نصر الباری

شرح اردو

صحیح البخاری

مولفہ

حضرت العلامہ مولانا محمد عثمان غنی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث مظاہر العلوم وقف سہارنپور

شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

جلد: اوّل | پارہ: ۱ | باب: ۱ - ۹۵ | حدیث: ۱ - ۱۳۴

کتاب الوحی، کتاب الایمان، کتاب العلم

ناشر مکتبۃ الشیخ

۳/۴۴۵، بہادر آباد، کراچی نمبر ۵۔ فون: 021-34935493

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَّبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

نصر الباری

شرح اردو

صحیح البخاری

مؤلفہ

حضرت العلامہ مولانا محمد عثمان غنی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث مظاہر العلوم وقف سہارنپور

شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

جلد: اوّل | پارہ: ۱ | باب: ۱ - ۹۵ | حدیث: ۱ - ۱۳۴

کتاب الوحی، کتاب الایمان، کتاب العلم

ناشر مکتبۃ الشیخ

۳/۴۴۵، بہادر آباد، کراچی نمبر ۵۔ فون: 021-34935493

نام .... نصر الباری شرح اردو صحیح البخاری ﴿جلد اول﴾

مؤلف .... حضرت العلامہ مولانا محمد عثمان غنی دامت برکاتہم

ناشر .... مکتبة الشیخ ۴۴۵/۳، بہادر آباد، کراچی نمبر ۵۔

﴿انتباہ﴾

اسٹاکسٹ: **مکتبہ خلیلیہ**

دوکان ۱۹، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ 0321-2098691

قدیمی کتب خانہ، کراچی
کتب خانہ اشرفیہ، اردو بازار، کراچی
اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن، کراچی
مکتبة العلوم، بنوری ٹاؤن، کراچی
مکتبہ قاسمیہ، لاہور
مکتبہ حقانیہ، ملتان
مکتبة العارفی، فیصل آباد

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی
کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
مکتبہ ندوہ، اردو بازار، کراچی
مکتبہ رحمانیہ، لاہور
مکتبہ حرمین، لاہور
ادارہ تالیفات، ملتان
مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ

زم زم پبلشرز، اردو بازار، کراچی
مکتبہ انعامیہ، اردو بازار، کراچی
مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی
ادارہ اسلامیات، لاہور
المیزان، لاہور
مکتبہ امدادیہ، ملتان
مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی

﴿ہر دینی کتب خانہ پر دستیاب ہے﴾

تقریظ

از فقیہ الاسلام خطیب ملت حضرت الحاج مولانا مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم

ناظم اعلیٰ جامعہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامع صحیح بخاری کو حدیث کی تمام کتابوں میں گوناگوں خصوصیات، امتیازات اور صحت و مقبولیت کے لحاظ سے جو تفوق و برتری حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے، اسی لئے جمہور محدثین کی رائے ہے: "اصح الکتب بعد کتاب اللہ الجامع الصحیح للبخاری"

محدثین نے ہر زمانہ میں درس و تدریس، تحشیہ و تشریح اور تحقیق ابواب و تراجم وغیرہ مختلف حیثیات سے اس کتاب کی طرف توجہ مبذول فرمائی ہے، اردو زبان میں بہت سے حضرات نے اپنے اپنے انداز میں اس کی شروح تحریر فرمائی ہیں، جن میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس کتاب کی خدمت کی ہے۔

اسی سلسلہ میں رفیق محترم الحاج علامہ عثمان غنی صاحب استاذِ حدیث مظاہر علوم (وقف) سہارنپور نے بھی اردو زبان میں ادلا بخاری جلد ثانی کی شرح مرتب فرمائی، کیونکہ اس حصہ کی عام طور پر اردو زبان میں کوئی شرح موجود نہ تھی، چنانچہ اللہ کا فضل ہے کہ مولانا کی یہ مخلصانہ کوشش مقبول ہوئی۔

مولانا نے اسی انداز میں جلد اول کی شرح بھی مرتب فرمائی ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، انشاء اللہ اساتذہ اور طلبہ سبھی کیلئے مفید ہوگی۔

حق تعالیٰ مولانا کی یہ کوشش بھی قبول فرمائے اور ذریعۂ سعادت بنائے۔ آمین۔

العبد

مظفر حسین المظاہری، ناظم اعلیٰ مظاہر علوم (وقف)

سہارنپور، یوپی،

۱۰ رجب المرجب ۱۴۱۷ھ

تقریظ از حضرت مولانا الحاج حکیم محمد اسلام انصاری صاحب مہتمم مدرسہ نور الاسلام میرٹھ
خلیفہ ومجاز حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد! احادیث نبویہ کی مدون کتابوں میں صحیح بخاری شریف کو اللہ تعالیٰ جو مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ نے اس کتاب پر جتنی توجہ فرمائی ہے کتاب اللہ کے بعد اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور جس طرح کتاب اللہ کے بعد صحت کے اعتبار سے اس کا درجہ ہے ٹھیک اسی طرح امت اسلامیہ نے اس کو کتاب اللہ کے بعد ہر دور میں مرکز توجہ بنایا اور اتنی شرحیں لکھیں کہ عقل حیران ہے۔ علامہ کرمانی، علامہ خطابی، علامہ نجم الدین نسفی، علامہ بدرالدین عینی، حافظ عسقلانی اور علامہ قسطلانی رحمہم اللہ کی تالیفات تو عام اور زبان زد محدثین عظام ہیں۔ اور اس کتاب عظیم اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی خدمت ہر محدث اپنے اپنے دور میں کرتا رہا ہے۔ مگر میرٹھ کی ایک عظیم ترین اور مقبول درسگاہ مدرسہ نور الاسلام کے بار اہتمام کی وجہ سے یہ تجربہ ہوا کہ موجودہ دور میں بچند وجوہ بالخصوص طلبہ میں ہمت ومحنت کی کمی اور تکاسل کا تقاضہ ہے کہ پوری بخاری شریف کی شرح حنفی مکتب خیال کے طرز سے نہایت ضروری ہے۔ کتب متداولہ حدیث کے ترجمے اور شروح اردو میں دوسرے حضرات نے کئے ہیں مگر انتہائی تشنہ ہیں۔

بلاشبہ علماء احناف کے بھی کچھ شروح اردو زبان میں شائع ہو چکے ہیں بالخصوص علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشادات و تحقیقات بنام انوار الباری اور حضرت علامہ فخر الدین صاحبؒ کے امالی بنام ایضاح البخاری۔ لیکن صحیح بخاری شریف کی پہلی جلد بھی مکمل نہ ہو سکی، مکمل تو کیا عرصہ پچیس ۲۵ سال سے بھی زیادہ گذر رہا ہوگا مگر اب تک بخاری شریف کے ابتدائی چند پارے شائع ہو سکے۔ انتہائی خوشی ہوئی کہ ہمارے محترم حضرت علامہ عثمان غنی صاحب محدث مظاہر علوم وقف سہارنپور نے بخاری شریف کی جلد ثانی سے ابتداء کی اس سے علامہ صاحب کا خلوص اور طلبہ حدیث سے انتہائی محبت وہمدردی کا اندازہ ہوتا ہے کہ طلبہ حدیث کو جلد اول کی ضرورت کچھ تو پوری ہو جاتی ہے مگر جلد ثانی کیلئے طلبہ پریشان ہوتے ہیں۔ ہمارے علامہ نے نصر الباری شرح بخاری کی دو جلدیں (کتاب المغازی مکمل اور کتاب التفسیر مکمل) شائع کر کے طلبہ پر بڑا احسان فرمایا ہے جو الحمد للہ توقع سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اہل علم اور تعلیمی اداروں نے جو پذیرائی کی یہ سب محض اللہ رب العزت کا احسان اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے انوار گوہر آبدار کی برکت ہے۔ اب علامہ صاحب نے چند احباب ومخلصین کے اصرار پر بخاری شریف جلد اول کی شرح شروع کی ہے، الحمد للہ بہت اعتدال کے ساتھ چل رہے ہیں نہ تو زیادہ طویل ہے کہ طلبہ ملول خاطر ہوں اور نہ ہی اتنا مختصر کہ تشنگی رہ جائے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے تشنگان علوم نبوت کو سیراب فرمائیں اور اصل کی طرح بارگاہ قبولیت میں جگہ عنایت فرمائیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

ع اس دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

الحمد للہ الذی شرح صدورنا للاسلام وجعلنا من امۃ حبیبہ سید الانام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام وادرجنا فی سلسلۃ خدام دینہ القویم ووفق اقلامنا لتشریح حدیث نبیہ الکریم اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ واشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ونبیہ الذی لا نبی بعدہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ اجمعین صلاۃ وسلاما مسلسلین متواترین دائمین غیر منقطعین الیٰ یوم الدین وعلینا معھم برحمتک یا ارحم الراحمین ویا اکرم الاکرمین ویا اجود الاجودین۔

اما بعد۔ احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ الصحیح البخاری کی شرح لکھنے کی جرأت کرے، مگر بہ بندۂ ظلوم وجہول اپنے رب کریم کی رحمت واسعہ کا بلا استحقاق امیدوار رہا ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ؎ نسیم صبح تیری مہربانی

لیکن حق تعالیٰ رب العالمین جب کسی کو اپنے فضل وکرم سے نوازنا چاہتا ہے اور کوئی عزت وشرف بخشنا چاہتا ہے تو اس کے لئے کسی قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں، وہ تو بہر حال طلکر ہی رہتی ہے۔ ؎

دادِ حق را قابلیت شرط نیست ؎ بلکہ شرطِ قابلیت داد ہست

خدائے لم یزل ولا یزال کا بے حد شکر گزار ہوں کہ ابتدا ہی سے تدریسی خدمت کا شرف بخشا، چنانچہ تقریبًا ۴۰ سال قبل ۱۹۵۵ء میں صوبہ بہار کے مرکزی مدارس میں سے ایک مشہور ومعروف مدرسہ "مدرسہ رشید العلوم چترا" کے اندر مسلم شریف اور ترمذی شریف وغیرہ کا درس دیا، پھر چند سال "مدرسہ حسینیہ گریڈیہہ" اور مدرسہ حسینیہ دگھی ضلع بھاگلپور میں متوسطات پڑھانے کے بعد ۱۹۶۳ء میں مدرسہ عالیہ فتحیہ فرفرہ شریف ضلع ہگلی سے خطوط آئے، احقر نے تدریس حدیث کے موقعہ کو غنیمت سمجھکر اور حاضر فرفرہ شریف ہوکر دینی ماحول اور پرسکون فضا دیکھکر تقریبًا بارہ سال رہا اور تدریس حدیث میں مشغول رہا۔ زیادہ تر احقر کے زیر درس بخاری شریف جلد اول اور تفسیر کشاف وغیرہ رہیں۔ یہاں بھی احقر نے اپنے معمول کے مطابق تالیف وتصنیف، ترجمہ وشرح کا سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ تفسیر کشاف بقدر نصاب کے مشکل مقامات کا حل، بالخصوص عالیہ بورڈ کے سالہائے گذشتہ کے سوالات کا حل بنام "الشفاف نوٹ کشاف"، "التقریر الکافی نوٹ بیضاوی"، دو دو حصہ ہدایہ ثالث اور ہدایہ رابع کا نوٹ بنام سقایہ وغیرہ اسی مدرسہ فتحیہ فرفرہ شریف کے زمانہ میں لکھی، جو ہندوستان کے مشہور ومعروف کتب خانہ "حاجی محمد سعید تاجر کتب ویلسلی اسٹریٹ کلکتہ" سے شائع ہوئیں اور بار بار شائع ہوئیں۔

نیز بخاری شریف کے سوالات کا حل بنام "تحفۃ البہاری نوٹ صحیح البخاری" بھی اسی زمانہ میں بھائی فرید صاحب مالک کتبخانہ مذکور کی

فرمائش پر احقر نے لکھی تھی جس کی کتابت و تصحیح بھی ہوچکی تھی، صرف طباعت باقی تھی کہ احقر کلکتہ چھوڑ کر چند ہی سال کے بعد گجرات کے معروف "مدرسہ دار العلوم تاراپور" پہنچ گیا، جہاں صحیح بخاری شریف کامل اور جامع ترمذی کامل کا درس احقر کے سپرد کیا گیا۔

اس مقام پر حقیقت حال ذکر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ مدرسہ دار العلوم تاراپور جو معیار تعلیم کے لحاظ سے گجرات کا ایک عظیم مرکز ہے، بیرونی طلبہ کو دونوں وقت کھانے کے علاوہ ناشتہ اور چائے کا بھی مدرسہ ہی کی طرف سے نظم ہے۔ حضرت مہتمم صاحب فرماتے ہیں کہ اسی تمام لڑکے پورے نشاط کے ساتھ شریک اسباق ہو جاتے ہیں۔

دار العلوم تاراپور کے بانی و مہتمم حضرت مولانا عبد الاحد صاحب دامت برکاتہم ایک عمر رسیدہ بزرگ کے ساتھ ساتھ جید عالم اور اس دور کے عظیم محدث ہیں، بلاشبہ حق یہی تھا کہ بخاری خود پڑھاتے لیکن مدرسہ کا سارا نظام اور بوجھ تنہا اٹھانے کے بعد تعمیری ترقیات کی فکر کی وجہ سے بخاری و ترمذی احقر کے سپرد فرمائی، اور خود اہتمام کی انتہائی مشغولیت کے باوجود طحاوی شریف وغیرہ کا درس دیتے، مہتمم صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تعلیمی نگرانی پر پوری توجہ فرماتے ہیں۔ احقر نے اکثر دیکھا کہ اساتذہ سبق پڑھا رہے ہیں اور مہتمم صاحب درسگاہوں کے سامنے چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ بظاہر نگاہ نیچی ہے مگر پوری توجہ اساتذہ کی تقریر پر ہے، اب اگر کسی مدرس کے اندر ناقابل برداشت خامی دیکھی تو شعبان میں سبکدوش کر دیا۔

احقر نے دو سال کے تدریس بخاری میں دیکھا کہ جلد اول کے شروح مثلاً ایضاح البخاری، فضل الباری اور انوار الباری وغیرہ طلبہ خریدتے اور مطالعہ کر لیتے ہیں، لیکن بخاری شریف جلد ثانی کیلئے کوئی اردو شرح دستیاب نہیں، حالانکہ بخاری جلد ثانی جلد اول سے زیادہ مشکل اور اہم ہے اسلئے کہ نصف پارہ کے بعد کتاب الوضوء سے مکمل، جلد اول فقہی مسائل (طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ) ہیں جو تقریباً پانچ سال تک نور الایضاح سے ہدایہ تک طلبہ یہی پڑھتے ہیں، پھر مشکوٰۃ میں پورے طور پر یہ مسائل طلبہ کے سامنے آجاتے ہیں، لیکن بخاری شریف جلد ثانی کے مباحث بالکل نئے ہوتے ہیں۔

اور یہ خیال صرف احقر ہی کا نہیں ہے، بلکہ ملک کے ایک عظیم محدث صاحب نسبت بزرگ یعنی شیخ الحدیث حضرت الحاج مولانا عبد الحق صاحب اعظمی دامت فیوضہم و برکاتہم سے احقر نے خود سنا، فرمایا "علامہ صاحب! بخاری جلد ثانی بہ نسبت جلد اول زیادہ مشکل ہے۔

طلبہ دورۂ حدیث نے بار بار دریافت کیا کہ "حضرت کیا دیکھوں؟ کسی شرح کی رہنمائی فرمائیے، احقر نے ہمیشہ "اصح السیر" کا مشورہ دیا چونکہ شیخ العرب والعجم شیخی واستاذی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلد ثانی کیلئے اصح السیر دیکھنے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔

لیکن حدیث پاک کا ترجمہ اور وہ اشکالات جو دوران درس سامنے آتے تھے، ان اشکالات کا حل، ترجمۃ الباب کی حدیث پاک سے مطابقت وغیرہ کی شکایت باقی رہ جاتی، تو احقر نے باوجود احساس تہی دامنی اور کم علمی کے جلد ثانی کی شرح بنام "نصر الباری شرح بخاری" رب العالمین پر بھروسہ کر کے شروع کر دی، اور دو سال تک خاموشی کے ساتھ بوقت فرصت کام کرتا رہا، جب معتد بہ حصہ یعنی بخاری شریف جلد ثانی کا سولھواں پارہ مکمل اور سترھواں کا نصف سے زیادہ حصہ ہو گیا تو جناب مہتمم حضرت الحاج مولانا عبد الاحد قاسمی مدظلہ العالی کو دکھلایا، تو مہتمم صاحب موصوف نے اظہار مسرت فرما کر نظر ثانی کے لئے تقریباً ایک ہفتہ سے زیادہ وقت دیا، پھر احقر نے کتابت کیلئے کاتب کے حوالہ کر دی اور کتاب المغازی کی تکمیل میں مشغول رہا۔ دار العلوم تاراپور کے قیام میں احقر کا معمول یہ تھا کہ شعبان اور شوال یعنی وطن جانے

اور آنے میں اپنے پیر و مرشد فقیہ الامت خطیب ملت حضرت الحاج الشاہ مولانا حافظ القاری مفتی مظفر حسین صاحب دامت فیوضہم و برکاتہم کی خدمت میں حاضر ہو کر ہفتہ عشرہ رہ کر استفادہ کے بعد وطن یا مدرسہ پہنچتا، مگر ہر سال اور بار بار یہ تمنا ہوتی کہ کاش سیدی و مولائی حضرت اقدس مفتی صاحب دامت فیوضہم کے قریب رہنے کا موقع میسر ہو جائے، چنانچہ مولانا نذر توحید چترادی سے اس خیال و خواہش کا بار بار احقر نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ اتنے میں مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور اختلاف کا شکار ہوا جسے بظاہر ایک عظیم حادثہ ہی سمجھنا چاہیے، جس کی بنا پر مدرسہ مظاہر علوم کے دو ٹکڑے ہو گئے، اور صحیحین کے استاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ العالی جدید مظاہر علوم چلے گئے۔ تو احقر کو حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم نے حکم دیا کہ اب گجرات سے تمام سامانوں کے ساتھ چلے آؤ، اور مدرسہ مظاہر علوم میں ہمارے ساتھ رہو۔ بس کیا تھا، دلی خواہش و تمنا پوری ہوئی، احقر حاضر مدرسہ ہو گیا، احقر کے ذمہ بخاری شریف جلد ثانی، اور مسلم شریف کامل اور طحاوی شریف کے اسباق سپرد کیے گئے جو تادمِ تحریر احقر کے زیرِ درس ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

بہرکیف بخاری شریف جلد ثانی کی اردو شرح یعنی نصر الباری کتاب المغازی کا اکثر حصہ تو گجرات کی معروف درسگاہ "دار العلوم ناراپور" ہی میں لکھ کر کاتب کے حوالہ کر دیا تھا لیکن اس کی تکمیل ہند و پاک کی مرکزی و معروف درسگاہ "مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور" میں کی۔

مقامِ تشکر اب سب سے اہم اور مشکل مسئلہ یہ تھا کہ ساڑھے پانچ سو صفحات کی کتابت اور طباعت کیلئے سرمایہ کہاں سے آئے؟ ادھر کاتب نے رقم کا مطالبہ شروع کر دیا، کچھ رقمیں ادا بھی کر دی گئیں، لیکن معمولی تنخواہ سے گھر کے ضروری اخراجات بھی پورا کرنا مشکل ہوتا تھا، اس لیے کتابت کی رقم رک جانے کی وجہ سے کاتب صاحب نے کتابت بند کر دی، اور کتابت شدہ اجزاء و مسودہ کی واپسی کے لیے رقم کی ادائیگی شرط قرار دی، میرے لیے انتہائی پریشان کن مسئلہ تھا کہ پروردگار عالم نے ایک عالم دین بزرگ کو متوجہ کر دیا، یعنی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب مظاہری مدظلہ العالی ناظم مجلس خیر سورت نے مبلغ پچیس ۲۵ ہزار روپے کی بڑی رقم دیکر حوصلہ افزائی فرمائی، اور کرم بالائے کرم یہ کیا کہ ان رقوم کی کتابیں مجلس خیر سورت کے پتہ پر چھاپ کر کتابیں سورت بھیجدیں اور چونکہ میرے پاس کچھ بھی رقم نہیں تھی تو سیدی و مولائی حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور نے کسی اہل خیر سے بطور قرض باقی رقم دلوائی، اور کتاب المغازی مکمل چھپ گئی۔

اور بنامِ خدا دوسری جلد یعنی کتاب التفسیر شروع کر دی، اسی دوران میں ایک محترم رفیق جناب مولانا محمد اسلام صاحب مدظلہ العالی ناظم اعلیٰ دار العلوم شاہ بہلول سہارنپور نے مشورہ دیا اور پر زور اصرار فرمایا کہ اس کے بعد بخاری شریف کا پہلا پارہ پہلی فرصت میں لکھیے۔ احقر نے وعدہ بھی کر لیا کہ آپ کا مشورہ بمنزلہ حکم ہے، ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

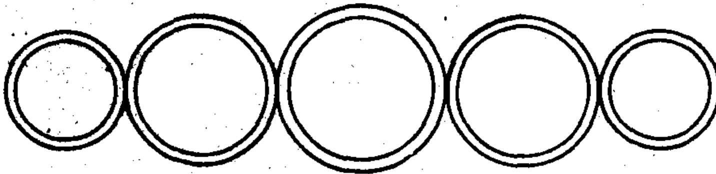
لیکن کتاب التفسیر کتاب المغازی سے ضخیم ہو گئی، تو مبیضہ میں کافی حذف و اختصار پر بھی تقریباً آٹھ سو صفحات کی جلد ہو گئی، پھر کتابت و طباعت کے لیے سرمایہ کی فکر دامنگیر ہو گئی، نیز کتابت کی اجرت دوگنی ہو گئی، انتہائی پریشان تھا مگر مسبب الاسباب رب العالمین نے میرے قدیم بزرگ کے ذریعہ اس فکر کو دور فرما دیا کہ حضرت الحاج مولانا عبد الاحد صاحب قاسمی مدظلہ العالی مہتمم دار العلوم ناراپور نے بیس ہزار بطور قرض عنایت فرمایا، اور پورے گجرات کے سب سے عظیم مرکز یعنی دار العلوم کنتھاریہ کے مہتمم حضرت الحاج مولانا محمد اسماعیل صاحب دامت برکاتہم نے بعوض کتب ساڑھے بارہ ہزار اور سیدی و مولائی حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور نے باقی رقم دیکر حوصلہ افزائی فرما کر احسان فرمایا۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اپنے رفیق مولانا عبد الرحمن صاحب بلند شہری سابق مدرس مظاہر علوم (وقف) کا

شکر بہ ادا نہ کروں کہ مولانا موصوف نے دس ہزار کی بڑی رقم عین وقت پر بھیجی۔

حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ اے پروردگار عالم ان کرم فرماؤں کو دارین میں اپنے خزانہ غیر متناہیہ سے اپنی شایان شان جملہ ترقیات سے مالا مال فرما۔ آمین۔

نیز تمام ناظرین سے میری گزارش ودرخواست ہے کہ وہ ان معاونین علماء کرام کو اور ان کے ادارے کو دعوات صالحہ سے ہرگز فراموش نہ کریں، بلکہ صمیم قلب سے دعائے خیر فرماتے رہیں کہ حق تعالیٰ ان بزرگوں کے جان ومال میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین،

احقر عباد اللہ الرحمٰن المدعو بمحمد عثمان غفر اللہ الحنان المنان،



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا ومولانا خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین وعلینا معھم یا ارحم الراحمین۔

"مقدمہ"

ہمیشہ سے اہل علم اکابر اور مشائخ درس کا دستور رہا کہ وہ ہر علم کے اور ہر کتاب کے شروع میں خاص طور پر علم حدیث کے شروع سے قبل بطور مقدمہ اس علم کے مبادی سے متعلق کچھ مباحث بیان کرتے ہیں تاکہ علی وجہ البصیرت کتاب کا افتتاح ہو سکے۔

ان مباحث کو "رؤس ثمانیہ" کہا جاتا ہے جو آٹھ باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(۱) علم کی تعریف، (۲) موضوع (۳) غرض و غایت (۴) وجہ تسمیہ (۵) علم کی فضیلت (۶) مصنفات فی الحدیث کے انواع (۷) علم کی تاریخ تدوین (۸) اجناس علوم میں اس کا مقام وغیرہ۔

اب بھی علم حدیث کے تمام اساتذہ اس جانب توجہ کو مفید سمجھ کر اپنی اپنی بصیرت کے مطابق کتب حدیث کی ابتداء میں کچھ ضرور ارشاد فرماتے ہیں اس مقدمہ میں رؤس ثمانیہ مذکورہ کے علاوہ کچھ ضروری باتیں اس علم کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اس مقدمہ کے مباحث "رؤس ثمانیہ" کی ترتیب سے قدرے مختلف ہوں گے۔

بحث اوّل علم حدیث کی تعریف حدیث کے لغوی معنی کلام کے ہیں، یعنی لغت کے اعتبار سے ہر قسم کے کلام کو حدیث کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال تقریرات و احوال کو حدیث کہتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ الحدیث فی عرف الشرع ما یضاف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قولا او فعلا او صفۃ او تقریرا کانہ ارید بہ مقابلۃ القرآن لانہ قدیم۔ یعنی حدیث شریعت کی اصطلاح میں ہر وہ چیز ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو چاہے قول ہو یا فعل، صفت ہو یا تقریر، تقریر کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو کوئی فعل کرتے دیکھا اور سکوت فرمایا ہو۔

یہ تو صرف حدیث کی تعریف تھی۔ اب علم حدیث کی تعریف ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ بدر الدین عینی رح نے یہ تعریف نقل کی ہے۔ "فھو علم یعرف بہ اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ واحوالہ" (عمدۃ القاری ص۱) یعنی وہ علم ہے جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور احوال کی معرفت حاصل ہو۔ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی تعریف بیان کی ہے۔

اقسام علم حدیث یوں تو علم حدیث کی ساٹھ سے بھی زائد اقسام بیان کئے گئے ہیں، لیکن عام طور پر ہمارے سامنے تمام اقسام کی بحث نہیں ہوتی ہے، بلکہ صرف روایت حدیث اور درایت حدیث کی بحث ہوتی ہے، چنانچہ علامہ ابن الاکفانی رح نے

"ارشاد القاصد" میں لکھا ہے کہ علم حدیث کی ابتداءً دو قسمیں ہیں۔ (۱) علم روایت الحدیث (۲) علم درایت الحدیث۔

علم روایت الحدیث هو علم يشتمل على نقل احواله صلى الله عليه وسلم قولا اوفعلا اوتقريرا اوصفة یعنی جس علم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کو نقل کیا جائے، چاہے آپ کے اقوال کو نقل کیا جائے یا افعال وتقریر کو یا کسی صفت کو۔

اس تعریف میں احوال عام ہے جس میں افعال اختیاریہ کے علاوہ افعال غیر اختیاریہ، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک، آپ کی رفتار وگفتار، آپ کی ولادت یا وفات کے واقعات و روایات سب داخل ہیں، اس لئے عام طور پر حدیث کی تعریف ان الفاظ سے مشہور ہے۔ الحديث ما اضيف الى رسول الله صلى الله عليه وسلم قولا اوفعلا اوتقريرا اوصفة حتى الحركات والسكنات فى اليقظة والمنام۔

علم درایت الحدیث وہ علم ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور احوال کی شرح معلوم ہو، یعنی الفاظ حدیث کے معانی ومطالب کو سمجھنا، اس سے مسائل کا استنباط کرنا، احادیث متعارضۃ الظاہر میں تطبیق دینا وغیرہ درایت الحدیث کہلاتا ہے۔

حدیث اور سنت میں فرق حدیث کا اطلاق حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال پر ہوتا ہے جن میں جائز الاتباع اور ممنوع الاتباع دونوں قسمیں شامل ہیں۔ ممنوع الاتباع سے مراد حضور اقدس صلعم کے خصوصیات ہیں، جیسے بیک وقت ازواج تسعہ (نو بیویوں) کو اپنے نکاح میں رکھنا، اسی طرح صوم وصال وغیرہ کہ یہ افعال حضور اقدس صلعم کے خصوصیات میں سے ہیں، امت میں سے کسی مسلمان کے لئے بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ جائز نہیں، بالکل حرام ہے۔

بہر حال لفظ حدیث دونوں قسموں کو شامل اور عام ہے بخلاف سنت کے، کہ سنت کا اطلاق صرف جائز الاتباع پر ہوتا ہے ممنوع الاتباع پر سنت کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے ارشاد نبوی ہے "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين" نیز ارشادِ گرامی ہے، "تركت فيكم امرين لن تضلوا ماتمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله" آپ نے "حديث رسوله" نہیں فرمایا۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لفظ حدیث اور سنت میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے، کہ حدیث عام ہے اور سنت خاص

حدیث وخبر بعض حضرات کے نزدیک دونوں مساوی ومترادف ہیں، لیکن راجح قول یہ ہے کہ ان دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے، خبر عام ہے اور حدیث خاص، اس طرح پر کہ حدیث تو حضور اقدس صلعم کے ساتھ خاص ہے اور خبر کا اطلاق احادیث پاک کے علاوہ اخبار ملوک پر بھی ہوتا ہے۔ اور اخبار ملوک کو حدیث نہیں کہا جاسکتا۔ خبر کے عموم ہی کی وجہ سے اخبارات کو اخبار کہتے ہیں۔ لیکن حضرات محدثین حدیث وخبر، اسی طرح اثر وسنت میں ایک کو دوسرے کی جگہ بکثرت استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ امام طحاوی رحمہ کی کتاب "شرح معانی الآثار" اور حدیث کی مشہور کتاب "منتقى الاخبار من كلام سيد الابرار" شاہد ہے۔

حدیث قدسی قدسی، قدس کی طرف منسوب ہے۔ لفظ قدس بضمتین اور بسکون الدال، ہر دو صورت میں اصل معنی پاکی کے ہیں، اسی سے ارض مقدسہ اور بیت المقدس ماخوذ ہے۔ اسمائے حسنیٰ یعنی حق تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام قدوس بھی ہے جس کا مفہوم و معنی ہے ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک ذات۔

احادیث کو قدس کی طرف نسبت کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان احادیث کے معنی حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہیں، چنانچہ احادیث قدسیہ کو احادیث الٰہیہ و احادیث ربانی بھی کہا جاتا ہے۔

حدیث قدسی وہ حدیث ہے جس کو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہٗ سے بلا واسطہ جبریل علیہ السلام الہام یا رؤیائے صادقہ کے ذریعہ اپنے الفاظ میں نقل فرمائیں، جیسے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ۔ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ کتب کتابا قبل ان یخلق الخلق ان رحمتی سبقت غضبی فھو مکتوب عندہ فوق العرش (بخاری ص۱۱۲۷) خلاصہ یہ ہے کہ جس حدیث میں نسبت الی اللہ کی تصریح ہو وہ حدیث قدسی ہے اور جہاں نسبت الی اللہ کی تصریح نہیں ہے وہ حدیث حدیث نبوی ہے۔

الفرق بین الحدیث القدسی والقرآن قرآن حکیم اور حدیث قدسی میں کئی طرح سے فرق بیان کیا جاتا ہے ۱ قرآن مجید معجز ہے اور حدیث قدسی معجز نہیں۔

۲ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی دونوں کا من اللہ ہونا ضروری ہے اور حدیث قدسی میں صرف معنی و مفہوم کا من اللہ ہونا ضروری ہے۔

۳ حدیث قدسی کی نسبت جس طرح حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح مخبر ہونے کی حیثیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی ہوتی ہے بخلاف قرآن پاک کے، کہ اس کی نسبت حضور اقدس ﷺ کی طرف نہیں کی جاسکتی ہے۔

۴ قرآن پاک ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں تواتر کے ساتھ منقول ہے لیکن حدیث قدسی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

۵ نماز کی ادائیگی قرآن مجید کی قراءت ہی سے ہوتی ہے، حدیث قدسی سے نہیں ہوتی۔

۶ قرآن حکیم کا منکر کافر ہے اور حدیث قدسی کا منکر کافر نہیں۔

دوسری بحث حدیث کا موضوع علامہ طیبی رح فرماتے ہیں، "فموضوع علم الحدیث ھو ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عمدہ)" یعنی فن حدیث کا موضوع ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انہ رسول اللہ ﷺ۔

اس حیثیت کی قید سے سارا اعتراض اور اشکال ختم ہو جاتا ہے۔

تیسری بحث غرض و غایت علم حدیث کی غرض و غایت ہے الاھتداء بھدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (یعنی حضور اقدس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے ہدایت یاب ہونا)۔

(۲) علامہ کرمانی رح فرماتے ہیں "الفوز بسعادۃ الدارین" یعنی دونوں جہان کی سعادت حاصل کرنا۔ علامہ کرمانی رح کے قول سے اجمالی طریقہ پر علم حدیث کی غرض و غایت معلوم ہوگئی، لیکن تفصیلی طور سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ علم حدیث کا اہم فائدہ یہ ہے کہ مشتغل بالحدیث میں صحابیت کی شان پیدا ہوتی ہے۔

اهل الحدیث هم اهل النبی وان ❊ لم یصحبوا نفسه انفاسه صحبوا

(۳) حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم حدیث کی غرض وغایت کیلئے صرف اتنا کافی ہے کہ اس میں اللہ کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس احوال واقوال ہیں، ہم محب رسول ہیں اور آپ سے سچی محبت کے دعویدار ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کے وطن سے، اس کے در و دیوار سے، اس کے جملہ آثار سے بھی محبت ہو جاتی ہے، اسی کے تذکرہ میں مزہ آجاتا ہے، محبوب کا خط آجائے تو کبھی چومتا ہے کبھی آنکھوں سے لگاتا ہے، ایک ایک جملہ کو بار بار پڑھتا ہے، اور ہر مرتبہ قند مکرر کا لطف حاصل کرتا ہے، اس کی ہر ادا پر مٹتا ہے۔ پس جب ہم محب رسول ہیں اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے قلب میں ساری مخلوق سے زیادہ ہے تو ہمیں علم حدیث اسلئے پڑھنا چاہیئے کہ محبوب کا کلام ہے اور اس کو محبوب کے ساتھ نسبت ہے، اور جب اس کو محبت کے ساتھ پڑھا جائے تو انشاء اللہ ضرور لذت وحلاوت حاصل ہوگی۔

پھر حضرت شیخ (یعنی شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ) نے فرمایا کہ علم حدیث کی تعریف کا خلاصہ تدبر ہے اور موضوع کا خلاصہ عظمت، اور غرض وغایت کا خلاصہ لذت، پس اگر علم حدیث کو تدبر، عظمت اور محبت کے ساتھ پڑھوگے تو انشاء اللہ غایت مرتب ہوگی، ورنہ جیسی نیت ویسی برکت (امداد الباری ص۲۹)

(۴) مشتغل بالحدیث، حضور پرنور صلے اللہ علیہ وسلم سے خصوصی تعلق پیدا ہوتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھنے پڑھانے اور تکمیل سلوک کے بعد حرمین شریفین کا سفر کیا وہاں ان کو کچھ مبشرات نظر آئے، روحانی فیوض حاصل ہوئے، جن کو حضرت شاہ صاحب موصوف نے اپنی کتاب "فیوض الحرمین" میں جمع کیا ہے۔

اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کی جانب توجہ کی تو مجھے محسوس ہوا کہ نبی اکرم حضور پرنور صلے اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک سے نور کے خطوط (دھاگے) نکل رہے ہیں اور ہر مشتغل بالحدیث کے قلب تک یہ نورانی دھاگہ جارہا ہے۔

پھر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے میری کتاب کے دیکھنے والو، تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم حدیث کا شغل قائم رکھو تاکہ وہ نورانی دھاگہ (نور کا کنکشن) تمہارے سینے کے ساتھ قائم رہے۔ اشتغال خواہ درس وتدریس کی صورت میں ہو خواہ تصنیف وتالیف کی، خواہ مطالعہ کی صورت میں، بہرحال حدیث پاک کا شغل ضروری ہے۔

چوتھی بحث وجہ تسمیہ اس فن کو فن حدیث کہتے ہیں، فن حدیث کی وجہ تسمیہ یعنی اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں مناسبت کیا ہے؟ اقوال مختلف ہیں۔

۱:- حدیث کے لغوی معنی کلام کے ہیں، اور اصطلاح شریعت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو حدیث کہا جاتا ہے۔ رہا یہ اشکال کہ احادیث تو صرف آپ کے کلام یعنی اقوال ہی نہیں ہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال وافعال بھی ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ احوال وافعال کو تغلیباً احادیث کہا جاتا ہے۔

۲:- حدیث بمعنی حادث ہے قال العلامة السيوطى فى التدريب ص۴۲ الحديث اصله ضد القديم

وقد استعمل فی قلیل الخبر وکثیرہ لانہ یحدث شیئا فشیئا۔ یعنی حدیث اصل لغت کے اعتبار سے قدیم کی ضد ہے، اس لئے ہر حادث کو حدیث کہا جا سکتا ہے، اسلئے کہ حدیث کا لفظ بھی حدوث پر دلالت کرتا ہے اور خبر بھی یک بیک صادر نہیں ہوتی، بلکہ یکے بعد دیگرے صادر ہوتی ہے، تو چونکہ کلام اللہ قدیم ہے اس لئے کلام الرسول کو حدیث کہدیا گیا۔

۳:۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل کو حدیث کہنے کا ماخذ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات ہیں، ارشاد نبوی ہے "حدثوا عنی ولا حرج" نیز مسلم شریف کی روایت ہے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین۔

پانچویں بحث فضیلت

علم حدیث شرافت اور فضیلت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے اور اول مرتبہ کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم کا ہے، اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس کو اصل ثانی قرار دیا گیا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول نضر اللہ امرأ سمع منا حدیثا فحفظہ حتی یبلغہ الحدیث (ابوداؤد ص۵۱۵)

نیز امام ترمذی رحمہ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے (ترمذی ص۹) یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری حدیث سنی پھر اس کو یاد کیا تاکہ دوسروں تک پہنچائے۔

بس علم حدیث کی فضیلت کے لئے یہ کافی ہے کہ مشتغل بالحدیث کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔

علم حدیث تو ایسا علم ہے جو سارے علوم دینیہ کی اصل ہے، کہ یہ قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور فقہ کی اصل بھی ہے اور تصوف کا ماخذ بھی۔

بحث سادس انواع المصنفات فی الحدیث

علم حدیث میں مختلف حیثیتوں سے کتابیں لکھی گئی ہیں، محدثین عظام نے احادیث جمع کرنے میں مختلف اسلوب وطریقے تجویز کئے ہیں چنانچہ مصنفات فی الحدیث یعنی کتب حدیث وضع اور ترتیب مسائل کے اعتبار سے بہت سے اقسام ہیں، جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص اصطلاحی نام ہے، یہاں سب کو بیان کرنا مشکل ہے۔ اس لئے صرف چند مشہور انواع کو بیان کرتا ہوں جن کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ کتب حدیث کے مشہور اقسام سات ہیں

(۱) **الجوامع** :۔ یہ جامع کی جمع ہے، جامع حدیث کی وہ کتابیں ہیں جن میں آٹھ مضامین کی احادیث جمع کر دی گئی ہوں جن کو کسی نے ایک شعر میں جمع کر دیا ہے۔

سیر آداب وتفسیر وعقائد ۔ فتن واحکام اشراط ومناقب

سیر۱:۔ سیرت کی جمع ہے یعنی وہ مضامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ کے واقعات پر مشتمل ہیں

آداب۲:۔ ادب کی جمع ہے، مراد ہیں آداب المعاشرت۔ مثلاً کھانے پینے کے آداب۔

تفسیر۳:۔ یعنی وہ احادیث جو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہیں۔

عقائد:۔ وہ احادیث جن کا تعلق عقائد سے ہے۔
فتن:۔ فتنہ کی جمع ہے، یعنی وہ بڑے بڑے واقعات جن کی پیشنگوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔
احکام:۔ یعنی احکام عملیہ جن پر فقہ مشتمل ہوتا ہے۔
اشراط:۔ یعنی علاماتِ قیامت۔
مناقب:۔ منقبت کی جمع ہے یعنی صحابۂ کرام اور صحابیات اور مختلف قبائل کے فضائل۔

غرض جو کتاب ان مضامین ثمانیہ پر مشتمل ہو اُسے "جامع" کہا جاتا ہے۔

صحاح ستہ میں سے صحیح بخاری شریف اور ترمذی شریف کے جامع ہونے پر اتفاق ہے البتہ صحیح مسلم شریف کے بارے میں اختلاف ہے لیکن صحیح اور حق یہ ہے کہ صحیح مسلم بھی جامع ہے۔

(۲) السنن:۔ حدیث کی وہ کتابیں ہیں جن میں احکام کی احادیث کو ابوابِ فقہیہ کی ترتیب پر جمع کیا گیا ہو، جیسے نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ، اس اعتبار سے ترمذی شریف کو بھی سنن کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ترتیب فقہی انداز پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے کتاب الایمان سے شروع کرنے کے ترمذی شریف کو کتاب الطہارت سے شروع کیا گیا ہے، چنانچہ سنن اربعہ کا لفظ بول کر یہی چار کتابیں مراد لی جاتی ہیں ۱۔ نسائی ۲۔ ابوداؤد ۳۔ ترمذی ۴۔ ابن ماجہ۔

(۳) المسانید:۔ مسند کی جمع ہے، ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں احادیث کو صحابۂ کرام رضؓ کی ترتیب پر جمع کیا گیا ہو یعنی ایک صحابی کی تمام مرویات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہو خواہ کسی مسئلہ سے متعلق ہو، پھر دوسرے صحابی کی وھلم جرّا۔ پھر اس ترتیب میں بھی مختلف صورتیں ہیں، بعض حروف تہجی کا لحاظ کرتے ہیں یعنی سب سے پہلے ان حضرات صحابہ رضؓ کی روایتوں کو جمع کرتے ہیں جن کے نام کے شروع میں ہمزہ (یعنی الف) ہو، اس صورت میں حضرت اسامہ رضؓ حضرت انس رضؓ مقدم ہوں گے۔

بعض تقدم فی الاسلام کا لحاظ کرتے ہیں، پس جو شخص اسلام لانے میں مقدم ہوگا اس کی روایتوں کو پہلے جمع کر دیں گے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر مسند کی یہ قسم مفقود ہے۔

بعض محدثین نے صحابۂ کرام رضؓ کے مراتب کے لحاظ سے مسانید لکھی ہیں، ان میں سب سے اول خلفاء راشدین علیٰ ترتیب الخلافت، پھر بقیہ عشرہ مبشرہ، پھر اصحابِ بدر پھر شرکاء بیعت الرضوان، پھر فتح مکہ سے قبل ہجرت کرنے والے، پھر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والے، پھر اصاغر صحابہ، پھر مردوں کے عورتوں کی احادیث اس طرح پر کہ ازواج مطہرات رضؓ کی حدیثوں کو مقدم کیا جائے گا، اسلئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں سے روایات نہیں ملتی مگر روایات قلیلہ سیدۃ النساء اہل الجنۃ حضرت فاطمۃ الزہراء رضؓ سے منقول ہیں اس لئے کہ تمام صاحبزادیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہری ہی میں انتقال فرما گئیں، صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے بعد چھ مہینے تک زندہ رہیں پھر ان کی بھی وفات ہو گئی۔ اس لئے ان سے بھی روایتیں زیادہ نہیں ہیں۔

(۴) معاجم:۔ معجم کی جمع ہے، معجم وہ کتاب ہے جس میں شیوخ واساتذہ کی ترتیب پر حدیث کو جمع کیا گیا ہو، اس طرح پر کہ ہر شیخ کی تمام احادیث کو یکجا کر دیا گیا ہو خواہ کسی مضمون کی ہو جیسے معجم طبرانی۔

(۵) جزء :- وہ کتاب جس میں صرف ایک مسئلہ سے متعلق روایات کو جمع کر دیا گیا ہو، جیسے جزء القراءة، جزء رفع الیدین للبخاریؒ۔
(۶) مفرد (۷) غریب (۸) مستخرج (۹) مستدرک وغیرہ۔

بحث سابع اجناس علوم میں اس کا مقام، علوم کی اجناس مقرر ہیں اور اس کی تقسیم مختلف طریقہ سے کی گئی ہے۔ مثلاً یہ علم عقلی ہے یا نقلی، عقلی جیسے منطق فلسفہ، نقلی ہے تو پھر اس کی بھی دو قسم ہیں، شرعی ہے یا غیر شرعی؟ پھر شرعی کی بھی دو قسم ہیں، اصلی یا فرعی۔ اس تفصیل کے بعد کہا جائیگا کہ علم حدیث نقلی شرعی اصلی ہے، نقلی ہونا تو صاف ظاہر ہے کہ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال ہی نقل کئے جاتے ہیں۔ اور شرعی اس لئے کہ اس پر دین و شریعت کا مدار ہے، احکام شرعیہ کی تفصیلات اسی سے معلوم ہوتی ہیں۔ اصلی اس لئے کہ اصول شرع میں سے اصل دوم یہی ہے۔

بحث ثامن حکم شرعی علم حدیث کا شرعی حکم یہ ہے کہ جس علاقہ میں صرف ایک ہی مسلمان ہو وہاں تو علم حدیث پڑھنا فرض عین ہے، اور جہاں بہت سے مسلمان ہوں تو پھر فرض کفایہ ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ لا اعلم علما افضل من علم الحدیث لمن اراد به وجه الله تعالیٰ ان الناس یحتاجون الیه حتی فی طعامهم وشرابهم فهو افضل من التطوع بالصلوٰة والصیام لانه فرض کفایة۔

یہی حکم علم فقہ کا ہے، کیونکہ احادیث کی تفصیل و تشریح فقہ پر ہی موقوف ہے۔

حجیت الحدیث پوری دنیا کے علماء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کے بعد حدیث پاک دین کا دوسرا اہم ماخذ اور اصول ہے، اسلام میں تقریباً پہلی صدی تک صحیح احادیث کو متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ معتزلہ ظاہر ہوئے ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا، انھوں نے حشر و نشر، رویت باری تعالیٰ، وزن اعمال اور اس قسم کی اور احادیث کو قابل تسلیم نہ سمجھا اور اپنے اس مزاجی فساد کی وجہ سے اخبار متواترہ کے سوا بقیہ احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور بہت سی قرآنی آیات میں جو اپنے مذاق کے خلاف دیکھیں تاویلیں کر ڈالیں۔

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ "اہل سنت، شیعہ، خوارج، قدریہ تمام فرقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابل حجت سمجھتے رہے یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انہوں نے اس اجماع کے خلاف کیا (ترجمان السنۃ جلد اول ص۹۲ بحوالہ الاحکام ج ا ص۱۱۴)

حافظ ابن حجر نے ابو علی جبائی معتزلی سے نقل فرمایا کہ حدیث کی صحت کیلئے عزیز ہونا شرط ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکار حدیث سے ان کا مقصد دین سے سبکدوشی حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ ایک اصولی غلطی تھی جو ان کے دماغوں میں ایک غلط بنیاد پر قائم ہو گئی تھی لیکن انیسویں (۱۹) صدی میں جب مسلمانوں پر مغربی اقوام کا سیاسی و نظریاتی تسلط بڑھا تو دین سے ناواقف مسلمانوں کا ایسا طبقہ وجود میں آیا جو مغربی افکار سے بیحد مرعوب تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ترقی بغیر تقلید مغرب کے حاصل نہیں ہو سکتی اور اسلام کے بہت سے احکام اس کے راستہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے اسلئے اس نے اسلام میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا تاکہ اسے

مغربی افکار کے مطابق بنایا جاسکے، اس طبقہ کو "اہل تجدد" کہا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور کا فتنہ علم و فہم پر مبنی نہیں بلکہ جہل و عناد پر مبنی ہے، اس کا مقصود مذہب کی گرفت ڈھیلی کرنا اور اس کو ایسی صورت میں پیش کرنا ہے جو ہر سانچے میں ڈھلنے کے قابل ہو جائے۔ اس لئے اب انکار حدیث کے لئے کسی بڑی دلیل کی ضرورت بھی نہیں رہی بلکہ صرف چند احادیث میں معمولی شبہات پیدا کر کے بقیہ تمام احادیث کو بے دلیل کر دیا گیا۔

ہندوستان میں سرسید احمد خاں، مصر میں طٰہٰ حسین، ترکی میں ضیا گوک اسپ اس طبقہ کے رہنما ہیں، اس طبقہ کے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے تھے، جب تک حدیث کو راستہ سے نہ ہٹایا جائے کیونکہ احادیث میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ایسی مفصل ہدایات موجود ہیں جو مغربی افکار سے صراحۃً متصادم ہیں۔ چنانچہ اس طبقہ کے بعض افراد نے حدیث کو حجت ماننے سے انکار کیا، یہ آواز ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں اور ان کے رفیق مولوی چراغ علی نے بلند کی لیکن انہوں نے انکار حدیث کے نظریہ کو علی الاعلان اور بوضاحت پیش کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں کوئی حدیث اپنے مدعا کے خلاف نظر آئی اس کی صحت سے انکار کر دیا خواہ اس کی سند کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو اور ساتھ ہی کہیں کہیں اس بات کا بھی اظہار کیا جاتا رہا کہ یہ احادیث موجودہ دور میں حجت نہیں ہونی چاہئیں، اور اس کے ساتھ بعض مقامات پر مفید مطلب احادیث سے استدلال بھی کیا جاتا رہا۔ اسی ذریعہ سے تجارتی سود کو حلال کیا گیا، معجزات کا انکار کیا گیا اور بہت سے مغربی نظریات کو سند جواز دی گئی۔

ان کے بعد نظریہ انکار حدیث میں اور ترقی ہوئی اور یہ نظریہ کسی قدر منظم طور سے عبداللہ چکڑالوی کی قیادت میں آگے بڑھا، یہ ایک فرقہ کا بانی تھا جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا تھا، اس کا مقصد حدیث سے کلیۃً انکار کرنا تھا، اس کے بعد اسلم جیراجپوری نے اس نظریہ کو اور آگے بڑھایا یہاں تک کہ غلام احمد پرویز نے اس فتنہ (فتنۂ انکار حدیث) کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے ایک منظم نظریہ اور مکتب فکر کی شکل دیدی، نوجوانوں کے لئے اس کی تحریر میں بڑی کشش تھی اس لئے اس کے زمانے میں یہ فتنہ سب سے زیادہ پھیلا، ہم یہاں اس فتنہ کے بنیادی نظریات پر مختصر گفتگو کریں گے۔

منکرین حدیث کے تین نظریات

منکرین حدیث کی طرف سے جو نظریات اب تک سامنے آئے ہیں وہ تین قسم کے متضاد نظریات وخیالات ہیں۔

(۱) قرآن سمجھنے کیلئے حدیث کی حاجت نہیں ہر شخص اپنے دماغ و عقل سے قرآن مجید سمجھ سکتا ہے، حضور اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ صرف قرآن مجید پہونچانا تھا، اطاعت صرف قرآن کی واجب ہے۔ آپ کی اطاعت من حیث الرسول نہ صحابہ پر واجب تھی اور نہ ہم پر واجب ہے (معاذ اللہ)، اور وحی صرف متلو ہے اور وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں ہے۔

(۲) حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے جو احکام بیان فرمائے وہ صرف حضور کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھے، ہر زمانے کے لحاظ سے ان احکام میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی آپ کے ارشادات و احکام آپ کے زمانے میں حجت تھے ہم پر حجت نہیں۔

(۳) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل یعنی حدیث پاک حجت تو ہے لیکن موجودہ احادیث ہم تک قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہونچیں، اسلئے ہم انھیں ماننے کے مکلف نہیں۔

منکرین حدیث کے ان مختلف اور متضاد خیالات دیکھکر اہل علم وعقل کے لئے دو شقوں میں سے ایک کا تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے یعنی یا تو ان کو مجنون اور دیوانہ سمجھکر معذور خیال کیا جائے یا یوں کہا جائے کہ ان کا کوئی نصب العین اور نظریہ معین نہیں ہے بلکہ اس ساری تگ ودو سے ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرکے ہر طرح سے آزادانہ زندگی بسر کریں اس لئے جس قسم کا موقع پاتے ہیں ویسی ہی بات منھ سے نکالدیتے ہیں اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔

اس وقت ہم ان تین قسم کے متضاد نظریات میں سے ہر ایک پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

نظریہ اولیٰ کی تردید

(۱) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا الآیہ پ ۲۵ ع ۶، اس آیت میں وحی کو ارسال رسول کے مقابلہ میں ذکر کرنا دال ہے کہ بغیر ارسال رسول کے بھی وحی ہوتی ہے، یہی وحی غیر متلو (یعنی حدیث) ہے۔

(۲) ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (پ ۲ ع ۱) اس آیت میں الْقِبْلَةَ سے مراد بیت المقدس ہے اور اس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو باری تعالیٰ نے جعلنا کے لفظ سے اپنی جانب منسوب فرمایا، حالانکہ پورے قرآن حکیم میں کہیں بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم مذکور نہیں، لامحالہ یہ حکم وحی غیر متلو کے ذریعہ تھا اور اسے اپنی طرف منسوب کرکے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وحی غیر متلو کا حکم بھی اسی طرح واجب التعمیل ہے جس طرح وحی متلو کا۔

(۳) ارشاد خداوندی ہے۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ الخ (پ ۴ ع ۲) یہ آیت غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئی جس میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں انزال ملائکہ کا وعدہ فرمایا تھا، حالانکہ قرآن میں موقع بدر پر اس قسم کا کوئی وعدہ مذکور نہیں، معلوم ہوا کہ انزال ملائکہ کا وعدہ وحی غیر متلو سے تھا جو حدیث ہے۔

(۴) ارشاد ربانی ہے۔ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ الآیہ (پ ۲ ع ۷) اس آیت میں رمضان المبارک کی رات میں جماع کرنے کو خیانت سے تعبیر کیا گیا اور بعد میں اس کی اجازت دیدی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ ابتداء میں رمضان المبارک کی رات میں جماع کرنا حرام تھا حالانکہ یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، لامحالہ یہ حکم وحی غیر متلو کے ذریعہ تھا۔

(۵) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ الخ (پ ۹ ع ۱۵) اس میں بھی جس وعدہ کا ذکر ہے وہ وحی غیر متلو کے ذریعہ ہوا تھا، کیونکہ قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں۔

(۶) وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (پ ۲۸ سورۂ تحریم)

اس میں صاف مذکور ہے کہ حضرت عائشہ رضہ اور حضرت حفصہ رضہ کا پورا واقعہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر

ظاہر فرمادیا اور قرآن میں کہیں یہ واقعہ مذکور نہیں، لامحالہ یہ وحی غیر متلو کے ذریعہ تھا۔

(۷) سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ (پ ۲۶ ع ۱۰)

اس آیت میں تصریح فرمائی جارہی ہے کہ منافقین کو غزوۂ خیبر میں شرکت کی اجازت نہ دینے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے کردیا تھا حالانکہ اس آیت کے علاوہ اس فیصلہ کا قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں ہے، معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ وحی غیر متلو سے ہوا تھا۔

(۸) لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ الخ (پ ۴ ع ۸)

اس آیتِ مبارکہ میں صاف دلالت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کام ایک ڈاکیے کی طرح محض پیغام پہنچادینا ہی نہیں تھا بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اور حکمت کے معلّم اور مسلمانوں کے لئے مزکّی بھی تھے۔ تعلیم الکتاب کا فرض جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّہ لگا یا گیا، آپؐ اس فرضِ منصبی کو کس طرح ادا کرتے تھے؟ کیا قرآن کے طلبہ یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ سے کسی آیت کے بارے میں دریافت ہی نہ کرتے تھے؟ اور اگر کچھ دریافت کرتے تھے تو کیا آپؐ ان کے جواب میں قرآن ہی کی کوئی آیت پیش فرما دیتے تھے؟ کیا یہ طریقِ تعلیم قرینِ قیاس ہو سکتا ہے کہ ایک معلّم کسی کتاب کی تعلیم دے تو طلبہ تلاوتِ متن اور سماع کے سوا کوئی بات دریافت ہی نہ کریں؟ اور اگر دریافت کریں تو استاد اس کے جواب میں کتاب ہی کا متن پڑھ دے؟ اور اپنی زبان سے کوئی تشریح نہ کرے، معلّم کا فرض ہے کہ کتاب کے مجملات کی تفسیر اور تشریح کرے، طلبہ کے اعتراضات اور اشکالات کو حل کرے، کتاب کے مفہوم اور مضمون کو واضح طور پر سمجھائے، اگر قرآن مجید کے لئے حدیث کی ضرورت ہی نہیں، ہر شخص اپنے دماغ سے قرآن سمجھ سکتا ہے تو پرویز (علیہ ماعلیہ) نے معارف القرآن لکھ کر حماقت کا ثبوت کیوں دیا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر تو قابل قبول نہ ہو اور اس گستاخ (خاک بدھنش) کی تفسیر قبول ہو۔

بلاشبہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم اپنے قول و فعل سے قرآن مجید کی تشریح فرماتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا تزکیہ فرماتے تھے۔

(۹) وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ الآیۃ (پ ۱۴ ع ۱۲)

اس آیتِ کریمہ سے صاف معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب تبیین و تشریح ہے۔

(۱۰) قرآن حکیم میں جگہ جگہ أَطِيعُوا اللَّهَ کے ساتھ أَطِيعُوا الرَّسُولَ کے الفاظ مذکور ہیں جو صراحۃً حجیت حدیث پر دلالت کرتے ہیں، اس کے بارے میں منکرین حدیث عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ اطاعت بحیثیت حجت فی الشرع ہونے کے نہیں بلکہ بحیثیت مرکز ملت یا حاکم ہونے کے ہے یعنی آپؐ کے ارشادات ایک حکمراں کی حیثیت سے آپؐ کے زمانہ کے لوگوں کے لئے واجب العمل تھے اور آپؐ کے بعد جو بھی حاکم آئے اس کی اطاعت کی جائے گی نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

اس کے دو جواب ہیں، ۱ ایک یہ کہ حاکم کی اطاعت کا ذکر مستقل طور سے آگے کیا گیا ہے یعنی اولی الامر منکم، لہٰذا اطاعت رسول کو اس پر محمول نہیں کیا جاسکتا ہے۔
دوسرے یہاں اطیعوا الرسول میں اطاعت کی علت رسالت ہے نہ کہ حاکمیت۔
(۱۱) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (پ ۵ ع ۶) اس آیت سے صاف واضح ہے کہ آپؐ کے ارشادات کی اطاعت نہ صرف واجب بلکہ مدار ایمان ہے۔
(۱۲) قرآن مجید میں کئی مقامات پر انبیاء سابقین کی احادیث منقول ہیں اور ان کے ارشادات کو ان کی امتوں کے لئے واجب العمل قرار دیا گیا ہے اور نہ ماننے پر عذاب نازل کیا گیا ہے، یہ بات حجیت حدیث کی واضح دلیل ہے۔
(۱۳) انبیاء سابقین میں سے متعدد حضرات ایسے ہوئے ہیں جن پر کوئی کتاب نہیں اتری، اگر ان کے ارشادات واجب العمل نہ تھے تو انھیں بھیجا ہی کیوں گیا؟
(۱۴) قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا واقعہ مذکور ہے جس میں ذبح ولد کا حکم دیا گیا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وحی غیر متلو ہے۔

عقلی دلائل قرآن مجید میں ہر چیز کا بیان اجمالاً ہے اور اس کی تشریح و تفصیل حدیث میں ہے، نمازوں کے اوقات خمسہ، تعداد رکعات فرائض و واجبات کی تفاصیل، صوم و زکوٰۃ کے مفصل احکام، حج کے مناسک قربانی وغیرہ، نیز خرید و فروخت، امور خانہ داری، ازدواجی معاملات اور معاشرت کے قوانین، ان سب امور کی تفصیلات اور ان پر عمل کے طریقے سب احادیث نے بتائے، لہٰذا احادیث حجت نہیں تو اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ پر عمل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صلوٰۃ کے معنی عربی لغت کی رُو سے تحریک الصلوین ہے لہٰذا اقیموا الصلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ رقص کے اڈے قائم کرو تو اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟
نیز بول و براز اور کتے، گیدڑ وغیرہ کی حرمت کا قرآن مجید میں ذکر نہیں، چنانچہ اس اعتراض سے بچنے کے لئے منکرین حدیث ان جملہ اشیاء خبیثہ کی حلت کے قائل ہیں بلکہ محمد صبیح ایڈوکیٹ لکھتا ہے کہ قرآن میں مذکورہ چار چیزوں کے سوا باقی ہر چیز کا کھانا فرض ہے، کھانے سے انکار کرنا گناہ اور خدا کے حکم کی معصیت ہے۔ (ارشاد القاری بحوالہ طلوع اسلام جون ۵۲ء)
یعنی کتا، گدھا، گیدڑ، بلی، چوہا حتی کہ پیشاب پاخانہ وغیرہ کا کھانا فرض ہے۔
اس سے ظاہر ہے کہ منکرین حدیث خدا کے حکم کی معصیت سے بچنے کے لئے فرض اور ثواب سمجھکر مذکورہ چیزیں شبانہ روز مزے لیکر کھاتے ہوں گے۔ سود اللہ وجہہ۔
(۲) مشرکین عرب کی یہ خواہش تھی کہ کتاب اللہ کو بواسطہ رسول بھیجنے کے بجائے براہ راست ہم پر اتارا جائے۔ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں معجزہ بھی زیادہ ظاہر ہوتا اور مشرکین کے ایمان لانے کی امید بھی زیادہ ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔

سوال یہ ہے کہ اگر احادیث حجت نہیں ہیں تو رسول کے بھیجنے پر کیوں اصرار کیا گیا؟

درحقیقت رسول کو اسلئے بھیجا گیا کہ تنہا کتاب کسی قوم کی اصلاح کیلئے کبھی کافی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کوئی ایسا معلم نہ ہو جو اس کے معانی کو متعین کردے اور خود اس کا عملی نمونہ بنکر نکل آئے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کا ہر ہر قول وفعل واجب الاتباع نہ ہو، غور کرنے کا مقام ہے کہ دین اسلام کے بعض احکام وہ ہیں جو قرآن حکیم میں مذکور نہیں صرف احادیث نبوی سے ثابت ہیں، جیسے پنجگانہ نماز کے لئے مخصوص کلمات سے اذان دینا، جو عہد رسالت سے آج تک شعار اسلام رہی ہے اور رہیگی، علیٰ ہٰذا نماز جنازہ، نماز جمعہ، وعیدین کے لئے خطبہ وغیرہ۔

(۳) صحابۂ کرام سے لیکر اب تک تمام امت بلا استثناء احادیث کو حجت مانتی آئی ہے، اگر یہ سب کے سب لوگ گمراہ تھے اور چودہ سو سال کی مدت میں پرویز صاحب (علیہ ما علیہ) کے سوا اسلام کا کوئی سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا تو پھر یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا وہ دین قابل اتباع ہو سکتا ہے، جسے چودہ سو سال تک کسی ایک فرد بشر نے بھی نہ سمجھا ہو۔

منکرین حدیث کے دلائل مع جوابات

(۱) منکرین حدیث اپنی دلیل میں سب سے پہلے یہ آیت پیش کرتے ہیں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ان کا کہنا ہے کہ اس آیت کی رو سے قرآن بالکل آسان ہے، لہٰذا اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے کسی قسم کی تعلیم اور تشریح کی حاجت نہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ قرآن کریم کے مضامین دو قسم پر مشتمل ہیں، کچھ مضامین تو ایسے ہیں جن کا مقصد خوف خدا، فکر آخرت، انابت الی اللہ اور عام نصیحت کی باتیں کرنا ہیں۔

اور کچھ مضامین ایسے ہیں جن میں احکام وشرائع اور ان کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ، کی آیت پہلی قسم کے مضامین سے متعلق ہے نہ کہ دوسری قسم کے مضامین سے جس کی دلیل یہ ہے لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ کے ساتھ لِلذِّكْرِ کی قید بڑھائی گئی ہے، اگر استنباط احکام بھی آسان ہوتا تو یہ قید نہ ہوتی، نیز آگے فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ فرمایا گیا نہ کہ هَلْ مِنْ مُسْتَنْبِطٍ، هَلْ مِنْ مُجْتَهِدٍ

اس کے علاوہ قرآن کریم کی کئی آیتوں میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ کتاب بغیر رسول کے سمجھ میں نہیں آسکتی مثلاً وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ،

(۲) منکرین حدیث کہتے ہیں کہ قرآن نے جگہ جگہ اپنی آیات کو "بیّنات" قرار دیا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ واضح ہے توضیح کی ضرورت نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مضمون ہمیشہ بنیادی عقائد سے متعلق لایا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید اور رسالت اور آخرت کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ ذرا توجہ کی جائے تو دل میں اتر جاتے ہیں، عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی طرح نہیں کہ ساری دنیا ملکر بھی اسے سمجھ نہیں پائی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احکام کے معاملہ میں بھی وہ بالکل آسان ہے

یا ان کی توضیح کیلئے کسی رسول کی حاجت نہیں۔

(۳) منکرین حدیث کہتے ہیں کہ آیت کریمہ "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ" (الآیہ) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انسانوں کی طرح انسان قرار دیا گیا ہے لہذا یہ آیت صریح ہے کہ آپ ص پر نازل ہونے والی وحی متلو تو واجب الاتباع ہے لیکن خود آپ ص کے ارشادات واجب العمل نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہ استدلال آیت کو اس کے سیاق سے الگ کرکے کیا گیا ہے، درحقیقت یہ آیت ان مشرکین کے جواب میں آئی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے، جواب میں فرمایا گیا کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں اس لئے اپنی مرضی سے معجزہ دکھانے پر قادر نہیں، تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مِثْلُكُمْ میں تشبیہ صرف عدم القدرۃ علی المعجزہ بغیر مشیۃ اللہ میں ہے من کل الوجوہ نہیں۔

دوسرے اسی آیت میں دوسرے انسانوں کے ساتھ مابہ الفرق وحی کو قرار دیا گیا ہے اور وحی کا لفظ مطلق استعمال کیا گیا ہے جو وحی متلو اور غیر متلو دونوں کو شامل ہے، لہذا اس سے واجب الاتباع نہ ہونے پر استدلال محض لغو ہے۔

(۴) منکرین حدیث ان واقعات سے بھی استدلال کرتے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل پر قرآن کریم میں عتاب نازل ہوا مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دینا، ان کا کہنا یہ ہے کہ اس واقعہ میں قرآن مجید نے تصریح کردی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ رضاء خداوندی کے موافق نہ تھا، اس لئے آپ ص کے اقوال وافعال کو علی الاطلاق کیسے حجت کہا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان واقعات میں بیشک آپ ص سے اجتہادی لغزش ہوئی جس پر بذریعہ وحی متنبہ کردیا گیا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی واقعہ حجیت حدیث پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جب تک قرآن نے اس لغزش اجتہادی پر تنبیہ نہیں کی اس وقت تک تمام صحابہ رض نے اس حکم پر آپ ص کا اتباع کیا اور جب قرآنی تنبیہ نازل ہوئی تو اس میں آپ ص پر تو بہ محبوبانہ عتاب ہوا کہ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى (الآیہ) لیکن صحابہ رض پر کوئی عتاب نہیں ہوا کہ اس فیصلہ میں انہوں نے آپ ص کی اتباع کرکے اپنا فریضہ ادا کیا تھا اور آپ ص کے فیصلہ کی تمام تر ذمہ داری خود آپ ص پر تھی۔

(۵) منکرین حدیث اس واقعہ سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں آپ ص نے انصار مدینہ کو تابیر نخل سے منع فرمایا صحابہ کرام نے تابیر کو چھوڑ دیا تو پیداوار گھٹ گئی، اس پر آپ ص نے فرمایا "انتم اعلم بامور دنیاکم" یعنی اس معاملہ میں میری اتباع تم پر واجب نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی دو حیثیتیں ہیں، ایک وہ ارشادات جو آپ ص نے بحیثیت رسول بیان فرمائے۔ اور دوسرے وہ ارشادات جو شخصی مشوروں کی حیثیت میں صادر ہوئے، انتم اعلم بامور دنیاکم کا تعلق دوسری قسم کے ارشادات سے ہے اور محل بحث پہلی قسم کے ارشادات ہیں۔ لہذا یہ استدلال درست نہیں ہے۔

اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ یہ پتہ لگانا ہمارے لئے متعذر ہے کہ کونسا ارشاد کس حیثیت کا ہے اس لئے آپ ص کے اقوال وافعال کو علی الاطلاق حجت نہیں کہا جاسکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ص کی اصل حیثیت رسول کی حیثیت ہے

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کو اسی حیثیت پر محمول کر کے حجت قرار دیا جائے گا الا یہ کہ کسی جگہ کوئی دلیل یا قرینہ اس بات پر قائم ہو جائے کہ یہ ارشاد شخصی مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ پورے ذخیرۂ احادیث میں شخصی مشوروں کی مثالیں گنی چنی ہیں، اور ایسے مقامات پر یہ تصریح موجود ہے کہ یہ ارشاد شرعی حکم نہیں بلکہ شخصی مشورہ ہے۔ ان چند مقامات کے سوا باقی تمام ارشادات بحیثیت رسول صادر ہوئے ہیں اور حجت ہیں۔ (ارشاد القاری، درس ترمذی)

نظریہ ثانیہ کی تردید اس نظریہ کے مطابق احادیث نبویہ صحابہ کے لئے حجت تھیں لیکن ہمارے لئے حجت نہیں۔ یہ نظریہ اتنا بدیہی البطلان ہے کہ اس کی تردید کے لئے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت قیام قیامت تک کے لئے عام نہیں بلکہ آپ کی رسالت صرف عہد صحابہ تک مخصوص تھی، حالانکہ مندرجہ ذیل آیات اس کی تردید کر رہی ہیں۔

(۱) قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ (اعراف)

(۲) وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (سورۂ انبیاء)

(۳) وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا (سورۂ سبا)

(۴) تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا (فرقان)

اس کے علاوہ بنیادی سوال یہ ہے کہ فہم قرآن کے لئے تعلیم رسول کی حاجت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو رسول کو بھیجا ہی کیوں گیا؟ اور اگر ہے تو عجیب معاملہ ہے کہ صحابہ کو تو تعلیم کی حاجت ہو اور ہمیں نہ ہو۔ حالانکہ صحابہ نے نزول قرآن کا خود مشاہدہ کیا تھا، اور ہم ان سب چیزوں سے محروم ہیں، اس کے جواب میں منکرین حدیث وہی پرانی بات کہا کرتے ہیں کہ آپ کی اطاعت صحابۂ کرام پر بحیثیت مرکز ملت واجب تھی نہ کہ بحیثیت رسول، لیکن اس کی تردید پہلے کی جا چکی ہے۔

نظریہ ثالثہ کی تردید یہ کہنا بالکل باطل ہے کہ احادیث حجت تو ہیں لیکن ہم تک قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہونچیں، اس پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

(۱) ہم تک قرآن مجید بھی ان ہی واسطوں سے پہنچا ہے جن واسطوں سے حدیث آئی ہے، اب اگر یہ واسطے ناقابل اعتماد ہیں تو قرآن سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ منکرین حدیث اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن نے اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ کہکر اپنی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے، حدیث کے بارے میں ایسی کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی۔

لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ انا لہ لحافظون کی آیت بھی تو ہم تک ان ہی واسطوں سے پہنچی ہے جو بقول آپ کے ناقابل اعتماد ہیں، تو اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ آیت کسی نے اپنی طرف سے نہیں بڑھائی۔

(۲) دوسرا اس میں قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے اور قرآن باتفاق اصولیین نام ہے نظم اور معنی دونوں کا، اس لئے یہ آیت صرف الفاظ قرآن کی نہیں بلکہ معانی قرآن کی حفاظت کی بھی ضمانت لیتی ہے اور معانی قرآن کی تعلیم حدیث میں ہوئی۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ قرآن ذکر ہے اور حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم مبیّن ذکر ہیں اور احادیث نبویہ اس کی تفسیر ہیں

لہٰذا اس آیت سے احادیث کی حفاظت کا وعدہ بھی مفہوم ہوتا ہے۔

تدوین حدیث

منکرین حدیث یہ کہا کرتے ہیں کہ احادیث تیسری صدی ہجری میں مدوّن کی گئیں اس لئے یہ اعتماد نہیں ہے کہ وہ اصلی صورت پر باقی رہی ہوں، لیکن یہ مغالطہ بے بنیاد ہے اس لئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حدیث کی حفاظت کا عہد رسالت سے لیکر اب تک کیا اہتمام ہوا۔

حفاظت حدیث کا راستہ صرف کتابت ہی نہیں ہے بلکہ دوسرے قابل اعتماد ذرائع بھی ہیں اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں حفاظت حدیث کیلئے تین طریقے استعمال کئے گئے، جو درج ذیل ہیں۔

حفظ حدیث

حفاظت حدیث کا پہلا طریقہ احادیث کو حفظ (یاد) کرنا ہے، عہد نبوی میں حدیثوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ صحابہ رضہ حدیثوں کا دور کرتے تھے، چنانچہ حضرت انس رضہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے حدیثیں سنتے رہتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اٹھتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دور کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کل حدیثیں بیان کرجاتا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، بسا اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور ساٹھوں باری باری سے بیان کرتے تھے اس کے بعد جب ہم اٹھتے تھے تو حدیثیں اس طرح ذہن نشین ہوتی تھی کہ گویا ہمارے دلوں میں بودی گئی ہیں، (مجمع الزوائد صہ ۱۶۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضہ فرماتے ہیں انما کنا نحفظ الحدیث والحدیث یحفظ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ (مقدمہ مسلم صہ، ابن ماجہ صہ)

اور یہ طریقہ اس دور کے لحاظ سے انتہائی قابل اعتماد تھا، اہل عرب کو حق تعالیٰ نے غیر معمولی حافظے عطا فرمائے تھے، وہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں تک کے نسب نامے ازبر یاد کرلیا کرتے تھے، ایک ایک شخص کو ہزاروں اشعار حفظ ہوتے تھے اور بسا اوقات کسی بات کو ایک بار سنکر یا دیکھکر پوری طرح یاد کرلیتے تھے، تاریخ میں اس کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں جن میں سے ایک دو یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ عبیداللہ بن عدی بن الخیار کے ساتھ حضرت وحشی رضہ سے ملنے گیا، عبیداللہ نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ تو حضرت وحشی رضہ نے فرمایا کہ میں آپ کو پہچانتا تو نہیں، البتہ مجھے اتنا یاد ہے کہ آج سے سالہا سال پہلے میں ایک دن عدی بن الخیار نامی ایک شخص کے یہاں گیا تھا اس دن عدی کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا، میں اس بچہ کو چادر میں لپیٹ کر اس کی مرضعہ کے پاس لے گیا تھا، بچہ کا سارا جسم ڈھکا ہوا تھا صرف پاؤں میں نے دیکھے تھے، تمہارے پاؤں اس بچہ کے پاؤں کے ساتھ بہت مشابہ ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے جو قوم اتنی معمولی باتوں کو اتنے وثوق کے ساتھ یاد رکھتی ہو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال یاد رکھنے کا کتنا اہتمام کریگی جبکہ وہ انہیں اپنے لئے راہِ نجات سمجھتے ہوں، خاص طور سے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے سامنے آچکا تھا کہ نضّر اللہ امرأ سمع منّا شیئا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی لہ من سامع (رواہ الترمذی وابن ماجہ ورواہ الدارمی عن ابی الدرداء مشکوٰۃ صہ ۳۵)

حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب "الاصابہ" میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ عبد الملک بن مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضؓ کے حافظہ کا امتحان لینا چاہا اور انہیں بلاکر احادیث بیان کرنے کی درخواست کی، حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے بہت سی احادیث سنائیں، ایک کاتب ان کو لکھتا رہا یہانتک کہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ چلے گئے، عبد الملک نے اگلے سال انہیں پھر بلوایا اور ان سے کہا کہ جو احادیث آپ نے پچھلے سال لکھوائی تھیں وہی احادیث اسی ترتیب کے ساتھ سنائیے، حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے پھر احادیث سنانی شروع کیں کاتب اپنی کتاب سے ان کا مطالعہ کرتا رہا، کسی جگہ ایک حرف، ایک نقطہ، ایک شوشہ کی تبدیلی نہیں کی، انتہا یہ ہے کہ ترتیب بالکل وہی تھی اور کوئی حدیث مقدم مؤخر نہیں ہوئی، اس قسم کے حیرت انگیز واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو غیر معمولی حافظے حدیث کے لئے عطا فرمائے تھے، بلاشبہ ایسے حافظے حدیث کے لئے اتنے ہی قابل اعتماد ذرائع ہیں جیسے کتابت۔

دوسرا طریقہ تعامل

حفاظت حدیث کا دوسرا طریقہ جو صحابہ نے اختیار کیا تھا وہ تعامل تھا یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال پر بجنسہا عمل کرکے اسے یاد کرتے تھے، بہت سے صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کوئی عمل کیا اور اس کے بعد فرمایا "ھکذا رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفعل" یہ طریقہ نہایت قابل اعتماد طریقہ ہے اس لئے کہ جس بات پر انسان خود عمل کرے وہ ذہن میں کالنقش علی الحجر ہوتی ہے۔

تیسرا طریقہ کتابت

احادیث کی حفاظت کتابت کے ذریعہ سے بھی کی گئی، اور تاریخی طور پر کتابت حدیث چار مراحل پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) متفرق طور سے احادیث کو قلمبند کرنا۔
(۲) کسی ایک شخصی صحیفہ میں احادیث کو جمع کرنا، جس کی حیثیت ذاتی یادداشت کی ہو۔
(۳) احادیث کو کتابی صورت میں بغیر تبویب کے جمع کرنا۔
(۴) احادیث کو کتابی صورت میں تبویب کے ساتھ جمع کرنا۔

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتابت کی پہلی دو قسمیں اچھی طرح رائج ہوچکی تھیں۔

منکرین حدیث عہد رسالتؐ میں کتابت حدیث کو تسلیم نہیں کرتے اور مسلم شریف کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (مسلم ص۴۱۴ ج۲)

منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کتابت حدیث سے منع فرمانا اس کی دلیل ہے کہ اس دور میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث حجت نہیں ورنہ آپؐ انہیں اہتمام کے ساتھ قلمبند فرماتے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کی یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک قرآن کریم کسی ایک نسخہ میں مدوّن نہ ہوا تھا بلکہ متفرق طور سے صحابہ کے پاس لکھا ہوا تھا، دوسری طرف صحابہ کرام بھی ابھی تک اسلوب قرآن سے اتنے مانوس نہ تھے کہ وہ قرآن اور غیر قرآن میں باوّل نظر تمیز کرسکیں۔ ان حالات میں اگر احادیث بھی لکھی جاتیں تو خطرہ تھا

کہ وہ قرآن کے ساتھ گڈمڈ ہو جائیں، اس خطرہ کے پیش نظر اور اس کے انسداد کے لئے آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت فرمادی لیکن جب صحابہ کرام رضا اسلوب قرآن سے پوری طرح مانوس ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی اجازت بھی دیدی جس کے متعدد واقعات کتب حدیث میں منقول ہیں۔

(۱) ترمذی شریف میں امام ترمذی رح نے ابواب العلم میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ باب ملجاء فی الرخصۃ فیہ" اور اس میں حضرت ابوہریرہ رض کی یہ روایت نقل کی ہے کہ۔

قال کان رجل من الانصار یجلس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث فیعجبہ ولا یحفظہ فشکی ذلك الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ انی لاسمع منك الحدیث فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بیمینك واوما بیدہ الخط (ترمذی جلد ۲ ص۹۱)

(۲) امام ابی داؤد رح اپنی سنن میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ کنت اکتب کل شیئ اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فنھتنی وقالوا اتکتب کل شیئ تسمعہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر یتکلم فی الغضب والرضا فامسکت عن الکتابۃ فذکرت ذلك الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاوما باصبعہ الی فیہ فقال اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق (ابوداؤد جلد ۲ ص۱۵۳ تا ص۱۵۸ کتاب العلم)

(۳) عن ابی ھریرۃ رض ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب فذکر قصۃ فی الحدیث فقال ابو شاہ اکتبوا لی یارسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکتبوا لابی شاہ وفی الحدیث قصۃ ھذا حدیث حسن صحیح (ترمذی جلد ۲ ص۹۱ ابواب العلم) (بخاری ج ۱ باب کتابۃ العلم ص۲۲-۲۱)

یعنی فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور ابو شاہ یمنی کی درخواست پر وہ خطبہ لکھوا کر انھیں دیا۔ ھذا انما یسخ لحدیث النھی عن الکتابۃ واجمع الامۃ علی جوازھا وقیل النھی عن جمعہ مع القرآن فی صحیفۃ لئلا یختلط فیشتبہ لانہ کان وقت نزول القرآن فلما امن نسخ کذا فی المجمع وغیرہ (حاشیہ ترمذی ص۹۱)

اس قسم کی احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت کسی امر عارض کی بنا پر تھی، اور جب وہ عارض مرتفع ہو گیا تو اس کی اجازت بلکہ حکم دیا گیا۔

علامہ نووی رح نے منع کتابت حدیث کی ایک اور توجیہ ذکر کی ہے، اور وہ یہ کہ مطلقاً کتابت کسی بھی زمانہ میں ممنوع نہیں ہوئی بلکہ بعض حضرات صحابہ ایسا کرتے تھے کہ آیات قرآنی لکھنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفسیر بھی اسی جگہ لکھ لیا کرتے تھے، یہ صورت بڑی خطرناک تھی کیونکہ اس سے آیات قرآنی کے ملتبس ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، اس لئے صرف اس صورت کی ممانعت کی گئی تھی، قرآن مجید سے الگ احادیث لکھنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔

علامہ نووی رح کی یہ توجیہ بہت قرین قیاس ہے اور اس کی تائید سنن نسائی کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام نسائی نے "کتاب الصلوٰۃ، باب المحافظۃ علیٰ صلوٰۃ العصر" میں نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ رضہ نے اپنے ایک غلام کو قرآن کریم لکھنے کا حکم دیا اور جب وہ اس آیت پر پہنچا کہ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلوٰةِ الْوُسْطٰى، تو حضرت عائشہ رضہ نے لفظ وسطیٰ کے بعد "وصلوٰۃ العصر" بڑھانے کا حکم دیا۔ ظاہر ہے کہ لفظ العصر قرآن مجید کا جز نہیں تھا بلکہ بطور تشریح بڑھا دیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں چونکہ متن اور شرح میں امتیاز کی وہ علامات رائج نہیں تھیں جو بعد میں رائج ہوئیں، اسلئے یہ لفظ متن ہی کے ساتھ لکھ دیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابہ رضہ بھی آپؐ کی بیان فرمودہ تشریحات اسی طرح لکھ لیتے ہوں گے، ظاہر ہے کہ اگر اس رواج کو عام ہونے دیا جاتا تو متن قرآن کی تعیین اور حفاظت ایک دردِ سر بنجاتی۔ درحقیقت ممانعت کتابت حدیث کے ذریعہ اسی عظیم خطرہ کا سدّباب کیا گیا تھا، لیکن قرآن کریم سے الگ احادیث لکھنے کا رواج ہر دور میں جاری رہا چنانچہ عہد صحابہ میں حدیث کے کئی مجموعے جو ذاتی نوعیت کے تھے تیار ہو چکے تھے، اس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) الصحیفۃ الصادقہ :- مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضہ نے احادیث کا جو مجموعہ تیار کیا تھا اس کا نام "الصحیفۃ الصادقہ" رکھا تھا۔ یہ عہد صحابہ کے حدیثی مجموعوں میں سب سے زیادہ ضخیم صحیفہ تھا، اس کی احادیث کی کل تعداد یقینی طور سے معلوم نہیں ہو سکی، لیکن حضرت ابوہریرہ رضہ کی ایک روایت سے جو صحیح بخاری جلد اول صـ۲۲ کتاب العلم باب کتابۃ العلم وغیرہ میں موجود ہے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ، رای عن النبی م، منّی الاما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب"

اشکال مع جواب بخاری شریف کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضہ کی احادیث حضرت ابوہریرہ رضہ کی احادیث سے زیادہ تھیں، حضرت ابوہریرہ رضہ کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے، لہذا عبداللہ بن عمرو رضہ کی مرویات زیادہ ہونی چاہیے، حالانکہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی مرویات جو کتب حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں ان کی تعداد حضرت ابوہریرہ رضہ کی مرویات سے کم ہے۔

جوابـ۱ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضہ عبادت میں زیادہ مشغول رہتے تھے، تعلیم اور بیان حدیث کی نوبت کم آتی تھی۔ جوابـ۲ کسی کے پاس حدیثوں کا ذخیرہ زیادہ ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ ساری حدیثیں دوسروں کے سامنے روایت بھی کی گئی ہوں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضہ مدینہ طیبہ میں تھے جو اس دور میں طالبان علم دین کا مرکز تھا، اسلئے انھیں روایت حدیث کے مواقع زیادہ ملے، اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمرو رضہ شام و مصر میں رہے جہاں حدیث کے طلبہ کا اتنا رجوع نہ ہو سکا، اسی لئے باوجودیکہ ان کے پاس احادیث کا ذخیرہ زیادہ تھا لیکن مرویات کی تعداد حضرت ابوہریرہ رضہ کی مرویات سے کم رہیں۔

مراکز علم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد علم کے تین مراکز تھے، مدینہ منورہ۱، مکہ معظمہ۲، اور کوفہ۳۔ مکہ مکرمہ کے

صدر مدرس حضرت ابن عباس رضؓ، مدینہ منورہ کے حضرت ابن عمر رضؓ اور زید بن ثابت رضؓ اور کوفہ کے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ تھے۔ (اعلام الموقعین)

بہرحال صحیفہ صادقہ اس زمانہ کا صحیح ترین مجموعۂ حدیث تھا اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضؓ اسے نہایت حفاظت سے رکھتے تھے، ان کی وفات کے بعد یہ صحیفہ ان کے پڑپوتے حضرت عمرو بن شعیب کے پاس منتقل ہوا جو اکثر عن ابیہ عن جدہ کی سند سے احادیث روایت کرتے ہیں، بلکہ حافظ ابن حجر رحؒ نے تہذیب التہذیب میں امام یحییٰ بن معین اور علی بن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ جو حدیث بھی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صحیفہ صادقہ کی حدیث ہے۔

(۲) صحیفہ علی رضؓ ابوداؤد ج ۱ ص ۲۷۸ کتاب المناسک باب فی تحریم المدینہ، کے تحت حضرت علی رضؓ کا یہ قول منقول ہے ماکتبنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا القرآن وما فی ھذہ الصحیفۃ الخ یہی روایت بخاری میں چار مقامات پر اور مسلم میں دو مقام اور نسائی و ترمذی میں بھی تخریج کی گئی ہے۔ حضرت علی رضؓ کا صحیفہ ان کی تلوار کی نیام میں رہتا تھا، اور اس روایت کے متعدد الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دیات اور معاقل، فدیہ اور قصاص، احکام اہل ذمہ نصاب زکوٰۃ اور مدینہ طیبہ کے حرم ہونے سے متعلق ارشادات نبوی درج تھے۔

(۳) کتاب الصدقۃ:- یہ ان احادیث کا مجموعہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود املاء کرائی تھیں، اس میں زکوٰۃ و صدقات اور عشرہ وغیرہ کے احکام تھے اور سنن ابی داؤد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب آپؐ نے اپنے عمال کو بھیجنے کے لئے لکھوائی تھی، لیکن ابھی آپؐ بھجوا نہ سکے تھے کہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس پر عمل کیا، پھر حضرت عمر رضؓ کے پاس آئی، پھر ان کے دو صاحبزادوں حضرت عبد اللہ اور حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہما کے پاس آئی، پھر ان سے حضرت عمر بن عبد العزیز رحؒ نے حاصل کرکے اسی کی نقل کی، اور ان سے حضرت سالم بن عبد اللہ کے پاس منتقل ہوئی، حضرت سالم سے امام ابن شہاب زہری رحؒ نے اسے حفظ کیا اور دوسروں کو پڑھایا۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۱۹)

اس کے علاوہ مختلف صحابۂ کرام رضؓ کے پاس نوشتہ احادیث بھی موجود تھیں۔

(۴) صحیفہ عمرو بن حزم رضؓ:- جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرو بن حزم رضؓ کو نجران کا عامل بنا کر بھیجا تو ایک صحیفہ ان کے حوالہ کیا جو آپؐ کی احادیث پر مشتمل تھا اور اسے حضرت ابی بن کعب نے لکھا تھا ابوداؤد وغیرہ میں اس صحیفہ کے جو اقتباسات آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج و عمرہ، جہاد، سیر و مغانم وغیرہ سے متعلق احادیث درج تھیں۔

(۵) صحیفہ سمرۃ بن جندب رضؓ:- حافظ ابن حجر رحؒ نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے کہ سلیمان بن سمرہ نے اپنے والد سمرہ بن جندب رضؓ سے ایک بڑا نسخہ روایت کیا ہے، اور امام محمد بن سیرین رحؒ فرماتے ہیں کہ ان الرسالۃ التی کتبہا سمرۃ لولدہ لا یوجد فیہا علم کثیر۔

(۶) صحف ابی ھریرۃ رضؓ:- امام حاکم نے مستدرک میں اور علامہ ابن عبد البر رحؒ نے "جامع بیان العلم" میں

حضرت حسن بن عمرو کا یہ واقعہ نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی، حضرت ابو ہریرہ رضہ نے اس حدیث سے ناواقفیت کا اظہار فرمایا، میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ حدیث آپ ہی سے سنی ہے، اس پر حضرت ابو ہریرہ رضہ نے فرمایا کہ اگر یہ حدیث میں نے بیان کی ہوگی تو میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی، چنانچہ وہ کچھ کتابیں نکال کر لائے جن میں احادیث درج تھیں ان میں تلاش کیا تو وہ حدیث مل گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ رضہ کے پاس ان کی تمام مرویات لکھی ہوئی موجود تھیں گویا اس سے پانچہزار تین سو چوہتر ۵۳۷۴ احادیث کے مکتوب ذخیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضہ کا یہ ارشاد پیچھے گذر چکا ہے کہ میں احادیث نہیں لکھا کرتا تھا، پھر اس روایت کی کیا توجیہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضہ عہد رسالت صلعم اور خلفاء کے ابتدائی دور میں احادیث نہیں لکھتے تھے، لیکن آخری عمر میں یہ خیال ہوا ہوگا کہ کہیں میں یہ روایتیں بھول نہ جاؤں، اس لئے انہوں نے اپنی مرویات کو جمع کر دیا، لہٰذا کوئی تعارض نہ رہا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضہ کی طرف کئی صحیفے منسوب ہیں۔

(الف) مسند ابی ہریرہ:۔ امام ابن سعد نے "طبقات" میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے والد عبد العزیز بن مروان نے مصر کی گورنری کے زمانہ میں کثیر بن مرہ کو خط لکھا کہ آپ کے پاس صحابہ کی روایت کردہ جتنی حدیثیں ہوں وہ سب میرے پاس بھیج دیجئے "الا ما کان من حدیث ابی ھریرۃ فانہ عندنا"، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضہ کی مرویات ان کے پاس مکتوب شکل میں موجود تھیں۔

(ب) مؤلف بشیر بن نہیک:۔ حضرت بشیر بن نہیک رح حضرت ابو ہریرہ رضہ کے شاگرد ہیں اور امام دارمی رح نے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں جو کچھ ابو ہریرہ رضہ سے سنتا اسے لکھ لیتا تھا، بعد میں میں نے یہ مجموعہ حضرت ابو ہریرہ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے آپ سے سنی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضہ نے فرمایا "ہاں"

(ج) صحیفہ عبد الملک بن مروان:۔ پیچھے ذکر آچکا ہے کہ عبد الملک بن مروان نے امتحاناً حضرت ابو ہریرہ رضہ کو بلا کر ان کی کچھ روایات لکھ لی تھیں۔

(د) صحیفہ ہمام بن منبہ رح:۔ حضرت ہمام بن منبہ رح بھی حضرت ابو ہریرہ رضہ کے مشہور شاگرد ہیں انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضہ کی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں الصحیفۃ الصحیحہ ذکر کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رح نے اپنی مسند میں اس صحیفہ کو بتمامہا نقل کر دیا ہے۔

امام مسلم رح اپنی صحیح میں بہت سی احادیث اس صحیفہ کے واسطے سے لائے ہیں جب وہ اس صحیفہ کی کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں عن ھمام بن منبہ قال ھذا ما حدثنا بہ ابو ھریرۃ رضہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکر احادیث منھا وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

حسن اتفاق سے چند سال پہلے اس صحیفہ کا اصل مخطوط دریافت ہو گیا ہے، اس کا ایک نسخہ جرمنی میں برلن کے کتبخانہ میں موجود ہے، دوسرا نسخہ دمشق کے کتب خانہ "مجمع علمی" میں سیرت اور تاریخ کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان

دونوں نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا تو کہیں ایک حرف یا ایک نقطہ میں بھی فرق نہیں تھا۔

یہ چند مثالیں اس بات کو واضح کرنے کیلئے کافی ہیں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کا طریقہ خوب اچھی طرح رائج ہو چکا تھا، یہاں ہم نے صرف بڑے بڑے مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انفرادی خطوط تحریر فرمائے، یا کسی کو کوئی بات لکھ کر دی یا کوئی فرامین جاری کئے وہ اس کے علاوہ ہیں، اس کی تفصیل مطولات میں دیکھی جا سکتی ہے (درس ترمذی)

یہ درست ہے کہ تدوین حدیث کی یہ ساری کوششیں انفرادی نوعیت کی تھیں اور غیر مرتب طریقہ پر، عام طور سے کتابی شکل میں احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام نہیں تھا اور فنی حیثیت سے ان کو مستقل کتابیں نہیں کہہ سکتے، یہانتک کہ صحابۂ کرام رضی جہاد و تبلیغ اور تعلیم کے لئے نیز فتوحات ملکیہ کے باعث مختلف بلاد و امصار میں منتشر ہو گئے اور کچھ شہید بھی ہو گئے پھر جب تابعین کا زمانہ آیا اور مختلف فرق باطلہ پیدا ہوئے، خوارج، روافض، معتزلہ قدریہ وغیرہ کے مہیب فتنے سر ابھارنے لگے اور اغراض فاسدہ وعقائد باطلہ کی ترویج کیلئے حدیثیں گڑھنا شروع کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ احادیث کو مدوّن کیا جائے، چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے دل میں جمع احادیث کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنی تمام قلمرو میں تدوین حدیث کا حکم دیا۔

مختصر سیرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ

لسب نامہ عمر بن عبد العزیز بن مروان بن الحکم بن العاص بن امیہ بن عبد شمس۔
ابو حفص کنیت ہے، عمر نام تھا، والد کا نام عبد العزیز اور والدہ کا نام امّ عاصم ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رح کی والدہ محترمہ حضرت عاصم بن عمر بن الخطاب رضی کی صاحبزادی تھیں؛

علامہ ابن جوزی رح نے لکھا ہے کہ ایک روز حضرت عمر فاروق رضی مدینہ طیبہ کا گشت لگا رہے تھے کہ ایک دیوار کے کنارے تھک کر بیٹھ گئے، گھر کے اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھکر دودھ میں پانی ملا دے، لیکن لڑکی نے کہا "امیر المؤمنین نے عام منادی کرادی ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے"، ماں نے کہا، اسوقت عمر رضی اور حضرت عمر رضی کے منادی دیکھ نہیں سکتے تم دودھ میں پانی ملادو، اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں امیر المؤمنین کی اطاعت کروں اور خلوت میں ان کی نافرمانی کا داغ اپنے دامن پر لگاؤں،

بعض کتابوں میں یہ بھی اضافہ ہے کہ اس نے یہ بھی کہا کہ امیر المؤمنین تو نہیں دیکھتے لیکن میرا اور امیر المؤمنین کا اور سب کا خدا تو دیکھتا ہے۔ حضرت عمر رضی نے ساری گفتگو سن لی، اسلم سے کہا، "اس مکان اور دروازہ کو خوب یاد رکھو، صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی نے تحقیق کیلئے بھیجا کہ وہ کون عورتیں ہیں؟ ان کے شوہر ہیں یا نہیں؟ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ماں بیوہ ہے اور لڑکی کنواری، قصہ مختصر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی نے اپنے بیٹے عاصم سے اس کا نکاح کر دیا، اور اسی لڑکی سے حضرت عمر رضی بن عبد العزیز رح کی ماں امّ عاصم پیدا ہوئیں، اور اس لحاظ سے حضرت عمر بن الخطاب رضی حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے

پر نانا ہیں۔

علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رح مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے، راجح یہ ہے کہ ۶۱ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور جب ان کے والد ۶۵ھ میں مصر کے گورنر ہوئے، تو اپنی بیوی امّ عاصم کو لکھا کہ بچہ کو لیکر یہاں آجائیں امّ عاصم نے اپنے چچا عبد اللہ بن عمر رض سے تذکرہ کیا تو چچا نے کہا کہ تم چلی جاؤ اور بچے کو ہمارے یہاں چھوڑ دو، کیونکہ وہ تم سب میں ہم سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، چنانچہ وہ عمر بن عبد العزیز رح کو ان کے پاس چھوڑ کر مصر چلی گئیں، گویا ابتدائی تربیت حضرت ابن عمر رض کی خدمت میں ہوئی، اس کے بعد باپ کے پاس آئے، تھوڑی مدت قیام کیا پھر مدینہ منورہ تعلیم کیلئے بھیجدیئے گئے اور صالح بن کیسان کی تربیت میں رہے، بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کیا، حدیث کی روایت اگرچہ مختلف شیوخ سے کی جن میں تابعین کے علاوہ متعدد صحابہ بھی شامل تھے لیکن وہ اس مقدس فن میں زیادہ تر عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود کے مرہون منت ہیں۔ (کما فی تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صـ۱۱۲)

علامہ ذہبی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے کان اماما فقیها مجتهدا عارفا بالسنن کبیر الشان ثبتا حجة حافظا قانتا للہ اواها منیبا وسیرته تحتمل مجلدا۔

مجاہد رح کا قول ہے کہ ہم عمر بن عبد العزیز کے پاس اس لئے آئے کہ وہ ہم سے کچھ سیکھیں گے مگر ان کے پاس آکر ہم کو خود ان ہی سے بہت کچھ سیکھنا پڑا۔

محمد بن علی بن حسین سے کسی نے ان کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ بنی امیہ کے نجیب ہیں اور قیامت میں بصورۃ امت واحدہ اٹھیں گے۔ اگرچہ حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے فضل و کمال کا سب سے موزوں مظہر مسند درس ہو سکتا تھا لیکن خاندانی تعلقات کی بنا پر مسند حکومت تجویز کیا گیا، ۸۶ھ میں مدینہ طیبہ کے گورنر ہوئے اور بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ۹۳ھ تک مدینہ طیبہ کے گورنر رہے، پھر حجاج کے اشارے پر ولید نے ان کو معزول کر دیا یا انہوں نے استعفا دیدیا، دونوں میں تطبیق بھی ہو سکتی ہے، وللتفصیل مقام آخر۔

۱۰ صفر بروز جمعہ ۹۹ھ کو سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہوا تو اس نے انتقال سے پہلے ہی حضرت عمر بن عبد العزیز رح کو خلیفہ مقرر کر دیا اور ان کی وفات ۲۵ رجب ۱۰۱ھ میں ہوئی، کل خلافت کا زمانہ دو برس پانچ مہینہ چند دن ہوتے ہیں، لیکن تاریخ اسلام میں ان کا دور حکومت اس لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے کہ انہوں نے خلافت راشدہ کے نظم ونسق کو دوبارہ قائم کیا، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں: ولتوسط عمر بن عبد العزیز فنزع الی طریقة الخلفاء الاربعة والصحابة جهده ولم یمهل (مقدمہ ابن خلدون صـ۱۷۲)

یعنی عمر بن عبد العزیز رح مروانی سلسلہ کی درمیانی کڑی تھے، انہوں نے اپنی تمامتر توجہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رض کے طریقہ کی جانب مبذول فرمادی، ذرا سی بھی سستی نہ کی۔

اصلاح کی ابتدا اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان سے کی، سب سے پہلے جب ان کو معلوم ہوا کہ مجھکو خلیفہ بنایا گیا تو اس بار عظیم پر اناللہ پڑھا، سلیمان بن عبد الملک کی تجہیز وتکفین کے بعد شاہی سواریاں جن میں ترکی گھوڑے وغیرہ تھے

حاضر کیے گئے تو ان کو واپس کر دیا اور کہا کہ میرے لیے یہ خچر کافی ہے، افسر پولیس نیزہ لیکر چلا تو اسکو ہٹا دیا اور کہا کہ میں بھی تمام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں، جب گھر میں آئے تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، بیوی نے گھبرا کر پوچھا کیوں خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا، خیریت کہاں ہے میری گردن میں امت محمدیہ کا بوجھ ڈالا گیا ہے ننگے، بھوکے بیمار، مظلوم، مسافر، قیدی، بوڑھے، بچے، کم حیثیت عیالدار وغیرہ کی ذمہ داری مجھ پر آ گئی، اسی خوف سے رو رہا ہوں کہ کہیں قیامت میں مجھ سے پرسش ہو اور میں جواب نہ دے سکوں، پھر آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تمہارے زیورات تمہارے باپ نے بیت المال کے حق سے بنوائے میں تو فیصلہ کر چکا اب تم کو فیصلہ کرنا ہے یا تو زیورات یا میں، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، فوراً بیوی نے زیورات اتار دیئے اور بیت المال میں پہنچا دیا گیا، اسی طرح جو جائدادیں اپنے یا اپنے خاندان کے پاس ناجائز طریقہ سے تھیں سب کو صحیح مصرف میں خرچ کیا، سب کا حق دلایا، بنی ہاشم کے ساتھ بہت مراعات کی، ان کا اعزاز کیا، فدک وغیرہ واپس کیا، شاہی خاندان کے ساتھ کوئی رعایت نہ رکھی اور آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں تمام امور کی جانب اشارہ کر دیا تھا، طبقات ابن سعد میں ان کے خطبہ میں یہ بھی ہے کہ لو ان کل سنۃ یرفعہا اللہ علی یدی ولو ان کل بدعۃ یمیتہا اللہ علی یدی ولو کان آخر ذلک علی قطع لادمی لکان فی اللہ یسیرا، جس کا حاصل یہ ہے کہ میری دلی تمنا ہے کہ ایک ایک سنت کو زندہ کروں اور ایک ایک بدعت کو مٹا دوں، احیاء سنت اور اماتۃ بدعت کیلئے مجھکو اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو یہ اللہ کے راستہ میں آسان ہے، اسی خطبہ میں یہ بھی کہدیا کہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق یاد رکھو کہ احکام الٰہی کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، پھر اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رح جو نظام سلطنت عدل وانصاف کی سطح پر رکھنا چاہتے تھے وہ قائم نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ سابقہ عمال کو معزول نہ کیا جاتا اس لیے اموال مغصوبہ کی واپسی کے بعد یہی کام کیا۔

امام اوزاعی رح فرماتے ہیں کہ ایک روز آپ کے مکان میں بنو امیہ کے اکثر اشراف وسردار بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں تمہیں کسی لشکر کا سردار اور کسی علاقہ کا مالک وحاکم بنا دوں، یاد رکھو میں اس بات کا کبھی روادار نہیں ہوں کہ میرے مکان کا فرش تمہارے پیروں سے ناپاک ہو، تمہاری حالت بہت افسوسناک ہے میں تم کو اپنے دین اور مسلمانوں کے مصالح کا مالک کسی طرح نہیں بنا سکتا، انھوں نے عرض کیا ہم کو بوجہ قرابت کوئی حق اور کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں تمہارے اور ایک ادنیٰ مسلمان کے درمیان میرے نزدیک ایک رتی برابر فرق نہیں، اس قسم کے واقعات تھے جن کی بنا پر خاندان میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں تو کڑک کر ایک خطبہ میں فرمایا " ان فی بنی مروان لذبحا وایم اللہ لو کان ھذا الذبح علی یدی " یعنی معلوم ہوتا ہے کہ احیاء حق کے لیے مجھے اپنے خاندان کو ذبح کرنا پڑیگا، خدا کی قسم اگر اس کی ضرورت پیش آئی تو میں اس سے بھی دریغ نہ کروں گا، خاندان والوں کو یہ بھی خیال ہوا کہ اگر ان کی خلافت کا زمانہ طویل ہوا تو حکومت کا معاملہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور یہ کسی با صلاحیت اور متشرع اور متدین ہی کو اپنا قائم مقام بنائینگے اس لیے ان کو زہر دیدیا گیا قال الجزائری فی توجیہ النظر وکانت مبایعتہ بالخلافۃ فی صفر سنۃ تسع وتسعین

ووفاته لخمس بقين من رجب سنة احدى ومائة وعاش اربعين سنة وكان موته بالسم فان بنى امية ظهر لهم انه ان امتدت ايامه خرج الامر من ايديهم ولو يعهد الا لمن يصلح له فعاجلوه . وفى تذكرة الحفاظ فسموه ۔

علامہ عینی رح جلد اول صـ۱۱۳ میں فرماتے ہیں احد الخلفاء الراشدين ومدة خلافته سنتان وخمسة اشهر نحو خلافة الصديق فملأ الارض قسطا وعدلا ، ملخصا ۔

امام شافعی رح نے بھی ان کو خلیفہ راشد کہا ہے ۔ (تذکرۃ الحفاظ)

ان کے کارنامے کی اہمیت اسوجہ سے بھی زیادہ ہے کہ عبدالملک بن مروان جیسے بادشاہ کے بھتیجے بھی تھے اور داماد بھی، ان کے خاندان کے سبھی لوگ بڑے بڑے عہدوں پر تھے، انھوں نے ایسے وقت میں عدل قائم کیا جبکہ عدل کالعدم ہوچکا تھا علامہ نووی رح نے تہذیب الاسمار میں لکھا ہے کہ یہ پہلی صدی کے مجدد ہیں، امام احمد رح اور بہت سے علمار سے بھی یہی منقول ہے، انھوں نے تدوین حدیث کا حکمنامہ جاری کیا اور جمع شدہ احادیث کے مجموعے تیار کرا کے ممالک محروسہ میں تقسیم بھی کیا (جامع بیان العلم صـ۳۸ وتذکرتفصیلہ) امداد الباری جلد اول ۔

حاصل یہ کہ باضابطہ کتابی شکل میں منظم طور پر تدوین حدیث کی ضرورت کا احساس حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کو ہوا، جو امت کے سب سے پہلے مجدد تھے، چنانچہ آپ نے مدینہ منورہ کے امیر وقاضی ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم الانصاری المتوفی ۱۲۰ھ کو لکھا انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه فانى خفت دروس العلم وذهاب العلماء الخ (بخاری صـ۲۰)

مؤطا امام محمد رح میں بھی یہ خط مروی ہے اور مؤطا میں اس طرح ہے کہ احادیث نبوی یا سنن رسول یا حدیث عمر یا مثل اس کے (دیگر صحابہ کبار کے آثار) سب جمع کر کے لکھو، کیونکہ مجھے علم کے ضائع ہونے اور علمار کے ختم ہوجانے کا اندیشہ ہے ۔ (مؤطا امام محمد صـ۳۹۱)

صحیح بخاری اور مؤطا امام محمد رح میں یہ حکم صرف قاضی مدینہ ابوبکر حزمی رح کے نام آیا ہے لیکن حافظ ابن حجر فتح الباری (مطبوعہ پاکستان) باب کتابۃ العلم صـ۲۰۸ میں فرماتے ہیں ۔ واوّل من دوّن الحديث ابن شهاب الزهرى على رأس المائة بامر عمر بن عبد العزيز ۔ اسی طرح علامہ سیوطی رح نے الفیہ اور تدریب میں امام زہری کو اوّل مدوّن قرار دیا ہے ۔

الغرض اول مدوّن میں دو قول ہیں ۔ ۱ امام زہری رح ۲ ابوبکر حزمی رح، اور دونوں کا زمانہ ایک ہے ۔

بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت کوئی تعارض نہیں ہے اس لئے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے دونوں کو حکم دیا تھا، چونکہ زمانہ دونوں کا ایک ہے ۔ علامہ ابن عبدالبر نے تمہید میں لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر حزمی کو لکھا کہ احادیث کو لکھ کر بھیجو " فتوفى عمر وقد كتب ابن حزم كتبا قبل ان يبعث بها اليه " یعنی ابن حزم نے چند کتابیں لکھی لیکن افسوس یہ ہے کہ جب ان کا یہ کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو عمر بن عبدالعزیز رح وفات پاچکے تھے اس لئے ان کی خدمت میں یہ کتابیں روانہ نہ کرسکے ۔

علامہ ابن عبدالبرؒ جامع بیان العلم میں امام زہری رح کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ہم کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے سنن کے جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، پھر انہوں نے پوری مملکت میں ایک ایک دفتر بھیجدیا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر محدثین نے امام زہری رح کو اول مدوّن کہا ہے، امام مالک رح سے بھی یہی منقول ہے "اول من دون الحدیث ابن شھاب (زہری) کما اخرج ابو نعیم فی حلیۃ الاولیاء عن مالک رح"۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ یہاں ایک مغالطہ کا ازالہ ضروری ہے۔ امام بخاری رح نے "باب کیف یقبض العلم" میں بطور تعلیق حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کا فرمان مذکور (انظر ما کان الخ) کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھایا کہ "ولا تقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی سوائے حدیث رسول ؐ اور کوئی چیز نہ لو" یہاں بعض طلبہ کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ یہ جملہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کا ہی ہے حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ خود امام بخاری رح کی دوسری تعلیق "حدثنا العلاء بن عبد الجبار الخ" سے ظاہر ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رح کا فرمان مذکور ذھاب العلماء تک ہے، چنانچہ حافظ عسقلانی رح فرماتے ہیں "فبقیتہ من کلام المصنف اوردہ تلو کلام عمر" اور اسی کی طرف علامہ قسطلانی رح نے اس مقام پر ان الفاظ سے وضاحت کی ہے۔ "قال الحافظ ابن حجر محتمل ان یکون ما بعدہ لیس من کلام عمر الخ (قسطلانی ص۱۴۵)

حاصل یہ کہ مدوّنین کے پہلے طبقہ میں اولیت ابن شہاب زہری کو ہے جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز المتوفی ۱۰۱ھ کی حیات ہی میں مدوّن کیا اس وقت متعدد صحابی رض دنیا میں تھے، آخری صحابی ابو الطفیل رض کی مکہ معظمہ میں وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی (کما صححہ الذھبی تدریب ص۲۱۲) اس سے ظاہر ہے کہ تدوین حدیث صحابہ کے دور میں ہو چکی تھی اگرچہ بظاہر ترتیب وتبویب (یعنی باضابطہ کتابی شکل میں مرتب) اس دور میں نہ تھی۔

دوسرا طبقہ اس کے بعد ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ وغیرہ کا دور آتا ہے اور ان کو بھی اول مدوّن کہا گیا ہے، حافظ نے مقدمہ فتح الباری میں ان کو اول جامع کہا ہے اور حافظ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "فکانوا یصنفون کل باب علیحدۃ" یعنی ہر باب کی حدیثوں کو الگ الگ لکھتے مثلاً کتاب الصلوٰۃ کو علیحدہ، کتاب الزکوٰۃ کو علیحدہ۔

علامہ چلپی نے کشف الظنون میں ربیع بن صبیح کو اول من صنف فی الاسلام لکھا ہے۔

تیسرا طبقہ اس کے بعد تیسرا طبقہ آتا ہے جنہوں نے مختلف ابواب کو ایک جگہ لکھنا شروع کیا، یہ طبقہ تقریباً ۱۵۰ھ کے بعد شروع ہوتا ہے اس کی بہترین نظیر مؤطا امام مالکؒ ہے، اس طبقہ میں بھی ایک جماعت ہے اس دوسری صدی کی چند مستند کتابیں یہ ہیں۔

(۱) مؤطا امام مالک بن انس رح المتوفی ۱۷۹ھ۔

(۲) مصنف اللیث بن سعد رح المتوفی ۱۷۵ھ۔

(۳) مصنف سفیان بن عیینہ رح المتوفی ۱۹۸ھ۔

(۴) مسند الامام الشافعی رح المتوفی ۲۰۴ھ۔

ان حضرات کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک کو اوّل مدوّن کہا گیا ہے۔ بعض بزرگوں نے تطبیق دی ہے کہ یہ اولیت باعتبار بلاد کے ہے مثلاً مکہ معظمہ میں ابن جریج، شام میں اوزاعی، مدینہ منورہ میں امام مالک، خراسان میں عبداللہ بن مبارک، یمن میں معمر۔

ان حضرات نے مختلف ابواب کو تو جمع کیا لیکن احادیث رسول کے ساتھ آثار صحابہ و تابعین کو بھی جمع کیا، ائمہ کے فقہی اقوال بھی اس میں آگئے۔ اس کے بعد تقریباً ۲۰۰ھ میں ایک جماعت کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ صرف احادیث رسول کو جمع کیا جائے تو عبداللہ بن موسیٰ عبسی نے مسند لکھی، پھر نعیم بن حماد خزاعی نے ایک مسند لکھی، پھر تو مسانید کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بکثرت مسانید لکھی گئیں جن میں مسند ابن حنبل بہت معروف و مشہور ہے۔

ان حضرات نے اگرچہ صرف احادیث مرفوعہ کو جمع کیا لیکن صحت کا التزام نہیں کیا، ان کی کتابیں صحاح، حسان اور ضعاف سب پر مشتمل ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس تیسری صدی میں تدوین حدیث کا کام اپنے شباب پر پہنچ گیا، ایک مرتبہ اسحٰق بن راہویہ رح کی مجلس میں اس کا ذکر ہوا اور کسی نے خیال ظاہر کیا کہ صحیح حدیث کا غیر صحیح سے امتیاز عام لوگوں کے لئے دشوار ہوتا ہے اس لئے کوئی کتاب ایسی ہونی چاہئے کہ جس میں صرف صحیح مرفوعات ہوں، امام اسحاق رح نے اپنے شاگردوں کو خطاب کر کے کہا کہ تم میں سے جو اس کام کو کر سکے ضرور کرنا چاہئے، اس مجلس میں امام بخاری رح موجود تھے، انہوں نے اسی وقت دل میں ارادہ کر لیا اور صحیح مجرد جمع کرنے کا اہتمام کیا پھر تو بہت سے محدثین نے امام بخاری رح کی اقتدار کی، اور صحیح مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، اور ابن ماجہ کی تالیف ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اول مدون کا اطلاق بہت سے لوگوں پر کیا گیا لیکن تحقیق یہ ہے کہ اول مدون علی الاطلاق امام زہری رح یا ابوبکر بن حزم رح ہیں، اس کے بعد ہر باب کو علیحدہ لکھنے والے ربیع بن صبیح، سعید بن ابی عروبہ ہیں، اس کے بعد مختلف ابواب کو جمع کرنے والی ایک جماعت ہے، اس کے بعد صرف احادیث رسول کو جمع کرنے والے اصحاب مسانید ہیں، اس کے بعد صرف صحیح حدیثوں کو جمع کرنے والی ایک جماعت ہے جس کے قائد امام بخاری رح ہیں۔

علامہ سیوطی رح نے الفیہ میں اول مدوّنین کو اشعار میں جمع کر دیا ہے۔ ؎

اول جامع الحدیث والاثر ابن شہاب آمر لہ عمر
واول الجامع للابواب جماعۃ فی العصر ذواقتراب
کابن جریج وھشیم مالک ومعمر وولد المبارک
واول الجامع باقتصار علی الصحیح فقط البخاری

اس میں علامہ سیوطی رح نے اول مدونین کا تین طبقہ قرار دیا ہے، بہر کیف اول میں اختلاف ہوا، اس میں تین طرح سے تطبیق دیگئی، ایک تو یہ کہ آج کی طرح رسل و رسائل کے وسائل نہیں تھے ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق کسی کو اول مدوّن کہا، دوسرے یہ کہ اولیت باعتبار بلاد کے ہے تیسرے یہ کہ اولیت باعتبار انواع کے ہے۔

(نوٹ) ایک الفیہ حافظ ابن حجر کے استاد علامہ عراقی کی ہے اور وہ بہت مشکل ہے جو الفیہ عراقی کے ساتھ مشہور ہے دوسری الفیہ علامہ سیوطی رح کی ہے یہ الفیہ سیوطی کے نام سے مشہور ہے، اور یہ دونوں الفیہ فن حدیث کے اندر ہیں۔ تیسری الفیہ نحو کے اندر ہے جو الفیہ ابن مالک کے نام سے مشہور ہے ان تینوں کو الفیہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ہر ایک کے ہزار اشعار ہیں۔

امام زہری رح هو ابوبكر محمد بن مسلم بن عبيد الله بن عبد الله بن شهاب بن عبد الله بن الحارث بن زهرة الفقيه نسب الى جد جده لشهرته الزهرى نسب الى جده الاعلى زهرة بن كلاب وهو من رهط آمنة ام النبي صلى الله عليه وسلم اتفقوا على اتقانه وامامته (فتح الباری ص۲۲)

کتابوں میں اکثر ابن شہاب یا زہری ملتا ہے، کہیں محمد بن مسلم بھی ہے سب سے مراد ایک ہی ہیں، ان کے دادا بہت مشہور تھے اس نسبت سے ابن شہاب کہا جاتا ہے، اور ان کے جد اعلیٰ زہرہ بن کلاب تھے اس لئے زہری کہا گیا محمد بن مسلم نام ہے۔

امام زہری رح کی پیدائش ۵۰ھ میں اور وفات ۱۲۵ھ میں ہوئی۔

ترجمۃ الامام البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ

ولادت صدق ۱۹۴   عمر مبارک حمید ۶۲ سال   وفات نور ۲۵۶ھ

امام بخاری رح کا نام محمد ہے، کنیت ابو عبد اللہ، لقب امیر المؤمنین فی الحدیث، نیز محدثین کرام و علماء اسلام سے یہ القاب بھی منقول ہیں۔ ۲ ناصر الحدیث النبویہ۔ ۳ ناشر المواریث المحمدیہ، لیکن مشہور و معروف لقب امیر المؤمنین فی الحدیث ہی ہے۔

سلسلہ نسب امیر المؤمنین فی الحدیث ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن بردزبۃ الجعفی البخاری۔
جعفی: یا نسبتی ہے جعف عرب کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔

امام بخاری رح کے پردادا مغیرہ نے یمان جعفی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا جو اس وقت بخارا کے حاکم تھے اور پھر بخارا ہی میں سکونت پذیر ہو گئے، اور چونکہ عرب کا یہ دستور تھا کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا اسی سے نسبت ولاء متعلق ہو جاتی تھی۔ حضرات احناف اسی کے قائل بھی ہیں اور اس سلسلہ میں احناف کے پاس ابو داؤد شریف کی روایت ہے۔

عن تميم الداري انه قال يارسول الله ما السنة في الرجل يسلم على يدى الرجل من المسلمين قال هو اولى الناس بمحياه ومماته۔ (ابو داؤد جلد ثانی کتاب الفرائض)

حضرت تمیم داری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ اس شخص کے بارے میں کیا طریقہ ہے جو مسلمانوں میں سے کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے؟ فرمایا وہ مسلمان تمام لوگوں میں سب سے اولیٰ ہے اس کی زندگی اور موت میں۔

لیکن ان کے والد بردزبہ (بفتح الباء الموحدہ وسکون الراء المہملہ وکسر الدال المہملہ وسکون الزاء المعجمہ وفتح الباء الموحدہ بعدہا ھا، فتح، قس) فارسی النسل مجوسی تھے اور انتقال بھی حالتِ کفر ہی میں ہوا۔

لفظ بُردزبہ فارسی میں کاشتکار کو کہتے ہیں، بردزبہ کھیتی کرتے تھے۔

ابراہیم یعنی امام بخاری رح کے جدامجد کے متعلق حافظ عسقلانی رح نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ ان کا حال معلوم نہیں ہوسکا البتہ امام علیہ الرحمہ کے والد ماجد حضرت العلامہ اسماعیل رح محدثین کبار میں شمار کئے جاتے تھے، بہت محدثین ان سے روایت کرتے ہیں، جلیل القدر محدث تھے ان کی کنیت ابوالحسن تھی یہ امام مالک رح کے شاگرد تھے اور حضرت عبداللہ بن مبارک رح سے بھی شرف صحبت حاصل رہا ہے۔ علامہ ذہبی رح کی تاریخ الاسلام اور خود تاریخ بخاری میں اس کی تصریح ہے کہ ابن مبارک کی صحبت رہی ہے، آپ ستودہ صفات بڑے متقی تھے آپ کے ایک شاگرد احمد بن حفص کا بیان ہے کہ میں وفات کے وقت حاضر خدمت تھا اس وقت اسماعیل نے فرمایا کہ میں اپنے کسب کردہ مال میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں پاتا۔ گو یہ معمولی بات ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت اہم اور بڑی چیز ہے کہ کوئی درہم مشتبہ بھی نہ ہو حرام تو درکنار۔

امام کی پرورش اس مال سے ہوئی تھی، والدین کے تقوی اور اخلاص کا اثر بلاشبہ اور ضرور اولاد پر ہوتا ہے کما فی القرآن الحکیم "والذین آمنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنا بهم ذریتهم"

امام کے مختصر حالات

امام بخاری رح ۱۹۴ھ میں ۱۳ شوال المکرم بعد نماز جمعہ شہر بخارا میں جلوہ فرمائے عالم ہوئے ایک طرف شوال المکرم ہے جو اشہر حرم کا پہلا مہینہ ہے اور دوسری طرف جمعہ ہے جو دوسرے دنوں پر فضیلت رکھتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رح کی تاریخ پیدائش بھی ممتاز خصوصیت رکھتی ہے۔

آپ لاغر جسم اور میانہ قدوقامت تھے، طبعاً صفائی پسند اور انتہائی سادہ، ڈاڑھی مبارک گنجان تھی، چہرۂ انور کو دیکھتے ہی انسانی نگاہ عقیدت ومحبت سے جھک جاتی تھی، سخاوت خاندانی ورثہ میں ملی تھی۔

امام بخاری رح کمسن ہی تھے کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا اور آپ کی تعلیم وتربیت کی ساری ذمہ داری والدۂ محترمہ پر آگئی، امام کی والدہ ماجدہ بڑی عبادت گذار وخدا رسیدہ خاتون تھیں، امام بخاری رح بچپن ہی میں کسی عارضہ کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے جس سے والدہ کو غیر معمولی صدمہ ہوا، شوہر یعنی حضرت اسماعیل رح کی وفات کا صاعقہ ہی کچھ کم نہ تھا کہ ادھر نورِ چشم لختِ جگر کی بینائی بھی جاتی رہی، بہت علاج کرایا گیا لیکن بینائی سے محرومی رہی، امام کی والدہ نے خوب رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں بیٹے کی بینائی کے لئے دعائیں مانگی، ایک رات حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ وعلیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا وہ فرما رہے ہیں کہ تمہاری دعائیں قبول ہوگئیں اور تیرے لختِ جگر کو پھر نورِ بصارت سے نواز دیا گیا ہے، چنانچہ صبح کو دیکھا کہ امام کی آنکھیں درست تھیں بینائی واپس آ گئی تھی اور قوت بینائی ایسی ہوئی کہ تاریخ کبیر کا مسودہ چاندنی رات میں لکھا۔

اب امام پانچ سال کی عمر میں مکتب کے سپرد کئے گئے، اور عمر کے دسویں سال میں مکتب کی تعلیم سے فارغ ہوگئے۔

امام بخاری رح کے شاگرد صاحب نسخہ فربری رح کا بیان ہے کہ میں نے ابو جعفر محمد بن حاتم وراق سے سنا

وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے خود امام بخاری رح سے سوال کیا "کیف کان بدء امرك؟" یعنی آپ اس شان تک کیسے پہنچے؟ جواب میں فرمایا، "الهمت حفظ الحديث وانا في الكتاب (المكتب)، قلت وكم اتى عليك اذ ذاك فقال عشر سنين او اقل" یعنی میں ابھی مکتب ہی میں تھا کہ میرے دل میں حفظ حدیث کے اہتمام کا القار کیا گیا حالانکہ میری عمر اس وقت دس برس یا اس سے بھی کم تھی، چنانچہ مکتب کے زمانہ میں متفرق طور پر جہاں کہیں کوئی حدیث ملتی تھی تو فوراً اس کو یاد کر لیتا تھا، کمسنی ہی سے احادیث نبوی کا بے حد شوق تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رح کی تخلیق ہی علم حدیث کے لیے کی گئی تھی، چنانچہ دس سال کی عمر میں مکتب سے فارغ ہو کر درس حدیث کے مختلف حلقوں میں شامل ہونے لگے، ۲۰۵ھ میں یعنی گیارہ سال کی عمر میں ایک روز محدث داخلی کے درس میں گئے، جن کا حلقہ اس وقت سب سے بڑا تھا محدث داخلی نے کسی حدیث کی سند اسطرح بیان کی "حدثنا سفيان عن ابي الزبير عن ابراهيم" امام بخاری رح نے ایک کونے سے عرض کیا "سند اس طرح نہیں ہے کیونکہ ابو الزبیر کی ملاقات ابراہیم سے ثابت نہیں ہے، محدث داخلی نے امام بخاری کو ایک طفل مکتب سمجھ کر ڈانٹ دیا لیکن امام بخاری نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ اگر آپ کے پاس اصل بیاض موجود ہو تو مراجعت فرمالیں، بات معقول تھی، محدث داخلی اٹھے اور بیاض دیکھنے پر معلوم ہوا کہ امام بخاری کی بات درست ہے پھر محدث داخلی نے فرمایا کہ "لڑکے اصل سند کیا ہے؟ امام بخاری نے کہا الزبير هو ابن عدي عن ابراهيم. محدث داخلی نے تصدیق کی، گویا حضرت استاد محدث داخلی کو علامہ ابو الزبیر اور زبیر بن عدی میں التباس پیدا ہوا، پھر تو امام بخاری مقبول نظر ہو گئے، کسی نے امام بخاری سے پوچھا کہ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ فرمایا "گیارہ سال"، یہ امام بخاری رح کی شہرت کا پہلا دن تھا اور اسی دن سے امام بخاری کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ امام بخاری جب اکابر محدثین کے درس میں پہنچ جاتے تو وہ سنبھل جاتے۔

امام بخاری رح کے حافظے کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، چند واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

علامہ قسطلانی رح نے نقل کیا ہے کہ امام کو بچپن ہی میں ستر ہزار حدیثیں یاد تھیں، حافظ عسقلانی نے بیان کیا ہے کہ حاشد بن اسماعیل کا بیان ہے کہ امام بخاری ہمارے ساتھ بصرہ کے مشائخ کے پاس جایا کرتے تھے، ہم لوگ تو لکھتے تھے لیکن امام بخاری رح کچھ نہ لکھتے تھے، ہم لوگ طعن کے طور پر کہا کرتے تھے کہ جب آپ کچھ لکھتے نہیں ہیں تو خواہ مخواہ تضییع اوقات کیوں کرتے ہیں؟ ایک روز بخاری کو جوش آیا اور کہا کہ تم نے بہت کچھ کہہ لیا، لاؤ دیکھوں تم نے کیا لکھا ہے، ہم نے ضبط کردہ تحریریں دکھا دیں، جو پندرہ ہزار سے بھی کچھ زائد حدیثیں تھیں، بخاری نے تمام حدیثوں کو اپنے حفظ سے فرفر سنانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ہم نے اپنی نوشتہ تحریروں کی ان کے حفظ سے اصلاح کی۔

(ہدی الساری مقدمہ فتح الباری)

بغداد شریف علوم اسلامیہ کا مرکز تھا، حدیث کے بکثرت شیوخ وہاں موجود تھے جب امام بخاری رح بغداد شریف پہنچے، تو ان کا امتحان لیا گیا، وہاں کے علماء نے سو حدیثوں کو منتخب کیا اور پہلے ہی سے دس آدمیوں کو دس دس حدیثیں یاد کرادی، اس طرح سے کہ متن وسند کو منقلب کر دیا، ایک کی سند دوسرے کے متن کے ساتھ جوڑ دیا جب

امام، جب تشریف لائے اور مجلس منعقد ہوئی تو ان دس آدمیوں نے غلط سلط حدیثیں باری باری پڑھنا شروع کیں، ہر حدیث پر امام بخاری فرماتے "لا اعرفہ" عوام میں تو مختلف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، لیکن علمار محققین نے اندازہ کر لیا کہ کامل ہیں، جب ہر ایک نے تمام حدیثیں سنالیں تو امام بخاری نے نمبر وار ہر ایک کو بلایا اور فرمایا کہ تم نے پہلی روایت اس طرح پڑھی یہ غلط ہے۔ صحیح اس طرح ہے۔ اسی طرح ترتیب وار دسوں کی اصلاح کی، اب سب پر واضح ہو گیا کہ یہ ماہر فن ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں تعجب اس پر نہیں کہ انھوں نے غلطی کی اصلاح کی وہ تو حافظ حدیث تھے ان کا تو کام ہی یہ ہے، تعجب تو حقیقت میں اس بات پر ہے کہ غلط احادیث کو ایک ہی مرتبہ سن کر ترتیب وار محفوظ رکھا۔

امام نے پہلے تمام کتب متداولہ اور مشائخ بخارا کی کتابوں کو محفوظ کر لیا، پھر سولہ برس کی عمر میں حجاز کا قصد کیا۔ کما صرح بہ الحافظ ابن حجر رح۔

سولہ برس کی عمر ۲۱۰ھ میں حج بیت اللہ کا ارادہ کیا والدہ ماجدہ اور بھائی احمد کے ساتھ۔ والدہ اور بھائی احمد فراغت حج کے بعد وطن واپس آگئے، اور امام نے مکہ معظمہ میں طلب علم کے لیے قیام کیا، ۲۱۲ھ میں مدینہ منورہ کا سفر کیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں قضایا الصحابہ والتابعین لکھی جس سے امام کی عظیم الشان شہرت ہوئی، اور اسی سفر میں امام بخاری نے مدینہ طیبہ ہی کے اندر "تاریخ کبیر" کا مسودہ چاندنی رات میں لکھا یہ امام کی دوسری تصنیف ہے۔ بقول امام بخاری حجاز کی مدتِ اقامت چھ سال ہے لیکن پوری مدت ایک سفر کی نہیں ہو سکتی، ہو سکتا ہے کہ درمیان میں کسی دوسری جگہ کا سفر بھی پیش آیا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اقامت حجاز کی مجموعی مدت چھ سال ہے، مدینہ طیبہ کے بعد بصرہ کا رخ کیا، امام کا خود بیان ہے کہ میں بصرہ چار مرتبہ گیا اس کے بعد کوفہ کا قصد کیا، وراق بخاری نے کوفہ اور بغداد کے متعلق امام کا یہ مقولہ نقل کیا ہے لا احصی کم رحلت الی الکوفۃ وبغداد مع المحدثین (میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں محدثین کے ہمراہ کوفہ اور بغداد کتنی بار جا چکا ہوں)

رحلت اصطلاح محدثین میں اس سفر کو کہتے ہیں جو طلب حدیث کیلئے یا حدیث کی اعلیٰ سند کو حاصل کرنے کے لیے ہو، صحابہ کرام اور تابعین عظام کو اس کا خاص جذبہ رہا ہے۔

امام بخاری رح کو اس سلسلہ میں طویل اسفار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ امام بخاری رح کا دور تعلیم فتوحات کا دور تھا اور مملکت اسلامی کی وسعت کی وجہ سے حاملین حدیث دور دور تک پھیل گئے تھے، کتب حدیث و تاریخ سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ایک ایک حدیث کیلئے ایک ایک ماہ کی مسافت کا سفر کرتے تھے، بخاری شریف جلد اوّل صـ۱ میں ہے رحل جابر بن عبد اللہ مسیرۃ شہر الی عبد اللہ بن انیس فی حدیث واحد" قرآن حکیم نے بھی فلولا نفر من کل فرقۃ الخ سے تفقہ فی الدین کے لیے سفر کی تاکید کی ہے۔

ایسے سفر کے لیے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم رح کا مقولہ ہے کہ اصحاب حدیث جو سفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے اس امت کی بلاؤں کو اٹھا لیتے ہیں۔

امام بخاری رح کو طلب علم کے دوران فاقہ بھی کرنا پڑا، درخت کے پتے اور گھاس بھی کھانی پڑی، فاقہ کے وقت کپڑے بھی بیچنے پڑے مگر ان کے پایۂ استقلال میں ذرا بھی تذبذب نہ پیدا ہوا، اور سالن تو تقریباً زندگی کے اکثر حصہ میں استعمال ہی نہ کیا۔

ایک مرتبہ امام بخاری رح بیمار ہوئے تو ان کا قارورہ اطبار کو دکھایا گیا تو انہوں نے کہا "یہ قارورہ ان پادریوں کا معلوم ہوتا ہے جو سالن کبھی نہیں کھاتے، امام بخاری نے تصدیق کی اور کہا کہ میں نے چالیس برس سے سالن استعمال نہیں کیا ہے، اطبار نے سالن تجویز کیا لیکن امام بخاری رح نے اس آرام طلبی کو منظور نہ کیا، صرف اتنا منظور فرمایا کہ روٹی کو شکر کے ساتھ کھالوں گا حقیقت یہی ہے کہ "لا ینال العلم براحة الجسم" عیش و آرام، راحت طلبی میں علم نہیں ملتا، علم کی دولت تو نہایت جد وجہد، تکلیف و مشقت سے ملتی ہے، امام بخاری رح اسی سے لئے امیر المومنین فی الحدیث ہو گئے، اور ان کی تعریف بڑوں نے بھی کی اور چھوٹوں نے بھی، امام احمد بن حنبل رح فرماتے ہیں "ما اخرجت خراسان مثل محمد بن اسماعیل"۔

امام مسلم رح فرماتے ہیں "اشهد انه ليس في الدنيا مثلك"۔ حاکم ابو عبد اللہ نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام مسلم امام بخاری کے پاس آئے اور دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بوسہ دیکر فرمایا "دعني اقبل رجليك یا استاذ الاستاذین و یا سید المحدثین و یا طبیب الحدیث فی علله"۔

احادیث میں اشارہ

چونکہ امام بخاری رح اہل فارس میں سے ہیں اور سلمان فارسی رض کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لو كان الدين بالثريا لناله رجال من ابناء فارس" علماء محدثین فرماتے ہیں کہ اس کے اولین مصداق امام اعظم ابو حنیفہ رض پھر امام بخاری رح ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں ہے "و آخرین منهم لما يلحقوا بهم" صحابہ کرام رض نے اس آیت کے متعلق عرض کیا تو حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "رجال من ابناء فارس" اس کے بھی مصداق امام الائمہ امام ابو حنیفہ اور امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہم اللہ ہیں۔

وراق بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ کہیں تشریف لیجا رہے ہیں اور امام بخاری رح آپ کے پیچھے قدم بقدم چلتے ہیں، اس سے امام بخاری رح کا متبع سنت ہونا ظاہر ہے۔

فربری رح کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "این ترید؟" میں نے عرض کیا: محمد بن اسماعیل بخاری کے پاس جا رہا ہوں تو ارشاد فرمایا "اقرء له مني السلام"۔

حقیقت یہ ہے کہ متبع سنت اور احیائے سنت کرنے والے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوتے ہیں، امام بخاری رح اتباع سنت بھی کرتے تھے اور احیائے سنت بھی۔ اور بخاری جیسی عظیم الشان کتاب اور دوسری کتب لکھکر دین کی خدمت بھی کی اور حدیث کی تعلیم بھی دیتے رہے، اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سلام کی بشارت بھی ملتی ہے۔

احتیاط و تقویٰ

امام بخاری رح جس طرح علم و فضل اور کمال میں اعلیٰ و ارفع تھے اسی طرح پرہیزگار و محتاط بھی تھے فرماتے ہیں "ما اغتبت احدا منذ علمت ان الغيبة حرام" یہ بھی فرمایا کرتے تھے ان شاء اللہ غیبت کے معاملہ میں قیامت کے دن کسی کا ہاتھ میرے دامن میں نہ ہوگا، یا میرا دامن کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگا۔ اس سے ہم طالب علموں کو نصیحت و عبرت حاصل کرنا چاہیئے کہ جس فاضل اجل کی عظیم کتاب ہم پڑھتے ہیں اس نے تو کسی کی ایک مرتبہ بھی غیبت نہ کی اور ہم رات دن غیبت میں منہمک رہتے ہیں تو بھلا ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ کسی کی غیبت سے پہلے سوچ لینا چاہیئے کہ ہم جس کی غیبت کرتے ہیں اس کا تو کچھ نقصان نہیں ہوتا البتہ اپنا ہی نقصان ہے کہ قیامت کے دن دوسرے کو ہماری نیکیوں پر تسلط

کردیا جائیگا، امام الائمہ امام ابوحنیفہ رح بھی اس سلسلہ میں بہت محتاط تھے، سفیان ثوری سے کسی نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رح کسی کی غیبت نہیں کرتے تو جواب دیا کہ وہ بہت عقلمند ہیں کہ اپنی نیکیوں پر کسی کو مسلط نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس دور میں تباغض و تحاسد کی کثرت ہے اسی وجہ سے غیبت میں بھی ابتلار زیادہ ہے، مثل مشہور ہے العلماء اشد الناس تباغضا و تحاسدا، حالانکہ علمار کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے، حسد سے کبھی دوسرے کا تو نقصان ہوتا نہیں البتہ حاسد کی نیکیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں الحسد یا کل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔ شیطان حب جاہ، حسد و تکبر میں مارا گیا، علمار کو اسی میں مبتلا کرکے ہلاک کرنا چاہتا ہے ہم کو امام بخاری رح کی سیرت سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ حسد، تکبر، غیبت، حب جاہ صرف معصیت اور حرام ہی نہیں بلکہ معاصی کی جڑ ہیں، علم کے لئے قوت یاد داشت ضروری ہے اور گناہوں سے حافظہ خراب ہو جاتا ہے۔ ؎

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فاوصانی الیٰ ترک المعاصی
فان العلم فضل من الٰہ وفضل اللّٰہ لا یعطی لعاصی

علمی وقار کی حفاظت

حافظ ابن حجر نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے، امام بخاری رح کو ایک مرتبہ دریا کا سفر پیش آیا، امام ایک ہزار اشرفیاں لیکر بحری جہاز میں سوار ہوئے، ایک شخص نے عقیدت مندی کا اظہار کیا اور اتنی نیازمندی ظاہر کی کہ امام کو اس پر اعتماد ہو گیا، اپنے پورے حالات اس کو بتا دئے یہ بھی بتا دیا کہ میرے پاس ایک ہزار اشرفیاں ہیں، ایک صبح جب وہ مکار اٹھا تو رونا چلانا شروع کیا اور کہنے لگا کہ میری ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی غائب ہو گئی، اس کے حال زار پر کشتی والوں کو رحم آیا، جہاز والوں کی تلاشی شروع ہوئی، امام نے موقعہ دیکھکر چپکے سے وہ تھیلی سمندر میں گرادی، امام کی بھی تلاشی لی گئی، لیکن جب کسی کے پاس وہ تھیلی نہ ملی تو کشتی والوں نے اس کو ملامت کیا۔ جہاز سے اترنے کے بعد وہ امام کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے، حضرت وہ اشرفیاں کیا ہوئیں؟ امام نے فرمایا کہ سمندر میں گرادی، اس نے کہا اتنی بڑی رقم کا ضیاع؟ امام نے فرمایا کہ جس دولت ثقاہت پر میں نے اپنی پوری زندگی ختم کردی وہی میری اصل کمائی ہے اس کو چند اشرفیوں کے عوض برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس سے ہم کو سبق لینا چاہیے کہ ہم اپنے برسہا برس کے علمی وقار کو روپے پیسوں کے عوض برباد نہ کریں، واقعات تو بہت سے ہیں لیکن ایک واقعہ اور سنیے، مقدمہ لامع میں ہے، منقول ہے کہ امام بخاری رح کے والد ماجد نے کافی مال چھوڑا تھا مگر امام نے یہ خیال فرمایا کہ میں تجارت میں مشغول ہوتا ہوں تو علمی نقصان ہوگا، اس لئے اپنا مال مضاربت پر دیدیا۔ ایک مرتبہ ایک مضارب نے پچیس ہزار لیکر دوسرے ملک میں سکونت اختیار کرلی، امام سے لوگوں نے کہا کہ مقامی حاکم کا خط لیکر اس علاقہ کے حاکم کے پاس پہنچادو، روپیہ آسانی سے مل جائیگا امام بخاری نے فرمایا اگر میں اپنے روپے کیلئے حکام سے سفارش لکھواؤں تو کل یہ حکام میرے دین میں دخل دینگے، اور میں اپنے دین کو دنیا کے عوض میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

پچیس ہزار کا یہ معاملہ اور امام کی یہ ہمت ہمارے لئے سبق آموز ہے (امداد الباری جلد اول)

مسئلہ خلق قرآن اور نیشاپور کا فتنہ

مسئلہ خلق قرآن ایک اہم مسئلہ ہے جو عقائد کی کتابوں میں موجود ہے، صاحب روح المعانی نے بھی اس کو مقدمہ میں بیان کیا ہے خود امام بخاری رحنے بھی "کتاب خلق افعال العباد" میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور محدثانہ رنگ میں باطل عقائد کی تردید کی ہے، بخاری شریف "کتاب الرد علی الجھمیہ" میں بھی مختلف عنوان سے اس کی طرف توجہ فرمائی ہے، اس مقام پر مفصل بحث مقصود نہیں ہے اور نہ ہی اس وقت اس کی چنداں ضرورت ہے۔

مختصر یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی صفت ہے، اللہ تعالیٰ قدیم ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی صفت بھی قدیم ہوگی لہٰذا قرآن قدیم غیر مخلوق ہے، اہل سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے۔ معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن مخلوق ہے، حادث ہے ایک زمانہ میں یہ فتنہ بہت شدت پر تھا حتیٰ کہ حکومت وقت بھی معتزلہ کے دام تزویر میں مبتلا ہو گئی، اس وقت کے علماء نے جان ہتھیلی پر رکھکر اس فتنہ کا مقابلہ کیا، بالخصوص امام احمد بن حنبل رحنے اس میں بہت اہم جدوجہد کی اور بہت تکلیفیں اٹھائیں یہانتک کہ یہ فتنہ ختم ہو گیا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی بدعت میں ابتلاء زیادہ ہو تو علماء برحق کو اس میں زیادہ شدت اختیار کرنی پڑتی ہے اور فاسد عقیدہ کی ہر رگ پر نشترزنی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ کوئی شخص کسی موہم لفظ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے اس لئے امام احمد رحنے کہا کہ جو شخص یہ کہے کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" تو وہ جہمیہ میں سے ہے اسی طرح جو لوگ اس مسئلہ میں سکوت کرنا چاہتے تھے ان پر بھی نکیر کی اس لئے کہ خطرہ تھا کہ ان کے سکوت سے لوگ غلط فائدہ اٹھائیں گے، بعض مبتدعین "القرآن بلفظی مخلوق" کہتے تھے تو احتیاطاً امام احمد رحنے لفظی بالقرآن سے بھی منع فرمادیا حالانکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے لیکن فرق ہر شخص پر ظاہر نہیں ہوتا۔

بہرکیف معتزلہ کا فتنہ تو ختم ہو گیا لیکن امام احمد بن حنبل رحکے بعض معتقدین نے اس مسئلہ میں بہت غلو کیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن پڑھتے وقت جو آواز انسان کی ہوتی ہے وہ بھی قدیم ہے (مقدمہ لامع ص۵۱)

حافظ عسقلانی رحمقدمہ فتح الباری ص۴۹۱ میں لکھتے ہیں کہ حاکم ابو عبداللہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ امام بخاری نیشاپور میں ۲۵۰ھ میں تشریف لائے ان کی تشریف آوری سے پہلے محمد بن یحییٰ ذہلی رح (دہر ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن خالد الذہلی النیساپوری) نے اپنی مجلس میں اعلان کیا جو محمد بن اسماعیل کا استقبال کرنا چاہتا ہے وہ استقبال کرلے میں خود ان کے استقبال کے لئے جانے والا ہوں، چونکہ امام ذہلی نیشاپور کے معروف و مشہور محدث تھے، عوام و خواص کے مرجع اعظم تھے اس لئے ان کی ترغیب پر بہت بڑا مجمع گیا اور امام بخاری رح اس شان سے نیشاپور آئے کہ اس وقت تک اس شان و شوکت کا استقبال نیشاپور کی تاریخ میں نہ کسی عالم کا ہوا تھا اور نہ کسی حاکم کا، دو دو منزل تین تین منزل سے لوگ استقبال کے لئے حاضر ہوئے، اور بخاریوں کے محلہ میں اترے۔ امام ذہلی رحنے لوگوں کو تنبیہ کر دی تھی کہ امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث سنو، لیکن علم کلام کا کوئی مسئلہ نہ پوچھنا، خدانخواستہ اگر ہمارے خلاف کوئی بات ان کی زبان سے نکلی تو رافضی، ناصبی، مرجی اور جہمی خوش ہوں گے۔

بہرکیف امام کی خدمت میں لوگ بکثرت حاضر ہونے لگے، مکان چھتیں سب بھر جاتیں، حتیٰ کہ نیشاپور کے رہنے والے امام مسلم رح جو خود ایک امام کا درجہ رکھتے ہیں امام بخاری رح کے درس میں شریک ہو کر تلمذ اختیار کیا، دوسرے یا تیسرے دن ایک آدمی اٹھا اور اس نے

کہا" لفظ بالقرآن کے متعلق کیا خیال ہے؟ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ امام بخاری رح نے فرمایا " افعالنا مخلوقة والفاظنا من افعالنا" اسی میں شور و شغب ہو گیا، کسی نے کہا لفظی بالقرآن مخلوق کہا، کسی نے کہا یہ نہیں کہا، یہاں تک کہ دست بگریباں ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو گھر والوں نے سب کو نکالدیا۔ ابواحمد بن عدی بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے مشائخ کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ امام بخاری رح کی مقبولیت عامہ سے بعض شیوخ وقت کو حسد ہو گیا اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ امام بخاری کہتے ہیں کہ لفظی بالقرآن مخلوق ہے۔ دوسرے یا تیسرے دن ایک آدمی نے اٹھکر سوال کیا تو امام بخاری نے اعراض کیا اور کچھ جواب نہیں دیا، اس شخص نے تین بار سوال کیا امام نے جواب نہیں دیا، جب اسکی اصرار کیا تو امام بخاری رح نے فرمایا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق وافعال العباد مخلوقة والامتحان بدعة۔

اسکی شور مچایا کہ یہ تو کہتے ہیں کہ لفظی بالقرآن مخلوق، لیکن امام بخاری رح نے بار بار کہا من زعم انی قلت لفظی بالقرآن مخلوق فھو کذاب ۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے وہ جھوٹا ہے، میں نے تو یہ کہا ہے القرآن کلام اللہ غیر مخلوق وافعال العباد مخلوقة، اور یہ بالکل صحیح ہے، قرآن عزیز میں ہے واللہ خلقکم وما تعملون، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان اللہ یصنع کل صانع وصنعته۔ (مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۹)

اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ انسان مخلوق و حادث ہے تو اس کے سارے افعال مخلوق حادث ہوں گے، انسان کی آواز، اسکی کتابت، اس کی روشنائی اور کاغذ سب حادث ہوں گے۔

مسئلہ تو بالکل واضح اور صاف تھا لیکن بعض لوگوں نے بدنام کر دیا۔ محمد بن یحییٰ ذہلی رح نے اعلان کر دیا کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق ومن زعم لفظی بالقرآن مخلوق فھو مبتدع"، اس سے بات چیت سلام کلام سب بند کر دیا جائے اور جو اس کے بعد محمد بن اسماعیل کے پاس جائے اسے متہم جانو، کیونکہ ان کی مجلس میں وہی جائے گا جو ان کے مذہب پر ہوگا، اس اعلان کے بعد امام مسلم رح اور احمد بن سلمہ کے سوا سب نے امام بخاری کی مجلس سے قطع تعلق کر لیا۔ پھر امام ذہلی نے کہا من قال باللفظ فلا یحل ان یحضر مجلسنا"، تو امام مسلم رح نے اپنی چادر اٹھائی اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ احمد بن سلمہ بھی چلے آئے، امام مسلم رح نے آتے ہی جتنی احادیث امام ذہلی سے لکھی تھی سب اونٹ پر لادکر واپس کر دی۔

حاکم نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب امام مسلم رح اور احمد بن سلمہ ذہلی کی مجلس سے اٹھکر چلے آئے تو ذہلی نے یہ بھی کہدیا کہ یہ شخص (بخاری) میرے اس شہر میں نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد احمد بن سلمہ امام بخاری رح کی خدمت میں پہونچے اور کہا کہ یہ شخص (محمد بن یحییٰ ذہلی) پورے خراسان بالخصوص اس شہر (نیشاپور) میں مقبول ہے، ہم میں سے کسی میں یہ طاقت نہیں کہ ذہلی سے اس معاملہ میں بات کر سکے، آپ نے کیا سوچا ہے؟ یہ سنکر امام بخاری نے اپنی ڈاڑھی مٹھی میں پکڑ کر کہا۔

وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد اللھم انک تعلم انی لم — میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں بلاشبہ اللہ تمام بندوں کو دیکھ رہا ہے۔ اے اللہ تو خوب جانتا ہے کہ میں نے نیشاپور میں قیام

ارد المقام بنیسابور اشرا ولا بطرا ولا طلبا للرياسة . اپنی بڑائی وبزرگی ظاہر کرنے اور ریاست حاصل کرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ (مقدمہ فتح الباری ص۴۹۱)

اور آپ نے احمد بن سلمہ سے کہا : اے احمد میں کل صبح ہی کوچ کر جاؤں گا چنانچہ امام بخاری نیشاپور سے رخصت ہو گئے۔

فائدہ ۱ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ امام احمد اور امام بخاری رحمہم اللہ میں اختلاف ہے۔ حالانکہ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں، امام احمد رح فرماتے ہیں القرآن کلام اللہ غیر مخلوق۔ امام بخاری رح بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ قاری کی تو آواز حادث ہے اس لئے کہ قاری حادث ہے تو اس کی آواز بھی حادث ہی ہو گی، امام احمد رح سے یا امام احمد کے کسی امام شاگرد سے یا سلف سے اس کے خلاف منقول نہیں نہ ان میں سے کسی نے کہا کہ قاری کی آواز قدیم ہے۔ بلکہ امام احمد رح نے متعدد جگہ تصریح فرمائی ہے کہ قاری کی قرأت کے وقت جو آواز سنائی دیتی ہے وہ قاری ہی کی آواز ہے اور اس کی تائید زینوا القرآن باصواتکم " سے بھی ہوتی ہے، امام احمد رح نے تو اتنا کہا من قال لفظی بالقرآن مخلوق فهو جهمی ،، لوگوں نے سمجھا کہ لفظ اور صوت دونوں ایک ہیں اس لئے کہہ دیا کہ امام احمد رح صوت کو قدیم کہتے ہیں اور امام بخاری رح حادث، لہذا اختلاف ہو گیا حالانکہ امام احمد رح نے صوت کو قدیم نہیں کہا، اسی لئے امام بخاری رح نے اپنی کتاب "خلق افعال العباد" میں لکھا ہے کہ لوگوں نے امام احمد رح کی بات کو سمجھا نہیں۔

بہرحال قرآن مجید کا لفظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قدیم ہے، غیر مخلوق ہے، البتہ ہمارے افعال آواز وغیرہ حادث ہیں پس کوئی اختلاف نہیں۔ (امداد الباری)

فائدہ ۲ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمد رح اور امام بخاری رح دونوں کو شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا، لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں کا معاملہ ایک ہی تھا یہ درست نہیں، امام احمد رح نے تو معتزلہ کا مقابلہ کیا اور استقامت دکھائی اور امام بخاری رح نے متشدد دین حنابلہ کے مقابلہ میں تکلیف اٹھائی اور عزیمت اختیار کیا چنانچہ امام بخاری رح جہاں تشریف لیجاتے آزمائش میں پھنس جاتے۔ تو آخر میں سب جگہ سے مایوس ہو کر اپنے وطن بخارا تشریف لے آئے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا امتحان اور وفات حسرت آیات

امام جب نیشاپور سے وطن کے لئے روانہ ہوئے اور بخارا والوں کو معلوم ہوا تو مسرت کی لہر دوڑ گئی، اور کئی میل تک شامیانے اور خیمے نصب کئے گئے، پورے شہر والے استقبال کے لئے نکلے اور بڑے تزک واحتشام اور شان و شوکت سے امام کو لیکر شہر آئے۔

امام نے بخارا میں درس حدیث شروع کر دیا، تشنگان علم حدیث جوق در جوق شریک درس ہونے لگے، مگر حاسدوں نے یہاں بھی امام بخاری رح کا پیچھا نہ چھوڑا، جن کے مشورے سے خالد بن احمد ذہلی والی بخارا نے امام کے پاس درخواست بھیجی،

کہ آپ دربار شاہی میں تشریف لاکر مجھے اور صاحبزادوں کو بخاری شریف اور تاریخ کا درس دیں لیکن امام صاحب نے اسی قاصد کی زبانی کہلا بھیجا کہ لا اذل العلم ولا احمله الی ابواب السلاطین (میں علم کو سلاطین کے دروازوں پہلے جاکر ذلیل نہیں کروں گا، جسے پڑھنا ہو میرے پاس آکر پڑھے والی بخارا نے دوبارہ کہلوایا اگر تشریف نہیں لاسکتے تو شہزادوں کے لئے کوئی مخصوص وقت عنایت فرمادیں کہ ان کے ساتھ کوئی دوسرے لوگ شریک نہ ہوں، امام نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا اور فرمایا کہ احادیث رسول پوری امت کے لئے یکساں ہیں، اس کی سماعت سے میں کسی کو محروم نہیں کرسکتا اگر میرا یہ جواب ناگوار ہو تو حکماً میرا درس روکدو تاکہ میں خدا کے دربار میں عذر پیش کرسکوں، اس جواب سے حاکم بخارا سخت ناراض ہوگیا، حاسدوں نے حاکم وقت کے اشارہ پر امام کو دین وعقائد کے بارے میں متہم کیا، بدعتی ہونے کا الزام لگایا پھر حاکم نے بخارا سے نکلنے کا حکم دیا، امام نے انتہائی کبیدہ خاطر ہوکر اپنے مخالفین کیلئے بددعا کی۔

اللهم ارهم ما قصدونی فی انفسهم واولادهم واهالیهم۔ — اے اللہ جس طرح اس امیر نے مجھے ذلیل کیا ہے اسی طرح ان کو اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنی اہل کی بے عزتی وذلت دکھادے۔

(مقدمہ فتح الباری پاکستانی ص۴۹۳)

چنانچہ ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا کہ خلیفۃ المسلمین اس امیر سے کسی وجہ سے سخت ناراض ہوکر اس کو معزول کردیا، اس کی جگہ دوسرا حاکم بھیجا اور حکم دیا کہ معزول امیر کا منھ کالا کرکے گدھے پر سوار کراکے پورے شہر میں اس کی تذلیل کرو، پھر قید کردیا گیا جہاں وہ انتہائی ذلت ورسوائی سے چند دن گذار کر مرگیا۔ نیز حاکم بخارا کے معاونین حریث بن ورقاء وغیرہ مختلف بلاؤں میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوگئے۔ من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب۔

بہرحال امام وہاں سے نکل کر بیکند پہونچے لیکن امام کے بارے میں وہاں بھی اختلاف ہوگیا، اس لئے وہاں قیام مناسب نہیں سمجھا، اتنے میں اہل سمرقند نے آپ کو دعوت دی، آپ نے قبول فرمالیا اور سمرقند کا ارادہ بھی فرمالیا لیکن راستہ میں خرتنگ تھا جہاں کچھ اعزا واقربا رہتے تھے، ماہ مبارک کی وجہ سے وہیں قیام کیا اسی دوران سمرقند سے اطلاع آئی کہ یہاں فضا سازگار نہیں ہے یہاں بھی لوگوں میں اختلاف ہوگیا ہے اس لئے امام نے عشرۂ اخیرہ میں تہجد کی نماز کے بعد دعا کی:۔

اللهم ضاقت علی الارض بما رحبت فاقبضنی الیك۔ — خدایا میرے اوپر زمین باوجود وسعت کے تنگ ہوگئی ہے اس لئے مجھے اپنے پاس بلالے۔

اہل سمرقند نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ الزام غلط ہے، پھر متفقہ طور سے دعوت پیش کیا، امام نے سواری طلب کی دو آدمی کے سہارے چند قدم چلے تھے کہ فرمایا ضعف بڑھتا جارہا ہے پھر کچھ دعا کی اور لیٹ گئے، جسم اقدس سے پسینہ نکلنا شروع ہوا اور آپ نے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

اس طرح تیرہ (۱۳) دن کم باسٹھ (۶۲) سال کی زندگی گذار کر شب عید الفطر (یکم شوال کی رات) میں علم وفضل کا وہ عظیم آفتاب غروب ہوگیا جس کے علم وفضل کی روشنی سے بخارا، سمرقند، بغداد اور نیشاپور کے بے شمار عوام وخواص اپنے دل ودماغ کو منور کررہے تھے عید الفطر کے دن شنبہ کے روز بعد نماز ظہر مقام خرتنگ میں اس مجسمۂ نورانی گنجینۂ کرامت کو سپرد خاک کیا گیا۔ دفن کے بعد آپ کی

قبر مبارک سے ایک مدت تک مشک کی خوشبو آتی رہی، لوگ دور دور سے آکر مٹی اٹھاکر لیجاتے جس سے گڑھا ہوگیا، اس لئے قبر کی حفاظت کیلئے احاطہ کیا گیا مگر پھر بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور لوگ احاطہ کے باہر سے مٹی لیجانے لگے، بالآخر متعلقین میں ایک بزرگ کی دعا سے یہ خوشبو بند ہوئی۔ یہ خوشبو کیا تھی؟ کیسی تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ خوشبو سید الکونین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث کی برکت تھی گویا یہ قبر اطہر کی مٹی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔ ؎

گلے خوشبوئے درحمام روزے ✦ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ✦ کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ✦ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد ✦ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

بارگاہ رسالت میں مقبولیت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایمان کی جان ہے، امام بخاری رح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ امام نے اپنی پوری زندگی اتباع سنت اور احادیث نبویہ کی تفتیش و تحقیق اور پھر اشاعت میں صرف کی۔

وراق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خواب دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لیجارہے ہیں اور آپکے پیچھے امام بخاری بھی جا رہے ہیں حضور اقدس جہاں قدم مبارک رکھتے ہیں امام بخاری رح بھی بعد میں وہیں قدم رکھتے ہیں۔

امام بخاری رح کے مشہور و معروف تلمیذ (صاحب نسخہ) کا بیان ہے کہ میں نے خواب دیکھا کہ میں کسی جگہ جارہا ہوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کہاں جارہے ہو؟ میں نے عرض کیا، محمد بن اسماعیل، کے پاس، ارشاد فرمایا، ان سے میرا سلام کہنا۔

عبدالواحد بن آدم طواویسی کا بیان ہے کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ چند اصحاب کرام رضہ کے ساتھ کسی کے منتظر ہیں، میں نے سلام کے بعد عرض کیا کہ حضور کس کے منتظر ہیں؟ فرمایا، محمد بن اسماعیل کا انتظار ہے، طواویسی لکھتے ہیں کہ چند دن کے بعد جب امام بخاری رح کے انتقال کی خبر ملی، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ امام کا انتقال اسی رات میں ہوا جس رات میں نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تھی۔

وقد جمع البعض تاریخ ولادتہ ومدۃ حیاتہ ووفاتہ فی البیتین ؎

کان البخاری حافظا ومحدثا ✦ جمع الصحیح مکمل التحریر
میلادہ صدق[194] ومدۃ عمرہ ✦ فیہا حمید[62] وانقضی فی نور[256]

؎ صدق ہے تاریخ ولادت نور ہے تاریخ وفات ✦ عمر مبارک حمید ہے ملکوتی صفات

فارسی:۔ ولادت صدق و عمر او حمید است ✦ بگیر از نور سال جاں سپاری

وانثر:۔ صدق حمید نور (یعنی سچ کہا حمید نے کہ وہ نور تھے)

اشکال و جواب

اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب احادیث میں تمنائے موت کی ممانعت ہے تو اتنے بڑے عظیم محدث نے یہ دعا فاقبضنی الیک کیوں کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیاوی مصیبت کی وجہ سے تمنائے موت ممنوع اور نا جائز ہے لیکن اخروی مصائب پر یا دینی فتنہ سے بچنے کیلئے تمنا جائز ہے جیسے شہادت کی تمنا۔

احوال الجامع الصحیح

امام بخاری رح کی یہ کتاب اگرچہ مشہور ہے "بخاری شریف" سے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤلف رح کا وطن بخارا ہے مگر خود مؤلف علام رح نے اس کا نام یہ رکھا تھا:- الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ (عمدۃ القاری)

وجہ تسمیہ بخاری شریف جامع تو اس وجہ سے کہ اس کے اندر حدیث کے آٹھوں انواع موجود ہیں ؎
سیر و آداب و تفسیر و عقائد فتن و اشراط احکام و مناقب

سیر:- سیرت کی جمع ہے یعنی وہ احادیث جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے واقعات بالخصوص اہم واقعات یعنی غزوات پر مشتمل ہیں۔

آداب:- ادب کی جمع ہے مراد ہیں آداب المعاشرت، مثلاً کھانے، پینے کے آداب وغیر ذالک۔

تفسیر:- یعنی وہ احادیث جو تفسیر قرآن سے متعلق ہیں۔

عقائد:- وہ احادیث جن کا تعلق عقائد و ایمان سے ہے۔

فتن:- فتنہ کی جمع ہے یعنی وہ اہم واقعات جن کی پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

اشراط:- یعنی علامات قیامت۔

احکام:- یعنی شرعی مسائل۔

مناقب:- منقبت کی جمع ہے یعنی صحابہ کرام و صحابیات اور مختلف قبائل و طبقات کے فضائل۔

مسند:- اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ سند متصل کے ساتھ مرفوعاً منقول ہیں، آثار وغیرہ جو مذکور ہیں وہ بالتبع ہیں اور تراجم میں ہیں۔

الصحیح:- اور صحیح اس وجہ سے کہ امام بخاری رح نے اس میں صحت کا التزام کیا ہے ان کی تحقیق کے مطابق اس میں کوئی روایت ضعیف نہیں ہے۔

المختصر:- سے اشارہ ہے کہ یہ کتاب بھی مختصر ہے اس میں تمام صحیح حدیثوں کو جمع نہیں کیا ہے خود مؤلف کتاب امام بخاری رح سے منقول ہے کہ میں نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے اس کتاب کو منتخب کیا ہے، یہ بھی منقول ہے کہ "ما کتبت فی کتاب الجامع الا ما صح وترکت من الصحاح لحال الطول" اس میں جتنی حدیثیں ہیں وہ سب صحیح ہیں اور بہت سی صحیح حدیثوں کو طول سے بچنے کیلئے میں نے ترک کر دیا ہے من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و اقوال کی طرف اشارہ ہے۔

وسننہ ۔ سے آپؐ کے افعال وتقریرات کی طرف اشارہ ہے ، وایامہ سے غزوات کی طرف اور ان تمام واقعات وحالات کی جانب اشارہ ہے جو آپؐ کے عہد مبارک میں پیش آئے ، امام نے بہت سی روایتیں ایسی ذکر کی ہیں جو نہ قولی ہیں نہ فعلی اور نہ تقریری ، وہاں حضرات شراح کو اشکال پیش آیا ہے لیکن اگر اس کتاب کا پورا نام مستحضر ہو تو کوئی اشکال ہی پیدا نہ ہوگا ۔

الغرض اس تالیف کا نام طویل ہے جو اپنے مضامین کے لحاظ سے جامع ومانع ہے لیکن اختصار میں زبان زد خلائق بخاری شریف یا صحیح البخاری ہے ۔

سبب تالیف

حضرات محدثین رح سے صحیح بخاری کی تالیف کے تین وجوہ منقول ہیں لیکن ان وجوہ میں کوئی تعارض نہیں ہے ان تینوں وجوہ کے مجموعے سے عزم وارادہ میں پختگی ہوئی اور امام نے اصح الکتاب کی تالیف کی ۔

(۱) امام بخاری رح کی سوانح حیات سے معلوم ہو چکا ہے کہ صرف دس سال کی عمر سے احادیث نبویہ کے حفظ کا بے پناہ شوق دامن گیر ہوا اور اس کیلئے مختلف ممالک کے ایک ہزار سے زائد مشائخ حدیث وائمہ کبار سے اخذ حدیث کیا ، چنانچہ جب تیئیس سال کی عمر ہوئی تو امام کے پاس چھ لاکھ حدیثوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا ، تین لاکھ سینے میں (یعنی حفظ) اور تین لاکھ سفینے (یعنی بیاض) ہیں ۔ تو دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ احادیث صحیحہ کو ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیجائے جس میں ہر قسم کی صحیح احادیث موجود ہوں ۔

(۲) ابھی یہ داعیہ صرف ایک خیال و پروگرام کی شکل میں تھا کہ ایک روز استاذ محترم شیخ وقت امام اسحٰق بن راہویہ نے دوران درس فرمایا " لو جمعتم کتابا مختصرا فی الصحیح لسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " استاد کے فرمانے سے اس خیال میں قوت پیدا ہو گئی ، اور یہی چیز دراصل تالیف صحیح کیلئے اصل محرک بنی اور امام بخاری نے عزم کر لیا کہ ایسی صحیح کتاب لکھوں گا ۔

(۳) نیز امام بخاری رح سے خود منقول ہے رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام الخ یعنی میں نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ میں خدمت اقدس میں کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ میں پنکھا ہے جس کے ذریعہ جسم اطہر سے مکھیوں کو دفع کر رہا ہوں ، بعض معبرین (تعبیر خواب کے ماہرین سے) تعبیر پوچھی تو اسکی تعبیر بتائی کہ تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے کذب کو دفع کرو گے یعنی احادیث کے ذخیرہ سے موضوع اور ضعیف حدیثوں کو چھانٹ کر نکالدوگے ۔ اس تعبیر کے بعد امام نے صحیح بخاری کی تالیف فرمائی ۔

تعداد روایات بخاری

صحیح بخاری میں کل کتنی حدیثیں ہیں ؟ شیخ تقی الدین ابن الصلاح کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح بخاری شریف میں کل احادیث مع مکررات سات ہزار دو سو پچھتر ہیں عدد احادیث صحیح البخاری سبعة آلاف ومائتان وخمسة وسبعون بالاحادیث المکررة (مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۶۵)

علامہ نووی رح سے بھی یہی تعداد منقول ہے لیکن علامہ نووی نے شرح میں مسندہ کی قید کا اضافہ کیا ہے ،

ولفظہ جملة ما فی صحیح البخاری من الاحادیث المسندة فذکر العدة سواء ای سبعة آلاف ومائتان وخمسة وسبعون بالمکررة ، وباسقاط المکررة اربعة آلاف (مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۶۵)

حافظ عسقلانی کہتے ہیں کہ یہ تعداد صحیح نہیں ہے، پھر حافظ نے ہر باب کی احادیث صحیح طور سے شمار کر کے لکھا ہے کہ کل احادیث مسندات کی تعداد سات ہزار تین سو ستانوے ۷۳۹۷ ہیں یعنی تحقیق کے بعد ۷۲۷۵ کے عدد پر ایک سو بائیس ۱۲۲ کا اضافہ کیا لہٰذا کل تعداد ۷۳۹۷ ہو گئیں، اس کے اس مقدمہ کے آخر میں ص۴۶۹ پر لکھتے ہیں فجملة ما فی الکتاب من التعالیق الف وثلثمائة واحد واربعون حدیثا یعنی کل تعالیق (جملہ معلقات) کی تعداد ایک ہزار تین سو اکتالیس ۱۳۴۱ ہے اور کل متابعات وتنبیہ علی اختلاف الروایات تین سو چوالیس ۳۴۴ ہیں دو سطر کے بعد لکھتے ہیں وجملة ما فیه من المتابعات والتنبیه علی اختلاف الروایات ثلثمائة واحد واربعون حدیثا (مقدمہ ص۴۶۹)، شاید کہ اربعة واربعون کے بجائے قلم کی چوک سے احد واربعون ہوگیا اور اس چوک کی دلیل یہ ہے کہ مجموعہ میں فرماتے ہیں تسعة الوف واثنان وثمانون حدیثا اور یہ مجموعہ اسی وقت درست ہوگا جبکہ متابعات کی تعداد تین سو چوالیس ۳۴۴ ہوگی۔

الحاصل:-

احادیث مسندات	۷۳۹۷	ایضاً قسطلانی ص۳۸
جملہ تعلیقات	۱۳۴۱	
کل متابعات	۳۴۴	ایضاً قسطلانی

مجموعہ احادیث ما فی البخاری ۹۰۸۲

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متابعات کی تعداد میں سبقت قلم یا سہو کاتب سے بجائے تین سو چوالیس کے تین سو اکتالیس ہوگیا ہے لیکن مجموعہ میزان ۹۰۸۲ صحیح ہوگیا جیسا کہ مقدمہ قسطلانی میں جو فی الواقع مقدمہ فتح الباری کی تلخیص ہے مصرح ہے وجملة ما فیه من المتابعات والتنبیه علی اختلاف الروایات ثلثمائة واربعة واربعون حدیثا فجملة ما فی الکتاب علی هذا بالمکرر تسعة آلاف واثنان وثمانون حدیثا خارجا عن الموقوفات علی الصحابة والمقطوعات علی التابعین فمن بعدهم (مقدمہ قسطلانی ص۳۸)

اور حذف مکررات کے بعد دو ہزار پانچ سو تیرہ ۲۵۱۳ وجمیع ما فیه موصولا ومعلقا بغیر تکرار الفا حدیث وخمسمائة حدیث وثلثة عشر حدیثا (مقدمہ لامع ص۳۷)

صحیح بخاری کی تالیف

تالیف کی ابتدا کب ہوئی اور فراغت کب؟ اس کے بارے میں شراح و مؤرخین خاموش ہیں لیکن اتنا مؤرخین بھی لکھتے ہیں اور خود مؤلف کا ارشاد بھی ہے کہ یہ کتاب سولہ برس ۱۶ میں مکمل ہوئی، اور امام بخاری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کتاب کو میں نے اپنے اساتذہ امام احمدؒ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین کی خدمت میں پیش کیا، وقال ابو جعفر العقیلی لما صنف البخاری کتاب الصحیح عرضه علی ابن المدینی واحمد بن حنبل ویحیی بن معین وغیرهم فاستحسنوه وشهدوا له بالصحة الا اربعة احادیث، قال العقیلی القول فیه قول البخاری وهی صحیحة ایضا وقال فی موضع اخر روی الفربری عن البخاری قال ما ادخلت فی الصحیح حدیثا الا بعد ان استخرت

الله وتيقنت صحته. (مقدمہ لامع صـ۲؎) ایضا قسطلانی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے پہلے یحییٰ بن معین کا وصال ہوا ۲۳۳ھ میں، اور علی بن مدینی کا انتقال ہوا ۲۳۴ھ میں اور امام احمد بن حنبل رح کی وفات ہوئی ۲۴۱ھ میں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام بخاری رح اپنی کتاب صحیح بخاری کی تصنیف سے ۲۳۳ھ سے قبل ہی فارغ ہو گئے تھے یعنی یحییٰ بن معین کی وفات سے قبل۔

اور یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اس کے بعد فراغت نہیں ہوئی البتہ یہ ممکن ہے کہ یحییٰ بن معین کی وفات سے چند سال پہلے فراغت ہوئی ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ فراغت کے بعد کچھ اضافہ بھی ہوا ہو۔ پس جب ۲۳۳ھ میں فراغت تسلیم کرلی جائے، تو لامحالہ ماننا پڑیگا کہ ابتداء ۲۱۷ھ میں ہوئی جبکہ امام کی عمر تیئیس برس کی تھی تاکہ سولہ ۱۶ سال کا حساب درست ہو جائے، لیکن چونکہ یہ یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ یحییٰ بن معین کی خدمت میں ان کی وفات کے سال کتاب پیش کیگئی اس لئے ابتداء کا تعین بھی دشوار ہے، ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ تکمیل ۲۳۳ھ یا اس سے پہلے ہوئی، اسی لحاظ سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابتداء ۲۱۷ھ یا اس سے پہلے ہوئی۔

(امداد)

ثلاثیات بخاری اس کے لئے احقر کی نصر الباری کتاب المغازی صـ۲۷۴ ملاحظہ فرمائیے۔

صحیح بخاری کی عظمت وفضیلت

ابوزید مروزی کا بیان ہے كنت نائما بين الركن والمقام فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم في المنام فقال لي يا ابا زيد الى متى تدرس كتاب الشافعي وما تدرس كتابي فقلت يا رسول الله وما كتابك؟ قال جامع محمد بن اسمعيل۔

(مقدمہ قسطلانی صـ۵۱، مقدمہ فتح صـ۴۸۹)

یعنی میں رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا میں نے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ نے مجھ سے فرمایا اے ابوزید! تم کب تک شافعی کی کتاب کا درس دیتے رہو گے؟ اور میری کتاب کا درس نہ دو گے؟ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ آپ کی کتاب کونسی ہے؟ ارشاد فرمایا "جامع محمد بن اسماعیل" (یعنی بخاری شریف) گویا اس میں اشارہ ہے کہ بخاری شریف نہایت صحیح جامع ہے جس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کتاب فرمایا۔

ختم بخاری کے برکات علماء کبار نے بارہا تجربہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ کوئی بڑی مصیبت یا مشکل پیش آئے اور اس مشکل کے حل کے لئے بخاری شریف کا ختم کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ اس مشکل کو آسان فرما دیتے ہیں،

طاعون کی وبا ہو یا قحط ہو تو اس میں ختم بخاری مجرب ہے، یہ بھی آزمودہ ہے کہ جس کشتی میں بخاری شریف ہو وہ کشتی ڈوبنے سے محفوظ رہتی ہے، اسی طرح شفاء مرض کے لئے اس کا پڑھنا بہت نافع ہے، اہم مقدمات میں بھی ختم بخاری مجرب ہے، الغرض استجابت دعا، حل مشکلات اور قضاء حاجات کے لئے ختم بخاری مفید اور آزمودہ ہے۔ چنانچہ علمی اور دینی مراکز مثلاً مظاہر علوم (وقف) سہارنپور اور دار العلوم دیوبند وغیرہ میں اکابر واسلاف کے وقت ہی سے معمول ہے۔

تراجم بخاری کی اہمیت

عموماً محدثین کرام اپنی اپنی کتابوں میں اپنے مذاق کے لحاظ سے ترجمۃ الباب منعقد کرتے ہیں، امام مسلمؒ نے تو کوئی ترجمۃ الباب لکھا ہی نہیں۔ ترمذی اور ابوداؤد کے تراجم بہت آسان ہیں ان میں غور وفکر کی ضرورت پیش نہیں آتی الا ماشاء اللہ، لیکن پھر ابوداؤد کا ترجمۃ الباب ترمذی سے اعلیٰ ہے اور ان دونوں ترمذی اور ابوداؤد سے نسائی شریف کا ترجمۃ الباب اعلیٰ ہے اور قدرے مشکل ہے، بعض مقامات پر تو امام بخاری کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے اس لئے اس میں تامل وتدبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض بعض مقامات پر دونوں کا ترجمۃ الباب ایک ہی ہے۔

توارد ممکن ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ شیخ کی اتباع ہی راجح معلوم ہوئی ہو، شیخ کا ترجمۃ الباب زیادہ پسند آگیا ہو، بہر حال امام بخاریؒ کا ترجمۃ الباب اپنی باریک بینی ودقت نظر کے لحاظ سے، تدبر و تفقاہت کے اعتبار سے مشہور و ممتاز ہے۔

یہ تو تدوین حدیث کی مذکورہ تقاریر کے اخیر میں معلوم ہو چکا ہے کہ امام بخاری رح کا اصل مقصد اور اولین داعیہ خالص صحیح مرفوعات کا مجموعہ تیار کرنا اور مسائل کا استنباط کرنا ہے لیکن اس کتاب کی اہم خصوصیت جس سے امام کی انفرادی شان اور امتیازی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے وہ اس بخاری شریف کے تراجم ہیں ورنہ جس کے پاس چھ لاکھ حدیثوں کا ذخیرہ موجود ہے اس کو دس ہزار حدیثوں کے انتخاب میں سولہ ۱۶ سال کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ترجمۃ الباب سب سے اعلیٰ بالا اور نرالا ہے۔

امام بخاری رح اکثر ترجمۃ الباب کے ساتھ آیت کریمہ بھی لاتے ہیں جس سے اس طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن ؛ تقاصر عنہ افہام الرجال

قال اللہ تعالیٰ :۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم ولعلھم یتفکرون۔

ذکر سے قرآن اور تبیین سے حدیث اور تفکر سے استنباط مراد ہے۔

امام شافعی رح کتاب الامّ میں فرماتے ہیں کہ آئندہ ہونے والا کوئی حادثہ ایسا نہیں جس کا حکم قرآن نے نہ بیان کیا ہو۔

حضرت امام اعظم رح سے کسی نے کہا کہ آپ اپنی رائے سے مسائل بیان فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ واللہ میں جو بھی مسئلہ بیان کرتا ہوں اس کا ماخذ قرآن ہے۔

امام بخاری رح نے ایسا ترجمۃ الباب لکھا نہ ان سے پہلے کسی نے ایسا ترجمۃ الباب لکھا اور نہ ان کے بعد کسی نے ان کی پوری نقالی کی کوشش کی، گویا اس دروازے کے یہی فاتح بھی ہیں اور خاتم بھی۔ مشہور ہے کہ "فقہ البخاری فی تراجمہ" اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ امام بخاری رح نے فقہ کی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، اگر ان کے مسائل فقہیہ کو معلوم کرنا ہو تو تراجم بخاری سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس جملہ کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ امام بہت بڑے ذہین و فقیہ ہیں ان کے تفقہ وذہانت کا اندازہ لگانا ہو تو ترجمۃ الباب دیکھو۔ اسی وجہ سے علامہ ابن خلدون نے کہا ہے کہ صحیح بخاری کے تراجم ابواب سے احادیث کی مطابقت امت مسلمہ پر امام بخاری رح کا قرض ہے، لیکن حق یہ ہے کہ علامہ بدر الدین عینی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی علمی ذکاوت اور دوربینی سے ایک حد تک اس قرض کو اتارنے کی بھرپور کوشش کی ہے مگر پھر بھی بعض مقامات پر ہتھیار ڈال دیا ہے، اس سے امام بخاری رح کی دقت نظر اور باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ

امام نووی رح شرح مسلم کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں " وکثیر منہا یذکرہ فی غیر بابہ الذی یسبق الیہ الفھم الخ (مقدمہ نووی ص۱۳)

دراصل عام طور پر محدثین کے نزدیک ترجمۃ الباب بمنزلہ دعوی کے ہوتا ہے اور پیش کردہ احادیث بمنزلہ دلیل کے ہوتی ہے اسی لحاظ سے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ترجمۃ الباب اور حدیث میں مطابقت کیا ہے ؟ لیکن امام بخاری رح محدثین کے قاعدہ کے پابند نہیں ان کی مثال تو ایسی ہے سه

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے ⁂ ہم اک طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

امام بخاری رح نے ترجمۃ الباب میں بہت سے علوم کو جمع کردیا ہے کہیں حدیث کی تشریح یا توجیہ مقصود ہوتی ہے تو کہیں اجمال کی تفصیل، کہیں دفع دخل مقدر ہوتا ہے تو کہیں کسی کی تردید، کہیں آیات و روایات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے تو ترجمۃ الباب سے اس کو دفع کرنا چاہتے ہیں جو مسئلہ متحقق و متعین ہوتا ہے، اس کو ترجمۃ الباب سے ظاہر فرماتے ہیں اور اگر کسی مسئلہ میں امام کو تردد ہوتا ہے یا جانبین کی گنجائش ہوتی ہے یا دلائل متعارض ہوتے ہیں تو قطعی حکم نہیں لگاتے اور مختلف روایتیں ذکر کرکے ہر ایک کے مستدل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پھر کبھی ترجمۃ الباب کی ہر روایت ترجمۃ الباب کے مطابق ہوتی ہے کبھی تمام روایات کے مجموعہ سے ترجمۃ الباب کا اثبات مقصود ہوتا ہے۔

تراجم بخاری کے متعلق محققین کی تحقیق یہی ہے کہ ہر روایت سے پورے ترجمۃ الباب کا ثابت ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر روایت سے ترجمۃ الباب کے کسی جز کا ثابت ہونا کافی ہے البتہ مجموعہ سے مجموعہ کا ثبوت ہونا چاہیے۔

کبھی امام ایک حدیث کو ترجمۃ الباب کی مناسبت سے ذکر کرتے ہیں پھر دوسری حدیث ایسی لاتے ہیں جس کا ترجمۃ الباب سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق حدیث سابق سے ہوتا ہے، اس کی تفصیل یا حدیث سابق کی سند یا متن کے متعلق کسی خاص تحقیق کی جانب اشارہ ہوتا ہے وغیرہ ذالک۔

امام بخاری رح کہیں تو ترجمۃ الباب ذکر ہی نہیں کرتے اور حدیث لے آتے ہیں جس کی مختلف وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) تالیف کے وقت امام کے ذہن میں مناسب ترجمۃ الباب نہیں آیا آئندہ پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے کہ بعد میں مذکور حدیث سے استنباط کرکے ترجمۃ الباب لکھدیا جائیگا مگر وقت نہ ملا۔

لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ایک جگہ امام بخاری نے تحریر فرمایا ہے کہ میں نے اس کتاب کو یحیٰی بن معین کی خدمت میں پیش کیا، اور یحیٰی بن معین کی وفات ۲۳۳ھ میں ہوئی اور امام بخاری کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی، اس لحاظ سے کتاب کی تالیف کے بعد کم از کم تیئیس برس اس دنیا میں رہے نیز یہ بھی ثابت ہے کہ نوّے ہزار انسانوں نے امام سے اس کتاب کو سنا، پس موقع نہ ملنے کا عذر کیونکر صحیح ہوسکتا ہے ؟

(۲) بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ناقلین کی غلطی ہے، امام نے ترجمۃ الباب لکھا تھا نقل کرنیوالوں کی غلطی سے چھوٹ گیا۔ اس جواب کی کمزوری بھی ظاہر ہے اسلئے کہ امام نے تالیف کے بعد مسلسل تیئیس ۲۳ برس دیکھا، ہزاروں کو سنایا، پھر ناقلین کی غلطی کی کیا دلیل ہے اور وہ اصل نسخہ کہاں ہے ؟ جس میں امام کا ترجمۃ الباب موجود ہے۔ اگر کوئی نسخہ ایسا نہیں ہے

تو پھر نقل کرنے والوں کو خطا کار کہنا دعوی بلا دلیل ہے اور فہم نارسا کا قصور ہے۔

(۳) حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ ایسا باب سابق باب کا تتمہ ہے یعنی کالفصل من الباب السابق "آئندہ مضمون نہ تو باب سابق سے بالکل متحد ہے نہ بالکل مغائر، بلکہ من وجہ باب سابق سے متعلق ہے اسلئے ترجمۃ الباب کی ضرورت نہیں اور من وجہ مغائر ہے، اس لئے لفظ باب، لکھدیا گیا۔

یہ توجیہ بہتر ہے اکثر شراح نے اس کو پسند کیا ہے، پوری تفصیل تو وہاں معلوم ہوگی جہاں باب بلاترجمہ ہے انشاء اللہ۔

(۴) امام ترجمۃ الباب کو چھوڑ کر طلبہ حدیث کا امتحان اور ان کے ذہن کی تمرین کرانا چاہتے ہیں، کہ وہ از خود حدیث ذیل سے کوئی مناسب مسئلہ اخذ کرکے ترجمۃ الباب میں رکھیں، کہیں اس کے برعکس ترجمۃ الباب تو لکھتے ہیں مگر اس کے تحت کوئی روایت نہیں لاتے، اس کی بھی وہی وجوہ بیان کیگئی ہیں یعنی یہ کہ امام رح کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی روایت نہ ملی یا یہ کہ روایت تلاش کرکے یہاں لکھنے کا ارادہ تھا مگر وقت نہ ملا، یہاں بھی بہتر جواب وہی ہے کہ طلبہ حدیث کے ذہن کی تمرین کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

امام بخاری رح کے تراجم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جگہ جگہ موقع بموقع قرآن حکیم کی آیتیں بھی پیش فرماتے ہیں، اقوال صحابہ اور تابعین سے اپنے دعوی کو مدلل فرماتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام بخاری رح کا مقصد صرف احادیث صحیحہ کو جمع کرنا ہی نہیں ہے بلکہ احادیث صحیحہ کے ساتھ قرآن کریم کی خدمت بھی مقصود ہے، اس کے لئے اگرچہ مستقل کتاب التفسیر ہے لیکن ہر مضمون کے مناسب آیت اسی مقام پر واقع فی النفس ہوتی ہے۔

اسی طرح احادیث سے مسائل کا استنباط اور اس کا طریقہ، نیز قرآن وحدیث اور فقہ کا ربط بھی بتانا چاہتے ہیں، تراجم بخاری کا اہتمام ہمیشہ ہوتا رہا ہے، محدثین کرام نے تراجم بخاری پر تصنیفات فرمائی ہیں، چنانچہ حضرت مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح نے ایک عربی رسالہ بنام "شرح تراجم ابواب صحیح البخاری" لکھا ہے جو بخاری شریف کے شروع میں ملحق ہے۔

(۲) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح نے بھی اردو زبان میں الابواب والتراجم" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے۔

(۳) ان اکابر بزرگوں کے بعد حضرت العلامہ الشیخ المحدث مولانا محمد زکریا صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے تراجم بخاری پر نہایت جامع اور مفصل کتاب بنام" الابواب والتراجم لصحیح البخاری" لکھی جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

امام بخاری رح سے ترجمۃ الباب سے متعلق کسی خاص قاعدے اور اصول کی تشریح منقول نہیں ہے، بعد کے علماء کبار نے اپنی تحقیق کے مطابق کچھ اصول اخذ کیے ہیں جن کو حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ نے مقدمہ لامع میں جمع کردیا ہے جو ستر اصول ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔

اگر علامہ ابن خلدون ہوتے اور حضرت شیخ الحدیث رح کی کتاب "الابواب والتراجم" دیکھ لیتے تو شاید بلساختہ کہدیتے کہ تراجم کا حق ادا ہوگیا ہے اور امت مسلمہ پر سے امام بخاری رح کا قرض اتار دیا گیا ہے، انشاء اللہ الرحمن نصر الباری

میں احقر بھی حسبِ موقعہ تشریح کرتا رہیگا۔

صحاح ستہ

حدیث کی پانچ کتابیں بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور ترمذی تو بالاتفاق صحاح میں داخل ہیں۔ ابتدا میں صحاح خمسہ کی اصطلاح مشہور تھی، چھٹی کتاب میں اختلاف ہے بعض حضرات نے مؤطا امام مالک کو قرار دیا ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگرچہ مؤطا صحیح ہے مگر اس میں احادیث کم ہیں اور آثار زیادہ اس لئے یہ صحاح ستہ میں داخل نہیں، اس کی جگہ بعض حضرات نے طحاوی کو اور بعض نے سنن دارمی کو صحاح ستہ میں داخل کیا۔

سب سے پہلے حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر المتوفی ۵۰۷ھ نے اپنی کتاب "اطراف الکتب الستۃ" اور اسی طرح شروط الائمۃ الستۃ" میں ابن ماجہ کو بھی صحاح کی فہرست میں داخل فرمایا پھر حافظ عبدالغنی مقدسی المتوفی ۶۰۰ھ نے اپنی کتاب اسماء الرجال میں فتبعہ الناس۔

پھر تو اکثر حضرات نے ابن ماجہ کو اس کی حسن ترتیب کی بنا پر صحاح ستہ میں شامل کیا چنانچہ آج کل یہی اصطلاح مشہور ہے صحاح ستہ، اور ابن ماجہ چھٹی کتاب ہے۔ پھر ابن ماجہ کا درجہ دوسری صحاح جیسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں تقریباً بیس احادیث موضوع ہیں اور ایک ہزار کے قریب ضعیف، ابوالحجاج المزی نے تو یہاں تک کہدیا کہ کل ما انفرد بہ ابن ماجۃ فھو ضعیف۔ مگر بلا دلیل علی الاطلاق یہ حکم لگانا درست نہیں، کذا قال ابوالحسن السندی رح فی تعلیقہ والحافظ ابن حجر فی الـ[illegible]ـب۔

بعض حضرات نے مسند احمد بن حنبل کو صحاح ستہ میں داخل کیا ہے لیکن ابن ماجہ کی مقبولیت پر دھندلا سا پردہ بھی نہ پڑ سکا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست ٭ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شروط ائمہ

شروط ائمہ یعنی ائمہ حدیث نے اپنی کتاب میں حدیث درج کرنے کیلئے کیا شرائط پیش نظر رکھی ہیں؟ یہ ایک اہم اور مشکل سوال ہے کیونکہ خود ائمہ حدیث اور مؤلفین حضرات نے اپنی کتابوں کی کوئی شرط نہیں ذکر فرمائی البتہ بعد کے علماء نے ان کی کتابوں کو چھاننے کے بعد تدبر کے ساتھ مطالعہ کیا، ان کی شرائط کو تلاش و تتبع کے بعد انھیں کی کتابوں سے مستنبط کیا، اس کے متعلق مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جس میں دو رسائل معروف اور متداول ہیں، امام ابوبکر حازمی رح کی شروط الائمۃ الخمسۃ اور حافظ ابوالفضل کی شروط الائمۃ الستۃ۔

ہر روایت میں دو چیزیں اس سلسلہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہیں، ایک راوی کی اپنی حیثیت، اس کا ذاتی جوہر یعنی عادل، ثقہ، صاحب ضبط و اتقان وغیرہ ہونا یا نہ ہونا، دوسری چیز اس کا اپنے شیخ سے تعلق مثلاً صرف معاصرت ہی ہے یا ملاقات بھی، پھر ملاقات کیسی؟ کتنی؟ سرسری ملاقات ہے یا اطمینانی؟ شیخ کی خدمت میں حاضری کم ہوئی یا بکثرت؟ صرف حضر کی صحبت حاصل ہے یا حضر و سفر دونوں کی، بعض محدثین ان تمام امور پر نظر فرماتے ہیں اسلئے کہ انسان کا اصلی جوہر سفر میں کھلتا ہے حضرت عمر رض سے کسی نے ایک شخص کی تعریف کی تو فرمایا کہ کیا تو کسی سفر میں اس کے ساتھ رہا؟ اس نے کہا نہیں، تو فرمایا پھر تعریف کیسی؟

حازمی رح فرماتے ہیں کہ ائمہ سے تو صراحۃً شرائط منقول نہیں البتہ ان کی کتابوں کے دیکھنے سے ان کی شرائط کا اندازہ ہوتا ہے۔ راوی کی پانچ قسمیں ہیں۔ ۱۔ کثیر الضبط والاتقان کثیر الملازمۃ مع الشیخ یعنی رواۃ اعلیٰ درجہ کا حافظہ رکھتے ہوں اور زمرۂ عنـ

کے ساتھ کثیر الملازمہ ہو۔

(۲) کثیر الضبط والاتقان قلیل الملازمۃ مع الشیخ۔

(۳) قلیل الضبط والاتقان کثیر الملازمۃ مع الشیخ۔

(۴) قلیل الضبط والاتقان قلیل الملازمۃ مع الشیخ۔

(۵) مجاہیل وضعفاء۔

امام بخاری رح طبقہ اولیٰ کی احادیث کو بالاستیعاب لیتے ہیں البتہ کبھی کبھی استشہاد کے طور پر طبقہ ثانیہ کی حدیث لے آتے ہیں۔
امام مسلم رح طبقہ اولیٰ اور طبقہ ثانیہ کی احادیث کو مستقلاً بالاستیعاب لیتے ہیں اور کبھی کبھی بطور استشہاد طبقہ ثالثہ کی روایت بھی لے آتے ہیں۔

امام نسائی اور ابو داؤد ان طبقات ثلاثہ کے علاوہ طبقہ رابعہ میں سے بھی مشاہیر کی روایت کو لیتے ہیں
امام ترمذی رح چاروں طبقات (۱، ۲، ۳، ۴) کو بالاستیعاب لیتے ہیں اور کبھی طبقہ خامسہ سے بھی روایت لے آتے ہیں۔
مذکورہ تقریر سے واضح ہوگیا کہ کتب صحاح میں باعتبار صحت کے محقق ترتیب اس طرح ہوگی۔

۱ بخاری شریف، ۲ مسلم شریف ۳ نسائی شریف ۴ ابو داؤد شریف ۵ ترمذی شریف، پھر آخری درجہ یعنی چھٹا درجہ ابن ماجہ کا ہوگا چونکہ ابن ماجہ میں ضعیف اور منکر روایات ہیں بلکہ بعض روایات موضوع بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

نوٹ:۔ طحاوی شریف باعتبار صحت کے ابو داؤد کے درجہ میں ہے۔

صحیحین میں موازنہ اور قول فیصل

جمہور علماء اسلام کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف ہے۔ بعض علماء مغاربہ نے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے اور حافظ ابو علی نیشاپوری کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے "ماتحت ادیم السماء کتاب اصح من مسلم" جمہور علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ اس جملہ سے صحیح بخاری پر ترجیح ثابت نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس قول میں تساوی کا احتمال ہے۔ نیز یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ حافظ نیشاپوری کا مقصد کلام مذکور سے یہ ہے کہ صحیح مسلم حسن ترتیب کے اعتبار سے راجح وافضل ہے۔

جمہور علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ صحت کے اعتبار سے صحیح بخاری افضل ہے اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مسلم شریف افضل ہے کما قال ابن العربی۔ ؎

تنازع قوم فی البخاری ومسلم ٭ لدیّ فقالوا ای ذین یقدم
فقلت لقد فاق البخاری صحۃ ٭ کما فاق فی حسن الصناعۃ مسلم

بہرحال یہ دونوں (بخاری ومسلم) امت مسلمہ کیلئے احادیث وروایات صحیحہ کا عظیم مجموعہ ہیں۔

قال العلامۃ العینی رح اتفق علماء الشرق والغرب علی انہ لیس بعد کتاب اللہ تعالیٰ اصح من صحیحی البخاری ومسلم الخ (عمدۃ القاری ص۵)

صحیح بخاری شریف بحر بے پایاں ہے اس سے کسی حدیث کو تلاش کرنے میں بڑی دقت اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے

صحیح مسلم جملہ متون اور اسانید کو یکجا جمع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے حدیث کی جستجو میں کوئی دقت نہیں ہوتی، امام بخاری نے حدثنا اور اخبرنا میں کوئی فرق نہیں کیا، مسلم رح نے ان کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے مثل الصحیحین کالعینین او الیدین بل کالقمرین۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ سے بالخصوص باعتبار صحت کے صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر فضیلت و فوقیت حاصل ہے۔

(۱) صحیح بخاری کی متکلم فیہ روایات کی تعداد ایک سو دس ۱۱۰ اور صحیح مسلم کی ایک سو بتیس ۱۳۲ ہیں جیساکہ علامہ سیوطی رح نے ابجد ہوز کے حساب سے ایک شعر میں جمع کیا ہے۔ ؎

فذ عد لجعفی وقاف لمسلم ۞ بل لهما فاحفظ وقیت من الرّدی

اس شعر میں فاء زائدہ ہے اور ذ عد کے عدد ۱۱۰ ہیں، جعفی سے مراد امام بخاری رح ہیں۔
اور قاف کے عدد سو ۱۰۰ ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ بل دونوں کے لیے، جسکا عدد بتیس ۳۲ ہے پس اس شعر کو یاد کرلو متکلم فیہ روایات سے واقفیت ہو جائے گی اور ہلاکت سے بچ جاؤ گے۔

(۲) صحت کا دار و مدار اتصال سند پر ہے امام بخاری رح نے بخاری شریف روایت کے لیے، راوی اور مروی عنہ (استاد و شاگرد) میں ثبوت لقاء کو ضروری قرار دیا ہے جبکہ امام مسلم رح کے یہاں معاصرت (امکان لقاء) کافی ہے۔

(۳) ان دو وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امام بخاری خود امام مسلم سے فائق ہیں، امام مسلم شاگرد ہیں اور برابر امام بخاری سے استفادہ کرتے رہے ہیں، امام بخاری حدیث کے دقائق اور علل کی معرفت میں امام مسلم رح سے بہت فائق ہیں وغیرہ۔ پس ظاہر ہے کہ اعلیٰ اور فائق کی کتاب فائق ہوگی۔ چنانچہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی رح فرماتے ہیں فاعلم ان الذی تقرر عند جمهور المحدثین ان صحیح البخاری مقدم علی سائر الکتب بعد کتاب الله صحیح البخاری (مقدمہ مشکوٰۃ)

تعدد نسخ اور وجوہ اختلاف

صحیح بخاری شریف کے نسخے متعدد اور مختلف ہیں، اس تعدد اور اختلاف کا سبب ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں موجودہ دور کی طرح مطابع اور پریس کی یہ موجودہ سہولتیں نہیں تھیں اور نہ موجودہ دور کی طرح نشر و اشاعت کے ذرائع تھے کہ ایک کتاب چھپوا کر بنگلہ دیش اور پاکستان، مصر و شام بھیجی جائے، اس دور میں تعلیم و تعلم کا طریقہ صرف یہ تھا کہ استاد اپنی یاد سے یا اپنی بیاض سے بیان کرتے اور تلامذہ اپنے استاد سے سنتے اور لکھ لیتے تھے اور ہمیشہ یہی دستور رہتا تھا کہ ہر سال شائقین علم کسی شیخ کے پاس جاتے، شیخ سناتا اور تقریر کرتا شاگرد سنتے اور لکھ لیتے تھے۔

اور یہ معلوم ہے کہ امام بخاری رح سے نوّے ہزار تلامذہ نے صحیح بخاری کی سماعت فرمائی، اور تجربہ شاہد ہے کہ استاد جب ہر سال پڑھائے گا تقریر کرے گا تو کچھ نہ کچھ فرق الفاظ کے اندر، تفصیل و اختصار کے لحاظ سے ہونا ناگزیر ہے اور چونکہ احادیث کو مختصر کرنا یا بالمعنی روایت کرنا جائز ہے اس وجہ سے اس وقت کے اساتذہ کبھی ایسا کر لیا کرتے تھے کہ کسی حدیث کو ایک سال تفصیل سے بیان کیا دوسرے سال اختصار کر دیا، دوسرے سال دوسری حدیث پر مفصل بیان کر دیا، اس بنا پر شاگردوں کے لکھنے میں بھی اختلاف ہوتا رہتا تھا، چنانچہ حافظ عسقلانی، علامہ قسطلانی وغیرہ نے جو اپنی سندیں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چار نسخے تو بخاری شریف کے مشہور و متعارف ہیں۔

ایک[1] علامہ ابراہیم نسفی کا۔ دوسرا[2] بزدوی کا۔ تیسرا[3] حماد بن شاکر کا اور چوتھا[4] فربری کا۔ اور ایک پانچواں بھی محاملی کا ہے جو مختلف فیہ ہے کہ آیا اسکی حیثیت مستقل نسخہ کی ہے یا نہیں؟ علامہ کرمانی کی رائے یہ ہے کہ یہ مستقل نسخہ ہے چنانچہ انہوں نے اپنی سند محاملی تک پہنچائی ہے مگر حافظ ابن حجر اس کا انکار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محاملی امام بخاری رح کے شاگرد تو ہیں لیکن انھوں نے بخاری کی سماعت خود امام سے نہیں فرمائی بلکہ اس کی نقول اور املائیں کی ہیں، بہر حال ہمارے سامنے جو نسخہ موجود ہے اور چاروں نسخوں میں سب سے زیادہ معتبر واضح اور مقبول نسخہ ہے وہ فربری کا ہے جسکو فربری رح نے امام بخاری سے دو مرتبہ سنکر اشاعت فرمائی ہے۔ وعلیہ مدار الروایات فی ہذا الزمان۔

علامہ فربری رح

ان کا نام ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر فربری ہے۔ فربر بکسر الفاء وبفتحہا ایضاً وفتح الراء الاولیٰ وسکون الباء الموحدہ ایک گاؤں کا نام ہے جو بخارا سے بیس[20] یا پچیس[25] میل کے فاصلے پر واقع ہے یہ ۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور بیس[20] شوال ۳۲۰ھ میں انتقال فرمایا، کل عمر نوے سال ہے۔ حضرت امام بخاری رح کے انتقال کے وقت ان کی عمر پچیس[25] سال تھی گویا چونسٹھ برس بعد تک زندہ رہے اور درس حدیث دیتے رہے اور ہر سال شاگردوں نے پڑھا اور لکھا اسلیے بھی یہ نسخہ سب سے زیادہ متعارف اور متداول رہا اور ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ علامہ فربری رح نے امام بخاری رح سے دو مرتبہ بخاری شریف پڑھی، اول مرتبہ ۲۴۸ھ میں اور دوسری مرتبہ ۲۵۲ھ میں۔ اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ علامہ فربری نے تین مرتبہ پڑھی، تیسری مرتبہ ۲۵۶ھ میں جس سال امام بخاری رح کا وصال ہوا۔ واللہ اعلم۔

خود علامہ فربری رح کا بیان ہے کہ امام بخاری رح سے صحیح بخاری نوے ہزار اشخاص نے سنی لیکن ان سے روایت کرنے والا میرے علاوہ اس وقت کوئی باقی نہیں رہا۔

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ شیخ بزدوی ان کے بعد تک باقی رہے پس علامہ فربری رح کے اس کلام کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے یہ اپنے علم کے اعتبار سے فرمادیا۔

فربری سے نقل کرنے والے بارہ شاگرد ہیں ان میں سے نو[9] کا ذکر حافظ ابن حجر نے کیا ہے اور امام نووی اور علامہ کرمانی نے ان کے علاوہ دو شاگردوں کا اور تذکرہ کیا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح نے ایک اور شاگرد کا تذکرہ فرمایا ہے، لامع کے مقدمہ میں سے ایک نقشہ میں اس کی تفصیل لکھدی ہے (منقول از تقریر شیخ الحدیث رح)

فربری کے نسخوں میں اختلاف کے وجوہات

یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ اگر امام بخاری رح کے شاگردوں کے نسخوں میں اختلاف ہو تو برمحل ہے کیونکہ جب مصنف نظر ثانی کرتا ہے تو ضرور محو و اثبات کرتا ہے۔ لیکن فربری سے پڑھنے والوں کے نسخوں میں اختلاف کی کیا وجہ؟

اس کے دو[2] جواب ہیں ایک معقول دوسرا غیر معقول، غیر معقول ہی زیادہ قوی ہے وہ یہ کہ پہلے زمانے کے اندر جیساکہ بیان کر چکا ہوں کہ استاد املا کراتا تھا اور شاگرد لکھتے تھے، مگر چونکہ سارے شاگرد ایک ہی درجہ کے متیقظ اور بیدار نہیں ہوتے اسلیے کسی نے کچھ لکھا اور کسی نے کچھ۔ جیسے کہ امتحان کے پرچوں میں دیکھتے ہیں کہ ممتحن ایک ایک حرف بولتا ہے پھر بھی لکھنے میں تغیر ہو جاتا ہے۔ ایک وجہ جو معقول ہے رجواتنی قوی بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ فربری نے اپنے استاد کے ساتھ غایت محبت

کی بنا پر دونوں نسخوں کی روایات لے لیں اگرچہ ان کو یہ معلوم تھا کہ آخری نسخہ یہی ہے اور دوسرا نسخہ آخری نہیں جیسے کہ میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ جب حضرت ابن مسعود رضؓ کی اس روایت پر پہنچے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو دو سورتیں ملا کر ایک رکعت میں پڑھتے تھے تو میرے حضرت نے غایت محبت کی بنا پر فرمایا ۔ زکریا مجھے بھی ایک پرچہ پر لکھکر یہ ترتیب دیدینا کہ آج تہجد میں اسی طرح پڑھیں گے ۔ تو باوجودیکہ وہ قرآن اور اس کی ترتیب مصحف عثمانی کے خلاف ہے لیکن غایت تعلق کی بنا پر حضرت نے اس کو پڑھا ۔ (امداد الباری)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بلاشبہ صحیح بخاری شریف اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بخاری شریف کا ایک ایک لفظ قرآن مجید کی طرح صحیح اور درست ہے ، اس پر نکتہ چینی اور ضعیف کہنا جائز نہیں خواہ وہ احادیث ہوں یا مؤلف علام کے اقوال و فرمودات ہوں ۔ یہ خیال خام اور غلط ہے ، بلاشبہ امام بخاری رحؒ نے اپنی فطانت اور فقاہت کے ساتھ سولہ سال دن رات کی تحقیق و تنقیح کے بعد اپنی وسعت بھر پوری کوشش کی کہ اس کتاب میں کوئی ضعیف اور غیر صحیح حدیث نہ آنے پائے اور کوئی لغزش نہ ہو مگر ابی اللہ العصمۃ الا لذاتہ ولرسولہ فسبحان من لا ینسی "

بلکہ اصح الکتب کا مطلب صرف یہ ہے کہ آج تک حدیث میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں سب سے زیادہ صحیح حدیثیں بخاری ہی میں ہیں اور دوسری تمام کتب حدیث کے اعتبار سے بخاری شریف میں ضعیف حدیثیں کم ہیں اس لحاظ سے بخاری شریف اصح الکتب ہے ۔

یہ بات خوب ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ جن حضرات اکابر نے بخاری شریف کو اصح الکتب کہا ہے وہ صرف احادیث کے اعتبار سے کہا ہے امام بخاری رحؒ کے تراجم و فرمودات کو اس میں داخل نہیں کیا ہے اس لئے امام بخاری سے بھی اس بخاری شریف میں بعض بعض لغزش ہوئی ہے ۔

مسامحات بخاری

امام بخاری رحؒ بھی اپنے تمامتر علمی و فنی کمالات کے باوجود ایک انسان اور بشر تھے اس لئے صحیح بخاری کی تالیف میں ان سے سہو و نسیان ، لغزش و تسامح کا واقع ہونا کوئی امر محال نہیں ہے ، جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ بخاری شریف میں ہر حدیث صحیح ہی ہے اور سند و متن کے بیان میں امام بخاری سے غلطی نہیں ہوئی ہے یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔ صحیح اور حق یہ ہے کہ صحیح بخاری میں بھی تسامح ہوا ہے ، صحیح بخاری میں ایسے راویوں کی تعداد کافی ہے جو قدری ، جہمی ، شیعی ، ناصبی عقائد کے حامل تھے ، نیز بخاری میں ایسے راوی بھی ہیں جو منکر الحدیث اور وہمی تھے چنانچہ ان تمام کی تفصیل حافظ عسقلانی رحؒ نے " ہدی الساری مقدمہ فتح الباری " میں مہیا کی ہے ۔ (ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۳۸۴ صفحہ ۴۵۶ تک)

اور امام بخاری رحؒ پر کیے گئے اعتراضات و تنقیدات کی مدافعت میں اپنی پوری فقاہت و علمی ذکاوت صرف کرنے پر کہنا پڑا لکل جواد کبوۃ ہر تیز رو گھوڑے کے لئے ٹھوکر ہے ۔

اور حافظ عسقلانی رحؒ امیر المومنین فی الحدیث حضرت عبد اللہ بن مبارک رحؒ کا یہ قیمتی مقولہ نقل فرماتے ہیں :۔

وقال ابن معین لست اعجب ممن — اور یحیی بن معین نے بیان کیا ہے کہ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہے جو حدیث

یحدث فیخطئ انما العجب ممن یحدث فیصیب۔ (لسان المیزان ص۱) بیان کرے اور خطا کر جائے مجھکو تو اس پر تعجب ہے کہ کوئی خطا واقع نہ ہو۔

لیکن بخاری رح کے مجروح و مطعون راویوں کے متعلق یہ کہدیا جاتا ہے کہ ان راویوں پر دوسرے لوگوں نے جرح کی ہے امام بخاری کے نزدیک ان راویوں پر جرح ثابت نہیں ہوسکی اس لئے امام بخاری رح نے ان راویوں کی حدیثوں کو اپنی صحیح میں لایا ہے

لیکن اس کا کیا جواب ہوگا کہ صحیح بخاری میں ایسے راویوں کی تعداد بھی کافی مقدار میں ہے جن پر خود امام بخاری نے اپنے تصانیف کے جرح کی ہے۔

مثلاً باب الاستنجاء بالماء کے تحت امام بخاری نے ایک حدیث اس سند سے ذکر کی ہے:۔

حدثنا ابو الولید هشام بن عبد الملک قال حدثنا شعبة عن ابی معاذ واسمه عطاء بن ابی میمونة قال سمعت انس بن مالک یقول کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا خرج لحاجته الحدیث (بخاری ص۲۷)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی عطاء بن ابی میمونہ ہے، اس کے بارے میں خود امام بخاری "کتاب الضعفاء الصغیر ص۲۷۱" میں لکھتے ہیں:۔

عطاء بن ابی میمونة ابو معاذ مولی انس وقال یزید بن هارون مولی عمران بن حصین کان یری القدر ابو معاذ عطاء بن ابی میمونہ حضرت انس رض کا غلام تھا اور یزید بن ہارون نے کہا کہ یہ عمران بن حصین کا غلام تھا یہ فرقہ قدریہ کا عقیدہ رکھتا تھا۔

چنانچہ حافظ عسقلانی اس کے متعلق فرماتے ہیں وقال البخاری وغیر واحد کان یری القدر (ہدی الساری ص۴۲۵ ایضا تہذیب التہذیب ص۲۱۶)۔

(۲) اسی طرح امام بخاری رح نے بخاری کتاب المغازی میں "باب بعث ابی موسی ومعاذ الی الیمن الخ" کے تحت ایک حدیث اس سند کے ساتھ ذکر کی ہے:۔

حدثنی عباس بن الولید قال حدثنا عبد الواحد عن ایوب بن عائذ قال حدثنا قیس بن مسلم قال سمعت طارق بن شهاب یقول حدثنی ابو موسی الاشعری قال بعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم (الحدیث بخاری ص۶۲۳)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ایوب بن عائذ ہے اس کے متعلق امام بخاری اپنی کتاب "کتاب الضعفاء" میں فرماتے ہیں ایوب بن عائذ الطائی کان یری الارجاء۔ (کتاب الضعفاء ص۲۵۳)

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں وقال البخاری کان یری الارجاء (تہذیب التہذیب ص۴۰۴)

وقال ابن المبارک کان صاحب عبادة ولکنه مرجئا ۔ ۔ ۔

حافظ ذہبی اس پر تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وكان من المرجئة قال له البخاري وأورده في الضعفاء لإرجائه والعجب من البخاري يغمزه وقد احتج به۔ | اور ابو ایوب فرقہ مرجیہ میں سے تھا امام بخاری نے اسکو مرجیہ ہونے کیوجہ سے ضعفاء میں درج کیا ہے اور امام بخاری پر تعجب ہے کہ اس پر طعن بھی کرتے ہیں اور اس سے اس ... ل بھی کرتے ہیں یعنی اس کی روایت بھی لیتے ہیں۔

(۳) اسی طرح ایک راوی ہے "اسماعیل بن ابان الوراق الکوفی" جس کے متعلق اسی کتاب الضعفاء میں امام بخاری لکھتے ہیں۔

اسماعيل بن ابان عن هشام بن عروة متروك الحديث كنيته ابو اسحاق | اسماعیل بن ابان جو ہشام بن عروہ سے روایت کرتا ہے متروک الحدیث ہے، اس کی کنیت ابو اسحاق ہے۔

(کتاب الضعفاء صـ ۲۵۲)

امام بخاری رح اس کو خود متروک الحدیث فرماتے ہیں اور اس متروک سے ایک نہیں صحیح بخاری میں متعدد حدیثیں لی ہیں، چنانچہ حافظ عسقلانی رح ہدی الساری میں لکھتے ہیں:۔

اسماعيل بن ابان الوراق الكوفي احد شيوخ البخاري ولم يكثر عنه۔ | اسماعیل بن ابان الوراق الکوفی امام بخاری کے شیوخ میں سے ہے۔ اور امام بخاری نے اسکی بہت زیادہ روایت نہیں لی ہے۔

(ہدی الساری پاکستانی صـ ۳۹۰)

ان مذکورہ راویوں کے علاوہ اگر آپ امام بخاری رح کی "کتاب الضعفاء" کا مطالعہ کرلیں اور مندرجہ ذیل راویوں پر امام بخاری کی جرح دیکھ لیں کہ امام نے خود جن راویوں کو مجروح اور ضعیف قرار دیا ہے پھر صحیح بخاری میں ان لوگوں کی روایات کو درج کیا ہے۔

زبیر بن محمد تیمی، سعید بن ابی عروبہ، عبداللہ بن لبید، عبدالملک بن اعین، عبدالوارث بن سعید، کہمس بن منہال، عطاء بن یزید، حد تو یہ ہے کہ عمران بن حطان جیسے خارجی بلکہ رئیس الخوارج سے بھی ایک روایت کتاب اللباس صـ ۸۶۷ میں لایا ہے، یہ عمران وہی ہے جس نے سیدنا حضرت علی رضہ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم جیسے شقی کا مرثیہ لکھا۔ . . . اور اس کے قتل سیدنا علی رضہ کے بارے میں تحسین کی تھی، یہ عمران شاعر تھا اس نے ایک شعر کہا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ "ایک تقی نے کیسی اچھی ضرب لگائی جس سے اس کی نیت خدا کی رضا حاصل کرنی تھی" اس طرح جس شقی عمران نے دوسرے شقی (مدینۃ العلم امیر المومنین سیدنا حضرت علی رضہ کے قاتل) کو متقی قرار دیا اور رحمت و رضوان کا بھی مستحق قرار دیا فیا للعجب کہ امام بخاری رح نے اس کی روایت صحیح بخاری میں درج فرمائی

(۲) مروان بن حکم جیسے مشہور شاطر سے بھی "کتاب المناقب" میں دو روایت لی ہے (دیکھو بخاری صـ ۵۲۷)۔

یہ وہی مروان ہے جس کی شرارت اور دسیسہ کاری کی وجہ سے امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمان رضہ شہید ہوئے جس نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ احد العشرۃ المبشرہ رضہ کو تیر مار کر زخمی کیا جس زخم کی وجہ سے وہ شہید ہوئے۔

(۳) بخاری کتاب التفسیر سورۂ انفال کے تحت ایک سند میں ابن ابی نجیح "راوی آیا ہے۔

هو عبد الله واسمه ابن ابي نجيح يسار الثقفي قال يحيى القطان كان قدريا،

(نصر الباری کتاب التفسیر صـ ۲۳۹، عمدۃ القاری)

سند کے بیان میں تسامح

ضعیف راویوں سے روایت کے علاوہ بعض بعض جگہ امام بخاری رحمہ سے راویوں کے نام کے سلسلہ میں بھی غلطی ہوئی ہے چنانچہ بخاری صفحہ ۷۳۲ کی دوسری سطر ہے "وقال عطاء عن ابن عباس الخ" یہ عطاء خراسانی ہے جو ضعیف ہے لیکن امام بخاری رحمہ نے اسی کو عطاء بن ابی رباح سمجھ کر روایت لی ہے کما قال القسطلانی رحمہ "لکن البخاری ما اخرجه الا انه من روایة عطاء بن ابی رباح لان الخراسانی لیس علی شرطه" (قسطلانی فی تفسیر سورۂ نوح)

(۲) بخاری اول صفحہ ۹۱ پر "باب اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبة" کے تحت جو حدیث ہے اس کی سند اس طرح بیان کی گئی ہے حدثنا عبد العزیز بن عبد الله قال حدثنا ابراهیم بن سعد عن ابیه عن حفص بن عاصم عن عبد الله بن مالك ابن بحینة قال مر النبی صلی الله علیه وسلم الخ۔ اس سند میں امام بخاری رحمہ سے دو تسامح ہوا ہے ایک تو یہ کہ مالک بن بحینہ کہا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحینہ (بضم الموحدہ و فتح المہلہ) مالک کی ماں ہے حالانکہ حضرت بحینہ مالک کی زوجہ ہیں اور عبد اللہ رضہ کی ماں ہیں۔ دوسرا یہ کہ تحویل سند کے بعد ہے سمعت رجلا من الازد یقال له مالك بن بحینة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم رای رجلا۔ (الحدیث)

اس حدیث کا راوی مالک کو بتایا ہے حالانکہ اس کے راوی مالک کے بیٹے عبد اللہ ہیں مالک تو صحیح قول پر مشرف باسلام کبھی نہیں ہوسکے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں "حکم الحفاظ یحیی بن معین واحمد (وغیرهما) بالوهم فیه موضعین احدها ان بحینة والدة عبد الله لا مالك، وثانیهما ان الصحبة والروایة لعبد الله لا لمالك۔"

(فتح الباری پاکستانی صفحہ ۱۲۹/۲، عمدۃ القاری صفحہ ۱۸۳/۵ کتاب الاذان)

اس پر پوری تفصیلی بحث اپنی جگہ آئے گی ان شاء اللہ۔ ابن ماجہ میں لعینہ ترجمۃ الباب ہے صفحہ ۸۲ پر، نیز مسلم شریف اور نسائی نے بھی اس سند کو بیان کیا ہے لیکن ان کی سند میں یہ غلطیاں نہیں ہیں۔

(۳) باب غزوة ذات الرقاع وهی غزوة محارب خصفة من بنی ثعلبة من غطفان (بخاری صفحہ ۵۹۲/۲)

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں "قال ابن حجر ولیس كذلك فان غطفان هو ابن سعد بن قیس بن عیلان فمحارب وغطفان ابناعم فكیف یكون الاعلی منسوبا الی الادنی والصواب ما فی الباب اللاحق وهو عند ابن اسحاق وغیره وبنی ثعلبة بواو العطف هكذا نبه علی ذلك ابو علی الغسانی فی اوهام الصحیحین" (قسطلانی)

(تفصیل کیلئے دیکھیے نصر الباری کتاب المغازی صفحہ ۱۷۱ تا صفحہ ۱۷۹)

(۴) بخاری جلد ثانی باب غزوۃ خیبر کے تحت یہ حدیث ہے ان اباهریرة قال شهدنا الخیبر۔ اس کی ایک سند امام بخاری رحمہ نے یہ ذکر کی قال الزهری واخبرنی عبد الله بن عبد الله وسعید عن النبی صلی الله علیه وسلم (بخاری صفحہ ۶۰۵/۲)

اس پر امام علی جبانی رحمہ نے یہ اعتراض کیا کہ صحیح عبد الرحمٰن بن عبد اللہ ہے مگر امام بخاری نے بجائے عبد الرحمٰن کے عبد اللہ ہی

لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں، وفیہ وھم فی قولہ قال الزھری واخبرنی عبد اللہ بن عبد اللہ وسعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، لان عبد اللہ بن عبد اللہ بن عبد اللہ لا یعرف والصواب الشاء اللہ عبد الرحمان بن عبد اللہ وھو ابن کعب قال وکنت اظن ان الوھم فیہ ممن دون البخاری الی ان رأیتہ فی التاریخ قد ساقہ کما ساقہ فی الصحیح سواء (مقدمہ فتح الباری صـ۳۷۹)

متن حدیث میں تسامح

صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ میں ایک حدیث ہے:۔

عن عائشۃ ان بعض ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قلن للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اینا اسرع بک لحوقا قال اطولکن یدا فاخذوا قصبۃ یذرعونھا فکانت سودۃ اطولھن یدا فعلمنا بعد انما کانت طول یدھا الصدقۃ وکانت اسرعنا لحوقا بہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تحب الصدقۃ (بخاری صـ۱۹۱)

حضرت عائشہ رضہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج نے آپؐ سے عرض کیا کہ ہم میں سب سے پہلے کون آپؐ سے واصل ہوگی؟ ارشاد فرمایا، تم میں جس کا ہاتھ سب سے زیادہ لمبا ہے۔ یہ سنکر سب ایک لکڑی لیکر اپنے اپنے ہاتھ ناپنے لگیں، ان میں سودہ رضہ کا سب سے زیادہ لمبا تھا پھر بعد میں ہم کو معلوم ہوا کہ ہاتھ کی لمبائی سے مراد صدقہ تھا اور حضرت سودہ رضہ کا سب سے پہلے وصال ہوا اور وہ صدقہ کو محبوب رکھتی تھیں۔

اس حدیث کے اندر جملہ وکانت اسرعنا لحوقا بہ میں کانت کی ضمیر کا مرجع بظاہر سودہ ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ازواج مطہرات میں سے سب سے پہلے حضرت سودہ رضہ کا وصال ہوا حالانکہ تمام اصحاب سیر وارباب تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ ازواج مطہرات میں سب سے پہلے حضرت زینب بنت جحش رضہ کا حضرت عمر فاروق رضہ کے دور خلافت ۲۰ھ میں وصال ہوا اور حضرت سودہ رضہ کا وصال حضرت معاویہ رضہ کے دور ۵۴ھ میں ہوا ہے۔ کما فی الحاشیۃ ایضا عمدۃ القاری۔ نیز یہی تحقیق امام نووی رح اور ابن بطال رح کی ہے:

(۲) باب احداد المرأۃ علی غیر زوجھا، عورت کا اپنے خاوند کے سوا کسی اور پر سوگ کرنا، کے تحت دوسری حدیث یہ ہے۔

عن زینب بنت ابی سلمۃ قالت لما جاء نعی ابی سفیان من الشام دعت ام حبیبۃ بصفرۃ فی الیوم الثالث فمسحت عارضیھا وذراعیھا الخ (بخاری صـ۱۴)

حضرت زینب بنت ابی سلمہ کا بیان ہے کہ جب شام سے ابوسفیان کے مرنے کی خبر آئی تو ام المؤمنین ام حبیبہ رضہ نے تیسرے دن زرد رنگ کی خوشبو منگا کر اپنے گالوں اور بازوؤں میں لگایا (یعنی سوگ ختم کر دیا)

امام بخاری رح کی اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ابوسفیان کے مرنے کی خبر شام سے آئی تھی جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابوسفیان کا انتقال شام میں ہوا تھا حالانکہ یہ غلط ہے تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ابوسفیان رضہ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ چنانچہ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں۔

وفی قولہ من الشام نظر لان ابا سفیان مات

اس روایت میں من الشام پر اعتراض ہے اس لئے کہ محدثین ومورخین سب کا

بالمدینة بلا خلاف بین اهل العلم بالاخبار والجمهور علی انه مات سنة اثنتین وثلاثین وقیل سنة ثلاث ولم ارف شیئ من طرق هذا الحدیث تقییده بابن الا فی روایة سفیان بن عیینة هذه واظنها وهما (فتح الباری ۱۳۰)

اس پر اتفاق ہے کہ ابوسفیان کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا اور جمہور کے نزدیک ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں انتقال ہوا ہے اور اس واقعہ میں شام کی قید سفیان بن عیینہ کی روایت کے سوا میں نے اور کہیں نہیں دیکھی اور میرا خیال ہے کہ یہ راوی کا وہم ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام بخاری رہ نے اس روایت کو درج بخاری کرنے میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔

(۳) امام بخاری رہ نے باب فضل من شهد بدرا کے تحت ص۵۶۸ میں اور باب غزوة الرجیع میں ص۵۸۵ پر ایک طویل حدیث میں فرمایا۔ وکان خبیب هو قتل الحارث بن عامر یوم بدر۔ یعنی حضرت خبیب رض نے غزوۂ بدر میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔

اس طویل حدیث کو امام بخاری رہ نے کتاب الجہاد ص۴۲۷ تا ص۴۲۸ میں بھی درج فرمایا ہے اور ہر جگہ یہی جملہ ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے، دراصل خبیب نام کے دو۲ شخص ہیں، ایک خبیب بن عدی خزرجی ہیں اور دوسرے خبیب بن اساف جو اوسی ہیں، تمامتر اہل مغازی کا اتفاق ہے کہ جس خبیب نے غزوۂ بدر میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا وہ قبیلہ اوس کے حضرت خبیب بن اساف ہیں اور امام بخاری نے اس حدیث میں جس خبیب کا واقعہ ذکر کیا ہے اس کو مشرکین نے گرفتار کر کے مکہ میں سولی دیدی تھی وہ حضرت خبیب بن عدی رض ہیں اور حضرت خبیب بن عدی رض نہ تو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور نہ انہوں نے حارث بن عامر کو قتل کیا۔ لہٰذا ان کے متعلق امام بخاری کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ خبیب نے حارث کو قتل کیا تھا چنانچہ علامہ قسطلانی رہ لکھتے ہیں۔

قال الشرف الدمیاطی لم یذکر احد من اهل المغازی ان خبیب بن عدی شهد بدرا ولا قتل الحارث بن عامر وانما ذکروا ان الذی قتل الحارث بن عامر ببدر خبیب بن یساف وهو غیر خبیب بن عدی وهو خزرجی وخبیب بن عدی اوسی الخ (قسطلانی باب غزوة الرجیع، ایضا عمدة القاری، ایضا فتح الباری)

(۴) امام بخاری رہ نے "باب غزوة الطائف" کے تحت چوتھی حدیث میں لکھا ہے وهو نازل بالجعرانة بین مکة والمدینة (بخاری ص۶۲۰ دوسری سطر)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جعرانہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ علامہ قسطلانی رہ فرماتے ہیں۔

والصواب بین مکة والطائف وبه جزم النووی وغیره۔ (قسطلانی باب غزوۂ طائف ایضا حاشیہ بخاری ص۶۲۰)

(۵) باب مناقب عثمان بن عفان کے تحت ایک طویل حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ ثم دعا علیا فامره ان یجلده فجلده ثمانین (بخاری اول ص۵۲۲) پھر حضرت عثمان رض نے حضرت علی رض کو بلا کر کوڑے لگانے کا

حکم دیا، چنانچہ انہوں نے اسّی کوڑے ولید کو لگائے۔

امام بخاری رحمہ نے اس روایت میں اسّی کوڑے مارنے کا ذکر کیا ہے، لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں

فی روایۃ معمر فجلد الولید اربعین جلدۃ وھذہ الروایۃ اصح من روایۃ یونس والوھم فیہ من الرّاوی۔ | معمر کی روایت میں ہے کہ ولید کو چالیس کوڑے لگائے، معمر کی یہ روایت بخاری ص۵۳۳ میں ہے، اور یونس کی روایت بخاری ص۵۲۲ سے اصح ہے اس یونس کی روایت میں راوی کو وہم لاحق ہوا ہے۔

(فتح، عمدہ، قس، ایضاً حاشیہ بخاری)

(۶) باب ماذکر فی الاسواق کے تحت ایک حدیث ہے۔

عن ابی ھریرۃ الدّوسی قال خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی طائفۃ النھار لا یکلمنی ولا اکلمہ حتی اتی سوق بنی قینقاع فجلس بفناء بیت فاطمۃ الحدیث۔ | حضرت ابوہریرہ رضہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت باہر نکلے میں اور آپ دونوں خاموش تھے، یہاں تک کہ آپ بنو قینقاع کے بازار میں آئے اور حضرت فاطمہ رضہ کے گھر کے صحن میں بیٹھ گئے

(بخاری اول ص۲۸۵ کتاب البیوع)

اس حدیث سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضہ کا گھر بنی قینقاع کے بازار میں تھا حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں تھا بلکہ سیدہ فاطمہ رضہ کا مکان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مکانوں کے درمیان تھا، ناقل کو اس روایت میں وہم ہوا ہے صحیح مسلم کی روایت میں یہ وہم نہیں ہے اس میں اس طرح ہے حتی جاء سوق بنی قینقاع ثم انصرف حتی اتی فناء فاطمۃ یعنی حضور اقدس جو بنی قینقاع کے بازار میں تشریف لائے پھر واپس ہوئے یہاں تک کہ حضرت فاطمہ رضہ کے صحن میں داخل ہوئے چنانچہ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں:۔

قال الدّاؤدی سقط بعض الحدیث عن الناقل او ادخل حدیثا فی حدیث لان بیت فاطمۃ لیس فی سوق بنی قینقاع انتھی وماذکرہ اولا ھو الواقع | داؤدی نے کہا کہ ناقل سے حدیث کے بعض الفاظ ساقط ہو گئے یا اس نے ایک حدیث کو دوسری حدیث میں داخل کر دیا کیونکہ حضرت فاطمہ رضہ کا مکان بنو قینقاع کے بازار میں نہیں تھا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ داؤدی نے جو پہلا احتمال ذکر کیا ہے (یعنی ناقل سے بعض الفاظ ساقط ہو گئے ہیں)، اصل میں واقعہ وہی ہے۔ واللہ اعلم۔

(فتح الباری، عمدۃ القاری)

(۷) امام بخاری رحمہ نے باب فضل من شھد بدرا کے بعد ایک باب بلا ترجمہ قائم کر کے ایک حدیث ذکر فرمائی ہے۔

عن ابی اسید رضہ قال قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم بدر اذا اکثبوکم یعنی کثروکم فارموھم واستبقوا نبلکم (بخاری ثانی ص۵۶۷ تا ص۵۶۸)۔

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:۔ ھذا التفسیر من بعض الرواۃ لا یعرفہ اھل اللغۃ۔

علامہ عینی رحمہ فرماتے ہیں۔ ھذا التفسیر لا یعرفہ اھل اللغۃ (عمدۃ القاری) ملاحظہ فرمائیے نصر الباری کتاب المغازی ص۔

استنباط مسائل میں تسامح

ہم اس سے پہلے عنوان "تراجم بخاری کی اہمیت" کے اندر بیان کر چکے ہیں کہ امام بخاری کا مقصد صحیح بخاری کی تالیف سے صرف احادیث صحیحہ کو جمع کرنا نہیں ہے بلکہ اہم مقصد احادیث سے مسائل کا استنباط ہے اور اسی مقصد کے ماتحت تراجم ابواب قائم کرتے ہیں، البشری تقاضا سے مسائل کے استنباط میں بھی امام بخاری سے لغزش ہوئی ہے اور اس لغزش کی تعداد تو بہت زیادہ ہے جو نصر الباری میں اپنی جگہ پر مفصل اور مدلل بحث آئے گی انشاء اللہ۔ ہم یہاں بطور نمونہ چند مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

(۱) باب اذا شرب الکلب فی الاناء "کے تحت دوسری حدیث اپنی سند کے ساتھ یہ ذکر فرمائی ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلا رای کلبا یاکل الثری من العطش فاخذ الرجل خفہ فجعل یغرف بہ حتی ارواہ فشکر اللہ لہ فادخلہ الجنۃ (بخاری جلد اول ص۲۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شخص نے ایک کتا دیکھا جو پیاس کی شدت کے مارے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس میں پانی بھر کر اسے چلو سے پلانا شروع کیا یہاں تک کہ اس نے کتے کو سیراب کر دیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس کام کی قدر فرمائی اور اس کو جنت عطا فرمائی۔

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:۔

استدل بہ المصنف علی طھارۃ سور الکلب الخ۔ (فتح الباری ص۲۷۵ ایضاً ص۲۲۳)

مصنف رح نے اس حدیث سے کتے کے جھوٹے کی طہارت پر استدلال کیا ہے۔

اس باب میں ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رض کی ہے۔

قال کانت الکلاب تقبل وتدبر فی المسجد فی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم یکونوا یرشون شیئا من ذلک۔

حضرت عبداللہ بن عمر رض کا بیان ہے کہ عہد رسالت میں کتے مسجد نبوی میں آتے جاتے تھے لیکن صحابہ کرام رض اس وجہ سے پانی نہیں چھڑکتے تھے۔

اس حدیث کے ذکر سے بھی امام بخاری رح کا مقصد بظاہر یہی ہے کہ کتے کا لعاب پاک ہے حالانکہ یہ بالکل ابتدائی دور کی بات ہے جب مسجد میں دروازے نہیں تھے اور بعد میں مسجد کی تطہیر اور تکریم کا حکم ہوا اور مسجد میں دروازے لگائے گئے تو کتوں کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا، اس پر مفصل اور مدلل بحث نصر الباری میں ہو گی انشاء اللہ۔

تاہم اتنا ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مسجد کے نہ دھونے سے لعاب کلاب کا پاک ہونا ہرگز نہیں ثابت ہوتا ہے کیونکہ زمین پر اگر پیشاب گر جائے اور دھوپ سے خشک ہو جائے، تو زمین پاک ہو جاتی ہے اس پر نماز پڑھنا درست ہے۔ یہی فقہائے احناف رح کہتے ہیں۔

(۲): امام بخاری رح نے ایک باب قائم کیا ہے باب تقضی الحائض المناسک کلھا الا الطواف بالبیت۔ (یعنی حائضہ عورت (حیض کی حالت میں) حج کے تمام ارکان ادا کر سکتی ہے مگر طواف بیت کی اجازت نہیں۔

امام نے اس باب کے تحت ایک روایت تعلیقاً ذکر فرمائی ہے۔

كان النبى صلى الله عليه وسلم يذكر الله على كل احيانه. (بخاری اول ص۴۴)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔

اس حدیث سے امام بخاری رح کا مقصد کیا ہے؟ علامہ عینی رح فرماتے ہیں:-

اراد البخارى بايراد هذا وبما ذكره فى هذا الباب الاستدلال على جواز قراءة الجنب والحائض لان الذكر اعم من ان يكون بالقرآن او بغيره. (عمدۃ القاری پاکستانی ص۲۴۴)

اس روایت کے ذکر سے امام بخاری رح کا مقصد یہ ہے کہ جنبی شخص اور حائضہ عورت کے لئے قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے کیونکہ ذکر عام ہے، قرآن مجید اور غیر قرآن سب کو شامل ہے للہذا قرآن مجید کی تلاوت بھی جائز ہے۔

حافظ عسقلانی رح لکھتے ہیں:-

ان مراد الاستدلال على جواز قراءة الحائض والجنب الخ (فتح الباری مصری ص۳۲۳ پاکستانی ص۴۲۰)

امام بخاری رح کا مقصد حائضہ اور جنبی کیلئے قرأت قرآن یعنی قرآن مجید کی تلاوت کے جواز کا استدلال کرنا ہے۔

مفصل بحث تو اپنے مقام پر آئیگی انشاء اللہ۔ یہاں صرف اتنا ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جمہور احناف و شوافع اور حنابلہ رحمہم اللہ کے نزدیک تلاوت کی نیت سے مکمل ایک آیت بھی جائز نہیں۔

رہا امام بخاری رح کا استدلال اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ ذکر کو عام رکھا جائے حالانکہ یہ محتمل ہے کہ یہاں ذکر سے مراد ذکر قلبی ہے یا تسبیحات و ادعیہ ہیں واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

ضروری تنبیہ احقر نے "مسامحات بخاری" کا عنوان قائم کر کے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف اکابر محدثین کی تحقیقات کی نقل ہیں، احقر کے پاس نہ اتنا علم ہے اور نہ اتنی نظر، یہ خاکسار تو فقط ناقل ہے اور اس نقل سے میرا مقصد صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اخیر دور ہی سے فقہاء اسلام و محدثین کرام رح نے شرعی مسائل و احکام کے اندر چھان بین، تحقیق و تدقیق جاری رکھی، یہ حضرات پیکر اخلاص تھے ان شیدایان اسلام و حامیان علوم نبویہ نے کسی مشہور و مقبول ترین شخصیت کی بھی دینی معاملہ میں رعایت نہیں کی البتہ ان حضرات نے تنقید کے اندر کبھی توہین کی آمیزش سے مکمل پرہیز کیا، خود امام بخاری رح نے اپنے شیخ الشیوخ امام الائمہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی رعایت نہیں کی اور صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر قال بعض الناس سے تعبیر فرمایا اگرچہ اس کی اصل وجہ امام اعظم رح کے مسلک سے ناواقفیت اور غلط فہمی ہے۔

بلاشبہ صحیح بخاری شریف اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے مگر اس سے یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہونی چاہیے کہ اس کی کل حدیثیں صحیح ہیں اس کے کل رواۃ غیر متکلم فیہ ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دیگر کتب احادیث کے مقابلے میں بخاری شریف کے اندر ضعاف انتہائی کم ہیں، نیز اس بات کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ امام کے تراجم ابواب اور ان کا استنباط تو کسی نے اصح نہیں کہا ہے اور نہ اس کی مقبولیت

اور پذیرائی ہے ورنہ یہ بھی ائمہ متبوعین میں سے ہوتے۔ اور ان بشری خامیوں کے باوجود امام بخاری رح کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہا جاتا ہے امام نے صحیح بخاری کی تالیف کر کے اسلام کی عظیم ترین خدمت سر انجام دی ہے اور مسلمانوں پر امام بخاری رح کا عظیم احسان ہے حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ امام بخاری رح کے درجات کو بلند فرمائیں اور ہمیں احادیث بخاری کے انوار و برکات سے بہرہ مند فرمائیں۔
آمین یا رب العالمین۔

شرح بخاری

صحیح بخاری کی مقبولیت کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ کتب حدیث میں سب سے زیادہ صحیح بخاری کی شرح لکھی گئی ہیں، کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے ۱۰۱۲ھ تک پچاس شروح کا تذکرہ کیا ہے پھر اس کے بعد ہر سال یہ سلسلہ جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اب تک عربی، فارسی اور اردو شروح و تراجم کی تعداد سو سے بلاشبہ زیادہ ہو چکی ہیں، ان سب کا تذکرہ تو مشکل ہے، صرف چند اہم اور مشہور و مقبول شرحیں درج ذیل ہیں۔

اتنی بات ذہن نشین رہے کہ اگلے اور پچھلے تمام شروح میں حق تعالیٰ نے تین شرحوں کو سب سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی ہے۔ وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشار۔

ان تین شروح کو ترتیب وار پہلے ذکر کیا جا رہا ہے۔

عمدۃ القاری المعروف بہ عینی:۔ یہ شرح حافظ ابن حجر عسقلانی رح کے معاصر (بلکہ استاد) شیخ الاسلام علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد بن موسیٰ المعروف بالبدر العینی رح کی شرح ہے، علامہ عینی رح ۱۷ رمضان المبارک ۷۶۲ھ میں بمقام عین تاب جلوہ فرمائے عالم ہوئے اسی نسبت سے آپ علامہ عینی سے مشہور ہوئے، علامہ عینی نے اس شرح (عمدۃ القاری) کو ۸۲۱ھ لکھنا شروع کیا اور جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ اس کو پچیس ۲۵ اجزاء میں مکمل کیا جو آج بارہ مجلدات پر مشتمل ہے، خداوند قدوس کا لاکھ لاکھ شکر و کرم ہے کہ پاکستان میں نہایت عمدہ کاغذ پر شائع ہو گئی ہے۔

(۲) فتح الباری:۔ یہ شرح حافظ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی تصنیف ہے یہ حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی سے مشہور و معروف ہیں آپ شعبان ۷۷۳ھ میں مصر میں پیدا ہوئے آپ نے صحیح بخاری کی عظیم شرح فتح الباری کے نام سے ۸۱۷ھ میں لکھنی شروع کی اور ۸۴۲ھ میں مکمل کیا جو آج مع مقدمہ چودہ ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی میں معاصرانہ چشمک رہتی تھی علامہ عینی رح جامع مویدی کے شیخ الحدیث تھے اور برج شمالی پر بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے، اس جامع مویدی کا ایک منارہ بوسیدہ ہو کر جھک پڑا تھا اس کو جدید تعمیر کیلئے گرا دیا گیا، اس موقعہ پر حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ اشعار کہے۔

لجامع مولانا المؤید رونق — منارته بالحسن تزهو وتزين
تقول وقد مالت عليهم تمهلوا — فليس على حسني اضر من العين

جامع مؤید بڑی بارونق ہے اس کا منارہ نہایت حسین و خوبصورت تھا وہ جھکتے وقت زبان حال سے کہہ رہا تھا مجھے چھوڑ دو (یعنی گرنے دو) میرے حسن کیلئے عین یعنی نظر بد سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں۔ اس میں حافظ عسقلانی رح نے

عین (النظر بد) سے علامہ عینی رح کا توریہ کیا ہے۔

علامہ عینی رح نے جب یہ اشعار سُنے تو علامہ نے حافظ عسقلانی کو یہ جواب بھیجا ؎

منارۃ کعروس الحسن قد جلیت — وھدمھا بقضاء اللہ والقدر

قالوا اصیبت بعین قلت ذا غلط — ما آفۃ الھدم الا خسۃ الحجر

منارہ دلہن کی طرح حسین و جمیل تھا جس کا گرنا (درحقیقت) قضا و قدر کی وجہ سے ہے

لوگوں نے کہا اسے نظر لگ گئی ہے میں نے کہا یہ غلط ہے یہ حجر (پتھر یا ابن حجر) کی خست یعنی شکستگی کی وجہ سے گرا۔

علامہ عینی اور حافظ عسقلانی رح دونوں بزرگوں نے ایک ہی زمانے میں بخاری کی شرحیں لکھی ہیں صرف فرق اتنا ہے کہ حافظ عسقلانی رح پہلے شروع کر چکے تھے یعنی حافظ ابن حجر عسقلانی نے ۸۱۷ھ میں شروع فرمایا اور ۸۴۲ھ میں پچیس ۲۵ سال کے اندر مکمل کر لیا۔ اور علامہ عینی رح نے ۸۲۱ھ میں شروع فرما کر ۸۴۷ھ میں چھبیس ۲۶ سال کے اندر مکمل فرمایا: چونکہ حافظ عسقلانی رح چار سال پہلے لکھنا شروع کر چکے تھے اور حافظ عسقلانی رح ہر ہفتہ اپنے تلامذہ کو جمع کرتے اور پورے ہفتہ کا لکھا ہوا اپنے تمیذ خاص برہان بن اخضر کو دیتے وہ سب کو سناتے اور سب کے سب نقلیں بھی کرتے۔ ان ہی برہان بن اخضر سے حافظ عسقلانی کی شرح علامہ عینی رح عاریۃً لیکر دیکھ لیا کرتے تھے پھر اپنی شرح میں جا بجا رَدّ کرتے گئے، جب علامہ کی شرح مکمل ہو کر لوگوں کے سامنے آئی تو سب حیران رہ گئے، پھر حافظ عسقلانی رح نے علامہ عینی کے اعتراضات کے جواب الانتقاض "اعتراض" کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور کتاب کی تکمیل سے پہلے ہی وفات پا گئے۔

بہر حال یہ دونوں شروح بخاری میں عظیم شرحیں ہیں اگرچہ فوائد و نکات معانی و بیان کے لحاظ سے عمدۃ القاری کو ترجیح حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳) ارشاد السّاری:۔ یہ شرح علامہ ابو العباس شہاب الدین احمد بن محمد خطیب قسطلانی کی شرح ہے اس شرح میں مذکورہ دونوں (فتح الباری، عمدۃ القاری) سے استفادہ کیا گیا ہے اگرچہ اصل ماخذ فتح الباری ہے یہ شرح خاصکر طلبہ کے لئے بہت مفید ہے۔ پہلے دس جلدوں میں آتی تھی لیکن اب بیروت سے نہایت عمدہ کاغذ پر پندرہ جلدوں میں آرہی ہے اور یہی نسخہ احقر کے سامنے ہے۔

علامہ قسطلانی کی ولادت ۸۵۱ھ میں اور وفات بروز جمعہ، محرم الحرام ۹۲۳ھ میں ہوئی۔

(۴) تیسیر القاری:۔ یہ شرح فارسی زبان میں چار جلدوں پر مشتمل ہے مشہور امام محدث حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح کے صاحبزادے حضرت شیخ نور الحق کی لطیف تالیف ہے اور بہت مفید ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں چھپ گئی ہے۔

(۵) لامع الدراری:۔ یہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے ارشادات کا مجموعہ ہے جس کو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رح نے مرتب فرمایا اور اس کی تنقیح حضرت مولانا زکریا صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور مہاجر مدنی رح نے فرمائی یہ شرح نہ صرف طلبہ حدیث بلکہ حضرات محدثین کے لئے بھی مفید ہے۔

اہم فائدہ قاضی ابوالعباس ولید بن ابراہیم جب رَی کی قضا سے معزول ہوئے، تو خود قاضی صاحب کا بیان ہے کہ مجھے علم حدیث کا شوق دامنگیر ہوا تو میں امام بخاری رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مقصد ظاہر کر کے میں نے درخواست کی کہ مجھ پر توجہ فرمائیں۔ ارشاد فرمایا: "اے بیٹے کسی کام کو اس وقت تک شروع نہ کرو جب تک کہ اس کے حدود اور مقادیر کی معرفت نہ حاصل کر لو" میں نے عرض کیا "حضور والا، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے میں نے جو مقصد آپ کے سامنے پیش کیا ہے یعنی علم حدیث کے حدود اور مقادیر کو بیان فرما دیجئے، تو ارشاد فرمایا:۔

اعلم ان الرجل لا یصیر محدثا کاملا فی حدیثہ الا بعد ان یکتب اربعا مع اربع کاربع مثل اربع فی اربع عند اربع باربع علی اربع عن اربع لاربع وکل ھٰذہ الرباعیات لاتتم الا باربع مع اربع فاذا تمت لہ کلھا ھان علیہ اربع وابتلی باربع فاذا صبر علیٰ ذٰلک اکرمہ اللہ تعالیٰ فی الدنیا باربع واثابہ فی الاٰخرۃ باربع۔

یعنی یاد رکھو کہ بغیر ان رباعیات کے کوئی کامل محدث نہیں بن سکتا۔ ہے اور جب یہ بارہ[۱۲] رباعیات یعنی اڑتالیس[۴۸] امور کوئی شخص مکمل کر لے اور اس کو نصیب ہو جائے تو پھر چار چیزیں اس پر آسان ہو جاتی ہیں یعنی اس کی نظر میں بمقابلہ علم ہیچ ہو جاتی ہیں اور چار چیزوں سے اس کا امتحان ہوگا پھر جب ان چودہ[۱۴] رباعیات پر صبر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں چار نعمتوں سے نوازے گا اور آخرت میں ایک رباعی یعنی چار نعمتیں عطا فرمائے گا۔

قاضی ولید کہتے ہیں کہ یہ سنکر میں نے عرض کیا کہ اس کی شرح فرما دیں تو امام بخاری رح نے ان رباعیات کی شرح فرمائی۔

(۱) ان یکتب اربعا:۔ یعنی چار چیزیں لکھے:۔

۱۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث ۲۔ صحابہ کرام رض کی روایات اور ان کی تعداد ۳۔ تابعین رح کی روایات واحوال۔ ۴۔ بعد کے علماء کی روایات اور ان کی تاریخ۔

(۲) مع اربع:۔ چار چیزوں کے ساتھ لکھے۔

۱۔ راویوں کے نام ۲۔ ان کی کنیت ۳۔ ان کی سکونت یعنی مکان ۴۔ ان کا زمانہ یعنی ولادت و وفات کی تاریخ۔

(۳) کاربع:۔ چار کے مانند (چار کی طرح)

۱۔ جیسے جیسے خطبہ یعنی تقریر کے ساتھ اللہ کی حمد ۲۔ توسل کے ساتھ دعا ۳۔ اور سورۃ کے ساتھ بسملہ۔ ۴۔ نماز کے ساتھ تکبیر۔

(۴) مثل اربع:۔ چار کے مثل۔

۱۔ مسندات۔ ۲۔ مرسلات ۳۔ موقوفات ۴۔ مقطوعات۔

(۵) فی اربع:۔ چار میں:۔

۱۔ کم سنی ۲۔ جوانی ۳۔ ادھیڑ عمر میں ۴۔ بڑھاپے میں۔

(۶) عند اربع چار حالتوں میں:۔

۱ فرصت کے وقت ۲ مشغولیت کے وقت یعنی علایم الفرصتی ۳ تنگدستی کے وقت ۴ خوشحالی کے وقت۔

(۷) **بأربع**:۔ چار مقامات میں:۔ ۱ پہاڑوں میں ۲ سمندروں میں ۳ شہروں میں ۴ جنگلوں میں۔

(۸) **علی اربع**:۔ چار چیزوں پر:۔ ۱ پتھروں پر ۲ ٹھیکروں پر ۳ چمڑوں پر ۴ ہڈیوں پر لکھے جب تک کاغذ میسّر نہ ہو۔

(۹) **عن اربع**:۔ چار سے:۔ ۱ اپنے بڑوں سے ۲ ہم عمروں سے ۳ اپنے چھوٹوں سے ۴ اپنے والد کی کتاب سے بشرطیکہ یقین ہو کہ باپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

(۱۰) **لاربع**:۔ چار مقصد کے لئے:۔ ۱ لوجہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ۲ اس پر عمل کرنے کے لئے جو کتاب اللہ کے موافق ہو ۳ طلبہ اور علم سے محبت کرنے والوں میں پھیلانے کے لئے ۴ اور تالیف کے لئے تاکہ اس کے بعد اس کا ذکر باقی رہے۔

یہ دس رباعیاں بغیر ان دو رباعیوں کے پوری نہ ہوں گی۔

(۱۱) **الا بأربع**:۔ ان چار کے بغیر پوری نہ ہوں گی ۱ کتابت کی معرفت یعنی لکھنے کا ڈھنگ ۲ علم لغت ۳ علم نحو ۴ علم صرف۔

(۱۲) **مع اربع**:۔ ان چاروں کے ساتھ جو عطائی ہیں ۱ قدرت ۲ صحت ۳ شوق ۴ قوت حافظہ۔ جب یہ بارہ رباعیات یعنی اڑتالیس چیزیں نصیب ہو جائیں تو پھر یہ چار چیزیں اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتی ہیں یعنی بمقابلہ علم یہ چار چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔

(۱۳) **هان علیه اربع**:۔ ۱ بیوی ۲ مال ۳ اولاد ۴ وطن۔

(۱۴) **وابتلی بأربع**:۔ اور چار چیزوں میں امتحان ہوتا ہے ۱ دشمنوں کی شماتت یعنی عداوت ۲ دوستوں کی ملامت ۳ جاہلوں کے طعن ۴ علماء کے حسد سے۔

(۱۵) **اکرمه الله عزوجل فی الدنیا بأربع**:۔ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں چار نعمتوں سے نوازے گا:۔
۱ قناعت کی عزت ۲ ہیبت نفس یعنی بارعب ہوگا ۳ علم کی لذت ۴ حیات ابد سے۔

(۱۶) **واثابه فی الآخرة بأربع**:۔ اور حق تعالیٰ آخرت میں چار نعمتیں عطا فرمائے گا:۔
۱ اپنے متعلقین میں سے جس کی چاہے سفارش کرے ۲ عرش الٰہی کا سایہ جس روز دوسرا کوئی سایہ نہ ہوگا ۳ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر سے جس کو پلانا چاہے پلائے گا۔ ۴ اور جنت میں، علی علیین کے اندر انبیاء کرام علیہم السلام کی مجاورت وقرب عطا فرمائیگا۔

اس کے بعد امام بخاری رح نے فرمایا: میں نے جو اپنے اساتذہ سے متفرق سنا تھا تم کو بتا دیا، اب تمہاری مرضی علم حدیث حاصل کرو یا اس ارادہ کو ترک کرکے کچھ مسائل واحکام سیکھ لو۔

قاضی ولید کا بیان ہے کہ اس تقریر نے مجھ کو گھبراہٹ میں ڈالدیا اور میں ادب سے گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ جب امام بخاری رح نے میری یہ کیفیت (فکرمند) دیکھی تو فرمایا:۔ اگر تم میں ان مشقتوں کے اٹھانے کی طاقت نہیں تو تم فقہ حاصل کرو، علم فقہ گھر بیٹھکر حاصل کرنا ممکن ہے اس کے لئے دور دراز کا سفر، شہر شہر گھومنے، سمندروں اور دریاؤں کے طے کرنے کی ضرورت نہیں، درآنحالیکہ فقہ بھی حدیث ہی کا ثمرہ ہے اور آخرت میں فقیہ کا ثواب محدث سے کم نہیں اور نہ فقیہ کی عزت محدث سے کم ہے، قاضی ولید کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو طلب حدیث کا ارادہ ختم کردیا اور فقہ حاصل کرنے

لگا یہانتک کہ اس میں آگے ہوگیا۔

بلاشبہ امام بخاری رح ایک عظیم محدث تھے، امیر المؤمنین فی الحدیث تھے لیکن فقہ میں ان کا مرتبہ ائمہ مجتہدین بالخصوص متبوعین کے مقابلے میں کم ہے اس لئے فقہ کے سلسلے میں ان کا قول حجت نہیں۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ فقہ کی بنیاد تین اصولوں پر ہے ۱ کتاب اللہ ۲ سنت رسول اللہ (یعنی احادیث) ۳ اجماع امت۔ اور یہ اصولی مسئلہ ہے۔ اب غور کیا جائے کہ فقہ کی بنیاد جن چیزوں پر ہے ان میں سے ایک حدیث پاک ہے اور بقول امام بخاری علم حدیث کیلئے اتنی رباعیاں ضروری ہیں تو پھر عرض یہ کرنا ہے کہ کتاب اللہ کیلئے کتنی چاہئیں، پھر اجماع امت کیلئے کتنی چاہئیں؟

جب اصولی بات معلوم ہوئی کہ مبانی فقہ میں سے حدیث ایک جزء ہے تو کل کا کیا حال ہوگا؟

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

معلوم ہوا کہ امام بخاری رح کا فقہ کو آسان کہنا صرف اس وجہ سے ہے کہ حضرت امام نے فقہ کی پوری حلاوت نہیں پائی لیکن کچھ چاشنی چکھ چکے تھے جس کی وجہ سے یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔ لیس ثواب الفقیہ دون ثواب المحدث فی الآخرۃ ولا عناۃ باقل من عز المحدث (قسطلانی ص ۳۶)

آخر اس ارشاد کا کیا مطلب ہے جبکہ قانونِ خداوندی ہے اجورکم علی نصبکم۔ العطایا بقدر البلایا

چنانچہ امام ترمذی رح فرماتے ہیں "وھو رای الفقہاء اعلم بمعانی الحدیث (ترمذی جلد اول ص ۱۱۸)

یعنی حدیث پاک کا اصل معنی اور صحیح مفہوم فقہاء زیادہ جانتے ہیں)

مسئلہ رضاعت

امام بخاری رح کے استنباطی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر لڑکے اور لڑکی نے ایام رضاعت میں کسی بکری کا دودھ پی لیا تو دونوں میں رضاعت کا رشتہ ثابت ہو جائیگا جس سے علماء بخارا میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں حالانکہ امام ابو حفص کبیر رح نے امام بخاری رح کو استنباط و اجتہاد سے منع فرما دیا تھا کہ آپ مسائل نہ بتائیں آپ کا فن علم حدیث ہے آپ حدیث پاک کا درس دیں۔ لیکن امام بخاری رح نے امام ابو حفص رح کی نصیحت قبول نہیں کی اور ایسا فتویٰ دیا کہ علماء بخارا سخت ناراض ہو گئے چنانچہ علامہ ابن ہمام رح لکھتے ہیں "ونقل ان الامام محمد بن اسماعیل البخاری صاحب الصحیح افتیٰ فی بخاری بثبوت الحرمۃ بین صبیین ارتضعا شاۃ فاجتمع علماؤھا علیہ وکان سبب خروجہ منھا (فتح القدیر ص ۳۲ کتاب الرضاع)

یہی مولانا جلال الدین صاحب "کفایہ" لکھتے ہیں:۔ وکان محمد بن اسماعیل رحمہ اللہ صاحب الحدیث یقول تثبت بہ حرمۃ الرضاع فانہ دخل بخارا فی زمن ابی حفص الکبیر وجعل یفتی فقال لہ الشیخ لا تفعل فلیس ھنالک (یعنی آپ فتوی بازی نہ کیجئے کیونکہ آپ اس کے مستحق نہیں ہیں) فابی ان یقبل نصیحتہ حتی استفتی عن ھذہ المسئلۃ اذا ارضع صبیان بلبن شاۃ فافتی بثبوت الحرمۃ فاجتمعوا واخرجوا من بخارا بسبب ھذہ الفتوی۔

(کفایہ شرح ہدایہ علی فتح القدیر کتاب الرضاع)

بعض حضرات کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس فتوی کی نسبت صرف فقہائے احناف نے امام بخاری رح کی طرف کی ہے حالانکہ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قاضی حسین بن محمد مالکی رح نے بھی لکھا ہے۔ (دیکھو تاریخ الخمیس ص ۳۴۲ ج ۲) نیز علامہ ابن حجر مکی شافعی رح کی (الخیرات الحسان ص ۷۳)

وللہ در القائل۔ ومن لو یدق نظرہ فی مناطات الاحکام وحکمھا کثر خطؤہ"۔

بہرکیف امام بخاری رح امیر المؤمنین فی الحدیث تھے لیکن فقاہت میں کمزور ضرور رہے لکل فن رجال۔

مقام غور ہے کہ امام ترمذی رح امام بخاری رح کے تلمیذ خاص بلکہ خلیفہ و جانشین تھے لیکن امام ترمذی رح نے کہیں بھی ان کو ائمہ مجتہدین کی صف میں شمار نہیں کیا "فتدبر فی الترمذی"

سلسلۂ اسناد

سلسلۂ اسناد امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا طرۂ امتیاز ہے، یہ سلسلہ دین اسلام کے علاوہ کسی اور دین میں قطعاً نہیں پایا جاتا خواہ وہ دین سماوی ہو یا غیر سماوی کہ وہ کسی بات کو بالسند المتصل ذکر کرتا ہو، پورے عالم میں اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں یہ بات نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنے پیغمبر یا مقتدا کے اقوال و افعال و احوال کو سند متصل سے بیان کرتے ہوں یا کر سکتے ہوں، مسلمانوں کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے جو ایمانی عقیدت و محبت ہے، دیگر امتوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ گذشتہ امتوں میں اس کی نظیر تلاش کرنا کوہ کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا جو جانے کے لئے آیا وہ وقت کے ساتھ چلا گیا، نہ اس کی حفاظت ضروری تھی اور نہ خالق کائنات کی جانب سے اس کا وعدہ ہی ہوا تھا۔ یہ رسالت چونکہ آخری رسالت ہے اور اس کے تا قیامت بقاء و دوام کا فیصلہ ہے اس لئے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی ہوا "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون"، اور قدرت کی جانب سے ایسا ہی مستحکم نظام قائم کیا گیا تاکہ کسی وقت کسی کو اصل دین کی تلاش و جستجو میں ناکامی کا عذر پیش کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

بہرکیف سلسلۂ اسانید صرف اسی امت مرحومہ کی خصوصیت ہے جس کا اقرار غیر مسلم مؤرخین و محققین کو بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ کتب احادیث میں روایات کو مع السند بیان کیا گیا اور اس کی تحقیق کے لئے نہایت عظیم الشان اصول بھی مقرر کئے گئے۔ پھر مشائخ حدیث کا یہ دستور چلا آرہا ہے کہ وہ اپنی اسانید کتاب وہاں تک بیان کر دیتے ہیں جہاں تک معروف و مطبوعہ نہ ہو۔ علی العموم اساتذۂ حدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح تک اپنی سند بیان کر دیتے ہیں اس لئے کہ اس کے آگے کے اسانید مطبوعہ ہیں، خود حضرت شاہ صاحب رح نے مستقل رسالہ "الارشاد الی مہمات الاسناد" میں اپنی تمام سندوں کو بیان کر دیا ہے، اسی طرح حضرت شاہ عبدالغنی رح کی "الیانع الجنی فی اسانید عبد الغنی"، کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہے۔ (ماخوذ از جامع الدراری)

میری سند

احقر نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن "دینی مکتب چلمل" میں حاصل کرنے کے بعد عربی کی ابتداء مدرسہ اشرف العلوم بڑا کٹھرہ چوک بازار ڈھاکہ میں کی وہاں چار برس پڑھنے کے بعد چند سال بعض مجبوریوں کی بنا پر تعلیمی سلسلہ بند رہا پھر چند سال مختلف مدارس کی خاک چھاننے کے بعد ۱۹۴۷ء میں ازہر ہند دار العلوم دیوبند پہنچا اور چار سال رہ کر دورۂ حدیث سے مشرف ہوا بخاری شریف مکمل (اول و ثانی) اور ترمذی جلد اول شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

نور اللہ مرقدہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اور ترمذی شریف جلد ثانی مع شمائل ترمذی اور ابوداؤد شریف مکمل شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہ سے پڑھی اور مسلم شریف کامل جامع المنقول والمعقول حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی نور اللہ مرقدہ سے پڑھی اور نسائی شریف حضرت مولانا فخر الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ سے پڑھی۔

اب پوری سند مسند حدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح تک ملاحظہ ہو:-

قال العبد الضعيف محمد عثمان غنی بن مولوی عبد الله الصديقی حدثنا شيخ الاسلام السيد حسين احمد المدنی قال حدثنا شيخ الهند محمود حسن الديوبندی عن شيخه الحجة العارف محمد قاسم النانوتوی وعن شيخه المحدث الفقيه الشيخ رشيد احمد الگنگوهی كلاهما عن المحدث الشيخ عبد الغنی المجددی الدهلوی وعن الشيخ احمد علی السهارنفوری وعن الشيخ محمد مظهر النانوتوی وعن الشيخ القاری عبد الرحمان الفانيفتی وهؤلاء الاربع عن الشيخ المحدث محمد اسحاق الدهلوی عن جده لامه المحدث الحجة الشاه عبد العزيز الدهلوی عن والده الامام الشاه ولی الله الدهلوی واسانيده الى اصحاب السنن مذكورة فی رسالته "الارشاد الی مهمات علم الاسناد"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا ومولانا محمد اکرم الاولین والاٰخرین وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ اجمعین وعلینا معھم یا ارحم الراحمین۔

اما بعد فان اصدق الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار وبالسند المتصل منا الی الامام الحافظ الحجۃ امیر المؤمنین فی الحدیث ابی عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراھیم بن المغیرۃ بن بردزبۃ الجعفی البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ ونفعنا بعلومہ آمین انہ قال:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام بخاری رحمہ نے اس اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کو بسم اللہ سے شروع فرمایا چونکہ مصحف عثمانی میں باجماع صحابہ سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی گئی ہے، نیز ارشاد نبوی کی اتباع ہے اس لئے کہ حدیث پاک "کل امر ذی بال لم یبدأ فیہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو اقطع" میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تسمیہ سے ہر ذی بال اور اہم چیز کی ابتداء کا حکم دیا ہے، نیز آپؐ کے گرامی قدر مکاتیب وتحریرات کی ابتداء تسمیہ ہی سے ہے۔ ہر دو سورتوں کے درمیان بھی فصل کے لئے موجود ہے، ہر دینی کتاب کی ابتداء میں اسی کا جلوہ ہے، پھر بخاری شریف میں جتنا بسم اللہ کا اہتمام ہے اتنا غالباً کسی کتاب میں نہیں ہے۔

احقر نے اپنی بخاری میں شمار کیا تو ایک سو تینتیس[۱۳۳] مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پایا۔

اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے اسی رسم جاہلیت کو مٹانے کیلئے قرآن حکیم کی سب سے پہلی آیت جو جبرئیل امین لے کر آئے، اس میں قرآن مجید کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا اقرأ باسم ربک۔

علامہ سیوطی رحمہ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی تھیں اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن اور امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے مگر الفاظ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن حکیم کی خصوصیت ہے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے، باسمک اللّٰھم کہتے اور لکھتے تھے جب آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تو انہیں الفاظ کو اختیار فرمالیا اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہوگئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بسم اللہ درحقیقت شاہی مہر ہے، دستور یہ ہے کہ جب کوئی چیز حکومت کو پسند آجاتی ہے تو شاہی مہر لگاکر

لگا کر وہ خزانہ میں داخل کر دی جاتی ہے پھر اس کی حفاظت اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح شاہی خزانہ کی نگرانی ہوتی ہے۔ پس مومن کو حکم دیا گیا کہ ہر کام کی ابتداء بسم اللہ سے کرے تاکہ وہ عند اللہ مقبول ہو اور بابرکت ہو جائے۔

رسم الخط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اسقطت الالف لکثرۃ استعمالها وطوّلت الباء عوضا قال البغوی قال عمر بن عبد العزیز طوّلوا الباء واظهروا السین ودوّروا المیم تعظیما لکتاب اللہ (تفسیر المظہری ص۲)

یعنی قاعدہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ الف کے ساتھ (باسم اللہ) لکھا جاتا لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے الف کو ساقط کر دیا گیا اور اس کے عوض میں بار کو طویل کر دیا گیا۔ علامہ بغوی رح فرماتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز رح نے فرمایا بار کو طویل کرو اور سین کے دانتوں کو ظاہر کرو، میم کو گول لکھو کتاب اللہ کی تعظیم کے لئے اس لئے کہ اس صورت میں تحسین خط ہے، اہتمام لفظ پر محافظت بھی ہے اور تعظیم بھی۔

ترکیب بسم اللہ الخ باء حرف جار، اسم مضاف اللہ موصوف رحمٰن صفت اول رحیم صفت ثانی، موصوف اپنی دونوں صفتوں سے مل کر مضاف الیہ ہوا اسم مضاف کا، اسم مضاف اپنے مضاف الیہ سے ملکر مجرور ہوا جار کا، جار مجرور کے لئے کوئی ایسا متعلق نکالنا چاہئے جو جملہ بن سکے چونکہ جار مجرور نہ تو جملہ ہے اور نہ بغیر کسی متعلق کے جملہ بن سکتا ہے تو چونکہ باء حرف جار ہے اور اس کا متعلق مذکور نہیں ہے پس اس کا متعلق یا تو اسم ہوگا یا فعل، پھر ان دونوں صورتوں میں عام ہوگا یا خاص، پھر چاروں صورتوں میں مقدم ہوگا یا مؤخر؟ یہ آٹھ صورتیں ہوئیں۔

اہل بصرہ کہتے ہیں کہ متعلق اسم مقدم ہے یعنی ابتدائی کائن بسم اللہ الخ اور اہل کوفہ کے نزدیک فعل مقدم پوشیدہ ہے۔

بہر حال نحویوں کے نزدیک خواہ اہل کوفہ ہوں یا اہل بصرہ سب کے نزدیک متعلق خواہ اسم ہو یا فعل مقدم ہوگا چونکہ عامل معمول پر مقدم ہوتا ہے۔

لیکن ابن جریر، ابن کثیر، علامہ زمخشری، قاضی بیضاوی وغیرہم محققین نے فعل خاص کو اور وہ بھی مؤخر کو راجح قرار دیا ہے یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اُصنّف یا اقرأ یا آکل وغیرہ۔

ایک اشکال حدیث میں ہے کل کلام لا یبدأ فیہ بحمد اللہ فھو اجذم (ابوداؤد ص۲۶۵) ایضا نسائی۔
وفی روایۃ کل امرذی بال لا یبدأ فیہ بالحمد اقطع (ابن ماجہ ص۱۳۶ ابواب النکاح)
ورواہ ابن حبان وابو عوانۃ فی صحیحهما وقال ابن الصلاح هذا حدیث حسن بل صحیح (الابواب والتراجم ص۲)

اب اشکال یہ ہے کہ امام بخاری رح نے اپنی عظیم الشان کتاب صحیح بخاری کو حمد سے کیوں نہیں شروع فرمایا؟

جوابات اولاً تو یہ اشکال قابل تسلیم نہیں، امام بخاری رح نے اپنی دقت نظر اور باریک بینی سے بسم اللہ سے آغاز کر کے حمد اللہ کی حدیث پر بھی عمل فرمایا ہے کیونکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں الرحمٰن اور الرحیم موجود ہیں اور یہ دونوں اوصاف ربانی ہیں، حمد سے مقصود بھی اللہ تعالیٰ کے اوصاف عالیہ وکمالیہ کا اظہار ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کی تکمیل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے بخوبی ہو جاتی ہے لہٰذا اشکال کی گنجائش ہی نہیں، بصورت تسلیم اس اشکال کے متعدد جوابات منقول ہیں:۔

۲ ان میں اصح ترین جواب یہ ہے کہ یہ روایت مختلف الفاظ سے منقول ہے، بعض روایت میں بسملہ سے شروع کرنا مذکور ہے بعض میں حمد اللہ اور بعض میں ذکر اللہ سے۔ علامہ نووی رح نے تینوں الفاظ کو پیش نظر رکھکر یوں تطبیق دی ہے کہ مقصود قدر مشترک ہے یعنی ذکر اللہ کا تحقق، خواہ حمد اللہ سے ہو یا بسم اللہ سے۔ اس لئے امام بخاری رح نے بسم اللہ کو کافی سمجھا۔
اس کا حاصل یہ نکلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک لفظ استعمال فرمایا تھا اور اغلب یہ ہے کہ وہ اسم اللہ یا ذکر اللہ کا لفظ عام تھا جس میں حمد اور شہادت بھی داخل ہو جاتی ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ذکر اللہ سے ابتدار تھا لہذا بعض راویوں نے اسے حمد سے تعبیر کردیا اور بعض نے شہادت سے،
الغرض ہتم بالشان کی ابتدار ذکر اللہ سے ہونی چاہئے خواہ وہ ذکر کسی صورت سے ہو، البتہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ خطبوں (تقاریر) کی ابتدار حمد سے کی جائے اور مکاتیب (کتب و خطوط) کی ابتدار بسم اللہ سے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقہ یہی تھا۔
علامہ زرقانی رح شرح مؤطا میں فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل جو ہمیں تتبع سے معلوم ہوا یہ تھا کہ خطبات کی ابتدار تحمید سے اور کتب و خطوط کی ابتدار تسمیہ سے فرماتے تھے، چنانچہ ہرقل وغیرہ کے نام خطوط اور حدیبیہ کے صلح نامہ میں تسمیہ سے ابتدا فرمائی۔
۳ قرآن مجید کی پہلی آیت اقرأ باسم ربك ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے نام سے قرأت کا حکم ہے اس میں حمد کا حکم نہیں، تو چونکہ صحیح بخاری کتاب ہے اس لئے اس کے مناسب یہی تھا کہ آپ کے خطوط، کتب اور قرآن مجید کا اتباع کیا جائے۔
۴ علاوہ ازیں اکتفار علی الواحد کی صورت میں یہی طریقہ چلا آتا ہے کہ تسمیہ پر اکتفار کیا جاتا ہے،
انبیار سابقین علی نبینا و علیہم السلام کے خطوط میں بھی بسم اللہ تحریر ہوتی تھی۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط منقول ہے جو بہت مختصر اور پر معنی ہے، ایسا بلیغ اور پر شوکت خط صفحۂ ہستی پر کسی غیر نبی نے تحریر نہیں کیا۔ فرماتے ہیں انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ان لا تعلوا علی وأتونی مسلمین،
اس کے قریب قریب ہارون رشید کا وہ شاندار خط ہے جو انہوں نے قیصر روم لقفور کے نام لکھا تھا (بعض تواریخ میں نقفور لکھا ہے) جبکہ اس نے جزیہ دینے سے انکار کردیا تھا اور کہا کہ مجھ سے پہلی ملکہ نسوانی ضعف و حماقت کی وجہ سے جزیہ ادا کرتی رہی ہے۔ جب میرا خط پہونچے تو ملکہ کے دیے ہوئے اموال فوراً واپس کردیں ورنہ میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔
ہارون الرشید نے اس کے خط کی پشت پر یہ جواب لکھا من ھارون امیر المؤمنین الی یقفور کلب الروم قد قرأت کتابك یا ابن الکافرة والجواب ماتراہ لا ماتسمعہ"
اور اسی روز ایک لشکر جرار لیکر اس کی سرکوبی کے لئے چلدیے (ارشاد القاری بحوالہ تاریخ الخلفار للسیوطی رح)
۵ بعض نے تحمید سے شروع نہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، مگر یہ شانِ بخاری رح کے مناسب نہیں جب کہ امام بخاری رح ہر حدیث سے قبل غسل، دو رکعت نفل اور استخارہ کا اہتمام فرماتے تھے، حالانکہ ان امور کے متعلق کوئی ضعیف روایت بھی نہیں تو باب فضائل میں بدایۃ بالتحمید کو ضعیف سند کی وجہ سے چھوڑ دینا معقول نہیں۔
علاوہ ازیں چار جبال حدیث یعنی حافظ ابن صلاح، ابوعوانہ ابن حبان اور تاج الدین سبکی نے اس کی تصحیح کی ہے۔

؎ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ کتابت بالتحمید شرط نہیں صرف تلفظ باللسان بھی کافی ہے۔ خطیبؒ نے جامع میں روایت کیا ہے کہ امام احمد رح حدیث لکھتے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پر پہنچتے تو صرف زبان سے درود شریف پڑھ لیتے تھے لکھتے نہ تھے۔ (فتح الباری ص۸)

حضرت مؤلف کا مہتم بالشان آغاز

؎ گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن ؎ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ تو ظاہر ہے کہ چمن میں اگر ایک ہی قسم کے پھول پتے ہوں تو بھی چمن چمن ہی ہے لیکن اگر مختلف انواع واقسام کے رنگ برنگ کے پھول پتے ہوں تو چمن کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔

محدثین عظام نے اپنی اپنی کتابوں کا آغاز اپنی اپنی فکر و نظر کے لحاظ سے مختلف مضامین سے کیا ہے۔

امام بخاری رح نے صحیح بخاری کے شروع کرنے کیلئے مہتم بالشان اور بنیادی مضمون کو اختیار فرمایا۔

مثلاً امام مسلم رح نے سب سے پہلے مسئلہ اسناد کو پیش فرمایا کیونکہ دین کا مدار سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور سنت میں صحیح وسقیم کا امتیاز صرف اسناد کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رح فرماتے ہیں:

الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء (مقدمہ مسلم ص۱۲، ایضاً ترمذی جلد ثانی ص۲۳۶ کتاب العلل)

اور اگر مقدمہ کو صحیح مسلم سے خارج مانیں تو کہا جائیگا کہ امام مسلم رح نے کتاب الایمان سے افتتاح کیا ہے اس لئے کہ مکلف پر سب سے پہلے اور اہم فریضہ ایمان ہے اور اسی پر سارے اعمال کا دار ومدار ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ بغیر ایمان کوئی عبادت معتبر نہیں اور نہ کوئی عمل نجات من النار کا باعث ہوگا۔

امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہم اللہ وغیرہ نے خیال فرمایا کہ ہماری کتاب اہل ایمان کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے اور ایک مومن کے ذمہ سب سے اہم فریضہ نماز ہے، دین کا ستون ہے اس لئے نماز کا بیان مقدم ہونا چاہئے لیکن چونکہ نماز کے لئے طہارت شرط ہے، "مفتاح الصلوٰۃ الطهور" اور شرط کا مشروط سے پہلے ہونا ضروری ہے اس لئے ان حضرات نے اپنی اپنی کتابوں کو طہارت سے شروع کیا۔ امام طحاوی رح نے بھی طہارت ہی سے کتاب کا افتتاح کیا لیکن ان کی توجہ اس جانب رہی کہ طہارت صغریٰ ہو یا کبریٰ، وضو ہو یا غسل، ہر ایک کے لئے پانی درکار ہے اس لئے پانی کی طہارت و نجاست کے مسئلہ کو مقدم کیا۔ امام ابن ماجہ رح نے اتباع سنت سے ابتداء کی اس لئے کہ دین سنت کا نام ہے اگر سنت و بدعت کا امتیاز اٹھ جائے سنت کے ساتھ بدعت کا اختلاط ہو جائے تو دین کی حقیقت ہی ختم ہو جائے، نیز قرآن مجید کی تفسیر وہی مقبول ہوگی جو سنت بیان کرے گی۔ اس کے بعد مناقب صحابہ کو اسلئے بیان فرمایا کہ انہیں حضرات رضی اللہ عنہم کے توسط سے دین و قرآن ہم کو ملا پس ان پر اعتماد ضروری ہے۔ جب تک ان حضرات پر اعتماد نہ ہوگا اس وقت تک نہ قرآن پر ایمان کامل ہو سکتا ہے، نہ سنت پر۔ امام مالک رح نے اپنے مؤطا کی ابتداء اوقات صلوٰۃ سے فرمائی ہے کیونکہ

نماز کے لئے وقت سبب ہے۔ وقت سے پہلے نہ تو نماز فرض ہوتی ہے نہ صحیح ہوتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔"

تو چونکہ اسلام کا اہم ترین فریضہ یعنی نماز موقوف ہے تعین وقت پر، اس لئے امام مالک رحمہ نے اوقات صلوٰۃ سے ابتدا فرمائی، ان تمام محدثین کرام سے بالکل الگ اپنے مقام رفیع کے مناسب نہایت مہتم بالشان اور بنیادی چیز بدء الوحی سے شروع فرمایا ہے

گلستاں میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا ؛ نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

امام بخاری رحمہ نے کتاب الایمان سے پہلے باب بدء الوحی " سے ابتدا کر کے اشارہ کیا ہے کہ کوئی امر ایمان وایمانیات میں قابل قبول نہیں جب تک کہ وہ مستند الی الوحی نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ دین کا مدار وحی الٰہی پر ہے، سارے امور شرعیہ کا منبع و سرچشمہ وحی ہے، مرضیات الٰہی کا علم بغیر وحی ہو ہی نہیں ہو سکتا لہٰذا سب سے زیادہ اعتماد اور وثوق کی چیز وحی ہے خواہ وحی متلو ہو یا غیر متلو۔

فلاسفہ منطق کی تعریف میں کہتے ہیں، " تعصم مراعاتھا الذھن عن الخطأ فی الفکر " حالانکہ منطق خود غلطی سے معصوم نہیں تو دوسروں کے لئے عاصم کیونکر ہوگی؟ چنانچہ فلاسفہ میں سیکڑوں اختلافات پائے جاتے ہیں کوئی جسم کو ہیولیٰ اور صورت سے مرکب مانتا ہے اور کوئی اجزاء دیمقراطیسیہ سے، پہلے کسی زمانے میں زمین کے متحرک ہونے کا خیال تھا پھر ایک طویل زمانے تک جملہ عقلاء آسمانوں کو متحرک مانتے رہے، اور دورِ حاضر کے سائنسداں پھر زمین کو متحرک کہنے لگے ؎

نورِ دل از سینۂ سینا مجو ؛ روشنی از چشم نابینا مجو

صدرا و قاضی مبارک چشمنی ؛ عمر در تحصیل این ضائع کنی

چند خوانی حکمتِ یونانیاں ؛ حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

صحت ایں حس بجوئید از طبیب ؛ صحت آں حس بجوئید از حبیب

تحصیل علم کے تین اسباب ہیں، شرح عقائد میں ہے " اسباب العلم ثلاثۃ الحواس السلیمۃ والعقل والخبر الصادق " پھر خبر صادق کی دو قسمیں ہیں ۱۔ خبر متواتر ۲۔ وحی۔ اس طرح اسباب علم چار ہو گئے، لیکن عقلاً اور نقلاً ثابت ہے کہ ان سب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد وحی ہے۔

عقل میں غلطی واقع ہونا اور ثابت ہو چکا کہ اہل عقل میں اختلافات کثیرہ اور ایک دوسرے پر تردید پائی جاتی ہے۔

اسی طرح حس بھی غلطی کرتی ہے چنانچہ چاندنی رات میں بادل چلتے ہیں مگر یہی دکھائی دیتا ہے کہ چاند بھاگا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ریل گاڑی پر سوار ہوں اور قریب سے دوسری گاڑی گذرے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گاڑی چل رہی ہے، چلتی گاڑی سے باہر نظر ڈالیں تو درخت وغیرہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ تو نظر کی غلطی ہوئی، اسی طرح قوت سامعہ، ذائقہ وغیرہ حواس سے بھی غلطی ہوتی ہے چنانچہ غلبہ صفرا کی حالت میں شہد کڑوا معلوم ہوتا ہے، یرقان والا ہر چیز کو زرد دیکھتا ہے، احول ایک کو دو دیکھتا ہے، پس غلطی سے منزہ اور پاک صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو مستند الی الوحی ہو۔ خبر متواتر اگرچہ قابلِ اعتماد ہے مگر یہ محسوس ہی تک محدود ہے غیر محسوس میں اس کا قابلِ اعتماد و یقین ہونا ضروری نہیں۔

اولیاء اللہ کے کشف بھی مختلف ہوتے ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ مقدس جماعت حضراتِ صحابہ رضی کی ہے مگر وہ بھی

اختلاف سے بچ نہ سکے۔

صرف انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت ہی ایسی ہے کہ ان میں کوئی اصولی اختلاف نہیں پایا جاتا، مسائل جزئیہ میں جو انبیاء علیہم السلام کا اختلاف نظر آتا ہے وہ بھی حقیقت میں اختلاف نہیں بلکہ اختلاف جزئیات اختلاف ازمنہ کی بنا پر ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کوئی مریض کسی طبیب کے پاس جاتا ہے، طبیب نے اپنے ذہن میں اس کے مکمل علاج کا خاکہ یوں تیار کیا کہ پہلے چند روز تک منضج دیا جائیگا پھر مسہل پھر مبردات پھر مقویات۔ یہ طبیب منضج دے چکا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا، اب یہ مریض دوسرے طبیب کے پاس گیا تو وہ اب منضج کے بجائے مسہل دیتا ہے اس کے بعد اگر تیسرے طبیب کے پاس جائیگا تو مبردات تجویز کریگا، چوتھے طبیب کے پاس گیا تو وہ مقویات استعمال کرائیگا۔ بظاہر مریض یہ سمجھیگا کہ ہر نئے طبیب نے پہلے طبیب کے نسخہ کو بدل دیا ہے اور کہیگا کہ ان اطباء کے علاج میں اختلاف ہے حالانکہ حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں اگر طبیب اوّل کا علاج ہی جاری رہتا تو وہ بھی اپنے ذہنی نقشہ کے مطابق مدت معینہ کے بعد نسخہ بدل دیتا۔ غرضیکہ انبیاء علیہم السلام میں حقیقۃً کوئی اختلاف نہیں۔ حدیث میں ہے الانبیاء اخوۃ لعلات امہاتہم شتی ودینہم واحد (متفق علیہ)

مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مبدأ فیض واحد ہے یعنی وحی الٰہی۔ اس لئے اصول میں کوئی اختلاف نہیں البتہ قوابل یعنی طبائع امم کے اختلاف کی وجہ سے جزئی اختلافات پائے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کی شریعت کی تغلیط وتکذیب کرے۔ جیساکہ اور فرقوں کے اختلافات میں ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تغلیط وتکذیب کرتے ہیں۔

حاصل یہ کہ جب تک استناد الی الوحی نہ ہو اس وقت تک کسی امر کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ نبی کی رائے من حیث الرای بھی حجت نہیں جب تک کہ وحی سے نہ ہو جیسے کہ قصہ بریرہ رضؓ اور واقعہ تابیر نخل سے واضح ہے۔ پس خالق کائنات خداوند قدوس کی مرضیات ونامرضیات کے معلوم کرنے کے لئے کسی قطعی یقینی اور جامع مانع ہمہ گیر ہدایت کی ضرورت ہے اور وہ وحی کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں صرف وحی قطعی اور یقینی اور بہمہ وجوہ فلاح وکامیابی کی متکفل ہے، ارشاد الٰہی ہے۔

وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ (پ ۲۴، آخری رکوع)

اور یہ (قرآن) بڑی باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اسکے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے یہ خدائے حکیم وحمید کی نازل کردہ ہے۔

اسی لئے امام بخاری رحؒ نے "باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سے کتاب کی ابتدا فرمائی۔

حضرت علامہ کشمیری رحؒ نے ایک نہایت لطیف نکتہ بیان فرمایا کہ وحی کے ساتھ افتتاح کرنے سے امام بخاری رحؒ کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا تعلق وحی ہی کے ذریعہ قائم ہوتا ہے پھر اس ثبوت کی ضرورت ہے کہ ہم

خدا سے متعلق ہیں یعنی ایمان۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تعلق (یعنی ایمان) عمل کو چاہتا ہے اور عمل کے لئے علم کی ضرورت ہے، اسی مناسبت سے امام نے وحی کے بعد کتاب الایمان پھر علم کے ابواب لائے اور پھر اعمال کا سلسلہ شروع فرمایا۔

غرضیکہ کتاب کی ابتداء وحی سے فرمائی پھر وحی کے احکام اصول و فروع بیان فرمائے، اور کتاب کا اختتام کلمتان حبیبتان الی الرحمٰن خفیفتان علی اللسان الخ پر کیا تاکہ وحی کے ذریعہ نازل شدہ احکام کی جزاء پر تنبیہ ہو جائے۔

● "باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقول اللّٰہ عز وجل انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ" ●

ترجمہ:- یہ باب اس بیان میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کی ابتداء کس طرح ہوئی؟ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے جس طرح نوح ؑ اور ان کے بعد والے انبیاء کے پاس بھیجی تھی۔

تشریح:- باب اصل میں بَوَب بفتح الواؤ تھا، واؤ متحرک ماقبل فتحہ کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا اس کی جمع ابواب آتی ہے، الباب اصلہ البوب قلبت الواو لتحرکھا وانفتاح ما قبلھا وتجمع علی ابواب المراد من الباب ھھنا النوع (عمدۃ ص۳۳)

اصطلاح:- محدثین کرام وفقہائے عظام کا دستور ہے کہ ان کی تالیفات کا جو حصہ مختلف الانواع مسائل پر مشتمل ہو اس کی تعبیر کتاب سے کرتے ہیں اور جو حصہ متحد النوع مسائل پر مشتمل ہو اس کی تعبیر باب سے کرتے ہیں اور کسی ایک صنف یا جزئی کی تالیف کو فصل کہتے ہیں پس کتاب بمنزلہ جنس کے ہے جیسے حیوان اور باب بمنزلہ نوع کے ہے جیسے انسان۔

وجہ تسمیہ:- باب کے لغوی معنی مدخل یعنی دروازہ کے ہیں جس طرح دروازہ کے ذریعہ مکان اور کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اسی طرح باب کے ذریعہ گویا ایک نوع کے مسائل میں داخل ہوتے ہیں اسلئے تشبیہا لباب البیت اس کو باب کہتے ہیں۔

سوال:- امام نے باب کا لفظ کیوں لکھا؟ کتاب سے کیوں تعبیر نہ فرمایا؟

جواب:- ١ اصل کتاب تو ایمان سے شروع ہے اسلئے وہاں کتاب الایمان کہا، یہ مقدمہ ہے اس لئے باب سے تعبیر فرمایا ٢ ایک نوع یعنی وحی کا بیان ہے اس لئے باب سے تعبیر کیا دستور کے مطابق۔

٣ وحی مقسم ہے ایمان، ایمانیات، عبادات و معاملات وغیرہ سب قسمیں ہیں وحی کی، پس اگر اس جگہ بھی کتاب لکھتے تو ایہام ہوتا کہ وحی اور ایمان وغیرہ ایک دوسرے کے قسیم ہیں پس کوئی مقسم نہ رہتا اسلئے فرق پیدا کرنے کیلئے مقسم کو باب سے اور بقیہ قسموں کو کتاب سے تعبیر کیا (عمدہ)

بعض نسخوں میں تو یہاں باب کا لفظ ہے ہی نہیں جیسا کہ فتح الباری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علامہ قسطلانی رح فرماتے ہیں "کذا لابی ذر والاصیلی باسقاط لفظ باب الخ" (قسطلانی ص۴۲)

لفظ باب کو تین طرح پڑھنا جائز ہے۔

۱۔ بابٌ بالتنوین فہو خبر مبتدأ محذوف ای ہذا بابٌ فی الوحی۔

۲۔ بابُ کیف کان بالاضافۃ یعنی رفع بغیر تنوین۔ اس صورت میں باب کا لفظ مابعد کی جانب مضاف ہوگا یعنی ھٰذا بابُ کیف کان بدء الوحی الخ اس صورت میں بھی ھٰذا مبتدا محذوف ہوگا اور بابُ الخ خبر ہے۔

۳۔ بابْ وقف کے ساتھ بلا اعراب اسماء معدودہ کے طرز پر۔

آخری دونوں صورتیں (یعنی بلا تنوین اضافت کی صورت اور تیسری صورت وقف کی) اشکال وجواب سے خالی نہیں اسلئے سب سے افضل پہلی صورت ہے یعنی تنوین کے ساتھ بابٌ۔

مثلاً دوسری صورت میں (یعنی بابُ اضافت کے ساتھ پڑھا جائے تو) اشکال یہ ہوگا کہ بابُ مضاف اور کیف مضاف الیہ۔ حالانکہ کیفَ صدارت کلام کو چاہتا ہے اور مضاف الیہ ماننے کی صورت میں کیفَ کی صدارت باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ کیف باب کے تحت واقع ہو رہا ہے، علامہ قسطلانی رح فرماتے ہیں۔ ثم ان الجملۃ من کان ومعمولها فی محل جر بالاضافۃ ولا تخرج کیف بذالک عن الصدارۃ لان المراد من کون الاستفہام لہ الصدارۃ ان یکون فی صدر الجملۃ التی ہو فیہا (قس ص۸۲)

حافظ عسقلانی رح فرماتے ہیں کہ بخاری کے بعض نسخوں میں اس جگہ لفظ باب موجود نہیں ہے، اس صورت میں عدم صدارت کا اشکال ہی نہیں ہوگا۔

اس صورت میں دوسرا اشکال یہ ہے۔ کتب نحو سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ کی طرف صرف آٹھ الفاظ کی اضافت جائز ہے۔ ولا یضاف الی الجملۃ الا ثمانیۃ (امداد الباری بحوالہ مغنی ص۲۱۵ ایضاً قسطلانی ص۸۲) یعنی جملہ کی طرف صرف آٹھ الفاظ کی اضافت ہوسکتی ہے بشرائط بعض کی وجوباً بعض کی جوازاً۔ اسماء الزمان۔ حیث۔ آیۃ بمعنی علامت ذو۔ ولدن۔ وریث۔ وقول۔ وقائل۔ اور لفظ باب ان میں سے نہیں ہے پس اضافت کیونکر درست ہوسکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شیخ بدرالدین دمامینی نے مصابیح الجامع میں لکھا ہے کہ جملہ سے مراد لفظ ہو تو یہ مفرد کے حکم میں ہے پس پورا جملہ مضاف الیہ ہوسکتا ہے اور یہاں الفاظ ہی مراد ہیں تقدیر عبارت یہ ہے باب جواب کیف کان یعنی اگر کوئی سوال کرے کہ کیف کان بدء الوحی تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے جو اس باب میں مذکور ہے فلا اشکال (قس ص۸۲)

اور تیسری صورت یعنی وقف کی صورت میں اشکال یہ ہے کہ وقف اشیاء معدودہ میں وہاں ہوتا ہے جہاں ان کے درمیان فصل نہ ہوا اور ہم یہاں ابواب کے درمیان فاصلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ پہلی صورت یعنی تنوین کے ساتھ قیل وقال سے پاک ہے۔

اصطلاحات المحدثین ایک اصطلاح تو یہ ہے کہ باب کے بعد حدثنا تک جو عبارت آتی ہے اسے "ترجمۃ الباب" کہا جاتا ہے نیز اسی کو مترجم بہ، عنوان اور دعویٰ کہا جاتا ہے اور اس کے بعد حدثنا سے

جو حدیث آتی ہے اسے مترجم لہ کہتے ہیں نیز معنون لہ اور دلیل بھی کہا جاتا ہے۔
پھر حدیث میں جہانتک رواۃ کے اسماء ہوتے ہیں اسے سند الحدیث اور آگے جہاں سے مضمون حدیث شروع ہوتا ہے اسے متن الحدیث کہتے ہیں۔ مترجم لہ اور معنون لہ میں لام تعلیل وسببیت کیلئے ہے چونکہ یہ ترجمہ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے اسلئے انہی احادیث کی وجہ سے یہ ترجمہ قائم کیا گیا ہے اس لئے دونوں میں مناسبت ہونی چاہئے۔

تراجم بخاری یہ ایسا پرشوکت لفظ ہے کہ اس میں بڑے بڑے غواصوں کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ "فقہ البخاری فی تراجمہ" مقدمہ میں گزر چکا ہے کہ اس جملہ کا اصل مفہوم تفقہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بخاری کے تراجم سے امام بخاری رح کے تفقہ اور توقد ذہن کی شان معلوم ہوتی ہے انتہائی دقت نظر اور باریک بینی سے احادیث لے آتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ تفصیل تراجم بخاری کی اہمیت میں گذر چکی ہے۔

قال ابن خلدون (بفتح الخاء وسكون اللام) ولقد سمعت كثيرا من شيوخنا رحمهم الله يقولون شرح كتاب البخاري دين على الامة يعنون ان احدا من علماء الامة لم يوف ما يجب له من الشرح بهذا الاعتبار۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں امام بخاری رح کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے اپنے اکثر شیوخ رح سے سنا ہے فرماتے تھے کہ امام بخاری رح کی کتاب صحیح بخاری شریف کی شرح و وضاحت امت پر دَین (قرض) ہے یعنی علماء امت میں سے کسی نے بخاری کے شایان شان کما حقہ شرح کا حق ادا نہیں کیا (اگرچہ بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن بخاری کا دین اب تک باقی ہے)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ عینی رح اور حافظ عسقلانی رح نے عمدۃ القاری اور فتح الباری لکھکر امت کی طرف سے شرح حدیث کا قرض اتار دیا ہے مگر تراجم کا دین باقی رہ گیا تھا کسی نے تراجم بخاری سے متعلق کیا خوب کہا ہے۔ ؎

اعيى فحول العلم حل رموزما ❊ ابداه فى الابواب من اسرار
فازوا من الاوراق منه بما جنوا ❊ منها ولم يصلوا الى الاثمار

تراجم بخاری پر تصانیف حل تراجم کے لئے مستقل تالیفات بھی موجود ہیں اور ہمیشہ ہی اس کا اہتمام کیا گیا ناصر الدین بن المنیر نے کتاب المتواری علی تراجم البخاری لکھی ہے، اسی طرح ابن رشید نے ترجمان التراجم لکھی ہے، اور قاضی بدر الدین بن جماعہ نے ابن منیر کے رسالہ کی تلخیص کی ہے اور کچھ اضافہ بھی حضرت مسند الہند شاہ ولی اللہ صاحب رح نے بھی تشریح تراجم کے لئے ایک عربی رسالہ لکھا، بعدہ حضرت شیخ الہند رح نے اردو زبان میں " الابواب والتراجم " کے نام سے ایک رسالہ لکھا مگر دونوں بزرگوں میں سے کوئی بھی تکمیل تک نہ پہنچا سکے، اور دار آخرت کا سفر کر گئے۔
آخر میں مدرسہ مظاہر علوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رح نے تحقیقات اکابر کے ساتھ ساتھ مزید جدید تحقیقات سے مزین کرکے " الابواب والتراجم لصحیح البخاری " کے نام سے چھ جلدوں میں مکمل فرمایا جو قابل قدر اور لائق مطالعہ ہیں۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء

ترجمۃ الباب کا مقصد باب کیف کان بدء الوحی الخ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رح ابتداء وحی کی کیفیت بیان کرنا چاہتے ہیں لیکن احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باب کی چھ حدیثوں میں سے بجز ایک دو حدیثوں کے کسی حدیث کی بھی ترجمۃ الباب کے ساتھ کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی اکثر روایات ابتداء کے ذکر سے خالی ہیں چنانچہ پہلی حدیث "انما الاعمال بالنیات" بظاہر بالکل مناسبت نہیں رکھتی، اور دوسری اور چوتھی میں کیفیت وحی کا ذکر تو ہے مگر بدء کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ تیسری حدیث جس میں "اول مابدئ به" ہے ترجمۃ الباب کے موافق نظر آتی ہے پھر پانچویں حدیث میں کسی چیز کا ذکر نہیں، نہ تو وحی کا ذکر ہے اور نہ ہی ابتداء وحی کا۔ اسی طرح چھٹی روایت جس میں ہرقل کا قصہ ہے جو نبوت کے آخری دور میں واقع ہوا بدء الوحی کے ساتھ بظاہر اس کا بھی تعلق و مناسبت نہیں معلوم ہوتی ہے وقد اعترض محمد بن اسمٰعیل التیمی رح علی هذه الترجمة فقال لوقال کیف کان الوحی لکان احسن الخ (فتح الباری صے)، یعنی اسماعیلی نے اس ترجمۃ الباب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر "کیف کان بدء الوحی" کے بجائے "کیف کان الوحی" ہوتا تو بہتر تھا۔

مگر اسماعیلی کے قول پر اعتراض ہوسکتا تھا کہ پہلی حدیث "انما الاعمال بالنیات" میں تو وحی کا بھی ذکر نہیں تو انہوں نے اپنی مستخرج میں انما الاعمال بالنیات کی حدیث کو باب سے پہلے ذکر کیا کہ یہ حدیث بمنزلہ خطبہ کے ہے اس لئے اسے پہلے ہونا چاہیے۔ گویا دو تصرف کے بعد اسماعیلی کے نزدیک اس حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے ہوسکتی ہے، یہ درحقیقت امام بخاری رح پر اعتراض ہے لیکن اسماعیلی کا یہ اعتراض دقیع نہیں ہے اس لئے کہ اگر ترجمۃ الباب بدء الوحی میں اضافت بیانی مان لی جائے تو بدء اور وحی ایک ہو جائیں گے اور عبارت ہوگی کیف کان بدء هو الوحی، اس صورت میں ترجمۃ الباب کا مفہوم ہوگا "کیف کان الوحی الخ" جو حضرت اسماعیلی نے احسن کہا تو اب اعتراض درست نہ رہا۔

شارحین نے مناسبت کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر اکثر غیر شافی ہیں جن سے تشنہ تحقیق سیر نہیں ہوسکتا۔ صرف چند بہتر توجیہات ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) وحی کو عام رکھا جائے خواہ وحی متلو ہو یا غیر متلو، اور بدء کو بھی عام لیا جائے کیونکہ بدء کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً یہ کہ کس زمانے میں وحی کی ابتداء ہوئی؟ کس مکان میں ہوئی؟ کیسے لوگوں سے ہوئی؟ کن حالات میں ہوئی؟ وغیرہ۔ فیدخل فیه کل مایدل علی عظمة شان الموحیٰ الیه۔

(۲) بعض مرتبہ بدایت بول کر جمیع حالات مقصود ہوتے ہیں چنانچہ جب امام بخاری رح سے سوال کیا گیا کیف کان بدء امرک؟ تو امام نے صرف اپنی پیدائش ذکر کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مفصل حالات بیان فرمائے کہ فلاں فلاں مدرسہ میں داخل ہوا اور فلاں فلاں واقعات پیش آئے، اسی طرح صحیح بخاری کے تیرھویں پارہ کی ابتداء کی ہے کتاب بدء الخلق سے صہ ۴۵۳ دیکھیے جس میں صرف بدایت کا ذکر نہیں ہے بلکہ مخلوق سے متعلق جملہ احکام ان ابواب میں آگئے ہیں۔

(۳) کبھی حدیث کو ترجمۃ الباب کے مدلول مطابقی سے مطابقت نہیں ہوتی بلکہ مدلول التزامی سے مناسبت ہوتی ہے

(۴) کبھی حدیث کو ترجمۃ الباب کے مدلول مطابقی سے مطابقت نہیں ہوتی بلکہ مدلول التزامی سے نہایت ہوتی ہے صحیح بخاری کو باب کیف کان بدء الوحی سے شروع کرنے کی حکمت کا مفصل بیان اوپر گزر چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی چیز قابلِ اعتماد نہیں جب تک وحی کی طرف منسوب نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ وحی کی فخامت وعظمت اور جلالت شان اس باب کا مدلول التزامی ہے اور ترجمۃ الباب سے یہی مقصود ہے، گویا کہ یہ باب ساری کتاب کا ایک مقدمہ یعنی کبریٰ ہے اور اصل کتاب کتاب الایمان سے شروع ہوتی ہے جو بمنزلہ صغریٰ ہے پس کتاب کی ہر حدیث کے متعلق کہا جائیگا کہ هٰذا من الوحی اور باب بدء الوحی کا خلاصہ یہ ہوا کہ ما کان من الوحی فھو موجب للعمل تو نتیجہ یہ نکلا کہ هٰذا موجب للعمل. اس تقریر کے بعد احادیث باب کی مناسبت ترجمۃ الباب کے ساتھ ظاہر ہے لانہا دالۃ علی عظمۃ الوحی "

اس موقع پر قابلِ غور یہ ہے کہ امام بخاری رح نے باب کی ابتدا کیف کان سے کی اور کیف سے جس طرح کسی چیز کی حالت دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے اسی طرح کبھی یہ لفظ کیف اظہارِ عظمت کیلئے آتا ہے. کما فی التنزیل العظیم.

۱. الم تر کیف فعل ربک باصحٰب الفیل — اے مخاطب کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحابِ فیل کیسا کچھ کیا.

۲. کیف خلق اللہ سبع سمٰوٰت طباقا — کیسے اللہ نے بنائے سات آسمان تہ برتہ.

۳. افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینٰھا وزینّٰھا ومالھا من فروج. — اور کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے کیسا اونچا اور بڑا بنایا، اور (ستاروں سے) اس کو آراستہ کیا (استحکام کا یہ حال ہے کہ) اس میں رخنہ تک نہیں:

اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جہاں کیف کا لفظ ہے لیکن وہاں سوال کیفیت یا کوئی سوال مراد نہیں بلکہ اہمیت اور اظہار تعظیم وتفخیم مقصود ہے.

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے کیف کو سوال کیفیت ہی کے لئے مانا جس کی وجہ سے اشکال پیش آیا اگر عظمت کے معنی کی طرف توجہ ہوتی تو کوئی خلجان نہ پیش آتا.

ان شاء اللہ ہر حدیث کے بعد تشریح کے اندر ترجمۃ الباب کی مطابقت پوری وضاحت کے ساتھ بیان کی جائیگی. جیسا کہ اس سے قبل دو جلدوں (نصر الباری کتاب المغازی ۲ نصر الباری کتاب التفسیر) میں بیان کی گئی ہے. واللہ المستعان وعلیہ التکلان. بدء (بفتح الباء وسکون الدال یعنی مہموز اللام) کے معنی آغاز اور ابتداء کے ہیں، اور علامہ عینی رح نے ایک نسخہ بدو بضم الاول والثانی وتشدید الواو نقل کیا ہے جس کے معنی ظہور کے ہیں (فتح الباری عمدۃ القاری)

الوحی قال الحافظ " والوحی لغۃ الاعلام فی خفاء (فتح) یعنی لغت میں وحی کے معنی ہیں پوشیدہ طور سے کسی کو کچھ بتانا، امام راغب نے مفردات القرآن میں لکھا ہے " واصل الوحی الاشارۃ السریعۃ"

طویل سلام کو مختصر طریق سے ادا کرنے کو اشارہ کہتے ہیں مثلاً تقریب میں خ بخاری شریف کے لئے۔ م مسلم شریف کیلئے۔ د ابوداؤد شریف کے لئے۔ ت ترمذی شریف کیلئے۔ س نسائی شریف کے لئے۔ خود بخاری شریف کے حاشیہ میں ک کرمانی ف فتح الباری اور ع عمدۃ القاری کی طرف اشارہ ہوتا ہے، پھر اشارہ کبھی ہاتھ سے ہوتا ہے اور کبھی سر سے اور کبھی زبان سے جیسے نعم اور لا۔

سلاطین کے اشارات ان کے مقربین ہی سمجھا کرتے ہیں اسی طرح وحی الٰہی کا سمجھنا صرف رسولوں کا کام ہے جو مقربین بارگاہ الٰہی ہیں، ان پیغمبروں کے دماغ اس قدر اعلیٰ ہوتے ہیں کہ فوراً اس کی گہرائی تک پہونچ جاتے ہیں گویا امام راغب نے اعلام کے بجائے اشارہ کا لفظ لاکر بڑے پتہ کی بات فرمائی ہے کہ وحی میں اشارہ ہوتا ہے یعنی مبسوط چیز کو مختصر پیرایہ میں بیان کر دیا جاتا ہے۔

واقعہ ہے کہ ایک مخصوص مجلس میں شیر شاہ نے یک بیک زمین پر لکیر کھینچ دی لوگوں نے خیال کیا کہ شیر شاہ نے یہ کیا بچوں کی سی حرکت کی ہے مگر اس کے وزیر نے کہا کہ "جہاں پناہ ایسا ہی ہوگا" اور ایک بڑی سڑک بنوادی۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام اشارہ کو سمجھ لیتے ہیں۔

دوسرا لفظ السریعۃ ہے یعنی نزول وحی آناً فاناً ہو جاتا ہے، ابن عربی فرماتے ہیں کہ نبی آن واحد میں وحی کو سنتا بھی ہے سمجھتا بھی ہے اور حفظ بھی کر لیتا ہے۔

امام راغبؒ نے اگرچہ خفیہ کا لفظ نہیں ذکر کیا ہے لیکن اشارہ میں اجنبی سے اخفاء بھی ہوتا ہے پھر اہل لغت نے خفاء کی قید لگائی ہے لہٰذا وحی میں اخفاء کے معنی بھی ہیں اس لئے تیسری چیز وحی میں اخفاء بھی ہے اس کی مثال تار برقی جیسی سمجھیں کہ دو شخص آپس میں بات کر رہے ہیں مگر قریب بیٹھنے والا کچھ نہیں سمجھتا۔

وحی کا اطلاق

وحی لغوی کا اطلاق ذی روح اور غیر ذی روح دونوں پر ہوتا ہے۔ ثانی کی مثال بانّ ربّک اوحیٰ لہا (پارہ عم) اس میں زمین کی طرف وحی کی نسبت کی گئی ہے، پھر ذی روح میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں پر اطلاق ہوتا ہے، ثانی کی مثال واوحیٰ ربّک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا الخ (سورۃ النحل پ۱۴)، پھر ذوی العقول میں انس و جن دونوں پر اطلاق ہوتا ہے ثانی کی مثال یوحی بعضہم الیٰ بعض زخرف القول غروراً (سورۃ الانعام پ۸)، پھر انسانوں میں سے نبی و غیر نبی دونوں کی طرف نسبت کی گئی ہے، ثانی کی مثال واوحینا الیٰ امّ موسیٰ الخ (سورۃ القصص پ۲۰) ایضاً واذ اوحیت الی الحواریین (سورۃ المائدہ پ۷) اور وحی نبی کی مثال ترجمۃ الباب میں مذکور ہے یعنی انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ الخ (سورۃ النساء پ۶)

وحی شرعی

صرف آخری قسم کو کہا جاتا ہے یعنی جو نبی کی طرف ہو وحی الیٰ غیر النبی وحی شرعی نہیں بلکہ وحی لغوی ہے وفی اصطلاح الشریعۃ ھو کلام اللہ المنزل علیٰ نبیّ من انبیائہ (عمدہ ص۳۹، فتح ص۹)

یعنی شریعتِ مطہرہ کی اصطلاح میں وحی اللہ تعالیٰ کا وہ کلام (وپیغام) ہے جو کسی نبی پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہو۔
علامہ قسطلانی رح فرماتے ہیں وفی اصطلاح الشرع اعلام اللہ تعالیٰ انبیاءہ الشیئ اما بکتاب او برسالۃ ملک او منام او الہام (قسطلانی ص۴۳) یعنی شریعتِ مطہرہ کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کا اپنے نبیوں کو کسی چیز (حکم وپیغام) کی خبر دینا خواہ کتاب کے ذریعہ ہو یا فرشتہ کو بھیجکر یا خواب یا الہام کے ذریعہ۔ مقصد یہ ہے کہ وحی اللہ کا حکم وپیغام ہے جو پیغمبروں کو بھیجا جاتا ہے۔

اقسام وحی

انبیاء علیہم السلام کے حق میں وحی الٰہی کی کتنی قسمیں ہیں؟ علماء کے اقوال مختلف ہیں:-
علامہ حلیمی رح نے چھیالیس ۴۶ قسمیں بیان کی ہیں اس کا مبنیٰ اور ماخذ صحیح بخاری کی وہ روایت ہے جو حضرت ابوہریرہ رضہ نیز حضرت عبادہ بن صامت رضہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ رؤیا المؤمن جزء من ستۃ وأربعین جزءا من النبوۃ (بخاری جلد ثانی ص۱۰۳۵) یعنی مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔
قرآن مجید میں وحی انبیاء علیہم السلام کی تین قسمیں مذکور ہیں:۔ وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا (پ۲۵ رکوع ۷) الا وحیا ای فی المنام او بالالہام۔ او من وراء حجاب سے یہ مراد ہے کہ بلا واسطہ کلام ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہِ طور پر اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلۃ المعراج میں۔
علامہ سہیلی رح نے نزول وحی کی کل سات صورتیں بیان کی ہیں یعنی وحی کا نزول کل سات طریقے سے ہوتا ہے۔
(۱) رؤیائے صادقہ، سچا خواب یعنی انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوا کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل شروع کردی، اور اسی وجہ سے بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سو رہے ہوں تو ان کو جگانا درست نہیں، ممکن ہے کہ خواب میں وحی آرہی ہو۔
(۲) القاء فی القلب:۔ یعنی دل میں کسی چیز کا ڈالنا جیسا کہ حدیث میں ہے قال صلی اللہ علیہ وسلم ان روح القدس نفث فی روعی (الحدیث) یعنی روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالدی کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مریگا جب تک کہ وہ اپنے رزق کو مکمل نہ کرلیگا الخ۔
اور اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے کسی ولی کے قلب پر کسی بات کا القاء ہو تو اہلِ فن کی اصطلاح میں اس کو الہام وکشف سے تعبیر کرتے ہیں. پس دونوں القاء فی القلب میں فرق یہ ہے کہ نبی پر القاء وحی کہلاتا ہے اور ہمیشہ صواب ہوتا ہے غلطی کا احتمال نہیں، اور ولی کا الہام صواب اور خطاء دونوں کا محتمل ہوتا ہے۔ ملاجیون رح فرماتے ہیں۔"

"یشترک فیہ الاولیاء ایضا وان کان الہامہم یحتمل الخطاء والصواب

الہام میں اولیاء بھی شریک ہیں اگرچہ ان کے الہام میں صواب وخطاء دونوں کا کھٹکا لگا رہتا ہے لیکن نبی کا الہام

والھامہ لایحتمل الا الصواب صواب کے سوا کسی بات کا احتمال ہی نہیں رکھتا۔

(نور الانوار مجتبائی صفحہ ۲۱۴)

(۳) اللہ تعالیٰ کا کلام من وراء الحجاب سُننا، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں سُنا تھا۔

(۴) صلصلۃ الجرس، یعنی گھنٹی کی آواز کی صورت میں آئے جس کی تفصیل حدیث ۲ میں آئے گی انشاء اللہ۔

(۵) تمثل ملک، یعنی فرشتہ کسی انسانی شکل میں آکر کلامِ ربانی پیش کرے، جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آنا روایات سے ثابت ہے۔

(۶) فرشتہ کا اپنی اصلی (ملکوتی) شکل میں آپ کے پاس آکر پیغامِ ربانی پہنچانا، جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: انہ رای جبرئیل لہ ستمائۃ جناح (بخاری صفحہ ۴۵۹) بعض روایت میں ہے لہ ستمائۃ جناح ینتشر منہا اللؤلؤ والیاقوت۔ (عمدہ صفحہ ۴۴ ایضاً حاشیہ بخاری صفحہ ۲) یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے چھ سو بازو ہیں جن سے یاقوت اور موتی جھڑتے ہیں۔

ایسا دو مرتبہ ہوا ہے جیسا کہ سورۂ نجم میں مذکور ہے، ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ۔

(۷) وحی اسرافیل علیہ السلام کما فی مسند احمد باسناد صحیح عن الشعبی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزلت علیہ النبوۃ وھو ابن اربعین سنۃ فقرن بنبوتہ اسرافیل علیہ السلام ثلاث سنین الخ (عمدہ صفحہ ۴۴)

یعنی مسند احمد بن حنبل میں سند صحیح کے ساتھ امام شعبی سے منقول ہے کہ جب حضور اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چالیس سال کی ہوئی تو آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی، اس کے بعد تین برس تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اور حضرت اسرافیل علیہ السلام کو قدرت نے آپ کے لئے مقرر فرمایا، وہ کبھی کبھی کوئی کلمہ آپ کو بتاتے رہتے تین برس کے بعد پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام مقرر کئے گئے اور وحی کا سلسلہ جاری ہوا۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۴)

○ الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ○

رسول اللہ کا لفظ اگرچہ عام ہے، ہر رسول کو رسول اللہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں حضور اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، اس لئے کہ مشہور قاعدہ ہے المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل

۲ یا یہاں اضافتِ عہدی ہے اس لئے مراد ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

۳ یا چونکہ دیگر تمام انبیاء اور رسل کے ادیان منسوخ ہو چکے ہیں، قیامت تک کیلئے آپ ہی رسول ہیں یہانتک کہ قربِ قیامت میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع کرینگے اس لئے رسولِ وقت ہونے کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں۔

یا یہ کہا جائے کہ یہ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی احادیث جمع کرنے کیلئے لکھی گئی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں، نبی اور رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیامبر اور واسطہ ہوتے ہیں۔

نبی اور رسول کا فرق

بعض حضرات کا خیال ہے کہ رسول اور نبی ہم معنی ہیں اور ایک ہی ہیں۔ لیکن راجح یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، ارشادِ الٰہی ہے وما ارسلنا قبلك من رسول ولا نبی الآیۃ۔ اس میں نبی کا عطف رسول پر ہے اور عطف مغایرت کی دلیل ہے۔ پھر عام طور سے رسول اور نبی میں یہ فرق بیان کیا جاتا ہے کہ رسول صاحب کتاب اور صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور نبی کیلئے یہ ضروری نہیں بلکہ نبی پیغمبر کو کہتے ہیں، مگر اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام پر کوئی مستقل کتاب نازل نہ ہوئی تھی، مع ہٰذا قرآن مجید میں ان کے بارے میں وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا وارد ہوا ہے (سورۂ مریم)

حافظ ابن تیمیہ نے کتاب النبوات میں بہترین فرق بیان کیا ہے ان کی تقریر سب سے عمدہ ہے، فرماتے ہیں کہ نبی وہ ہے جسے اصلاحِ ناس کیلئے بھیجا گیا ہو، اور رسول وہ ہے جسے دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کا حکم بھی ہو، خواہ صاحب کتاب ہو یا نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ نبی اور رسول میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے لیکن علی العموم نبی کو عام اور رسول کو خاص کہا جاتا ہے، اس لئے کہ انسانی نبی اور رسول مراد ہوتے ہیں، پس اس صورت میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوگی، سب سے پہلے اعدادِ دین کے ساتھ مقابلہ کی نوبت حضرت نوح علیہ السلام کو پیش آئی، اس لئے آپ سے رسالت کا دور شروع ہوا کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین (پ۲ ع۱۰)، سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع میں کوئی اختلاف نہ تھا، ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ سب سے پہلا اختلاف حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا ہے، تو ثابت ہوا کہ سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں، صحیح بخاری کتاب الرقاق کی حدیث شفاعت میں ہے۔ ائتوا نوحا اول رسول بعثہ اللہ (بخاری ص۹۷۰، مسلم ص۱۰۸)

فائدہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام نبی بھی ہیں اور رسول بھی۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام وغیرہ رسول ہیں نبی نہیں۔ لیکن یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ فرشتوں کی رسالت خاصہ ہے کہ حضرت جبرئیل امین عبد انبیاء کے پاس وحی لیکر آتے ہیں یا کبھی عذاب کیلئے یا کسی خاص نعمت یا خاص حکم کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں، ان کو براہِ راست کسی قوم یا ملک کی ہدایت و رہبری کیلئے نہیں بھیجا جاتا اسی لئے جب رسول کا لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے انسانی رسول مراد ہوتے ہیں فرشتے مراد نہیں ہوتے۔

○ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ○

علامہ عینی رح فرماتے ہیں، "جملۃ خبریۃ لکنہا لما کانت دعاء صارت انشاءً لان المعنی اللّٰھم صلِّ وکذا السلام فی سلم۔ (عمدۃ القاری ص۱۵)

مسئلہ حکیم الامت حضرت تھانوی رح تحریر فرماتے ہیں کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ درود شریف پڑھنا فرض ہے بوجہ حکم صلوا جو شعبان ۲ھ میں نازل ہوا۔

اگر ایک مجلس میں کئی بار آپ کا نام پاک ذکر کیا جائے (جیسا کہ درس حدیث میں بکثرت اس کا موقع ہوتا ہے، تو امام طحاوی رح کا مذہب یہ ہے کہ ہر بار میں ذکر کرنے والے اور سننے والے پر درود شریف پڑھنا واجب ہے، مگر مفتی بہ قول یہ ہے کہ ایک بار پڑھنا واجب ہے پھر مستحب ہے، یہی امام کرخی رح کی تحقیق ہے۔

قول اللہ عز وجل

اگر قول کو رفع کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا عطف باب پر ہوگا اور جر کی صورت میں باب کے تحت میں ہوگا اور کیف کان پر عطف ہوگا۔

إنا اوحينا اليك كما اوحينا الى نوح والنبيين من بعده

ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح (علیہ السلام) اور ان کے بعد والے انبیاء کی طرف بھیجی تھی۔

انتخاب آیت میں امام بخاری کا کمال

وحی کے متعلق قرآن حکیم میں بہت سی آیات ہیں لیکن مؤلف علام امام بخاری رح نے ترجمۃ الباب میں ایک ایسی آیت کو منتخب فرمایا ہے جس میں وحی کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ انتخاب امام بخاری رح کی خداداد ذہانت، دقت نظر، وسعت علم اور فہم و فراست کی بین دلیل ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ آیت کا صرف مذکورہ ٹکڑا ہی یہاں مراد نہیں ہے بلکہ ماقبل کا رکوع بھی مراد ہے کیونکہ وہ سائل کا سوال اور اس کا الزامی جواب ہے اور انا اوحینا الیک سے تحقیقی جواب ہے، اور پھر صرف کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ تک ہی مقصود نہیں بلکہ عمدۃ القاری اور ارشاد الساری میں ہے "الی داود زبورا الآیۃ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مابعد کا حصہ بھی مراد ہے، علاوہ بریں مضمون پر بھی غور فرمایئے تو صاف معلوم ہوگا کہ آئندہ کی آیت والنبیین من بعدہ کی تفصیل ہے جس میں بہت سے انبیاء کا اجمالی اور گیارہ کا تو ان کے اسمائے شریفہ کے ساتھ تذکرہ ہے، اور حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک خصوصیت کو بیان کیا ہے وآتینا داود زبورا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے۔ وکلم اللہ موسیٰ تکلیما۔

خلاصہ یہ ہے کہ ماقبل اور مابعد کو ملاحظہ فرمائیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وحی کا اتنا مبسوط اور مشرح بیان کسی دوسری آیت میں نہیں۔ تفسیر خازن میں ہے کہ ایک بار یہود میں سے کعب بن اشرف اور فنحاص بن عازوراء نے سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ نبی ہیں تو ہمارے پاس آسمان سے ایک ہی دفعہ پوری کتاب

لائے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔
ان اہل کتاب کا یہ سوال اطمینانِ قلب، طلب ہدایت و اتباع کیلئے نہ تھا بلکہ ازراہِ تعنت و عناد تھا اس پر آیت یسئلک اھل الکتاب الخ نازل ہوئی اور پورے رکوع میں ان کی اور ان کے آباء و اجداد کی شرارتوں کا ذکر ہے۔ اور ایک نوع سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ابھی تو انھوں نے آپ کو مانا نہیں، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو تو نبی مان چکے تھے پھر بھی کیسے کیسے سوال کرتے تھے اور کیسی کیسی حکم عدولیاں کرتے رہے، توریت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات واضح الدلالات دیکھنے کے بعد بھی ان کا سوال ختم نہ ہوا، باوجودیکہ ہم نے توریت کو یکبارگی ہی نازل کیا تھا لیکن خوئے بد را بہانہ بسیار، بجائے اطاعت کے انھوں نے خدا کو علانیہ دیکھنے کا سوال کر دیا، اگر قرآن عزیز کو یکبارگی ہی نازل کر دیا جاتا تو کوئی اور ہی گل کھلاتے۔
إِنَّا أَوْحَيْنَا سے تحقیقی جواب دیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا بکثرت انبیاء علیہم السلام آئے جن میں سے گیارہ کے اسماء مبارکہ یہاں بیان فرما دیے گئے ہیں ان سب حضرات میں سے کسی پر یکبارگی کتاب نازل نہ ہوئی حالانکہ اہل کتاب ان کو نبی مانتے ہیں۔
پس معلوم ہوا کہ یہود کے یہاں بھی نبوت کے لیے ایک مرتبہ مکمل کتاب کا نازل ہونا ضروری نہیں تھا اسی سے ثابت ہو گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرنا ازراہِ بغاوت و سرکشی ہے، رسولوں کی بعثت سے مقصود ہدایت خلق اور ان کو توحید و معرفت کا درس دینا، تزکیہ اور تربیت ہے، کتاب کے متفرق طور پر نازل ہونے سے یہ مقصد علی الوجہ الاتم حاصل ہوتا ہے کہ تھوڑا تھوڑا بآسانی دلنشیں ہو جاتا ہے، ادھر کسی نے سوال کیا فوراً جواب آ گیا، کوئی مشکل پیش آئی فوراً اس کا حل بھی سکونِ قلب کا باعث ہو گیا، یہ صورت زیادہ اوقع فی النفس ہوتی ہے اور انشراح قلب بھی اس میں زیادہ حاصل ہوتا ہے، پھر یہ قوم امی بھی تھی اس کے لیے اسی میں آسانی بھی تھی، نظام تربیت اور اصلاح کا تقاضا بھی یہی تھا کہ احکام کا نزول تدریجی ہو، پس ان حکمتوں کو نہ سمجھنا اور طرح طرح کے لایعنی سوالات کرنا کمال حماقت ہے، پھر آتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا میں اشارہ کر دیا کہ بیشک ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو زبور عنایت کی لیکن ان کو بھی ایک ہی مرتبہ ساری کتاب نہیں دی بلکہ منجما قسط وار نازل کی، کما فی روح المعانی ص۱۷ وکان انزاله عليه عليه السلام منجما پس اگر تصدیق نبوت کے لیے ایک دفعہ کتاب کا نزول ضروری ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام کو تم نبی کیوں مانتے ہو؟ اس سے بھی تمہاری ہٹ دھرمی اور عناد ظاہر ہے۔
نیز کَلَّمَ اللّٰہُ مُوسٰی تَکْلِیمًا سے یہودیوں کو نہایت مسکت اور دنداں شکن جواب دیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر کلام فرمایا اسی وقت سے ان کی نبوت ثابت ہو گئی، اور فرعون اور اس کی قوم کے پاس دعوت و تبلیغ اور انذار کے لیے باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تو امور ادۂ رسالت

سے بھی مشرف ہوگئے! اور آے اہل کتاب کوہ طور کے کلام ہی سے حضرت موسیٰ ؑ کو تم رسول و نبی مانتے ہو حالانکہ اس وقت تک ان پر کوئی کتاب نازل نہ ہوئی تھی، بلکہ کتاب توراۃ تو ان کو ملی فرعون اور اس کی قوم کے غرقاب ہونے کے بعد، پس جب تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرتے ہو بغیر کسی کتاب کے نازل ہونے کے تو پھر میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کیلئے کتاب کی شرط مزید برآں جملۃ واحدۃ کی قید کیسی؟ یہ ضد و عناد اور شرارت نہیں تو اور کیا ہے۔ (ماخوذ از امداد)

ترجمۃ الباب سے آیت کی مناسبت

ترجمۃ الباب ہے کیف کان بدء الوحی، یعنی وحی کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ آیت کریمہ میں دو جواب مذکور ہیں، ایک[۱] تو وحی کے اصل سرچشمہ کا بیان ہے اور وہ انا اوحینا میں ہے کہ اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہیں، دوسرا[۲] نوعیت وحی کے مبدء زمانی کا بیان ہے اور وہ کما اوحینا الخ میں ہے کہ اس نوعیت کی وحی حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوئی۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت مبارکہ سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ وحی کیلئے تین چیزیں لازم ہیں، ایک مرسِل یعنی مُوحِی و سرچشمہ وحی، وہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، دوسری چیز مرسَل الیہ، موحیٰ الیہ وہ انبیاء ہیں اور حضور اقدس علیہم الصلوٰۃ والسلام، اور تیسری چیز واسطہ، آیت مبارکہ کا مقصد جملہ لوازمات کو بیان کرنا ہے۔

اشکال وجواب

یہاں اشکال یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بطور خاص کیوں فرمایا گیا جب کہ حضرت نوح علیہ السلام سے قبل اور بھی انبیاء گذرے ہیں مثلاً حضرت آدم، حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہم السلام گذرے ہیں اور ان حضرات پر بھی وحی آئی ہے۔

اس کے متعدد جوابات منقول ہیں، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی تخصیص سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس طرح حضرت نوح ؑ کو ان کی قوم نے ستایا اور انہوں نے صبر کیا اسی طرح آپ کو بھی تکلیفیں ہوں گی مگر صبر کرنا ہوگا۔

۲ـ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے اگرچہ انبیاء تھے لیکن رسول نہ تھے، حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں اور ان کے بعد بہت سے رسول ہوئے۔ آیت سے اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسول ہیں۔

۳ـ حضرت نوح علیہ السلام شیوع کفر میں مبعوث ہوئے ان سے پہلے کفر کا شیوع نہیں ہوا تھا تو اس سے اشارہ کر دیا کہ آپ ﷺ بھی شیوع کفر میں مبعوث ہوئے ہیں وغیرہ۔

حضرت شیخ الہند رح نے الیٰ نوح والنبیین من بعدہ کی تخصیص کی ایک اور لطیف وجہ بیان فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ نوح علیہ السلام سے قبل امور معاشرت کی وحی ہوا کرتی تھی یعنی کسب معاش

کے ذرائع اور صنائع وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی (مثلاً حضرت آدم ع کو مکان بنانے کے، حضرت شیث علیہ السلام کو زراعت کے اور حضرت ادریس ع کو خیاطی کے طریقے بتائے گئے)، اور حضرت نوح ع سے وحی شرائع کا آغاز ہوا جس کی تکمیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ جیسے بچے کو ابتدائً امورِ معاشرت کی تعلیم دی جاتی ہے، جب ذرا ہوش سنبھالا تو کلمہ طیبہ اور معمولی طور پر دین کی باتیں سکھلائی جاتی ہیں، پھر مدرسہ سے مانوس کیا جاتا ہے، جب کچھ بڑھنے لگتا ہے اور عقل میں اضافہ ہوتا ہے تو سختی کیجاتی ہے اور ضابطہ سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اور امتحان کی صعوبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اور فائزین وخائبین کی درجہ بندیاں ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح زمین ایک مدرسہ ہے اس کے معلّم اول حضرت آدم علیہ السلام تھے چونکہ وہ زمانہ طفولیت کا تھا اس لئے پہلے زیادہ تر معاشرت کے احکام سکھلائے گئے اور قدرے دینی احکام کی بھی تعلیم دی گئی، چلتے چلتے حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آیا جہاں سے باضابطہ تعلیم دین کے دارالعلوم کا آغاز ہوتا ہے، اس میں فیل ہونے والوں کو دنیا سے نیست ونابود کر دیا گیا، پھر نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے ازسرِ نو دنیا کا آغاز ہوا، گویا کہ نوح علیہ السلام آدمِ ثانی ہیں، پھر زمانہ ترقی کرتا رہا اور اس کے مناسب نبی آتے رہے، بالآخر اس علم وعمل کے دارالعلوم کا نصاب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا، چنانچہ ارشاد ہے "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

حاصل یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام سے قبل وحی دوسری نوعیت کی تھی یعنی امورِ معاشرت کی وحی ہوتی تھی اور حضرت نوح ع سے لیکر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک امورِ آخرت کی وحی ہے، اس لئے آپ کی وحی کو نوح علیہ السلام ومن بعدہ کی وحی سے تشبیہ دی گئی۔

(۱) حدثنا الحُمَيدِيُّ قال حدثنا سُفيانُ قال حدثنا يحيى بنُ سعيدٍ الانصاريُّ قال اخبرني محمدُ بنُ ابراهيمَ التيميُّ انَّه سمع علقمةَ بنَ وقّاصٍ الليثيَّ يقول سمعتُ عمرَ بنَ الخطابِ رضي الله عنه على المنبر يقول سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقول انّما الاعمالُ بالنّيّات وانما لِكُلِّ امرِئٍ مّا نوى فمَن كانت هجرتُه الى دنيا يُصيبُها او الى امرأةٍ ينكِحُها فهجرتُه الى ما هاجرَ اليه۔

ترجمہ (امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ) ہم سے بیان کیا حمیدی نے، حمیدی نے کہا کہ ہم سے بیان کیا سفیان نے انہوں نے کہا کہ ہم سے بیان کیا یحیی بن سعید انصاری نے انہوں نے کہا مجھکو خبر دی محمد بن ابراہیم تیمی نے کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص لیثی کو یہ کہتے سُنا کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو منبر پر فرماتے ہوئے سُنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے

اور ہر شخص کو وہی ملیگا جس کی اس نے نیت کی ہے، پس جس کی ہجرت دنیا کمانے یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہو پس اس کی ہجرت (اپنی نیت کے مطابق) اسی کیلئے ہوگی جس کیلئے ہجرت کی ہے۔

نوٹ: صرف ابتدار میں چند حدیثوں کی سند کا ترجمہ لکھا جائے گا تاکہ طلبہ عزیز کو طرز معلوم ہو جائے، کتاب الایمان سے صرف حدیث شریف کا ترجمہ لکھا جائے گا انشاء اللہ۔

تعدد الحدیث فی الصحیح بہ روایت بخاری شریف میں سات جگہ مذکور ہے، ایک تو یہی حدیث صـ۲ پر ہے جس میں نیات بصیغہ جمع ہے باقی چھ جگہ پر بصیغہ مفرد یعنی نیۃ ہے، ملاحظہ ہو، صـ۱۳، صـ۳۴۳، صـ۵۵۱، صـ۵۹۷، صـ۹۰۷، صـ۱۰۲۸۔

مطابقۃ للترجمۃ اس بارے میں شراح حدیث کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں نہ تو ابتدار کا بیان ہے اور نہ وحی کا، صرف تبرک کیلئے ابتدار میں لائے ہیں۔

(۲) بعضوں نے کہا ابتدار کتاب میں اس حدیث کے لانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں نے یہ کتاب خالصًا لوجہ اللہ لکھی ہے اور یہ بطور تحدیث نعمت کے ہے، ضمناً پڑھنے پڑھانے والے کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنی اپنی نیت کو خالصًا لوجہ اللہ کر لو۔

مگر یہ صحیح نہیں اسلئے کہ اگر امام بخاری کا یہ مقصد ہوتا تو صاحب مشکوٰۃ کی طرح ترجمۃ الباب سے پہلے لاتے تاکہ افتتاح سے قبل نیت کی صفائی اور دعوت اخلاص کا مقصد پورا ہو جاتا۔

(۳) صحیح تر جواب وہ ہے جو علامہ ابن بطال نے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا تعلق ترجمۃ الباب میں مذکورہ آیت یعنی انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح الخ سے ہے بایں طور کہ ترجمۃ الباب کا مقصد تھا کہ آپ کی طرف وحی کی ابتدار کیسے ہوئی؟ آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ جیسی انبیار سابقین کی طرف ہوئی، حدیث میں حسنِ نیت و اخلاص کی تاکید ہے اور یہی وحی تمام انبیار کی طرف آئی، وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء، معلوم ہوا کہ آیت میں جو تشبیہ (کما اوحینا میں) تھی اس کی مثال کے طور پر انما الاعمال بالنیات کی حدیث کو بیان کیا، پس مناسبت ظاہر ہے۔

(۴) ابن منیر رح فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ہجرت کا تذکرہ ہے اور وحی کی ابتدار ہجرت ہی کی حالت میں ہوئی، اس طرح پر کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتیں دو ہیں، ایک ہجرت گھر سے نکل کر غار حرار کی طرف، دوسری ہجرت مدینہ طیبہ کی طرف، پہلی ہجرت سے (یعنی غار حرا سے) وحی کی حقیقی ابتدار ہوئی اور دوسری ہجرت (مدینہ طیبہ) سے وحی کا ظہور و شیوع ہوا، پس ترجمۃ الباب سے مطابقت واضح ہو گئی۔ (عمدہ)

(۵) ایک لطیف مناسبت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس حدیث کے پہلے راوی حمیدی مکی ہیں، پس امام نے مکی سے ابتدار کر کے اشارہ کر دیا کہ وحی کی ابتدار مکہ سے ہوئی۔

(۶) ایک عمدہ ترین جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو ترجمۃ الباب کے مدلول التزامی یعنی وحی کی عظمتِ شان سے مناسبت ہے اس طور پر کہ موحیٰ الیہ وہی ہو سکتا ہے جس میں حسن نیت ہو، جیسے سلاطین کے یہاں منصب وزارت صرف اسی کو تفویض کیا جاتا ہے جس کے اخلاص پر بادشاہ کو پورا پورا اعتماد ہو اور بغاوت کا وہم تک نہ ہو، محض وہم بغاوت سے معزول کر دیا جاتا ہے مگر سلاطینِ دنیا کا علم ناقص ہے اس لیے جس پر اعتماد کیا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ بغاوت کردے، بغاوت نہ بھی کرے تو امکانِ بغاوت تو ضرور ہے برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کے علم میں خطا کا کوئی احتمال نہیں، لہٰذا جسے وہ منتخب فرماتے ہیں اس میں بغاوت کا امکان بھی نہیں ہوتا، ارشاد ہے ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ۔

(۷) حافظ عسقلانی رح فرماتے ہیں ومن المناسبات البدیعۃ الوجیزۃ ان الکتاب لما کان موضوعاً لجمع وحی السنۃ صدرہ ببدء الوحی لبیان الاعمال الشرعیۃ صدرہ بحدیث الاعمال۔ یعنی بہترین اور مختصر مناسبت یہ ہے کہ چونکہ کتاب لکھی گئی ہے وحی سنت کے جمع کرنے کیلئے، اس لیے بدء وحی کو پہلے بیان کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور وحی سے مقصود اعمالِ شرعیہ کا بیان کرنا ہے، اس لیے سب سے پہلے انما الاعمال کی حدیث لائے جس میں اعمال کو درست کرنیکا طریقہ بتایا گیا ہے۔

وحی کیلئے حسنِ نیت کی شرط سے یہ وہم نہ ہو کہ وحی کسبی ہے جیساکہ معتزلہ اور قادیانی کہتے ہیں، اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی نبوت محض وہبی ہے، کوئی کتنی ہی ریاضت و مجاہدہ کیوں نہ کرلے اور اس کے اندر کتنی ہی قابلیت واستعداد کا جوہر کیوں نہ ہو مگر بغیر مشیت الٰہیہ کے موحیٰ الیہ نہیں بن سکتا۔

غرضیکہ نبوت ورسالت کوئی ڈگری نہیں بلکہ عہدہ ہے جو بغیر تفویض کے نہیں مل سکتا، دنیا میں صدہا لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی ہیں مگر کسی عہدہ پر فائز نہیں ہو سکے، اسی طرح روئے زمین پر بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے قلوب میں نبوت کا بارِ عظیم اٹھانے کی صلاحیت ہے مگر نبی نہیں کیونکہ یہ عہدہ ہے، یہ عطیۂ خداوندی ہے جسے چاہے دیں اور جسے چاہیں محروم رکھیں، قال اللہ تعالیٰ اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ۔ اللہ جانتا ہے کہ کسے رسول بنائے۔

اللہ یصطفی من الملٰئکۃ رسلاً ومن الناس۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ اور انسانوں میں سے رسولوں کو منتخب فرماتے ہیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ نبوت ڈگری نہیں بلکہ عہدہ ہے تو مالک جب تک چاہے عہدہ کو باقی رکھے اور جب چاہے توڑ دے، پس عہدۂ رسالت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد توڑ دیا گیا۔ اب کوئی ہزار صلاحیتیں پیدا کرلے نبی نہیں ہو سکتا، اگر باب نبوت میں ذرا بھی توسع ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ضرور نبی ہوتے،

کما قال صلی اللہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبی لکان عمر رض۔

(حدثنا الحمیدی)

حدثنا تحمل روایت کے سلسلے میں محدثین کے اصطلاحی الفاظ میں سے ایک لفظ یہ (حدثنا) ہے جیسے اخبرنا اور انبانا وغیرہ ہیں۔

متقدمین اور ائمہ متبوعین نیز امام بخاری رحمہم اللہ کے نزدیک تحدیث، اخبار اور انبار میں کوئی فرق نہیں، راوی کو اختیار ہے جن الفاظ سے چاہے روایت کرے، البتہ متاخرین اور امام مسلم رہ کے نزدیک فرق ہے قراۃ الشیخ علی التلمیذ (یعنی استاد پڑھے اور شاگرد سنے) تو روایت کے وقت شاگرد کو حدثنا فلان، یا سمعت فلانا کہنا چاہیے، اور اگر قرأۃ التلمیذ علی الشیخ ہو یعنی استاد کے سامنے شاگرد نے قرأت کی ہے تو روایت کے وقت شاگرد کو اخبرنا کہنا چاہیے یہی مسلک امام شافعی اور امام نسائی کا بھی ہے۔

تحمل روایت کے جملہ طرق کو امام بخاری رہ نے کتاب العلم میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اس لیے تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی، لیکن چونکہ یہ لفظ ابتدا ہی میں آیا ہے اس لئے صرف چند باتیں گوش گذار کر دیتا ہوں۔

(۱) بخاری شریف اور مسلم شریف میں بکثرت حدثنا اور نسائی شریف میں بکثرت اخبرنا اور مصنف عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں انبانا ملے گا۔

(۲) محدثین کا دستور یہ ہے کہ ابتدار سند میں حدثنا ہو یا اخبرنا جلی قلم سے لکھتے ہیں اس کے بعد اسی سند میں دوبارہ یہ الفاظ آتے ہیں تو کتاب کی عام عبارت کے موافق لکھتے ہیں تاکہ ابتدار اور درمیان میں امتیاز ہو جائے اور جلی کو دیکھکر اول نظر میں معلوم ہو جائے کہ سند کی ابتدار یہاں سے ہے۔

(۳) ایک دستور یہ بھی ہے کہ درمیان سند میں حدثنا، اخبرنا لکھتے ہیں تو ان الفاظ سے پہلے لفظ قال کو بھی لکھتے ہیں لیکن کبھی قال کو کتابت میں حذف کر دیتے ہیں مگر قرأت میں باقی رہتا ہے اس لئے قال حدثنا قال اخبرنا پڑھنا چاہیے۔

(۴) ایک دستور تخفیف کا بھی زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے کہ حدثنا کے بجائے صرف ثنا یا صرف نا لکھتے ہیں اور اخبرنا کے بجائے انا لکھتے ہیں، پڑھتے وقت حدثنا اور اخبرنا پڑھنا چاہیے۔

حمیدی (بضم الحار وفتح المیم) کے نام سے دو محدث گذرے ہیں یہ امام بخاری رہ کے شیخ اور امام شافعی رہ کے معاصر ہیں ان کا نام عبد اللہ بن زبیر اور کنیت ابو بکر ہے، یہ اپنے جد اعلیٰ حمید بن اسامہ کی نسبت سے حمیدی کہلاتے ہیں ان کی وفات مکہ مکرمہ میں ۲۱۹ھ میں ہوئی۔ (عمدہ)

اہم فائدہ حمیدی شیخ بخاری بڑے پایہ کے محدث بھی ہیں اور مصنف بھی، مسند حمیدی آپ کی بلند پایہ تالیف ہے جو محدث جلیل ابو المآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رہ کی اہم تعلیقات کے ساتھ حیدرآباد میں

طبع ہوچکی ہے، ناظرینِ کرام کی خدمت میں مسند حمیدی کا ایک بہترین تحفہ ہم (یعنی حضرت مولانا عبد الجبار اعظمی رح) پیش کرنا چاہتے ہیں، ملاحظہ ہو مسند حمیدی ج ۲ حدیث ۶۱۴ ۔

حدثنا الحمیدی قال ثنا الزهری قال اخبرنی سالم بن عبد الله عن ابیه قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا افتتح الصلوٰة رفع یدیه حذو منکبیه واذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع راسه من الرکوع فلا یرفع ولا بین السجدتین فاغتنم وتشکر (جامع الدراری ص ۱۵۲)

ایک دوسرے حمیدی بعد میں گذرے ہیں جو الجمع بین الصحیحین کے مصنف ہیں ان کا نام محمد بن ابی نصر اور کنیت ابو عبد اللہ ہے، ان کی وفات ۴۸۸ھ میں ہوئی۔

قال حدثنا سفیان یہ سفیان بن عیینہ ہیں جو امام اعظم رح کے تلامذہ میں سے ہیں اور امام شافعی رح کے اساتذہ میں سے ہیں، اکیانوے ۹۱ برس کی عمر میں ۱۹۸ھ میں وفات ہوئی۔ ولد سنة سبع ومائة وتوفی غرة رجب سنة ثمان وتسعین ومائة (عمدہ)، یہ تبع تابعین میں سے ہیں۔

قال حدثنا یحیی بن سعید الانصاری

مشہور تابعی اور محدث اور فقیہ ہیں ۱۴۳ھ میں وفات ہوئی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رح، امام مالک رح جیسے ائمہ نے ان سے روایت کی ہے۔

لفظ ابن کے ہمزہ کا ضابطہ

لفظ ابن اگر دو متناسل و متناسق علم کے درمیان واقع ہو اور لفظ ابن پہلے علم کی صفت ہو اور وہ ابن مضاف ہو دوسرے علم کی طرف اور مفرد ہو تو ابن کا ہمزہ حذف کردیا جائے گا لیکن اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو ہمزہ لکھا جائے گا، مثلاً یحیی بن سعید میں لفظ ابن دو متناسل علموں کے درمیان واقع ہے اور ابن یحیی کی صفت ہے اور سعید یحیی کے باپ ہیں اور ابن کا لفظ مفرد بھی ہے اور دوسرے علم سعید کی طرف مضاف ہے لہذا یحیی بن سعید میں ابن کا الف حذف کردیا جائیگا، نیز اگر ابن سے پہلے کوئی علم نہ ہو تو ابن کا ہمزہ لکھا بھی جائیگا اور پڑھا بھی جائیگا، مثلاً ابن عمر، ابن عباس، ابن مسعود وغیرہ۔

محمد بن ابراهیم التیمی

یہ مشہور ثقات تابعین میں سے ہیں حضرت ابن عمر رض سے شرف سماع ہے ان کی وفات ۱۲۰ھ مدینہ منورہ میں ہوئی۔

انه سمع علقمة بن وقاص اللیثی

ان کی کنیت ابو واقد اور نام علقمہ (بفتح العین) ہے، وقاص بتشدید القاف جمہور کے نزدیک تابعین میں سے ہیں وذکره ابن منده فی الصحابة وغیره فی التابعین المتوفی بالمدینة ایام عبد الملک بن مروان (قسطلانی ص ۸۸ ج ۱)

تنبیہ

ہمارے بخاری شریف کے ہندوستانی نسخہ ۵ کے حاشیہ ۳ میں قسطلانی کے حوالہ سے ذکرہ ابن المنذر من الصحابۃ کی عبارت میں کاتب کی غلطی ہے، کاتب نے ابن مندہ کے بجائے ابن المنذر لکھ دیا ہے ملاحظہ ہو قسطلانی ص۵۹، علامہ عینی رح حافظ عسقلانی رح سب نے یہی لکھا ہے۔

عمر بن الخطاب رض

آپ کا اسم گرامی عمر (بضم العین) ہے اور کنیت ابو حفص لقب فاروق ہے، آپ رض کی ولادت واقعہ فیل کے تیرہ برس بعد ہوئی، آپ ستائیس برس کی عمر میں سنہ ۶ نبوی میں مشرف باسلام ہوئے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ۱۳ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور دس برس چھ مہینے پانچ دن تخت خلافت کو زینت بخشی، فجر کی نماز میں ابو لؤلؤ مجوسی کے ہاتھ سے ۲۷ ستائیس ذی الحجہ ۲۳ھ بروز چہارشنبہ زخمی ہوئے، اور پانچویں دن یکم محرم بروز یکشنبہ بعمر ترلیسٹھ سال شہید ہوگئے، روضہ مطہرہ میں صدیق اکبر رض کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تشریح حدیث

یہ حدیث صحیح بخاری شریف کی سب سے پہلی حدیث ہے جس کی ابتدار سند میں امام بخاری رح کے شیخ حمیدی ہیں اور صحیح بخاری کی سب سے آخری حدیث کی ابتدار سند میں امام بخاری رح کے شیخ احمد بن اشکاب ہیں اور دونوں کا مادہ حمد ہے یہ امام بخاری رح کی دقت نظر اور باریک بینی کا کمال ہے کہ حمد سے ابتدا کر کے حمد پر ختم کیا ہے جو الحمد لا ولہ وآخرہ کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

انما الاعمال بالنیات

جمہور اہل لغت کے نزدیک انما حصر کیلئے آتا ہے، علامہ عینی رح فرماتے ہیں انما للحصر وھو اثبات الحکم للمذکور ونفیہ عما عداہ۔ (عمدہ ص۲۵ ج۱)

اعمال عمل کی جمع ہے صاحب قاموس عمل وفعل کو مترادف قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، اگرچہ کبھی کبھی دونوں ایک ہی معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، فعل عام ہے مطلق کام کو کہتے ہیں، اختیاری ہو یا غیر اختیاری، اور عمل صرف مکلف کے فعل اختیاری کو کہتے ہیں، غالباً اسی وجہ سے حدیث شریف میں انما الاعمال فرمایا گیا ہے افعال نہیں، اسلئے کہ افعال کا اطلاق انسان اور حیوان دونوں کے افعال پر ہوتا ہے اور اعمال کا اطلاق انسان کے ساتھ خاص ہے پس فعل البہائم کہا جائے گا ولا یقال عمل البہائم بل یقال عمل الانسان۔

نیات

نیۃ (بتشدید الیار وقد تخفف) کی جمع ہے، نیت کے لغوی معنی دل کے پختہ ارادہ اور قصد کے ہیں خواہ وہ کسی چیز کا ہو۔

شریعت کی اصطلاح میں اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کیلئے عبادت کے ارادہ کو نیت کہتے ہیں۔

عزم، قصد، نیت

پختہ ارادہ ہونے میں تو مشترک ہیں مگر فرق ہے۔

عزم وہ ارادہ ہے جو فعل پر مقدم ہو، قصد وہ ارادہ جو فعل سے مقترن ہو اور فعل کے ساتھ پایا جاتا ہو۔ نیت وہ ارادہ ہے جو عمل سے مقترن ومتصل ہو اور منوی معلوم ہو یعنی عمل کی غایت

وغرض ملحوظ ہو۔

پھر نیت، عزم، قصد تینوں ارادۂ حادثہ کا نام ہیں اسی لئے ان کا اطلاق باری تعالیٰ پر نہیں ہوتا اور چونکہ ارادہ میں حدوث کی خصوصیت نہیں اسلئے ارادہ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے جیسے یرید اللہ بکم الیسر۔ کیونکہ افعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض نہیں۔

بحث ونظر انما الاعمال بالنیات:۔ یہاں سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ جا حرف جار کا متعلق جو مقدر ہے وہ کیا ہے؟ تاکہ حدیث کا مطلب واضح ہو جائے۔

چنانچہ حضرات شوافع رہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ تصِحّ مقدر ہے یعنی انما الاعمال تصح بالنیات یا انما صحۃ الاعمال بالنیات، یعنی کوئی عمل بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوتا، تو اب اس عموم میں وضو بھی داخل ہے، پس اگر کسی نے بغیر نیت کے وضو کیا تو اس کا وضو صحیح نہیں ہوا اور اس وضو سے نماز نہیں ہو گی۔

اور حضرات احناف رہ کہتے ہیں تثاب مقدر ہے یعنی انما الاعمال تثاب بالنیات، یا ثواب الاعمال بالنیات الغرض ہر ایک اپنے مسلک کی رعایت سے مقدر نکالتے ہیں۔

اس بات پر دونوں فریق کا اتفاق ہے کہ اعمال سے مراد عبادات ہیں، کیونکہ الاعمال میں الف لام استغراقی نہیں ہے، کیونکہ چھت پر سے گرنے والا گرنے کی نیت نہیں کرتا، ٹھوکر کھانے والا ٹھوکر کھانے کی نیت نہیں کرتا، نیز کوئی بھی کپڑے اور بدن کی صفائی اور چوری و زنا میں حد جاری کرنے کیلئے نیت کی شرط نہیں لگاتا، اسی طرح قتل خطاء اس کو خطا کہا ہی جاتا ہے، اسلئے کہ اس میں قتل کی نیت نہیں ہوتی، اس کے باوجود سب اس میں دیت (تاوان) کا حکم دیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ الاعمال میں الف لام عہدی ہے اور مراد اعمال سے عبادات ہیں، اور عبادات مقصودہ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں بالاتفاق سب کے نزدیک نیت شرط ہے، بغیر نیت کے کوئی عمل عبادت کے درجہ میں نہیں آئے گا نہ اس پر عبادت کا ثواب ملے گا، پس وضو بلا نیت فی نفسہ صحیح ہو جائیگا البتہ اس وضو پر ثواب نہ ہوگا۔

حدیث کا شانِ ورود جس طرح آیت کا شانِ نزول ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات احادیث کا بھی شانِ ورود (مورد وسبب) ہوتا ہے یعنی جس واقعہ پر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی، چنانچہ علامہ عینی رہ لکھتے ہیں عن ابن مسعود رض کان فینا رجل خطب امرأۃ یقال لھا ام قیس فابت الخ (عمدہ ص۲۴)، یعنی ایک شخص نے ایک عورت ام قیس کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تو ام قیس نے یہ شرط لگا دی کہ اگر تم ہجرت کر لو تو تم سے نکاح کر لوں گی، چنانچہ انھوں نے نکاح کی خاطر ہجرت کی، ان کو ہم لوگ مہاجر ام قیس کہتے تھے۔

حضور رہ کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور خطبہ میں یہ حدیث بیان کی انما الاعمال بالنیات الخ اور یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس زمانے میں ہجرت فرض تھی، پس اگر بقول شوافع ہر عمل کی صحت کیلئے نیت ضروری تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی تنبیہ پر اکتفا کیوں فرمایا؟ اس سے

آپؐ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ تمہاری ہجرت صحیح نہیں ہوئی تم لوٹ کر مکہ جاؤ اور پھر ہجرت کرکے آؤ جس طرح قم فصل فانک لم تصل فرمایا تھا، تعجب تو یہ ہے کہ جو حدیث حنفیہ کی دلیل ہے اور شوافع کے خلاف ہے، شوافع اسی کو اپنی دلیل اور حنفیہ کے خلاف بتاتے ہیں، سنئے ہجرت بھی عبادت غیر مقصودہ ہے جس طرح وضوء، کیونکہ اصل مقصد تو اقامتِ دین ہے جب احکامات شرعیہ کی ادائیگی میں دشواری ہوجاتی ہے تو شرائط کے مطابق ہجرت کا حکم ہوتا ہے ورنہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا ھجرۃ بعد الفتح پس جس طرح وضو عبادتِ غیر مقصودہ ہے اسی طرح ہجرت بھی، اور مہاجر ام قیس کی ہجرت نیت شرعیہ سے نہیں ہوئی لیکن حضور ؐ نے ان کی ہجرت کو باطل نہیں قرار دیا بلکہ جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہی ہے کہ ان کی ہجرت مقبول نہیں اس پر ثواب نہیں ملے گا، اسی طرح حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ وضو بدون نیت صحیح ہوجائیگا، البتہ عبادت نہ ہوگا ثواب نہ ملیگا، پس ثابت ہوگیا کہ یہ روایت حنفیہ کی دلیل ہے شوافع رح کو جواب دینا ہے۔

ائمہ کرام کا اصل اختلاف

احناف رح بھی وضوء کے عبادت ہونے کیلئے نیت کو شرط قرار دیتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ وضوء بغیر نیت کے عبادت کے درجہ میں نہیں آئے گی لیکن یہ کہ وہ مفتاح صلوٰۃ بھی نہ بن سکیگی یہ درست نہیں، اس لئے کہ وہ اعمال جو وسائل ہیں اور نماز کے لئے شروط ہیں جیسے سترِ عورت، اور طہارت ثوب و بدن ہے، اگرچہ حصولِ ثواب کیلئے نیت ضروری ہے مگر صحت کیلئے اور وسیلہ بننے کے لئے نیت ضروری نہیں، کیونکہ اس صورت میں وضوء بنفسہٖ خود عبادت نہیں بلکہ وسیلۂ عبادت ہے، اس وضوء سے نماز صحیح ہوجائے گی۔

اشکال وجواب

احناف رح پر اعتراض ہوتا ہے کہ جس طرح وضوء عبادتِ غیر مقصودہ ہے اسی طرح تیمم بھی عبادت غیر مقصودہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک وضوء میں نیت فرض نہیں اور تیمم میں فرض ہے؟

جواب ۱:۔ قرآنِ حکیم نے وضو کے متعلق فاغسلوا الخ فرمایا ہے اور تیمم کے متعلق فتیمموا صعیدًا طیبًا غسل کا لفظ نیت پر نہیں دلالت کرتا ہے اور تیمم کا لفظ نیت پر دلالت کرتا ہے، پس حنفیہ نے عنوانِ قرآنی کی رعایت کی لہٰذا حنفیہ کا یہ طریقہ قابلِ تحسین ہے نہ قابلِ اعتراض۔

۲:۔ وضو میں اگر نیت کو فرض قرار دیتے ہیں تو خبر واحد محتمل و مبہم سے کتاب اللہ پر زیادتی لازم آتی ہے اور یہ درست نہیں، اور تیمم میں نیت کو ضروری قرار دینے سے کتاب اللہ پر زیادتی لازم نہیں آتی بلکہ ارشادِ الٰہی کی تعمیل ہوتی ہے۔

۳:۔ پانی مطہر بالطبع ہے ارشادِ باری ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (سورۂ فرقان)، وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَکُمْ بِهٖ (انفال)، معلوم ہوا کہ پانی مطہر بالطبع ہے اور وضوء سے مقصود طہارت ہی ہے بخلاف مٹی کے کہ بطبعہٖ مطہر نہیں بلکہ ملوث ہے لہٰذا اس سے طہارت نیت

پر موقوف ہے، نیز تیمم کے معنی بھی قصد و ارادہ کے ہیں۔

ا۔ پھر اصل اصل ہے اور خلیفہ خلیفہ، پس اصالت اور نیابت کا تقاضا بھی ہے کہ تیمم میں نیت کو ضروری قرار دیا جائے۔

وانما لکل امرئ ما نوی اس روایت کے تین اجزاء ہیں، تین جملے ہیں۔

پہلا جملہ انما الاعمال بالنیات کا حاصل یہ ہے کہ عمل کا وجود عند اللہ نیت سے ہو جاتا ہے یعنی وہی عمل معتبر ہوگا جس میں نیت ہو۔

دوسرا جملہ "انما لامرئ ما نوی" سے مقصد یہ ہے کہ جیسی نیت ہوگی اور جتنی نیت ہوگی عمل کا وجود اسی طرح اور اسی قدر مرتب ہوگا، یعنی نیت میں جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اتنا ہی اس پر ثواب زیادہ ہوگا، نیز ایک عمل میں جتنی نیتیں ہوں گی (یعنی ایک عمل میں متعدد نیتیں جمع ہو جائیں)، تو سب کا اجر ملیگا، اتنے ہی اعمال کا ثواب ہوگا۔ مثلاً ایک شخص مسجد میں صرف نماز پڑھنے آتا ہے اور دوسرا ساتھ ہی اعتکاف کی نیت بھی کر لیتا ہے تو پہلے کو ایک عمل کا اور دوسرے کو دو عملوں کا ثواب ملے گا۔

اشکال وجواب یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جیسی نیت کریگا وہی مرتب ہوگا فقہاء رح فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص رمضان میں نفلی روزے کی نیت کرے تب بھی فرض ہی واقع ہوگا، تو یہاں پر ما نوی مرتب نہ ہوا۔

جواب یہ ہے کہ رمضان چونکہ نفل کا محل نہیں ہے اسلئے نفل کی نیت لغو ہو جائیگی، نیز یہ بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ فرض کے اندر نفل داخل ہے گویا فرض عبادتِ نافلہ مع شیئ زائد ہے تو اس صورت میں ما نوی مرتب ہوا لیکن مع شیئ زائد۔

تیسرا جملہ فمن کانت ھجرتہ الخ جملہ ثانیہ کی تفصیل ہے اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے تخم اور شجر و ثمر ہے، نیت بمنزلہ تخم (بیج) ہے، اس تخم سے درخت کا پیدا ہونا عمل ہے اس پر مالک کی ہمہ تن مصروفیتوں سے کم و بیش سات سو دانے لگ گئے، اگر تخم بونے کے بعد اس کی آبیاری اور نگہداشت نہ کرتا تو ایک دانہ بھی نہ آتا، آگے اس کے ثمر (پھل) کی حلاوت یا ترشی وغیرہ تخم کی جلنسیت پر موقوف ہے اسی طرح نیت شر ہوگی تو ثمرہ بھی شر مرتب ہوگا اور نیت خیر پر ثمرہ خیر کا مرتب ہوگا۔

اختصار حدیث اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اختصار حدیث جائز ہے یا نہیں؟ (عمدہ، فتح) ارجح الاقوال اور صحیح ترمذہب یہ ہے کہ ماہر فن کیلئے جائز ہے غیر ماہر کیلئے ناجائز، وجہ ظاہر ہے کہ غیر ماہر کے اختصار میں خطرہ ہے کہ بقیہ حدیث کا مضمون خبط ہو جائے بخلاف ماہر کے کہ ماہر آخر سے یا درمیان سے کہیں سے بھی اختصار کرے گا تو اس بات کا ضرور خیال رکھیگا کہ روایت کے بقیہ مضمون میں خلل نہ ہو صحیح بخاری کی یہ پہلی حدیث ہے جس میں امام بخاری رح نے ایک جملہ یعنی فمن کانت

هجرته الی اللہ ورسولہ فهجرته الی اللہ ورسولہ" کو حذف کرکے جواز اختصار کی طرف اشارہ کردیا، نیز امام بخاری رح ہی کی دقت نظر اور باریک بینی ہے کہ ایک لطیف انداز میں تنبیہ فرمادی کہ علم دین کی تحصیل میں معلم اور متعلم کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم قبیح نیت نہ ہو کیونکہ دفع مضرت مقدم ہے جلب منفعت پر، پس امام نے فمن کانت هجرته الی اللہ ورسولہ فهجرته الی اللہ ورسولہ" چھوڑدیا کہ قبیح نیت نہ ہو ہاں اگر حسن نیت ہو تو نورٌ علیٰ نور۔

اشکال وجواب

جملۂ اولیٰ فمن کانت هجرته الی اللہ ورسولہ فهجرته الی اللہ ورسولہ میں شرط وجزاء میں تغایر ضروری ہے اور یہاں اتحاد ہے۔

جواب یہ ہے کہ تغایر کبھی لفظی ہوتا ہے اور کبھی معنوی جیسے شعری شعری، انا انا، انا ابوالنجم وغیرہ کے اندر کبھی لفظاً اتحاد ہے مگر معنی میں تغایر ہے، مراد یہ ہے شعری شعر الکامل، انا انا الکامل، انا مشہور بابی النجم۔ اسی طرح یہاں بھی مراد ہے من کانت هجرته الی اللہ ورسولہ نیۃً وقصداً فهجرته الی اللہ ورسولہ اجراً وثواباً۔

اوالی امرأۃ ینکحہا الخ

اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب عورت بھی دنیا میں داخل ہے تو اسے علیحدہ کیوں ذکر فرمایا؟ اس کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔

(۱) یہ تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے، فتنِ دنیا میں سے عورت کا فتنہ سب سے بڑھا ہوا ہے، کما قال تعالیٰ زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ الخ (آل عمران) اس آیتِ کریمہ میں دنیوی ساز وسامان میں سے نساء کی تقدیم ان کے فتنۂ عظیمہ پر دلیل ہے۔

ایک اور جگہ ارشادِ خداوندی ہے "انما اموالکم واولادکم فتنة" جب مال واولاد فتنہ ہیں تو عورتیں جن کا ذکر مزیّنات (مشتہیات) میں سب سے مقدم کیا گیا کتنا خطرناک فتنہ ہوں گی؟ ارشادِ نبوی ہے "ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء (رواہ البخاری ومسلم)

؎ اگر نیک بودے ہمہ کار زن　زناں را مزن نام بودے نہ زن

؎ اکبر دبے نہ تھے کبھی برٹش کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی فوج سے

---

(۲) حدثنا عبد اللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن هشام بن عروۃ عن ابیه عن عائشة ام المؤمنین رضی اللہ عنها ان الحارث بن هشام سأل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقال یا رسول اللہ کیف یاتیک الوحی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم احیاناً یاتینی مثل

صَلصَلةِ الجَرَسِ وهو اشدّہ علیّ فیفصِمُ عنّی وقد وَعیتُ عنه ما قال واحیانًا یَتمثّل لِیَ المَلکُ رجلاً فیکلّمُنی فاعِی مایقول قالت عائشۃ رض ولقد رَاَیتُه ینزلِ علیه الوحیُ فی الیومِ الشدیدِ البردِ فیفصمُ عنه وانّ جبینه لیتفصّدُ عَرقًا۔

ترجمہ عبداللہ بن یوسف نے ہم سے بیان کیا کہ امام مالکؒ نے ہشام بن عروہ سے یہ روایت بیان کی کہ انہوں نے عروہ سے بطریق ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بیان کیا کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، فرمایا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کبھی تو میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ انداز وحی میرے اوپر زیادہ سخت ہوتا ہے، پس یہ کیفیت ختم ہوتی ہے اس حال میں کہ میں فرشتہ وحی کی بات کو محفوظ کرچکا ہوتا ہوں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں مجھ سے گفتگو کرتا ہے تو میں اس کے کلمات محفوظ کرلیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضہ نے فرمایا کہ میں آپؐ کو سخت سردی کے دن اس حال میں دیکھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی تھی تو آپؐ کی پیشانی مبارک سے پسینہ جاری ہونے لگتا۔

تعدد الحدیث یہ حدیث امام بخاری رحہ نے صحیح بخاری میں دو جگہ لائی ہے، بدء الوحی صـ۲، بدء الخلق صـ۴۵۷ نیز مسلم شریف صـ۲۵۷، ترمذی کتاب المناقب صـ۲۰۴، نسائی کتاب الافتتاح صـ۱۴۳ تا صـ۱۴۸۔

بیان رجالہ وھم ستۃ عبد اللہ بن یوسف امام بخاری رح، یحیٰ بن معین اور امام ذہلی جیسے محدثین کے شیخ ہیں، اور امام مالک ولیث بن سعد جیسے جلیل القدر ائمہ کے شاگرد ہیں، صحاح ستۃ میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا عبداللہ بن یوسف نہیں ہے ان کی وفات مصر میں ۲۱۸ھ میں ہوئی اصل میں یہ دمشقی ہیں پھر تنیس میں آکر مقیم ہوگئے۔

تنیس (بکسر التاء والنون المکسورۃ المشددۃ وسکون الیاء وفی آخرہ سین مہملہ) ایک شہر تھا جو تنیس بن حام بن نوح علیہ السلام کے نام پر مصر کے اطراف میں ساحل بحر پر آباد تھا لیکن اب (علامہ عینی رح کے زمانے میں) ویرانہ ہوگیا ہے اسی کی طرف نسبت کرکے ان کو تنیسی مصری کہا جاتا ہے۔

یوسف عبرانی لفظ ہے عبرانی زبان میں اس کے معنی جمیل الوجہ کے ہیں لہٰذا عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ (عمدۃ القاری صـ۳۶)

اخبرنا مالک یہ ائمہ مجتہدین متبوعین میں سے ایک جلیل القدر امام ہیں، امام شافعی رح اور امام محمد رح جیسے ائمہ عظام ان کے شاگرد ہیں، ولادت ۹۳ھ اور وفات ۱۷۹ھ قبر مبارک مدینہ منورہ میں بقیع کے اندر ہے۔

هشام بن عروۃ بلند پایہ کے تابعی مدنی حافظ حدیث تھے ان کی ولادت ۶۱ھ اور وفات بغداد میں ۱۴۵ھ میں ہوئی۔

عن ابیہ یعنی عروہ بن زبیر ہشام مذکور کے والد ہیں، ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور نام عروہ المتوفی ۹۴ھ جلیل القدر تابعی ہیں۔ مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ مشہورہ میں سے ایک یہ بھی ہیں، صحاح ستہ میں ان کے علاوہ عروہ بن زبیر کوئی نہیں ہے، صحابہ میں بھی عروہ بن زبیر کوئی نہیں۔ (عمدہ)

عن عائشۃ رضہ اسم مبارک عائشہ ہے اور لقب صدیقہ اور کنیت ام عبد اللہ ہے آپ کی ہمشیرہ اسماء بنت ابی بکر رضہ کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضہ کی نسبت کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ام عبد اللہ رکھی، تمام ازواج مطہرات امہات المؤمنین ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (سورۂ احزاب پ ۲۱ ع ۱) نبی کی بیویاں امت کی مائیں ہیں۔ ان کے والد خلیفہ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں یہ بھی قدرت کی عظیم الشان عنایت ہے کہ باپ رفیق غار ہیں تو بیٹی رفیقۂ حیات، آپ کی والدہ ماجدہ امّ رومان زینب بنت عامر ہیں، حضرت صدیقہ رضہ ۴ھ نبوی میں پیدا ہوئیں اور چھ سال کی عمر میں ہجرت سے قبل ۱۰ھ نبوی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ام المؤمنین کے خطاب سے مشرف ہوئیں اور تین سال کے بعد نو سال کی عمر میں رخصتی ہوئی اور حضور اقدس صلعم کی وفات کے وقت اٹھارہ برس کی تھیں عن عائشۃ انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تزوّجھا وھی بنت ست سنین وبنی بھا وھی تسع سنین الخ (بخاری جلد ۲ ص ۷۷۵)

پھر چھیاسٹھ سال کی عمر میں ۱۷ رمضان ۵۷ھ مدینہ منورہ میں وصال فرمایا، حضرت ابوہریرہ رضہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اشکال ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن امہات المؤمنین ہیں کقولہ تعالیٰ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (احزاب) اس سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات امت پر محرمات موبدہ ہیں، تمام امت پر والدہ کی طرح ہمیشہ کیلئے حرام ہیں تو پھر ان سے پردہ کیوں ہے؟

جواب:- ۱ جن عورتوں میں حرمت موبدہ نسبی قرابت یا مصاہرت یا رضاعت کی وجہ سے ہو ان سے پردہ نہیں ہوتا، ازواج مطہرات کی حرمت ان تینوں اقسام سے جداگانہ محض ادب و احترام، تعظیم و توقیر کے لحاظ سے ہے، تمام احکام میں نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی اولاد سے دوسرے مسلمانوں کو نکاح کرنا جائز ہے۔

۲:- حرمۃ الازواج حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر ہے جیسے کہ حیات کے اور بھی بہت سے احکام انبیاء کرام علیہم السلام پر جاری ہوتے ہیں، مثلاً اجسادِ انبیاء کو مٹی کا نہ کھانا، میراث تقسیم نہ ہونا، اسی طرح ازواج مطہرات کی حرمت اس لئے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اس دنیا سے رخصت ہوجانے

کے بعد بھی دنیوی حیات کے چند احکام و آثار مرتب ہوتے ہیں، پس ازواج مطہرات رضؓ ذات زوج ہونیکی وجہ سے حرام ہیں اور حرمۃ المنکوحہ پردہ کے منافی نہیں۔

حارث بن ہشام یہ سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضؓ کے چچازاد بھائی اور ابوجہل فرعون مکہ کے حقیقی بھائی تھے، غزوۂ بدر واحد میں یہ بھی کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ میں آئے تھے، فتح مکہ کے دن ایمان لائے اور غزوۂ یرموک ۱۵ھ میں شہید ہوئے، فضلائے صحابہ میں سے تھے۔

کیف یاتیک الوحی، حضرت حارث بن ہشام رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ خصائص نبی کے متعلق سوال کرنا جائز ہے، چونکہ وحی ایک عجیب وغریب امر تھا اس لئے شدتِ اشتیاق کی بنا پر وحی کی کیفیت سے سوال کیا، یہ سوال نزول وحی میں تردّد وشک کی بنا پر قطعاً نہیں تھا سوال عن الکیفیت تو دلیل یقین ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کے وجود کا یقین نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی کیفیت دریافت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے خصائصِ الٰہیہ سے متعلق سوال کیا تھا رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی۔ جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلانکیر کے جواب میں ارشاد فرمایا اور جواب میں وحی کی دوؔ قسمیں بیان فرمائیں:۔

(۱) احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس، کبھی تو میرے پاس (وحی) گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے۔

احیانا منصوب علی الظرفیۃ ہے والعامل فیہ قولہ یاتینی موخرا (عمدہ صہ۴۲) احیان حین کی جمع ہے جس کے معنی مطلق وقت کے ہیں، قلیل وکثیر سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے والحاصل ان الحین یطلق علی لحظۃ من الزمان فما فوقہ (عمدہ)

صلصلۃ الجرس صلصلہ لغۃً اس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے یا پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچنے سے پیدا ہوتی ہے جرس اس گھونگرو یا گھنٹی کو کہتے ہیں جسے جانوروں کے گلے میں ڈالدیتے ہیں تاکہ چلتے وقت حرکت سے آواز پیدا ہوتی رہے۔

بحث ونظر اس میں بحث ہے کہ مثل صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی آواز کی طرح)، یہ آواز کس چیز کی تھی؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے کلام نفسی قدیم کی آواز ہوتی تھی یعنی صوتِ وحی، صوتِ باری تعالیٰ۔

(۲) حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کی اصلی آواز ہوتی تھی۔

(۳) جبرئیل عہ کے پروں کی یہ آواز ہوتی تھی جس میں حکمت یہ تھی کہ آپ وحی کی طرف متوجہ ہوجائیں جیسے ٹیلیفون میں پہلے متوجہ کرنے کیلئے گھنٹی بجتی ہے پھر بات شروع ہوتی ہے۔

مگر جمہور محدثین کہتے ہیں کہ یہ وحی ہی کی آواز تھی، امام بخاری رح کا یہی رجحان ہے، حافظ عسقلانی وغیرہ کی یہی تحقیق کہ یہ صوت وحی کی تھی، پس جیسے ہم کہتے ہیں لہ ید لیس کید نا ولہ ساق لیس کساقنا " اسی طرح صوتِ باری کے متعلق بھی کہینگے لہ صوت لیس کصوتنا چنانچہ جب حضرت موسیٰ ع سے کلام ہوا تو اس میں آواز کسی ایک جانب سے سنائی دینے کے بجائے ہر جانب سے سنائی دیتی تھی۔

اسی طرح بخاری میں ارشاد نبوی ہے :۔

اذا قضی اللہ الامر فی السماء ضربت الملائکۃ باجنحتہا خضعانا لقولہ کانہ سلسلۃ علی صفوان الخ — جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم دیتا ہے (یعنی جب کلام کرتا ہے کما فی الطبرانی) تو ملائکہ عاجزی سے اپنے پر مارنے لگتے ہیں (یعنی بیہوش ہوجاتے ہیں) یعنی کلام الٰہی سنکر جس میں ایسی آواز ہوتی ہے جیسے چکنے پتھر پر زنجیر کھینچنے سے۔

(بخاری ج ۲ صہ ۱۱۱۱ کی آخری حدیث)

اس کے بعد جب ملائکہ ہوش میں آتے ہیں تو ملاء اعلیٰ کے ملائکہ (یعنی مقرب ملائکہ) سے دریافت کرتے ہیں کہو! پروردگار نے کیا ارشاد فرمایا؟ (وہ مقرب فرشتے) کہتے ہیں بجا ارشاد فرمایا وہ بلند و برتر ہے۔

نیز اسی باب میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن انیس رض کی ہے۔

قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یحشر اللہ العباد فیناد یہم بصوت یسمعہ من بعد کما یسمعہ من قرب الخ — بیان کیا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرمارہے تھے کہ اللہ تعالیٰ (قیامت میں) بندوں کو جمع فرمائیں گے پھر ان کو ایسی آواز سے پکاریں گے کہ نزدیک اور دُور والے سب برابر سنیں گے۔

(بخاری جلد ۲ صہ ۱۱۱۴)

اس قسم کی روایات جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ امام بخاری صوت باری کے قائل ہیں اور مثل صلصلۃ الجرس خود وحی کی صوت ہے، باقی رہی یہ بات کہ صوت وحی کی صحیح حقیقت کا ادراک؟ تو یہ انسانی عقل وفہم سے بالاتر ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ؎ کہ جاہا سپر باید انداختن

مشبہ محمود اور مشبہ بہ مذموم

یہ صوت جس چیز کی بھی ہو مگر یہ بہت محمود صوت تھی کیونکہ اس کا تعلق بارگاہِ الٰہی سے تھا، حدیث میں اسکو صلصلۃ الجرس کے ساتھ تشبیہ دی حالانکہ صلصلۃ الجرس بہت مذموم چیز ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے ارشادِ نبوی ہے لا تصحب الملائکۃ رفقۃ فیہا جرس (مسلم شریف)

یعنی جس قافلہ میں جرس ہوتا ہے اس قافلہ کے ساتھ رحمت کے فرشتے نہیں رہتے، مگر چونکہ وجہ تشبیہ ظاہر ہے اور وہ اتصال وتدارک ہے اس لئے کچھ حرج نہیں۔ اس قسم کی تشبیہات احادیث میں بکثرت

موجود میں اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص مثل شیر کے ہے تو کیا تمام باتوں میں تشبیہ مقصود ہے ؟ ہرگز نہیں بلکہ وجہ تشبیہ ایک خاص وصف ہے یعنی شجاعت، ایسے ہی یہاں وجہ شبہ کا اعتبار ہے تشبیہ کا مقصود مشبہ کو واضح کرنا ہوتا ہے اس لئے اسے اختیار کیا اور یہ نبی ہی کی شان ہے کہ ایسی بلیغ تشبیہ دے اس سے بہتر تشبیہ ہو نہیں سکتی صحیح مسلم شریف میں ہے۔

ان الایمان لیارز الی المدینۃ   اسلام لوٹے گا مدینہ کی طرف جیسا کہ سانپ اپنے بل کما تارز الحیۃ فی جحرھا   (سوراخ) کی طرف لوٹتا ہے۔

اگر ہمارے بزرگوں میں سے کوئی بزرگ یہ تشبیہ دیتا تو کافر ساز فوراً تکفیر کرتے، ہمارے اکابر نے مسائل کی تفہیم میں تشبیہات سے کام لیا ہے، ان کا مقصد توہین نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو جہالات جاری کر رکھی ہیں وہ اسی ارذل کے مشابہ ہیں جس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس قسم کی تکفیر صریح ظلم ہے، یہاں ایمان جیسی مبارک شئی کو سانپ سے جس کا حرم میں بھی مارنا جائز ہے تشبیہ دیدی، غرض واضح ہے کیونکہ سانپ کہیں پھرتا رہے لیکن لوٹ کر اپنے بل ہی میں آتا ہے، اسی طرح اسلام فتنہ وفساد کے وقت اپنے مستقر میں پناہ لیگا۔

سیرت کی کتابوں میں ہے کہ جب حدیبیہ میں آپ ص کی اونٹنی بیٹھ گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
حبسھا حابس الفیل۔ اصحاب فیل کو روکنے والے نے اس اونٹنی کو روک دیا۔

یہاں حبس ناقہ کو حبس فیل (ہاتھی) سے تشبیہ دی حالانکہ وہ استیصال و تخریب کیلئے آیا تھا اور حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نیت خیر لیکر گئے تھے مگر مقصد صرف مشیت ایزدی کو بتلانا تھا۔

غرضیکہ ہمیشہ تشبیہ کی غرض کو دیکھا جاتا ہے یہاں حدیث میں غرض بساطت و اتصال اور تدارک کا بتلانا تھا اس لئے ایسا فرمایا گیا۔

وھو اشدہ علیّ اور یہ صلصلۃ الجرس کی صورت میرے اوپر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، شدت کی وجہ یہ تھی کہ افادہ و استفادہ کے لئے متکلم اور مخاطب کا ہم صفت ہونا ضروری ہے یعنی قائل اور سامع میں مناسبت ضروری ہے تو کبھی متکلم یعنی فرشتہ سامع یعنی نبی اکرم ص کی صفت و صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی سامع یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر متکلم کی صفت کو غالب کیا جاتا ہے یہی دوسری صورت سخت گراں ہوتی تھی کیونکہ نبی کی حالت میں تغیر ہوتا تھا اور لوازم بشریت سے ایک گونہ مجرد ہو کر صفات ملکیت سے متصف ہونا پڑتا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی تھی۔

(۲) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قسم میں فرمایا یتمثل لی الملک رجلا اور کبھی فرشتہ انسان کی شکل میں میرے پاس آتا ہے رجلا منصوب بنزع الخافض ہے عبارت ہوگی یتمثل لی الملک ای یتصور لی الملک تصور رجل (عمدہ صفحہ ۴۲)

فیفصم فیہ ثلاث روایات الاولیٰ وہی افصحہا بالفتح الیاء الخ (عمدہ صفحہ ۴۱)

یعنی یفصم میں تین روایتیں ہیں۔
(۱) بفتح الیاء واسکان الفاء وکسر الصاد یعنی مضارع معروف از باب ضرب یضرب، یہی اشہر اور افصح ہے۔
(۲) مضارع مجہول (۳) بضم اولہ وکسر الثالثۃ یعنی مضارع معروف از باب افعال اور یہ لغت قلیل الاستعمال ہے، فصم کے لغوی معنی قطع اور کاٹنے کے ہیں۔

اشکال ماقبل میں جو وحی کی تعریف وتقسیم مقدمہ میں ذکر کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا تھا کہ نزول وحی کے سات طریقے ہیں پھر اس حدیث میں دو ہی پر اکتفار کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ یہ دونوں طریقے کثیر الوقوع تھے اس لئے اہم اور کثیر الوقوع ہونیکی وجہ سے دو ہی کے بیان پر اکتفار کرلیا گیا باقی صورتیں نادر الوقوع ہونیکی وجہ سے ذکر نہیں فرمائیں۔

قالت عائشۃ رضؓ یہاں سے حضرت عائشہ رضؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک **وھو اشدہ علیّ**" کی توضیح وتبیین فرمارہی ہیں **ولقد رأیتہ** واؤ قسم لام تاکید اور قد للتحقیق ہے اپنا مشاہدہ بیان فرمارہی ہیں کہ قسم بخدا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سخت سردی کے زمانہ میں بھی جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگتا۔

وان جبینہ لیتفصد عرقا حضرت شاہ ولی اللہ رہ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی نور، حضرت جبرئیل عا بھی نور، پس اجتماع نورین کی وجہ سے حدت وگرمی پیدا ہو جاتی تھی اسلئے پسینہ آجاتا تھا، پھر تیسرا نور وحی الٰہی کا بھی ہوتا تھا انا سنلقی علیک قولا ثقیلا پھر جب تینوں ایک ساتھ جمع ہوگئے تو گرمی پیدا ہونا لازمی ہے اور یہ طبعی امر ہے کہ جب اندر گرمی زیادہ ہوجائے تو طبیعت اس کو باہر پھینکتی ہے اور جب پسینہ کی صورت میں اندر کی گرمی نکلی اور مسامات کھل گئے تو اب ہوا جو بدن کو لگے گی اور مسامات سے اندر گھسے گی تو ضرور سردی محسوس ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نزول وحی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زملونی زملونی"۔

مطابقۃ الحدیث للترجمہ علامہ سندھی رہ کی تحقیق کی بنا پر تو کوئی اشکال ہی نہیں اسلئے کہ علامہ سندھی رہ نے فرمایا کہ بدء کی اضافت وحی کی جانب بیانیہ ہے، اس صورت میں ترجمۃ الباب کیف کان بدء الوحی کے معنی ہوئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کیسے آئی؟ حدیث میں اس کا جواب ہے کہ فرشتہ وحی لیکر آتا ہے کبھی صلصلۃ الجرس کی شکل میں اور کبھی انسانی شکل میں۔

(۲) ترجمہ کے دو رُخ تھے ایک ظاہری اور ایک حقیقی۔ ظاہری پہلو کے اعتبار سے اس حدیث کا تعلق یہ ہے کہ حدیث میں نزولِ وحی کی عام صورت بتائی گئی کہ کبھی صلصلۃ الجرس اور کبھی فرشتہ کی وساطت سے وحی کا نزول ہوتا ہے، فرشتہ یا تو انسانی صورت میں آتا ہے یا بصورتِ ملک، بہرکیف جب عمومی طریق

معلوم ہوگیا تو اس سے ابتدائے وحی کے بارے میں ایک روشنی حاصل ہوگئی کہ وہ بھی اسی طرح نازل ہوئی ہوگی۔

دوسرا اس ترجمہ کا حقیقی پہلو ہے کہ اس ترجمہ سے مقصد عظمتِ وحی کا بیان کرنا ہے، اس لحاظ سے یہ حدیث قطعاً واضح ہے، حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں وکب ونتربد وجھہ آپ نزولِ وحی کے وقت بے چین ہوجاتے اور چہرۂ اقدس متغیر ہوجاتا تھا، پھر یہ کیفیت ایک دو مرتبہ پیش نہیں آئی جب بھی وحی آتی تھی یہی کیفیت پیش آتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بدنِ اطہر وحی کے وقت نچڑ جاتا تھا، معلوم ہوا کہ وحی عظمت کی چیز ہے اور آپ کی عمر کا بیشتر حصہ اسی کیفیت کو برداشت کرتے ہوئے گذر گیا اگر تصنع ہوتا تو انسان ایک دن میں کئی کئی مرتبہ اسے برداشت نہیں کرسکتا، حضرت آدم علیہ السلام پر پوری عمر میں صرف دس مرتبہ نزولِ وحی ہوا، حضرت نوح علیہ السلام پر پورے دورِ نبوت میں پچاس مرتبہ وحی آئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اڑتالیس مرتبہ اور عیسیٰ علیہ السلام پر صرف دس مرتبہ نزولِ وحی ہوا اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر چوبیس ہزار بار وحی نازل ہوئی اور اتنی ہی مرتبہ آپ نے یہ تکلیف اٹھائی اس سے آپ کی صداقت کے ساتھ عظمتِ وحی بھی بخوبی معلوم ہوتی ہے۔

---

(۳) حدثنا یحیی بن بکیر قال اخبرنا اللیث عن عقیل عن ابن شہاب عن عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا انہا قالت اوّل ما بدئ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم فکان لا یری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح ثم حبب الیہ الخلاء وکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیہ وھو التعبد اللیالی ذوات العدد قبل ان ینزع الی اھلہ ویتزود لذلک ثم یرجع الی خدیجۃ فیتزود لمثلہا حتی جاءہ الحق وھو فی غار حراء فجاءہ الملک فقال اقرأ فقال فقلت ما انا بقارئ قال فاخذنی فغطنی حتی بلغ منی الجھد ثم ارسلنی فقال اقرأ فقلت ما انا بقارئ فاخذنی فغطنی الثالثۃ ثم ارسلنی فقال اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربک الاکرم فرجع بہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرجف فؤادہ فدخل علی خدیجۃ بنت خویلد فقال زملونی زملونی فزملوہ حتی ذھب عنہ الروع فقال لخدیجۃ واخبرھا الخبر لقد خشیت علی نفسی فقالت خدیجۃ کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابدا انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق فانطلقت بہ خدیجۃ حتی اتت بہ ورقۃ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی ابن عم خدیجۃ وکان امرأ تنصر فی الجاھلیۃ وکان یکتب الکتاب العبرانی فیکتب من الانجیل بالعبرانیۃ ما شاء اللہ ان یکتب وکان شیخا کبیرا قد عمی فقالت لہ خدیجۃ یا ابن عم اسمع من ابن اخیک فقال لہ ورقۃ یا ابن اخی

ماذا ترى فاخبره رسول الله صلى الله عليه وسلم خبر ما رأى فقال له ورقة هذا الناموس الذي نزل الله على موسى يا ليتني فيها جذعا يا ليتني اكون حيا اذ يخرجك قومك فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أو مخرجي هم قال نعم لم يأت رجل قط بمثل ما جئت به الا عودي وان يدركني يومك أنصرك نصرا مؤزرا ثم لم ينشب ورقة أن توفي وفتر الوحي قال ابن شهاب واخبرني ابو سلمة بن عبد الرحمن أن جابر بن عبد الله الانصاري قال وهو يحدث عن فترة الوحي فقال في حديثه بينا انا أمشي اذ سمعت صوتا من السماء فرفعت بصري فاذا الملك الذي جاءني بحراء جالس على كرسي بين السماء والارض فرعبت منه فرجعت فقلت زملوني زملوني فانزل الله تعالى يا ايها المدثر قم فانذر وربك فكبر وثيابك فطهر والرجز فاهجر فحمي الوحي وتتابع تابعه عبد الله بن يوسف وابو صالح وتابعه هلال بن رداد عن الزهري وقال يونس ومعمر بوادره۔

ترجمہ ہم سے یحیٰ بن بکیر نے حدیث بیان کی کہ لیث نے عقیل (ابن خالد) سے اور انھوں نے ابن شہاب زہری سے بروایت عروہ بن زبیر حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی کہ حضرت عائشہ رضہ نے فرمایا کہ وہ پہلی چیز جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا ہوئی رؤیا صالحہ تھے جنھیں آپ خواب میں دیکھتے تھے چنانچہ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح سامنے آجاتا پھر خلوت گزینی آپ کے نزدیک محبوب کردی گئی، اور آپ غار حرا میں خلوت گزینی فرماتے اور اپنے اہل کی طرف اشتیاق سے پہلے کئی کئی رات تک اس میں عبادت فرماتے تھے اور اس کیلئے سامان خورد ونوش ساتھ لے جاتے پھر حضرت خدیجہ رضہ کے پاس تشریف لاتے اور اتنی ہی راتوں کے لئے پھر سامان مہیا فرماتے یہاں تک کہ حق آگیا (یعنی وحی الٰہی آگئی)، جبکہ آپ غار حرا میں تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا "اقرأ (پڑھیے)"، آپ نے فرمایا کہ میں نے جواب دیا کہ میں پڑھ نہیں سکتا، آپ نے فرمایا کہ فرشتے نے مجھے پکڑا اور دبایا یہانتک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اقرأ (پڑھیے)، پھر میں نے کہا "میں نہیں پڑھ سکتا" پھر فرشتے نے مجھے پکڑا اور دوسری مرتبہ دبوچا، یہانتک کہ اس کا دبوچنا میری انتہائی طاقت کو پہنچا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اقرأ (پڑھیے)، میں نے کہا میں نہیں پڑھ سکتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اس نے مجھے پکڑا اور تیسری مرتبہ دبوچا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا اقرأ باسم ربك الذي خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربك الاكرم آپ اپنے اس پروردگار کے بابرکت نام سے پڑھیے جس نے (ہر چیز کو)

پیدا کیا (بالخصوص) انسان کو لبتہ خون سے پیدا کیا پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے)، یہ آیات لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے اور آپ کا دل کانپ رہا تھا چنانچہ آپ حضرت خدیجہ رضی بنت خویلد کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مجھے کمبل اڑھادو مجھے کمبل اڑھادو، لوگوں نے آپ کو کمبل اڑھادیا یہاں تک کہ آپ کا خوف ختم ہوگیا (یعنی جب سکون کی کیفیت ہوئی)، تو آپ نے تمام واقعہ حضرت خدیجہ رضی سے بیان کیا اور فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا، حضرت خدیجہ رضی نے فرمایا "ہرگز ایسا نہیں ہوگا خدا کی قسم، اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رسوا نہ کریںگے آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں اور ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناداروں کی خبرگیری کرتے ہیں (آپ لوگوں کو ایسی چیزیں دیتے ہیں مال، اخلاق اور علم وغیرہ جو ان کے پاس نہیں) آپ مہمان نوازی کرتے ہیں، حق بجانب امور میں آپ ہمیشہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد فرماتے ہیں، پھر حضرت خدیجہ رضی آپ صلعم کو ساتھ لیکر چلیں اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو اسد بن عبدالعزیٰ کے بیٹے اور حضرت خدیجہ رضی کے چچا زاد بھائی تھے، اور ورقہ ایسے آدمی تھے جو زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہوگئے تھے اور عبرانی زبان کے کاتب تھے، چنانچہ انجیل میں سے عبرانی زبان میں حسب توفیق خداوندی لکھا کرتے تھے، ورقہ بہت عمر رسیدہ بوڑھے ہوگئے تھے جن کی بینائی بھی جاتی رہی تھی ان سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی نے کہا "اے میرے چچا کے بیٹے اپنے بھتیجے کی بات سنو، چنانچہ ورقہ نے آپ سے کہا "میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ تمام واقعات سنادئے جن کا مشاہدہ فرمایا تھا، ورقہ نے آپ سے کہا یہ تو وہی ناموس (رازدار) ہے جس کو حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا کاش میں آپ کی دعوت کے زمانہ میں نوجوان طاقتور ہوتا، کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالیگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وہ (میری قوم کے) لوگ مجھکو نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا ہاں، جو شخص بھی اس قسم کی دعوت لیکر آیا جیسی آپ لائے ہیں، لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا، اگر مجھے آپ کی نبوت کا زمانہ مل گیا (یعنی اگر میں ان دنوں تک زندہ رہا)، تو میں آپ کی مدد پوری قوت سے کروں گا، پھر تھوڑے ہی دن کے بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا اور وحی بھی موقوف ہوگئی۔

ابن شہاب نے کہا اور مجھے ابوسلمہ بن عبدالرحمان نے خبر دی کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے موقوف ہوجانے کے ایام کا حال بیان کرتے ہوئے یوں فرمایا کہ میں ایک مرتبہ جارہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، نظر اٹھاکر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے، میں اس منظر سے خوفزدہ ہوکر واپس ہوا اور (گھر والوں سے) میں نے کہا مجھے کمبل اڑھادو، مجھے کمبل اڑھادو، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ "اے کملی والے کھڑے ہوجائیے اور لوگوں کو ڈرائیے اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک رکھیے اور بتوں کو چھوڑے رکھیے۔

اس کے بعد وحی پے در پے آنے لگی۔

امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن یوسف اور ابو صالح نے یحییٰ بن بکیر کی متابعت کی (یہ متابعت تامہ ہے) اور عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے زہری سے کی ہے (یہ متابعت ناقصہ ہے) اور یونس اور معمر نے یرجف فؤادہ کے بجائے "یرجف بوادرہ" کہا۔

تعدد الحدیث یہ حدیث امام بخاری رح نے صحیح بخاری میں چار جگہ بیان کی ہے (۱) بدء الوحی ص۲، (۲) کتاب الانبیاء ص۴۸۰، (۳) کتاب التفسیر ص۷۳۹، (۴) کتاب التعبیر ص۱۰۳۳۔ مسلم شریف کتاب الایمان ص۸۸ وغیرہ۔

بیان رجالہ وھم ستۃ یحییٰ بن بکیر:- ان کا نام یحییٰ اور کنیت ابوزکریا ہے، والد کا نام عبداللہ ہے اور بکیر (بضم الباء وفتح الکاف) دادا ہیں، ولادت ۱۴۴ھ وقیل ۱۵۵ھ۔ وفات ۲۳۱ھ امام بخاری رح نے دادا کی طرف نسبت کر کے یحییٰ بن بکیر کہا چونکہ اسی طرح مشہور تھے، وھو من کبار حفاظ المصریین (عمدہ)

اخبرنا اللیث:- ان کا نام لیث والد کا نام سعد، دادا کا نام عبدالرحمان اور کنیت ابوالحارث ہے، تبع تابعی ہیں، ولد بقلقشندہ علی نحو اربع فراسخ من القاہرہ سنۃ ثلاث واربع وتسعین یعنی ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں پیدا ہوئے، ومات فی شعبان سنۃ خمس وسبعین ومائۃ وقبرہ فی قرافۃ مصر یزار وکان اماما کبیرا مجمعا علی جلالۃ وثقتہ وکرمہ وکان علی مذہب الامام ابی حنیفۃ رح قالہ القاضی ابن خلکان (عمدہ ص۴۲) صحاح ستہ میں ان کے علاوہ کوئی لیث بن سعد نہیں، پس صحاح ستہ میں جس جگہ بھی لیث بن سعد ہوں اس سے یہی مراد ہیں۔

عن عقیل (بضم العین وفتح القاف ای بالتصغیر) یہ عقیل بن خالد ہیں ان کی کنیت ابو خالد ہے اور دادا یعنی خالد کے والد کا نام عَقیل (بفتح العین وکسر القاف) ہے، امام زہری سے روایت کرنے والے اثبت رواۃ میں سے ہیں، ۱۴۱ھ میں مصر کے اندر انتقال ہوا، ولیس فی الکتب الستۃ من اسمہ عقیل (بضم العین) غیرہ (عمدہ)

عن ابن شہاب یہ امام زہری ہیں ان کے حالات مقدمہ میں گزر چکے ہیں سوانح امام بخاری رح سے قبل دیکھئے۔ عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عائشہ رض دونوں کے حالات دوسری حدیث کے تحت گزر چکے ہیں۔

عن عائشۃ ام المؤمنین رض انہا قالت الخ یہ حدیث بظاہر مرسل ہے کیونکہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت حضرت عائشہ رض پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں لیکن اقرب یہ ہے کہ بعد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رض نے اس واقعہ کو براہ راست سنا ہو، اس صورت میں یہ روایت بلا شبہ متصل ہو جائیگی لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ حضور رح سے نہیں سنا تو کسی صحابی سے سنکر بیان فرما رہی ہوں گی مگر پھر بھی کوئی

اشکال نہیں، اس لئے کہ صحابی کی مرسل روایت ہمارے نزدیک حجت ہے۔

اول ما بدئ به الخ پہلی وہ چیز جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء ہوئی رؤیائے صالحہ (اچھے اور عمدہ خواب) تھے من الوحی کی قید سے یہ معلوم ہوگیا کہ خواب بھی وحی کے اقسام میں سے ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے رؤیا الانبیاء علیہم السلام وحی (عمدہ ج ۱ ص ۵۳)

رؤیا الانبیاء وحی پر ایک اشکال

نبی کا خواب وحی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فانظر ماذا تریٰ، کے الفاظ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے دریافت کیوں فرمایا؟ اگر اسے وحی سمجھتے تھے تو بلا دریافت کئے تعمیل حکم کیلئے تیار ہو جاتے۔

جواب: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ استفسار تردد کی بناء پر نہیں تھا بلکہ اس سے اسماعیل علیہ السلام کا امتحان مقصود تھا کہ یہ بھی حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر خدانخواستہ اسمٰعیل علیہ السلام انکار کر دیتے تو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیل حکم سے ہرگز دریغ نہ فرماتے۔

دوسری حکمت یہ تھی کہ دریافت کرنے سے طریق ذبح متعین ہو جائیگا کیونکہ طوعًا ذبح ہونے اور کرہًا ذبح کرنے کا طریق جداگانہ ہے۔

اشکال

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب وحی تھا جیساکہ آپ کی تعمیل اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جواب افعل ما تؤمر سے ظاہر ہے بلکہ اسماعیل علیہ السلام کا افعل ما تریٰ کے بجائے افعل ما تؤمر کہنا ایک مستقل دلیل ہے تو خارج میں اس کا وقوع کیوں نہ ہوا؟ یعنی حکم ذبح ولد کا تھا مگر خارج میں ذبح نہیں ہوئے۔

اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔

(۱) شیخ اکبرؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ خواب کے صدق کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ جو کچھ خواب میں دیکھا وہی بعینہٖ خارج میں واقع ہو۔ دوسری صورت یہ کہ خواب کی تعبیر کسی دوسری شکل میں واقع ہو مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ نے تلوار کو حرکت دی تو وہ کچھ ٹوٹ گئی، پھر حرکت دی تو وہ درست ہوگئی، اور ایک گائے مذبوح دیکھی جس کی تعبیر یہ بیان فرمائی کہ تلوار کا ٹوٹنا احد میں مسلمانوں کی عارضی شکست ہے اور پھر تلوار کا درست ہو جانا بالآخر مسلمانوں کی فتح ہے اور مذبوح گائے شہداء سے تعبیر ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں انی رایت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رأیتھم لی ساجدین اس کی تعبیر گیارہ بھائی اور والدین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

اسی طرح انی ارٰنی اعصر خمرا - انی ارٰنی أحمل فوق راسی خبزا تاکل الطیر منہ۔
إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ

کی تعبیریں قرآنِ حکیم میں مذکور ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کی تعبیر علم اور قمیص کی دین بیان فرمائی۔
غرضیکہ بعض دفعہ خواب کی تعبیر اس کے ظاہر کے سوا کچھ اور ہوتی ہے اسی طرح یہاں ذبح ولد کی تعبیر ذبح کبش تھی مگر فرطِ امتثال کیوجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دھیان اس طرف نہ گیا اور ذبح ولد ہی پر تیار ہوگئے۔
شیخ اکبر رح کا یہ جواب تشفی بخش نہیں اس میں کئی قباحتیں ہیں۔
(۱) نبی سے اگرچہ اجتہادی خطا واقع ہوسکتی ہے جس پر بعد میں تنبیہ کردی جاتی ہے مگر بلا وجہ تغلیطِ نبی صحیح نہیں ہاں اگر کوئی اور توجیہ نہ ہوسکتی تو مجبوراً خطاءِ اجتہادی پر محمول کرنے کی گنجائش تھی۔
(۲) اگر ذبح کبش مقصود تھا تو قد صدقت الرؤیا کیوں فرمایا؟
(۳) وفدیناه بذبح عظیم اس پر دلیل ہے کہ اصل حکم ذبحِ ولد ہی کا تھا ذبح کبش تو بطور فدیہ ہوا ہے۔ فدیہ بدل کو کہا جاتا ہے۔
(۴) اگر ذبح ولد کا حکم نہ تھا تو اسے بلاء مبین کیوں فرمایا؟ ذبح کبش تو کوئی بڑی بات نہیں۔
۲۔ حضرت انور شاہ صاحب رح فرماتے ہیں کہ جتنا واقعہ خواب میں دیکھا اس کا وقوع خارج میں بھی ہوا ہے خواب میں صرف ذبح کرتے دیکھا انی اذبحک، یہ نہیں دیکھا کہ ذبح ہو بھی گئے ہیں لہٰذا خواب کے صدق میں کوئی اشکال نہ رہا۔
اس پر بعض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام کو اس کا علم تھا کہ میرے ذبح کرنے پر نتیجہ مرتب نہ ہوگا تو یہ بلاء مبین نہ ہوا اور اگر اس کا علم نہ تھا تو وہی تغلیطِ نبی لازم آئے گی، مگر یہ اعتراض صحیح نہیں اسلئے کہ نبی کو کسی غیر شرعی امر کا علم نہ ہونا باعث نقص نہیں اور نہ ہی ایسے علم کی نفی کو تغلیطِ نبی کہنا صحیح ہے۔

سب سے بہترین توجیہ ابن قیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں کہ حکم ذبح ولد کا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے سمجھ بھی چکے تھے اور عمل پر آمادہ بھی ہوئے بلکہ شروع بھی کردیا مگر قبل العمل یہ حکم منسوخ ہوگیا اس لئے کہ مقصد صرف امتحان تھا۔
اس تقریر پر زیادہ سے زیادہ قول نسخ قبل العمل لازم آیا اور اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ واقع ہے چنانچہ لیلۃ المعراج میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں مگر قبل العمل منسوخ ہوکر پانچ رہ گئیں۔
(ارشاد القاری بالاختصار)

فکان لایریٰ رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہوجاتا یعنی آپ جو کوئی خواب دیکھتے تھے اس کی تعبیر بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہوتی تھی جیساکہ صبح صادق کی روشنی بالکل ظاہر اور کھلی ہوتی ہے طلوع صبح میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

یہ رؤیا رِ صالحہ نبوت کی تمہید تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب تین صفات سے متصف تھے، صالحہ، صادقہ، واضحہ۔

صالحہ جس کا ظاہر بھی مبارک ہو اور اس کی تعبیر بھی خوشگوار ہو، ضرر کا پہلو اس میں نہ ہو۔

صادقہ جو سچا ہو اس کی تعبیر واقع کے مطابق ہو آگے عام ہے کہ خوشگوار ہو یا اس میں کوئی ضرر کا پہلو ہو۔ جیسے غزوۂ احد میں آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ نے تلوار کو حرکت دی تو وہ کچھ ٹوٹ گئی، پھر دوسری مرتبہ حرکت دی تو وہ درست ہو گئی، اور آپ نے ایک گائے مذبوح دیکھی جس کی تعبیر یہ بیان فرمائی کہ تلوار کا ٹوٹنا احد میں مسلمانوں کی عارضی شکست ہے اور مذبوح گائے شہداء سے تعبیر ہے، اس میں بظاہر مسلمانوں کا ضرر تھا مگر واقع کے مطابق تھا لہٰذا صادقہ تو ہے صالحہ نہیں۔ مگر یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں ہر خواب صادقہ صالحہ بھی ہیں اگرچہ دنیوی لحاظ سے بظاہر صالحہ نہ ہوں۔ چنانچہ یہاں بھی راہِ خدا میں شہید ہونا بلاشبہ حیات ابدی دنیوی حیات سے بہتر و صالح ہے۔

واضحہ، جس کی تعبیر بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہو، مثلاً نزولِ وحی سے پہلے آپ کا غیبی آواز سننا، احجار و اشجار کا سلام و کلام کرنا، چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھے سلام کرتا تھا۔ یہ سب امور آپ کو وحی سے مانوس کرنے کے لئے اور وحی کی عظمت و جلالت شان ظاہر کرنے کے لئے تھے، جیسے ریل گاڑی آنے سے قبل اسٹیشن پر سگنل، گھنٹی اور جھنڈیوں وغیرہ کے انتظامات شروع ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی بہت اہم اور تیز رفتار میل (مثلاً راجدھانی میل) آرہی ہو تو بہت پہلے ہی سے اس کیلئے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

مثل فلق الصبح علامہ عینی رح فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ مثل منصوب ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر عبارت یہ ہے الاجاءت مجیئا مثل فلق الصبح ای شبیہۃ لضیاء الصبح (عمدہ ص۔۔)

فلق (بفتح الفاء واللام) کے معنی ہیں پھاڑنا، چیرنا کما فی القرآن ان اللہ فالق الحب والنوی۔ (بیشک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والے ہیں دانہ اور گٹھلیوں کو)، صبح صادق کو فلق الصبح کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہ رات کی اندھیری کو پھاڑ کر نکلتی ہے۔ علامہ ابن ابی جمرہ نے منتخب بخاری پر بہجۃ النفوس کے نام سے شرح لکھی ہے ان سے حافظ نے نقل کیا ہے، علامہ ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں کہ اس تشبیہ میں ایک خاص لطیف نکتہ ہے کہ انبیاء سابقین چاند ستاروں کے مثل ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شمس (آفتاب) ہیں کہ جس کے طلوع سے کافی وقت پہلے صبح صادق اس کی خبر دیتی ہے کہ عنقریب آفتاب عالمتاب طلوع ہونے والا ہے ایسے ہی یہ رؤیائے صالحہ آفتاب نبوت کے مبادی اور پیش خیمہ تھے، نبوت سے قبل چھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، ربیع الاول میں رؤیائے صالحہ کی ابتداء ہوئی اور رمضان المبارک میں وحی شروع ہوئی۔

ثم حبب الیہ الخلاء قال العینی رح الخلاء بالمد وہو الخلوۃ مقصد یہ ہے کہ خلاء سے مکان خالی

مراد نہیں ہے بلکہ مراد مصدر یعنی خلوت کا اختیار کرنا ہے۔ یعنی پھر خلوت گزینی آپ کو محبوب بنادی گئی۔
حُبِّبَ بصیغۂ مجہول، جس سے معلوم ہوا کہ یہ خلوت گزینی طبعی نہ تھی بلکہ قدرت کی جانب سے تھی، صوفیا کرام کہتے ہیں کہ جب ذکر کے آثار شروع ہوتے ہیں تو آدمی کو خلوت محبوب ہو جاتی ہے۔ وکان یخلو بغار (ص۶۱) اور آپ غارِ حرا میں خلوت اختیار فرماتے تھے۔ حرا بکسر الحاء وتخفیف الراء صحیح قول یہ ہے کہ مذکر اور منصرف ہے (قسطلانی)
یہ حرا مکہ معظمہ سے تین میل کے قریب منیٰ کو جاتے ہوئے بائیں جانب پڑتا ہے اب اس کو جبل النور کہتے ہیں۔

انتخاب حرا کے وجوہ

خلوت گزینی کیلئے آپ نے غارِ حرا کو کیوں منتخب فرمایا؟ علامہ قسطلانی رح لکھتے ہیں کہ قریش میں سب سے پہلے آپ کے دادا عبد المطلب نے اس میں خلوت گزینی کی تھی (قسطلانی ص۴۷) دادا کے ساتھ آپ بھی کبھی کبھی تشریف لیجایا کرتے تھے اسی وقت سے آپ کو اس مقام سے انس تھا۔ مگر یہ توجیہ تشفی بخش نہیں اس لئے کہ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے دادا نے اُس غار کا انتخاب کیوں فرمایا؟

(۲) قال الحافظ فی کتاب التعبیر قال ابن ابی جمرۃ الحکمۃ فی تخصیصہ بالتخلی فیہ ان المقیم فیہ کان یمکنہ رؤیۃ الکعبۃ فیجتمع لمن یخلو فیہ ثلث عبادات الخلوۃ والتعبد ورؤیۃ البیت۔
خلاصہ یہ ہے کہ یہاں خلوت گزینی میں تین عبادتیں جمع ہو جاتی ہیں۔
(۱) خلوت یعنی کفار ومشرکین سے اعتزال وعلیحدگی، (۲) وہ ذکر واذکار جس میں آپ مشغول رہتے۔ (۳) بیت اللہ کو دیکھنا، روایت میں ہے کہ بیت اللہ کی جانب ہر نظر پر خدا کی بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔
(۳) غارِ حرا کا معائنہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ توجیہات کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ اسکا محل وقوع ہی کچھ ایسا ہے کہ خلوت وعبادت کے لئے عین مناسب ہے، شہر سے نہ زیادہ قریب کہ خلوت کا مقصد ہی حاصل نہ ہو اور نہ اتنا بعید کہ وہاں پہونچنا متعسر (مشکل) ہو اسی طرح غار کی بلندی نہ اتنی کم کہ ہر شخص بسہولت وہاں پہنچ جائے اور نہ اتنی زیادہ کہ وہاں جانا متعذر ہو، پھر غار کی نوعیت ایسی ہے کہ گویا قدرت نے عبادت ہی کے لئے اس کو چھوٹا سا کمرہ بنادیا ہے اونچائی اتنی کہ آدمی اس میں بسہولت کھڑا ہو سکے اور وسعت اتنی کہ سجدہ بسہولت ہو سکے غرضیکہ اس کی بناوٹ اور محل وقوع دیکھنے کے بعد کسی دوسری توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔
فیتحنث فیہ وھو التعبد اللیالی کئی کئی رات دن مسلسل اس میں عبادت کرتے تھے۔
وھو التعبد ھُوَ کی ضمیر تحنث کی طرف راجع ہے اور یہ تفسیر امام زہری کی ہے۔ حِنث کے معنی گناہ کے آتے ہیں لیکن چونکہ باب تفعل کی ایک خاصیت سلب ماخذ ہے اسلئے تحنث کے معنی ترک حنث کے ہوئے یعنی گناہ سے بچنا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے گناہ سے بچنا عبادت ہے پس یہ تحنث کے

حقیقی معنی نہیں بلکہ معنی التزامی ہے۔

غارِ حرا میں عبادت کی نوعیت

اس میں کلام ہوا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں کس دین کے مطابق عبادت کرتے تھے؟ دین نوح، ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام مختلف اقوال بیان کئے گئے ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح سے منقول ہے کہ کان عبادته صلی اللہ علیه وسلم قبل البعثة علی ملة ابیه ابراهیم علیهما الصلوٰة والسلام (تیسیر القاری ج ۱ ص۸)

یعنی آپ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی اتباع فرماتے تھے اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ نیز سیرت ابن ہشام کی روایت میں بجائے یتحنث یتحنف ہے یعنی آپ دین حنیف کے مطابق عبادت کیا کرتے تھے ممکن ہے کہ رواۃ نے فا کو ثا سے بدل دیا ہو اور اصل روایت فا کے ساتھ ہی ہو، حافظ رح فرماتے ہیں کہ فا کو ثا سے بدلنا عرب کا عام دستور ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ادیان سابقہ میں تحریف ہو چکی تھی پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بقایا غیر محرف کا علم کیسے ہوا؟ اس کا معتبر ذریعہ کیا تھا؟ اس لئے راجح وہی ہے جو صاحب درمختار نے کہا والمختار عندنا انه کان یعمل بما ظهر له من الکشف الصادق من شریعة ابراهیم وغیره (درمختار جلد اول)

یعنی ہمارے (احناف رح) کے نزدیک مختار یہی ہے کہ کشف صادق اور الہام صحیح سے جو ظاہر اور منکشف ہوتا اسی کے مطابق عمل فرماتے کسی خاص نبی کی اتباع نہ فرماتے تھے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کشف صادق اور قدرتی الفاظ ملت ابراہیمی کے مطابق ہوتا ہو جیسا کہ بعد میں ملتِ ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا۔

قبل ان ینزع الی اهله یعنی جب تک گھر والوں کی طرف اشتیاق نہ ہوتا تھا آپ وہاں رہتے کبھی کبھی ایک ماہ تک ٹھہرنے کی نوبت آتی، کما فی حدیث مسلم جاورت بحراء شهرا (یعنی میں حراء میں ایک مہینہ رہا)۔

ویتزود لذالک اور آپ سامان خورد و نوش بھی ساتھ لے جاتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب توکل ترک نہ کرنا چاہیے، حقیقت میں ترک اسباب توکل نہیں تعطل ہے البتہ یہ ضرور خیال رہے کہ یہ اسباب ہیں ارباب نہیں، ان اسباب کے باوجود حق تعالیٰ چاہیں گے تو کام ہوگا ورنہ نہیں۔

حتی جاءه الحق وهو فی غار حراء یہاں تک کہ حق آگیا جبکہ آپ غار حرا میں تھے یعنی اچانک اور غیر متوقع طور پر آپ کے پاس حق آگیا، چنانچہ بخاری کتاب التفسیر ص۷۳۹ میں ہے حتی فجئه الحق اور حق سے مراد وحی ہے۔

فجاءه الملک فقال اقرأ چنانچہ آپ کے پاس فرشتہ (جبرئیل ع) پہنچا یوم الاثنین لسبع عشرة خلت من رمضان وهو ابن اربعین سنة (عمدہ ص۱ ایضا قسطلانی) اور آپ نے

کہا "اقرأ" پڑھیے۔

فجاءہ میں فا تعقیبیہ نہیں ہے اس لیے کہ فرشتہ کا آنا وحی کے بعد نہیں ہوا ہے بلکہ فرشتہ یعنی جبرئیل علیہ السلام ہی وحی لیکر آئے اسلیے یہ فا تفسیر یہ تفصیلیہ ہے۔

فقال اقرأ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے کو معلوم تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور امی کو پڑھنے کا حکم دینا تکلیف مالا یطاق ہے پھر فرشتہ کی طرف سے امر قرأت کیوں؟

جواب یہ ہے کہ یہ امر تکلیفی نہیں تلقینی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میں پڑھتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ ساتھ پڑھیے، لہٰذا یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے قرأت کا حکم نہیں دیا بلکہ تعلیم قرأت کا حکم ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر الفاظ سے خیال فرمایا کہ قرأت کا حکم کیا جارہا ہے اس لیے جواباً فرمایا "ما انا بقارئ"۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ اقرأ امر تلقینی ہے تو اس کا ترجمہ یہ کرنا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، درست نہیں کیونکہ زبانی تعلیم وتلقین سے تلقین کردہ الفاظ کو پڑھنا امیت کے منافی نہیں جیساکہ مکاتب ومدارس میں رات دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے ما انا بقارئ کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ وحی کی عظمت وثقل کیوجہ سے میری زبان نہیں چلتی یعنی میں پڑھ نہیں سکتا۔

ثقل وحی

ثقل وحی کا بیان دوسری حدیث میں گزرچکا، خود قرآن حکیم میں ہے انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً۔ اور لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته خاشعا متصدعا من خشية الله

بخاری شریف میں متعدد جگہ یہ روایت ہے کہ حضرت زید رضہ فرماتے ہیں کہ صرف غیر اولی الضرر کا نزول ہوا اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زانوئے مبارک میرے زانو پر تھا تو مجھے محسوس ہورہا تھا کہ میرا زانو پارہ پارہ ہوجائے گا۔ پس خیال فرمائیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنا وزن ہوتا ہوگا، پھر اس آیت کا نزول غزوۂ بدر سے متعلق ہے اور مکہ معظمہ میں تیرہ برس تک وحی کا نزول ہوتا رہا اور بدر تک مدینہ منورہ میں۔

جب اس وقت کے ثقل کا یہ حال ہے تو اوّل مرتبہ میں کتنا ثقل ووزن محسوس ہوگا؟ بالکل ظاہر ہے کہ کسی امتی کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکتی، حقیقت تو یہ ہے کہ عظمت کلام قدرت نے حکمت کی بنا پر مخفی فرمادیا ہے ورنہ قرآن عظیم کی تلاوت مشکل ہوجاتی، کلام خداوندی کے روحانی وزن کا کسی امتی کو کیا اندازہ ہوسکتا ہے، لیکن کلام رسول کے وزن کی ایک جھلک کا اندازہ ایک مشہور واقعہ سے ہوسکتا ہے۔

حضرت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے اونچے اور ممتاز اولیاء کرام میں سے تھے اپنے زمانہ کے غوث وقطب تھے، جنید عالم بھی تھے حضرت تھانوی رحمہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوچکے ہیں اور ایک رسالہ میں ان کے کمالات وغیرہ کو بیان بھی کیا ہے۔

بہرکیف ایک عالم فاضل بخاری شریف کے پڑھانے والے استاد حضرت کی خدمت میں اجازت کیلئے حاضر ہوئے، ساتھ ہی شاگردوں کو بھی لائے تھے حضرت مولانا نے حسب دستور بخاری شریف کھول کر ان کے سامنے رکھدی اور فرمایا کہ پڑھیے، انہوں نے پڑھنا شروع کیا ترجمۃ الباب پڑھا سند پڑھی جب حدیث پر پہونچے تو خاموش

ہو گئے، حضرت فرماتے ہیں پڑھے، لیکن ان کی زبان نہیں کھلتی، نہ کتاب کے حروف ہی نظر آتے ہیں، جب بہت دیر ہوگئی تو حضرت نے فرمایا، جائیے وہ استاد حدیث چلے گئے، طلبہ وتلامذہ سخت متحیر تھے کیا وجہ ہے کہ حضرت استاد عبارت بھی نہ پڑھ سکے، اپنے شیخ سے وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ جب میں حدیث پر پہنچا تو زبان جواب دے چکی تھی، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا، حضرت مولانا گنج مراد آبادی رح سے دریافت کیا گیا تو فرمایا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے وزن کی ایک جھلک دکھلادی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ زبان ونگاہ نے جواب دے دیا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب کلام رسول کے وزن کی ایک جھلک کا یہ حال ہے تو کلام الٰہی کے وزن کا کیا حال ہوگا۔ حقیقت یہی ہے لا یحد ولا یتصور۔ (امداد الباری)

حتی بلغ منی الجهد۔ جہد میں چار احتمال ہیں بضم الجیم وفتحہا، وبرفع الدال ونصبہا۔ جُہد بضم الجیم اور جَہد بفتح الجیم دونوں کے تین معنی آتے ہیں طاقت مشقت اور غایت۔

بحالت رفع مشقت کے معنی میں ہوگا اور بلغ کا فاعل ہوگا اور مفعول محذوف ہوگا عبارت ہوگی حتی بلغ منی الجهد مبلغه اختصار کیلئے مبلغه مفعول کو حذف کردیا ترجمہ یہ ہوگا، فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دبوچا یہاں تک کہ میری مشقت وتکلیف اپنی انتہاء کو پہنچ گئی، یعنی اس سے زیادہ مشقت میری برداشت سے باہر تھی یا میری طاقت اپنی انتہاء کو پہنچ گئی یعنی اس سے زیادہ تحمل کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

(۲) بحالت نصب الجهدَ بلغ کا مفعول ہوگا اور فاعل کی ضمیر ملک کی طرف راجع ہوگی۔ یہاں ملک کی صورت بشریہ مراد ہے ورنہ ملک اپنی اصلیت پر ہوتے ہوئے کسی کو پوری قوت سے دبائے، تو اس کا تحمل انسان کیلئے مشکل ہے اس صورت (بحالت نصب) میں ترجمہ یہ ہوگا کہ یہاں تک کہ فرشتہ اپنی طاقت یا مشقت کی انتہاء کو پہونچ گیا (یعنی اس زور سے دبایا کہ خود پسینہ پسینہ ہو گئے)۔

ایک اشکال وجواب

اشکال یہ ہے کہ حضرت جبرئیل عہ کی قوت ملکی ہے جس کے متعلق قرآن حکیم میں ذی قوة (ای قوة عظیمة) فرمایا گیا ہے، قوم لوط کی بستی کو اپنے پر دن پر اٹھا کر الٹ دیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت جبرئیل عہ کی انتہائی قوت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم برداشت کرلیں؟

جواب یہ ہے کہ جو چیزیں (خواہ فرشتہ ہو یا جن) مختلف اشکال میں متشکل ہوتی رہتی ہیں وہ جس صورت میں ہوتی ہیں اسی طاقت میں بھی ہو جاتی ہیں لہٰذا جب جبرئیل عہ انسانی صورت میں ہوئے تو صرف ایک انسان کی طاقت میں ہو گئے، اور یہ معلوم ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو چار ہزار انسانوں کی طاقت دیگئی تھی، اسی نوع سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت عزرائیل عہ کے تھپڑ مار کر آنکھ کا نکالدینا ہے، نبی کی قوت واستعداد کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تجلی الٰہی سے جبل طور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف تھوڑی دیر کے لئے بیہوشی طاری ہوئی۔

دبوچنے کی حکمتیں از جامع الدراری شرح بخاری

(۱) علامہ عثمانی رح کی تحقیق انیق مع توضیح۔

حقیقت یہ ہے کہ جبرئیل امین نے بحکم الٰہی شق صدر کے ذریعہ روحانی بجلی کا عظیم الشان پاور آپ کے قلب مبارک میں بھر دیا تھا پھر قول ثقیل باعظمت کلام کی قرأت کا امر کیا، آپ پر سخت شدت طاری تھی، جبرئیل ع کا دبوچنا شدت ثقل کی تسہیل اور آسانی کیلئے تھا۔

علامہ عثمانی رح فرماتے ہیں کہ بعض نئی روشنی والوں نے (غالباً علامہ شبلی نعمانی مراد ہیں) کہا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جبرئیل علیہ السلام آپ کو دبائیں، آپ اس کو محسوس فرمائیں اور سہولت ہو جائے آپ پڑھنے لگیں۔ ہم کہتے ہیں کہ شروع سے آخر تک کونسی بات سمجھ میں آنے کی ہے؟ وحی کی حقیقت ہی کسی امتی کو معلوم نہیں ہو سکتی (کما مر) اس سلسلہ کی سب باتیں ہماری عقول سے باہر ہیں تو کیا سب کا انکار کر دوگے؟ علامہ عثمانی رح فرماتے ہیں کیفیت کچھ بیان نہیں ہو سکتی، مگر مجھ پر خود ایک واقعہ گذرا ہے، میں حیدر آباد کے شفاخانہ میں گیا تو ڈاکٹر نے بجلی سے علاج کے بہت سے کرشمے دکھائے پھر کہا فرمائیے تو آپ کے جسم میں بجلی پہنچاؤں، میں پہلے گھبرایا مگر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پیتل کا ایک دستہ پکڑ لیا، انہوں نے مشین چلائی اور تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ ہم اتنی بجلی آپ کے بدن میں پہنچا چکے ہیں، مجھے تعجب ہوا، مگر انہوں نے کہا آپ متعجب نہ ہوں ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا اور مولوی یحییٰ سے کہا "انہیں ذرا ہاتھ لگاؤ" انہوں نے ہاتھ قریب کر کے ایک انگلی بڑھائی ہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ انگلی سے ایک شعلہ نکلا، وہ سمجھے کہ انگلی جل گئی اور مجھے تکلیف محسوس ہوئی، اب معلوم ہوا کہ کوئی اجنبی چیز بدن میں ہے پھر مولوی یحییٰ سے کہا کہ ایک دم زور سے پکڑ لو، اب کچھ اثر نہ تھا یوں ہی پکڑے ہوئے رہے تھے کہ تیسرے آدمی سے کہا کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ، ہاتھ قریب کرنا تھا کہ وہی کیفیت پیدا ہوئی، پھر زور سے پکڑا تو کچھ اثر نہ ہوا، میں نے کہا کہ آج ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا، معلوم ہوا کہ زور سے پکڑنے میں بھی بعض اوقات آسانی ہو جاتی ہے۔ جبرئیل ع کا جب اتصال ہوا، اور نور کی نور سے ملاقات ہوئی تو اولاً بہت دقت ہوئی اور جب زور سے دبایا تو وہ ثقیل چیز سہل ہو گئی۔ (فتح الملہم ص۳۱۱)

(۲) حضرت شیخ الہند رح کی توجیہ

حاصل یہ ہے کہ معلم حقیقی تو اصل حضرت حق جل مجدہ ہیں اور جبرئیل امین واسطہ فی التعلیم ہیں جیسے قلم یا آئینہ بردار ہیں۔ خداوند قدوس نے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کے ساتھ تکمیل واتمام کو وابستہ کر دیا تھا اور آپ کے لئے سید الاولین والآخرین، امام الانبیاء والمرسلین ہونے کا فیصلہ روز اول سے ہی ہو چکا تھا۔ لیکن آپ کی

عبدیت کامل تھی، غارِ حرار کی خلوتوں نے اسے انتہائی عروج تک پہنچا دیا تھا اور آپ مقامِ عبدیت کے مراقبہ میں مستغرق تھے، اسلئے جب جبرئیل امین نے "اقرأ" کہکر کمال کی دعوت دی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقامِ عبدیت کے استغراق کیوجہ سے فرمایا "ما انا بقارئ" اور یہ فرمانا بالکل طبعی اور فطری چیز ہے اس لئے کہ ابتک آپ کے کمالات عبدیت کے پردے میں مستور تھے، بحکم الٰہی جبرئیل علیہ السلام دبوچ دبوچکر آپ کو اس مقامِ استغراق سے ابھارنا شروع کیا اور اپنے آئینہ میں آپ کے کمالات خفیہ کو دکھلانا اور اجاگر کرنا شروع کیا یہانتک کہ جب تیسری مرتبہ آپ کے کمالات مخفیہ ذہن نشین ہو گئے تو جبرئیل امین نے اقرأ باسم ربك الخ کہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا اور یہ عمل تدریجاً تین مرتبہ میں کیا گیا کہ اگر ایک مرتبہ میں کیا جاتا تو شاید آپ کے قویٰ متحمل نہ ہوتے۔

الغرض جبرئیل امین نے کوئی نئی چیز نہیں پیدا کی بلکہ جو چیز ابتک حِکَم و مصالح کی بنا پر مخفی رکھی گئی تھی اسکو بحکم الٰہی دکھلا دیا، کیونکہ آپ کو عظیم الشان منصب کی ذمہ داری سپرد کی جانے والی ہے۔

حضرت شیخ الہند رح نے ایک مثال بھی پیش فرمائی کہ جیسے کسی حسین نے کبھی آئینہ نہ دیکھا اور اسے اپنے حسن و جمال کا احساس نہ ہو لیکن دفعۃً اس کے سامنے آئینہ رکھدیا جائے تو اپنی صورت اور خد و خال کو دیکھکر خود اپنے قبول صورت کا گرویدہ ہو جائے گا حالانکہ آئینہ نے کوئی نئی چیز پیدا نہ کی، یہی حال یہاں ہے۔ ہمارے امیر شاہ خان کا شعر کتنا برمحل ہے۔

آئینہ مبیں ہرگز اے محوِ تماشائی ؎ ترسم کہ خوری زخمے از تیر نگاہ خود

یعنی تم آئینہ نہ دیکھنا ورنہ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری تصویر تمہیں مجروح نہ کر دے۔

(۳) حضرت شاہ عبد العزیز رح کی تحقیق انیق

یہ ہے کہ یہ کھینچنا ر دبوچنا، بحکم الٰہی نسبت اتحادی پیدا کرنے اور آپ کی مبارک روح میں اعلیٰ درجہ کی تاثیر پیدا کرنے کے لئے تھا جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں توجہ کہتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ معلم حقیقی تو باری تعالیٰ ہیں اور جبرئیل امین واسطہ فی التعلیم ہیں اور قاعدہ ہے اور دستور یہ ہے کہ جب ایک صاحبِ کمال دوسرے کو اپنے کمال سے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو خود کو اسکی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس توجہ کی چار صورتیں ہیں ۱ انعکاسی ۲ القائی، ۳ اصلاحی ۴ اتحادی۔

(۱) انعکاسی:

اس کا حاصل یہ ہے کہ شیخ اپنے ذکر و شغل اور انفاس قدسیہ کی برکت سے حاضرین مجلس کے قلب میں یادِ الٰہی کی نورانی روح پیدا کر دے، جب تک شیخ مجلس میں موجود ہے اس کے اثرات حاضرین پر بقدر استعداد پڑ رہے ہیں، دل و دماغ سے دنیا فراموش ہو گئی ہے لیکن جہاں شیخ نے مجلس کو چھوڑا وہ کیفیت ختم ہو گئی، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص خوب عطر لگا کر مجلس میں آئے اور اس کے عطر کی خوشبو حاضرین کو معطر کر دے، لیکن یہ توجہ کی کمزور قسم ہے کیونکہ اس کا

اثر صرف اسی مجلس تک ہے جب تک صحبت ہے پھر کچھ نہیں لیکن فائدہ سے خالی نہیں
(۲) **القائی:-** دوسری قسم جو انعکاسی سے اونچی ہے وہ توجہ القائی ہے کہ شیخ اپنے قلب کی نورانیت سے مرید کے اندر ایک نورانی کیفیت کا القاء کرتا ہے لہذ اپنے انوار باطنیہ کے چراغ سے مرید کے چراغ قلب کو روشن کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کے پاس چراغ بھی ہو اور تیل وبتی بھی ہو، اب کسی دوسرے ایسے شخص کے پاس پہنچتا ہے جو اپنا چراغ پہلے سے روشن کئے ہوئے ہے اور کہتا ہے کہ میرا چراغ روشن کر دیجئے، اس نے اپنے روشن چراغ سے اس کے چراغ کو روشن کر دیا، اس میں پہلے سے کچھ قوت زیادہ ہے کہ مجلس کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہتا ہے اب مرید کا کام ہے کہ ذکر وشغل کا تیل ڈالتا رہے، نیز معاصی کی ہوا سے اسکی حفاظت رکھے ورنہ چراغ گل ہو جائے گا۔
(۳) **اصلاحی:-** یہ توجہ کی تیسری قسم ہے جو اول اور ثانی سے قوی ہے اس میں مرید اپنے قلب کو ریاضات ومجاہدات سے بالکل صاف کر لیتا ہے پھر شیخ توجہ ڈال کر اپنے انوار کا ایک وافر حصہ مرید کو عنایت کرتا ہے اور مرید صفائی قلب کے باعث اس کی نورانیت کو قبول کر لیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص پوری محنت سے حوض کھود کر خوب صاف کر کے کسی دریا سے اس کا دہانہ ملادے تاکہ اس کے حوض میں پانی آجائے، اب اگر اس دہانہ میں معمولی خس وخاشاک اور مٹی وغیرہ آئیگی تو پانی کے دباؤ سے خود بخود بہتی چلی جائیگی، البتہ اگر کوئی بڑی چٹان ہی دہانہ میں گر گئی تو پانی کا آنا بند ہو گا۔
(۴) **اتحادی:-** چوتھی توجہ اتحادی ہے کہ اس میں شیخ اپنی روح باکمال کو مرید مستفید کی روح سے متصل کر دے اور اپنے کمالات وانوار کا افاضہ کرے کہ شیخ کے ساتھ طبیعت اتنی متحد ہو جائے کہ جو اس کے قلب میں آئے وہی مرید کے قلب میں بھی آئے، اس کی مثال میں حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شیخ ومرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت خواجہ صاحب کے یہاں چند مہمان آگئے اور اس وقت ان کی ضیافت کے لئے آپ کے یہاں کچھ موجود نہ تھا آپ بہت پریشان ہوئے اس پریشانی میں کبھی حجرہ کے اندر جاتے ہیں اور کبھی فرط اضطراب میں باہر تشریف لاتے، سامنے ایک نان بائی کی دوکان تھی اس کو معلوم ہوا تو فوراً ہی ایک سینی میں کھانا لگا کر حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر کر دیا، مہمانوں نے کھانا کھالیا، خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے، حقیقت تو یہ ہے کہ ان مشائخ کے یہاں یہ دستور رہا ہے کہ اپنی ذات کیلئے آنیوالے ہدایا سے اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا اس وقت خوش ہوتے جبکہ کوئی خصوصی مہمان آجائے اس وقت اگر کوئی ہدیہ مہمانوں کے لائق لاتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے دل کا کنول کھل جاتا ہے یہی حال یہاں ہوا، نان بائی جب برتن لینے آیا تو حضرت نے فرمایا " مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس نے عرض کیا، "حضرت اپنے جیسا بنا دیجئے، خواجہ صاحب نے فرمایا تم اس کو برداشت نہ کر سکو گے کچھ اور مانگ لے، مگر وہ اپنے مطالبہ پر مصر رہا، خواجہ صاحب اس کو حجرہ میں لے گئے اور اس کو اپنے سینے سے لگا کر اتحادی توجہ ڈالی

کچھ دیر کے بعد دونوں حضرات نکلے تو دونوں کی صورت تک ایک ہو چکی تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت خواجہ صاحب کے ہوش وحواس درست تھے اور نان بائی بیخود اور مدہوش، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نانبائی تین دن کے بعد واصل بحق ہوگیا، رحمۃ اللہ علیہ۔

بہرحال یہاں حضرت جبرئیل ع خداوند قدوس کی جانب سے بہت سے کمالات لیکر حاضر ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ ان سب کمالات کو آپ کے قلب مبارک میں ڈالدیں، لیکن اگر قانون تدریج سے صرف نظر کرتے ہیں تو فنا کا اندیشہ ہے اس لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ ایک بار دبایا پھر چھوڑ کر دقفہ دیا، پھر دوبارہ دبایا پھر سہ بارہ، اسطرح تدریجاً تین مرتبہ کے عمل سے اتحادی توجہ ڈال کر استعداد پیدا ہونے پر آیاتِ مبارکہ کی تلاوت فرمائی۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر توجہ اتحادی قبول کرنے والا جوہر قابل ہو تو اس کو نہ صرف یہ کہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ وہ کم سے کم وقت میں دوسرے کے کمالات اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رہ کے متعلق منقول ہے کہ ان ہی حضرت خواجہ باقی باللہ رہ کی خدمت میں حضرت مجدد الف ثانی رہ پہنچے، بیعت ہوئے اور چند ہی روز میں آپ نے قطبیت، فردیت وغیرہ مدارج عالیہ تک ترقی فرمائی اور خود خواجہ صاحب نے آپ کو قرب ونہایت وصول الی اللہ کے مراتب عالیہ کی تحصیل وتکمیل کی بشارت سنائی اور فرمایا کہ شیخ احمد سرہندی رہ ہمارے یہاں آئے جو کثیر العلم، قوی العمل ہیں، چند ہی روز میں ہم نے ان کے بہت سے عجائب وغرائب حالات مشاہدہ کئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آفتاب ہوگا جس نے سارا جہان روشن ہوگا، ایک روز یہ بھی فرمایا کہ شیخ احمد سرہندی ایسا سورج ہے جس کے سایہ میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توجہ قبول کرنے والا کبھی توجہ دینے والے سے بھی بڑھ جاتا ہے جیسا کہ یہاں حضرت خواجہ صاحب نے خود فرمایا کہ حضرتِ مجدد صاحب کی مثال سورج کی سی ہے اور ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کے سایہ میں گم ہیں۔ (انوار الباری ج ۱ ص۵)

ت علامہ قسطلانی رہ فرماتے ہیں کہ پہلی مرتبہ دبوچنا ہر طرف سے توجہ ہٹانے کیلئے تھا اور دوسری مرتبہ وحی الٰہی کی طرف ہمہ تن متوجہ کرنے کے لئے اور تیسری مرتبہ مؤانست کے لیے۔ (قسطلانی ج ۱ ص۱۱)

صاحب بہجۃ النفوس نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقصد آپ کو اپنے سینے سے ملا کر دبانے سے یہ تھا کہ آپ کے اندر ایک زبردست قوت نوریہ پیدا ہو جائے جس سے آپ وحی الٰہی کا تحمل کر سکیں۔ (انوار الباری ج ۱ ص۴۶)

فقال اقرأ باسم ربك الذى خلق یہ ما انا بقارئ کا جواب ہے کہ آپ اگرچہ بذاتِ خود قرأت سے عاجز ہیں مگر اپنے رب کے نام کی مدد سے قرأت شروع کیجیے، پھر لفظ رب اور ضمیر مخاطب کی طرف اسکی اضافت

میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ذات جسنے آپ کی بچپن سے تربیت کی اور کامل انسان بنایا گیا اب وہ ایسے ہی چھوڑ دیگی؟ اسلیے کہ تربیت کے معنی ہیں تبلیغ الشیٔ الی کمالہ شیئاً فشیئاً ای تدریجاً۔ یعنی چالیس سال تک آپ کی تربیت کی اور کمال تک پہنچایا، شروع ہی سے آپ کی نبوت کے عظیم الشان نشانات ظاہر فرمائے جیسے کہ حضرت موسیٰ ع کا ایسے زمانہ میں پیدا ہونا اور زندہ رہنا جبکہ فرعون نے بنی اسرائیل کے تمام لڑکوں کے قتل کرنے کا حکم دے رکھا تھا بلکہ سینکڑوں کو زیر تلوار دلقمہ تیغ صرف اس خیال سے کردیا کہ موسیٰ علیہ السلام دنیا میں زندہ نہ رہ جائیں، مگر قدرت کا کرشمہ کہ اس فرعون کی سرپرستی میں موسیٰ ع نے پرورش پائی اور جس فرعون کے خوف سے موسیٰ ع کی والدہ کا دریا میں ڈالدینا اور پھر فرعون ہی کے گھر میں پرورش پانا یہ تمام امارات نبوت تھے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ولادت سے بھی قبل ایسے آثار نمایاں ہوئے جو کسی عظیم الشان چیز کے وجود کی خبر دے رہے تھے، مثلاً آپ ص کی والدہ کا نور دیکھنا، آپ کے دادا کا خواب، ایران کسریٰ کے کنگروں کا ٹوٹ جانا، آتشکدۂ ایران کا ٹھنڈا ہوجانا وغیرہ وغیرہ۔

الذی خلق اس میں بھی استعداد قرأت پر دلیل ہے کہ جس ذات نے سارے عالم کو پیدا فرمایا وہ آپ کے اندر صفت قرأت پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، خلق کا مفعول دلالت علی العموم کیلیے حذف کیا گیا ای خلق کل شیٔ۔

خلق الانسان من علق یہ بھی استعداد قرأت کی دلیل ہے کہ قادر مطلق نے ایک غلیظ و نجس اور بے شعور بلکہ بے جان خون کے لوتھڑے کو انسان کی صورت عطا فرمائی، اور اس کو سمع و بصر اور فہم و شعور اور کمالات سے نوازا تو اس پر ایک کامل انسان کو اکمل بنا دینا اور امّی کو قاری بنا دینا کیا مشکل ہے؟

اقرأ وربك الاكرم اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ افادہ واستفادہ سے دو امر مانع ہوتے ہیں ایک یہ کہ مستفید میں استعداد و صلاحیت نہ ہو، دوسرا یہ کہ مفید بخیل ہو اس لئے افادہ میں بخل کرتا ہو، آیاتِ سابقہ میں بیان ہوا کہ مستفید یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں قرأت کی استعداد تام موجود ہے اور ربك الاكرم میں اس کا بیان ہے کہ مفید یعنی آپ کا رب سب سے زیادہ کریم ہے لہذا استفادہ سے کوئی امر مانع نہیں۔

الذی علم بالقلم جس نے قلم کی مدد سے سکھایا۔ اس میں بھی استعداد قرأت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نے ایک جماد محض یعنی قلم سے علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا کتنا بڑا کام لیا ہے تو آپ کے ذریعہ قرآن کے انوار کو انضمائے عالم تک پہنچانے میں کیا بُعد ہے؟

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملک (حضرت جبرئیل ع) رسول ص سے افضل نہیں کیونکہ وہ رسول ص کا معلم نہیں بلکہ واسطہ فی التعلیم ہیں اور واسطہ فی التعلیم متعلم سے افضل نہیں ہوتا جیسے قلم واسطہ فی التعلیم ہے اور متعلم سے افضل نہیں علمہ شدید القویٰ میں تعلیم کی نسبت ملک کی طرف مجازاً کردی گئی ہے حقیقۃً معلم اللہ تعالیٰ ہیں کما قال اللہ تعالیٰ الرحمٰن علم القرآن۔ وعلمك ما لم تكن تعلم۔

نیز علم بالقلم میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے قلم کاتب کے ارادہ سے عدول نہیں کرسکتا اسی طرح

ملائکہ جو ذریعۂ تعلیم ہیں اللہ تعالیٰ کے امر سے سر تابی نہیں کرسکتے، ویفعلون مایؤمرون۔

علم الانسان مالم یعلم :- اس سے بھی استعداد قرأت کو ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بوقت ولادت جاہل محض تھا اور اس میں عقل وفہم کا شائبہ تک نہ تھا، مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی ہے، پس وہ ذات ایک سہل انسان کو قاری بنادے یہ کچھ مشکل نہیں۔ علامہ عینی رح فرماتے ہیں "اشارۃ الی علم اللدنی" اس وقت تک سورۂ اقرأ یہاں تک نازل ہوئی بقیہ حصہ بعد میں نازل ہوا (عمدہ)۔

سوال وجواب

صحیح بخاری شریف کی اس تیسری حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اول ما نزل من القرآن سورۃ اقرأ ہے لیکن اسی بخاری شریف کی کتاب التفسیر صفحہ ۷۳۲ اور مسلم شریف جلد اول صفحہ ۹۱ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اول ما نزل من القرآن یاایھا المدثر ہے اور ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، کیف التوفیق ؟

جواب :- یہ ہے کہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لئے کہ اولیت حقیقیہ تو سورہ اقرأ کی پانچ آیتوں کو حاصل ہے، امام نووی رح فرماتے ہیں "ھذا ھو الصواب الذی علیہ الجماھیر من السلف والخلف۔"

اور پوری سورۃ جو سب سے پہلے نازل ہوئی وہ سورۂ فاتحہ ہے اور تین سال کی مدت فترت کے بعد اول ما نزل سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات یعنی فاھجر تک ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہات وحیثیات تینوں کے اندر مختلف ہیں اس لئے ہر قول اول ما نزل ہونے کے اعتبار سے صحیح ہے۔

فرجع بھا ای بالآیات (قسطلانی)

فدخل علی خدیجۃ الخ چنانچہ آپ حضرت خدیجہ رض کے پاس تشریف لائے۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ آپ کا اپنا گھر تھا اور حضرت خدیجہ رض آپ صلعم کی زوجہ مطہرہ طاہرہ تھیں۔

ام المؤمنین خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ام المؤمنین حضرت خدیجہ رض بالاجماع آپ صلعم کی پہلی بیوی ہیں اور بالاجماع پہلی مسلمان ہیں کوئی مرد اور کوئی عورت اسلام لانے میں آپ سے مقدم نہیں، آپ کے والد ماجد خویلد بن اسد عرب کے مشہور دولتمند تاجر اور قریش میں نامور تھے، آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا، حضرت خدیجہ رض جاہلیت کے رسم ورواج سے پاک تھیں اس لئے بعثت نبوی سے پیشتر وہ طاہرہ کے نام سے مشہور تھیں، آپ کا پہلا نکاح ابوہالہ بن زرارہ تیمی سے ہوا جن سے ہند اور ہالہ دو بیٹے پیدا ہوئے، ہند اور ہالہ دونوں مشرف باسلام ہوئے، دونوں صحابی ہیں، رضی اللہ عنہما۔ ہند بن ابی ہالہ نہایت فصیح وبلیغ تھے۔ حلیہ نبوی کے متعلق مفصل روایت ان ہی سے مروی ہے، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما حلیہ مبارک کی روایت اپنے ان ہی ماموں

سے کرتے ہیں۔
ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی کے نکاح میں آئیں جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام ہند تھا ہند بھی مسلمان ہوکر صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئیں، کچھ عرصہ کے بعد عتیق کا بھی انتقال ہوگیا اور حضرت خدیجہ رضہ پھر بیوہ کی بیوہ رہ گئیں۔ (زرقانی)

حضرت خدیجہ رضہ ایک حسین اور دولتمند عورت تھیں اس لئے بہت سے سرداران قریش ان کے ساتھ نکاح کے خواہشمند تھے مگر انہوں نے سب سے انکار کردیا اور نفیسہ بنت امیہ یعنی یعلی بن امیہ کی ہمشیرہ کے ذریعہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا چنانچہ حضرت خدیجہ رضہ کے چچا عمرو بن اسد نے ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کردیا، اس وقت حضرت خدیجہ رضہ کی عمر چالیس ۴۰ سال کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس ۲۵ سال کی تھی، نکاح کے بعد پچیس ۲۵ برس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں اور ہجرت سے تین سال پیشتر رمضان المبارک ۱۰ نبوی میں پینسٹھ ۶۵ برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور حجون میں دفن ہوئیں۔ آنحضور ص نے خود قبر میں اتارا، نماز جنازہ اس وقت تک مشروع نہیں ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے حضرت ابراہیم آپ کی ام ولد ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے جو بچپن ہی میں انتقال کرگئے، حضرت ابراہیم کے سوا بقیہ ساری اولاد حضرت خدیجہ رضہ کے بطن مبارک سے ہوئیں۔ دو صاحبزادے جن میں ایک قاسم ہیں جن کی وجہ سے آپ کی کنیت ابوالقاسم ہوئی صرف دو سال کی عمر میں راہی دار البقاء ہو گئے، دوسرے لخت جگر عبداللہ ہیں جو نبوت کے بعد پیدا ہوئے انہیں کا لقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے طیب اور حضرت خدیجہ رضہ کی طرف سے طاہر ہے یہ بھی بچپن ہی میں رحلت فرما گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاد نرینہ نہ رہنے کا طعن دیا گیا اور سورۂ کوثر کا نزول ہوا۔ چار صاحبزادیاں حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم، حضرت فاطمہ، صحیح قول کی بنا پر اسی ترتیب سے پیدا ہوئیں۔

فقال زملونی زملونی الخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر آتے ہی، فرمایا مجھے کمبل اڑھادو مجھے کمبل اڑھادو، لوگوں نے کمبل اڑھادیا یہاں تک کہ آپ کا خوف ختم ہوگیا۔

اشکال اشکال یہ ہے کہ حضور اقدس ص جب حضرت خدیجہ رضہ کے پاس تشریف لائے تو مذکر کا صیغہ زملونی سے خطاب کرنیکی کیا وجہ ہے؟ جبکہ مخاطب ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

جواب یہ ہے کہ ایسے مواقع یعنی مواقع خدمت پر محاورات میں تذکیر وتانیث کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کرتے، چنانچہ گھر جاکر عام طور پر بیوی سے کہتے ہیں کھانا لاؤ۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ گھر میں حضرت خدیجہ رضہ کے غلام بھی تھے اور باندیاں بھی تھیں اور اس وقت چونکہ پردہ کا دستور نہیں تھا اسلئے حضور اکرم ص نے سب کو خطاب فرمایا۔

لقد خشیت علی نفسی۔ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا۔

اس جملہ کی تشریح میں علامہ عینی رح اور حافظ عسقلانی رح وغیرہ نے بارہ اقوال نقل کئے ہیں۔ جن میں بعض تو بالکل غلط اور لائق ابطال ہیں اور بعض ضعیف۔ ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد حافظ عسقلانی فرماتے ہیں واولی هذه الاقوال بالصواب واسلمها من الارتیاب الثالث والذان بعده وما عداها فهو معترض۔ یعنی ان اقوال میں سب سے اولیٰ اور تمام شکوک وشبہات سے محفوظ تیسرا، چوتھا اور پانچواں قول ہو یعنی موت من شدة الرعب۔ مرض۔ دوام مرض۔

لیکن ان اقوال کا مدار حال یا استقبال پر ہے یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ میں ہلاک ہو جاؤنگا، حالانکہ حدیث شریف میں لفظ خشیت ماضی کا صیغہ ہے مضارع کا نہیں، یعنی گذشتہ واقعہ کا بیان ہے جو واقعات غار حراء میں گذرے تھے، آپ نے گھر آنے اور سکون حاصل ہونے پر ام المؤمنین حضرت خدیجہ رض سے فرمایا کہ خدیجہ! غار حراء کا معاملہ اسقدر سخت تھا کہ مجھکو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ یہ مطلب بالکل نہیں کہ آپ اب گھبرا رہے ہیں کہ میں کیا کروں گا۔

علامہ ابو الحسن محمد بن عبد الہادی سندھی رح فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک مناسب توجیہ یہ ہے کہ لفظ خشیت کو ماضی کے متعلق مانا جائے، ہو سکتا ہے کہ فرشتہ کو اول اول جب آپ نے دیکھا ہو تو پہچاننے اور وحی سے مشرف ہونے سے قبل آپ پر خشیت طاری ہوئی ہو اور معرفت ملک اور تبلیغ وحی سے قبل خشیت مضر نہیں جیساکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے فاوجس منهم خيفة۔ فلما ذهب عن ابراهيم الروع۔

اگر خشیت کو زمانہ حال یا استقبال کے لئے تسلیم کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے خدیجہ مجھ پر ایسی شدت گذری کہ آئندہ اس قسم کی شدت وصعوبت سے دو تین مرتبہ اور وحی نازل ہوئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میری جان نکل جائے گی۔

بہر حال علامہ سندھی رح کے نزدیک خشیت حال یا استقبال کیلئے نہیں، ماضی کا صیغہ ہے اور ماضی کے معنی میں ہے۔

حضرت خدیجہ رض سے اس واقعہ کو ذکر کرنے کی حکمت علامہ سندھی رح نے یہ بیان فرمائی ہے کہ حضرت خدیجہ رض کا امتحان مقصود تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استفسار فانظر ماذا ترىٰ۔ سے مقصد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا امتحان تھا، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ معلوم فرمانا چاہتے تھے کہ یہ خبر سنکر ایمان لاتی ہیں یا نہیں؟ اور اس امتحان کیلئے آپ نے ایسا طرز اختیار فرمایا کہ خدیجہ رض نے ہمدردی شروع کردی اور آپ کے اوصاف حمیدہ شمار کرکے تسلی فرمادی۔

کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابدا۔ (حضرت خدیجہ رض نے جواب دیا کہ) ہرگز ایسا نہیں ہوگا خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرینگے۔ اس سے حضرت خدیجہ رض کا کمال ذہانت اور کمال تجربہ معلوم ہوتا ہے

اس لئے کہ دنیاوی تجربات سے یہ بات مشہور تھی کہ جس شخص کے اخلاق وفضائل اس قسم کے ہوتے ہیں وہ خدا کا محبوب بندہ ہوتا ہے قدرت کی طرف سے اسکی اعانت ہوتی ہے نیز حدیث میں بھی آتا ہے کہ حسن سلوک کا کردار ذلت ونکبت کی رسوائیوں سے محفوظ کرتا ہے یہاں پانچ خصائل کا ذکر ہوا ہے۔

انک لتصل الرحم آپ توصلہ رحمی فرماتے ہیں یعنی قرابتداروں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تمام اوصاف میں سب سے پہلے صلہ رحمی کو ذکر کیا اس لئے کہ غیر کے ساتھ حسن سلوک اتنا زیادہ مشکل نہیں جتنا قرابت داروں کے ساتھ۔

وتحمل الکل بفتح الکاف وتشدید اللام یعنی آپ بوجھ اٹھاتے ہیں اس میں ضعیف، یتیم اور سب مجبور ومعذور داخل ہیں اسلئے کہ کل ہر وہ شخص ہے جو اپنا بوجھ برداشت نہ کرسکے، مقصد یہ ہے کہ عاجز لوگوں کا آپ بار اٹھاتے ہیں اور امداد فرماتے ہیں۔

وتکسب المعدوم بفتح التاء من باب ضرب۔ علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ھو المشہور الصحیح فی الروایۃ المعروف فی اللغۃ (عمدہ ص۱/۵۱) قاضی عیاض فرماتے ہیں وھذہ الروایۃ اصح (فتح ص۱/۲۴)

پھر کسب کبھی متعدی بیک مفعول ہوتا ہے اور کبھی متعدی بدو مفعول ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ مجرد میں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے، متعدی بیک مفعول ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ آپ نادار یعنی فقیر کو کماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ آپ ناداروں اور محتاجوں پر ایسے احسانات فرماتے ہیں کہ گویا وہ آپ کے مکسوب ومملوک ہوجاتے ہیں۔ نادار ومحتاج کو معدوم اسلئے کہا گیا کہ وہ بمنزلہ میت کے ہے کہ اپنی معیشت وضرورت کا انتظام نہیں کرسکتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ مال معدوم کو کماتے ہیں یعنی ایسا نایاب مال جسے عام لوگ نہ کماسکتے ہوں وہ آپ کما لیتے ہیں۔ مشہور تھا کہ آپ تجارت میں بڑے بالنصیب تھے کان محظوظاً فی التجارۃ پھر ایسا مال حاصل کرکے خود جمع نہیں کرتے بلکہ تحمل الکل وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق یعنی دوسروں پر خرچ کرتے ہیں۔

اور اگر تکسب متعدی بدو مفعول ہو تو ایک مفعول محذوف ہوگا، ای تکسب غیرک المعدوم یعنی نادر ونایاب چیزیں دوسروں کو عنایت فرماتے ہیں۔

دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تکسب المعدوم میں معدوم مفعول اول ہے بمعنی نادار اور مفعول ثانی محذوف ہوا ای تکسب المعدوم المال یعنی آپ نادار اور محتاج لوگوں کو مال عطا کردیتے ہیں، چنانچہ بعض نسخوں میں بجائے معدوم کے معدم بصیغہ اسم فاعل ہے، بمعنی محتاج، نادار۔

بعض نسخوں میں بضم التاء باب افعال سے بمعنی اعطاء ہے اس صورۃ میں ترجمہ وہی ہوگا جو مجرد متعدی بدو مفعول کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

تقری الضیف بفتح التاء، آپ مہمان نوازی فرماتے ہیں وتعین علی نوائب الحق راہِ حق میں

مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔ نوائب نائبہ کی جمع ہے، نائبہ حادثہ کو کہتے ہیں، حق کی قید بڑھا کر باطل سے احتراز مقصود ہے کیونکہ نوائب وحوادث دونوں قسم کے ہوتے ہیں یعنی اگر حق کی وجہ سے کوئی مصیبت میں مبتلا ہو تو آپ مدد فرماتے ہیں لیکن اگر کوئی ناحق کام مثلاً چوری کرنے جارہا ہو یا کسی کا حق دبانے کی کوشش کررہا ہو تو آپ اس میں اعانت نہیں فرماتے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ نوائب حق سے مراد آفاتِ سماویہ ہیں مثلاً کثرتِ بارش کی وجہ سے مکانات کا منہدم ہوجانا، یا گرم ہوا کی شدت وزیادتی یا پالا وغیرہ کی وجہ سے باغات اور کھیتوں کا برباد ہونا وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ آفاتِ سماوی ہوں یا ارضی حق بجانب امور میں آپ مدد فرماتے ہیں۔

فانطلقت به خديجة حتى اتت به ورقة بن نوفل الخ پھر خدیجہ رضہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو حضرت خدیجہ رضہ کے چچازاد بھائی تھے۔

زمانۂ جاہلیت میں دو شخص مکہ سے شام کی طرف تلاشِ حق کیلئے نکلے ایک زید بن عمرو بن نفیل (جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک صحابی سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے والد ہیں) دوسرے یہی ورقہ بن نوفل، بالآخر زید دین ابراہیمی پر جمے رہے، بیت اللہ پکڑ کر کہتے تھے "یا ربَّ البیت میں دین ابراہیمی پر ہوں اور اپنے کو ملتِ ابراہیمی پر کہتے رہے" ان کا انتقال آنحضور صلعم کی بعثت سے قبل ہوگیا۔

اور حضرت ورقہ تلاشِ حق میں رہے آخر ان کو ایک راہب (عیسائی عالم) مل گیا جو صحیح دینِ عیسوی پر تھا اور ورقہ نے دینِ عیسوی اختیار کرلیا۔

وكان يكتب الكتاب العبراني الخ اور ورقہ عبرانی زبان کے کاتب تھے یعنی انجیل کا ترجمہ عبرانی زبان میں لکھتے تھے، بعض روایت میں ہے يكتب كتاب العربي ويكتب من الانجيل بالعربية (بخاری ج ۲ ص ۹۸۷) دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لئے کہ حضرت ورقہ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں جانتے تھے اور دونوں زبانوں میں ترجمہ کرتے تھے، انجیل کی اصل زبان سریانی تھی، سوریا کی طرف منسوب ہے، سوریا ملک شام کو کہتے ہیں، اور تورات کی اصل زبان عبرانی تھی یہ عبر کی طرف منسوب ہے، عبر یعبر عبرًا عبورًا، از باب نصر عبور کرنا، عبر کی طرف منسوب کرکے عبری اور کبھی خلافِ قیاس الف نون زائد کرکے عبرانی کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نمرود سے بچکر عراق سے دریائے فرات عبور کرکے شام کی طرف تشریف لیگئے تو وہاں یہ زبان پیدا ہوئی اس لئے اسے عبرانی کہا گیا۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ورقہ عربی اور عبرانی دونوں زبانوں کے ماہر تھے اس لئے انجیل کو سریانی زبان سے بعض کو عبرانی زبان میں اور بعض کو عربی میں ترجمہ کرکے دیا کرتے تھے۔ (شرح نووی مسلم ج ۱ ص ۸۹)

بعض نے کہا ہے کہ اصل میں ہر آسمانی کتاب عربی میں نازل ہوئی تھی پھر نبی اپنی قومی زبان میں ترجمہ کرتے تھے، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

وکان شیخا کبیرا قد عمی اشکال ہوتا ہے کہ جب نابینا ہو گئے تھے تو لکھتے کیسے تھے؟
جواب ۱۔ نابینا ہونے سے قبل لکھتے ہوں گے۔
۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ضعف بصارت کو عمی سے تعبیر کر دیا ہو اور ضعیف البصر ہونے کے باوجود لکھتے ہوں۔
۳۔ یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی سے لکھواتے ہوں گے۔
فقالت له خديجة يا ابن عم ان سے خدیجہ نے کہا، اے میرے چچا کے بیٹے۔ مسلم کی روایت میں ہے أی عم اے چچا علامہ نووی رہ نے تطبیق دی کہ ابن عم تو واقعہ کے مطابق تھا کیونکہ واقعہ میں ورقہ چچا کے بیٹے تھے اور عم کبر سنی کیوجہ سے احتراماً کہا، اور یہ عرب کی اصطلاح ہے۔
اسمع من ابن اخيك الخ اپنے بھتیجے کی بات سنئے، ورقہ بن نوفل حضور اقدس ص کے چچا نہیں تھے مگر چونکہ اہل عرب ہر بڑے کو چچا بطور تعظیم اور ہر چھوٹے کو بھتیجا بطور شفقت کہتے ہیں اس لئے حضرت خدیجہ نے ابن اخ کہدیا۔
هذا الناموس الذى نزل الله على موسى یہ وہی راز داں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لیکر بھیجا تھا۔
ناموس کے معنی صاحب السر یعنی راز دار کے ہیں، امام بخاری رہ اس کی تفسیر کرتے ہیں الناموس صاحب السر الذى يطلعه بما يستره عن غيره (بخاری) یعنی وہ راز دار جو ان باتوں کو بتائے جنہیں غیر سے چھپائے۔ اور اسی وزن پر ایک لفظ جاسوس ہے مگر جاسوس شر کا راز دار ہوتا ہے، اہل لغت کوئی فرق نہیں کرتے اور یہی حافظ عسقلانی رہ فرماتے ہیں، لیکن علامہ عینی رہ فرماتے ہیں کہ ناموس اور جاسوس میں فرق ہے (عمدہ)۔ یہاں ناموس سے مراد جبرئیل ع ہیں سمی جبرئيل الناموس لان الله خصه بالغيب والوحى۔

اشکال

حضرت ورقہ دین عیسوی پر تھے تو انہیں نزل الله على عيسى کہنا چاہئے تھا؟
جواب (۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مستقل تھی اور عیسیٰ علیہ السلام نے اگرچہ توریت کے بعض احکام منسوخ کر دیئے لیکن زیادہ تر توریت ہی کے احکام پر چلتے تھے، پس عیسیٰ ع کی شریعت بمنزلہ تتمہ کے تھی مستقل شریعت نہ تھی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو موسیٰ ع کی شریعت کے ساتھ تشبیہ دیگئی، کیونکہ آپ کی شریعت سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے، جیسے توریت تمام کتب سابقہ میں سب سے زیادہ جامع ہے توریت میں احکامات بکثرت تھے بخلاف انجیل کے اس کے احکام کم تھے اور زیادہ تر مواعظ و نصائح۔ لہٰذا آپ کی وحی کو موسیٰ ع کی وحی سے تشبیہ دینا زیادہ مناسب تھا، قرآن مجید میں بھی موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دیگئی ہے انا ارسلنا اليكم رسولا شاهدا عليكم كما ارسلنا الى فرعون رسولا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے موسیٰ ع کے زمانہ نبوت میں فرعون کو غرق کیا گیا اسی طرح حضور اکرم ص کے

فرعون ابوجہل بھی برباد ہوگا۔

۲ :- بعض روایات میں نزّل علی عیسیٰ آیا ہے اس پر کوئی اشکال نہیں البتہ دونوں روایتوں میں تعارض کا اشکال پیش آئے گا، پس بوقت تعارض صحیحین کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

حافظؒ نے تطبیق کی یہ صورت بیان کی ہے کہ پہلے حضرت خدیجہ رضؓ ورقہ کے پاس تنہا گئی تھیں اور حالات بیان کئے تھے تو ورقہ نے نزّل اللہ علی عیسیٰ فرمایا، کما فی دلائل النبوۃ لابی نعیم، اس لئے کہ لفظ موسیٰ اختیار کرنے میں جو اشارات تھے حضرت خدیجہ رضؓ ان کے سمجھنے سے قاصر تھیں، بعد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لیکر دوبارہ گئیں تو نزّل اللہ علی موسیٰ فرمایا، پس تبدیلِ الفاظ فہم مخاطب پر مبنی ہے۔

۳ :- ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر یہود و نصاریٰ سب متفق تھے بخلاف حضرت عیسیٰ عؑ کے، کہ ان کو صرف نصاریٰ مانتے تھے۔

یالیتنی فیہا جذعا یالیتنی اکون حیا اذ یخرجک قومک کاش کہ میں آپ کے ایام دعوت میں نوجوان طاقتور ہوتا کاش میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔

جذعا بالذال المعجمۃ المفتوحۃ ای شابا قویا۔

أوَمخرجیّ ھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا وہ لوگ (میری قوم کے لوگ، مجھکو نکال دیں گے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی تعجب سے فرمایا، چونکہ حضور اکرم ﷺ کی چالیس سالہ زندگی نہایت محبوبانہ گذری تھی، پوری قوم میں الصادق الامین سے مشہور تھے، قوم کے اندر آپ کے محاسن وفضائل کا یہ عالم تھا کہ اہم موقع پر حکم اور فیصل مانتی تھی، پھر جس کے اخلاق ایسے ہوں جو خدیجہ رضؓ نے بیان کئے ایسے شخص کو لوگ نکالدینگے؟

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی حیرت کا اظہار فرمایا، حضور ﷺ کے اس حیرت و تعجب پر ورقہ نے جواب دیا:-

لم یات رجل قط الخ ہاں جو شخص بھی اس طرح کی چیز (نبوت)، لے کر آیا لوگوں نے اس سے دشمنی کا برتاؤ کیا، لہٰذا آپ کے ساتھ بھی دشمنی کا برتاؤ کریں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عراق سے شام جانا پڑا، موسیٰ عؑ مصر سے نکلے، اس لئے آپ کے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آئے گا۔

اشکال وجواب

أوَمخرجیّ میں اشکال یہ ہے کہ ہمزہ استفہام کے بعد واؤ حرف عطف واقع ہے، ہمزہ استفہام صدارت کلام کو چاہتا ہے اور واؤ اپنے ماقبل معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کا عطف حرف پر نہیں ہوسکتا تو اس عبارت پر وارد اشکال کا کیا جواب ہے؟

جواب ۱ :- یہاں ہمزہ اور واؤ کے درمیان ایک جملہ محذوف ہے یعنی امعادی ھم ومخرجیّ کیا یہ لوگ مجھ سے دشمنی کرنے والے ہیں اور مجھکو نکالنے والے ہیں؟

۲ :۔ بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ اصل میں واؤ مقدم اور ہمزہ مؤخر تھا اور اس جملہ کا عطف ماقبل کے جملہ پر ہے لیکن چونکہ ہمزہ صدارت کلام کو چاہتا ہے اس لئے ہمزہ کو مقدم کر دیا گیا۔
ان یدرکنی بالجزم بان الشرطیہ یومک بالرفع فاعل یدرکنی ای یوم انتشار نبوتک انصرک بالجزم جواب الشرط (قسطلانی ص۱۱۳) حضرت ورقہ نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا یعنی آپ کی رسالت تک زندہ رہا تو آپ کی مضبوط مدد کروں گا۔ ثم لم ینشب ورقۃ ان توفی ای لم یلبث پھر تھوڑے ہی زمانہ کے بعد حضرت ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ورقہ بن نوفل

حضرت ورقہ کے ناجی اور مومن ہونے پر سب کا اتفاق ہے کیونکہ جب نصرانی تھے تو اصلی دین مسیحی پر تھے محرّف دین پر نہ تھے۔
ام المؤمنین حضرت عائشہ رضہ کی اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ورقہ نے ابتداء نبوت کا زمانہ پایا اور پورے یقین کے ساتھ نبوت کا اقرار کیا اور نصرۃ کا وعدہ کیا کہ اگر آپ کی نبوت کے شیوع تک زندہ رہا تو مضبوط اور زوردار مدد کروں گا۔ ان کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ورقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بلاشبہ مومن مسلمان تھے لیکن لم ینشب ورقۃ سے معلوم ہوا کہ حضرت ورقہ نے زمانۂ دعوت نہیں پایا دعوت کا زمانہ فترۃ الوحی کے بعد یا ایہا المدثر قم فانذر ... تا والرجز فاھجر کے نزول سے شروع ہوتا ہے۔
حضرت ورقہ نبوت کے بعد اور رسالت سے پہلے ایمان لائے، حضرت ورقہ کا ایمان زمانہ فترت کا ہے اس وقت دعوت نہ تھی، اس لئے حضرت ورقہ مسلمان تو ہیں مگر انہیں صحابی کہنا مشکل ہے اگرچہ بعض علماء نے صحابی کہا ہے۔
امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب دریافت کیا گیا کہ سب سے پہلے کون مسلمان ہوا تو یہ ارشاد فرمایا کہ آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضہ اسلام لائے، اور عورتوں میں سے حضرت خدیجہ رضہ اور غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہ رضہ اور لڑکوں میں سے حضرت علی رضہ مشرف باسلام ہوئے۔
(جامع الدراری بحوالہ البدایہ والنہایہ ص۲۹/۳)

وفتر الوحی اور وحی بھی موقوف ہو گئی۔ فتر کے لغوی معنی تیزی کے بعد رُک جانا، سست ہونا، اور کسی کام کا موقوف ہونا، یہاں موقوف ہونے کے معنی ہیں۔
قرآن مجید سورۂ مائدہ آیت ۱۹ میں بھی علی فترۃ الرسل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تقریباً پانچ سو انہتر ۵۶۹ برس کی مدت نبی سے خالی رہی انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ بند رہا، آیت مذکورہ میں فترۃ رسل ہی مراد ہے، اور مطلقاً جب زمانہ فترۃ بولا جاتا ہے تو اس سے وہی زمانہ مراد ہوتا ہے (یعنی درمیانی وقفہ)۔ اس حدیث میں فترۃ وحی مراد ہے۔
اس فترۃ الوحی کی مدت میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے چھ ماہ اور بعض نے ڈھائی سال کہا ہے۔

امام احمد رح نے تین سال کا قول کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

قال ابن شہاب یہ تعلیق نہیں ہے جیساکہ علامہ کرمانی رح کو وہم ہوگیا، دراصل یہ تحویل ہے۔ تحویل کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ ابتدائی حصہ میں یعنی نیچے کی سندیں مختلف ہوں اور اوپر کی سند متحد ہو، عام طور پر تحویل کی یہی صورت ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ ابتدار سند متحد ہو انتہار سند مختلف یہاں یہی صورت ہے، امام بخاری رح سے لے کر ابن شہاب تک سند متحد ہے اور ابن شہاب کے بعد سند مختلف ہے، مضمون سابق کی سند میں ابن شہاب کے استاد عروہ ہیں اور وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضہ سے نقل کرتے ہیں تو وہ حدیث مسند عائشہ میں سے تھی، اور یہاں ابن شہاب کے استاد ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن ہیں جو حضرت جابر رضہ سے روایت کرتے ہیں تو یہ حدیث مسند جابر رضہ میں سے ہے جیساکہ امام بخاری رح نے کتاب التفسیر ص۷۳۹ میں ذکر کیا ہے۔

ابوسلمہ بفتحتین واسمہ عبداللہ المتوفی بالمدینۃ سنۃ اربع وتسعین (تقس)، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوسلمہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف احد العشرۃ المبشرہ کے صاحبزادے ہیں اور جلیل القدر محدث تابعی ہیں، بہتر سال کی عمر میں ۹۴ھ مدینہ منورہ میں وفات ہوئی۔

جابر بن عبداللہ الانصاری رضہ۔ جابر نام ہے اور ابوعبداللہ یا ابوعبدالرحمٰن کنیت ہے یہ بھی صحابی ہیں اور ان کے والد حضرت عبداللہ الانصاری خزرجی بھی صحابی ہیں جو ۳ھ غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضہ ان چھ[۶] صحابہ میں سے ہیں جو مکثرین فی الحدیث ہیں، حضرت جابر رضہ سے پندرہ سو چالیس[۱۵۴۰] حدیثیں مروی ہیں، صحیحین میں ان سے دوسو دس[۲۱۰] حدیثیں مروی ہیں، اٹھاون[۵۸] احادیث کی روایت میں حضرات شیخین متفق ہیں، بخاری میں ان کی چھبیس[۲۶] روایات ایسی ہیں جو مسلم شریف میں نہیں اور مسلم شریف میں ان کی ایک سو چھبیس[۱۲۶] روایات ایسی ہیں جو بخاری شریف میں نہیں، نابینا ہوکر دنیا سے تشریف لیگئے ۸۔ یا ۷۳ یا ۷۴ یا ۷۹ ہجری میں وفات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر چورانوے[۹۴] برس تھی، مدینہ طیبہ میں وفات پانیوالے صحابہ میں آخری صحابی ہیں۔

وھو یحدث راجح قول یہی ہے کہ ھو کی ضمیر کا مرجع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

وتابعہ عبداللہ بن یوسف الخ امام بخاری رح کا دستور یہ ہے کہ موقع بموقع متابعت پیش کرتے ہیں اور خصوصاً جہاں کوئی تردد پیدا ہورہا ہو مثلاً اس روایت میں لقد خشیت علی نفسی کے الفاظ ہیں جس کے مفہوم کے نہ سمجھنے کے باعث بعض لوگوں نے حدیث ہی کا انکار کردیا، امام بخاری رح نے متابعت پیش کرکے حدیث پاک کی تائید کردی۔

متابعت کی ۲ دو قسمیں ہیں، متابعت[۱] تامہ، متابعت[۲] ناقصہ۔

متابعت تامہ یہ ہے کہ ابتدار سند ہی سے متابعت ہو یعنی اول راوی نے جس شیخ سے روایت حاصل کی

دوسرے نے بھی اسی شیخ سے روایت حاصل کی جیسے یہاں تابعہ کی ضمیر مفعولی یحییٰ بن بکیر کی طرف راجع ہے جو امام بخاری رحمہ کے شیخ ہیں اور تابع کا فاعل عبد اللہ بن یوسف اور ابو صالح ہیں تو چونکہ ان دونوں نے یحییٰ بن بکیر کی پوری سند میں متابعت کی ہے اسلیئے یہ متابعت تامّہ کہلائیگی۔

تابعہ ھلال بن ردّاد عن الزھری یہاں عن الزھری متابع عنہ زہری کے ذکر سے معلوم ہوگیا کہ یہاں متابعت زہری کے شاگرد عقیل کی ہو رہی ہے پس تابعہ میں ضمیر کا مرجع عقیل ہے لہذا معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح عقیل نے زہری سے روایت کی ہے اسی طرح ہلال بن ردّاد نے بھی زہری ہی سے روایت کی ہے، تو چونکہ یہ متابعت ابتدار سند سے نہیں ہے بلکہ اوپر کے درجہ میں یعنی بعض سند میں ہوئی، اس لیے یہ متابعت ناقصہ ہے۔

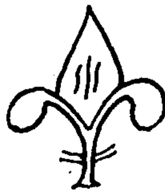
قال یونس ومعمر بوادرہ یہ دونوں بھی ہلال بن ردّاد کی طرح عقیل کے متابع ہیں اور زہری سے روایت کرتے ہیں مگر الفاظ میں کچھ فرق ہونیکی وجہ سے ان دونوں کو الگ ذکر کیا، الگ ذکر کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ متابعت میں ان الفاظ کا ایک ہونا ضروری نہیں بلکہ مضمون کا اتحاد کافی ہے جیسے یہاں ہے کہ امام زہری رحمہ کے ایک شاگرد عقیل نے یرجف فوادہ کہا اور یونس اور معمر نے بوادرہ کہا ہے۔

بوادر جمع ہے بادرۃ کی، بادرہ منکب اور عنق یعنی مونڈھے اور گردن کے درمیانی حصّہ کو کہتے ہیں، خوف کے وقت جس طرح دل کانپتا ہے اسی طرح یہ حصّہ بھی کانپنے لگتا ہے۔

مطابقۃ الحدیث للترجمہ

ترجمہ کے دو رُخ تھے ایک ظاہری اور ایک حقیقی۔ ظاہری رُخ تو یہ کہ وحی کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدار میں رؤیائے صالحہ دکھلائے جاتے تھے پھر خلوت گزینی کو محبوب بنا دیا گیا اور آپ غارِ حرار میں خلوت گزینی فرمانے لگے، یہ تمام مراحل وحی کے مبادی تھے، اس حدیث عائشہ رضؓ میں مفصل طور پر ابتدار وحی کے احوال کا ذکر آگیا۔

دوسرا مقصد حقیقی یعنی وحی کی عظمت و عصمت کا اثبات ہے، چنانچہ اس حدیث عائشہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وحی اس قدر با عظمت چیز ہے کہ جس کا تحمل پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بمشکل ہو پاتا تھا، نیز اگر وحی عظیم الشان چیز نہ ہوتی تو اس کے موقوف ہونے پر آنحضور صلعم اسقدر بیتاب نہ ہوتے کلام باری تعالیٰ کی عظمت و لذت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے وفور اشتیاق کا سبب تھی، ایک نعمت جب مل جاتی ہے تو اس کے بقار و قیام کا تقاضا ایک طبعی چیز ہے۔



(۴) حَدثنا موسٰی بنُ اِسمٰعیلَ قال اخبرنا ابوعَوانةَ قال حدثنا موسٰی بنُ ابی عائشة قال حَدثنا سعیدُ بن جبیرٍ عن ابن عباسٍ رضی اللّٰہ عنہما فی قولہ تعالٰی لا تحرّک بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُعالج من التنزیلِ شدةً وکان مِمّا یُحرّک شفتیہ فقال ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما فانا اُحرّکھما لَکَ کما کانَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُحرّکھمَا وقالَ سعید انا اُحرّکھما کما رأیتُ ابنَ عباس رضی اللّٰہ عنہما یحرّکھما فحرّکَ شفتیہ فانزل اللّٰہ تعالٰی لاتحرّک بِہٖ لِسانکَ لتعجلَ بہ اِنّ عَلینا جَمْعَہ و قرآنَہ قال جمعَہٗ لکَ صَدرُکَ وتقرأہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ قال فاستمع لہ وانصِت ثُمّ اِنّ عَلَینَا بَیَانَہ ثم انّ علینا ان تقرأہ فکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد ذٰلک اذا آتاہُ جبرئیلُ استمعَ فاذا انطلقَ جبرئیل قرأہ النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کما قرأہٗ ۔

ترجمہ ہم سے بیان کیا موسٰی بن اسماعیل نے کہا ہم سے بیان کیا ابوعوانہ نے کہا ہم سے بیان کیا موسٰی بن ابی عائشہ نے کہا ہم سے بیان کیا سعید بن جبیر نے انہوں نے سُنا ابن عباس رضہ سے ارشادِ باری تعالیٰ لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول قرآن سے سخت مشقت برداشت فرماتے تھے اور یاد کرنے کے لئے، آپ اکثر لبہائے مبارک کو حرکت دیتے تھے، حضرت ابن عباس رضہ نے (سعید بن جبیر سے کہا) کہا میں ہونٹ ہلاکر تجھے بتاتا ہوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلاتے تھے، اور سعید نے (لوگوں سے) کہا میں اپنے ہونٹوں کو ہلاتا ہوں جس طرح میں نے حضرت ابن عباس رضہ کو ہلاتے دیکھا، پھر سعید نے اپنے دونوں ہونٹ ہلائے، حضرت ابن عباس رضہ نے کہا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "لا تحرک الخ اے میرے حبیب وحی کو جلد یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو نہ ہلایا کیجئے، اس وحی کو آپ کے سینے میں جمع و محفوظ کردینا اور اس کو پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، ابن عباس رضہ کہتے ہیں کہ قرآن آپ کے سینے میں جمع کردینا اور جب آپ چاہیں اس کی تلاوت آپ کی زبان سے کرا دینا ہمارا کام ہے، پھر جب ہم اس کو پڑھیں (یعنی ہمارا نمائندہ فرشتہ پڑھے)، تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔ ابن عباس رضہ فرماتے ہیں (اس کا مطلب یہ ہے)، کہ آپ خاموشی کے ساتھ سنتے رہیے، پھر اس کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے یعنی ہمارے ذمہ ہے اس کا آپ سے پڑھوانا (حضرت ابن عباس رضہ فرماتے ہیں کہ) پھر ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب جبرئیل عہ (وحی لیکر) آتے تو آپ (چپکے) سنتے رہتے پھر جبرئیل عہ چلے جاتے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح قرآن پڑھ دیتے جیسے جبرئیل عہ نے پڑھا تھا۔

تعدد الحدیث ہنا فی کتاب الوحی ص۳ و فی التفسیر ص۷۳۴ فی فضائل القرآن ص۷۵۴ فی التوحید ص۱۱۲۲ ۔

بیان رجالہ وہم خمسۃ حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل قال الحافظ ھو ابو سلمۃ التبوذکی وکان من حفاظ المصریین - وقال العلامۃ العینی " الاول ابو سلمۃ موسیٰ بن اسمٰعیل الخ یعنی حضرت ابو سلمہ موسیٰ بن اسماعیل جلیل القدر عظیم الشان محدث ہیں، امام بخاری اور ابوداؤد رحمہم اللہ وغیرہ کے شیخ ہیں، رجب ۲۲۳ھ میں بصرہ کے اندر انتقال ہوا ۔

ابوعوانۃ بفتح العین المہملۃ والنون واسمہ الوضاح بن عبداللہ الیشکری بضم الکاف الخ (عمدہ ص۷۳)

خلاصہ یہ کہ ابوعوانہ بفتح العین کنیت ہے اور کنیت ہی سے مشہور بھی ہیں وضاح بن عبداللہ (بتشدید الضاد) نام ہے، جرجان کی جنگ میں گرفتار ہو کر آئے اور عرصہ تک یزید بن عطار واسطی کے غلام رہے وہ ان سے تجارت کراتے رہے بالآخر آزاد کر دیا - ان کی عظیم خوبی یہ رہی کہ غلامی کی حالت میں بھی علم دین کا شوق ایسا کامل تھا کہ مشکلات کے باوجود علمی جدوجہد میں مشغول رہے، حضرت حسن بصری رح اور ابن سیرین رح کی روایت و زیارت ان کو حاصل ہے، مات سنۃ ست وسبعین ومائۃ وقیل خمس وسبعین (عمدہ ص۷۳)

موسیٰ بن ابی عائشہ ان کا نام موسیٰ ہے اور کنیت ابوالحسن ہے - وابو عائشہ لایعرف اسمہ ۔

سعید بن جبیر (بضم الجیم وفتح البار) امام مجمع علیہ بالجلالۃ والعلو فی العلم والعظم فی العبادۃ قتلہ الحجاج صبرا فی شعبان سنۃ خمس وتسعین ولم یعش الحجاج بعدہ الا ایاما ولم یقتل احدا بعدہ الخ (عمدہ ص۷۳)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رح مشہور تابعی کبار علماء میں سے ہیں آپ کی کنیت ابو محمد اور لقب جہبذ العلماء ہے جس کے معنی پرکھنے والا، دانا کے ہیں، آپ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رض کے جلیل القدر شاگرد ہیں، آپ محدث مفسر اور فقیہ کے ساتھ ساتھ عابد، زاہد اور شب زندہ دار تھے - آپ انچاس ۴۹ برس کی عمر میں شعبان ۹۵ھ میں حجاج کے حکم سے شہید کیے گئے، ابن جبیر رح کی شہادت کے بعد حجاج کے پیٹ میں پھوڑا ہوا اور انتہائی تکلیف اٹھا کر چند دنوں میں مرگیا ۔

ابن عباس رض یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق نصر الباری شرح بخاری کتاب التفسیر ص۱۱۴ دیکھیے - اس روایت میں عن ابن عباس ہے اگرچہ حضرت عباس رض کے متعدد صاحبزادے تھے لیکن یہاں حضرت عبداللہ بن عباس رض مراد ہیں اسلئے کہ قاعدہ ہے المطلق اذا یطلق یراد بہ الفرد الکامل " جب کوئی لفظ مطلق بولا جائے اور کسی خاص معنی کیلئے کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو فرد کامل مراد لیا جاتا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رض اپنے تمام بھائیوں سے اعلیٰ اکمل اور اشہر تھے اس لئے جب بھی احادیث میں ابن عباس ہو تو وہاں عبداللہ بن عمر اور ابن زبیر ہو تو عبداللہ بن زبیر اور ابن مسعود ہو تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم ہی مراد ہوتے ہیں اس لئے کہ یہ سب عبادلہ اپنے بھائیوں سے اعلیٰ و افضل اور اشہر ہیں ۔

تشریح شروع میں جب حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی الہی (قرآن مجید) لے کر آتے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے

پڑھنے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یاد کرنے کے خیال سے وحی کو جلدی جلدی دہرانے کی کوشش فرماتے تھے تاکہ بھول نہ جائیں مگر اس صورت میں آپؐ کو سخت مشقت ہوتی، ایک تو خود وحی الٰہی کی مشقت، دوم یاد کرنے اور زبان مبارک کے ہلانے کی مشقت، سوم معانی پر غور کرنے کی مشقت، یہ متعدد مشقتیں ہوگئیں جو پیش آتی تھیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لاتحرک بہ لسانک الخ یعنی آپ اس وقت پڑھنے اور زبان ہلانے کی کوشش نہ کریں بلکہ آپ ہمہ تن متوجہ ہوکر سنئے یہ قرآن ہمارا کلام ہے جس غرض سے ہم اسے نازل کر رہے ہیں اس کا پورا کرنا ہمارے ذمہ ہے اسلئے نازل ہونے والی وحی کو اطمینان وسکون سے سنئے اس کو یاد کرنیکی فکر آپ نہ کیجئے۔

یعالج من التنزیل شدۃ۔ شدۃ مفعول ہے یعالج کا۔ یعالج معالجہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کرنے کیلئے مشقت اٹھانا، اس صورت میں شدۃ کا لفظ تاکید کیلئے ہوگا یعنی حضورؐ وحی کے نزول سے سخت مشقت برداشت فرماتے تھے وکان مما یحرک شفتیہ مما بمعنی ربما ہے، ای کثیرا ما یحرک آپ اکثر لبہائے مبارک ہلایا کرتے تھے۔

اشکال یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ تمام حروف توشفوی نہیں ہیں بلکہ اکثر حروف ایسے ہیں کہ ان کی ادائیگی کے وقت تحریک شفتین کی ضرورت نہیں پڑتی نیز تجربہ یہ ہے کہ قرات کے وقت زبان اور ہونٹ دونوں متحرک ہوتے ہیں پھر روایت میں صرف تحریک شفتین ہی کا ذکر کیوں ہے؟ اور آیت کریمہ میں صرف لسان کا ذکر کیوں؟

جواب ۱ یہ ہے کہ شفتین کا ذکر علی سبیل الاکتفاء۔ باب اکتفاء میں امور متعددہ میں سے کسی ایک کو ذکر کرکے دوسری چیزوں کو حذف کردیتے ہیں جیساکہ ارشاد الٰہی ہے سرابیل تقیکم الحر (سورۂ نمل) اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ کرتے صرف گرمی سے محفوظ رکھتے ہیں اور سردی سے حفاظت نہیں کرتے بلکہ مراد میں سردی بھی داخل ہے اسی طرح ارشاد فرمایا گیا رب المشارق حالانکہ وہ رب المغارب بھی ہے اسی طرح یہاں روایت میں بھی شفتیہ کے ذکر پر اکتفاء ہے اور لسانہ کو حذف کردیا گیا۔ (عمدہ)

۲: یہاں بدء الوحی میں اختصار ہے یہ روایت بخاری شریف کتاب التفسیر میں متعدد طرق سے منقول ہے اور بدء وحی میں بھی ہے اور اس کے الفاظ میں بھی اختلاف ہے، اور یہ روایتیں بن ابی عائشہ عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کی سند سے مروی ہیں البتہ نیچے کے راوی مختلف ہیں۔

ابوعوانہ (کما فی بدء الوحی حدیث ۴) اور اسرائیل (کما فی التفسیر حدیث ۴۵۱) نے تو شفتین کے ذکر پر اکتفاء کیا۔ اور سفیان کی روایت (کما فی التفسیر حدیث ۴۵۰) میں صرف لسان مذکور ہے۔ اور جریر کی روایت (کما فی التفسیر حدیث ۴۵۲) میں وکان مما یحرک بہ لسانہ وشفتیہ یعنی لسان اور شفتین دونوں مذکور ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب یہ تمام روایتیں حضرت ابن عباس رضی سے مروی ہیں اور تمام روایتوں میں صحابی کے شاگرد اور شاگرد کے شاگرد بھی ایک ہی ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل روایت میں لسان وشفتین دونوں مذکور ہیں اور جس روایت میں ایک مذکور ہے وہ مختصر ہے۔ اصل جواب تو یہی ہے اور یہ کافی وشافی ہے اسلئے اب روایت میں کوئی اشکال

نہیں۔

یہ جواب دراصل جواب ۱ ہی ہے صرف فرق یہ ہے کہ دوسرا جواب مفصل ومدلل ہے۔

او المراد یحرک فمہ المشتمل علی الشفتین واللسان (فتح ص ۲۳) یعنی تمام روایتوں کے مجموعہ سے مقصد یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دہان مبارک کو حرکت دیتے تھے جو لسان وشفتین پر مشتمل ہے۔

۱ فقال ابن عباس رض فانا احرکھما ابن عباس رضؓ نے کہا کہ میں تمہیں اسی طرح ہونٹ ہلاکر دکھلاتا ہوں جسطرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلایا کرتے تھے۔

اشکال یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ تحریک شفتین کا واقعہ بالکل ابتدار وحی کا ہے اور ابن عباس رضؓ ہجرت سے صرف تین سال قبل پیدا ہوئے تو آپ رضؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک شفتین کیسے دیکھی؟

جواب ۱ کسی دوسرے صحابی سے دیکھی ہوگی جس کا واسطہ چھوڑ دیا، تو یہ روایت مرسل ہوگی اور مراسیل صحابہ بالاتفاق حجت ہیں، لان الصحابۃ کلھم عدول۔

۲۔ علامہ قسطلانی رح فرماتے ہیں کہ مسند ابو داؤد طیالسی میں حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت بھی مصرح ہے ولفظہ قال ابن عباس فانا احرک لک شفتیّ کما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحرکھما۔ (قس ص ۱۱)

اس روایت کی طرف حافظ عسقلانی رح نے بھی اشارہ کیا ہے (فتح ص ۲۵)

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے کسی وقت آنحضور صلعم سے سورۂ قیامہ کی ان آیات کی تفسیر سنی، اور آپ صلعم نے تحریک شفتین کرکے بتلایا، ابن عباس رضؓ نے سعید بن جبیر سے یہ روایت بیان کرتے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور اسی طرح سعید بن جبیر نے جب یہ روایت موسیٰ بن ابی عائشہ سے بیان کی تو حضرت سعید نے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی، اسی وجہ سے اس حدیث کا نام مسلسل بتحریک الشفتین پڑ گیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معلّم کو چاہیئے کہ بوقتِ ضرورت قول کے ساتھ ساتھ متعلم کے سامنے مضمون کی کیفیت بھی اپنے طرز ادا سے بیان کردے تاکہ اوقع فی النفس ہوجائے، کما قالہ النووی رح۔

پس اس صورت میں حدیث کا مرفوع ہونا ثابت ہوگیا اب یہ روایت مرسل نہ ہوگی۔

فانزل اللہ تعالیٰ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ اس آیت کا تعلق مما یحرک شفتیہ سے ہے اور فقال ابن عباس سے فحرک شفتیہ تک جملہ معترضہ ہے۔ اس آیت میں بہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اگرچہ اس سے قبل قرآن کا لفظ مذکور نہیں لیکن سیاق آیت اس بات پر دلالت کرتا ہے اس لئے اضمار قبل الذکر کا اعتراض وارد نہیں ہوگا جس طرح انا انزلنا ہ فی لیلۃ القدر میں ہے۔

ان علینا جمعہ وقرآنہ ای قرارتہ فہو مصدر مضاف للمفعول والفاعل محذوف والاصل وقرائتک

اياه (نس)۔ یعنی اس آیت میں قرآن مصدر ہے (یعنی کتاب اللہ کا علم نہیں ہے) اور مضاف الی المفعول ہے اور فاعل اس کا محذوف ہے، اصل عبارت ہو گی قرائتک ایاہ۔ قال جمعه لك صدرك یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہے اس کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں، اکثر روایات میں میم اور عین کے فتحہ یعنی بصیغہ ماضی ہے اور صدرک کی را ر فاعل ہونیکی وجہ سے مرفوع ہے اس صورت میں ترجمہ ہوگا" آپ کے سینہ کا آپ کیلئے قرآن کو جمع کرنا" درحقیقت آپ کے مبارک سینے میں جمع کرنے والے باری تعالیٰ ہیں لیکن صدر کی جانب جمع کی نسبت مجازی ہے جیسے کسی مسلمان کا قول انبت الربیع البقل، تو اس کی مراد ہوتی ہے انبت اللہ فی الربیع البقل۔ اور لام تعلیل کے لیے یا تبیین کے لیے ہے۔

دوسرا نسخہ ہے جمعه لك صدرك میم ساکن اور عین مرفوع ہے اور جمع کا لفظ مصدر ہے، صدرک کی را رحسب سابق مرفوع ہے فاعلیت کی بنا پر۔ اور تیسرا نسخہ ہے جیم مفتوح میم ساکن اور لفظ فی زیادہ ہے یعنی فی صدرك علامہ قسطلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وھو یوضح الاول (ارشاد الساری ص۱۱۸)

وتقرءه حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے قرآنہ کی تفسیر تقرءہ سے کی یعنی آپ کو پڑھوا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

فاذا قرأناه یعنی جب ہم پڑھنے لگیں۔ اس جملہ میں حق تعالیٰ نے قرأت کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ اصل موحی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور جبرئیل علیہ السلام حق تعالیٰ کی طرف سے مبلغ ہیں۔ فاتبع قرآنه قرآن بمعنی قرأت ہے یعنی آپ اس قرأت کی اتباع کیجیے۔

اتباع کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جیسے متبوع کرے ویسے ہی تابع بھی کرے
اتباع کی دوسری صورت یہ ہے کہ خاموشی سے سننا۔ یہاں پہلے معنی مراد نہیں ہو سکتے یعنی جب ہم پڑھیں تو ہمارے ساتھ آپ بھی پڑھا کیجیے، یہ مراد نہیں کیونکہ اس سے تو روکا جا رہا ہے، پس اتباع کی دوسری صورت متعین ہو گی، اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں فاستمع له وانصت یعنی آپ خاموشی کے ساتھ سنتے رہیے۔ یہ تفسیر فاتحہ خلف الامام کے عدم جواز پر دلیل قاطع ہے۔

ایک حدیث میں ہے انما جعل الامام لیؤتم به" حافظ رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں، لیتبع " اور اتباع قرآن کے معنی یہ ہیں کہ خاموشی سے سنو جیسا کہ اوپر فاتبع قرآنه اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر فاستمع له وانصت سے ثابت کیا گیا ہے۔ پس اگر اس حدیث انما جعل الامام لیؤتم به" کے آخر میں واذا قرء فانصتوا کی زیادتی نہ بھی تسلیم کی جائے تو بھی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فاتحہ خلف الامام جائز نہیں۔

ثم ان علینا بیانه حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں ثم ان علینا ان تقرءه" حالانکہ بعینہ یہی تفسیر اوپر قرآنه کی گذر چکی ہے۔

اشکال یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب قرآنہ اور بیانہ کی تفسیر ایک ہی ہے تو درمیان میں لفظ ثمّ

کیوں ہے؟ پھر تکرار سے کیا فائدہ؟

جواب ۱: بعض نے کہا کسی راوی سے سہو ہو گیا ہے کہ اس نے قرآنہ کی تفسیر کو بیانہ کی تفسیر میں رکھ دیا کیونکہ ان تقرءہ قرآنہ کی تفسیر ہے بیانہ کی نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہی روایت بخاری شریف کتاب التفسیر ص ۷۳۴ سنداً و متناً مذکور ہے اس میں بیانہ کی تفسیر ان تبینہ ،،

۲: پہلے تقرءہ یعنی قرآنہ کے تحت مذکور ان تقرءہ میں قرأت لنفسہ مراد ہے اور دوسرے سے یعنی بیانہ کے تحت ان تقرءہ سے مراد قرأت علی الناس ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے تین اشیاء کا ذمہ لیا ہے آپ کے سینہ میں جمع کرنا، زبان سے پڑھانا، لوگوں پر بیان کرنا۔

آیت کریمہ لاتحرک بہ لسانک الخ کا ماقبل و مابعد سے ربط

یہ آیت سورۂ قیامہ کی ہے اس سورت کو سورۂ قیامہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی ابتداء ہی لا اُقسم بیوم القیامۃ سے کی گئی ہے۔ اس آیت سے قبل اور بعد قیامت کا تذکرہ ہے مگر بظاہر اس آیت کا ماقبل و مابعد سے کوئی ربط و تعلق معلوم نہیں ہوتا، ربط کے لحاظ سے یہ مقام اصعب المقامات شمار ہوتا ہے کیونکہ ان کا شان نزول جو ابن عباس رضؓ نے بیان کیا ہے جو صحیح روایت ہے اس کے اعتبار سے ماقبل و مابعد سے بظاہر کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا، اسی بناء پر شیعہ اسے تحریف قرآن پر بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کلام اللہ کی آیات کا ربط انسان کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ جس طرح قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا صحیفہ قولی ہے اسی طرح یہ پورا عالم صحیفہ فعلی ہے کما قال الشیخ فرید الدین عطار رح ؎

آں خداوندے کہ ہستی ذاتِ اوست ؞ ہر دو عالم مصحف آیات اوست

صحیفہ فعلی کی ترتیب انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے مثلاً یہ کہ رفعت عظمت سے پہلے کیوں پیدا ہوا؟ شرف الدین ابو محمد سے پہلے کیوں مرا؟ وغیرہ۔ پس صحیفہ قولی کی ترتیب و ربط اگر سمجھ میں نہ آئے تو اس میں کیا بعد ہے؟ معہذا اس مقام پر مفسرین رح ربط کی بہت سی وجوہ بیان فرمائی ہیں جن میں سے چند ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) امام رازی رح فرماتے ہیں کہ یہاں ربط کی ضرورت ہی نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی استاد کسی مضمون کا افادہ کرتے وقت کسی شاگرد کو کسی کام میں مشغول دیکھے یا کوئی مقرر اثناء تقریر میں کسی کی کوئی نامناسب چیز دیکھے تو اپنے مضمون کو قطع کر کے اس کو تنبیہ کرتا ہے پھر اپنا مضمون شروع کر دیتا ہے اس تنبیہ کا اصل تقریر کے ماقبل و مابعد سے تعلق و ربط ضروری نہیں ہے۔ یہ منظر حضرات مدرسین و طلبہ کے سامنے آتا ہی رہتا ہے، بالکل اسی طرح یہاں ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حرکت شفتین کرتے دیکھا گیا کہ آپ کو مشقت ہو رہی ہے، یاد کرنے کی زحمت کے ساتھ ساتھ مضمون کو سمجھنے کی فکر۔

اس لئے بطور محبۃ معترضہ پیار و شفقت کے ساتھ ارشادِ ربّانی ہوتا ہے کہ اے محبوب آپ ایسا نہ کریں، یاد کرانے

اور مضمون کو سمجھنے سمجھانے کی ذمہ داری تو ہم پر ہے آپ کا کام صرف خاموشی کے ساتھ سُننا ہے، اب لبہائے مبارک کو حرکت دینا خواہ یاد کرنے کی غرض سے ہو یا لذت کلام کی وجہ سے، بہر حال درمیان میں تحریک شفتین سے منع فرمادیا گیا، پھر وہی سابقہ مضمون شروع کر دیا گیا۔

(۲) حافظ ابن کثیر رح فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندوں کیلئے دو کتابیں مقرر ہیں ایک کتاب الاحکام جس میں وہ احکام و قوانین مذکور ہیں جن کا بندوں کو مکلّف بنایا گیا ہے یعنی قرآن مجید۔

دوسری کتاب الاعمال جس میں انسان کے کئے ہوئے بھلے بُرے سب اعمال لکھے جاتے ہیں جن پر حساب کا مدار ہے یعنی نامۂ اعمال۔ ان دونوں کتابوں کا آپس میں تعلق ہے کیونکہ کتاب الاعمال کتاب الاحکام ہی کی وجہ سے ہے اگر کتاب الاحکام نہ ہوتی تو نہ حساب ہوتا نہ کتاب، تو چونکہ کتاب الاعمال کتاب الاحکام ہی پر مرتب ہوتی ہے اس لئے عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ جہاں ایک کتاب کا ذکر فرماتے ہیں وہاں دوسری کا ذکر بھی لے آتے ہیں، چنانچہ سورۂ کہف میں آیت ۴۹ ہے:۔

ووُضِع الکتٰب فتری المجرمین مشفقین مما فیه ويقولون يٰويلتنا مالِ هٰذا الکتٰب لایُغادِرُ صغيرة ولا كبيرة إلّا أحصٰها ووجدوا ما عملوا حاضرا۔ الآیۃ

اور کتاب (یعنی نامۂ اعمال) سامنے رکھدیا جائیگا تو آپ مجرموں کو دیکھینگے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہوگا اس کے مضمون کو دیکھکر ڈرتے ہوئے کہینگے ہائے ہماری کمبختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب موجود پائینگے۔ الخ

اس آیت میں کتاب الاعمال (نامۂ اعمال) کا ذکر ہے، اس کے بعد آدم علیہ السلام کا قصہ مناسبت سے ذکر کیا اس کے بعد فرمایا:۔

ولقد صرّفنا فی هٰذا القرآن للناس من كلّ مثل وكان الانسان اكثر شيئ جدلا۔ (الکہف آیت ۵۴)

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں مگر انسان بہت ہی جھگڑالو ہے۔

اس آیت میں کتاب الاحکام یعنی قرآن حکیم کا ذکر ہے، تو یہاں دونوں کتابوں کا ذکر فرمایا کیونکہ دونوں میں مناسبت ہے اسلیے کہ کتاب الاعمال کا ترتب اسی کتاب الاحکام (قرآن) پر ہے۔ اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں ہے:۔

يوم ينفخ فی الصّور ونحشر المجرمين يومئذٍ زُرقا۔

اس دن جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں جمع کریں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہوں گی۔

اب یہاں اعمال کے سلسلہ میں مجرموں کے تذکرہ کے بعد اہلِ ایمان اور ان کے اعمال کا تذکرہ ہے:۔

وَمَن يَّعمل مِنَ الصّٰلحٰتِ وَهُوَ مُؤمِنٌ فَلا يَخَافُ ظُلمًا وَّلا هَضمًا (طٰہٰ آیت ۱۱۲)

جو نیک کام کرے اور ایمان بھی رکھتا ہو تو اسے نہ بے انصافی کا اندیشہ ہوگا اور نہ نقصان پہنچنے کا۔

یعنی نہ اسکی کوئی نیکی ضائع ہوگی، نہ ناکردہ گناہ میں پکڑا جائے گا نہ اسکے ثواب میں کوئی کمی ہوگی۔

یہانتک تو کتاب الاعمال کا بیان ہے اس کے بعد کتاب الاحکام کا ذکر ہے۔

وکذلک انزلنہ قرآنا عربیا وصرفنا فیہ من الوعید لعلھم یتقون او یحدث لھم ذکرا۔ فتعلی اللہ الملک الحق ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ وقل رب زدنی علما۔

اور ہم نے اسی طرح اسکو عربی قرآن کرکے نازل کیا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ وہ لوگ ڈر جائیں یا یہ قرآن ان کیلئے کسی قدر سمجھ پیدا کردے سو اللہ تعالیٰ جو بادشاہ حقیقی ہے بڑا عالیشان ہے اور قرآن میں قبل اسکے کہ آپ پر اسکی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیا کیجیے، اور آپ یہ دعا کیجیے، اے میرے رب میرا علم بڑھا دے۔

الغرض جس طرح ان آیات اور ان جیسی دوسری آیات میں کتاب الاعمال کے ساتھ ساتھ کتاب الاحکام کا ذکر ہے اسی طرح یہاں سورۂ قیامہ میں بھی ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم واخر میں کتاب الاعمال کا ذکر تھا یعنی اس روز انسان کو سب اگلے پچھلے نیک کام ہوں یا بد جتلا دیے جائینگے۔

ینبؤ کی صورت یہی ہوگی کہ نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:۔

ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا۔ اقرأ کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔ (بنی اسرائیل)

اور قیامت کے دن اسکا اعمالنامہ اسکے واسطے سامنے نکالکر رکھ دینگے جسے وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا، اپنا اعمالنامہ پڑھ لے آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

اسی اسلوب کے تحت سورۂ قیامہ میں بھی ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم واخر میں کتاب الاعمال کا بیان تھا اسلیے لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ الخ میں کتاب الاحکام کا ذکر آیا۔

(۳) حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رح فرماتے ہیں کہ پہلے سے ذکر آرہا ہے:۔

ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم واخر، اس روز انسان کو اسکا اگلا پچھلا کیا ہوا سب جتلا دیا جائے گا۔ ماقدم وہ چیزیں جو مؤخر کرنے کی تھیں اور ان کو مقدم کردیا جیسے وقت سے پہلے نماز پڑھنا، عشاء سے پہلے وتر پڑھنا، عدت گذرنے سے پہلے نکاح کرنا، اور ما اخر سے مراد وہ چیزیں ہیں جو پہلے کرنے کی تھیں ان کو مؤخر کردیا جیسے وقت گذر جانے کے بعد نماز پڑھنا، سجدہ کے بعد رکوع کرنا۔ حاصل یہ ہے کہ جس چیز کی تاخیر ضروری تھی اسکی تقدیم ممنوع اور قابل مواخذہ ہے، اسی طرح جس چیز کی تقدیم ضروری ہے اس کی تاخیر بھی قابل مواخذہ ہے، اگرچہ تقدیم و تاخیر اچھے کاموں ہی میں ہو لیکن شریعت کی مقرر کردہ ترتیب کے خلاف ہونے پر مواخذہ ہوگا، مثلاً قیام کے بجائے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنا، رکوع سے پہلے سجدہ کرنا۔

اسی طرح قرآن مجید کا سننا بھی عبادت، پڑھنا اور یاد کرنا بھی سب عبادت ہے لیکن شریعت مطہرہ نے ان امور میں بھی ترتیب مقرر فرما دی ہے مثلاً جبرئیل عا کی قرأت کے ساتھ پڑھنا بھی تقدیم ماحقہ التاخیر تھا کیونکہ قرأت قرآن کی اتباع استماع و انصات میں ہے، پس جبرئیل عا کے ساتھ پڑھنا وہ چیز ہے جس کی تاخیر

واجب تھی مگر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم اس کو مقدم کرتے تھے تو فرمایا لاتحرک بہ لسانک الخ یعنی ہر چیز میں تقدیم و تاخیر کا خیال ناگزیر ہے۔ پس آیت کریمہ لاتحرک بہ کا ربط ما قبل و ما بعد سے ثابت و ظاہر ہے۔

مطابقۃ الحدیث للترجمہ اس حدیث کا ابتداء وحی کے ساتھ یہ ربط ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آیت "لاتحرک بہ" الخ کے نزول سے قبل آپ کا معمول یہ تھا کہ وحی نازل ہونے کے وقت جبرئیل امین کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے اس سے ظاہر ہے کہ ابتداء وحی کے وقت بھی آپ کا یہی عمل ہوگا، گویا غار حرا والی روایت میں بدء مکانی کا تذکرہ تھا اور اس روایت میں بدء باعتبار صفات موحیٰ الیہ کے ہے۔

اور دوسرا مقصد ترجمۃ الباب سے وحی کی عظمت و عصمت ثابت کرنا تھا تاکہ ذہن نشین ہوجائے کہ دین کے معاملہ میں سب سے باوثوق و قابل اعتماد وحی ہے اس لئے کہ اگر وحی الٰہی کا ذمہ دار کسی انسان کو بنایا جاتا تو نسیان اور غلطی کا احتمال تھا وحی کے حفظ و قرأت، توضیح مشکلات، معانی اور مطالب کی ذمہ داری رب العالمین نے لے لی ہے اسی ذمہ داری سے وحی کی عظمت و عصمت ثابت ہے، رب العالمین کی ذمہ داری سے جلالت وحی اور اس کی عظمت شان ظاہر ہے، پھر یہ بھی بدیہی ہے کہ جس کے محافظ خود رب العالمین ہوں وہ ہر قسم کے تغیر و تبدل، کمی و زیادتی سے محفوظ ہوگی، لہٰذا عظمت وحی بھی ثابت ہے۔

---

۵ حدثنا عبدان قال اخبرنا عبد اللہ قال اخبرنا یونس عن الزہری ح وحدثنا بشر بن محمد قال حدثنا عبد اللہ قال اخبرنا یونس ومعمر نحوہ عن الزہری اخبرنی عبید اللہ بن عبد اللہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس وکان اجود ما یکون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القرآن فلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلۃ۔

ترجمہ عبدان نے ہم سے بیان کیا کہ ہم کو عبد اللہ بن مبارک نے خبر دی کہا ہم کو خبر دی یونس نے انہوں نے زہری سے ح (یعنی دوسری سند) اور ہم سے بشر بن محمد نے بیان کیا، کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ بن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس نے اور معمر نے یونس کے مانند زہری سے، زہری نے کہا مجھکو عبید اللہ بن عبد اللہ نے خبر دی انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رض سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں جب جبرئیل ع آپ سے ملاقات کرتے تو (دوسرے اوقات کے مقابلہ میں) آپ ص کی سخاوت نقطۂ عروج پر پہونچ جاتی تھی اور جبرئیل ع رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملاقات کرتے اور آپ ص کے ساتھ قرآن مجید کا دَور کرتے تھے، الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی نفع رسانی میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی تھے۔

تعدد الحدیث یہ حدیث امام بخاری شریف میں پانچ جگہ لایا ہے ص۳، ص۲۵۵، ص۲۵۷ ...

ج ۲ ص ۵۰۲، ج ۵ ص ۴۴۸ واخرجہ مسلم ایضا۔

بیان رجالہ

وہم ثمانیۃ عبدان (بفتح العین المھملۃ وسکون البار الموحدہ) لقب ہے ان کا نام عبداللہ بن عثمان اور کنیت ابوعبدالرحمان ہے۔ حافظ ابن طاہر فرماتے ہیں کہ ان کا نام عبداللہ بن عثمان اور کنیت ابوعبدالرحمان ہے تو نام اور کنیت سے دو عبد جمع ہو گئے اس لئے ان کو عبدان کہا گیا۔ بہرحال اصل میں تثنیہ تھا پھر علم ہو گیا اور اسی نام سے مشہور ہو گئے، امام مالکؒ اور حماد بن زید رح سے شرف تلمذ حاصل ہے امام بخاری اور امام ذہلی جیسے ائمہ حدیث ان کے شاگرد ہیں، بخاری شریف میں ان سے ایک سو دس حدیثیں مروی ہیں، چھہتر برس کی عمر میں ۲۲۱ھ میں وفات ہوئی۔

اخبرنا عبداللہ ھو ابن المبارک بن واضح الحنظلی التیمی الخ حضرت عبداللہ بن مبارک رح کی جلالت شان اور امامت پر اتفاق ہے علامہ عینی رح فرماتے ہیں الامام المتفق علیہ علی جلالتہ وامامتہ وورعہ وسخائہ وعبادتہ، الثقۃ الحجۃ الثبت (عمدہ) یہ تبع تابعی ہیں محدثین کبار ان کو امیرالمؤمنین فی الحدیث کے لقب سے پکارتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رح اکثر اوقات خلوت میں رہتے کسی نے کہا آپ کو وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا وحشت کیسی جبکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا ہوں یعنی حدیث میں مشغول رہتا ہوں۔

اسی لئے، علماء نے لکھا ہے کہ وہ خصال خیر کے مجموعہ تھے، اسماعیل بن عیاش کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں روئے زمین پر ابن مبارک جیسا کوئی نہیں تھا میرے علم میں جتنے خصال خیر ہیں قدرت نے ان کے اندر جمع کر دی ہے۔

(جامع الدراری بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶)

عبدالرحمان بن مہدی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک صراف حدیث تھے (موفق ج ۲ ص ۴۵)

امام بخاری رح نے بھی رسالہ رفع یدین میں کہا کہ ابن مبارک اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ولادت ۱۱۸ھ ایک غزوہ سے واپسی کے وقت مقام ہیت میں وفات ہوئی تریسٹھ برس کی عمر میں۔ مقام ہیت ہا کے کسرہ کے ساتھ عراق میں فرات کے کنارے ایک شہر کا نام تھا۔

اخبرنا یونس ھو یونس بن یزید بن مشکان بن ابی النجاد بکسر النون الایلی بفتح الھمزہ وسکون الیار الخ (عمدہ ج ۱ ص ۶۵) یونس بن یزید تابعی ہیں ۱۵۹ھ میں مصر میں وفات ہوئی، وفی یونس ستۃ اوجہ ضم النون وکسرہا وفتحہا مع الھمزۃ ودونہا والضم بلا ہمزہ افصح (عمدہ)

عن الزھری امام زہری رح کا حال مقدمہ میں گذر چکا۔

ح وحدثنا بشر بن محمد اس روایت کی سند میں ح واقع ہوئی ہے اس لئے اس کے بعد واو تحویل لایا گیا ہے اس کی تفصیل ابھی آرہی ہے۔

بشر بکسر البار الموحدہ والشین المعجمۃ الساکنۃ ابن محمد ابومحمد المروزی السختیانی روی عنہ البخاری منفردا بہ عن باقی

الکتب الستۃ ہنا وفی التوحید وفی الصلوٰۃ وغیرہا ذکرہ ابن حبان فی ثقاتہ وقال کان مرجئا مات سنۃ اربع وعشرین ومائتین۔ (عمدہ)

خلاصہ یہ ہے کہ بخاری شریف کے علاوہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں بشر بن محمد کی کوئی روایت نہیں البتہ امام بخاری رح نے اس جگہ اور کتاب الصلوٰۃ وغیرہ میں ان سے روایت لی ہے۔

قال حدثنا عبد اللہ ہو عبد اللہ بن المبارک امیر المؤمنین فی الحدیث مر بیانہ آنفا۔

اخبرنا یونس ومعمر نحوہ ای نحو یونس۔ یونس کا حال گزر چکا۔ معمر بفتح المیمین وسکون العین ہو معمر بن راشد۔ صحیحین میں معمر بن راشد صرف یہی ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا راوی معمر بن راشد نہیں ہے بلکہ صحیحین میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا راوی معمر نامی بھی نہیں، البتہ بخاری میں ایک راوی معمر بن یحیی بن سام ضبی ہیں مگر بعضوں نے کہا کہ وہ میم کی تشدید کے ساتھ ہیں، امام بخاری رح نے ان سے ایک روایت کتاب الغسل میں لی ہے۔

اور صحابہ میں معمر تیرہ ہیں پھر صحیحین کے علاوہ کتب اربعہ میں معمر نام کے چھ آدمی ہیں (عمدۃ القاری ص۶۹ ج۱) وفات اٹھاون برس کی عمر میں ۱۵۴ھ (تقریب)

حا تحویل اور اسکا مقصد

اس سلسلے میں احقر نے نصر الباری شرح بخاری کتاب المغازی ص۲۲ میں بیان کر دیا ہے لیکن چونکہ یہ نصر الباری کی پہلی جلد ہے اور یہ سب سے پہلا موقع ہے جہاں امام بخاری رح نے تحویل کی ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ پوری تفصیل جامع الدراری شرح بخاری سے نقل کر دوں جو حضرت مولانا عبد الجبار صاحب اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ سابق شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد خلیفہ دمجاز قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تالیف ہے اور یہ دراصل امداد الباری شرح بخاری کی تلخیص ہے۔

فائدہ

اس روایت میں ہے ح وحدثنا بشر اس واو کو واو تحویل کہا جاتا ہے یعنی ایک سند سے دوسری سند کی جانب منتقل ہونے کی علامت ہے عموماً اس کو بصورت ح مہملہ مفردہ لکھا جاتا ہے اور بعض نسخوں میں یہاں بھی اسی طرح ہے۔ علامہ نووی رح فرماتے ہیں کہ اس قسم کی ح صحیح مسلم میں بہت اور بخاری میں کم ہے پھر یہ پہلا موقع ہے جہاں امام بخاری نے تحویل کی صورت اختیار کی ہے قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی حدیث کی دو یا دو سے زیادہ سندیں ہوں تو ہر ایک سند کو مکمل لانے میں طول ہو جانا ظاہر ہے اسلئے محدثین کرام طوالت سے بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ اولاً ایک سند کو مدار سند یعنی مشترک شیخ تک پہنچا کر لوٹ آتے ہیں، پھر دوسری اور تیسری سند اسی شیخ تک پہنچاتے ہیں اور دونوں سندوں کے درمیان فصل کیلئے ح لے آتے ہیں تاکہ دیکھنے والوں کو متعدد سندوں پر ایک ہی سند کا گمان یا اشتباہ نہ ہو مثلاً روایت مذکورہ میں زہری پر مدار سند ہے اور زہری دونوں سندوں میں مشترک ہیں لہٰذا پہلے کہا حدثنا عبدان قال اخبرنا عبد اللہ قال اخبرنا یونس عن الزہری ح اس کے بعد پھر ابتداء دوسری سند کی ہوتی ہے وحدثنا بشر بن محمد قال اخبرنا عبد اللہ قال اخبرنا یونس

ومعمر نحوہ عن الزہری "زہری دونوں میں مشترک ہیں اس کے بعد اخبرنی عبید اللہ سے آخر تک دونوں روایتوں میں ہے۔

تحویل کی ۲ دو قسم ہیں اول یہ ہے کہ دونوں سندیں ابتدا میں علیحدہ علیحدہ ہوں اور آخر میں متحد ہوں جیسا کہ موجودہ روایت میں ہے اور اکثر تحویل کی یہی صورت ہوتی ہے۔

کبھی دونوں سند ابتدار میں ایک ہوتی ہے آخر میں مغایر جیسا کہ اس باب کی تیسری حدیث یحییٰ بن بکیر والی روایت میں ابتدار سند ایک ہی ہے اور آخر میں علیحدہ علیحدہ ہیں جیسا کہ قال ابن شہاب کی شرح میں گزر چکا لیکن اس قسم کے تحویل بہت کم ہوتی ہے (فیض الباری ج ۱ ص ۳۶)

فائدہ حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ تحویل کی صورت میں الفاظ متن آخری سند کے ہوتے ہیں اور شیخ عمرو بن الصلاح علامہ نووی کے شیخ فرماتے ہیں کہ متن یا تو آخری سند کا ہوتا ہے یا سند عالی کا۔ ان دونوں اقوال میں تطبیق یوں دیگئی ہے کہ امام بخاری رح کی علی العموم یہ عادت ہے کہ متن آخری سند کا ہوتا ہے کبھی اسکے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔ اور عام محدثین کا دستور وہی ہے جو ابن الصلاح نے ذکر کیا ہے (فیض الباری ص ۳۶)

فائدہ ح کے متعلق چھ ۶ اقوال ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ یہ خار معجمہ ہے یا حار مہملہ؟ جو لوگ خار معجمہ قرار دیتے ہیں ان میں بھی ۲ دو قول ہیں ایک تو یہ ہے کہ مخفف ہے الخ کا یعنی الی آخرہ، جب کسی طویل آیت یا حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے تو اس کا ابتدائی حصہ لکھکر الآیۃ یا الحدیث یا الخ لکھدیتے ہیں اور مقصد ہوتا ہے الی آخر الآیۃ یا الی آخر الحدیث یا الی آخر الکلام گویا الخ مخفف ہے الی آخرہ کا اور خ مخفف ہے الخ کا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مخفف ہے اسناد آخر کا لیکن علامہ قسطلانی رح نے اس کو وہم قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ وزعم بعضهم انها معجمة فوهم (ارشاد الساری ص ۵۹) بہر کیف بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ خار معجمہ ہے پھر ان میں بھی دو قول ہیں لیکن جماعت کثیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حار مہملہ ہے یعنی بغیر نقطہ کی حار ہے پھر اس جماعت میں بھی چار فریق ہیں۔

اول:۔ مغاربہ کہتے ہیں کہ یہ الحدیث کا مخفف ہے لہذا یہاں پہونچکر الحدیث پڑھنا چاہیے۔

ثانی:۔ ابو مسلم لیثی ابو سعید خلیلی کہتے ہیں کہ صح کا مخفف ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب کبھی تحریر میں کسی جگہ تردد دشبہ کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس جگہ چھوٹا سا صح بنا دیتے ہیں جو صحت کی علامت ہوتی ہے اس میں اشارہ ہوتا ہے کہ یہ عبارت بالکل صحیح ہے اس میں کسی قسم کا شک و تردد نہ کرو مگر اس سے صرف تنبیہ مقصود ہے اس لیے اسکو پڑھا نہیں جاتا چونکہ اس مقام پر بھی اشتباہ ہو سکتا تھا کہ شاید پہلی سند کا متن ساقط ہو گیا اس لیے ح لکھا گیا ہے جس میں رمز و اشارہ ہے صح کی جانب۔ بعض حفاظ اس کی جگہ صح لکھتے ہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ح صح کا مخفف ہے۔ علامہ سیوطی رح تدریب میں فرماتے ہیں وحسن اثبات صح لئلا یتوهم ان حدیث هذا الاسناد

سقط ولئلا یرکب الاسناد الثانی علی الاسناد الاول فیجعلا اسنادا واحدا۔

ثالث :- یہ کہ یہ حاء حائل ہے، دو سندوں کے درمیان حائل ہوتا ہے، اصل روایت میں نہیں صرف علامت حیلولۃ ہے اس لئے اسکو پڑھا نہیں جائے گا۔ کما فی التدریب۔

اور ارشاد الساری میں ہے کہ عبد القادر رہاوی اور دمیاطی دونوں کہتے ہیں کہ یہ حاء حائل ہے لیکن عبد القادر کے نزدیک یہاں کچھ نہیں پڑھا جائے گا اور دمیاطی کے نزدیک حاء پڑھا جائے گا

رابع :- یہ کہ جمہور کے نزدیک یہ حاء تحویل ہے یعنی تحویل سے ماخوذ ہے یہاں پہونچکر حاء پڑھا جائے گا۔

وقال النووی فی مقدمۃ شرح مسلم اذا کان للحدیث اسنادان او اکثر کتبوا عند الانتقال من اسناد الی اسناد ح وھی حاء مفردۃ والمختار انہ ماخوذ من التحویل لتحولہ من اسناد الی اسناد وانہ یقول القاری اذا انتہی الیہ حاء ویستمر فی قراءۃ ما بعدھا الخ۔

ومعمر نحوہ امام بخاری رح نے اس حدیث کو اپنے دو استادوں سے نقل کیا ہے یعنی عبدان اور بشر سے اور عبدان اور بشر دونوں نے عبد اللہ بن مبارک سے روایت کیا لیکن عبدان نے عبد اللہ بن مبارک کے ایک شیخ یعنی یونس کو ذکر کیا اور بشر نے عبد اللہ بن مبارک کے دو شیخ یعنی یونس اور معمر کو ذکر کیا، چونکہ امام بخاری رح کا علی العموم دستور یہ ہے کہ متن حدیث آخری سند کا لاتے ہیں کما مر، اسلئے روایت میں متن بشر کا ہے اور بشر کی روایت میں ان کے استاد الاستاد دو ہیں یونس اور معمر، مگر یہاں الفاظ یونس کے ہیں اور معمر کی روایت یونس کی روایت کے مفہوم میں متحد ہے الفاظ میں مغایر ہے اسی کی طرف اشارہ ہے ومعمر نحوہ سے ای نحو حدیث یونس۔

مثلہ اور نحوہ میں فرق

نصر الباری شرح بخاری کتاب المغازی ص۲۷ دیکھیے۔

عبید اللہ بن عبد اللہ

عبید اللہ بالتصغیر ابن عبد اللہ بن عتبہ بضم العین المہملۃ وسکون المثناۃ الفوقیۃ وفتح الموحدہ الامام الجلیل احد الفقہاء السبعۃ التابعی المتوفی بعد ذہاب بصرہ سنۃ تسع او ثمان او خمس او اربع وتسعین الخ (ارشاد الساری ص۱۲۱)

یعنی حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود رض کے بھائی عتبہ بن مسعود کے پوتے ہیں، ۹۴ھ میں انتقال ہوا ہے (تقریب ص۲۵۲) حضرت عبید اللہ عظیم الشان جلیل القدر تابعی ہیں اور مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں، خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے استاد تھے۔

عن ابن عباس رض حدیث ۴ میں ان کا حال گزر چکا۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس بنصب اجود لانہا خبر کان (فتح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اجود (فیاض وسخی) تھے

جود و سخا میں فرق

اجود اسم تفضیل کا صیغہ ہے جاد یجود جوداً از باب نصر بخشش میں غالب ہونا، امام راغب نے جود کے معنی اس طرح بیان کئے ہیں۔

اعطاء ما ینبغی لمن ینبغی، جو چیز جس کے مناسب ہو اسے عطا کرنا۔ اور سخاوت کے معنی ہیں مالی تقسیم کرنا، اس اعتبار سے لفظ جود اپنے اندر بہت عموم رکھتا ہے یعنی یہ مال پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر شخص کو اس کے مناسب چیز دینا جود ہے۔ بھوکے کو کپڑا دینا، ننگے کو کھانا کھلانا جود نہیں ہے کیونکہ اعطاء ما ینبغی لمن ینبغی نہ ہوا بلکہ فقیروں، ناداروں مفلسوں کو اموال تقسیم کرنا، تشنگانِ علوم کیلئے افاضۂ علم کرنا، گمراہوں کیلئے ہدایت کرنا یعنی ہر کام کو اپنے محل میں کرنے کا نام جود ہے اس اعتبار سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجود الناس ہونا اظہر من الشمس ہے۔

جود دراصل ایک ملکۂ استعداد ہے اور سخاوت اسکا ثمرہ واثر ہے۔ حضور اقدس ﷺ اپنے ملکات کے اعتبار سے تمام اہلِ کمال پر فوقیت رکھتے تھے، ارشادِ نبوی ہے انا اجود ولد آدم واجودهم بعدی رجل علم علما فنشر علمه الخ (فتح)، یعنی تمام انسانوں میں سب سے بڑا سخی میں ہوں پھر میرے بعد وہ سب سے زیادہ سخی ہے جو علم حاصل کرکے اس کو پھیلائے۔

غلط فہمیوں کا ازالہ

عام طور پر ایک غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ جود وسخا کے معنی یہ سمجھ لئے جاتے ہیں کہ مالِ کثیر خرچ کیا جائے، دوسری غلط فہمی یہ کہ سخا اور جود کو اموال کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے ان دو غلط فہمیوں کی بنا پر شبہ ہوسکتا ہے کہ دنیا میں کئی لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سخی ہیں جیسے حاتم طائی وغیرہ کے واقعات مشہور ہیں۔

پس حقیقت یہ ہے کہ مالِ کثیر صرف کرنا سخا یا جود نہیں ہے بلکہ کل مال سے مال مصروف کی نسبت کا اعتبار ہے مثلاً ایک شخص لاکھ پتی ہے اور وہ ایک ہزار روپے خیرات کرتا ہے اور دوسرے کے پاس صرف ایک روپیہ ہے اور وہ پورا روپیہ ہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردیتا ہے، بظاہر پہلا شخص سخی دکھلائی دیتا ہے کہ اس نے ہزار روپیہ خرچ کیا اور دوسرے نے صرف ایک روپیہ، مگر حقیقت میں دوسرا شخص زیادہ سخی ہے اسلئے کہ اس نے اپنا کل مال دیدیا جبکہ پہلے شخص نے اپنے کل مال کا ایک فیصد حصہ خرچ کیا ہے، یہ امر معقول ہونے کے علاوہ منقول بھی ہے، ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اہم کام کے لئے مال جمع کرنے کی ترغیب فرمائی، ان ایام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس کافی مال تھا آپ آدھا مال لے گئے اور دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج صدیق اکبر رضؓ پر فضیلت لے جاؤنگا، ادھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا کل اثاثہ لے آئے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضؓ سے دریافت فرمایا کہ آپ کتنا مال لائے ہیں؟ عرض کیا! "نصف" پھر حضرت صدیق اکبر رضؓ سے دریافت فرمایا تو عرض کیا کہ کل مال حاضرِ خدمت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھر میں بچوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا، "ترکت الله ورسوله" حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ اس روز سے مجھے یقین ہوگیا کہ میں کسی میدان میں بھی صدیق کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

پس اس موقع پر وجہ فضیلت میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ زیادہ مال کون لایا ہے بلکہ یہ امر ملحوظ تھا کہ کل مال کا کتنا حصہ لایا ہے۔

مسند احمد بن حنبل رح میں حضرت علی رضؓ سے روایت ہے جاء ثلثة نفر الى النبی صلی الله علیه وسلم فقال احدهم

کانت لی مائۃ دینار فتصدقت بعشرۃ فقال الآخر کانت لی عشرۃ فتصدقت بواحد وقال الآخر کان لی دینار فتصدقت بعشرہ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلکم فی الاجر سواء وکلکم تصدق بعشر مالہ۔

اسی طرح جود وسخا کو صرف مال کے ساتھ مخصوص سمجھنا غلط ہے کیونکہ یہ فیوض وانوار اور علوم واسرار کو بھی شامل ہے جیساکہ امام راغب جود کے معنی بیان فرماتے ہیں ھو اعطاء ماینبغی لمن ینبغی " پس جود وسخا کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجود الناس ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

سوال وجواب

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کچھ پکانے کی چیز نہ ہونے کی وجہ سے مدتوں آگ نہیں جلتی تھی، ام المؤمنین حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ دو دو ماہ گذر جاتے اور ہمارے چولھے میں آگ نہ جلتی، صرف کھجور اور پانی پر گذر ہوتا الخ کئی کئی دن کے فاقے ہوتے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا تو اجود الناس کیسے ہوئے ؟

جواب:۔ جواب یہ ہے کہ آپ ص کا یہ فقر وفاقہ اضطراری نہ تھا بلکہ اختیاری تھا اور اسی جود کی وجہ سے تھا کہ جو کچھ آیا فوراً تقسیم کردیا اور اس وقت تک گھر تشریف نہ لے گئے، جب تک کہ وہ سارا تقسیم نہ ہوگیا۔

حضرت انس بن مالک رض کی روایت ہے کہ حضور اکرم ص کے پاس بحرین سے مال آیا (بخاری صنہ) ابن ابی شیبہ کی مرسل روایت میں ہے کہ وہ مال ایک لاکھ درہم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ رقم مسجد کے ایک کونے میں ڈالدی گئی، اور نماز سے فراغت کے بعد حضور ص نے اسے تقسیم کرنا شروع فرمایا یہاں تک کہ سب تقسیم ہوگیا فما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وثمہ منہا درھم (بخاری صنہ) یعنی جب تک ایک درہم بھی رہا حضور اکرم ص وہاں سے نہ اٹھے۔ ایک مرتبہ نماز عصر کے بعد فوراً لوگوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے گھر میں تشریف لے گئے سونے کا ایک ٹکڑا اٹھالائے، اور فرمایا کہ ایک ایسی شئے جو قابلِ تقسیم تھی گھر میں رہ گئی تھی، اور اس قسم کی چیزوں کا پیغمبر کے گھر میں رہنا مناسب نہیں۔

ایک عورت بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ تہبند لے کر حاضر خدمت ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی رغبت کے ساتھ اسے قبول کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے استعمال فرمایا تو ایک صحابی رض نے اسے دیکھکر چھوا اور کہا بہت اچھا ہے، ان کے الفاظ سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ اس کی تمنا رکھتے ہیں آپ ص اسی وقت گھر تشریف لیگئے، اور اپنا پرانا تہبند پہنا، اور اسے تہ کرکے اس صحابی کو دیدیا، لوگوں نے انہیں ملامت بھی کی کہ تم نے یہ درست نہیں کیا تم نے خیال نہیں کیا کہ ایک عورت انتہائی اشتیاق ورغبت سے لائی تھی اور آپ ص نے بھی بڑی قدر کے ساتھ اسے قبول فرمایا لیکن تم نے فوراً ہی مانگ لیا، انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اس لئے مانگا ہے کہ آپ ص کے بدن مبارک سے اس تہبند کا اتصال ہوچکا ہے میں اپنے کفن میں ایسے کپڑے کو رکھنا چاہتا ہوں جسے آپ ص کے بدن مبارک سے نسبت ہو۔ الغرض آپ ص کی تو یہ حالت تھی کہ اگر کوئی ضرورتمند آپ ص سے سوال نہ کرتا مگر کسی اور طریقہ سے اسکی ضرورت واضح ہوجاتی تو اسے خود ہی پورا فرمادیتے اور اگر خود پورا نہ کرسکتے تو اس ضرورتمند کیلئے قرض لیتے اور اگر قرض بھی نہ ملتا تو صحابہ رض کو اس کی ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے، وللہ در القائل۔

سہ ماقال لا قط الا فی تشہدہ لولا التشہد کان لاءہ نعم

اس لئے آپ ﷺ کا اجود الناس بلکہ اجود الخلائق ہونا مسلّم ہے۔

وکان اجود مایکون فی رمضان الخ اور رمضان المبارک میں جب جبرئیل ع آپ سے ملاقات کرتے تو دوسرے اوقات کے مقابلہ میں، آپ ﷺ کی سخاوت نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے خود حضور اقدس ﷺ نے اس مہینہ کو شہر عظیم ماہ مبارک فرمایا ہے، اس میں نفل کا ثواب فرض کے برابر ہوتا ہے، ایک فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے، رمضان شریف کی ہر رات میں دس لاکھ آدمی جہنم سے آزاد کئے جاتے ہیں۔

فضل زمان ومکان

اکثر متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ فی نفسہ سب زمان ومکان برابر ہیں، خالق کائنات نے سب کو یکساں بنایا، کسی زمانہ یا کسی مکان کو کسی دوسرے وقت وجگہ پر کوئی فضیلت وفوقیت نہیں البتہ کسی خاص امر عظیم کے کسی وقت ومقام پر ہوجانے کی وجہ سے اس کو دوسرے اوقات ومقامات پر فضیلت ہوجاتی ہے۔

شیخ اکبر اور ابن قیم وغیرہ محققین فرماتے ہیں کہ قدرت ہی کی جانب سے بعض ازمنہ اور امکنہ میں کچھ خصوصیات ودلیعت کی گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ امور عظام اور وقائع مہمہ اس میں واقع ہوتے ہیں اور حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ بہترین مقام اور ایام کو بہترین چیزوں کیلئے منتخب کیا جاتا ہے پھر ان امور ووقائع کی وجہ سے ان کی فضیلت میں کچھ اضافہ ہوتا ہے مثلاً یوم عاشورہ کے متعلق متکلمین کا خیال ہے کہ اس دن کو دوسرے ایام پر فی نفسہ کوئی فضیلت نہیں لیکن چونکہ اس دن بڑے بڑے امور عظام واقع ہوئے ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نجات اور فرعون جیسے طاغی اور سرکش کی ہلاکت وغرقابی وغیرہ وغیرہ، اس لئے اس میں خاص واقعہ کی وجہ سے خصوصی فضیلت آگئی۔

محققین فرماتے ہیں کہ اس دن میں قدرتی طور پر خاص استعداد رکھی گئی تھی، اس وجہ سے اس دن کو حکیم مطلق نے ان امور عظام کے لئے تجویز فرمایا جس کی وجہ سے اس دن کی فضیلت دوبالا ہوگئی، ایسے ہی لیلۃ القدر کو متکلمین کے نزدیک دوسری راتوں پر کوئی خاص فضیلت نہ تھی لیکن نزول قرآن اور کتب سماویہ کی وجہ سے اس میں خاص فضیلت آگئی ہے۔

محققین کا ارشاد ہے کہ شب قدر میں تکوینی طور پر خصوصی عظمت صلاحیت وفضیلت تھی اس لئے اس میں کتب سماویہ اور قرآن عظیم کا نزول ہوا۔ ایسا ہی خانہ کعبہ کی جگہ کے بارے میں متکلمین کہتے ہیں کہ اس میں خاص فضیلت نہیں تھی چونکہ وہاں حج شروع ہوا، مقدس لوگ وہاں حج کو جاتے ہیں اس لئے اس کی ایک خاص فضیلت ہوگئی۔

محققین فرماتے ہیں کہ اگر ساری جگہیں یکساں تھیں تو حج کے لئے اسی جگہ کو کیوں منتخب فرمایا وربک یخلق مایشاء ویختار تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہے پسند کرے، اللہ تعالیٰ حکیم ہیں اور حکمت کے معنی، وضع الشیٔ فی محلہ ہیں یعنی جس چیز کے لائق جو محل ہو اس کو اسی محل میں رکھتے ہیں اسلئے ظاہر ہے کہ خداوند قدوس کسی امر عظیم کے لئے کسی محل یا کسی زمانہ کو چھانٹیں گے تو ضرور اس میں کوئی امتیازی شان ہوگی، عرق گلاب کو سونگھنے اور شیشی میں رکھنے سے فضیلت نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس میں خوبی تھی اس لئے اس کو بہترین محل میں رکھا۔

علامہ ابن قیم رح نے اس مسئلہ کو ایک طویل تمہید کے بعد کتاب و سنت کی روشنی میں بہت تفصیل سے چھوٹی تقطیع کی زاد المعاد میں ص۳۵ تا ۶۰ تقریباً پچیس ۲۵ صفحات میں بیان کیا ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ یہ نکتہ: اس کوتاہ بین کی فہم سے ماوراء ہے جو اعیان وافعال اور ازمنہ واماکن کو یکساں سمجھتا ہو کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت و مزیت حاصل نہیں، لیکن اس گمان فاسد کے خلاف چالیس سے زائد دلائل میرے پاس موجود ہیں جنہیں میں نے دوسری جگہ وضاحت سے بیان کیا ہے اس جگہ اس فاسد نظریہ کے ابطال کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر اسے مان لیا جائے تو انبیاء علیہم السلام اور اعداء انبیاء (کفار، مشرکین، فرعون، ہامان) کی حیثیت ایک ہو جائیگی اور اس سے بڑھکر جہل اور باطل بات کیا ہو سکتی ہے کہ مکان بیت الحرام تمام دیگر خطوں کے برابر ہے اور حجر اسود کا ٹکڑا کرۂ ارضی کے دوسرے پتھروں کی طرح ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی دوسرے انسانوں کے مساوی ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ "باری تعالیٰ جانتے ہیں کہ وہ رسالت کسے عطا فرمائیں یعنی ہر فرد تحمل رسالت کی اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اگرچہ نبوت وہبی ہے کسبی نہیں ہے لیکن اس کی اہلیت و صلاحیت کے لئے کچھ خصوصیتیں درکار ہیں جن میں نبوت و رسالت کا ترتب ہوتا ہے اور ان کے بغیر یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی اور اور ان خصوصیتوں کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں وہی جانتا ہے کہ ان خصوصیات کا جامع کون ہے اسی لئے فرمایا اللہ یصطفی من الملئکۃ رسلاً ومن الناس۔ علامہ ابن قیم رح نے بعض ازمنہ اور امکنہ کے فضائل تفصیل سے بیان کیا اور محققین کے مسلک کو خوب بسط کے ساتھ دلائل سے ثابت کیا، آخر میں متکلمین کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ھو اعظم جنایۃ جناھا المتکلمون علی الشریعۃ (زاد المعاد ج ا ص۱۳) - یہ اقاویل و امثال متکلمین کی ان ہفوات میں سے ہیں جو انہوں نے شریعت پر افتراء کیا اور اسکی جانب منسوب کردی ہیں حالانکہ شریعت قطعاً ان ہفوات و جہالات سے بری ہے اور ان متکلمین کے پاس بعض عام امور میں مساوات کے سوا کوئی دلیل نہیں اور اس عمومی مساوات سے حقیقی مساوات بہر حال حاصل نہیں ہو سکتی الخ بلکہ رات دن کا مشاہدہ اس کے خلاف ہے مثلاً زید، عمر، بکر شکل و صورت انسانیت، کھانے پینے، سونے، اٹھنے بیٹھنے میں مشترک ہیں لیکن پھر بھی یہ سب نہ تو ایک ہیں نہ یکساں، بہت سی چیزوں میں اختلاف ہے، و ہذا ظاہر جداً واللہ ولی التوفیق۔ (جامع الدراری بحوالہ زاد المعاد بڑی تقطیع ص۲ تا ص۱۳)۔

علامہ ابن کثیر رح فرماتے ہیں انزل اشرف الکتب باشرف اللغات علی اشرف الرسل بسفارۃ اشرف الملائکۃ وکان ذالک فی اشرف بقاع الارض وابتداء انزالہ فی اشرف شہور السنۃ وھو رمضان فکمل من کل الوجوہ۔

فیدارسہ القرآن جبرئیل عا آپ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے۔ یُدارس فعل مضارع کا صیغہ ہے مدارسۃ باب مفاعلۃ سے جو جانبین سے ہونے کو مشعر ہے یہاں مراد دور کرنا ہے۔ اس مدارسۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ مبارک کو کلام الٰہی سے خاص مناسبت ہے اسی وجہ سے اللہ جل شانہ کی تمام کتابیں اسی ماہ مبارک میں نازل ہوئیں، چنانچہ قرآن مجید لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں اسی ماہ شب قدر میں نازل ہوا اور بیت العزۃ میں محفوظ

کردیا گیا، اور بیت العزہ آسمان دنیا میں ایک جگہ کا نام ہے، اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی قرآنی کی ابتداء سترہ رمضان المبارک بروز دوشنبہ کو ہوئی، پھر تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت تیئیس ۲۳ برس کے عرصہ میں نازل ہوا، اس کے علاوہ حضرت ابراہیم عا کے صحیفے یکم رمضان کو نازل ہوئے، حضرت موسیٰ عا کو توریت ۶ رمضان کو عنایت ہوئی، اور حضرت عیسیٰ عا کو انجیل ۱۳ رمضان کو عطا ہوئی اور حضرت داؤد عا کو زبور ۱۸ رمضان کو ملی۔

فلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلۃ الخ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (لوگوں کو) بھلائی پہنچانے میں چلتی ہوا سے بھی زیادہ سخی تھے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو رمضان المبارک اشرف الشہور (تمام مہینوں میں افضل و اشرف) اور آنیوالے جبرئیل عا سید الملائکہ اور جو چیز لے کر آتے وہ تمام کتب سماویہ میں افضل و اشرف الکتب اور جس کے پاس لائے وہ سید المرسلین و اشرف الخلائق، جب یہ ساری شرافتیں مجتمع ہوگئیں تو متعدد برکات کے اجتماع سے حضور اکرم ص کے صفت جود و سخا کے سمندر کا موجزن ہونا اور آپ ص کے علوم و معارف کے بحر ناپیدا کنار کا جوش میں آنا ظاہر ہے۔

مطابقۃ الحدیث للترجمہ

غار حرا والی حدیث (یعنی باب کی تیسری حدیث) میں بدر مکانی کا ذکر ہے یعنی آغاز وحی کا مکان بتلایا گیا تھا، اس حدیث میں بدر زمانی مذکور ہے کہ سب سے پہلے نزول وحی کا آغاز رمضان المبارک میں ہوا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔

---

(۶) حدثنا ابو الیمان الحکم بن نافع قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال اخبرنی عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ بن مسعود ان عبد اللہ بن عباس اخبرہ ان ابا سفیان بن حرب اخبرہ ان ھرقل ارسل الیہ فی رکب من قریش وکانوا تجارا بالشام فی المدۃ التی کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مادّ فیھا ابا سفیان وکفار قریش فاتوہ وھم بایلیاء فدعاھم فی مجلسہ وحولہ عظماء الروم ثم دعاھم ودعا ترجمانہ فقال ایکم اقرب نسبا بھذا الرجل الذی یزعم انہ نبی قال ابو سفیان فقلت انا اقربھم نسبا فقال ادنوہ منی وقربوا اصحابہ فاجعلوھم عند ظھرہ ثم قال لترجمانہ قل لھم انی سائل ھذا عن ھذا الرجل فان کذبنی فکذبوہ فواللہ لولا الحیاء من ان یاثروا علی کذبا لکذبت عنہ ثم کان اول ما سالنی عنہ ان قال کیف نسبہ فیکم قلت ھو فینا ذو نسب قال فھل قال ھذا القول منکم احد قط قبلہ قلت لا قال فھل کان من آبائہ من ملک قلت لا قال فاشراف الناس اتبعوہ ام ضعفاؤھم فقلت بل ضعفاؤھم قال ایزیدون ام ینقصون قلت بل یزیدون قال فھل یرتد احد منھم سخطۃ لدینہ بعد ان یدخل فیہ قلت لا قال فھل کنتم تتھمونہ

بالکذبِ قبلَ أن یقولَ ما قال قلتُ لا قال فهل یغدِرُ قلتُ لا ونحن منه فی مدّةٍ لا ندری ماهو فاعلٌ فیہا قال ولم تُمکنّی کلمةٌ أُدخِل فیہا شیئًا غیرُ هذه الکلمةِ قال فهل قاتلتموه قلتُ نعم قال فکیف کان قتالکم ایّاه قلتُ الحربُ بیننا وبینه سِجالٌ ینال منّا وننال منه قال ماذا یأمرکم قلتُ یقول اعبدوا الله وحده ولا تشرکوا به شیئًا واترکوا ما یقول آباؤکم ویأمرنا بالصلوٰة والصدق والعفاف والصلة فقال للترجمانِ قل له سألتک عن نسبه فذکرتَ أنه فیکم ذو نسب وکذالک الرسل تُبعث فی نسبِ قومها وسألتک هل قال احدٌ منکم هذا القولَ فذکرتَ ان لا قلتُ لو کان احدٌ قال هذا القولَ قبلَه لقلتُ رجلٌ یأتسی بقولٍ قیل قبلَه وسألتک هل کان من آبائه من مَلِکٍ فذکرتَ ان لا فقلتُ فلو کان من آبائه من مَلِکٍ قلتُ رجلٌ یطلبُ مُلکَ ابیه وسألتک هل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال فذکرتَ ان لا فقد أعرف أنه لم یکن لیذرَ الکذبَ علی الناس ویکذب علی الله وسألتک اشرافُ الناس اتّبعوه امر ضعفاؤهم فذکرتَ أنّ ضعفاءَهم اتّبعوه وهم أتباعُ الرسل وسألتک أیزیدون ام ینقصون فذکرتَ انهم یزیدون وکذالک أمرُ الایمان حتی یتمّ وسألتک أیرتدّ احدٌ سخطةً لدینه بعد أن یدخل فیه فذکرتَ ان لا وکذالک الایمان حین تخالط بشاشتُه القلوبَ وسألتک هل یغدر فذکرتَ ان لا وکذالک الرسل لا تغدِرُ وسألتک بما یأمرکم فذکرتَ انه یأمرکم أن تعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئًا وینهاکم عن عبادة الاوثان ویأمرکم بالصلوٰة والصدق والعفاف فإن کان ما تقول حقًا فسیملک موضعَ قدمیّ هاتین وقد کنتُ أعلم أنه خارجٌ ولم اکن أظنّ أنه منکم فلو أنّی أعلم أنّی أخلصُ الیه لتجشّمتُ لقاءَه ولو کنتُ عنده لغسلتُ عن قدمیه ثمّ دعا بکتاب رسولِ الله صلی الله علیه وسلم الذی بعث به مع دِحیةَ الکلبی إلی عظیم بُصری فدفعه عظیمُ بُصری الی هِرَقلَ فقرأه فاذا فیه بسم الله الرحمٰن الرحیم من محمد عبدِ الله ورسوله الی هرقلَ عظیم الروم سلامٌ علی من اتبع الهدیٰ امّا بعد فانی أدعوک بدعایةِ الاسلام أسلِم تَسلَم یؤتک الله اجرک مرتین فان تولّیتَ فانّ علیک اثمَ الیریسیین ویا أهلَ الکتٰب تعالوا إلی کلمةٍ سواءٍ بیننا وبینکم أن لا نعبدَ الّا الله ولا نشرک به شیئًا ولا یتّخذ بعضُنا بعضًا اربابًا من دون الله فان تولّوا فقولوا اشهدوا بانّا مسلمون قال ابو سفیان فلمّا قال ما قال وفرغ من قراءة الکتاب کثر عنده الصخبُ فارتفعت الاصواتُ وأُخرِجنا فقلتُ لاصحابی حین أُخرِجنا لقد أَمِرَ أمرُ ابن ابی کبشة إنّه

يخافه ملكُ بني الأصفر فما زلتُ موقنا أنه سيظهر حتى ادخل الله عليّ الإسلام وكان ابنُ الناطور صاحبُ إيلياء وهرقلَ سُقفّ على نصارى الشام يحدّث أن هرقل حين قدم إيلياءَ اصبح يوماخبيثَ النفسِ فقال لعضُ بَطارِقته قد استنكرنا هَيأتك قال ابنُ الناطور وكان هرقلُ حزّاءً ينظر في النجوم فقال لهم حين سالوه إني رأيتُ الليلة حين نظرتُ في النجوم مَلِكَ الختان قد ظهر فمَن يختتن من هذه الامة قالوا ليس يختتنُ الّا اليهودُ فلا يُهِمّنّك شانُهم واكتبْ إلى مدائنِ ملكك فليقتلوا مَن فيهم من اليهود فبيناهم على امرهم أُتي هرقلُ برجلٍ ارسل به مَلِكُ غسّانَ يُخبر عن خبر رسول الله صلّى الله عليه وسلم فلمّا استخبره هرقلُ قال اذهبوا فانظروا أمُختتِنٌ هوام لا فنظروا اليه فحدثوه انه مُختتِنٌ وساله عن العرب فقال هم يختتنون فقال هرقل هذا مَلِكُ هذه الامّة قد ظهر ثمّ كتب هرقلُ إلى صاحبٍ له بِرُوميّةَ وكان نظيرَه في العلم وسار هرقل إلى حِمصَ فلم يَرِمْ حِمصَ حتى اتاه كتابٌ من صاحبه يوافق رأيَ هرقل على خروج النبي صلى الله عليه وسلم وانه نبيّ فاذِن هرقل لعظماء الروم في دَسْكرةٍ له بحمصَ ثمّ امر بابوابها فغُلِّقت ثمّ اطّلعَ فقال يامعشرَ الرّوم هل لكم في الفلاح والرشد وأن يثبتَ ملككم فتبايعوا هذا النبيّ فحاصوا حيصةَ حُمُرِ الوحشِ الى الابواب فوجدوها قد غُلِّقت فلمّا رأى هرقل نفرتَهم وأَيِس من الايمان قال رُدّوهم عليّ وقال إني قلت مقالتي آنفا أختبر بها شدّتكم على دينكم فقد رأيتُ فسجدوا له ورضوا عنه فكان ذلك آخرَ شانِ هِرقل قال ابوعبدالله رواه صالح بن كيسان ويونس ومعمرعن الزهري

ترجمہ (امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ) ہم سے ابوالیمان حکم بن نافع نے بیان کیا، حکم نے کہا کہ ہم کو خبر دی شعیب نے زہری سے روایت کرتے ہوئے زہری نے کہا خبر دی مجھے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضہ نے کہ ان سے عبداللہ بن عباس رضہ نے بیان کیا کہ انہیں ابوسفیان بن حرب رضہ نے خبر دی کہ ہرقل نے انہیں اس وقت بلایا جبکہ وہ قریش کے ایک قافلہ میں تھے، قریش کے یہ لوگ شام میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے اس زمانہ میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور کفار قریش سے ایک مدّت کے لئے مصالحت فرمائی تھی چنانچہ یہ لوگ ہرقل کے پاس پہونچے اس وقت ہرقل مع مصاحبین ایلیا میں تھے ہرقل نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا اور اسکے ارد گرد روم کے بڑے بڑے لوگ تھے پھر ہرقل نے ان کو اپنے قریب بلایا اور اپنے ترجمان کو بھی بلایا پھر ہرقل نے بذریعہ ترجمان سوال کیا (اے عرب والو) تم میں سے اس مدعی نبوت کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا میں ان سب لوگوں سے زیادہ نسب میں ان کے قریب ہوں تو ہرقل نے کہا اس (ابوسفیان) کو میرے قریب کر دو

اور اس کے پیچھے نزدیک ہی اس کے ساتھیوں کو بھی بیٹھا دو، پھر اس نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہدو کہ میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص کا (پیغمبر صاحب کا) کچھ حال پوچھتا ہوں اگر یہ مجھ سے جھوٹ بولے تو تم لوگ اس کا جھوٹ ظاہر کردینا، ابوسفیان نے کہا قسم خدا کی اگر مجھکو یہ شرم نہ ہوتی کہ یہ لوگ مجلس سے اٹھنے کے بعد میرے اس جھوٹ کو لوگوں میں بیان کرینگے تو میں آپ ص کی نسبت ضرور غلط بیانی کرتا، پھر پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی وہ یہ تھی کہ اس شخص کا خاندان کیسا ہے تم لوگوں میں؟ میں (ابوسفیان) نے کہا کہ وہ ہم میں عالی نسب ہے، کہنے لگا اچھا پھر یہ بات (کہ میں پیغمبر ہوں) ان سے پہلے تم لوگوں میں سے کسی نے کہی تھی؟ (ابوسفیان کہتے ہیں)، میں نے کہا نہیں، ہرقل نے کہا کیا ان کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ میں (ابوسفیان) نے کہا نہیں، ہرقل نے پوچھا اونچے طبقے کے لوگوں نے ان کی اتباع کی ہے یا کمزور لوگ؟ میں نے کہا کمزور لوگ، ہرقل نے پوچھا ان کے متبعین (روز بروز) زیادہ ہو رہے ہیں یا گھٹتے جارہے ہیں؟ میں نے کہا بلکہ بڑھتے جارہے ہیں، ہرقل نے کہا کیا ان کے متبعین میں کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد اس دین سے ناراض ہوکر مرتد ہوتا ہے؟ (یعنی دین سے پھر جاتا ہے؟) میں نے کہا نہیں، ہرقل نے کہا کیا اس دعوائے نبوت سے پہلے تم انہیں جھوٹ سے متہم کرتے تھے؟ میں نے کہا نہیں، ہرقل نے کہا کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں، لیکن اب ہماری ان سے (مصالحت کی)، ایک مدت ٹھہری ہے معلوم نہیں کہ وہ اس میں کیا کرتے ہیں (یعنی عہد پر قائم رہتے ہیں یا نہیں؟) ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس بات کے سوا کوئی دوسرا مغالطہ آمیز کلمہ میں اس گفتگو میں شامل کرنے کا موقع نہ پاسکا، ہرقل نے کہا کبھی تم لوگوں نے ان سے جنگ بھی کی ہے؟ میں نے کہا ہاں، ہرقل نے پوچھا پھر تمہاری اس کی جنگ کا نتیجہ کیا رہا ہے؟ میں نے کہا لڑائی ہمارے اور ان کے درمیان ڈول کی طرح رہی کبھی وہ ہم سے میدان جنگ لے لیتے ہیں اور کبھی ہم (یعنی کبھی وہ غالب رہتے ہیں اور کبھی ہم)، ہرقل نے پوچھا وہ تمہیں کن چیزوں کا حکم دیتے ہیں؟ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑدو اور ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاکدامنی اختیار کرنے اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں اس کے بعد ہرقل نے ترجمان سے کہا کہ اس (ابوسفیان) سے کہدو کہ میں نے تم سے ان کے نسب کے متعلق دریافت کیا تو تم نے بتایا کہ وہ تم میں عالی نسب ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ انبیاء کرام ع ہمیشہ اپنی قوم کے عالی نسب ہی میں بھیجے جاتے ہیں اور میں نے تجھ سے پوچھا کہ یہ بات تم میں سے کسی نے اس سے پہلے کہی ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں، تب میں نے (اپنے دل میں)، کہا کہ اگر یہ بات (دعوائے نبوت) ان سے پہلے کسی نے کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ ایسا شخص ہے جو اقتدا کر رہا ہے اس بات کی جو اس سے قبل کہی جاچکی ہے، اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا ان کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ تم نے بتلایا کہ نہیں، تو میں نے (اپنے دل میں) یہ کہا کہ اگر ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ شخص (پیغمبری کا بہانہ کر کے) اپنے باپ کے ملک واقتدار کا طالب ہے، اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اسی دعوائے نبوت سے پہلے تم انہیں متہم بالکذب سمجھتے تھے؟ تو تم نے کہا کہ نہیں، تو اب میں نے سمجھ لیا کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں پر تو دروغ گوئی سے پرہیز کرے اور اللہ پر جھوٹ باندھے (کہ اللہ نے مجھکو رسول بنایا) اور میں نے تجھ سے پوچھا کہ کیا بڑے لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے یا کمزوروں نے؟ تو تم نے بیان کیا کہ کمزوروں نے ان کی پیروی کی ہے

درحقیقت انبیاء علیہم السلام کے ابتدائی پیروکار ایسے ہی ہوتے ہیں، اور میں نے تم سے پوچھا کہ وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں تو تم نے بتایا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور اسی طرح ایمان کا معاملہ ہے یہانتک کہ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا کوئی اس دین میں داخل ہونے کے بعد اس کو بُرا سمجھ کر پھر جاتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں، اور یہی ایمان کا حال ہے کہ جب اسکی بشاشت دلوں میں پیوست ہو جاتی ہے (تو پھر نہیں نکلتی) اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ وہ کبھی عہد وپیمان کے خلاف بھی کرتے ہیں؟ تو تم نے بیان کیا کہ نہیں، انبیاء درصل ایسے ہی ہوتے ہیں کہ عہد شکنی اور فریب نہیں کرتے ہیں، میں نے تم سے دریافت کیا کہ وہ تمہیں کیا حکم دیتے ہیں؟ تو تم نے یہ بتایا کہ وہ حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور بتوں کی پرستش سے منع کرتے ہیں اور نماز (سچائی) اور پاکدامنی کا حکم فرماتے ہیں پس اگر تمہاری یہ باتیں سچ ہیں تو عنقریب وہ اس جگہ کا بھی مالک ہو جائیگا جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں (یعنی ملک شام کا بھی حاکم ہو جائے گا، اور یہ تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ وہ پیغمبر آنے والے ہیں لیکن میرا خیال یہ نہیں تھا کہ وہ پیغمبر تم میں سے ہوں گے پس اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میں ان کی خدمت میں (یعنی مدینہ منورہ میں) ہوتا تو ضرور بذاتِ خود ان کے پاؤں دھوتا، اس کے بعد ہرقل نے رسول اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی منگوایا جس کو آپؐ نے دحیہ کلبی کی معرفت (۶ھ میں) عظیم بصریٰ (حارث بن شمر غسانی) کے پاس ارسال فرمایا تھا پھر عظیم بصریٰ نے وہ نامۂ مبارک ہرقل کو دیدیا ہرقل نے اس مکتوب گرامی کو پڑھا اس میں لکھا تھا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے یہ خط ہے ہرقل کے نام جو رومیوں کا رئیس اعظم ہے جو راہِ ہدایت کی اتباع کرے اُس کو سلام، اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت یعنی کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی طرف بلاتا ہوں مسلمان ہو جا تو سلامت رہیگا (دنیا میں بھی آخرت میں بھی) اللہ تجھکو دوہرا ثواب دیگا پھر اگر تو نے روگردانی کی تو (تمہاری) رعایا کا گناہ بھی تیرے اوپر ہوگا اور اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے پھر اگر وہ (اس دعوت ایمان وتوحید کو) نہ مانیں تو (اے مسلمانو) تم ان سے کہدو کہ تم گواہ رہو کہ ہم ایک خدا کے تابعدار ہیں۔ ابو سفیان رضؓ کا بیان ہے کہ جب ہرقل کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اور مکتوب گرامی کی قرأت سے فارغ ہو گیا تو اس کے پاس بہت شور وشغب ہوا اور آوازیں بلند ہوئیں اور ہم باہر نکال دئے گئے، تو میں (ابو سفیان رضؓ) نے اپنے رفقاء سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے کہ اس سے بنی اصفر (شاہ روم) خائف ہے (ابو سفیان کہتے ہیں کہ) اس دن سے مجھے برابر یقین رہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب غالب ہو کر رہیں گے یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اسلام کو مسلط کر دیا (امام زہری کہتے ہیں کہ) اور ابن ناطور جو ایلیاء کا حاکم اور ہرقل کا مصاحب شام کے نصاریٰ کا لاٹ پادری تھا بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیاء (بیت المقدس) میں آیا تو ایک روز صبح کے وقت کبیدہ خاطر اداس اٹھا تو اس کے بعض مصاحبین نے دریافت کیا کہ ہم آج آپ کی صورت متغیر دیکھ رہے ہیں (کیا وجہ ہے؟) ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہرقل کاہن (نجومی) بھی تھا علم نجوم میں مہارت رکھتا تھا

جب لوگوں نے اس سے پوچھا کہ آپ رنجیدہ پریشان حال کیوں ہیں؟) تو ہرقل نے کہا کہ آج کی رات میں نے ستاروں پر نظر کی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہو چکا ہے (آپس بتلاؤ) اس زمانہ میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ مصاحبین نے کہا یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا سو ان کا معاملہ آپ کو غمزدہ نہ کرے (یعنی ان یہودیوں کی وجہ سے آپ فکر نہ کریں) آپ اپنی حکومت کے تمام شہروں کے حکام کے پاس یہ حکمنامہ لکھ بھیجیے کہ وہاں جتنے یہودی ہوں سب قتل کر دیے جائیں ابھی لوگ ان ہی باتوں میں مشغول تھے کہ ہرقل کے پاس ایک شخص لایا گیا جسے غسان کے بادشاہ نے بھیجا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و خبر بیان کرتا تھا پس جب ہرقل نے اس سے احوال دریافت کر لیا تو اپنے خدام سے کہا اسے لیجاؤ اور دیکھو کہ وہ ختنہ شدہ ہے یا نہیں؟ چنانچہ ان لوگوں نے دیکھا تو بتایا کہ وہ ختنہ کیا ہوا ہے اور ہرقل نے اس شخص سے اہل عرب کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کراتے ہیں پھر ہرقل نے کہا یہی (پیغمبر صاحب) اس امت کے بادشاہ ہیں جو ظاہر ہو چکے ہیں، پھر ہرقل نے رومیہ کے اپنے ایک دوست (ضغاطر) کو لکھا جو علم نجوم میں ہرقل کا ہم پلہ تھا اور ہرقل خود حمص چلا گیا ابھی حمص سے نکلا نہیں تھا کہ اس کے دوست (ضغاطر) کا خط (اس کے جواب میں) آ گیا اس کی رائے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بارے میں ہرقل کے موافق تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی پیغمبر ہیں، اس کے بعد ہرقل نے روم کے سرداروں کو اپنے حمص کے ایک محل میں بلایا (جب وہ آ گئے تو) تمام دروازوں کو بند کروا دیا، اس کے بعد اوپر سے سر نکالکر خطاب کیا اے روم والو کیا تم اپنی کامیابی اور ہدایت چاہتے ہو؟ اور یہ چاہتے ہو کہ تمہاری سلطنت قائم رہے؟ تو اس نبی کے ہاتھ پر بیعت کر لو، یہ سنتے ہی وہ لوگ نیل گایوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے مگر دروازوں کو بند پایا، پھر جب ہرقل نے دیکھا کہ انہیں ایمان سے نفرت ہے اور ان کے ایمان سے مایوس ہو گیا تو کہنے لگا کہ ان لوگوں کو میرے پاس واپس بلاؤ، جب وہ واپس آ گئے تو ہرقل نے ان سے کہا "ابھی میں نے تم سے جو بات کہی تھی اس سے تمہاری دینی پختگی اور مضبوطی کی آزمائش مقصود تھی سو وہ میں نے دیکھ لی، یہ بات سنکر سب کے سب ہرقل کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور اس سے راضی ہو گئے پس یہ ہرقل کا آخری حال ہوا۔

امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو صالح بن کیسان اور یونس اور معمر نے بھی شعیب کی طرح زہری سے روایت کیا ہے۔

تعدد الحدیث

یہ حدیث حدیث ہرقل کہلاتی ہے، امام بخاری رح نے اس حدیث کو صحیح بخاری میں چودہ[۱۴] جگہ ذکر فرمایا ہے، تین جگہ مفصل اور گیارہ[۱۱] جگہ اختصار کے ساتھ کچھ کچھ ٹکڑے۔

مفصل ایک تو یہی کتاب الوحی کی آخری حدیث صـ۴ تا صـ۵ (۲) کتاب الجہاد صـ۴۱۲ تا صـ۴۱۳، (۳) کتاب التفسیر صـ۶۵۳ تا صـ۶۵۴۔

مختصر:- (۴) کتاب الایمان صـ۱۳، (۵) صـ۳۶۸ (۶) صـ۳۹۳ (۷) صـ۴۱۱، (۸) صـ۴۱۸، (۹) صـ۴۵۰ (۱۰) صـ۸۸۴ (۱۱) صـ۹۲۶ (۱۲) صـ۱۰۶۸ (۱۳) صـ۱۰۷۸، (۱۴) صـ۱۱۲۵۔

علامہ عینی رح فرماتے ہیں "قال الکرمانی قد ذکر البخاری حدیث ہرقل فی کتابہ فی عشرۃ مواضع قلت ذکرہ فی اربعۃ عشر

موضعا الخ (عمدہ ج ۱ ص ۸۵)

امام مسلم رح نے مغازی میں پانچ شیوخ سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور ابو داؤد نے ادب میں، ترمذی نے استیذان میں، نسائی نے تفسیر میں اور ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں ہے (عمدہ ص ۸۴)

بیان رجال وہم ستۃ الاول ابو الیمان بفتح الیاء وتخفیف المیم واسمہ الحکم بفتح الحاء المہملۃ والکاف الخ (عمدہ) ابو الیمان کنیت اور نام حکم بن نافع ہے مگر مشہور کنیت کے ساتھ ہیں، صحاح ستہ میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا راوی حکم بن نافع نہیں ہے ولادت ۱۳۸ھ میں ہے اور وفات تراسی ۸۳ برس کی عمر میں ۲۲۱ھ یا ۲۲۲ھ میں بمقام حمص ہوئی۔

والثانی شعیب ہو شعیب بن ابی حمزۃ واسم ابیہ دینار ستر برس سے زیادہ عمر میں ۱۶۲ھ یا ۱۶۳ھ میں وفات ہوئی صحاح ستہ میں ان کے علاوہ شعیب بن دینار نام کا کوئی دوسرا راوی نہیں ہے (عمدہ)

والثالث الزہری اس باب کی تیسری حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

والرابع عبید اللہ بن عبد اللہ یہ جلیل القدر تابعی ہیں احوال کیلئے اس سے قبل کی حدیث یعنی حدیث ۵ ملاحظہ فرمایئے۔

والخامس ان اباسفیان بن حرب ان کا نام صخر بن حرب ہے اور کنیت ابو سفیان وابو حنظلہ ہے پہلی کنیت یعنی ابو سفیان سے مشہور ہیں۔ بخاری شریف میں عن ابی سفیان کی سند سے اس کے علاوہ کوئی دوسری روایت نہیں نیز صحیحین اور سنن ابو داؤد، ترمذی اور نسائی میں ابو سفیان رض کی کوئی روایت اسکے علاوہ نہیں اور اس روایت کو ابو سفیان سے صرف حضرت ابن عباس رض نے نقل کیا ہے کسی دوسرے راوی نے نہیں۔

تشریح حدیث ہرقل کی شرح سے قبل چند واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے صاحب واقعہ ہرقل کی معرفت ہو جائے اور اس کے اور ابو سفیان رض اور حضرت دحیہ کلبی رض کے ایک ساتھ بیت المقدس میں جمع ہونے کا راز منکشف ہو جائے نیز اس طویل حدیث میں جس واقعہ کا ذکر ہے اس کو بالترتیب بیان کر دیا جائے تاکہ حدیث کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

احقر نے نصر الباری شرح بخاری کتاب التفسیر ص ۱۱۵ میں یہ وعدہ کیا تھا کہ "بدء الوحی" میں حدیث ہرقل کی پوری تفصیل آئے گی اسلئے یہاں پوری تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

وعلی اللہ التوکل وہو المستعان

جس زمانہ میں سرور کائنات خاتم الانبیاء والمرسلین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرمائے عالم ہوئے (یعنی بروز دوشنبہ بتاریخ ۸ ربیع الاول ۵۷۰ء میں دنیا میں تشریف لائے) اس زمانہ میں دنیا میں بڑی بڑی دو حکومتیں تھیں، ایک روم کی جس کا بادشاہ قیصر کہلاتا تھا اس کا نام ہرقل تھا، دوسری فارس کی جسے ایران کہتے ہیں فارس کے بادشاہ کو کسریٰ کہا جاتا تھا اس زمانہ میں یہی دو سلطنتیں زیادہ مشہور تھیں اہل روم نصاریٰ اہل کتاب تھے اور اہل فارس مجوسی

آتش پرست تھے یہ دونوں سلطنتیں مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں اور مکہ والوں کو روم اور فارس کی جنگ کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں، اسی دوران میں جب ۶۱۰ء میں سردار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اسلامی تحریک نے اہل مکہ کیلئے روم و فارس کی جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کردی، فارس کے آتش پرست مجوسی کو مشرکین مکہ مذہبًا اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں سے قریب تر قرار دیے جاتے تھے اس لئے فارس کے غلبہ کی جب خبر آئی تو مشرکین مکہ خوش ہوئے اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی فال لیتے، خوش آئند توقعات باندھتے تھے اور مسلمانوں کو بھی طبعًا اس سے صدمہ ہوتا کہ عیسائی اہل کتاب آتش پرست مجوسیوں سے مغلوب ہوں اور اس وقت ان کو مشرکین مکہ کی شماتت کا بھی ہدف بننا پڑتا تھا، آخر ۶۱۴ء کے بعد جبکہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے پینتالیس ۴۵ سال ہوئے اور بعثت کے پانچ سال گذر چکے، اہل فارس نے خسرو پرویز کے عہد میں روم کو ایک نہایت زبردست فیصلہ کن شکست دی کہ شام، مصر اور ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

قیصر روم ہرقل کو ایرانی لشکر نے قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کر دیا اور رومیوں کا دار السلطنت بھی خطرہ میں پڑ گیا، بڑے بڑے پادری قتل یا قید ہو گئے، بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایرانی فاتحین لے اُڑے، قیصر روم کا اقتدار بالکل فنا ہو گیا اور بظاہر اسباب روم کے ابھرنے اور فارس کے تسلط سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

یہ حالات دیکھ کر مشرکین مکہ نے خوب خوشیاں منائیں مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کیا بڑے حوصلے اور توقعات قائم کرنے لگے حتی کہ بعض مشرکین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے کل ہم بھی اسی طرح مٹا ڈالیں گے، اس وقت قرآن مجید نے سلسلہ اسباب ظاہری کے بالکل خلاف عام اعلان کر دیا۔

غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین (سورۂ روم)

رومی مغلوب ہوئے قریب کی زمین میں (اذرعات و بصریٰ کے درمیانی خطہ جو شام کی سرحد پر حجاز سے ملتا ہے) اور وہ اس مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے چند سال میں (یعنی نو سال کے اندر)

قرآنی پیشینگوئی اور حضرت صدیق اکبرؓ کی ایمانی جرأت

اس پیشین گوئی کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعض مشرکین سے شرط باندھ لی (اس وقت تک ایسی شرط لگانا حرام نہ ہوا تھا) کہ اگر اتنے سال تک رومی غالب نہ ہوئے تو میں سو اونٹ تم کو دوں گا ورنہ اسی قدر اونٹ تم سے لوں گا، ادھر یہ معاہدہ ہو رہا تھا ادھر قیصر روم ہرقل ان تمام مایوس کن حالات سے قطعًا بے ہراس اور خدا کی نصرت پر بھروسہ کر کے پوری حوصلہ مندی سے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کی تدابیر میں سرگرم ہو گیا اور ہرقل نے منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو فارس پر فتح دی تو میں حمص (جو شام کا مشہور اور بڑا شہر ہے) سے پیدل چل کر ایلیا

یعنی بیت المقدس پہنچوں گا (کیونکہ بیت المقدس ان کا قبلہ تھا جیسا کہ بیت اللہ ہمارا قبلہ ہے)۔

غلبہ روم وشکست فارس

چنانچہ قرآن حکیم کی پیشینگوئی کے مطابق ٹھیک ۹ سال کے اندر ہجرت کے ایک سال بعد ۲ھ میں عین بدر کے دن جبکہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر نمایاں فتح حاصل ہونے کی خوشیاں منا رہے تھے یہ خبر سنکر اور زیادہ مسرور ہوئے کہ اہل کتاب قیصر روم کو حق تعالیٰ نے ایران کے مجوسیوں پر غالب کر دیا، اس خبر سے مشرکین کو (بدر میں) اپنی شکست کے ساتھ ایران کی شکست کی بھی ذلت نصیب ہوئی۔

ظاہری اسباب کے بالکل خلاف قرآن مجید کی اس محیر العقول پیشین گوئی کا مشاہدہ کرکے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضہ نے سو اونٹ مشرکین مکہ سے دصول کیے جو حضور اقدس صلعم کے ارشاد کے مطابق صدقہ کر دیے گئے۔

حضرت دحیہ، ابوسفیان اور ہرقل کا اجتماع

غزوۂ بدر ۲ھ میں اگرچہ مسلمانوں کو شاندار فتح اور نمایاں کامیابی ہوئی، مگر پھر بھی غزوات کا سلسلہ جاری رہا، ۲ھ میں غزوۂ بدر، ۳ھ میں غزوۂ احد، ۴ھ میں بدر صغریٰ، ۵ھ میں غزوۂ خندق جسے غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں، نیز اسی ۵ھ میں غزوہ بنی المصطلق جسے غزوۂ مریسیع بھی کہتے ہیں، اس لیے ایک طرف مسلمانوں کو سفر میں دشواری تھی اور اسلامی دعوت کے خطوط سلاطین زمانہ کے پاس روانہ کرنا تقریباً ناممکن تھا، دوسری طرف قریش مکہ کا ایک اہم تجارتی مرکز شام تھا جہاں مدینہ طیبہ کے قریب سے جانا پڑتا تھا اس لیے قریش کا بھی شام کی جانب تجارتی سفر منقطع ہو چکا تھا اس کے بعد ۶ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔

تنبیہ صلح حدیبیہ کی پوری اور مکمل تفصیل کیلئے احقر کی نصر الباری شرح بخاری کتاب المغازی صفحہ ۲۲۰ تا صفحہ ۲۳۰ ملاحظہ فرمائیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک خواب دیکھکر ۶ھ بماہ ذیقعدہ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کو ہمراہ لیکر بغرض عمرہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے، حدیبیہ پہونچکر جو مکہ مکرمہ سے قریب ہے آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی، اور کسی طرح اٹھنے کا نام بھی نہ لیا وہاں بہت کچھ واقعات ہونے کے بعد مکہ کے چند رؤسا بغرض صلح آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلحنامہ لکھنا قرار پایا، اس سلسلہ میں بعض امور پر بحث وتکرار بھی ہوئی اس کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں اور مسلمانوں کو غصہ اور جوش آیا کہ تلوار سے معاملہ ایک طرف کر دیا جائے، لیکن آخر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے اصرار کے موافق سب باتیں منظور فرمالیں اور صلحنامہ تیار ہو گیا جس میں بہت شرائط طے ہوئیں جن میں ایک شرط یہ ٹھہری کہ فریقین میں دس سال تک جنگ نہ ہو گی۔

اب جنگ وحروب بند ہونیکی وجہ سے فریقین کو موقع ملا اور اپنے اپنے کاروبار شروع کیے، ابو سفیان تجارت کی طرف متوجہ ہوئے، جو جنگ کی وجہ سے معطل ہو چکی تھی، چنانچہ تیس ۳۰ آدمیوں کا ایک قافلہ ہمراہ لیکر تجارت کی غرض سے شام پہنچے، ادھر حضور اکرم صلعم نے فرصت کا موقع غنیمت سمجھکر مختلف بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط روانہ

فرمائے، روم، فارس، حبشہ، شام اور یمامہ کے ملوک کی طرف خطوط لکھے گئے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ذی الحجہ ۶ھ کے آخر میں آپ نے قیصر روم کے پاس حضرت دحیہ کلبی رضؓ کی معرفت ایک والانامہ تحریر فرمایا ہے جسے لیکر حضرت دحیہ ابتدا محرم ۷ھ میں پہنچے تھے۔ اس حدیث ہرقل میں اسی مکتوب گرامی کا تذکرہ ہے، حضرت دحیہ رضؓ جب مکتوب گرامی لیکر گئے تو ہرقل نے جو منت مان رکھی تھی کہ کسریٰ کو شکست دینے پر حمص سے پیدل چل کر بیت المقدس پہونچوں گا وہ اپنی منت پوری کرنے کی غرض سے بیت المقدس پہنچا ہوا تھا حضرت دحیہ رضؓ نے امیر بصریٰ کی وساطت سے نامۂ مبارکہ ہرقل کو دیا، ہرقل نے حکم دیا کہ اس نبی کے قریبی لوگوں میں سے اگر کوئی یہاں موجود ہو تو اسے بلاؤ، ابوسفیان اور ان کے رفقاء غزہ سے ہرقل کے پاس بلائے گئے، قدرتِ الٰہی کا کرشمہ کہ اس طرح حضرت دحیہ، ابوسفیان اور ہرقل سب ایک جگہ جمع ہو گئے پھر ابوسفیان اور ہرقل کے درمیان جو کچھ واقعہ ہوا اسکی تفصیل حدیث میں مذکور ہے۔

حدیث ہرقل کی شرح

ان اباسفیان بن حرب یہ روایت ابوسفیان رضؓ نے حالتِ اسلام میں کی، تحمل اس واقعہ کا حالت کفر میں کیا تھا۔

ان هرقل ای بان ہرقل بکسر الهاء وفتح الراء وسکون القاف وهو غیر منصرف للعجمة والعلمیة وحکی فیه بسکون الراء وکسر القاف هِرْقِل والاول هو الاشهر (قس)، اس کا لقب قیصر تھا۔

قیصر لقب کی وجہ

قیصر قصر سے ہے جس کے معنی ان کی لغت میں چاک کرنے اور کاٹنے کے ہیں رومیوں کے جدّاعلیٰ میں کسی کی یا خود ہرقل کی ولادت اس طرح ہوئی کہ وہ ماں کی شکم ہی میں تھا کہ ماں کا انتقال ہوگیا بچہ زندہ تھا اس لیے ماں کا شکم چاک کرکے نکالا گیا وہ زندہ رہا اور بادشاہ بھی ہوا وہ اس پر فخر کرتا تھا کہ جس طرح عام بچوں کی ولادت نظام طبعی کے طور پر ہوتی ہے اور پیشاب کے مقام سے گذرتا ہوا پیدا ہوتا ہے اس طرح میری پیدائش نہیں ہوئی اسلیے اس نے اپنا لقب قیصر رکھا اس کے بعد سے رومیوں کے ہر بادشاہ کا لقب قیصر ہوا (عینی وغیرہ)، وهو اول من ضرب الدنانیر الخ (قس)، یعنی ہرقل ہی سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے دینار کا سکہ ایجاد کرکے چلایا اور اس نے اکتیس[۳۱] برس حکومت کی اور اسی کے زمانے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دارالبقاء میں تشریف لے گئے۔

فی رکب راکب کی جمع ہے جیسے صاحب کی جمع صحب اور تاجر کی جمع تجر ہے ابوسفیان کے ساتھ یہ قافلہ تیس[۳۰] آدمیوں پر مشتمل تھا من قریش نضر بن کنانہ ابن خزیمہ کی اولاد کو قریش کہتے ہیں۔

مادّ فیها بتشدید الدال از باب مفاعلة دراصل مادد تھا اجتماع مثلین کی وجہ سے دال کو دال میں ادغام کردیا اور یہ ادغام وجوبی ہے یہ لفظ مدّت سے مشتق ہے اس کا اطلاق زمانہ کے ہر حصہ پر ہوتا ہے قلیل پر بھی اور کثیر پر بھی بحسب القرینہ پھر باب مفاعلة مشارکة کیلئے ہوتا ہے اس لئے حاصل عبارت ہوگا اتفقوا علی الصلح مدة من الزمان (عمدہ)، یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوسفیان و کفار قریش نے ایک مدّت کی مصالحت پر اتفاق کیا اس میں صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے جو ۶ھ میں بماہ ذیقعدہ دس[۱۰] سال کے لیے ہوئی۔

فاتوہ وھو بایلیاء ضمیر منصوب ہرقل کی جانب لوٹتی ہے یعنی ابوسفیان اور اس کے رفقاء قیصر کے پاس آئے یہ لوگ شام کے ایک مشہور شہر غزہ سے بلائے گئے تھے، اور موجودہ نسخہ میں وھو ضمیر سے مراد ہرقل اور اس کے ارکین دم نشین ہیں اور بعض نسخوں میں وہم کے بجائے وھو ہے یعنی ہرقل بایلیا وفیہ ثلاث لغات اشہرہا کسر الہمزۃ واللام واسکان الیاء بینہما وبالمد الخ (عمدہ)۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں مشہور لغت یہی ہے کہ اول ہمزہ مکسورہ اس کے بعد یاء ساکن پھر لام مکسور پھر یاء اس کے بعد الف ممدودہ بروزن کبریاء - ایلیاء عبرانی زبان میں ایل بمعنی اللہ اور یاء بمعنی بیت مراد بیت المقدس ہے۔

فدعاھم فی مجلسہ وحولہ عظماء الروم عظماء جمع ہے عظیم کی، روم کے بڑے بڑے سے مراد ارکین دولت، فوجی کمانڈر اور علماء و رہبان ہیں۔

ثم دعاھم بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ تکرار نہیں کیونکہ بادشاہوں کا دستور یہ ہے کہ پہلے دربار میں بلاتے ہیں پھر گفتگو کرنے کیلئے قریب بلاتے ہیں اسی لئے ثم دعاھم کہا کیونکہ ثم تراخی پر دلالت کرتا ہے۔

ودعا ترجمانہ بفتح التاء المثناۃ وضم الجیم الخ (فتح) یعنی ترجمان تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے، علامہ نووی رح نے شرح مسلم میں اسی کو ترجیح دی ہے اور تاء کا ضمہ بھی جائز ہے الخ۔ ترجمان وہ شخص ہوتا ہے جو ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کرے وہو معرب۔ چونکہ حضرت ابوسفیان عربی تھے ان کی زبان عربی تھی اور قیصر وغیرہ عربی زبان سے ناواقف تھے اس لئے ترجمان کو بلایا۔

قولہ انا اقربھم نسبا ابوسفیان رض کا نسب چوتھی پشت میں حضور اقدس ﷺ کے نسب سے مل جاتا ہے، محمد[۱] صلی اللہ علیہ وسلم بن عبد اللہ[۲] بن عبد المطلب[۳] بن ہاشم[۴] بن عبد مناف۔

ابوسفیان[۱] صخر بن حرب[۲] بن امیہ[۳] بن عبد شمس[۴] بن عبد مناف۔

عبد مناف پر دونوں سلسلے ایک ہو جاتے ہیں، عبد مناف کے چار لڑکے تھے ہاشم، مطلب، عبد شمس، نوفل۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہاشم کی اولاد میں ہیں اور ابوسفیان عبد شمس کی اولاد میں اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہوئے جیسا کہ بخاری کتاب الجہاد ص ۴۱۲ میں تصریح ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان سے دریافت کیا ماقرابتک منہ قلت ھو ابن عمی، ابوسفیان کا یہ بھی بیان ہے کہ اس قافلہ میں میرے علاوہ کوئی شخص عبد مناف میں سے نہ تھا۔

فاجعلوھم عند ظھرہ ای ظہر ابی سفیان۔ ابوسفیان کو نسبی قرابت کی وجہ سے آگے بلایا گیا اور عام قاعدہ یہی ہے کہ قرابت و رشتہ داری کی وجہ سے حالات سے زیادہ واقفیت ہوتی ہے اس لئے کہ ہر وقت کا رہنا سہنا اور معاملہ وغیرہ ہوتا رہتا ہے، اور باقی ساتھیوں کو ابوسفیان کے پیچھے بٹھا یا گیا اور یہ کہہ دیا گیا کہ اگر یہ ابوسفیان کسی سوال کے جواب میں غلط بیان کرے تو تم فوراً تکذیب کر دینا اور اس تکذیب کے حکم کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ شاہی دربار میں بلا اجازت بولنا جرم ہے اسی لئے عام اجازت دیگئی کہ دیکھو ابوسفیان ذرا بھی غلط بیانی کریں تو فوراً ٹوک دینا۔

اور ابوسفیان کے ساتھیوں کو پس پشت بیٹھانے میں یہ حکمت کارفرما تھی کہ اگر آمنے سامنے ہوتے تو ممکن ہے کہ ابوسفیان غلط بیانی کریں اور دوسرے لوگ نظریں ملانے کی بناء پر چشم پوشی کرجائیں۔

قولہ فواللہ لولا الحیاء من ان یاثروا علی الخ ابوسفیان کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر مجھکو یہ شرم وغیرت نہ ہوتی کہ یہ لوگ اس مجلس سے اٹھنے کے بعد اس کذب کو لوگوں سے بیان کریں گے تو میں آپ کی نسبت ضرور جھوٹ بولتا یعنی اپنے ساتھیوں پر اتنا تو اعتماد ہے کہ یہاں میری تکذیب کرنے والا کوئی نہیں ہے لیکن یہ جھوٹ اس مجلس پر ختم نہیں ہوجائے گا بلکہ قوم میں اس کی تشہیر کی جائے گی اور یہ میری سرداری کے لئے سخت نقصان دہ ہوگا۔

دوسرا اندیشہ یہ بھی ہے کہ گو بات اس وقت ہرقل کو نہیں پہونچیگی لیکن ہماری تجارت کا مرکز شام ہے ممکن ہے کہ عرب میں چرچا ہونے کے بعد اس کی اطلاع ہرقل کو بھی ہوجائے اور داخلہ بند کردے یا گرفتار کرکے سزا دے۔

قولہ ثم کان اول ما سالنی عنہ ان قال الخ اس جملہ میں ان قال کان کا اسم ہے اور ما سالنی خبر ہے اس لئے اول منصوب ہے۔

ہرقل نے دس چیزوں کے متعلق سوال کیا ان تمام چیزوں میں سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کا خاندان کیسا ہے؟ قلت ھو فینا ذو نسب تنوین تعظیم کے لئے ہے وہ تو ہم سب میں شریف النسب ہیں۔ قط قبلہ بتشدید الطاء المضمومۃ مع فتح القاف۔

یہاں اشکال یہ ہے کہ لفظ قط ماضی منفی میں تاکید کیلئے مستعمل ہوتا ہے اور یہاں کلام مثبت ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں استفہام ہے اور استفہام نفی کے حکم میں ہوتا ہے گو یا کہ تقدیر عبارت یہ ہے۔ ھل قال ھذا القول احد ولم یقلہ احد قط (قس)۔

ہرقل کا دوسرا سوال ہے کہ آپ سے قبل خاندان میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا کہ نہیں، پھر ہرقل نے سوال کیا کہ آپ کا اتباع کرنے والے شرفاء ہیں یا ضعفاء؟ یعنی صاحب اثر بڑے لوگ ان کی پیروی کررہے ہیں یا کمزور لوگ؟ تو یہ جواب ابوسفیان نے غالب اکثریت کے اعتبار سے کہاہے للاکثر حکم الکل۔

سخطۃ لدینہ ہرقل کا یہ چھٹا سوال ہے کہ کیا ان میں سے کوئی ایمان لاکر اس کے دین سے بیزار ہوکر مرتد ہوجاتا ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں، اس میں سخطۃ کی قید ہرقل کی دانشمندی اور صاحب تجربہ ہونیکی دلیل ہے کیونکہ ارتداد کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں بعض وقت مال و دولت کی لالچ یا کسی خوف و ڈر یا کسی عورت کا عشق ہو جیسا کہ خود ابوسفیان کا داماد عبید اللہ بن جحش مسلمان ہوچکا تھا اور اپنی بیوی ام حبیبہ کے ساتھ حبشہ کیجانب ہجرت بھی کرچکا تھا لیکن ایک نصرانی عورت کے عشق میں مبتلا ہوکر مرتد ہوگیا۔ پھر بھی ابوسفیان نے کہا "لا" اس لئے کہ ابوسفیان کو معلوم تھا کہ اس کا سبب دین اسلام سے بیزاری نہیں ہے بلکہ عورت کا عشق ہے وغیرہ۔

فھل یغدر یہ ہرقل کا آٹھواں سوال ہے کہ کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ میں نے کہا "نہیں" لیکن ابوسفیان نے

لکھتے ہیں کہ نحن منه فی مدة لا ندری الخ یعنی ہمارا اور ان کا ایک معاہدہ ہوا ہے معلوم نہیں کہ اس میں ان کا طرز عمل کیا رہے گا۔

بعض روایات میں ہے کہ ابوسفیان نے اتنی بات زائد کہی کہ اس معاہدۂ صلح کے بعد ہم نے ان کے حلیف کے خلاف اپنے حلیف کی امداد کی یعنی ان کے حلیف پر ظلم و زیادتی کی ہے اس لئے ان کی طرف سے ہمیں خطرہ ہے تو ہرقل نے کہا ان کنتم بدرتم فانتم اغدر یعنی جب عہد شکنی کی ابتدار تمہاری طرف سے ہوئی ہے تو تم ہی غدار ہو (فتح)

قال هل قاتلتموه ہرقل کا نواں سوال ہے کہ کیا تم نے کبھی ان سے جنگ کی ہے؟ یہ عنوان سوال بھی ہرقل کی دانائی اور عقلمندی پر دال ہے کہ ہرقل نے یہ نہیں کہا هل قاتلكم۔ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دعوت و تبلیغ و اصلاح کے لئے مبعوث ہوتے ہیں کبھی قتل و قتال کی ابتدار اپنی طرف سے نہیں کرتے تیرہ[۱۳] سالہ مکی زندگی اس کے لئے شاہد عدل ہے دراصل قتال تو بدرجہ مجبوری ہے آخر الحیل السیف۔

بلا تشبیہ یوں سمجھئے کہ جب کسی کے جسم میں پھوڑا ہو جائے تو سب سے پہلے یہ کوشش ہوتی ہے کہ زخم کسی طرح مندمل ہو جائے، پھر یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح ٹوٹ جائے، اور فاسد مادّہ نکل جائے اگر یہ بھی نہ ہو سکے بلکہ خطرہ ہو کہ اگر آپریشن نہ کیا جائے تو دیگر اعضار کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو اس جگہ نشتر و شگاف لگانا اور اس کا آپریشن ضروری ہوتا ہے پھر کامیاب آپریشن پر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے اس طرح پہلے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ مختلف طرق سے اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے پھر کہا جاتا ہے امن و سکون کے ساتھ رہنے کی گارنٹی دو، اگر کوئی پیغام امن کو بھی قبول نہ کرے تو فاسد مادّہ جس کا قطع ضروری ہو جاتا ہے یہی عقل و حکمت کا تقاضا ہے۔

الحرب بيننا وبينهم سجال الخ یعنی ہماری ان کی لڑائی ڈولوں کی طرح ہے کبھی وہ ہم سے (میدان) لے لیتے ہیں اور کبھی ہم ان سے یعنی نہ وہ ہمیشہ غالب رہتے ہیں اور نہ ہم۔ پانسہ بدلتا رہتا ہے، ابوسفیان کا اشارہ غزوۂ احد کی طرف ہے کہ غزوۂ بدر میں مسلمان غالب آئے اور غزوۂ احد میں مشرکین مکہ اور غزوۂ خندق میں دونوں برابر رہے۔

اشکال اس عبارت پر بظاہر اشکال ہے کیونکہ سجال جمع ہے اور الحرب مفرد ہے اور نحوی قاعدہ کے لحاظ سے مفرد کی خبر کا جمع ہونا صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر رح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ الحرب اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل و کثیر سب پر ہوتا ہے اور سجال جمع نہیں ہے بلکہ اسم جنس ہے اس لئے سجال کا خبر ہونا درست ہے (فتح)۔

لیکن علامہ عینی رح فرماتے ہیں کہ سجال جمع ہے سجل کی اسم جنس نہیں ہے مگر چونکہ الحرب اسم جنس ہے اس لئے کوئی اشکال نہیں، پھر علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ سجال بر وزن قتال باب مفاعلت سے مصدر ہو پھر اس صورت میں اشکال ہی وارد نہ ہوگا۔ (عمدہ)۔

قال ماذا يأمركم ہرقل کا یہ دسواں اور آخری سوال ہے کہ وہ تمہیں کن چیزوں کا حکم دیتے ہیں یعنی ان کے ذاتی احوال و اوصاف تو معلوم ہو گئے اب ان کی تعلیمات بتائیے۔ ابوسفیان نے تعلیمات کے متعلق بتایا کہ وہ

کہتے ہیں اعبدوا اللہ وحدہ ولا تشرکوا بہ شیئا الخ یعنی صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے آباء و اجداد کی باتوں کو چھوڑ دو الخ۔

تشریح الفاظ مکتوب گرامی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

من محمد عبد اللہ ورسولہ خط کی ترتیب کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ کاتب کا نام مقدم ہو تاکہ اول وہلہ میں اس پر نظر پڑے، اس لئے کہ مکتوب الیہ کو سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کا تقاضا ہوتا ہے کہ کاتب کون ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ ہرقل کے بعض ہم نشینوں نے اعتراض کیا کہ کاتب نے اپنا نام پہلے لکھکر کتنی گستاخی کی ہے، ہرقل نے جواب دیا کہ اگر وہ نبی برحق ہیں تو وہ اس کے مستحق ہیں۔

عبد اللہ اس سے نصاریٰ کا رد مقصود ہے کہ میں افضل الرسل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں تو عیسیٰ علیہ السلام ابن اللہ کیسے ہو سکتے ہیں؟

عظیم الروم اس سے معلوم ہوا کہ کافر کی زیادہ تعریف کرنا جائز نہیں البتہ اس کے عہدے کے مطابق اسے کوئی لقب دینے میں کوئی حرج نہیں تاکہ وہ بدتہذیبی پر محمول نہ کریں۔

بدعایۃ الاسلام بکسر الدال ای دعوۃ الاسلام۔ بعض روایت میں بداعیۃ الاسلام آیا ہے تو اس کا موصوف محذوف ہوگا ای بالکلمات الداعیۃ الی الاسلام۔

اسلم تسلم یعنی عذاب سے سلامت رہیگا، اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری سلطنت بھی قائم رہیگی غالباً یہی اشارہ سمجھکر ہرقل نے اپنی قوم سے ھل لکم فی الفلاح والرشد وان یثبت ملککم کہا تھا۔

یؤتک اللہ اجرک مرتین اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) بادشاہ کا ایمان رعیت کے ایمان کا سبب بنےگا، تو ایک اجر اپنے ایمان کا اور دوسرا رعیت کے ایمان کی تسبیب کا۔

(۲) حدیث میں ہے کہ جو اہل کتاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے اسے دو اجر ملتے ہیں اسکی وجہ اور پوری تفصیل عنقریب کتاب الایمان میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

فان تولیت فان علیک اثم الیریسیین۔

اشکال:۔ بظاہر یہ نص قرآنی ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کے خلاف ہے۔

جواب:۔ قرآن مجید میں مباشرت کی نفی ہے اور اس میں تسبیب کا ذکر ہے یعنی غیر کی گمراہی کا سبب بننے سے اسے گناہ ہوگا۔ تسبیب پر گناہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ وقال الذین کفروا للذین آمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم وما ھم بحاملین من خطایاھم من شیئ انھم لکاذبون ۝ ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم (عنکبوت) اثقال اول علی وجہ المباشرت اور ثانی علی وجہ التسبیب ہیں۔

قل یاھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ الخ

اشکال: نصاری تثلیث کے قائل ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں تو کلمۂ توحید کو سواء بیننا وبینکم کہنا کیسے صحیح ہوگا؟

جواب: (۱) منزل من اللہ فی القرآن والتوراۃ والانجیل وسائر الکتب السماویہ ہونے میں مساوات ہے۔

(۲) تمام مشرکین بھی ایک حد تک توحید کے قائل ہیں ہر مذہب توحید باری تعالیٰ کا طوعاً وکرہاً زبان سے اقرار کرتا ہے چنانچہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ اللہ ایک ہے تو یقیناً یہی جواب دیں گے کہ ایک ہے مگر اس کے باوجود سیاہ بختی سے اس میں زیادتی کر دیتے ہیں مثلاً نصاریٰ اقانیم ثلثہ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں ایک تین اور تین ایک ہیں، باوجودیکہ اجتماع ضدین لازم آرہا ہے تو بھی توحید کو نہیں چھوڑتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ محال لازم آئے، لیکن توحید ہاتھ سے نہ جائے۔

ایک پادری نے میزان الحق لکھی ہے اور مسئلۂ تثلیث پر اوراق کے اوراق سیاہ کر ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ مذہب کے رازوں میں سے ایک راز ہے اور عقول متوسطہ کے سمجھنے سے بالاتر ہے گویا کہ یہ متشابہات میں سے ہے۔ مگر یہ سراسر غلط ہے کیونکہ متشابہ اسے کہتے ہیں جو عقل میں نہ آسکے اور اسکی کیفیت معلوم نہ ہو سکے، اور تثلیث تو محالات عقلیہ میں سے ہے۔

غرضیکہ ایک وہ چیز ہے کہ وہاں تک عقل کی رسائی نہ ہو اور دوسری وہ کہ عقل اسے محال گردانتی ہو ان دونوں میں واضح فرق ہے۔

اسی طرح مجوسی سے دریافت کرنے پر جواب ملتا ہے کہ خدا ایک ہے اور اہرمن خدا ہی سے ہے جیسا کہ مسلمان شیطان کو سمجھتے ہیں، مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ ہم شیطان کو مخلوق سمجھتے ہیں اور وہ اس کو مستقل خالق تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح آریہ بھی توحید کے قائل ہیں حتیٰ کہ ہمیں مشرک کہتے ہیں کہ یہ کعبہ کی پرستش کرتے ہیں معہذا وہ روح ومادہ کو قدیم مانتے ہیں، اسی طرح دیگر مذاہب میں بھی کسی نہ کسی حد تک توحید کا قول ہے مگر کوئی موحد ہونے کے ہزار دعوی کرے جب تک اسلام کے دامن میں نہ آئے وہ کبھی موحد نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام کے سوا تمام مذاہب میں شرک پایا جاتا ہے صرف اسلام ہی اس سے مبرا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ من کل الوجوہ مساوات مراد نہیں بلکہ وہ توحید مراد ہے جس سے انسان کو مفر اور مخرج نہیں اور جس کی فطرت انسانی مقتضی ہے اور مجبور ہے کہ لامحالہ اسے تسلیم کرے پس توحید اجمالاً وکلیاً مسلمہ عقیدہ ہے اور کلیہ یاد دلانے کے بعد جزئیات مختلف فیہا کا اثبات دخول فی الکلیہ سہل ہو جاتا ہے۔

اہل کتاب صفات مختصہ بالباری تعالیٰ میں سے ہے الوہیت کو حضرت عیسیٰ وحضرت عزیر علیہما السلام کے لئے اور مطاع علی الاطلاق ہونے کو احبار ورہبان کیلئے ثابت کرتے تھے جس کو اربابا من دون اللہ فرمایا گیا ہے یہ ان کی تحریم وتحلیل کو نصوص قطعیہ محکمہ معمولہ بالاجماع کے خلاف بھی واجب العمل سمجھتے تھے۔

بخلاف تقلید جمہور اہل اسلام کے کہ اس کا محل مسائل ظنیہ محتمل الطرفین ہیں۔ اہل کتاب اپنے اس عقیدہ کو شرک اور منافی توحید نہ سمجھتے تھے اسلئے کہ وہ بالذات و بالعرض میں فرق کرتے تھے، حالانکہ یہ فرق صفات غیر مختصہ میں صحیح ہے اور صفات مختصہ میں غیر صحیح اور شرک ہے۔

تحقیق شرک

شرک کی دو قسمیں ہیں شرک فی الذات اور شرک فی الصفات۔ قسم اول کا دنیا میں کوئی بھی قائل نہیں، مشرکین مکہ بھی اللہ تعالیٰ کو واحد و خالق و مالک سمجھتے تھے ولئن سألتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ الخ۔

دوسری قسم یعنی شرک فی الصفات کے بہت سے لوگ قائل ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب ہم جمعیۃ العلماء کی طرف سے مکہ معظمہ گئے تو سلطان ابن سعود سے بات ہوئی، میں نے کہا کہ آپ نے اہل طائف کو مباح الدم کیوں قرار دیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ قبروں کو ایسے سجدہ کرتے ہیں جیسے صنم کو کیا جاتا ہے لہٰذا کافر اور مباح الدم ہیں۔

قاضی شوکانی صاحب نیل الاوطار نے ایک مستقل رسالہ "الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید" لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ سجدہ لغیر اللہ مطلقاً کفر ہے لیکن ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سجدہ تعظیمی اگرچہ حرام اور گناہ کبیرہ ہے مگر موجب کفر نہیں۔

میں نے کہا کہ جب آپ کے ہاں ہر سجدہ عبادت ہے تو ہر ساجد عابد ہوگا اور ہر مسجود معبود ہوگا تو کیا کسی زمانہ میں ایک منٹ کے لئے بھی غیر اللہ کی عبادت جائز رکھی گئی ہے؟

جواب دیا کہ نہیں۔

میں نے کہا قرآن مجید میں ہے واذ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس" اور حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کے بارے میں فرماتے ہیں وخروا لہ سجدا۔

معلوم ہوا کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا خصوصاً جبکہ اس سے قبل حضرت یوسف علیہ السلام زندان میں اپنے ساتھیوں کو توحید کی تبلیغ فرما چکے تھے پھر بعد میں سجدہ بھی ہوا، تو معلوم ہوا کہ یہ سجدہ تعبدی نہ تھا، اس پر سلطان خاموش ہوگئے، اور کہا کہ میں عالم نہیں ہوں، نہ آپ کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ اس بارے میں ہمارے علماء سے گفتگو کیجئے، علماء کا جو فیصلہ ہوگا ابن سعود کی گردن اس کے نیچے ہوگی۔

سجدۂ تعبدی اور تعظیمی میں فرق

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ سجدہ تعبدی اور تعظیمی میں کیا فرق ہے؟

اس کو سمجھنے کے لئے عبادت کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ البالغۃ میں فرماتے ہیں کہ جیسے بادشاہ اپنے ماتحت وزراء اور دوسرے حکام کو کچھ اختیارات سونپ دیتا ہے تو وہ ان کو استعمال کرتے وقت ہر مرتبہ بادشاہ سے اجازت نہیں لیتے بلکہ ان اختیارات کے استعمال میں مستقل بالذات

ہوتے ہیں کہ جب چاہیں استعمال کریں بالکل اسی طرح مشرکین عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ اصنام کو اختیارات اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی عطا ہوئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اختیارات اس طرح سونپ دئے ہیں کہ یہ ان کے استعمال میں مستقل ہیں اپنی مرضی سے جب چاہیں تصرف کرسکتے ہیں اس لئے کفار کہا کرتے تھے لا شریک لک الا شریکا ھو لک تملکہ وما ملک پس اسی کا نام شرک ہے پس اگر سجدہ کرنے والے کا یہ عقیدہ ہو کہ مسجود متصرف فی الامور ہے تو یہ سجدہ تعبدی ہوگا اور ایسا شخص کافر ہوگا۔ اور اگر مسجود کو متصرف نہ سمجھتا ہو تو یہ سجدہ تعظیمی ہوگا جو اگرچہ حرام ہے مگر کفر نہیں۔

البتہ صنم کو سجدہ کرنا خواہ کسی نیت سے بھی ہو مطلقاً کفر ہے کیونکہ یہ مشرکین کا شعار ہے قولہ تعالیٰ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون"

اس میں اختلاف ہے کہ اسلام ملت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے یا کہ ادیانِ سابقہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جلال الدین سیوطی رح نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے کہ مسلم صرف اسی امت کا لقب ہے امم ماضیہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا الا الانبیاء علیہم السلام واتباعہم المخصوصین کما قال ابراہیم علیہ السّلام انا اول المسلمین وقال یوسف علیہ السّلام توفنی مسلما و الحقنی بالصالحین وقال بنو یعقوب علیہم السّلام ونحن لہ مسلمون۔

اسلام کے لغوی معنی ہیں سپرد کردینا کما قال ابراہیم علیہ السلام اسلمت لرب العالمین اور ابراہیم واسماعیل علیہما الصّلوٰۃ والسّلام کے متعلق وارد ہے فلما اسلما " یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے دونوں نے اپنے نفس کو سونپ دیا۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام کے خط میں ہے الا تعلوا علیّ و أتونی مسلمین"

اسلام کا مادہ سلم ہے اس میں بھی جھکنے کے معنی پائے جاتے ہیں وَاِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ یاایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ " اس لغوی معنی کے لحاظ سے ہر نبی اور ہر امت پر مسلم کا اطلاق کرسکتے ہیں اس لئے کہ ہر نبی کا مدعیٰ یہ تھا کہ بندگانِ خدا اپنے خالق کے سامنے سر خم کردیں۔

پس مسلم کے معنی یہ ہوئے کہ جو حکم جس وقت جس کے ذریعہ بھی پہونچے اس پر فوراً گردن جھکا دے اگر کسی ایک حکم سے بھی انحراف کیا تو دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا، آخر کار یہ سلسلۂ نبوت ایک منبع کمالات پر ختم ہوا جو ایک مکمّل اور عالمگیر قانون لایا جس میں جملہ کتب سماویہ کے احکام موجود ہیں فیھا کتب قیمۃ" گویا کہ وہ تمام کتب کا عرق ہے۔ اس ملت میں تین چیزیں ایسی ہیں جو کسی مذہب میں نہیں۔

(۱) تمام ملل پر حاوی ہونا (۲) تمام اقوال وقبائل کو عام ہونا (۳) مؤبدتا قیامت ہونا، پس دین اسلام کو تسلیم کرنا گویا تمام ادیان کو تسلیم کرنا ہے اور اس کو ماننے والا اکمل (ارشاد القاری)۔

لقد امر امر ابن ابی کبشۃ ابن ابی کبشہ کا معاملہ تو بہت بلند ہوگیا کہ روم کا بادشاہ بھی خوفزدہ ہے۔ امر از سمع بمعنی عظم اور دوسرا امر بسکون المیم مصدر ہے بمعنی کام، مطلب یہ ہے کہ آپ کی تبلیغ کا کام یا آپ کی عظمت وشان بہت بلند ہوگئی ہے الخ۔ حضور اقدس ص کو ابو کبشہ کی طرف منسوب کرنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ رضہ کے شوہر حارث بن عبدالعزی کی کنیت تھی اس لئے آپ کو رضاعی نسبت سے ابن ابی کبشہ کہا۔

(۲) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں کسی کی کنیت ابوکبشہ ہوگی۔

(۳) تحقیق یہ ہے کہ ابوکبشہ بنو خزاعہ میں ایک شخص تھا جس کا نام وُجز (بفتح الواو وسکون الجیم) تھا اس نے آبائی دین بت پرستی چھوڑ کر کواکب پرستی شروع کردی تھی، آبائی دین کی مخالفت وانحراف میں تشبیہ دینے کی غرض سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوکبشہ کی طرف منسوب کیا۔

وکان ابن الناطور الخ یہ امام زہری رح کا مقولہ ہے، حضرت ابوسفیان رضہ کی روایت حتی ادخل اللہ علی الاسلام پر ختم ہوگئی، اس کے بعد امام بخاری رح تکمیل قصہ کے واسطے وکان ابن الناطور سے بیان کررہے ہیں مطلب یہ ہے کہ ابتدائی سند دونوں واقعہ کی ایک ہے حدثنا ابوالیمان الحکم بن نافع قال اخبرنا شعیب عن الزہری یہاں تک ایک سند ہے اس کے بعد سابقہ واقعہ امام زہری نے عبیداللہ سے روایت کی ہے جو حتی ادخل اللہ علی الاسلام پر ختم ہوگئی، اور یہاں سے امام زہری بلاواسطہ ابن ناطور سے روایت کرتے ہیں یعنی اس میں عبیداللہ یا ابن عباس وغیرہ کا واسطہ نہیں ہے ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں زہری سے نقل کیا ہے کہ وہ (امام زہری رح) عبدالملک کے زمانے میں شام یعنی دمشق میں ابن ناطور سے خود ملے ہیں اور اس سے یہ واقعہ سنا۔

ناطور اصل میں باغبان کو کہتے ہیں مگر عیسائیوں کے یہاں ایک منصب (عہدہ) بھی ہے جیسے بطریق، اسقف وغیرہ یہ خلافت فاروقی میں مسلمان ہوگئے تھے اور مسلمان ہونے کے بعد یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہرقل جب ایلیاء میں پہنچا تو ایک روز صبح کو بہت مکدر اور پریشان حال اٹھا الخ۔

صاحب ایلیاء وھرقل ہرقل کا عطف ایلیاء پر ہے ترجمہ ہوگا "جو ایلیاء کا حاکم اور ہرقل کا مصاحب (رازدار ساتھی) تھا- اور لفظ صاحب رفع کی صورت میں ابن ناطور کی صفت ہے یا خبر ہے مبتدا محذوف ھو کی۔

اشکال اس عبارت میں تو جمع بین الحقیقۃ والمجاز لازم آتا ہے جو جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں صرف شوافع رحمہم اللہ جائز کہتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ تو لکھتے ہیں کہ امام شافعی رح سے اس مسئلہ میں کوئی تصریح منقول نہیں بلکہ شوافع نے ان کے بعض مسائل سے اس کا استنباط کیا ہے (فیض الباری)۔

جواب: علامہ عینی رح فرماتے ہیں کہ یہاں جمع بین الحقیقۃ والمجاز نہیں ہے اس لئے کہ تقدیر عبارت یہ ہے کان ابن الناطور صاحب ایلیاء وصاحب ھرقل، مخاطب کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے اختصاراً دوسرے صاحب کو حذف کردیا گیا لہٰذا ایک ہی لفظ سے حقیقی اور مجازی معنی مراد ہیں اور صاحب ہرقل میں حقیقی معنی، صاحب کا لفظ دو جگہ ہے ایک سے مجازی دوسرے سے حقیقی معنی مراد ہیں، پھر علامہ عینی رح فرماتے ہیں کہ جمع بین الحقیقۃ والمجاز جیسی محال چیز کے ارتکاب سے حذف عبارت اولیٰ ہے (عمدہ)۔

جواب ۲:- یہاں صاحب کے معنی ایک ہی ہیں صرف نسبت کا فرق ہے صاحب کے معنی "والا" کے ہیں

اگر لفظ صاحب کی نسبت کسی ملک یا شہر کی طرف کردی جائے، تو اس کے معنی حاکم کے ہو جائیں گے اور اگر کسی انسان کیطرف اس کی نسبت کردی جائے، تو اس کے معنی ساتھی اور رفیق کے ہوں گے اردو میں اس کا ترجمہ ایلیاء اور ہرقل والا کریں گے فلا اشکال۔

سقف علی نصاری الشام اور شام کے نصاری کا پادری تھا، سقف چند طرح پڑھا گیا ہے (۱) مرفوع اس صورت میں اسم ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔
(۲) اسم ہے اور کان ابن الناطور کی خبر ہے (۳) تیسری صورت یہ ہے کہ فعل مجہول ہے اس صورت میں ترجمہ ہوگا، "شام کے نصاری کا مقتدی (پادری) بنادیا گیا۔ پھر اس میں مختلف اقوال ہیں کہ افعال سے، باب تفعیل سے، ہمزہ کے ساتھ اور بدون ہمزہ وغیرہ۔
علامہ نووی رح فرماتے ہیں کہ ہمزہ اور فاء کی تشدید زیادہ مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "ہو منصوب علی انہ خبر کان یعنی اُسقفا۔

حین قدم ایلیاء ہرقل کو جب کسریٰ کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی تو ایفار نذر کے لئے بیت المقدس پہونچا۔
فقال بعض بطارقتہ بطارقہ اور بطارق بفتح الباء جمع ہے بِطریق بکسر الباء کی فوج کا جرنیل، یہ بطریق بھی نصاریٰ کے یہاں ایک منصب اور عہدہ کے طور پر مستعمل تھا جیسے پوپ، اسقف اور کاہن۔ وکان ھرقل حزاء ینظر فی النجوم اور ہرقل کاہن تھا اور علم نجوم میں مہارت رکھتا تھا حزاء بفتح الحاء المہملہ وتشدید الزاء المعجمہ اصل میں اس کو کہتے ہیں جو قیافہ اور قرائن سے کچھ معلوم کرلیتا ہے اور اسی کو کاہن بھی کہتے ہیں۔
کہانت کبھی فطری ہوتی ہے جو قیافہ وقرائن سے کچھ معلوم کرلیتا ہے اور کبھی نجوم (ستاروں) کے ذریعہ سے اور کبھی شیاطین سے کہ شیاطین اس کے تابع ہوتے ہیں اور وہ ادھر ادھر کی خبریں بتاتے رہتے ہیں، زمانۂ جاہلیت میں ایسے لوگوں کو بالعموم کاہن کہتے تھے۔
اب اگر ینظر فی النجوم کو حزاء کی صفت قرار دیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ہرقل کی کہانت علم نجوم کے ذریعہ تھی شیاطین سے متعلق نہ تھی، اور اگر ینظر فی النجوم کو حزاء کی صفت نہ قرار دیں بلکہ خبر ثانی کہیں تو مقصد یہ ہوگا کہ ہرقل فطری طور پر کاہن تھا اور علم نجوم میں بھی مہارت رکھتا تھا

اتی ھرقل برجل ممکن ہے کہ یہ قاصد عدی بن حاتم ہوں جو اس وقت نصرانی تھے یہ ہرقل کے پاس پہنچے اس کے بعد حضرت دحیہ رض بھی پہنچ گئے، بعض روایات میں ہے کہ دحیہ اور عدی ساتھ ساتھ پہونچے تھے۔
ارسل بہ ملک غسان الخ اس ملک غسان سے مراد وہی عظیم بصریٰ ہے یعنی حارث بن ابی شمر غسانی۔
ملک الختان قد ظھر ملک بفتح المیم وکسر اللام بھی پڑھا گیا ہے اور ملک بضم المیم وسکون اللام بھی (فس) اصل ترجمہ یہ ہے کہ ملک الختان کا غلبہ ہونے والا ہے لیکن تحقیق وقوع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہرقل نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا، یا یہ کہا جائے کہ ملک الختان کے غلبہ کی ابتداء ہوچکی، اشارہ حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

نثر کتب ہرقل الی صاحب لہ سمی ضغاطر الاسقف (فس) پھر ہرقل نے رومیہ کے اپنے ایک دوست ضغاطر کو لکھا جو علم میں ہرقل کا ہم پلہ تھا، جب ہرقل کا خط ضغاطر کے پاس پہونچا تو ضغاطر اس کو پڑھکر مشرف باسلام ہو گیا لیکن قوم نے ان کو وہیں قتل کر دیا۔ فلو یرم بفتح الیار وکسر الرار حمص بکسر الحار، ابھی ہرقل حمص سے کہیں گیا بھی نہ تھا کہ اس کے دوست ضغاطر کا جواب آگیا۔

ترتیب واقعات

اس حدیث ہرقل میں کئی واقعات کی طرف اشارہ ہے اور ترتیب واقعات اس طرح ہے۔

یہ تو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہرقل کو کسریٰ کے مقابلہ میں جب غلبہ ہوا اور کامیابی ہوئی تو اپنی نذر پوری کرنے کے لئے بیت المقدس پہونچا اور اپنی نذر پوری کی، اب ہرقل کو انتہائی مسرور و دلشاش رہنا چاہئے لیکن ایک دن صبح کو ارا کین و عمائدین نے ہرقل کو پریشان خاطر اور اداس چہرہ دیکھا تو وجہ دریافت کیا اس پر ہرقل نے کہا کہ آج رات کو جب میں نے نجوم میں نظر کی تو مجھے ملک الختان کا ظہور اور غلبہ نظر آیا پھر ہرقل نے اپنے مصاحبین سے دریافت کیا کہ اس وقت ختنہ کرنے والے کون لوگ ہیں؟ مصاحبین نے اپنے علم کے مطابق بتایا کہ صرف یہود ختنہ کرتے ہیں ان سے متفکر ہونے کی کوئی بات نہیں وہ کیا کر سکتے ہیں وہ تو خود ذلیل وخوار ہیں آپ تمام قلمرو میں حکمنامہ بھیجدیجئے کہ جتنے یہود ملیں ان سب کو قتل کر دیا جائے ابھی یہ بات بطور مشورہ چل رہی تھی کہ ان ہی ایام میں ملک غسان کا قاصد ہرقل کے پاس پہنچا جس نے عرب میں نبی کے مبعوث ہونے کی اطلاع دی اور لوگوں کی موافقت و مخالفت کا حال بیان کیا، ہرقل نے مصاحبین سے کہا کہ اس قاصد کو دیکھو یہ مختون ہے یا نہیں؟ لوگوں نے مشاہدہ کے بعد بتلایا کہ یہ ختنہ شدہ ہے پھر اس قاصد سے پوچھا کہ اہل عرب بھی ختنہ کراتے ہیں؟ اس نے کہا "ہاں"، اس پر ہرقل نے کہا کہ میں نے جس کے ظہور و غلبہ کو دیکھا وہ یہی نبی ہیں۔

اسی اثنار میں حضرت دحیہ رضؓ مکتوب گرامی لیکر پہنچے اگرچہ ابن السکن کی روایت کے مطابق وہ فرستادہ (قاصد) اور حضرت دحیہ رضؓ ساتھ ہی پہونچے لیکن چونکہ فرستادہ اپنے خاص معتمد کا تھا اس لئے اولا ہرقل نے اسکو دربار میں بلایا پھر حضرت دحیہ رضؓ نے مکتوب گرامی اس کے حوالہ کیا، اس کے بعد ہرقل نے آپؐ کے ذاتی حالات کی تحقیق کے لئے عرب کے قافلہ کی جستجو کا حکم دیا تو بیت المقدس کے قریب ہی ایک مقام غزہ میں حضرت ابوسفیان کی امارت میں تیس۳۰ شتر سوار تاجران مکہ معظمہ کا قافلہ موجود تھا ان کو بلا کر ہرقل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دس۱۰ سوالات کئے، جن کے جوابات حضرت ابوسفیانؓ نے دئے، پھر ہرقل نے اپنا عندیہ ظاہر کیا جس پر قوم ناراض ہو گئی، اور شور وشغب ہونے لگا تو ہرقل نے معاملہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اس وقت معاملہ کو ملتوی رکھا اور ہرقل نے رومیہ کے عالم ضغاطر کے پاس مکتوب گرامی اور حالات کو لکھا تاکہ اس کی رائے معلوم ہو جائے اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ سب واقعات بیت المقدس میں ہوئے۔

اور ضغاطر کے پاس خط لکھنے کے بعد ہرقل حمص کی جانب روانہ ہوگیا، حمص پہنچنے کے بعد ضغاطر کا جواب آگیا جس میں ہرقل کی پوری تائید تھی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق بھی۔

ضغاطر کی موافقت اور تائید سے ہرقل کو ہمت ہوئی اور امید ہوگئی کہ شاید اب لوگ مان جائیں اور آپؐ کی رسالت کو تسلیم کرلیں کیونکہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ کہہ رہا ہے اور دین کا سب سے بڑا عالم (ضغاطر) بھی کہہ رہا ہے تو اس امید پر ہرقل نے ملک کے بڑے بڑے لوگوں کو اپنے محل میں بلواکر صاف صاف دعوت دی البتہ ہرقل کو بیت المقدس میں اپنے خیال سے لوگوں کے تنفر وہیجان کا تجربہ ہوچکا تھا اس لئے حمص میں اس نے ایک عظیم شاہی محل میں عظماء روم کو جمع کیا اور چاروں طرف سے باہر نکلنے کے دروازے بندکرادیئے اور خود بالاخانہ کے اوپر جاکر اس کے دروازے بھی بندکرادیئے تاکہ کوئی اس پر دست درازی نہ کرسکے اور نہ ہی باہر نکل کر عوام میں کوئی فتنہ پیدا کرسکیں اور ان کے غیظ وغضب کو حکمت عملی سے یہیں ختم کردیا جائے، ان تمام انتظامات کے بعد اس نے بالاخانے کے اوپر سے جھانک کر دعوت دی اور تقریر کی یا معشر الروم ہل لکم فی الفلاح الخ مگر سب نے مخالفت کی اور کہنے لگے کہ دیکھو یہ ہم سب کو عرب کا غلام بنانا چاہتا ہے۔ پھر ملک اور حکومت کی لالچ میں ہرقل کا رویہ بھی بدل گیا اور اسلام وایمان سے محروم رہ گیا، واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم

مطابقۃ الحدیث للترجمۃ

علامہ قسطلانی رحمہ فرماتے ہیں ووجہ مناسبۃ ذکر ھذا الحدیث فی ھذا الباب الخ (قس)

خلاصہ یہ ہے کہ ترجمۃ الباب بدء الوحی کی کیفیت کا ہے امام بخاری رحمہ نے بدء الوحی کے آخری حدیث میں موحیٰ الیہ کے اوصاف جمیلہ وتعلیمات عالیہ کو بطور تکملہ بیان کردیا۔

(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث ہرقل کا تعلق وحی کے ابتدائی کے ابتدائی زمانہ سے ہے کہ آغاز وحی یعنی ابتداء نبوت میں کن کن حالات کا سامنا ہوا اور کن کن منازل سے گذرنا پڑا یہاں تک کہ اپنے اوطان سے نکالے گئے، ان تمام مصائب کے باوجود حق پر قائم رہے، تو حدیث ہرقل میں ان احوال کا نقشہ کھینچا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ بدء الوحی سے ابتداء آنی مراد نہیں بلکہ ابتداء زمانی ممتد مراد ہے۔

(۳) حضرت شیخ الہند رحمہ کے نزدیک چونکہ باب کی غرض وحی کی عظمت وعصمت کو بیان کرنا ہے جس کی تفصیل ترجمۃ الباب کی شرح میں گذرچکی ہے اور حدیث ہرقل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف عالیہ کو بیان کیا گیا ہے، ایک کٹر دشمن اسلام آپؐ کی ایسی جامع تعریف بیان کی جو قول وعمل ہر قسم کے فضائل پر مشتمل ہے، نیز تعلق مع اللہ، تعلق مع خلق اللہ اور تہذیب نفس اعلیٰ تعلیمات کو جامع ہے۔

پھر اہل کتاب کے مسلّم عالم ہرقل کی تائید بھی اسی روایت سے ہوتی ہے، ان بیانات سے آپؐ کی عظمت بخوبی معلوم ہوتی ہے اور موحیٰ الیہ کی عظمت سے وحی کی عظمت خود ثابت ہے۔

(۴) حضرت شیخ الحدیث رحمہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ نے ترجمہ یوں منعقد فرمایا ہے کیف کان بدء الوحی

الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقول اللہ عزوجل انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ» اور حدیث ہرقل میں مکتوب گرامی کی آیت ہے یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم۔ پس مناسبت ظاہر ہے کہ مکتوب گرامی سے آپؐ نے الکلمۃ السواء کی دعوت دی تھی اور یہ الکلمۃ السواء یعنی کلمۂ توحید تمام انبیاء علیہم السلام کی بنیادی دعوت ہے (تقریر بخاری حضرت شیخ رح)

براعۃ الاختتام

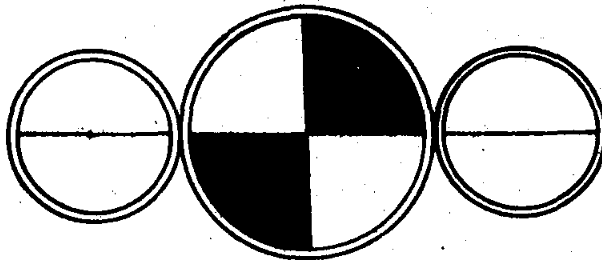
حافظ عسقلانی رح فرماتے ہیں ویوخذ للمصنف من آخر لفظ فی القصۃ براعۃ الاختتام وھو واضح مما قررنا (فتح الباری مطبوعہ بیروت جلد ۱ ص ۳۸)

خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاری رح کے اصول موضوعہ میں سے یہ بھی ہے کہ ہر کتاب کے خاتمہ پر ایسی روایت ضرور لاتے ہیں جس سے اس کتاب کے ختم کی طرف اشارہ ہو، چنانچہ حافظ نے ہر کتاب کے ختم پر ایسا لفظ بتلا دیا کہ اس سے اختتام کتاب کی جانب اشارہ ہے چنانچہ اس مقام پر بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فکان ذلک آخر شان ھرقل» سے باب بدء الوحی» کے اختتام کی جانب اشارہ فرمایا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ بخاری شریف میں جس طرح بہت سے دقائق ونکات ہیں اسی طرح ہر کتاب کے خاتمہ پر کوئی ایسی روایت یا ایسا جملہ لاتے ہیں جس سے انسان کے خاتمہ اور موت کی جانب اشارہ مقصود ہوتا ہے۔

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے

بہر حال اپنی جگہ پر ہر دو قول درست اور قیمتی ہے اور کوئی تضاد نہیں ہے ممکن ہے کہ دونوں داخل مقصود ہوں۔ واللہ اعلم



کِتَابُ الْاِیْمَانِ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام بخاری رحمہ نے جتنا بسم اللہ کا اہتمام کیا اتنا کسی محدث نے نہیں کیا، ہر کتاب کی ابتدا میں بسم اللہ ضرور تحریر فرماتے ہیں۔ پھر پوری بخاری شریف میں کتاب سے پہلے یا بعد میں بسم اللہ کی کتابت کے بارے میں روایات مختلف ہیں کہیں کتاب سے قبل بسم اللہ ہے جیساکہ ابتدا ہی میں ہے اور اس کے علاوہ دیگر ابواب و کتب میں بھی۔ اور کسی مقام پر کتاب پہلے ہے بسم اللہ بعد میں۔ دونوں کی صحیح توجیہ ہوسکتی ہے۔

اگر کتاب سے پہلے بسم اللہ ہے کما فی اکثر کتب ھٰذا الجامع (ارشاد الساری جلد اول) تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہر کتاب گویا مستقل رسالہ ہے اور ابتدا بالتسمیہ کی بہت تاکید ہے۔

لہٰذا تمسک بالسنۃ کے اہتمام اور تبرک کے لئے بسم اللہ کو مقدم فرماتے ہیں، اور جس مقام پر کتاب مقدم ہے اور بسم اللہ مؤخر اس کی توجیہ یہ ہے کہ کتاب اللہ میں جس طرح پہلے سورتوں کے نام ہوتے ہیں پھر بسم اللہ اس کے بعد اس سورۃ کی آیتیں: اسی طرح کتاب و ترجمہ بمنزلہ اسماء سور کے ہیں اس کے بعد تسمیہ ہے بعض مقامات پر ایک ہی جگہ تقدیم بھی ہے تاخیر بھی۔ جیساکہ کتاب الایمان کی ابتدا ہی میں اکثر روایات (نسخے) میں کتاب مقدم ہے اور تسمیہ مؤخر (جیسے ہمارے ہندوستانی نسخے) بعض نسخوں (جیسے عمدۃ القاری و ارشاد الساری وغیرہ) میں اس کے برعکس ہے اس کی وجہ اختلاف نسخ ہے کہ کسی نسخہ میں کتاب سے پہلے ہے اور کسی میں بعد میں ولکل وجہ کما مر۔

بسم اللہ کے مؤخر ہونے کی ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کتاب الایمان کی سرخی لکھدی ہو کہ آئندہ اس کے متعلق لکھنا ہے، کسی وجہ سے وقفہ ہوگیا پھر تالیف شروع کی تو بسم اللہ لکھی کما قیل۔ اور بعض مقامات پر ایسا بھی ہو کہ درمیان کتاب میں بسم اللہ ہے اس کی وجہ مشائخ سے یہ منقول ہے کہ کتاب لکھتے لکھتے کسی مرض یا کسی عذر کی وجہ سے کتابت موقوف ہو جاتی پھر جب شروع فرماتے تو بسم اللہ تحریر فرمادیتے، واللہ اعلم (امداد الباری ص ۲۵۱/۴)

قولہ کتاب الایمان ای ہذا کتاب الایمان فیکون ارتفاع الکتاب علی انہ خبر مبتدأ محذوف ویجوز العکس، ویجوز نصبہ علی ہاک کتاب الایمان او خذہ (عمدہ ص ۱۰۱/۱)۔

کتاب اور باب کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی باب بدء الوحی میں گذر چکے۔

ربط ما قبل ولما فرغ المؤلف رح من باب الوحی الذی ہو کالمقدمۃ لہذا الکتاب الجامع شرع بذکر المقاصد الدینیۃ وبدء منہا بالایمان الخ (ارشاد الساری) علامہ قسطلانی رح فرماتے ہیں کہ جب مؤلف کتاب امام بخاری رح باب وحی سے فارغ ہوئے جو اس کتاب جامع کے مقدمہ کے درجہ میں ہے تو ابواب مقاصد دینیہ

کا بیان شروع فرما رہے ہیں اور اصحاب جوامع یعنی جو محدثین اپنی کتاب کے اندر حدیث کے انواع ثمانیہ کو ذکر کرتے ہیں ان کا طریقہ ہے کہ اپنی کتاب کو کتاب الایمان سے ابتدا کرتے ہیں چونکہ مکلف پر سب سے پہلے ایمان ہی فرض ہے، سارے اعمال وعبادات کا دارومدار ایمان پر ہے، حیات جاودانی ونجات اخروی ایمان ہی پر موقوف ہے، ایمان وعقیدہ بنیاد ہے اور اعمال اس کی شاخیں ہیں، ایمان بمنزلہ روح کے ہے اور اعمال اس کا بدن، ایمان حقیقت ہے اور اسلام اس کی صورت. اس لئے مقدمہ سے فراغت کے بعد کتاب الایمان سے شروع فرمایا۔

اقسام فرق اسلامیہ

دنیا میں جتنے فرقے ہیں ان میں سے فرق اسلامیہ ان کو کہا جاتا ہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں اور اپنے آپ کو مومن ومسلمان سمجھتے اور کہتے ہیں خواہ وہ اسلام کے صحیح راستے پر ہوں یا گمراہ ہوں، مثلاً روافض، خوارج، معتزلہ، مرجیہ، کرامیہ اور جہمیہ وغیرہ، یہ سب اپنے کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر سب کے سب علی التشکیک فرق ضالہ وگمراہ ہیں۔

اہل سنت والجماعت کی وجہ تسمیہ

صحیح اسلامی فرقہ اہل سنت والجماعت ہے یعنی جو سنت نبوی اور جماعت صحابہ کا پیرو ہے، یہ لقب ماخوذ ہے بلکہ ہو بہو ترجمہ ہے حدیث پاک کے اس جملہ کا جو فرقہ ناجیہ کے بارے میں ارشاد نبوی ہے ما انا علیہ واصحابی (ترمذی) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق پر میں ہوں اور میرے صحابہ کی جماعت ہے وہی اہل نجات کا طریقہ ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید (مشکوٰۃ ص۳۰) حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے بگڑنے کے وقت جس شخص نے میری سنت کو دلیل بنایا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملیگا۔

ظاہر ہے کہ متمسکین بالسنۃ اہل سنت ہی ہیں، مذکورہ دونوں روایتوں کو ملانے سے اہل سنت والجماعت کا لقب ثابت ہوجاتا ہے بلکہ صرف پہلی روایت اس کے لئے کافی ہے

طبقات اہل سنت والجماعت

پھر خود اہل سنت والجماعت میں ہی چار گروہ ہیں چاروں صحیح اسلام پر ہیں اور ناجی ہیں سب کا اصل مقصود ومدّعا ایک ہی ہے فقط طریقہ استدلال میں کسی پر کوئی طریقہ غالب ہے محض اسی اعتبار سے چار فرقے ہوگئے۔

(۱) محدثین جو حضرت امام احمد رحؒ کے متبع ہیں عقائد میں یعنی امام احمد بن حنبل رحؒ سے جو کچھ اقوال عقائد میں منقول ہیں ان کی نشر وتشریح کرتے ہیں۔

(۲) متکلمین۔ ان میں پھر دو جماعتیں ہیں ۱ اشاعرہ یہ لوگ عموماً وبیشتر امام مالک رحؒ اور امام شافعی رحؒ سے منقول شدہ عقائد کی تائید وتفصیل کرتے ہیں ۲ ماتریدیہ۔

اشاعرہ وماتریدیہ میں اختلاف قلیل ہے۔ اشاعرہ کے مقتدا امام ابوالحسن اشعری رحؒ ہیں اور ماتریدیہ کے مقتدا ابوالمنصور

ماتریدی رح ہیں۔ یہ دونوں امام ایک ہی زمانہ کے ہیں اور یہ دونوں امام طحاوی رح کے معاصر ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری رح پہلے معتزلی تھے سالہاسال تک ابوعلی جبائی جو بہت بڑا معتزلی تھا اس کے پاس رہے، امام ابوالحسن رح معتزلہ کی طرف سے بہت بڑے مناظر رہے، گویا اہل سنت والجماعت پر معتزلہ کی طرف سے ایک تلوار تھی مگر بعد میں قدرت الٰہی نے اسی تلوار کو پلٹ کر معتزلہ ہی کی گردن پر رکھا ان کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ یہ پورے رمضان کے اعتکاف کا ارادہ کر کے معتکف ہوئے۔

عشرۂ اولیٰ میں ایک رات خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا "ابوالحسن دین کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جا" صبح کو اٹھے تو انہوں نے اس کا زیادہ اہتمام نہ کیا ان کے نزدیک چونکہ عقائد معتزلہ ہی صحیح دین تھا اس لئے خیال کیا کہ میں تو ان کی طرف سے بہت زیادہ مناظرہ و حمایت کرتا رہتا ہوں۔ پھر دوبارہ عشرۂ ثانیہ میں بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اب دل میں تشویش تو ضرور ہوئی مگر خواب کا مطلب کچھ ٹھیک نہیں سمجھ سکے کیونکہ ان کے نزدیک تو عقائد معتزلہ ہی اصل دین تھا، پھر سہ بارہ عشرۂ اخیرہ میں خواب دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں نے تم سے کہا کہ دین کی حمایت کیلئے کھڑے ہو جا لیکن تم ابتک تیار نہ ہوئے، تو خواب ہی میں ابوالحسن اشعری رح نے درخواست کی کہ حضور میں تو نہیں جانتا آپ ہی بتا دیجئے کہ میرے عقائد میں کیا کیا غلطیاں ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری ہدایت کا خود تکفل کرلیا ہے تو میں یہاں سے نہ ہٹتا یہانتک کہ تیری غلطیاں ایک ایک کر کے کھول کر بیان کر دیتا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی تکفل کرلیا ہے اس لئے ضرورت نہیں، چنانچہ جب صبح کو اٹھے تو تمام عقائد اہل سنت والجماعت میں ان کو شرح صدر تھا اور مفاسد معتزلہ ان پر منکشف ہو چکے تھے، جمعہ کا دن تھا جامع مسجد میں کھڑے ہو کر مجمع کے اندر معتزلہ کے تمام خیالات فاسدہ کو ظاہر کر کے اس سے تائب ہوئے، پھر تو اہل سنت والجماعت کے وہ امام بنے جو اظہر من الشمس ہے۔

(۴) صوفیہ: اہل سنت والجماعت کا چوتھا گروہ صوفیہ کا ہے۔

محدثین پر محض نقل و سماع غالب ہے وہ مسائل کو اولاً سمعیات سے ثابت کرتے ہیں، متکلمین خواہ اشاعرہ ہوں یا ماتریدیہ سمعیات و عقلیات دونوں پر مسائل کا مدار رکھتے ہیں اور دونوں سے استدلال کرتے ہیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل سے کوئی نئی بات ثابت کرتے ہیں بلکہ قرآن و حدیث سے ثابت شدہ عقیدوں کو عقلی دلائل سے ثابت کرنا اور شبہات عقلیہ کا جواب دینا ان کا اہم مقصود ہے اور عقل و نقل میں توافق کر کے دونوں سے مسئلہ ثابت کرتے ہیں (ماخوذ از فضل الباری علامہ عثمانی رح)۔

ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اس میں فرق اسلامیہ بلکہ اہل سنت والجماعت کے اندر بھی بظاہر اختلاف نظر آتا ہے اس لئے کچھ تفصیل ضروری ہے۔

ایمان کے لغوی معنی

ایمان امن سے ماخوذ ہے جو خوف کی ضد ہے، امن کے معنی ہیں سکون و اطمینان۔

خوف میں قلق و اضطراب ہوتا ہے اور امن نام ہے زوالِ خوف اور حصولِ طمانیت کا، قرآن مجید میں ہے وَلَيُبَدِّلَنَّهُم من بعد خوفهم امنا (نور) اللہ تعالیٰ ضرور تبدیل فرمادیں گے ان کے خوف کو امن سے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ امن ضد خوف ہے تو امن نام ہوا زوالِ خوف اور مطمئن ہو جانے کا، ارشادِ نبوی ہے المؤمن من امنه الناس على دمائهم واموالهم (ترمذی)۔

اور امن ثلاثی مجرد سے لازم ہے جب اس کو باب افعال میں لاکر ایمان بنایا تو ہمزہ افعال نے اس کو متعدی کر دیا اور اس کے معنی ہوئے مامون و بے خوف کر دینا، تو ایمان لانے کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ مومن (ایمان لانے والا) مومن بہٖ (جس پر ایمان لایا ہے)، کو اپنی تکذیب سے مامون اور مطمئن کر دیتا ہے تو لامحالہ اب لازم ہے کہ اس کی تصدیق کرے اور مان لے ، اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ایمان کے دونوں معنی حقیقی ہیں یعنی واضع نے لفظ ایمان کو پہلے کسی چیز سے امن دینے کے معنی میں وضع کیا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی تصدیق کرتا ہے تو اس کو تکذیب و مخالفت سے امن دے دیتا ہے، علامہ انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ کی تحقیق یہی ہے فرماتے ہیں "کا المعنيين اللغويين معنيان حقيقيان للفظ الايمان وضع اولا لجعل الشيء آمنا من امر ثم وضع ثانيا لمعنى يناسبه وهو التصديق فانك اذا صدقت المخبر فقد امنته من تكن يبك اياه (فیض الباری ج اول ص۴۵) خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کے لغوی معنی ہیں تصدیق کرنے اور مان لینے کے کما فی القرآن الحکیم وما انت بمؤمن لنا ولو كنا صٰدقين (یوسف) اور آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی ہوں "۔

سب کا خلاصہ یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ایمان علم و معرفت، جاننے پہچاننے کا نام نہیں بلکہ ایمان تصدیق قلبی یعنی ماننے اور قبول کرنے کا نام ہے۔

ایمان کے شرعی معنی

شریعت مطہرہ کی اصطلاح میں ہر تصدیق کا نام ایمان نہیں چنانچہ السماء فوقنا والارض تحتنا کی تصدیق کو ایمان نہیں کہا جائے گا۔

اصطلاح شریعت میں ایمان نام ہے تصديق الرسول عليه السلام فی کل ما علم مجيئه به بالضرورة تصديقا جازما الخ (عمدۃ القاری ج ا ص۱۰۲) یعنی ایمان ان تمام اشیاء کی تصدیق اور مان لینے کا نام ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لیکر آئے ہیں، مختصر یہ کہ تمام ضروریاتِ دین کے ماننے کو شریعت میں ایمان کہتے ہیں۔

علامہ عثمانی رح فرماتے ہیں " واما فی الشرع فهو التصديق بما علم مجيء النبي صلی اللہ علیہ وسلم به ضرورة تفصيلاً فيما علم تفصيلا واجمالا فيما علم اجمالا وهذا مذهب جمهور المحققين (فتح الملہم ج ا ص۱۵۲) یعنی جن چیزوں کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لانے کا واضح طور پر علم ہو جائے، تو تفصیلی چیزوں کی تفصیل کے ساتھ اور اجمالی چیزوں کی اجمالاً تصدیق کرنے کو ایمان کہتے ہیں یعنی سچا قرار دینا اور سچا ماننا ایمان ہے صرف سچا جاننا ایمان نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض چیزیں تفصیل سے منقول ہیں جیسے نماز روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ اسلام کے ایسے احکام ہیں کہ ان احکام کا ثبوت حضور اقدس ص سے حد تواتر اور علم ضروری کے مرتبہ تک پہنچ چکا ہے

کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرنے والا کافر ہے۔

اور بعض چیزیں اجمالاً منقول ہیں جیسے قیامت آنے والی ہے لیکن اس کے وقت معین کی تعلیم نہیں دی گئی، جیسا کہ حدیث جبرئیل اور بہت سی آیات سے ظاہر ہے، اسی طرح عذاب قبر کہ اس کا ثبوت بھی تواتر سے ثابت ہے مگر اجمالاً اتنا ثابت ہے کہ عذاب قبر ہوگا، کس کیفیت سے ہوگا؟ اس کی تفصیل حضور صلعم سے ثابت نہیں تو اب اجمالاً اتنی بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ عذاب قبر مستحقین کیلئے ہوگا کیفیات کی تفصیل کہ عذاب صرف جسم یا صرف روح یا دونوں کو ہوگا ایمان لانا ضروری نہیں۔

اور بعض امور ایسے ہیں جہاں کچھ تفصیل بھی ہے اور اجمال بھی، وہاں تفصیل پر تفصیلاً، اجمال پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہوگا مثلاً جملہ انبیاء کی نبوت وحقانیت پر ایمان لانا فرض ہے بعض انبیاء کی تفصیل نام بنام آئی ہے اور کچھ انبیاء ایسے بھی ہیں جن کا تفصیلی ذکر نہیں آیا فقط اتنا بتلا دیا گیا کہ اور بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں چنانچہ ارشادِ ربانی ہے۔

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن) — بعض ان پیغمبروں میں سے وہ ہیں جن کے حالات ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعضے وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

تو جن کے نام کی تفصیل آئی ہے مثلاً آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ ان پر نام بنام تفصیلاً ایمان لایا جائے گا اور جن کی تفصیل نہیں آئی اُن پر اجمالاً کہ جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے سب پر اجمالاً ایمان لاتا ہوں۔ علیٰ ہذا القیاس کتب سماویہ کی تفصیل معلوم نہیں لیکن قرآن مجید، توریت، انجیل و زبور کا کتب سماویہ ہونا قرآن سے معلوم ہے پس ان کتابوں میں سے ہر ایک پر اور باقی کتبِ سماویہ پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے، آمنت باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ۔

امام الحرمین وعلامہ ابن ہمام رح

امام الحرمین فرماتے ہیں کہ تصدیق علوم ومعارف کے قبیل سے نہیں بلکہ یہ کلام نفسی ہے یعنی کسی چیز کو سمجھ لینے کے بعد عقل کا اس پر جھک جانا اور قبول کر لینا۔

علامہ ابن ہمام رح نے سب سے بہترین الفاظ میں بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق ومعرفت کے ساتھ استسلام قلبی اور انقیاد باطنی کا یعنی دوسرے کے ہاتھ میں اپنی باگ دیدینا، جدھر وہ کھینچے ادھر کھنچے جانا جیسا کہ گھوڑا وغیرہ۔

یعنی مومن وہی ہے جو رسول کو جان لینے کے بعد ظاہراً و باطناً ان کے سامنے منقاد ہو جائے اور اتباع کی رسی اپنی گردن میں ڈال لے اور اپنے اوپر اتباع لازم کرلے کہ رسول صلعم جدھر چلائے گا ادھر ہی چلوں گا۔ یہی انقیاد باطنی ہے جس کو علامہ ابن تیمیہ نے التزام طاعت اور بعض بزرگوں نے التزام شریعت سے تعبیر کیا ہے۔

خلاصۃ المذاہب فی حقیقۃ الایمان

ایمان کی حقیقت میں اقوال مختلف ہیں، اعمال حقیقت ایمان میں داخل ہیں یا نہیں؟

علامہ عینی رح نے عمدۃ القاری شرح بخاری جلد اول صـ۱۰۲ میں واضح طور پر تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان مرکب (ذواجزاء) ہے یا بسیط؟ پھر جو لوگ بسیط مانتے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے، اسی طرح

جو لوگ مرکب مانتے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے کہ اس کے اجزاء اجزاء مقولہ ہیں یا اجزاء فرعیہ تزئینیہ ہیں ؟
اجزاء مقولہ ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کے وجود پر کل کا وجود موقوف ہو اور ان کے فوت ہو جانے سے کل فوت ہو جاتا ہو۔ اور اجزاء فرعیہ تزئینیہ مکملہ کے فوت ہو جانے سے کمال و زینت ختم ہو جاتی ہے کل ختم نہیں ہوتا۔ پھر جو لوگ اجزائے مقولہ مانتے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے آیا عمل کے فوت ہو جانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے یا نہیں ؟ یعنی بین بین رہتا ہے۔
یہ اقوال مختلفہ کا اجمالی خلاصہ ہے لیکن ہم یہاں صرف مشہور اقوال و مذاہب بیان کریں گے۔

اہل قبلہ کے مشہور اقوال

اہل قبلہ کے مشہور اقوال پانچ ہیں:
(۱) پہلا قول امام اعظم ابو حنیفہ رح اور اکثر فقہاء کرام و متکلمین عظام کا ہے کہ ایمان بسیط ہے جس کی حقیقت تصدیق قلبی ہے اور اقرار باللسان شرط ہے اجراء احکام کے لئے اور اعمال ضروری دلابدی ہیں کمال ایمان کے لئے، یہی قول عند المحققین راجح ہے

دلائل

قرآن حکیم میں حنفیہ کیلئے پانچ قسم کے دلائل ملتے ہیں،۔ نوع اول وہ آیات جن میں عمل کو عطف کیا گیا ہے ایمان پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل مغایر ہے ایمان کے کیونکہ عطف کا اصل مغایرت بین المعطوف والمعطوف علیہ ہے اس کا خلاف خلاف اصل ہے جس کیلئے خارجی قرائن و دلائل کی ضرورت ہے نیز اگر عمل ایمان میں داخل تھا تو دوبارہ ذکر کرنا تکرار ہے جیساکہ قرآن حکیم میں ہے انّ الّذینَ آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت (البینہ) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے۔

اس قسم کی صدہا آیتیں ہیں۔
نوع ثانی وہ آیات ہیں جن میں اعمال کیلئے ایمان کو شرط قرار دیا گیا جیساکہ قرآن حکیم میں ہے،۔
وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤْمِنٌ　اور جو نیکی کے کام کرے اور وہ مومن ہے۔
اور شرط و مشروط میں مغایرت ہوتی ہے، قاعدہ ہے شرط الشیئ خارج الشیئ۔
نوع ثالث وہ آیات جن میں آمنوا سے خطاب کرکے توبہ کا امر کیا ہے جیساکہ قرآن مجید میں ہے،۔
یا ایّھا الّذینَ آمنوا توبوا الی اللّٰہ توبۃً نّصوحًا (التحریم)　کیونکہ توبہ معصیت سے ہوتی ہے اگر عمل جزو ایمان ہے تو ایمان ضد ہے معصیت کی اور اس خطاب سے صحۃ اجتماع الایمان مع المعصیۃ معلوم ہوتی ہے حالانکہ الشیئ لا یجمع مع ضدہ۔
نوع رابع وہ آیتیں جن میں مرتکب معصیت پر مؤمن کا لفظ اطلاق کیا جیساکہ قرآن کریم میں ہے،۔
وان طائفتانِ مِنَ المؤمنینَ اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا الّتی تبغی حتّی تفیئَ الیٰ امر اللّٰہ (حجرات)　اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کرا دو پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے۔
معلوم ہوا کہ باغی اللہ کے امر سے باہر تھا اس کے باوجود اس کو مومن کہا گیا۔
نوع خامس وہ آیات ہیں جن میں محل ایمان قلب کو کہا گیا، اور ایمان کو قلب کی طرف منسوب کیا گیا جیساکہ قرآن میں ہے،۔

اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان (مجادلہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان لکھ دیا گیا۔
ایک دوسری جگہ ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی گئی ہے۔
من الذین قالوا اٰمنا بافواھھم لوگوں میں بعض وہ ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں حالانکہ ان
ولم تؤمن قلوبھم (المائدہ) کے دل مسلمان نہیں ہوئے۔
اس کے بعد حدیث سے بھی دلائل ملتے ہیں خصوصًا وہ احادیث جن میں اس قسم کا مضمون ہے کہ یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان، جن سے قلب کا محل ایمان ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

حدیث اور دلائل قرآنیہ کے نوع خاص سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایمان محض تصدیق ہے اقرار باللسان بھی ایمان کا جز نہیں ہے۔

جواب: یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رح کا ایک قول تو ایسا ہی ہے کہ اقرار شطر ایمان (ایمان کا جز) نہیں ہے۔ اور جز ایمان قرار دینے کی تقدیر پر یہ کہا جائے گا کہ چونکہ ایمان میں اصل جز تصدیق ہی ہے اقرار اسی کا اظہار و اعلان ہو بغیر تصدیق کے اقرار لاشئ محض ہے، تصدیق رکن اصلی ہے جو کسی حال میں بھی محتمل السقوط نہیں ہے، اقرار رکن زائد ہے عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے اس لئے جز اصلی کے لحاظ سے ایمان کی نسبت قلب ہی کی طرف کر دی ہے، اقرار کے حق میں تو یہ تاویل کی جائیگی جبکہ اقرار کی جزئیت دلائل سے ثابت ہو جائے اب جو نصوص بظاہر اس کے خلاف آئیں گی ان میں لا محالہ تاویل کی جائے گی مگر عمل کے حق میں یہ تاویل نہیں کی جائیگی کیونکہ عمل کی جزئیت ابتک ثابت نہیں ہوئی تاکہ نصوص کو اس کے لئے ظاہر سے پھیرا جائے، فیہ ما فیہ واللہ اعلم۔

(۲) دوسرا قول ائمہ ثلاث رح اور امام بخاری رح اور اکثر محدثین رح کا ہے کہ ایمان مرکب ہے تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور اعمال بالارکان سے لیکن سب کی رکنیت و جزئیت یکساں نہیں ہے، تصدیق بالجنان اصل اصول ہے اور اقرار و اعمال اجزاء مکملہ ہیں نہ کہ اجزاء مقولہ۔ اس تفصیل سے صاف معلوم ہو گیا کہ احناف اور ائمہ ثلاث میں کوئی اختلاف نہیں ہے تفصیل آرہی ہے۔

(۳) تیسرا قول مرجیہ، کرامیہ اور جہمیہ کا ہے کہ ایمان بسیط محض ہے۔ پھر اس قائلین بساطت کے تین گروہ ہو گئے۔

۱۔ مرجیہ کہتا ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق قلبی ہے اقرار لسانی اور اعمال ایمان کا نہ رکن ہے نہ شرط، نہ اجزاء مقومہ ہیں نہ اجزاء مکملہ بلکہ اعمال ایمان سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ بدعملی سے نہ ایمان کی رونق میں کچھ فرق آتا ہے اور نہ ہی نجات اخروی میں مخل ہو گی یعنی بدون سزا جنت میں جائے گا۔

۲۔ دوسرا گروہ جہمیہ ہے جو کہتا ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف معرفت قلب ہے تصدیق و یقین بھی ضروری نہیں۔

۳۔ تیسرا گروہ کرامیہ ہے اس کے نزدیک ایمان کی حقیقت صرف اقرار باللسان ہے بشرطیکہ دل میں انکار نہ ہو۔

بہر حال ان تینوں کے نزدیک ایمان بسیط محض ہے اب جس کے اندر ایمان کی حقیقت بسیط موجود ہے اس کیلئے اعمال سیئہ مضر نہیں، دلیل میں یہ لوگ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں وان زنی وان سرق الخ (مسلم جلد اول صفحہ ۱۶۲)

اور من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ لیکن ان نادانوں نے من یقتل مومنا متعمدا فجزاءہ جہنم۔ اور من یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ۔ اور لا یدخل الجنۃ قتات اور لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن الخ وغیرہ آیات واحادیث کی طرف دیکھا ہی نہیں اس لئے کہدیا کہ ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت مضر نہیں۔

(۴) چوتھا قول خوارج کا ہے کہ ایمان مرکب ہے تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور اعمال بالارکان سے۔ یعنی اعمال ایمان کے ارکان واجزائے مقومہ ہیں پس اعمال کا تارک اسلام سے خارج اور کافر ہوگا۔

دلیل میں یہ لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن الحدیث (مسلم ج اول ص۵۶)

(۵) پانچواں قول معتزلہ کا ہے کہ ایمان مرکب ہے تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور اعمال بالارکان سے۔ یعنی اقرار و اعمال ایمان کے اجزائے مقومہ ہیں اس لئے تارک اعمال اسلام سے خارج ہوگا لیکن کافر نہیں ہوگا چونکہ ایمان کا ایک جزء تصدیق قلبی موجود ہے۔

ان دونوں (خوارج و معتزلہ) میں فرق یہ ہے کہ خوارج ایمان و کفر کے درمیان کسی واسطہ کے قائل نہیں ہیں، اور معتزلہ واسطہ کے قائل ہیں اس لئے معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ یا تارک اعمال نہ مومن ہے نہ کافر، اگر بلا توبہ مرگیا تو مخلّد فی النار یعنی ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

دلائل

اخیر کے تینوں اقوال (تیسرا، چوتھا اور پانچواں) فرق باطلہ کے ہیں جو کتاب و سنت سے غلط اور مردود ہیں۔ تیسرا قول بساطت محضہ مرجیہ، کرامیہ، جہمیہ کا مذہب ہے کہ اعمال کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے ایمان کے بعد نماز، روزہ کے ترک سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور سیئات و معاصی کی وجہ سے ایک لمحہ کیلئے بھی وہ دوزخ میں نہیں جائیگا، جس طرح کہ ایک کافر عمر بھر کے تمام حسنات کرلینے سے کبھی ایک لمحہ کے لئے جنت میں نہیں داخل ہوسکتا، بالاتفاق جنت اس پر حرام ہے، اسی طرح گناہوں میں غرق ہونے والے مومن پر بھی دوزخ بالکل حرام ہے۔ جیسا کہ کفر کے ساتھ کوئی طاعت فائدہ مند نہیں، ایسا ہی ایمان کے ساتھ کوئی معصیت نقصان دہ نہیں۔ وھو مذہب باطل و قول مردود بالکتاب والسنۃ۔

کتاب اللہ نے حضرت موسیٰ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو تبلیغ کی تو فرعون کہنے لگا "اے موسیٰ میرے خیال میں تجھ پر جادو کر دیا گیا ہے"، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا "لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنزَلَ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ" (بنی اسرائیل)

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صرف قلبی علم ایمان نہیں۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (نمل)

(انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان آیات (معجزات) کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا)

اس سے اور مزید وضاحت ہوگئی کہ صرف تصدیق قلبی (یعنی علم و ادراک) میں ایمان نہیں ہے بلکہ علم و ادراک کے بعد

از حالی کیفیت پیدا ہونا (دل کا قبول کرنا) ضروری ہے جو لواحق ادراک ہے جس کو اردو میں ماننا اور فارسی میں گردیدن سے تعبیر کیا جاتا ہے اس یقین کے بغیر مومن نہیں کافر ہے۔

اسی طرح کرامیہ کا قول بھی مردود اور باطل ہے اسلئے کہ آیات ربانی اور ارشادات نبوی سے قطعی ثابت ہے کہ محل ایمان قلب ہے قال اللہ تعالیٰ اولئک کتب فی قلوبھم الایمان (مجادلہ، ۲۸) من الذین قالوا اٰمنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم (مائدہ) نیز ایمان کی حقیقت صرف اقرار باللسان کی صورت میں تو عبداللہ بن ابی وغیرہ منافقین کا مومن ہونا لازم آئے گا۔

تنبیہ کرامیہ کے متعلق علی العموم اور مشہور یہی ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف اقرار باللسان ہے اور یہی نجات کیلئے کافی ہے، حافظ عسقلانی رحمہ نے بھی نقل کیا ہے کہ والکرامیۃ القائلون بان الایمان قول باللسان فقط وان اعتقد الکفر بقلبہ (فتح ص ۲۹۲/۱۳) ممکن ہے کہ بعض کرامیہ کا یہ قول ہو لیکن تحقیق یہ ہے کہ کرامیہ اس بات کے قائل ہیں کہ دنیوی احکام میں ایمان کی حقیقت محض اقرار ہے یعنی جس میں اقرار پایا جائیگا ہم اس پر مومن کے احکام جاری کریں گے اب اگر اس اقرار کے مطابق دل میں بھی تصدیق ہے تو اس کا ایمان آخرت میں بھی معتبر اور نافع ہوگا اور اگر دل میں تصدیق نہیں محض زبانی اقرار ہے تو دنیوی احکام میں ایمان ہی کے احکام اس پر جاری ہوں گے اور آخرت میں فی الدرک الاسفل من النار ہوگا۔

چنانچہ علامہ عینی رحمہ نے ان کا مذہب صحیح لکھا ہے کہ ان الایمان مجرد الاقرار باللسان وھو قول الکرامیۃ وزعموا ان المنافق مومن الظاھر کافر السریرۃ فیثبت لہ حکم المؤمنین فی الدنیا وحکم الکافرین فی الاخرۃ (عمدۃ القاری جلد اول ص ۱۰۳)

اس تشریح کے بعد اہل حق کے ساتھ کرامیہ کا زیادہ اختلاف باقی نہیں رہتا، ثمرہ وہی ہے جو اہل حق کہتے ہیں۔

اسی طرح جہمیہ کا قول کہ ایمان کی حقیقت صرف معرفتِ قلب ہے، باطل اور مردود ہے لقولہ تعالیٰ:۔
الذین اٰتینٰھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم،

نیز ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں اور جہمیہ کے قول پر بلا قرینہ عدول لازم آئیگا جو باطل ہے، امام بخاری رحمہ نے ان لوگوں کی تردید کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

چوتھا قول اور پانچواں قول ترکیب حقیقی کا ہے یعنی ایمان کے ارکان اور اجزائے مقومہ تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور اعمال جوارح ہیں، اگر ایک فرض کا بھی تارک ہوگا تو مومن باقی نہیں رہیگا، اسی وجہ سے یہ لوگ مرتکب کبیرہ کو دائرہ اسلام سے خارج اور مخلد فی النار کہتے ہیں، قرآنی آیات و نبوی ارشادات سے یہ قول بھی باطل اور مردود ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما الخ (پ ۲۶ سورۂ حجرات)

آیتِ مبارکہ میں مرتکب کبیرہ کو مومن قرار دیا گیا اگر عمل صالح ایمان کا رکن اور جزء ہوتا تو ضد کے ساتھ مقارنت صحیح نہیں ہوتی اور اجتماع ضدین لازم آتا۔

(۲) ارشادِ الٰہی:- یاایھا الذین امنوا توبوا الی اللّٰہ توبۃ نصوحا (تحریم) اس آیت میں حق تعالیٰ نے گنہگاروں کو مؤمن قرار دیکر خطاب فرمایا اور توبہ کا حکم دیا۔

(۳) ارشادِ ربانی:- قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ (سورۂ زمر) اس آیت میں حق تعالیٰ نے تارکِ اعمال اور مرتکبِ کبائر کو اپنی رحمت و مغفرت کی امید دلائی ہے پھر یہ بدنصیب خوارج و معتزلہ مخلد فی النار کہکر نا امیدی کا حکم کس طرح لگاتے ہیں؟

(۴) ارشادِ خداوندی واطیعوا اللّٰہ ورسولہ ان کنتم مؤمنین (انفال) اس آیت میں اطاعت و اعمال کا حکم ہے بشرطِ ایمان، اور ظاہر ہے کہ شرط الشیئ خارج الشیئ۔

نیز بکثرت احادیث میں تارکِ اعمال و مرتکبِ معاصی کو مومن قرار دیا گیا ہے جیسے وان زنیٰ وان سرق والی حدیث وغیرہ۔

اہلِ سنت والجماعت

پہلا قول اور دوسرا قول اہلِ سنت والجماعت کا ہے اور یہی (ہر دو قول) حق ہیں اہلِ سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں رہا یہ اشکال کہ ہر دو قول آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف تعبیرات کا اختلاف اور لفظی نزاع ہے اسلئے کہ فقہاءِ احناف رح اور علماءِ متکلمین یہ نہیں کہتے ہیں کہ اعمال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ فرماتے ہیں کہ اعمال کمالِ ایمان کیلئے ضروری اور لابدی ہیں تارکِ اعمال و مرتکبِ معاصی ناقص مومن ہے۔

اسی طرح ائمہ ثلاث اور محدثین کرام رح تارکِ اعمال کو کافر نہیں کہتے ہیں بلکہ ناقص مومن کہتے ہیں، پس دونوں قول کا مآل اور نتیجہ ایک ہی ہے کہ تارکِ اعمال مومن ہے مگر ناقص، بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ائمہ ثلاث اعمال کو ایمان کا جزء مانتے ہیں مگر نفسِ ایمان کا جزء نہیں بلکہ ایمانِ کامل کا جزء جیسے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک اور انگلیاں انسان کے اجزاء ہیں، تو جس طرح انسان ان اجزاء کے باقی رہتے ہوئے انسان زندہ اور باقی ہے اسی طرح اس وقت بھی انسان باقی اور زندہ رہیگا جبکہ ہاتھ یا کان کاٹ لیا جائے صرف فرق یہ ہوگا کہ پہلی صورت میں وہ کامل انسان ہوگا اور دوسری صورت میں عیب دار و ناقص ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح اصل ایمان تو تصدیقِ قلبی ہے مگر ایمان کی تکمیل و تزئین کے لئے اعمال ضروری اجزاء ہیں، یہی محققینِ اسلام کے نزدیک راجح اور حق ہے یہی فقہائے حنفیہ اور ائمہ متکلمین کا فیصلہ ہے صرف اصطلاح کے اعتبار سے ائمہ ثلاث رح اور حضرات محدثین جب لفظِ ایمان بولتے ہیں تو ایمانِ کامل مراد لیتے ہیں، ولا مناقشۃ فی الاصطلاح۔

امام رازی اور محدثین

امام رازی رح بھی چونکہ متکلمین میں سے ہیں انہوں نے اپنی کتاب مناقب شافعی رح میں اس مسئلہ پر کلام کیا ہے اور محدثین رح پر اشکال کرتے ہوئے لکھا کہ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ عمل کو جزء کہکر پھر یہ کہتے ہیں کہ اس کے فوت ہونے سے ایمان فوت نہیں ہوتا حالانکہ یہ بات بالکل

بدیہیات میں سے ہے کہ فوت جز مستلزم ہے فوت کل کو۔
حافظ ابن حجر رح نے اس اعتراض کو تسلیم کرلیا ہے اور کہا کہ جو لوگ عمل کو جز کہتے ہیں وہ نفس ایمان کا جز نہیں کہتے بلکہ ایمان کامل کا جز کہتے ہیں تو اب عمل کے فوت ہونے کے بعد نفس ایمان باقی رہیگا جس بنا پر دخول جنت ہوگا۔
ایمان کامل فوت ہو جائے گا جس کی وجہ سے دخول اولی کا مستحق نہیں رہیگا۔ لیکن اس بات کا حنفیہ بھی انکار نہیں کرتے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اس کو نزاع لفظی ہی پر محمول کیا ہے۔
پوری تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اہل حق (اہل سنت والجماعت) کے ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے، پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل حق (اہل سنت والجماعت) کے اندر یہ لفظی اختلاف کیوں ہوا؟ اس فرق تعبیرات اور اختلاف کا سبب کیا ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ امام اعظم رح کے دور میں معتزلہ کا اثر تھا حتی کہ حکومت کا مسلک بھی اعتزال تھا اس لئے امام اعظم رح نے تقاضائے عصر کے اعتبار سے معتزلہ کی پوری مخالفت کی، اور جب امام شافعی رح وغیرہ کا دور آیا تو جہمیہ و کرامیہ سے مقابلہ ہوا اس لئے امام شافعی رح وغیرہ کو اعمال پر زور دینے کی ضرورت پڑی کہ یہ فرق باطلہ اعمال کو ایمان سے بے تعلق بتاتے ہیں۔
غرض و مقصد تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک ہے صرف تعبیرات کا یہ اختلاف اختلاف دور کا نتیجہ ہے۔

ایمان و اسلام کی باہمی نسبت

امام غزالی رح فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ایمان اور اسلام کے درمیان کیا نسبت ہے؟ ترادف و تساوی ہے یا عموم و خصوص؟
تحقیق یہ ہے کہ نسبت بیان کرنے کے لئے دونوں کا مفہوم متعین کرنا ضروری ہے۔ اگر ایمان سے مراد ایمان کامل لیا جائے اور اسلام سے بھی اسلام کامل مراد لیا جائے تو اس صورت میں ترادف یعنی تساوی کی نسبت ہوگی جیسا کہ ائمہ ثلاث حضرات محدثین نیز امام بخاری رح کا مسلک ہے اور ان حضرات کا مستدل یہ ارشاد الٰہی ہے۔ فاخرجنا من کان فیھا من المؤمنین فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین۔ اس بستی میں بالاتفاق ایک ہی گھر مسلمانوں کا تھا یعنی حضرت لوط علیہ السلام کا گھرانہ، انھیں کو مومن کہا اور انھیں کو مسلم بھی کہا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان میں ترادف و تواردہے۔
اور اگر ایمان کی تعریف کی جائے ہو الانقیاد الباطنی بشرط الانقیاد الظاہری اور اسلام کی تعریف کی جائے ہو الانقیاد الظاہری بشرط الانقیاد الباطنی تو اس صورت میں تلازم و تساوی کی نسبت ہوگی۔
اور اگر ایمان سے مراد لیا جائے تو صرف تصدیق قلبی یعنی انقیاد باطنی اور اسلام سے مراد لیا جائے مطلق انقیاد و اطاعت خواہ دل سے ہو یا زبان سے یا جوارح سے تو عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوگی اسلام عام ہوگا اور ایمان خاص
اور اگر ایمان سے مراد لیا جائے صرف انقیاد باطنی اور اسلام سے صرف انقیاد ظاہری تو اس صورت میں اختلاف و تباین کی نسبت ہوگی جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا

ولما يدخل الايمان في قلوبكم (الآية)

علامہ عینی رح فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ ان میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے بعضے مومن ہونگے مسلم نہ ہوں گے مثلاً دل میں تصدیق آئی اور اظہار کرنے کا موقع نہ ملا انتقال ہوگیا تو ایسا شخص مومن ہے (عنداللہ) مسلمان نہیں، اور ایک شخص جو زبان سے اقرار کرتا ہے لیکن دل میں تصدیق نہیں تو ایسا شخص مسلم ہے مومن نہیں، جیسے منافق۔

اور ایک وہ شخص ہے جو مومن بھی ہے اور مسلم بھی جیسے صحابہ کرام رض اور ہر مخلص مومن۔

پس ایمان و اسلام میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہوگی، اس صورت میں ایک مادہ اجتماع کا ہوگا اور دو مادے افتراق کے جیسا کہ مثال سے ظاہر ہے، بہت سے محققین نے اسی کو راجح قرار دیا ہے، علامہ عینی رح فرماتے ہیں ہ والحق ان بينهما عموما وخصوصا من وجه (عمدہ جلد اول صفحہ ۱۰۹)

حافظ ابن رجب حنبلی رح نے ایمان و اسلام کے شرعی استعمال کے متعلق ایک کلیہ بیان کیا ہے جو نہایت قیمتی اور آب زر سے لکھنے کے لائق ہے فرماتے ہیں "الاسلام والايمان كاسمي الفقير والمسكين اذا اجتمعا تفرقا واذا تفرقا اجتمعا۔

پوری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں (ایمان و اسلام) میں بلاشبہ فرق ہے حقیقت لغویہ کے رو سے بھی اور حقیقت شرعیہ کے رو سے بھی۔

حقیقت لغویہ کے رو سے جیسا کہ آیت کریمہ قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا سے ظاہر ہے اور حقیقت شرعیہ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا جو نماز جنازہ کے سلسلہ میں کتب حدیث میں موجود ہے قابل لحاظ ہے چنانچہ اللهم من احييته منا فاحيه على الاسلام ومن توفيته منا فتوفه على الايمان میں زندہ رہنے والوں کے لئے اسلام (جو انقیاد ظاہر و اعمال جوارح سے عبارت ہے) کی توفیق کے لئے دعا اور مرنے والوں کے لئے توفی علی الایمان کی دعا، دونوں الفاظ کے باہمی فرق و نسبت کو بخوبی واضح کررہی ہے اگرچہ ایک کا اطلاق دوسرے پر و استعمال ثابت ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

بابُ قولِ النبيِ صلى الله عليه وسلم بُنِيَ الاسلامُ

على خمسٍ وهو قولٌ وفعلٌ ويَزِيدُ وينقصُ قال الله تعالى لِيَزدادوا ايمانا مّع ايمانهم۔ وزِدناهم هُدًى۔ ويَزِيدُ الله الذين اهتدوا هُدًى۔ والذين اهتدوا هُدًى - والذين اهتَدَوا زادهم هُدًى وّاٰتٰهم تقوٰهم۔ ويزداد الذين آمنوا ايمانا۔ وقوله عزّ وجلّ أيّكم زادَتْهُ هٰذِهٖ ايمانا فامّا الذين آمنوا فزادتهم ايمانا۔ وقوله فاخشَوْهُمْ فزادهم ايمانا۔ وقوله وَمَا زادهُمْ الّا ايمانًا وّتسليما۔ والحُبُّ في الله والبُغضُ في الله من الايمان وكتب عُمَرُ بن عبدِ العزيز الى عَدِيّ بن عدِيّ انّ للايمان فرائضَ وشرائعَ وحُدودا وسننا فمن استكملها استكمل الايمان وَمَن لم يستكملها

لم یستکمل الایمان فان اعش فسابینہا لکم حتی تعملوا بہا و ان امت فما انا علی صحبتکم بحریص۔ وقال ابراھیم علیہ السلام ولکن لیطمئن قلبی وقال معاذ اجلس بنا نؤمن ساعۃ وقال ابن مسعود الیقین الایمان کلہ وقال ابن عمر لا یبلغ العبد حقیقۃ التقویٰ حتی یدع ما حاک فی الصدر وقال مجاھد شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا اوصیناک یا محمد وایاہ دینا واحدا وقال ابن عباس شرعۃ ومنہاجا سبیلا وسنۃ ودعاؤکم ایمانکم۔

ترجمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اور وہ (ایمان) قول وفعل (دونوں کے مجموعہ کا نام) ہے اور وہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے اللہ تعالیٰ نے (سورۂ فتح میں) فرمایا تاکہ (ان کے پہلے) ایمان کے ساتھ اور ایمان زیادہ ہو، اور (سورۂ کہف میں) ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی، اور (سورۂ مریم میں) جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں انہیں اللہ اور زیادہ ہدایت دیتا ہے، اور (سورۂ محمد میں) جو لوگ راہ پر ہیں اللہ نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی اور ان کو پرہیزگاری عطا فرمائی، اور (سورۂ مدثر میں) جو لوگ ایماندار ہیں ان کا ایمان اور بڑھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ توبہ میں) اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا جو لوگ ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا اور ارشادِ الٰہی (سورۂ آل عمران میں) لوگوں نے مسلمانوں سے کہا) تم کافروں سے ڈرتے رہنا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا، اور حق تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ احزاب میں) ان کا کچھ نہیں بڑھا مگر ایمان اور اطاعت کا شیوہ۔ اور (حدیث کی رو سے) اللہ کے لئے محبت رکھنا اور اللہ کے لئے دشمنی رکھنا داخلِ ایمان ہے، اور عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ) نے عدی بن عدی کو لکھا کہ ایمان کے کچھ فرائض ہیں اور عقائد اور کچھ منہیات ہیں اور کچھ مندوبات پس جس نے ان تمام چیزوں کی تکمیل کرلی اس نے ایمان کامل کرلیا اور جس نے ان تمام چیزوں کو پورا نہیں کیا (بلکہ کوتاہی کی) اس نے اپنا ایمان کامل نہیں کیا، پھر اگر (آئندہ) میں زندہ رہا تو ان سب باتوں کو تم سے کھول کر بیان کردوں گا تاکہ تم ان پر عمل پیرا ہوسکو اور اگر میں مرگیا تو (واقعہ یہ ہے کہ) مجھکو تمہاری مصاحبت میں رہنے کی کچھ ہوس نہیں ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا (سورہ بقرہ میں) لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے دل کو تسلی ہو جائے،" اور معاذ نے (اسود بن ہلال سے) کہا ہمارے پاس بیٹھو ایک گھڑی ایمان کی باتیں کریں، اور حضرت ابن مسعود رضہ نے کہا یقین پورا ایمان ہے اور حضرت ابن عمر رضہ نے کہا بندہ اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت (یعنی کمال تقویٰ) نہیں پا سکتا جب تک ان باتوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹکتی ہیں اور مجاہد رحہ نے شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ ٹھہرایا جس کا حضرت نوح عہ کو حکم دیا تھا) کی تفسیر میں فرمایا ہم نے آپ کو اے محمدؐ اور نوح عہ کو ایک ہی دین کا حکم دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضہ نے کہا کہ آیت کریمہ ولکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجا۔ میں شرعۃ کا مطلب ہے سنت یعنی طریقہ اور منہاج کا مطلب ہے راستہ (یہ لف نشر غیر مرتب ہے) اور (سورۂ فرقان کی اس آیت کی تفسیر میں کہا) دعاؤکم یعنی ایمانکم۔

ترجمۃ الباب کا مقصد امام بخاری رحہ کے پیش نظر دو مسئلے ہیں ایک مسئلہ ایمان کی ترکیب وبساطت کا، اور دوسرا مسئلہ زیادۃ ونقصان کا۔

اور یہ ماقبل کی تقریر سے معلوم ہو چکا ہے کہ امام بخاری رہ محدثین میں سے ہیں جو ایمان کو مرکب کہتے ہیں، اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے امام بخاری رہ نے ترجمۃ الباب میں تین جملے نقل کئے ہیں ملہ بنی الاسلام علی خمس، یہ جملہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو اسی کتاب الایمان کی سب سے پہلی حدیث ہے اور اسی باب میں آرہی ہے۔

امام بخاری رہ نے اسلام کو ایمان کا مرادف قرار دیکر استدلال کیا ہے حدیث میں یہاں ایمان کی تشریح نہیں ہے اور جن احادیث میں ایمان کی تشریح ہے مثلاً حدیث جبرئیل میں تو وہاں ایمان و اسلام کی تشریح الگ الگ ہے۔

دوسرا جملہ وھو قول وفعل ہے ملے اور تیسرا جملہ یزید وینقص ہے۔

ان تینوں جملوں میں سے ہر پہلا جملہ دوسرے کیلئے بمنزلہ علت ہے اور ہر دوسرا جملہ ماسبق کا نتیجہ ہے بایں طور کہ پہلا جملہ ہے بنی الاسلام علی خمس، اور ظاہر ہے کہ جب اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے تو اسلام مرکب اور ذو اجزار ہوا اور اس کے اجزار قول اور فعل ہیں اب جہاں یہ اجزار پورے ہوں گے وہاں ایمان بھی کامل ہوگا اور جہاں اجزار پورے نہ ہوں گے وہاں ایمان بھی ناقص ہوگا تو اب دوسرا مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ ایمان میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔

قولہ وھو قول وفعل ھو کی ضمیر کا مرجع اسلام بھی ہوسکتا ہے اور ایمان بھی۔ اسلام تو اس وجہ سے کہ وہ قریب ہے اور مرجع قریب ہی ہونا چاہیے، اور امام بخاری رہ کے نزدیک ایمان و اسلام ایک ہی ہیں۔ اور ایمان اس وجہ سے مرجع ہوسکتا ہے کہ یہاں اصل کتاب الایمان ہی ہے۔ پھر موجودہ نسخہ میں قول وفعل ہے لیکن دوسرے نسخہ میں قول وعمل ہے اور یہی نسخہ راجح ہے کیونکہ سلف کے مقولہ میں عمل ہی کا لفظ ہے مگر چونکہ ایک کا اطلاق دوسرے پر بکثرت ہوتا ہے اسلئے امام بخاری رہ نے بجائے عمل کے فعل کہدیا۔

سوال سوال یہ ہے کہ تصدیق قلبی اصل جزء ہے اور بالاتفاق ضروری ہے امام بخاری رہ نے اسے کیوں نہیں ذکر فرمایا؟

جواب ملہ:- قول کو عام رکھا جائے قول لسانی (یعنی اقرار باللسان) اور قول قلبی (یعنی تصدیق) دونوں کو شامل قرار دیا جائے (۲) یا فعل سے عام مراد لیا جائے کہ فعل قلب یعنی تصدیق اور فعل جوارح یعنی عمل دونوں مراد ہیں (۳) تصدیق قلبی چونکہ بالاتفاق ضروری اور مسلم تھی تصدیق کے اندر کسی فریق کا اختلاف نہیں لہٰذا یہ مفروغ عنہ ہے اسلئے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، باقی جن دو جزؤں (یعنی اقرار باللسان اور عمل بالارکان) میں اختلاف تھا فقط ان کے ذکر پر اکتفار کیا گیا۔

اشکال یہاں ایک اشکال کیا جاتا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے تو اسلام مبنی ہوگا اور پانچ چیزیں مبنی علیہ، اور قاعدہ ہے کہ مبنی مبنیٰ علیہ کا غیر ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ حروف جارہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں تو یہاں علیٰ بمعنی مِن ہے یعنی بنی الاسلام من خمس فلا اشکال۔

قولہ ویزید وینقص ای یزید بالطاعۃ وینقص بالمعصیۃ، یہاں امام بخاری رہ نے سلف کے اصل قول

کو مختصر کرکے ذکر کیا ہے اصل قول یہی تھا کہ ایمان طاعت سے بڑھتا ہے اور معصیت سے گھٹتا ہے۔

اب اس سے صاف ظاہر ہے کہ عمل ایمان کے ارکان واجزاء میں سے نہیں ہے بلکہ عمل ایمان سے علیحدہ ایک چیز ہے جس سے ایمان بڑھتا ہے کیونکہ کوئی چیز اپنی ذات سے زائد نہیں ہوتی یعنی کسی چیز میں اس کی ذات سے زیادتی نہیں پیدا ہوتی مثلاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انسان میں اس کے سر کی وجہ سے اضافہ ہوتا ہے ہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان میں طول، عرض، موٹاپے وغیرہ سے زیادتی ہوتی ہے، جس طرح یہ کہنا درست نہیں کہ نماز میں رکوع سے زیادتی ہوتی ہے کیونکہ رکوع وسجود کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں پس رکوع وسجود سے نماز کا تحقق ہوتا ہے زیادتی نہیں ہوتی بلکہ آداب وسنن کی رعایت سے نماز میں زیادتی ہوتی ہے۔

پس ایمان کا فی حد ذاتہ ایک مستقل وجود ہے پھر وجود کے بعد اس کا حال مختلف ہوتا ہے زیادتی بھی ہوتی ہے اعمال وعبادات سے اور کمی بھی ہوتی ہے معاصی سے یہی امام اعظم رح کہتے ہیں کہ اعمال اصل ایمان سے زائد ہیں اس کی ذات میں داخل نہیں۔ علامہ نووی رح فرماتے ہیں قال المحققون من اصحابنا المتکلمین نفس التصدیق لا یزید ولا ینقص والایمان الشرعی یزید وینقص بزیادۃ ثمراتہ وھی الاعمال ونقصانہا (شرح مسلم صہ ۴۶)

موجودہ زمانے کے غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رح نے اس جملہ سے حنفیہ پر رد کیا ہے کیونکہ حنفیہ کے نزدیک ایمان بسیط ہے اور امام بخاری رح ایمان کو مرکب (ذو اجزاء) اور قابل زیادۃ ونقصان ہونا ثابت کر رہے ہیں۔ مگر یہ کہنا جہالت اور غلط ہے یا پھر شدت تعصب وعناد پر مبنی ہے کیونکہ حنفیہ کہتے ہیں کہ ایمان کے لئے تصدیق بالجنان (اذعان قلبی) ضروری ہے بغیر اس کے مومن ہو ہی نہیں سکتا اگر کسی کو اذعان نہ ہو بلکہ شک ہو تو اہل سنت والجماعت میں سے کسی کے نزدیک مومن نہیں ہے ہاں یقین کے درجات مختلف ہیں مثلاً اس بات کا یقین کہ دہلی ایک شہر ہے اس شخص کو بھی ہے جس نے اس کو دیکھا ہے اور اس کو بھی ہے جس نے اس کو صرف سنا ہے دیکھا نہیں ہے مگر دونوں کے یقین میں باعتبار کیفیت کے فرق ہے، اسی طرح ایمان ہے کہ وہ تو نفس تصدیق کا نام ہے لیکن اس میں مکملات یعنی اعمال کے ذریعہ زیادتی ہوتی رہتی ہے بخلاف مرجئہ کے کہ وہ بالکل کسی قسم کی زیادتی کے قائل نہیں لہذا امام بخاری رح کا مقصود مرجئہ کا رد ہے حنفیہ پر تو کسی حال میں بھی رد نہیں ہو سکتا کیونکہ حنفیہ ایمان کے لئے اجزاء مکملہ کے قائل ہیں جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہو، اور امام بخاریؒ کے پیش کردہ دلائل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام فرق باطلہ کا رد کر رہے ہیں۔

امام بخاری رح کے دلائل

امام بخاری رح نے ایمان میں زیادتی اور کمی کے اثبات کے لئے جو آیات پیش کی ہیں ان سب کا اجمالی جواب یہ ہے کہ ان آیات سے جو زیادۃ اور نقص ہو رہا ہے امام اعظم رح اس کا انکار نہیں فرماتے، اور امام رح جس زیادۃ ونقص کا انکار فرماتے ہیں اس کا آیات میں ثبوت نہیں ہے، البتہ فرقہ مرجیہ وغیرہ کا بھرپور رد ہے جو علی الاطلاق زیادۃ ونقص کے منکر ہیں ملاحظہ ہو

لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ تعالیٰ نے موضح القرآن میں اس کی بہترین تقریر

فرمائی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مشرکین مکہ نے عمرہ ادا کرنے سے روکا تو حضرات صحابہ رضہ کے قلوب میں جوش جہاد بھڑک اٹھا پھر جب حضرت عثمان رضہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کی طرف قاصد بنا کر بھیجا اور یہ غلط افواہ پھیل گئی کہ اہل مکہ نے حضرت عثمان رضہ کو شہید کر دیا ہے تو اس خبر نے آگ پر پٹرول کا کام کیا چنانچہ حضور اکرم صلعم نے موت پر بیعت لینا شروع کر دی جو پندرہ سو کے قریب صحابہ تھے سب نے فرداً فرداً حضور اکرم صلعم کے دست مبارک پر بطیب خاطر بیعت کی اور لڑنے مرنے کیلئے تیار ہو گئے، کما قال اللہ تعالیٰ لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ " یہی بیعت ہے جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے، غرضیکہ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سربکف ہو کر ؎

سرِ میدان کفن بر دوش دارم

کا مظاہرہ کر رہے تھے، بازی سرانداز ی کے ولولوں سے خون کھول رہا تھا، جان لینے اور دینے کے موقع کا گھڑی بے اضطراری سے انتظار کر رہے تھے کہ حکم مل جائے اور تلوار سے تمام جھگڑوں کا فیصلہ کر دیا جائے، اور طاقت کی بھی کچھ کمی نہ تھی، خود تاریخ شاہد ہے کہ صحابہ جیسی سرفروش سپاہیوں کی اتنی بڑی جماعت کے سامنے قریش اور ان کے طرف داروں کی جمعیت کیا چیز تھی؟

غور کیجیے کہ دنیائے دنیہ اور خواہشات نفسانیہ کی خاطر جب انسان مرنے مارنے پر آجاتا ہے اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس سے اندازہ لگائیے کہ اس وقت محبوب حقیقی کی خاطر جانبازی کرنے والوں کے ولولوں کا کیا عالم ہوگا؟

؎ جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

اسی حال میں حکم ہوتا ہے کہ صلح کر و جس میں سب شرائط سراسر مسلمانوں کے خلاف تھیں، بظاہر یہ سراسر ذلت تھی، حضرات صحابہ کرام رضہ کے سارے جذبات یکسر فنا ہو گئے، اور محبوب حقیقی کے اشارے پر قبول ذلت کو عین عزت سمجھکر رہتی دنیا تک عبدیت کی مثال قائم کر دی، آفتاب نے بایں ہمہ دوران عبادالرحمان کی اس شان عبدیت کی نظیر نہیں دیکھی کہ ابھی محبوب حقیقی کی خاطر میدان کارزار کو خون سے رنگنے پر ڈٹے ہوئے تھے اور اب آن واحد میں رضائے محبوب کی خاطر ذلت قبول کر رہے ہیں ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو ✤ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

تھوڑی دیر کے بعد صحابہ کرام رضہ نے سر منڈانے اور احرام کھولنے میں اس بنا پر تاخیر کی کہ شاید یہ حکم صلح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد ہو اور عنقریب ہی اس کے خلاف بذریعہ وحی جہاد کا حکم آجائے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم صلعم کے چہرۂ انور پر صحابہ کرام کی تاخیر حلق کی وجہ سے کچھ تغیر محسوس کیا تو عرض کیا، کہ آپ خیمہ سے نکل کر خود حلق کر دائیں تو صحابہ آپ کا اتباع کریں گے۔ حضرت ام سلمہ رضہ بڑی عاقلہ تھیں، چنانچہ حضور

اکرم ص نے جب حلق شروع کروایا تو صحابہ کرام رض آپ کے اتباع میں ٹوٹ پڑے، اس لئے کہ اب نزول وحی سے مایوس ہوگئے تھے اس حالت کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم (فتح) حاصل یہ کہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے عشاق کی اطاعت وایمان کی دو شانوں کو بیان فرما رہے ہیں لہٰذا اس میں ایمان کی زیادتی کا بیان نہیں بلکہ ایمان کے دو رنگ بتائے گئے ہیں پس اس سے نور ایمانی و درجہ کی زیادتی ثابت ہوتی ہے جس کا حنفیہ کو انکار نہیں۔

(۲) وزدناھم ھدی

امام بخاری رح کا مقصد یہ ہے کہ اس آیت سے ہدایت میں زیادتی ثابت ہوئی اور ہدایت وایمان ایک چیز ہے، پس ثابت ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے

یہاں بھی پہلے اس آیت کا مطلب سمجھا جائے۔ یہ آیت اصحاب کہف کے بارے میں ہے۔
روم میں ایک ظالم وجابر بادشاہ دقیانوس نامی گزرا ہے جو بہت غالی بت پرست تھا اور جبر واکراہ سے بت پرستی کی اشاعت کرتا تھا جب عام لوگ سختی اور تکلیف کے خوف اور چند روزہ دنیوی منافع کی طمع سے اپنے مذہب کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرنے لگے تو اس وقت اسی سرزمین میں چند نوجوانوں کے دلوں میں خیال آیا کہ ایک مخلوق کی خاطر خالق کو ناراض کرنا ٹھیک نہیں، ان کے دل خشیت الٰہی اور نور ہدایت سے بھرپور تھے، حق تعالیٰ نے انہیں صبر واستقلال اور توکل وتبتل کی دولت سے مالا مال کیا تھا، بادشاہ کے روبرو جاکر بھی انہوں نے جرأت ایمانی اور استقلال کا مظاہرہ کیا، قرآن کریم نے ان کے اعلان حق کا تذکرہ کیا ہے۔

ربنا رب السموٰت والارض لن ندعوا من دونہ الٰھا لقد قلنا اذا شططا (کہف) — ہمارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہیں پکاریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بے جا بات کہی۔

یعنی جب رب ہی وہ ہے تو معبود بھی وہی ہوگا ربوبیت والوہیت دونوں اسی کے لئے مخصوص ہیں۔
انہوں نے اس اعلان توحید کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ذکر سے مدلل کیا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ ان سب بت پرستوں کی تحمیق وتجہیل کی کہ سب نے بلا دلیل رب کو چھوڑ کر اور کسی کو معبود ٹھہرالیا جو سراسر حماقت ہے اور برانگیختہ کرتے ہوئے ان سے دلیل کا مطالبہ کیا اور بڑا ظالم وبے انصاف کہا۔

لولا یاتون علیھم بسلطن بین فمن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا (کہف) — یہ لوگ ان معبودوں پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے؟ تو اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگا وے۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمانی بصیرت اور سوجھ بوجھ کس قدر دی تھی جس کی بدولت وہ لوگ ایسی سرزمین اور ایسے پرخطر مقام میں بھی پہاڑ جیسے ایمان پر مضبوط اور ثابت قدم اور عقیدۂ توحید پر پختہ رہے اور اپنی بات صاف صاف کہدی اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وزدناھم ھدًی ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کردی یعنی ہم نے ان کو اور زیادہ سوجھ بوجھ دی
اب خود اپنے ہی فیصلہ سے ترجیح دیجئے کہ یہاں مراد نفس ایمان میں زیادہ ہے جیساکہ امام بخاری رح کا مسلک

بیان کیا جاتا ہے یا لواحق و متعلقات ایمان یعنی ایمانی بصیرت واستقامت اور اس کی موجبوں جو میں زیادتی مراد ہے جیساکہ حنفیہ کا مشہور مسلک ہے۔

(۳) ویزید اللہ الذین اهتدوا هدی یہ آیت سورۂ مریم کی ہے، اس سے قبل کفار سے متعلق فرمایا۔ "قل من کان فی الضللة فلیمدد له الرحمٰن مدا (مریم)" آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے"

مطلب یہ ہے کہ کفار کو ضلالت و گمراہی میں مداومت رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے مقابلہ میں ویزید اللہ الذین اهتدوا هدی سے بھی یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ایمان پر مداومت اور استقامت عطا فرماتے ہیں پس زیادۃ سے استقامت مراد ہے۔

(۴) والذین اهتدوا زادهم هدی و اٰتٰهم تقوٰهم یہ آیت سورۂ محمدؐ کی ہے جس کو سورۂ قتال بھی کہا جاتا ہے۔

اس سے قبل اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبهم واتبعوا اهواءهم" میں کفار کی ۲ دو صفات میں بیان فرمائی ہیں، ان کے مقابلہ میں مومنین کے بھی ۲ دو صفات حمیدہ بیان فرماتے ہیں طبع اللہ علی قلوبهم کے مقابلہ میں زادهم هدی اور واتبعوا اهواءهم کے مقابلہ میں واٰتٰهم تقوٰهم" اس سے معلوم ہوا کہ زادهم هدی سے زیادۃ ایمان مراد نہیں بلکہ قلب میں نور ایمان کی زیادتی مراد ہے جیسے کہ طبع اللہ علی قلوبهم میں ظلمت کفر مراد ہے۔

(۵) ویزداد الذین اٰمنوا ایمانا یہ سورۂ مدثر کی اکتیسویں ۳۱ آیت کا ایک ٹکڑا ہے اس سے قبل چند آیتوں میں دوزخ کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد خداوندی ہے علیها تسعة عشر" (اس پر انیس ۱۹ فرشتے ہیں) یعنی دوزخ کے انتظام پر جو فرشتوں کا لشکر ہوگا اس کے افسر انیس ۱۹ فرشتے ہوں گے جن میں سب سے بڑے ذمہ دار کا نام "مالک" ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ خاص اس عدد کی کیا علت ہے؟ اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ تکوینیات میں سوال کرنا اور علت کی جستجو ہی صحیح نہیں ہے، دنیا کے ادنیٰ ادنیٰ امور تکوینیہ کی علت کوئی بھی بیان نہیں کر سکتا۔

ثانیاً شاہ عبدالعزیزؒ نے انیس ۱۹ کے عدد کی بعض حکمتیں بیان کی ہیں جو قابل دید ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جہنم میں مجرموں کو عذاب دینے کے لئے انیس ۱۹ قسم کے فرائض ہیں جن میں سے ہر فرض کی انجام دہی ایک ایک فرشتہ کی سرکردگی میں ہوگی، کوئی شبہ نہیں کہ فرشتہ کی طاقت بہت بڑی ہے اور ایک فرشتہ وہ کام کر سکتا ہے جو لاکھوں آدمی مل کر نہیں کر سکتے۔

لیکن یاد رہے کہ ہر فرشتہ کی یہ قوت اسی دائرہ میں محدود ہے جس میں کام کرنے کیلئے وہ مامور ہوا ہے مثلاً ملک الموت لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتا ہے مگر عورت کے پیٹ میں ایک بچہ کے اندر جان نہیں ڈال سکتا

حضرت جبرئیل علیہ السلام چشم زدن میں وحی لا سکتے ہیں لیکن پانی برسانا ان کا کام نہیں، جس طرح کان دیکھ نہیں سکتا آنکھ سن نہیں سکتی اگرچہ اپنی قسم کے کام کتنے ہی سخت ہوں کر سکتے ہیں مثلاً کان سے ہو سکتا ہے کہ ہزاروں آوازیں سن لے اور نہ تھکے، آنکھ ہزاروں رنگ دیکھ لے اور عاجز نہ ہو اسی طرح اگر ایک فرشتہ عذاب کے واسطے دوزخیوں پر مقرر ہوتا تو اس سے ایک ہی قسم کا عذاب دوزخیوں پر ہو سکتا تھا دوسری قسم کا عذاب جو اس کے دائرۂ استعداد سے باہر ہے اسلئے انیس ۱۹ قسم کے عذابوں کے لیے (جن کی تفصیل تفسیر عزیزی میں ہے) انیس ۱۹ ذمہ دار فرشتے مقرر ہوئے ہیں۔

علماء نے اس عدد کی حکمتوں پر بہت کلام کیا ہے مگر میرے نزدیک (یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی رح کے نزدیک) شاہ صاحب رح کا کلام بہت ہی عمیق ولطیف ہے۔ اس عدد پر احمق مشرکین مکہ نے مذاق اڑانا شروع کیا چنانچہ ان میں سے ایک پہلوان نے کہا کہ سترہ کے لیے تو میں اکیلا کافی ہوں باقی دو کو سب اہل مکہ کہاں چھوڑیں گے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

وماجعلنا اصحٰب النار الا ملٰئکة وماجعلنا عدتهم الا فتنة للذين كفروا (مدثر) اور ہم نے دوزخ کے کارکن صرف فرشتے بنائے ہیں اور ان کی تعداد ہم نے کافروں کے واسطے آزمائش بنائی ہے۔

اس عدد کے بیان کرنے کی حکمت کیطرف اشارہ فرمایا کہ ایک تو اس گنتی کے بیان کرنے میں منکروں کی جانچ ہے، دیکھتے ہیں کہ کون اس کو سنکر ڈرتا ہے اور کون ہنسی مذاق اڑاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان بیوقوفوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ جہنم کے داروغے ان کی طرح انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جن کی قوت کا یہ حال ہے کہ ایک فرشتہ نے قوم لوط علیہ السلام کی ساری بستی کو ایک بازو پر اٹھا کر پٹک دیا تھا۔

دوسری حکمت یہ ہے،،

ليستيقن الذين اوتوا الكتٰب (مدثر) تاکہ جن لوگوں کو کتاب دی ہے وہ یقین کرلیں۔

یعنی اہل کتاب کو آپ کی نبوت اور حقانیت قرآن کا یقین ہو جائے، اور ان پر حجت تمام ہو جائے، کیونکہ پہلی کتب سماویہ میں بھی داروغۂ دوزخ کا یہی عدد آیا ہے، بظاہر آپ امی تھے کتب سماویہ کا علم حاصل کیے ہوئے نہ تھے اس کے باوجود ایک ایسی چیز کی خبر دینا جس میں بغیر وحی الٰہی کے اٹکل وغیرہ سے کچھ کام نہیں چل سکتا، یہ آپ کی اور قرآن مجید کی حقانیت کی ایک مستقل دلیل ہے، دلیل بھی ایسی کہ دشمن اہل کتاب بھی اس سے گریز نہ کر سکے اور ان کو بھی اقرار کرنا پڑا اور دشمن کے منھ سے اقرار شدہ دلیل ہونے کی بنا پر مؤمنین کو بھی زیادتی انشراح وطمانیت، ایمانی مسرت ولبشاشت ضرور حاصل ہوگی، تو یہ تیسری حکمت ہوئی۔ پہلی دو حکمتوں کو بیان کر کے ان ہی کے متصل اس تیسری حکمت کو بیان فرمایا کہ،

ويزداد الذين اٰمنوا ايمانا (مدثر) اور ایمان والوں کا ایمان بڑھ جائے۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ یہاں زیادتی سے مراد نفس ایمان کی زیادتی نہیں ہے بلکہ متعلقات ایمان یعنی ایمانی خوشی ومسرت اور انشراح وطمانیت کی زیادتی مراد ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے جبکہ

انہوں نے احیاء موتی کی کیفیت بچشم خود دیکھنے کی آرزو کی تھی تو جواب میں ارشاد فرمایا کہ، اولم تؤمن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی (بقرہ)

مطلب یہ ہے کہ ایمان تو پختہ ہے اب مشاہدہ کی درخواست اسلئے ہے کہ زیادتی انشراح اور طمانیت حاصل ہو جو لواحق ایمان میں سے ہے۔

نیز یہاں امام اعظم رح کا جواب آمنوا بالجملۃ ثم بالتفصیل بھی جاری ہوسکتا ہے کیونکہ مومنین پہلے اس کلی پر ایمان لائے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو خبر دیں گے اس کی ہم تصدیق کریں گے یہ ایک اجمالی مومن بہ تھا (کیونکہ اس کے لاکھوں افراد و جزئیات ہوسکتے ہیں) اس اجمالی مومن بہ کی ایک تفصیل (یعنی ایک جزئی و ایک فرد) یہ آئی اور آپ نے خبر دی کہ داروغہ دوزخ انیس ۱۹ ہیں مومنین سنتے ہی بے چون وچرا اس پر ایمان لائے تو بس آمنوا بالجملۃ ثم بالتفصیل متحقق ہوا اسی کو فرمایا گیا ویزداد الذین آمنوا ایمانا۔

(۶) ایکم زادتہ ھذہ ایمانا فاما الذین آمنوا فزادتھم ایمانا

یہ آیت سورۃ توبہ کے آخری رکوع کی ہے، امام بخاری رح نے اس آیت کو بھی ایمان کے زیادۃ ونقصان پر استدلال کیلئے پیش کیا ہے۔

اس آیت کو بھی سیاق وسباق ملاکر مطلب سمجھ لیا جائے مگر اولاً بطور تمہید کے ایک مثال ذہن نشین کرلیا جائے کہ تمام تحقیقات ومشاہدات سے یہ بات ثابت ہے کہ بہتر سے بہتر غذا اگر کسی مریض فاسد ہاضمہ والے کو کھلائی جائے تو اس کی بیماری کو اور بڑھادے گی اور پیٹ کے اندر گندگی اور پلیدگی اور زیادہ پیدا کرے گی، پہلے اگر پانچ دست آتے تھے تو اب پندرہ دست آئیں گے یہ بات ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے اور یہ بھی مسلّم ہے کہ فساد اس غذا میں نہیں ہے بلکہ اس کے پیٹ اور ہاضمہ میں ہے ورنہ تندرست آدمی میں کیوں فساد نہ ہوا لہٰذا اس کے پیٹ کی اصلاح ہونی چاہئے۔

جب یہ تمہید ذہن نشین ہوگئی تو اب پوری آیت ملاحظہ فرمایئے:-

واذا ما انزلت سورۃ فمنھم من یقول ایکم زادتہ ھذہ ایمانا (توبہ) اور جب کوئی سورۃ قرآنی نازل ہوتی تو منافقین آپس میں یا بعض سادہ دل مسلمانوں سے ازراہ استہزاء وتمسخر کہتے کہ کیوں صاحب تم میں سے کس کس کا ایمان اس سورت نے بڑھایا۔

مطلب یہ تھا کہ (معاذ اللہ) اس سورت میں رکھا ہی کیا ہے؟ کون سے حقائق ومعارف ہیں جو ایمان ویقین کی ترقی کا موجب ہوں۔

حق تعالیٰ نے جواب دیا۔ فاما الذین آمنوا فزادتھم ایمانا الخ بیشک کلام الٰہی سنکر مومنین کے ایمان میں تازگی اور ترقی ہوتی ہے اور قلوب مسرور ومنشرح ہوتے ہیں، ہاں جن کے دلوں میں کفر ونفاق کی بیماری اور گندگی ہے ان کی بیماری اور گندگی میں اضافہ ہوجاتا ہے حتیٰ کہ یہ بیماری ان کی جان ہی لے کر چھوڑتی ہے۔

؎ باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ❊ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

مثلاً قورمہ بہت ہی عمدہ اور مقوی غذا ہے مگر جس کا معدہ فاسد ہو اس کیلئے سخت مضر ہے۔

زیادتی ایمان کی صورتیں

اولاً یہ کہ ہر سورت میں کچھ جدید معلومات یا جدید احکام نازل ہوتے ہیں جو اجمالی مومن بہ کی تفصیل ہوتے ہیں اس کے نازل ہونے سے جب مومنین اس پر ایمان لاتے ہیں تو آمنوا بالجملة ثم بالتفصیل "پائی جاتی ہے اسی کو زادتھم فرمایا یعنی مومن بہ کی زیادتی کو ایمان کی زیادتی سے تعبیر کردیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ جب جدید سورت نازل ہوئی تو کچھ نئے دلائل معلوم ہوئے ان جدید دلائل سے ایمان و یقین میں حلاوت و تازگی، شدت و قوت حاصل ہوئی۔

(۷) فاخشوھم فزادھم ایمانا

یہ آیت سورۂ آل عمران کی ہے پوری آیت مع شان نزول ملاحظہ ہو۔

اس کا شان نزول یہ ہے کہ جنگ اُحد ختم ہو جانے کے بعد جب کفار قریش میدانِ اُحد سے واپس ہوئے تو راستے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم نے بڑی غلطی کی کہ ہزیمت یافتہ اور زخم خوردہ مسلمانوں کو یونہی چھوڑ کر چلے آئے مشورے ہونے لگے کہ پھر مدینہ واپس چل کر ان کا قصہ تمام کردیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو اعلان فرمادیا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ لڑائی میں حاضر تھے آج دشمن کا تعاقب کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مسلمان مجاہدین باوجودیکہ تازہ زخم کھائے ہوئے تھے اللہ اور رسول کی پکار پر نکل پڑے، آپ ان مجاہدین کی جمعیت لیکر مقام حمراء الاسد تک (جو مدینہ طیبہ سے آٹھ میل پر ہے) پہونچے، ابوسفیان کے دل میں یہ سنکر کہ مسلمان اس کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں سخت رعب و دہشت طاری ہوگئی، دوبارہ حملہ کا ارادہ فسخ کرکے مکہ کی طرف بھاگا۔ عبد القیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ آرہا تھا ابوسفیان نے ان لوگوں کو کچھ دیکر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پہونچکر ایسی خبریں شائع کریں جن کو سنکر مسلمان ہماری طرف سے مرعوب و خوفزدہ ہو جائیں، انھوں نے مدینہ پہونچکر کہنا شروع کیا کہ مکہ والوں نے بڑا بھاری لشکر اور سامان مسلمانوں کی استیصال کی غرض سے تیار کیا ہے یہ سنکر مسلمانوں کے دلوں میں خوف کی جگہ جوش ایمان بڑھ گیا اور کفار کی جمعیت کا حال سنکر کہنے لگے حسبنا اللہ ونعم الوکیل، ساری دنیا کے مقابلے میں اکیلا خدا ہم کو کافی ہے، اسی پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل

یہ ایسے (مخلص) لوگ ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ ان لوگوں نے تمہارے (مقابلہ کے) لئے سامان جمع کیا ہے سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس خبر نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کردیا۔

یعنی ایمانی جوش اور توکل و اعتماد بڑھ گیا چنانچہ قرآن کا جملہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل اس پر صراحۃً دلالت کرتا ہے۔

تو یہاں زیادتی ایمان سے متعلقات ایمان یا مقامات ایمان کی زیادتی مراد ہے حقیقتِ ایمان میں زیادتی

مراد نہیں۔

بعض حضرات نے اس کا شان نزول بدر صغریٰ بتایا ہے کہ جنگ احد تمام ہونے پر ابو سفیان نے جاتے ہوئے کہا تھا وموعدنا البدر، یعنی آئندہ سال میدان بدر میں پھر زور آزمائی ہوگی، حضرت نے قبول کرلیا، جب اگلا سال آیا تو حضور مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لئے چلو اگر کوئی نہیں جائے گا تو اللہ کا رسول تنہا جائیگا۔

ادھر ابو سفیان فوج لیکر مکہ سے نکلا تھوڑی دور چلکر ہمت ٹوٹ گئی، رعب چھاگیا، قحط سالی کا عذر کرکے چاہا کہ مکہ واپس جائے مگر صورت ایسی ہو کہ الزام مسلمانوں پر رہے، ایک شخص مدینہ جارہا تھا اس کو کچھ دیا کہ وہاں پہنچکر اس طرف کی ایسی خبریں مشہور کرنا جن کو سنکر مسلمان خوف کھاجائیں اور جنگ کو نہ نکلیں۔

وہ مدینہ پہنچکر کہنے لگا کہ مکہ والوں نے بڑی بھاری جمعیت اکٹھی کی ہے جنگ تمہارے لئے بہتر نہیں۔ مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے استقلال دیا انہوں نے یہی کہا کہ ہم کو اللہ کافی ہے۔

آخر مسلمان حسب وعدہ بدر پہنچے وہاں بڑا بازار لگتا تھا تین روز رہ کر تجارت کرکے خوب نفع کماکر مدینہ واپس آئے، اس غزوہ کو بدر صغریٰ کہتے ہیں، اس وقت جن لوگوں نے رفاقت کی اور تیار ہوئے ان کو بشارت ہے کہ احد میں زخم کھاکر اور نقصان اٹھاکر پھر ایسی جرأت کی، مسلمانوں کی اس جرأت و مستعدی کی خبر سنکر مشرکین راستے سے لوٹ گئے، چنانچہ مکہ والوں نے اس مہم کا نام جیش السویق رکھدیا، یعنی وہ لشکر جو محض ستو پینے گیا تھا پی کر واپس آگیا فانقلبوا بنعمۃ من اللہ وفضل لم یمسسھم سوء" یعنی اللہ کا فضل دیکھو کہ نہ کچھ لڑائی کرنی پڑی نہ کانٹا چبھا مفت میں ثواب کمایا، تجارت میں نفع حاصل کرکے اور دشمنوں پر دھاک بٹھلاکر خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو لئے ہوئے صحیح سلامت گھر واپس آگئے۔

راجح قول یہی ہے کہ ان آیات کا تعلق "بدر صغریٰ" سے نہیں بلکہ غزوہ حمراء الاسد سے ہے۔

غزوہ حمراء الاسد کی تفصیل کے لئے نصر الباری کتاب المغازی مطالعہ کیجئے۔

(۸) **وما زادھم الا ایمانا وتسلیما** یہ آیت سورۂ احزاب کی بائیسویں آیت کا ٹکڑا ہے اس آیت کا تعلق غزوۂ احزاب سے ہے جب کہ مشرکین نے یہ طے کرلیا تھا کہ سب قبائل مل کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کریں اور مسلمانوں کا بالکل استیصال کردیں، اس کا نقشہ قرآن مجید نے یوں کھینچا ہے "اذ جاءوکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (احزاب آیت ۱۰ و ۱۱)

اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خائف ہوجاتے مگر اس کے بجائے ان کی قوت توکل کی یوں حکایت فرماتے ہیں ولما رأ المؤمنون الاحزاب قالوا ھذا ما وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما (احزاب)

شان نزول سے ثابت ہوا کہ زیادۃ ایمان سے زیادۃ توکل مراد ہے۔

نوٹ غزوۂ احزاب کی تفصیل کیلئے نصر الباری کتاب المغازی دیکھیے۔
اس کے بعد امام بخاری رح اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے چند آثار صحابہ و تابعین رض پیش فرمارہے ہیں۔

سوال امام بخاری رح نے پہلی آیت کو قال اللہ تعالیٰ سے شروع کیا اور اس کے ضمن میں پانچ آیتیں مذکور ہیں۔ درمیان میں قولہ تعالیٰ کا اعادہ نہیں ہے پھر چھٹی آیت کو قولہ سے، ساتویں کو وقولہ اور آٹھویں کو بھی قولہ سے شروع کیا اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب:- اگرچہ یہ آٹھوں آیات قرآن عزیز کی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی پانچ آیتوں کا مضمون باری تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے کسی کے قول کی حکایت نہیں، اور آخر کی تین آیتوں میں یہ نقل بطور حکایت ہے۔ چھٹی آیت میں کافروں کے تمسخر و استہزار کا جواب ہے اور ساتویں آیت میں کفار کی تہدید پر مسلمانوں کے ثبات و استقامت کی حکایت ہے اور آٹھویں آیت میں بھی خداوند قدوس کی جانب سے مسلمانوں کی ہمت و پامردی اور استقلال کے معاملہ کی حکایت ہے، واللہ اعلم۔

والحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان اللہ کے لئے محبت اور اس کے لئے بغض رکھنا بھی داخل ایمان ہے۔

امام بخاری رح اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حب اور بغض اجزاء ایمان ہیں اور محبت و عداوت کے درجات متفاوت ہوتے ہیں تو ایمان میں بھی کمی و زیادتی ثابت ہوجائے گی۔

جواب ۱ اگر یہ مقولہ امام بخاری رح کا اپنا ہے تو حجت نہیں، اور اگر حدیث ہے تو یہ مضمون کتب حدیث میں کہیں نہیں ملتا۔ سنن ابو داؤد میں حدیث یوں ہے "من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان" جو اللہ کے لئے محبت کرتا ہے اور اللہ کیلئے بغض رکھتا ہے اور اللہ ہی کے لئے خیرات کرتا ہے اور اللہ ہی کے لئے دینے سے رکتا ہے تو اس نے ایمان مکمل کرلیا۔

۲ اگر بالفرض اسے حدیث تسلیم کرلیں اس بنا پر کہ امام بخاری رح اعلم بالحدیث تھے ممکن ہے کہ انھیں یہ حدیث ملی ہو مگر ہمیں اس کا علم نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ من الایمان میں من تبعیضیہ نہیں بلکہ ابتدائیہ ہے۔ مطلب یہ کہ حب فی اللہ و بغض فی اللہ کی ابتداء ایمان سے ہوتی ہے یعنی ان کا منشاء ایمان ہے۔

۳ اگر من کو تبعیضیہ بھی لے لیں تو یہ ایمان منجی کے اجزاء نہیں بلکہ معلی کے اجزاء ہیں کما مر تفصیلہ۔

وکتب عمر بن عبد العزیز الی عدی بن عدی عمر بن عبد العزیز رح نے عدی بن عدی کو لکھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رح خلیفہ راشد عمر ثانی کے نام سے مشہور ہیں جن کے عدل و انصاف پر تاریخ شاہد ہے یہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں، اول صدی کے اختتام اور دوسری صدی کی ابتداء میں سب سے پہلے مجدد بالاتفاق یہی ہیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے تفصیلی حالات تدوین حدیث میں مذکور ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں

مشہور ہے کہ صحابہ رض کے بعد دنیا بھر کا عدل ایک طرف ہو اور عمر بن عبد العزیز رح کا ایک جانب تو سب پر بھاری ہو جائیگا جیسے کہ دنیا بھر کے مظالم ایک طرف ہوں اور حجاج بن یوسف کے دوسری طرف، تو حجاج کے مظالم سب سے زیادہ وزنی ہونگے۔
حضرت عبد اللہ بن مبارک رح سے کسی نے دریافت کیا کہ عمر بن عبد العزیز رح افضل ہیں یا کہ امیر معاویہ رض؟
آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا کہ حضرت معاویہ رض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کیلئے جس گھوڑے پر سوار ہوتے تھے اس گھوڑے کی ناک کی گرد بھی عمر بن عبد العزیز رح سے افضل ہے۔ یہ فضیلت صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے اس سے ضرورت صحبت کی اہمیت معلوم ہوئی۔
آجکل فتن متقاطرہ میں سے ایک عظیم فتنہ وبا کی طرح یہ بھی پھیل رہا ہے کہ اہل علم حضرات بھی اہل اللہ کی صحبت کی ضرورت کا انکار کرنے لگے ہیں۔

ضرورت صحبت پر چند دلائل

(۱) واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداوة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوة الدنيا (سورہ کہف)
رؤسائے مشرکین نے یہ درخواست کی کہ ہمارے آنے کے وقت آپ ان فقراء و مساکین کو اٹھا دیا کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔
حضور اکرم صلعم کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بدستور اپنی طویل صحبت سے اپنے اصحاب کو مشرف فرماتے رہیں اور کسی رئیس کے ایمان لانے کی امید میں ان طالبین کو اپنی مجالست طویلہ کے کسی حصہ سے محروم نہ فرمائیں۔
(۲) یایها الذین امنوا اتقوا الله وکونوا مع الصدقین (توبہ)
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا امر فرما کر اس کی تحصیل کا طریقہ بیان فرما دیا کہ صادقین کے ساتھ رہو، یعنی صادقین کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ رہو۔
(۳) حضرت عبد اللہ بن مبارک رح کے قول مذکور سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑا ولی اللہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، یہ مضمون خود حدیث سے بھی ثابت ہے؛
عن ابی سعید رض قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تسبوا اصحابی فان احدکم لو انفق مثل احد ذهبا ما بلغ مد احدهم ولا نصیفه (رواه الشیخان)
وعن جابر رض قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تمس النار مسلما راٰنی او راٰی من راٰنی (رواه الترمذی)
غرضیکہ یہ امر منقول ہونے کے ساتھ مسلم بھی ہے کہ کوئی غیر صحابی صحابی کا درجہ نہیں پا سکتا پس غور طلب یہ امر ہے کہ صحابی کی وجہ فضیلت کیا ہے؟ سوائے فضیلت صحبت کے اور کوئی وجہ نہیں۔ اسی سے ثابت ہوا

کہ اہل اللہ کی صحبت میں بڑا اثر ہوتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اذا رؤا ذکر اللّٰہ" یعنی ان کو دیکھنے سے خدا یاد آجاتا ہے۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوا کما رأیتمونی اصلی، یہ دلیل ہے کہ دین قیل وقال سے نہیں ملتا بلکہ کسی صاحب حال کی بندگی اور غلامی دیکھکر اس کی حرکات وسکنات، قیام، رکوع، سجود میں اس کے ہر عضو سے جو عظمت الٰہیہ کے پیش نظر ایک خاص سکنت اور عاجزی ٹپکتی ہے اس کے مشاہدہ سے جو قلب پر اثر پڑتا ہے اور بندگی کی جو روح ملتی ہے وہ کتابوں اور قیل وقال سے کہاں حاصل ہوتی ہے جج اکبر الٰہ آبادی نے خوب فرمایا ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا ۞ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

(۵) یہ امر مسلم ہے اور معقول ومشاہد ہے کہ دنیا کا کوئی فن بھی ماہر فن کی صحبت کے سوا حاصل نہیں ہوسکتا، مثلاً ڈاکٹری کے فن پر بہتر سے بہتر ہر زبان میں ہزاروں کتابیں بہت مفصل اور جامع موجود ہیں مگر آج تک کوئی شخص صرف ان کتابوں کے مطالعہ سے ڈاکٹر نہیں بن سکا، ڈاکٹر بننے کیلئے معتدبہ وقت تک کسی ماہر فن کے پاس رہنا ضروری سمجھا جاتا ہے، بلعینہ اسی طرح کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کئے بغیر تعلق مع اللہ نہیں پیدا ہوتا۔

؎ جو آگ کی خاصیت وہ عشق کی خاصیت ۞ اک خانہ بخانہ ہے ایک سینہ بسینہ ہے

؎ قال را بگذار مرد حال شو ۞ پیش مرد کامل پامال شو

اگر صحبت کی ضرورت نہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ جمیع انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہی بے معنی ہو جاتی ہے، اس صورت میں تو لکھی لکھائی کتاب نازل کردی جاتی، لوگ خود بخود اس کا مطالعہ کرکے واصل باللہ ہو جاتے، رسول کی کیا ضرورت تھی؟

صحبت اولیاء سے محروم رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عالم تو بنجاتے ہیں مگر انسانیت کے آداب تک سے بے بہرہ ہوتے ہیں ؎

شیخ شدی وزاہد شدی ودانشمند ۞ ایں جملہ شدی ولے انساں نہ شدی

پھر کچھ لوگوں کے معتقد ہو جانے پر پندار یہ کہ ہمچوں من دیگرے نیست

کسی صاحب نظر سے تشخیص کرانا ضروری ہے۔

؎ بنما بصاحب نظرے گوہر خود را ۞ عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

ہمیں کہتی ہے دنیا تم ہو دل والے جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو کہ ہو تم بھی تو نظر والے

الی عدی بن عدی ۔ اما عدی فہو ابن عدی بفتح العین فیہما ابن عمیرہ بفتح العین الخ (عمدہ)

یہ عدی بن عدی تابعی ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کی طرف سے جزیرہ کے عامل (گورنر) تھے ۱۲۰ھ میں ان کے

وفات ہوئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے عدی بن عدی رح گورنر کو جو ہدایت نامہ بھیجا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان للایمان: فرائض (بکسر ہمزة إن، وفرائض بالنصب علی انہا اسم ان) ایمان کے لئے فرائض، شرائع حدود اور سنن ہیں۔

تشریح الفاظ فرائض اعمالِ مفروضہ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ شرائع دینی عقائد جو تمام انبیاء میں متفق علیہ تھے۔ وحدودا ای المنہیات یعنی محرمات وممنوعات شرعیہ۔

وسننا ای المندوبات (عمدہ وغیرہ)

فمن استکملہا استکمل الایمان الخ پھر جس نے ان چیزوں کی تکمیل کرلی اس نے ایمان کامل کرلیا اور جس نے ان تمام چیزوں کو پورا نہیں کیا اس نے ایمان کامل نہیں کیا۔

گویا یہ امور اجزاء مقومہ نہیں بلکہ اجزاء مکملہ ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ ان کے نہ ہونے کی شکل میں ایمان جاتا رہے گا بلکہ یہ فرمایا کہ کمال ایمانی ان کے پائے جانے پر موقوف ہے، حافظ عسقلانی رح بھی فرماتے ہیں " فالمراد انہا من المکملات لان الشارع اطلق علی مکملات الایمان ایمانا (فتح ص۴۱)۔

پس ثابت ہوگیا کہ یہ امور حقیقت ایمان میں داخل نہیں، علاوہ بریں امام راغب اصفہانی نے تمام وکمال میں فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تمام ذات کے لیے اور کمال صفات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے پس جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے ارشاد میں اتمام کا لفظ نہیں بلکہ استکمال کا لفظ ہے تو معلوم ہوا کہ سب چیزیں ذات ایمان میں داخل نہیں، پس امام بخاری رح کا مقصد اس سے صرف مرجیہ کی تردید ہے کہ تم اعمال کی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھتے اور تکمیل ایمان کے لئے بھی عمل کو ضروری نہیں قرار دیتے حالانکہ آیات قرآنیہ، اور احادیث نبویہ اور اقوال اکابر میں اعمال کی بہت تاکید ہے اور بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ بغیر عمل کے ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

قولہ فان اعش فسابینہما الخ اگر میں زندہ رہا تو تمام تفصیلات واضح طور سے بیان کردوں گا تاکہ تم عمل کرسکو۔

ممکن ہے کہ اس میں ارادۂ تدوین حدیث کی طرف اشارہ ہو چنانچہ آپ نے ۹۹ھ میں بڑے وسیع پیمانے پر تدوین حدیث کا کام شروع فرمایا جس کی تفصیل " تدوین حدیث " کے تحت گذر چکی ہے۔

وان امت فما انا علی صحبتکم بحریص اور اگر میں مرگیا تو میں تمہاری صحبت کا حریص نہیں ہوں انقطاع عما سوی اللہ کی کیفیت کو کس عجیب انداز سے بیان فرمایا، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس دولت عظمیٰ سے نوازیں۔ آمین۔

وقال ابراہیم علیہ السلام ولکن لیطمئن قلبی اس سے بھی امام بخاری رح ایمان کے قابل زیادۃ ونقصان ہونے پر استدلال فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا احیاء موتیٰ پر ایمان تو پہلے سے تھا لہذا ولکن لیطمئن قلبی سے زیادۃ ایمان مطلوب ہے۔

جواب اطمینان کے معنی ہیں سکون و ٹھہراؤ، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جملہ تو اس پر دلیل ہے کہ آپ کو احیاء موتی کا یقین کامل اور اس پر ایمان بدرجۂ اتم پہلے سے موجود تھا اس لئے کہ کسی چیز کا یقین ہوگا جب ہی تو اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوگا جتنا یقین زیادہ ہوگا اسی قدر شوق میں زیادتی ہوگی اور فرط شوق سے قلب میں اضطراب و بیقراری پیدا ہوتی ہے جو دیکھنے کے بعد سکون سے بدل جاتی ہے۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ احیاء موتی پر ایمان و یقین کامل ہونے کی وجہ سے شوق رویت نے دل کو بیقرار کر رکھا ہے اس لئے، اس کا سکون چاہتا ہوں۔

اس سے ثابت ہوا کہ اطمینان قلب سے زیادۂ ایمان مراد نہیں، ایمان کامل تو پہلے سے موجود تھا اگر معاذ اللہ پہلے یقین نہیں تھا تو دیکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ مثلاً بیت اللہ کو دیکھنے کا شوق اور بیقراری اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو اس کے وجود اور اس کی جلالت شان پر یقین کامل رکھتا ہو (ارشاد الساری)

وقال معاذ اجلس بنا نؤمن ساعة معاذ (لفہم المبیم) یہ وہی مشہور صحابی معاذ بن جبل رضہ انصاری خزرجی ہیں ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے، اٹھارہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے مشہور طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں وفات ہوئی اس وقت ان کی عمر تینتیس ۳۳ سال کی تھی (عمدہ) یہ روایت مسند احمد بن حنبل، مصنف ابن ابی شیبہ کے اندر سند صحیح کے ساتھ موجود ہے کہ اسود بن ہلال کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت معاذ رضہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھو ہم تھوڑی دیر ایمان لائیں۔

ظاہر ہے کہ حضرت معاذ رضہ مومن کامل الایمان تھے اس لئے حضرت معاذ رضہ کا مقصد تھوڑی دیر کیلئے ایمان لانا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ دنیاوی دھندوں میں پڑ کر کچھ غفلت سی آگئی ہے، آؤ ذکر اللہ کے ساتھ اس غفلت کو دور کر کے ایمان کی تجدید اور اسکو تازہ کرلیں، اس روایت سے امام بخاری رحہ کا منشا یہی ہے کہ حضرت معاذ رضہ بھی ایمان کی زیادتی کے قائل تھے مگر یہ زیادتی اصل ایمان میں نہیں بلکہ کیفیت ایمانیہ میں ہے جس سے مرجئہ کی بخوبی تردید ہوگئی۔

وقال ابن مسعود الیقین الایمان کلہ حضرت ابن مسعود رضہ فرماتے ہیں کہ یقین کل کا کل ایمان ہے طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ اس اثر کو نقل کیا ہے، بخاری شریف کے اندر یہ روایت مختصر ہے حافظ نے طبرانی سے پورا اثر نقل کیا ہے الصبر نصف الایمان والیقین الایمان کلہ پہلا جملہ امام بخاری رحہ کے مدعا کیلئے بالکل صریح ہے لیکن امام بخاری رحہ کی یہ عادت ہے کہ کبھی کبھی صاف اور واضح چیز کو حذف کر دیتے ہیں اس سے طلبہ کی تمرین اور مشاقی ہوتی ہے۔

اس جملہ سے امام بخاری رحہ کا استدلال یوں ہوگا کہ اس جملہ میں لفظ کل سے ایمان کی تاکید لائی گئی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ لفظ کل سے تاکید ذو اجزاء شیئ کی لائی جاتی ہے، لہٰذا معلوم ہوگیا کہ ایمان ذو اجزاء ہے اور جب ذو اجزاء ہے تو مرکب بھی ہوگا اور اس میں کمی و زیادتی بھی ہوگی - اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ جب ایمان کا کل ہوگا تو اس کے

اجزاء بھی ہوں گے کیونکہ کل مجموعہ اجزاء کو کہا جاتا ہے، نیز اس جملہ میں یقین کو ایمان کہا گیا ہے اور یقین کے درجات متفاوت ہیں علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، لہٰذا اس سے ایمان میں کمی زیادتی ثابت ہوگئی، حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ ایمان کامل ذو اجزاء ہے اس میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔ البتہ مرجیہ کی بخوبی تردید ہوگئی۔

وقال ابن عمر لا یبلغ العبد حقیقۃ التقوی حتی یدع ما حاك فی الصدر۔ اور حضرت ابن عمر رضہ فرماتے ہیں کہ بندہ تقوی کی حقیقت (کمال تقوی) کو نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ جو بات دل میں کھٹکتی ہو اس کو چھوڑ دے۔

امام بخاری رح کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضہ کے اس قول سے تقوی کے مختلف مراتب ثابت ہوئے اور تقوی ایمان ہی ہے پس معلوم ہوا کہ ایمان کے بھی متفاوت درجات ہیں۔

جواب:۔ نفس ایمان ایک چیز ہے اور تقوی اور چیز ہے جس کے مختلف درجات ہیں، تقوی کے لغوی معنی ہیں مضرت سے بچنا، اور شرعاً ان چیزوں سے بچنا جو اخروی زندگی میں مضر ہوں، تقوی کے درجات شش ہیں (۱) شرک و کفر سے بچنا (۲) بدعات سے بچنا (۳) کبائر سے بچنا (۴) کبائر و صغائر دونوں سے بچنا (۵) مباحات مؤدیہ الی الحرام سے (۶) مشتبہات سے (۷) احتراز عما سوی اللہ تعالیٰ، یہ آخری درجہ خاص مقربین کو حاصل ہوتا ہے، حضرت ابن عمر رضہ کے قول حتی یدع ما حاك فی الصدر سے تقوی کا چھٹا درجہ مراد ہے یعنی مشتبہات سے احتراز، اور یہ قول ماخوذ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد دع ما یریبك الی ما لا یریبك سے۔

بہرحال تقوی کے درجات مختلف ہیں سب سے ادنیٰ درجہ شرک و کفر سے بچنا ہے اور اعلیٰ درجہ جو اخص الخواص یعنی مقربین کا تقوی یہ ہے کہ ہر ما سوی اللہ سے پرہیز کرے یعنی ہر کام میں رضائے الٰہی مقصود ہو۔

اس سے بھی مرجیہ ہی کی تردید ہوتی ہے کہ اعمال کو ایمان کے سلسلے میں قطعاً موثر نہیں مانتے حالانکہ چھوٹے چھوٹے اعمال کو بھی تقوی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

وقال مجاهد شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا اوصیناك یا محمد وایاه دینا واحدا

اور مجاہد رح نے آیت کریمہ شرع لکم من الدین الآیۃ (الشوری) کی تفسیر میں فرمایا کہ اے محمد (صلعم) ہم نے آپ کو اور حضرت نوح ع کو ایک ہی دین کی وصیت کی (یعنی حکم دیا ہے) حضرت عبد اللہ بن عباس رضہ کے خاص شاگرد امام مجاہد رح کے قول سے امام بخاری رح یوں استدلال کرتے ہیں کہ جمیع انبیاء ع کا دین یعنی ایمان ایک ہے معہذا یہ ادیان فروع و جزئیات میں مختلف ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے درجات متفاوت ہوتے ہیں۔

جواب:۔ یہ آیت اور حضرت مجاہد رح کی یہ تفسیر احناف کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس سے اصول دین میں اتحاد اور فروع میں اختلاف ثابت ہوا، پس احناف بھی یوں ہی سمجھتے ہیں کہ اصل ایمان مرکب نہیں اور اس میں زیادۃ ونقصان کا کوئی احتمال نہیں، ہاں فروع میں کمی و زیادتی ہوتی ہے البتہ مرجیہ کی بخوبی تردید ہوتی ہے۔

وقال ابن عباس شرعۃ ومنہاجا سبیلا وسنۃ اور حضرت ابن عباس رضہ کہتے ہیں کہ آیت لکلّ جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجا (مائدہ) میں شرعۃ سے مراد سنت ہے اور منہاج سے سبیلا ہے یہ تفسیر لف ونشر غیر مرتب ہے۔

قال الحافظ ہ فیہ لف ونشر غیر مرتب (فتح، عمدہ، ارشاد الساری)

مطلب یہ ہے کہ منہاج بڑے راستے کو کہتے ہیں اور بڑے راستہ میں سے جو چھوٹا راستہ نکلتا ہے اسکو شرعۃ کہتے ہیں، کبھی کبھی مستقل چھوٹے راستے کو بھی شرعۃ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضہ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ دین تو ایک ہے، لیکن کسی کو منہاج کہتے ہیں اور کسی کو شرعۃ، پس زیادتی وکمی ثابت ہوگئی۔

حضرت ابن عباس رضہ کا ارشاد مستقل دلیل بھی ہو سکتا ہے اور حضرت مجاہد رحہ کے قول کے ساتھ ملاکر بھی دلیل، بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ امام بخاری رحہ کا مقصد دونوں آیات میں تطبیق دینا ہے کیونکہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء عم کا دین ایک ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کا راستہ علیحدہ ہے تو مؤلف امام رحہ نے جواب دیا کہ اتحاد اصول دین میں ہے اور اختلاف جزئیات وفروع میں ہے۔

بعض علماء نے لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجا کو خاص اسی امت خیر الامم پر محمول کیا ہے کہ مرد، عورت، مقیم، مسافر اور مریض وتندرست کے احکام الگ الگ ہیں۔

قولہ دعاؤکم ایمانکم امام بخاری رحہ کا مقصد یہ ہے کہ ابن عباس رضہ دعا کو ایمان قرار دے رہے ہیں اور دعاء ایک عمل ہے پس معلوم ہوا کہ عمل ایمان کامل میں داخل ہے، پھر دعا میں کمی وزیادتی بھی ہوتی ہے لہذا امام بخاری رحہ کا دونوں مدعا ثابت ہوگیا۔

پوری آیت یوں ہے جو سورۂ فرقان کی آخری آیت ہے:۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لولا دعاؤکم آپ کہدیجئے میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا اگر تم اسکو نہ پکارو کیونکہ انسانوں کی پکار اللہ تعالیٰ کے عذاب کو تھامے ہوئے ہے، صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے۔ لا تقوم الساعۃ حتی لا یقال فی الارض اللہ اللہ" ایک اور ضعیف حدیث ہے لولا شبان خشع وبہائم رتع وشیوخ رکع واطفال رضع لصب علیکم العذاب صبا" معلوم ہوا کہ ضعف اور عجز وانکسار اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرتا ہے۔

شبان خشع کو سب سے پہلے لانے میں غالبًا اس کی اہمیت کیطرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں جوانی میں خشوع کی بہت بڑی قدر ہے ؎

درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است ÷ وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

حضرت مولانا نانوتوی رحہ نے کیا معرفت کی بات ارشاد فرمائی کہ حق تعالیٰ کے دربار میں ایک چیز نہیں ہے اور جس دربار میں جو چیز نہیں ہوتی اس کی بڑی قدر ہوتی ہے، وہ چیز ہے بندوں کی گریہ وزاری اور ندامت

دشواری۔ قال الرومی رحمہ اللہ تعالیٰ ؎

کہ برابر می کند شاہ مجید — اشک را در وزن باخونِ شہید

نالۂ مومن ہمی داریم دوست — گو تضرع کن کہ ایں اعزاز اوست

(ماخوذ از ارشاد القاری)

امام بخاری رہ کے دلائل پر ایک نظر

امام بخاری رہ کے ترجمہ اور دلائل کا رُخ مرجئہ اور معتزلہ کی طرف ہے اہل سنت درمیان میں ہیں لیکن ان میں سے کوئی مرجیہ سے قریب ہے اور کوئی معتزلہ سے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رہ یہی تجزیہ فرمایا کرتے تھے لیکن اگر کوئی اس حقیقت سے قطع نظر کرکے یہی کہتا ہے کہ امام بخاری نے یہاں امام اعظم ابو حنیفہ رہ ہی کا رخ کیا ہے تب ہم امام بخاری رہ سے سوال کریں گے کہ معاملہ ایمانیات کا ہے اور آپ اس سلسلہ میں امام اعظم رہ سے الجھ رہے ہیں آپ نے جو ترجمہ قائم فرمایا ہے وہ بنی الاسلام علی خمس " ہے، دعویٰ تو ایمان کے زائد وناقص ہونے کا ہے اور جو دلائل اس کے ثبوت کیلئے پیش فرماتے ہیں ان سے ایمان کی نہیں اسلام کی کمی بیشی کا اثبات کیا، کہیں محبت کا ذکر ہے، کہیں تقویٰ کی کمی بیشی کا بیان ہے، محبت اور تقویٰ کے زائد وناقص ہونیکا ہمیں بھی انکار نہیں ہے۔ اسلام کے اندر اعمال داخل ہیں ہم بھی اس کا انکار نہیں کرتے لیکن نفس ایمان کا زائد وناقص ہونا جس کا کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے وہ ان دلائل سے ثابت نہیں ہوتا۔

۷ — حدثنا عبید اللہ بن موسیٰ قال اخبرنا حنظلۃ بن ابی سفیان عن عکرمۃ بن خالد عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان۔

ترجمہ ہم سے بیان کیا عبید اللہ بن موسیٰ نے، کہا ہم کو خبر دی حنظلہ بن ابی سفیان نے انھوں نے سُنا عکرمہ بن خالد سے انھوں نے ابن عمر رض سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی ہے، اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ایضاً فی التفسیر ص ۶۴۸ حدیث ۴۱ دھنا بخاری اول ص ۶ ایضاً اخرجہ مسلم وغیرہ۔

مطابقۃ للترجمۃ ترجمۃ الباب سے حدیث کی مطابقت بالکل واضح ہے لان ہٰذا الحدیث ہو ترجمۃ الباب ۔

بیان رجالہ وہم اربعۃ الاول عبید اللہ بن موسیٰ توفی بالاسکندریۃ سنۃ ثلاث عشر او اربعۃ عشر ومائتین یعنی ۲۱۳ھ یا ۲۱۴ھ میں انتقال ہوا۔

الثانی حنظلۃ بن ابی سفیان ہو قرشی مکی من ذریۃ صفوان بن امیۃ المتوفی سنۃ احدی وخمسین ومائۃ ۔ ۱۵۱

الثالث :- عکرمۃ بن خالد بن العاصی مات بعد عطاء وعطاء مات ۱۱۴ھ یا ۱۱۵ھ (عمدہ)

تنبیہ عکرمۃ بن خالد بن العاصی کے طبقہ میں عکرمہ بن خالد بن سلمہ بن ہشام مخزومی بھی ہیں جو ضعیف ہیں بخاری شریف میں ان کی روایت نہیں اور نہ ابن عمر رضہ سے ان کی روایت ہے فتنبہ فانہ موضع الاشتباہ (عمدہ)

الرابع ابن عمر ہو عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما۔

ابن عمر رضہ کا مختصر حال یہ ابن عمر حضرت فاروق اعظم عمر بن خطاب رضہ کے صاحبزادے عبد اللہ بن عمر ہیں اور ام المؤمنین حضرت حفصہ رضہ کے حقیقی بھائی ہیں ان کی والدہ ماجدہ زینب بنت مظعون ہیں جو حضرت عثمان بن مظعون کی ہمشیرہ تھیں ۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضہ قدیم الاسلام ہیں اپنے والد ماجد کے ساتھ مکہ معظمہ میں بچپنے میں مشرف باسلام ہوگئے اور اپنے والد ہی کے ساتھ ہجرت بھی کیا ۔

بعضوں کا خیال ہے کہ ابن عمر رضہ اپنے والد سے پہلے مسلمان بھی ہوئے اور ہجرت بھی پہلے ہی کیا لیکن یہ قول صحیح نہیں جیسا کہ خود عبد اللہ بن عمر رضہ کے شاگرد نافع رحہ نے اس کی تردید کی ہے کما فی البخاری جلد ثانی ص۶۰۱ نصر الباری کتاب المغازی حدیث ۲۱۴)۔ کم سنی کی وجہ سے غزوۂ بدر وغزوۂ احد میں شریک نہ ہوسکے، غزوۂ احد میں شرکت کرنی چاہتے تھے مگر پورے پندرہ سال کے نہ ہونے کی وجہ سے واپس کردئے اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے ۔ وہو اکثر الصحابۃ روایۃ بعد ابی ہریرۃ (عمدہ ص۱۱۶) حضرت ابوہریرہ کے بعد تمام صحابہ میں سب سے زیادہ کثیر الروایت ہیں ان سے دو ہزار چھ سو تیس ۲۶۳۰ حدیثیں مروی ہیں، ایک سو ستر ۱۷۰ روایتوں کی تخریج میں شیخین متفق ہیں بخاری شریف میں ان کی اکیاسی ۸۱ حدیثیں ایسی ہیں جو مسلم میں نہیں اور مسلم شریف میں ان سے اکتیس ۳۱ روایتیں ایسی ہیں جو بخاری میں نہیں ۔ (عمدہ ص۱۱۶)

وفات :- عبد الملک بن مروان نے حجاج بن یوسف کو تاکید کردی تھی کہ امور حج میں ابن عمر رضہ کی مخالفت نہ کرے یہ چیز حجاج کو ناگوار گذری جب عرفات سے لوگوں کی واپسی ہوئی تو حجاج کے اشارہ سے ایک شخص نے زہر آلود نیزہ قدم میں لگا دیا یہ چند ہی دن بیمار رہکر ذی الحجہ ۷۳ھ میں شہادت سے مشرف ہوئے ۔

تشریح حدیث اس حدیث میں اسلام کو ایک خیمے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو پانچ دعائم

(ستونوں) پر قائم ہے ایک عمود وقطب (درمیانی مستحکم ومضبوط ستون) اور چاروں طرف اوتاد (کھونٹے)۔ تو جس طرح خیمہ کی اصل بنیاد درمیانی ستون (قطب) پر ہے اور اس کی تکمیل کیلئے (یعنی اس کے پھیلاؤ کو قائم رکھنے کیلئے) چاروں طرف اوتاد (کھونٹے) گاڑ کر رسیوں سے باندھ دیئے جاتے ہیں اور اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اس میں بیچ کا عمود (قطب) اگر نہ ہو خواہ اوتاد باقی بھی رہیں تو خیمہ قائم نہیں رہیگا یہی نوعیت اسلام کے ان امور خمسہ کی ہے شہادت توحید ورسالت بمنزلہ عمود (قطب) کے ہیں جس پر خیمۂ اسلام کھڑا ہے اور نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بمنزلہ چاروں اوتاد وارکان کے ہیں، اگر شہادتین (تصدیق قلبی) موجود ہوں اور چاروں ارکانوں میں سے سب کے سب یا کوئی ایک ساقط ہو جائے تو بھی ایمان باقی رہیگا البتہ جس طرف کا ستون ساقط ہو گا رسیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی اس طرف سے ناقص رہے گا۔ لیکن اگر شہادتین ہی ساقط ہو جائیں تو پھر ایمان کا نام ونشان باقی نہیں رہیگا۔

تو جس طرح خیمہ گرمی، سردی، بارش وغیرہ آفات جسمانیہ سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح اسلام آفاتِ آخرت سے محفوظ رکھتا ہے۔

اشکال

ارکانِ اسلام تو اور بھی ہیں صرف پانچ کی تخصیص کیوں کی گئی؟

جواب: ۱۔ ان پانچ ارکان میں حصر مقصود نہیں صرف مشہور ترین ارکان کو بیان کر دیا۔

۲۔ ارکان اسلام کی مختلف انواع میں سے ہر نوع کا ایک رکن بیان کر دیا گیا ہے چنانچہ احکام یا قبیل اعتقاد سے ہوں گے یا قبیل اعمال سے، امور اعتقادیہ میں سے شہادتین کا ذکر فرمایا۔

پھر اعمال کی دو قسمیں ہیں ایجابی وسلبی (وجودی ہوں گے یا ترکی) اعمال سلبیہ (یعنی ترکی) میں سے صوم پر اکتفا فرمایا۔

پھر اعمال ایجابیہ کی تین قسمیں ہیں، محض بدنی، محض مالی، بدنی ومالی دونوں سے مرکب۔ محض بدنی میں سے نماز، محض مالی میں سے زکوٰۃ اور مرکب میں سے حج کو بیان فرمایا۔

الفاظ حدیث کی تقدیم وتاخیر

بخاری شریف کی اس روایت میں حج مقدم ہے اور صوم مؤخر ہے امام بخاری رح نے اسی روایت پر اعتماد بھی کیا چنانچہ صحیح بخاری میں کتاب الحج کو پہلے اور کتاب الصوم کو بعد میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس روایت سے امام بخاری رح نے اپنی کتاب کی ترتیب کی جانب اشارہ کیا ہے۔

صحیح مسلم شریف میں ہے کہ ابن عمر رض کے ایک تلمیذ (بشر بن السکسکی) نے ان کو یہ روایت پڑھکر سنائی تو اس میں یوں کہا "والحج وصیام رمضان"

اس پر حضرت ابن عمر رض نے فرمایا "لا صیام رمضان والحج هکذا سمعته من رسول الله صلی الله علیه وسلم" اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم رمضان کو حج سے مقدم ذکر فرمایا تھا لہذا صحیح بخاری میں جو ذکر حج مقدم ہے اسے روایت بالمعنی پر محمول کیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی راوی کو وہم ہو گیا

صحیح مسلم میں ابن عمرؓ کی تصحیح سے امام نووی رح کے استاذ حافظ ابن صلاح نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ واؤ ترتیب کیلئے آتی ہے، ابن صلاح کے اس استدلال کا جواب خود شوافع میں سے نووی اور حافظ رحمہما اللہ نے یہ دیا ہے کہ ابن عمرؓ نے یہ تصحیح اس لئے نہیں فرمائی کہ ان کے یہاں واؤ ترتیب کے لئے ہے بلکہ تصحیح سے مقصد یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے الفاظ جس طرح ثابت ہوں ان کو حتی المقدور ویسے ہی نقل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

واؤ اگرچہ ترتیب کیلئے نہیں آتی مگر ترتیب ذکری میں کلام بلغاء میں عموماً اور کلام اللہ وکلام الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خصوصاً کوئی نکتہ ضرور ہوتا ہے چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ کی ترتیب ذکری ملحوظ رکھتے ہوئے صفا سے سعی کی ابتدا فرمائی اور فرمایا نبدأ بما بدأ اللہ به ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ "

اس حدیث میں صوم کو حج سے مقدم کرنے کی حکمت حافظ رح نے یہ بیان فرمائی ہے کہ صوم کی فرضیت حج سے پہلے ہوتی ہے، صوم ۲ھ میں فرض ہوا، اور حج علی اختلاف الاقوال ۶ھ یا ۹ھ میں فرض ہوا، چونکہ صوم کی فرضیت مقدم تھی لہٰذا ترتیب ذکری میں بھی اسے مقدم رکھنا مناسب تھا۔

نیز صوم کی تقدیم اس لئے بھی مناسب ہے کہ صوم کا مکلف ہر بالغ ہے اور حج کا مکلف ہر بالغ نہیں۔

نیز یہ کہ حج پوری زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے اور روزہ ہر سال لازم ہوتا ہے۔

اعمال اربعہ کی تشریح

یہ اعمال وعبادات دو طرح کی ہیں، ایک کا تعلق اللہ تعالیٰ کی شان حاکمانہ سے ہے کہ وہ حاکم ہیں اور ہم محکوم۔

اور دوسری قسم شان محبوبیت سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ بعض عبادات شان جلالی کی مظہر ہیں اور بعض شان جمالی کی۔

نماز اور زکوٰۃ حاکمانہ شان کی مظہر ہیں جس سے جلال باری تعالیٰ کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ اذان دربار شاہی کھلنے کی گھنٹی ہے، دربار میں حاضری کے لئے بدن اور لباس کی طہارت وصفائی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور عمدہ لباس اختیار کیا جاتا ہے۔ "خذوا زینتکم عند کل مسجد (اعراف) تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

اور دربار کی طرف دوڑتے ہوئے نہیں بلکہ وقار کے ساتھ جایا جاتا ہے، حاکم کی خاص مجلس میں حاضر ہونے سے قبل کچھ وقت انتظار کرنا پڑتا ہے لہٰذا نماز میں بھی مناسب یہ ہے کہ جماعت قائم ہونے سے کچھ پہلے مسجد میں پہونچکر انتظار کرے اس کے بعد اللہ اکبر کہتا ہوا ہاتھوں کے اشارے سے اس عالم کو پس پشت ڈال کر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوتا ہے یہی ہے تکبیر تحریمہ۔

شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ ہاتھوں کو اٹھا کر باندھنے سے پہلے کچھ خفیف ارسال کرے جس میں ہتھیلیوں سے

ذرا سا اشارہ ہو جائے پیچھے کی طرف کہ تمام غیر اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔

حاکم کے دربار میں پہونچکر سب لوگ پہلے سلام و آداب بجالاتے ہیں اس لئے حکم ہوا کہ نماز شروع کرتے ہی امام اور سب مقتدی ثنا پڑھیں، اس کے بعد سب حاضرین کی طرف سے ایک نمائندہ درخواست پیش کرتا ہے، اس لئے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ صرف امام ہی پڑھے کیونکہ یہ درخواست ہے، درخواست کا مضمون بھی اللہ تعالیٰ نے خود سکھلا دیا۔ اس لئے اس سورت کے ناموں میں سے ایک نام سورۂ تعلیم المسئلہ بھی ہے۔

فاتحہ کے جملوں پر دادِ خداوندی

اس درخواست کے ہر جملہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے داد بھی دی جاتی ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قسمت الصلوٰة بيني وبين عبدي نصفين ولعبدي ماسأل فاذا قال العبد الحمد لله رب العالمين قال الله تعالى حمدني عبدي واذا قال الرحمن الرحيم قال الله اثنى علي عبدي واذا قال مالك يوم الدين قال مجدني عبدي فاذا قال اياك نعبد واياك نستعين قال هذا بيني وبين عبدي ولعبدي ماسأل فاذا قال اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال هذا لعبدي ولعبدي ماسأل۔

میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نماز کو تقسیم کر دی ہے اور میرا بندہ جو مانگتا ہے وہ ملتا ہے تو جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری تعریف کی، اور جب بندہ الرحمن الرحیم کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری توصیف کی، اور جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری بزرگی بیان کی اور جب بندہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان (آدھی آدھی) تقسیم ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا ملیگا (سورہ کا آخری حصہ میرے بندہ کے لئے ہے) جب بندہ کہتا ہے اہدنا الصراط المستقیم الآیۃ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ سب میرے بندہ کے لئے ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ ملے گا۔ (مسلم شریف جلد اول ص۱۶۹ تا ص۱۷۰ ایضاً مشکوٰۃ شریف)

اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کی ہر آیت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے داد دیجاتی ہے۔ حدیث سے بھی ثابت ہے کہ حضور اقدس صلعم سورۂ فاتحہ کی ہر آیت پر وقف فرماتے تھے۔ اس بنا پر ہم لوگوں کو بھی چاہیئے کہ سورہ فاتحہ کی ہر آیت پر وقف کریں اور تصور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سن لیا اور جواب دیا۔

اس غرض سے وقف کرنے پر شیخ اکبر، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ نے تنبیہ فرمائی ہے۔ احقر نے شیخی واستاذی شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کو ہمیشہ اس پر عمل کرتے دیکھا۔

اس کے بعد سب مقتدی آمین کہکر امام کی پیش کردہ درخواست کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ امام قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھ کر سنا دیا جاتا ہے کہ تم نے اھدنا الصراط المستقیم میں جو ہدایت طلب کی ہے اس کے جواب میں ہم تمہیں یہ کتاب دیتے ہیں جو ھدی للمتقین ہے۔

نماز میں یہاں تک تو صرف زبان سے حمد و ثنا تھی آگے جوارح سے بھی آداب بجالانے کیلئے رکوع میں جھک جاتا ہے، اس کے بعد امام سمع اللہ لمن حمدہ کہکر یہ بشارت دیتا ہے کہ آپ کی قولی و فعلی حمد قبول ہوگئی، اس بشارت پر بطور شکر مقتدی ربنا ولک الحمد کہکر مزید حمد کرتے ہیں۔

پھر احکم الحاکمین کے سامنے انتہائی تذلّل کے اظہار کیلئے اشرف الاعضاء یعنی چہرہ خاک میں ملا دیتا ہے اور مکرر سجدہ کرکے یہ ظاہر کرتا ہے کہ شان جلالی و جمالی دونوں پر مٹنے کیلئے تیار ہے۔

حکمت زکوٰۃ نماز پڑھکر جب احکم الحاکمین کی حکومت تسلیم کرلیا اور اپنے غلام اور محکوم ہونے کا اقرار و اظہار کردیا کہ میں تیرا ہی غلام اور فرمانبردار محکوم ہوں، تیری ہی حکومت میں بس رہا ہوں۔

اور ہر حکومت کا یہ قاعدہ ہے کہ رعایا کے اوپر ٹیکس لگایا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری رعایا جان و مال دونوں سے حاضر ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حاکمانہ شان سے زکوٰۃ کو فرض کرکے حکم دیا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ اور بندہ زکوٰۃ ادا کرکے یہ ثابت کرتا ہے کہ ہم جیسے اپنی جان سے حاضر ہیں اسی طرح مال سے بھی حاضر ہیں۔

غرضیکہ نماز و زکوٰۃ شان جلالی یعنی حاکمانہ شان کی مظہر ہیں اور صوم و حج شان جمالی یعنی محبوبیت کے مظہر ہیں۔

پہلی عبادت روزہ ہے کہ اس میں ماسوا اللہ کو ترک کرنا ہے، تین ہی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ترک کرنے کے بعد انسان کو کسی چیز کی حاجت نہیں رہ جاتی اور وہ تینوں چیزیں کھانا پینا اور جماع ہیں۔

امام غزالی رح کہتے ہیں کہ ریاضت دو شہوتوں کے کسر و انقطاع کا نام ہے اور وہ شہوت بطن اور شہوت فرج اور ان شہوتوں کے ترک کا نام روزہ ہے بشرطیکہ نیت ہو حکم الٰہی کی بجا آوری اور اسی کی طرف انتساب کی۔

روزہ، حج بندہ ان دونوں کو ادا کرکے اپنی محبانہ و عاشقانہ شان کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر عاشق ہوتا ہے تو عشق کی پہلی منزل یہ ہے کہ ان کا کھانا اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے، پھر دوسری منزل یہ آتی ہے کہ عاشق صادق ہر چیز سے قطع تعلق کرکے خلوت میں بیٹھکر محبوب کے تصور میں ہمہ تن منہمک رہتا ہے۔

؎ جی چاہتا ہے بس یہی فرصت کے رات دن ؛ بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

پھر تیسری منزل یہ آتی ہے کہ جب تنہائی میں محبوب کا تصور کرتے کرتے اس کی محبت رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر عاشق صادق تنہائی کو بھی چھوڑ کر محبوب کے گھر کا راستہ لیتا ہے۔

؎ ہٹو میری نظروں سے امواج رنگیں ؛ یہ کشتی پیا کے نگر جا رہی ہے

اور محبوب کے گلیوں کا طواف کرتا ہے، در و دیوار کو بوسہ دیتا ہے۔

امر علی الدیار دیار لیلی ✽ اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی ✽ ولکن حب من سکن الدیارا

پائے سگ بوسیدہ مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود
گفت گاہے گاہے ایں در کوئے لیلیٰ رفتہ بود

باب امور الایمان
ایمان کے کاموں کا بیان

وقول اللہ عزوجل لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ الی قولہ المتقون قد افلح المؤمنون الآیۃ۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں کہ نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنا منھ (عبادت میں) مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ (اصل) نیکی ان کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اخیر آیت متقون تک اور قد افلح المؤمنون اخیر تک۔

تشریح باب امور الایمان یہ خبر ہے مبتدا محذوف کی اسلئے لفظ باب مرفوع ہے، ای ہذا باب فی امور الایمان (عمدہ) پھر یا تو اضافت بیانیہ ہو تو اس صورت میں عبارت کی تقدیر یوں ہوگی "باب الامور التی ہی الایمان" یعنی وہ امور جو عین ایمان ہیں۔

امام بخاری رح کے اصول کے مطابق اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ ان کی بحث ایمان کامل سے ہے اور اعمال ایمان کامل میں داخل ہیں۔

یا اضافت لامیہ ہوگی تو اس صورت میں عبارت ہوگی "باب الامور التی ہی مکملات للایمان۔

وقول اللہ عزوجل بالجر عطف علی امور (قس)

ماقبل سے ربط باب سابق میں ایمان کے پانچ ارکان یعنی بنیادی چیزوں کو ذکر کیا گیا تھا اب اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان کے اور بھی بہت سے ارکان ہیں۔

قطب الاقطاب حضرت گنگوہی رح سے منقول ہے کہ اوپر کی حدیث بنی الاسلام علی خمس سے شبہ ہوسکتا تھا کہ اسلام کے ارکان صرف پانچ ہی ہیں، تو اس شبہ کو دفع کرنے کیلئے امام بخاری رح نے یہ باب منعقد کیا اور بتا دیا کہ پانچ کے اندر انحصار نہیں ہے بلکہ ایمان کے نو ساٹھ سے زیادہ شعبے ہیں ماقبل میں تو صرف پانچ بڑے بڑے بنیادی ارکان ذکر کئے گئے تھے کل کو نہیں بیان کیا گیا تھا (امداد الباری جلد ۲)

امام بخاری رہ بالکل واضح طریقہ پر یہ بتلا رہے ہیں کہ ایمان چند امور کے مجموعہ کا نام ہے اور اس سے مقصد مرجیہ کی تردید ہے جو اعمال کو لاشیٔ قرار دیتے ہیں۔

آیات مذکورہ سے ترجمہ کا ربط

امام بخاری رہ نے دو آیتیں ترجمۃ الباب میں ذکر کی ہیں جو امور ایمان کو شامل ہیں اور ترجمۃ الباب بھی امور ایمان ہی سے متعلق ہے اسلئے آیت اور ترجمۃ الباب میں مطابقت ظاہر ہے۔

پہلی آیت ہے " لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ الخ (پ۲ ع۶) ترجمہ گزر چکا ہے۔

اشکال

آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ توجہ الی القبلہ بر (نیکی) نہیں حالانکہ استقبال قبلہ فرض ہے۔

جواب :- ایک بر کی صورت ہوتی ہے اور دوسری اس کی روح (حقیقت) مقصد یہ ہے کہ توجہ الی القبلہ بر کی صورت ہے اور بر کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے وہ جدھر منھ کرنیکا حکم دیں اسی جہت کا استقبال بر ہوجائے گا۔

سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت جس کو امام بخاری رہ نے منتخب کیا ہے یہ آیت امور ایمان اور انواع احکام پر بہت ہی جامع اور حاوی ہے۔ پوری آیت میں تین چیزوں کا بیان ہے، پہلی چیز تو وہ ہیں جو تصحیح عقائد سے متعلق ہیں ان کو " مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (بقرہ آیت ۱۷۷) جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب پیغمبروں پر۔

میں بیان کیا۔ اور دوسری چیز وہ ہے جو حسن معاشرت سے متعلق ہے۔ اس کو " وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ۔ اور مال دے اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو، اور گردنیں چھڑانے میں۔

بیان کیا گیا۔ تیسری چیز وہ ہے جو تہذیب نفس سے متعلق ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک فرائض کی ادائیگی سے متعلق ہے اور دوسرا حسن اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔

فرائض کی ادائیگی کو واقام الصلوٰۃ وآتی الزکوٰۃ " میں بیان کیا گیا۔

اور تہذیب نفس کے سلسلہ میں حسن اخلاق سے تعلق رکھنے والی چیز کو والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصّٰبرین فی البأساء والضراء وحین الباس " میں ارشاد فرمایا گیا۔

اس آیت میں تمام انواع بر بیان کرنے کے بعد آخر آیت میں فرمایا اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون (بقرہ آیت ۱۷۷)۔

امام بخاری رہ نے اس آیت سے اس طرح استدلال کیا کہ بِر، میں عقائد و اعمال سب کو ذکر کیا گیا ہے اس سے

معلوم ہوا کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں، اور بخاری رح کے مذاق کے مطابق پر دا یمان متحد ہیں مگر حنفیہ کے نزدیک نفس ایمان دو پر متحد نہیں ہیں اور یہ آیت ایک حیثیت سے حنفیہ کی موید ہے کیونکہ آیت میں اعمال کو ایمان پر عطف کیا گیا ہے اور عطف میں اصل تغایر ہے یعنی معطوف دراصل معطوف علیہ سے مغایر ہوتا ہے، اس عطف سے ظاہر ہوگیا کہ اعمال ایمان سے علیحدہ ہیں۔

دوسری آیات جو امام بخاری رح نے ذکر فرمایا ہے "قد افلح المؤمنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون الآیة (سورۂ مؤمنون پ۱۸)۔

ترجمہ:۔ یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغویات سے دور رہنے والے ہیں اور جو (اعمال و اخلاق میں) تزکیہ کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ طلبگار ہوں ایسے لوگ حد سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات میں مؤمنین کے صفات ہیں خواہ کاشفہ ہوں یا مادحہ؟ مفسرین نے دونوں احتمال بیان کیے ہیں۔

بہرصورت اتنا ضرور معلوم ہوگیا کہ کامیاب وہی لوگ ہیں جو ان کاموں کو کریں۔

پس مرجیہ کا یہ کہنا کہ تصدیق کے بعد کسی عمل خیر کی ضرورت نہیں بغیر عمل کے بھی انسان کامیاب ہوسکتا ہے غلط ہوگیا۔

(۸) حدثنا عبدُ اللهِ بنُ محمدٍ الجُعفیُّ قال ثنا ابو عامرٍ العقدیُّ قال ثنا سُلیمانُ بنُ بلالٍ عن عبدِ اللهِ بنِ دینارٍ عن ابی صالحٍ عن ابی هریرةَ عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم قال الایمانُ بِضعٌ وستّونَ شعبةً والحیاءُ شعبةٌ مِنَ الایمانِ۔

ترجمہ حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کے ساٹھ سے کچھ زائد شعبے ہیں اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ (شاخ) ہے۔

الفاظ روایت میں اختلاف

صحاح ستہ میں اس حدیث کے الفاظ چار طرح سے منقول ہیں ۱ بخاری شریف کی اس حدیث میں بضع وستون ہے ۲ مسلم شریف کے کتاب الایمان ص۴۷ میں ایک روایت ہے الایمان بضع وسبعون شعبة، ۳ مسلم شریف کے اسی مذکورہ صفحہ پر ایک روایت کے الفاظ ہیں بضع وسبعون او بضع وستون الخ یعنی شک راوی کے ساتھ منقول ہے ۴ ترمذی جلد ثانی کتاب الایمان کی ایک روایت ہے الایمان اربعة وستون بابا۔

ترمذی کی روایت کے متعلق حافظ فرماتے ہیں کہ وہ معلول ہے۔
اب صرف صحیحین کی روایت میں جو اختلاف نظر آتا ہے محدثین کرام نے تطبیق کے مختلف وجوہ بیان کئے ہیں۔
(۱) قاضی عیاض اور امام نووی رح فرماتے ہیں کہ تمام راویوں اور روایتوں پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت بالاکثر یعنی بضع وسبعون والی روایت راجح ہے۔ وجہ ترجیح یہ ہے کہ ثقات کی زیادتی مقبول ہے۔ ۲ عدد اقل اکثر کی نفی نہیں کرتا یعنی بضع وسبعون میں بضع وستون داخل ہے ۳ ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کم شعبوں کا علم دیا گیا ہو اور آپ نے ستون فرمایا پھر بعد میں اضافہ کر دیا گیا تو آپ نے سبعون فرما دیا ہو اور یہ بالکل ظاہر ہے اس لئے کہ احکامات بتدریج نازل ہوئے ہیں۔
(۲) امام بخاری اور ابن صلاح وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ روایت بالاقل یعنی ستون کی روایت راجح ہے اسلئے کہ اقل یقینی ہے جو تمام روایات میں ہے۔ ۲ بخاری شریف کی روایت کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔
مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ تحدید یعنی تعیین عدد مراد نہیں ہے بلکہ مراد تکثیر ہے یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں اور یہ بہت مشہور ہے کہ عرب میں سبعون کا لفظ تکثیر کیلئے مستعمل ہے اس صورت میں اختلافی روایات کا اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تشریح حدیث اس حدیث میں ایمان کو ایک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ارشاد خداوندی ہے مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ کی آیت میں اس مضمون کی تصریح ہے اور ظاہر ہے کہ درخت میں جتنے ہی پھل پھول اور شاخیں ہوں گی اتنا ہی درخت کامل ہوگا اس کے اندر رونق وزینت پیدا ہوگی۔ تو جس طرح سے پھل پھول اور شاخوں کے ذریعہ درخت میں کمال پیدا ہوتا ہے رونق پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اعمال کے ذریعہ ایمان میں رونق پیدا ہوتی ہے، کمال متحقق ہوتا ہے۔
اور جس طرح سے ان پتوں وغیرہ کے جھڑ جانے سے درخت کی رونق ختم ہو جاتی ہے اسی طرح سے اعمال کے نہ ہونے کی وجہ سے ایمان کی بھی رونق وزینت ختم ہو جاتی ہے، ناقص ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے مرجۂ کی تردید ہوگئی۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ عمل جس کو کتاب وسنت نے ضروری قرار دیا ہو اور اس کے نہ ہونے کو مضر قرار دیا ہو ان سب آیات واحادیث سے مرجیہ کی بخوبی تردید ہوتی ہے کیونکہ مرجۂ نہ تو عمل ہی کو ضروری قرار دیتے ہیں اور نہ معصیت ہی کو مضر مانتے ہیں۔
اسی سے معتزلہ وخوارج کی بھی تردید ہو سکتی ہے کیونکہ درخت کی کسی شاخ کے ختم ہونے سے درخت ختم نہیں ہوتا جب تک کہ اصل موجود ہے، اسی طرح جب تک کہ تصدیق موجود ہے اعمال کے نہ ہونے سے ایمان ختم نہیں ہوتا۔
قولہ بضع بکسر الموحدہ وقد تفتح (قس)، اس لفظ کے معنی اور مقدار میں قدرے اختلاف منقول ہے لیکن صحیح تر قول یہ ہے کہ بضع کا اطلاق تین سے نو تک آتا ہے تو بضع وستون کے معنی یہ ہوئے کہ ساٹھ سے کچھ اوپر۔

والحیاء شعبۃ من الایمان اور حیار ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

حیار کے لغوی معنی ہیں شرم یعنی لغوی معنی اس انکساری اور شکستگی کو کہتے ہیں جو کسی سزا یا ملامت کے ڈر سے انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے حیار کی تعبیر یہ کی ہے کہ کسی مکروہ فعل کے ارتکاب کے خوف سے نفس میں جو انقباض ہوتا ہے اس کو حیار کہتے ہیں۔

حیار کے شرعی معنی حیار وہ خلق اور فطری ملکہ ہے جو قبیح چیز سے اجتناب و کنارہ کشی پر آمادہ کرے اور صاحبِ حق کے حق میں کوتاہی کرنے سے روکے، اسی وجہ سے ایک حدیث میں ہے "الحیاء خیر کلہ"

اشکال حیار (شرم)، تو طبعی و فطری چیز ہے اور ایمان اختیاری ہے پھر اس کو ایمان کا شعبہ کس طرح قرار دیا گیا؟

جواب:- حیار کی دو قسمیں ہیں طبعی، شرعی، یہاں شرعی مراد ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حیار سے مراد حیار کے ثمرات و نتائج ہیں یعنی حیار کسبی مراد ہے جو عمل کی مزاولت ومداومت سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص ہمیشہ پابندی سے نماز پڑھتا ہو اسے ترک نماز سے انقباض ہوگا۔ عرصہ سے ڈاڑھی رکھے ہوئے ہے تو اب ڈاڑھی کٹانے سے حیار مانع ہوگی۔

دوسرا اشکال یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایمان کے کثیر شعبوں میں حیار کو خاصکر کیوں ذکر فرمایا گیا؟ جبکہ بضع وستون شعبۃ میں حیار بھی داخل ہے؟

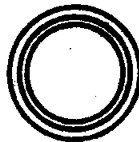
جواب:- حیار ایک ایسا شعبہ ہے جس پر بہت سے شعبے مرتب ہوتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے،

بے حیا باش وہرچہ خواہی کن

تو چونکہ حیار جھوٹ، چوری، سنیما، اور ہر قسم کی برائیوں سے بچاتی ہے اس لیے کہ حیار ہوگی تو سوچے گا کہ اگر کل کو جھوٹ ظاہر ہوگیا تو کیا ہوگا؟ اگر کسی شاگرد یا مرید نے سنیما ہال میں دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ غرضیکہ ہر برائی سے حیار بچاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تخصیص اہتمام شان کے لئے ہے۔

مطابقۃ الحدیث للترجمہ حدیث کی مطابقت واضح ہے اس لیے کہ ترجمۃ الباب امور الایمان کا ہے اور حدیث کے اندر ایمان کے شعبوں وشاخوں کا ذکر ہے۔



بابُ المسلمُ من سَلِمَ المسلمونَ من لِسانِه ویدِه

کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں

ای ہٰذا باب (بالتنوین)، فالمبتدأ محذوف - ویجوز ترک التنوین بالاضافۃ الی مابعدہ من الجملۃ، ویجوز الوقف علی السکون والمناسبۃ بین البابین ظاہرۃ لانہ ذکر فی الباب السابق ان الایمان لہ شعب وہٰذا الباب فیہ بیان شعبتین من ہٰذہ الشعب وہما سلامۃ المسلمین من لسان المسلم ویدہ والمہاجر من ہجر المنہیات (عمدہ)

(۹) حدثنا آدمُ بنُ ابی ایاس قال حدثنا شعبةُ عن عبدِ اللّٰہِ بنِ ابی السَّفرِ واسمٰعیلَ عن الشعبیّ عن عبدِ اللّٰہِ بنِ عمرٍو عن النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال المسلمُ مَن سَلِمَ المسلمون من لسانہ ویدہ والمُہاجِرُ مَن ہَجَرَ مانہی اللّٰہ عنہ قال ابو عبدِ اللّٰہِ وقال ابومعاویۃ ثنا داؤدُ بنُ ابی ہندٍ عن عامرٍ قال سمعتُ عبدَ اللّٰہِ بنَ عمرٍو یحدّث عن النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقال عبدُ الاعلیٰ عن داؤدَ عن عامرٍ عن عبدِ اللّٰہِ عن النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، اور مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے - ابوعبداللہ (یعنی امام بخاری رح) نے کہا "اور ابومعاویہ نے بیان کیا کہ ہم سے داؤد بن ابی ہند نے بیان کیا انہوں نے عامر شعبی سے، عامر شعبی نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا اور عبدالاعلیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لبند داؤد عن عامر عن عبداللہ بیان کیا۔

مطابقتہ للترجمہ اس حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے چونکہ ترجمۃ الباب میں حدیث ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ہٰنا فی الایمان صـ۶ـ ایضا فی الرقاق صـ۹۶۰ـ۔

باب سابق سے ربط ماقبل کے باب سے یہ ربط ہے کہ ماقبل والا باب کلی کے درجہ میں تھا اور اس باب سے اس کی جزئیات کا بیان ہو رہا ہے۔

تشریح

اس حدیث سے بھی باب سابق کی طرح مرجئہ پر رَد کرنا مقصود ہے کیونکہ مرجئہ نے ایمان میں نہ معصیت کو مضر سمجھا اور نہ اعمال کو ضروری۔ اس لیے ہر وہ عمل جس سے ایمان میں کمزوری آئے اس کو مرجئہ کی تردید کے سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

المسلم من سلم المسلمون اس جملہ میں مسند اور مسند الیہ دونوں معرفہ ہیں اور یہ مسلم مسئلہ ہے کہ مسند اور مسند الیہ کا معرفہ ہونا حصر کا فائدہ دیتا ہے لہٰذا اس جملہ میں بھی حصر ہوگا اور اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں

اشکال

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس سے دوسرے مسلمانوں کو ایذا (تکلیف) پہونچے وہ مسلمان ہی نہیں حالانکہ یہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

جواب:- یہ ہے کہ یہاں حصر کمال وافضلیت ہے حصر صحت نہیں۔ لیکن علماء کرام نے مختلف عنوانوں سے مختلف جوابات دیے ہیں۔

(۱) قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس روایت میں مسلم سے مراد المسلم الکامل الجامع لخصالہ ہے۔

(۲) بعض نے یہ تاویل کی کہ مراد المسلم الممدوح ہے۔ (۳) بعض کا رجحان ہے افضل المسلمین من سلم المسلمون الخ ہے۔

بلاشبہ علمی تحقیق کے وقت یہ درست ہے کہ "المسلم" کی تقدیر المسلم الکامل یا افضل ترین وقابل تعریف مسلمان ہے لیکن یہ تاویلات اسلئے بہتر نہیں کہ اس سے حدیث پاک کا وزن گھٹ جاتا ہے اور حدیث سے جو اصلی غرض ہے (یعنی تحذیر الناس، لوگوں کو متنبہ کرنا) اس میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے بلکہ مقصود ہی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ کسی کو ایذاء نہ پہنچائی جائے، اور اس تاویل کے بعد لوگ یہ کہیں گے کہ یہ تو مسلم کامل کی علامت ہے ہم کون سے امام اعظم ابوحنیفہ اور شیخ جیلانی ہیں، ہم تو پہلے ہی سے ناقص ہیں لہٰذا ہم سے کسی کو تکلیف پہنچ جائے، تو کوئی حرج نہیں۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ حدیث کو اس کے ظاہر ہی پر رکھا جائے، مگر اس کے باوجود ایذاء پہنچانے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ مالدار لغۃً ہر اس شخص کو کہنا صحیح ہے جو مال رکھتا ہو اگرچہ قلیل ہی ہو۔ مال کے معنی ہیں عین ینتفع بہ، لہٰذا جس شخص کے پاس ادنی سے ادنی چیز منتفع بہ ہوگی و لغۃً مالدار ہوگا مگر اسے عرفاً مالدار نہیں کہا جاتا ہے عرف میں صرف اس شخص کو مالدار کہتے ہیں جو معتد بہ مال رکھتا ہو۔

اسی طرح دوسروں کو ایذا پہنچانے والا حقیقۃً تو مسلم ہے مگر عرفاً اس لائق نہیں کہ اسے مسلمان کہا جائے اسے تنزیل الناقص منزلۃ المعدوم کہا جاتا ہے۔

حضرت نوح ع کے بیٹے کے بارے میں انہ لیس من اھلك انہ عمل غیر صالح " باوجودیکہ یہ حقیقۃً بیٹا تھا مگر نقصان اہلیت کی وجہ سے بیٹا ہونے کی نفی کردی گئی یعنی بیٹا کہلانے کے لائق نہیں۔

یہ تقریر عقیدۂ اہلِ سنت کے کبھی خلاف نہیں اور اس سے حدیث کا وزن بھی قائم رہتا ہے، زجر و توبیخ اور تہدید کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

لسان کی وجہ تقدیم

۱ عام طور پر سب سے پہلے زبان ہی سے بات چیت ہوتی ہے اس کے بعد ہاتھ چلتا ہے۔ ۲ زبان کا چلانا آسان ہے ۳ زبان کی تکلیف معنوی حیثیت سے بھی زیادہ شدید اور دیرپا ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

جراحات السنان لها التیام ؛ ولا یلتام ماجرح اللسان

۴ زبان کی تکلیف میں ابتلاء زیادہ ہے حتیٰ کہ خواص بھی اس میں مبتلا ہیں۔

۵ ایذاء لسانی احیاء و اموات (زندے و مردے) دونوں کو عام اور ایذاء ید احیاء کے ساتھ خاص ہے۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اور ان پانچ حدیثوں میں سے ایک ہے جنہیں امام اعظم رح نے پانچ لاکھ حدیثوں میں سے منتخب کیا ہے۔

والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

ہجرت کی دو قسمیں ہیں ۱ ظاہری ۲ باطنی۔ ہجرت ظاہری اللہ کے واسطے ترکِ وطن کرنا اور ہجرت باطنی اور حقیقی تمام ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دینا۔

ترکِ وطن میں ایک مرتبہ تکلیف ہوتی ہے لیکن گناہوں کے چھوڑنے میں پوری زندگی اپنے نفس سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

قولہ قال ابو عبد الله الخ امام بخاری رح نے یہاں دو تعلیقات ذکر کی ہیں۔

پہلی تعلیق سے مقصود یہ ہے کہ عامر شعبی رح (جو امام اعظم ابو حنیفہ رح کے شیخ و استاذ ہیں) کا سماع حضرت عبد اللہ بن عمرو رض سے ثابت ہے، پہلی روایت معنعن تھی جس سے عدم سماع کا وہم ہو سکتا تھا اس لیے امام بخاری رح نے تعلیق اول کو ذکر کیا کیونکہ اس میں سمعت عبد الله کی صراحت موجود ہے۔

دوسری تعلیق سے مقصود یہ ہے کہ عبد الاعلیٰ کی روایت میں جو عبد اللہ کا لفظ مبہم ہے اس سے مراد عبد اللہ بن عمرو رض ہیں جیسا کہ ابو معاویہ کی روایت میں تصریح ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ محدثین رح کا یہ قاعدہ ہے کہ جب صحابہ کے طبقہ میں عبد اللہ کا لفظ مطلقاً بولا جاتا ہے تو اس سے حضرت عبد اللہ بن مسعود رض مراد ہوتے ہیں اور عبد الاعلیٰ کی روایت میں چونکہ عبد اللہ کا لفظ مطلقاً ہے جس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید عبد اللہ بن مسعود رض ہی مراد ہوں اس شبہ کو دور کرنے کیلئے تعلیق کو ذکر فرمایا۔

عبد اللہ بن عمرو بن العاص رض

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما صحابی ابن صحابی ہیں ان کے والد حضرت عمرو بن العاص رض فاتح مصر مشہور و معروف

صحابی ہیں ان کی والدہ ریطہ بنت منبہ ہے۔ حضرت عبد اللہؓ اپنے باپ سے پہلے مسلمان ہوئے، ان کے والد حضرت عمرو بن العاصؓ ان سے بارہ سال کے بڑے تھے یہ عابد زاہد کثیر العلم صحابی تھے عبادلہ اربعہ میں ان کا بھی نام ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ حدیث لکھتے تھے جیساکہ بخاری شریف جلد اول کتاب العلم میں ہے ان سے سات سو احادیث مروی ہیں سترہ حدیثوں پر شیخین متفق ہیں۔

تمیز لفظ عمرو حالت رفع و جر میں واؤ کے ساتھ لکھا جاتا ہے تاکہ عُمر (بضم العین) سے متمیز ہو جائے البتہ حالت نصب میں واؤ لکھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ عُمر غیر منصرف ہے اور عَمرو (بفتح العین) منصرف۔ تو حالت نصب میں الف سے تمیز ہو جائے گی۔ (عمدہ)

منتخبات خصوصی یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے امام ابو داؤد رحؒ نے پانچ لاکھ احادیث میں سے منتخب کرکے اپنی سنن میں چار ہزار آٹھ سو احادیث ذکر کیں پھر ان میں سے چار حدیثوں کو منتخب کیا کہ انسان کو اپنے دین پر عمل کرنے کیلئے صرف یہ چار حدیثیں کافی ہیں۔

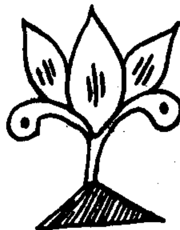
۱ انما الاعمال بالنیات عبادات کی درستی کے لئے۔

۲ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ عمر عزیز کے گرانقدر لمحات کو حفاظت کے لئے۔

۳ لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ حقوق العباد کی صحیح طور پر ادائیگی کے لئے۔

۴ الحلال بیّن والحرام بیّن وما بینھما مشتبھات فمن اتقی الشبھات فقد استبرأ لدینہ مشتبہات سے بچنے کے لئے۔

اگرچہ یہ بات امام ابو داؤد رحؒ کی طرف منسوب ہوکر مشہور ہوئی مگر ان سے پہلے امام اعظم ابو حنیفہ رحؒ نے اپنے صاحبزادہ حماد رحؒ سے فرمایا تھا کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ حدیثیں منتخب کی ہیں پھر ان چار مذکورہ بالا احادیث کے ساتھ پانچویں حدیث المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ بیان فرمائی۔



بَابٌ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ
کونسا اسلام افضل ہے؟

یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ اسلام کے کون سے امور اور خصلتیں افضل ہیں۔
امام بخاری رح کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے مراتب و مدارج متفاوت ہیں کسی کا اسلام افضل ہوتا ہے اور کسی کا مفضول، اور چونکہ ایمان و اسلام درجۂ کمال میں متحد ہیں لہٰذا ایمان کی زیادتی کمی ثابت ہوگئی، اور مرجئہ کی تردید۔

---

(۱۰) حدثنا سعید بن یحیی بن سعید الاموی القرشی قال ثنا ابی قال ثنا ابوبردة بن عبد الله بن ابی بردة عن ابی بردة عن ابی موسٰی قال قالوا یا رسول الله ایُّ الاسلام افضلُ قال من سلم المسلمون من لسانه ویده۔

ترجمہ حضرت ابوموسٰی اشعری رضہ نے بیان کیا کہ صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کونسا اسلام افضل ہے؟" آپ نے فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

مطابقة للترجمة پہلے باب میں بیان کیا گیا تھا کہ مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، اس سے بظاہر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے سلامتی نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے تو امام بخاری رح نے یہ ترجمۃ الباب قائم کر کے اس شبہ کو دور کر دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں حصر افضلیت ہے اس لیے کہ حضور صلعم کا یہ ارشاد ایک سوال کے جواب میں ہے، سائل نے پوچھا تھا ایُّ الاسلام افضل ای من غیرہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من سلم المسلمون الخ یعنی جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگوں کو سلامتی ہو وہ افضل ہے۔

اشکال نحوی قاعدہ کے لحاظ سے ایُّ کے مضاف الیہ کا متعدد ہونا ضروری ہے اور یہاں مفرد ہے۔

جواب:- تقدیر یوں ہے ایُّ اصحاب الاسلام افضل یا ای خصال الاسلام افضل۔ تقدیر اول اولیٰ ہے کیونکہ ثانی پر پھر اشکال ہوتا ہے کہ سوال و جواب میں مطابقت نہیں ہے سوال صفت کا ہے اور جواب میں ذات کا ذکر ہے۔
اور تقدیر اول پر کوئی اشکال نہیں۔ نیز مسلم شریف جلد اول صفحہ ۴۸ کی روایت ایُّ المسلمین افضل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

• بابٌ اطعامُ الطّعامِ من الاسلام •

ای ہذا بابٌ (بالتنوین) کھانا کھلانا اسلام کی خصلت ہے۔

ع۲ اضافت کی وجہ سے لفظ باب رفع بلا تنوین بھی جائز ہے۔

ع۳ نیز اسماء معدودہ کے طرز پر بابْ کا سکون بھی درست ہے۔ (عمدۃ القاری)

۱۱ • حدثنا عمرو بن خالدٍ قال ثنا اللیثُ عن یزیدَ عن ابی الخیرِ عن عبدِ اللّٰہِ بنِ عمروٍ اَنّ رجلاً سأل رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ایُّ الاسلامِ خیرٌ قال تطعمُ الطعامَ وتقرءُ السلامَ علیٰ من عرفتَ ومَن لم تعرفْ •

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا کھانا کھلانا اور (ہر ایک مسلمان کو) سلام کرنا اس کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ص۶ وایضاً ص۹ وفی کتاب الاستیذان ص۹۲۱ واخرجہ مسلم وغیرہ۔

مطابقتہ للترجمۃ:۔ مطابقت ظاہر ہے کہ ترجمۃ الباب الفاظ حدیث سے ماخوذ ہے۔

ماقبل سے ربط شراح بخاریؒ کی تو یہی رائے ہے کہ جب امام بخاریؒ نے یہ فرمایا کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں اور اس سے ایمان کی زیادتی اور نقصان پر استدلال کیا تو اب کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ثابت شدہ شعبوں کو یکے بعد دیگرے بطور نمونہ بیان کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے باب میں اسلام کے ایک شعبہ کو بیان کیا گیا تھا اور اس باب میں دو شعبے "اطعام الطعام، اور افشاء سلام" کا بیان ہے۔ (فتح الباری، عمدۃ القاری)

(۲) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باب علی سبیل الترقی ہے، اور امام بخاریؒ ایک خاص ترتیب اور عجیب لطافت کے ساتھ ابواب منعقد کر رہے ہیں بایں طور اس باب اور آنے والے ابواب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔

کمالِ ایمانی کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ پہونچائے اور اس باب سے یہ بتا رہے ہیں کہ اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ صرف لسان و ید (زبان اور ہاتھ) کی حفاظت ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو نفع بھی پہونچائے، زبان سے سلامتی کی دعا کرے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھانا بھی کھلائے، اور اس کے بعد اس طرف متوجہ کیا گیا کہ اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کیلئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، گویا دوسرے عنوان سے ایسی نسبتِ اتحادی اور تعلق پیدا کرو کہ دونوں کی مرضیات ایک ہو جائیں جیسا کہ انصار نے مہاجرین کیساتھ عملی نمونہ کے طور پر پیش کیا۔

پھر ناظرین کی عنانِ توجہ کو اس جانب منعطف کیا کہ جب اس مقام ارفع کو پہونچ گیا کہ اپنی مرغوب و پسندیدہ چیز

کو اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرتا ہو تو ظاہر ہے کہ جو ذات مقدس ساری مخلوقات سے افضل اور انسانیت کی محسنِ اعظم ہے اس کے ساتھ ایسی محبت ہونی چاہئے کہ اپنی مرضیات کو ان کی مرضیات کے تابع کر دینا چاہئے اور تن، من، دھن، جان ومال، والد و ولد سب کو ان کی مرضیات پر قربان کر دینا چاہئے پھر جب کسی کے ساتھ انتہائی درجہ کی محبت ہوتی ہے اور فنائیت کے درجہ کو پہونچ جاتی ہے تو جس سے بھی محبت ہوگی محبوب ہی کی خاطر، اور بغض ہوگا تو اسی کی رضامندی کے لئے پھر اس کے متعلقین انصار و اعوان سے بھی محبت لازمی ہے جیسے کہ پیالہ جب بھر جاتا ہے تو چھلک کر آس پاس کی زمین کو بھی سیراب کر دیتا ہے اس کے بیان کے لئے ذرا آگے چل کر بیان فرمایا: علامۃ الایمان حب الانصار .. اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ چند ابواب جن کا مضمون بظاہر متحد معلوم ہوتا ہے حقیقۃً ان میں یہ فرق ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے ایمان کے مختلف درجات کو بیان کرنا مقصود ہے۔

ای الاسلام خیر غالباً یہ سوال کرنے والے حضرت ابو ذرؓ ہیں۔

جواب میں آپؐ نے دو خصلتوں کو بیان فرمایا: اطعام طعام اور افشاءِ سلام کو۔

لفظ اطعام میں کھلانا پلانا، ضیافت اور اطعام فقراء وغیرہ سب داخل ہیں، اسی طرح اطعام طعام کسی کے ساتھ مخصوص نہیں کافر ہو یا مسلم، اپنا ہو یا پرایا حتیٰ کہ انسان ہو یا جانور۔

تقرء السلام ہر قوم کی عادت ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے سے ملتا ہے تو قولاً ایک تحفہ پیش کرتا ہے جیسا کہ ہنود جے رام جی، یا آداب، نصاریٰ گڈ مارننگ وغیرہ کہتے ہیں۔ لیکن ان میں جامعیت نہیں ہے۔

سلام بہترین تحفہ ہے

یعنی اسلام نے بھی مسلمانوں کے لئے ایک بہترین تحفہ دیا ہے۔ "السلام علیکم" اسلام کا یہ تحفہ جملہ اقوام عالم کے تحفہ سے بہتر اور جامع ہے کہ ہر قسم کی سلامتی کی دعا ہے جان کی، مال، عزت و آبرو کی اور دینا کی، آخرت کی الغرض نہایت مختصر مگر پُر مغز اور جامع تحفہ ہے۔

سلام کی ابتداء

امام بخاریؒ نے کتاب الاستیذان ۲۷ ص ۹۱۹ میں سب سے پہلے "باب بدء السلام" منعقد کیا ہے اور اس میں یہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو یوں فرمایا کہ جاؤ ان فرشتوں کی جماعت کو سلام کرو اور سنو کہ کیا جواب دیتے ہیں وہی جواب تمہارا اور تمہاری ذرّیت کا سلام ہے۔ تو آدم علیہ السلام نے فرمایا السلام علیکم"، فرشتوں نے جواب دیا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ ،، اس سے معلوم ہوا کہ سلام آدمیت کا تحفہ ہے، اور بڑے چھوٹے تمام ذرّیت کا بھی سلام ہے۔

جنتیوں کا تحیہ بھی یہی ہوگا، کما فی القرآن الحکیم وتحیتھم فیھا سلام (یونس) اور انکا تحفہ جنت میں سلام کرنا ہے۔

اور خداوند قدوس بھی اپنے جنتی بندوں کو بطور دعا نہیں بلکہ اہلِ جنت کے اعزاز و اکرام اور اپنی طرف سے رحمت وسلامتی عطا فرمانے کی خبر کے طور پر اسی تحیہ سے خطاب فرمائیں گے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: سلامٌ

قولاً مِن رّبٍّ الرّحيم (سورۂ یٰسٓ) یعنی اس مہربان پروردگار کی طرف سے اہل جنت کو سلام بولا جائیگا خواہ فرشتوں کے ذریعہ یا جیسا کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ بلا واسطہ خود رب کریم سلام ارشاد فرمائیں گے۔ اس وقت کی عزت ولذت کا کیا کہنا اللّٰھم ارزقنا ھٰذہٖ النعمۃ العظمٰی ببرکۃ نبیّک محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

حدیث شریف میں باری تعالیٰ کی طرف سے امّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سلام کا تحفہ ملنا مذکور ہے۔

اسی طرح بخاری شریف میں جبریل امین کی طرف سے امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تحفہ سلام سے مشرف ہونا مذکور ہے۔ (بخاری جلد ثانی ص۹۲۳ ایضاً ص۲۲۴)۔

اشکال

صحیح بخاری میں اسی مضمون کی چار حدیثیں ہیں:۔

(۱) باب سابق کی حدیث کہ حضور اقدس ؐ سے دریافت کیا گیا "ایّ الاسلام افضل" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: مَن سلِمَ المسلمونَ مِن لسانہٖ ویدہٖ۔

(۲) حدیث باب ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا "ایّ الاسلام خیر" تو آپؐ نے فرمایا: تطعم الطعام وتقرؤ السلام" الخ

(۳) تیسری حدیث بخاری ص۸ پر ہے انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل ایّ العمل افضل فقال ایمان باللہ ورسولہ قیل ثمّ ماذا قال الجھاد فی سبیل اللہ قیل ثمّ ماذا قال حج مبرور، (ایضاً مسلم ج۱ ص۶۲)۔

(۴) چوتھی حدیث یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سألت النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ایّ العمل احبّ الی اللہ قال الصلوٰۃ علیٰ وقتھا قال ثمّ ایّ قال ثم برّ الوالدین قال ثم ایّ قال الجھاد فی سبیل اللہ۔ (بخاری ج۱ ص۷۶، مسلم ج۱ ص۶۲)۔

بظاہر یہ چاروں احادیث آپس میں متعارض ہیں کیونکہ چاروں میں سوالات قریب قریب یکساں ہیں مگر جوابات مختلف ہیں۔

جواب:۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں قد اجیب بأن اختلاف الاجوبۃ فی ذٰلک لاختلاف الاحوال والأشخاص الخ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ جوابات کا اختلاف احوال واشخاص کے اختلاف کی وجہ سے ہے، غالباً اسی وجہ سے اس باب کی حدیثوں میں نماز، زکوٰۃ اور صیام کا ذکر نہیں، عرف اور محاورہ میں کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز خیر الاشیاء ہے اور اس کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ یہ چیز من کل الوجوہ ہر حال میں اور ہر شخص کے لئے خیر ومفید ہے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخصوص حالات میں اس کے اندر افضلیت وخیریت یا احبیت ہے لہٰذا حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

(۲) اختلاف الاجوبۃ لاختلاف احوال المخاطبین یعنی کسی کی نماز میں کوتاہی محسوس کی تو اس کیلئے الصلوٰۃ لوقتھا کو افضل الاعمال فرمایا اور کسی کے متعلق حقِ والدین میں تقصیر (کوتاہی) کا شبہ ہوا تو اس کیلئے برّ الوالدین کو افضل الاعمال قرار دیا وقس علیٰ ھٰذا۔

(۳) اختلاف الاجوبۃ لاختلاف شئون التکلم ہے۔ باری تعالیٰ کی مختلف شانیں ہیں۔ قال السعدیؒ:-

بتہدید اگر برکشد تیغ حکم ٭ بمانند کروبیاں صم و بکم
وگر دردہد یک صلائے کرم ٭ عزازیل گوید نصیبے برم

اسی طرح حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شانیں بھی مختلف ہوتی ہیں، فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کسی دوسرے کے تابع نہیں ہوتی اور شئون انبیاء علیہم السلام شئونِ الٰہیہ کے تابع ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت پر نظر گئی تو فرمایا: ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذٰلک الا دخل الجنۃ۔

اور شان اصلاح یا غضب و انتقام پر توجہ ہوئی تو فرمایا "لا یدخل الجنۃ قتات" (متفق علیہ)
وفی روایۃ مسلم "نمام" ۔ "من ادعیٰ الیٰ غیر ابیہ وھو یعلم فالجنۃ علیہ حرام" (متفق علیہ)

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا اذھب بنعلی ھاتین فمن لقیک من وراء ھذا الحائط یشھد ان لا الٰہ الا اللہ مستیقنا بھا قلبہ فبشرہ بالجنۃ سامنے حضرت عمر فاروقؓ مل گئے ان کو ابو ہریرہؓ کا قصد معلوم ہوا تو سختی سے واپس لوٹا کر لائے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اس اعلان کی وجہ سے لوگ اعمال میں سستی کرنے لگیں گے اس لئے یہ اعلان نہ کیا جائے، حضور اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کی تصویب فرمائی۔

آپؐ کا یہ اختلافِ جواب یعنی پہلے اعلان کا حکم اور پھر اس سے منع فرمانا اختلافِ شان پر مبنی تھا، پہلے آپؐ پر شانِ رحمت کا غلبہ تھا بعد میں حضرت عمرؓ کے متوجہ کرنے پر شانِ حکمت و اصلاح غالب آگئی۔

(۴) اختلاف الاجوبۃ لاختلاف الازمنۃ ہے یعنی کسی وقت میں ایک عمل افضل ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں دوسرا۔ مثلاً خدانخواستہ شہر میں قحط ہو، لوگ بھوکے مر رہے ہوں ایسے وقت میں کوئی شخص نفل حج کا ارادہ کرے تو اسے منع کیا جائیگا اور اس وقت اطعامِ طعام کو افضل الاعمال قرار دیا جائے گا۔ غرضیکہ موقع و محل کا لحاظ ضروری ہے۔

طبقاتِ شافعیہ میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک رئیس ان کے مرید تھے وہ جب بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو رئیسانہ مزاج کے مطابق قیامگاہ نہ ملنے کی وجہ سے تکلیف ہوتی، انہوں نے بزرگ کو کثیر رقم دے کر درخواست کی کہ میرے لئے ایک عمدہ مکان بنوا دیں، اس زمانے میں شہر میں قحط تھا۔ اس بزرگ نے یہ رقم مساکین پر تقسیم کر کے رئیس کو لکھدیا کہ مکان تیار ہے وہ بہت خوش ہوا جب بزرگ کی خدمت میں پہنچا تو کوئی مکان نظر نہ آیا، دریافت کرنے پر بزرگ نے جواب دیا کہ جنت میں مکان تیار ہے، رئیس نے کہا کہ دستاویز لکھدیجئے تاکہ قبر میں ساتھ لیجاؤں، انہوں نے دستاویز لکھدی، رات کو خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری ہے اور ڈانٹ پڑ رہی ہے کہ تم جنت کے ٹھیکیدار ہو کہ جسے چاہیں دستاویز لکھدیں اور ارشاد

ہوا کر چونکہ تمہاری نیت نیک تھی اس لئے تمہیں معاف کردیا جاتا ہے اور ہم نے تمہارا کہنا کردیا۔ آئندہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا۔

(۵) یہ تفاضل من وجہ ہے یعنی من وجہ ایک عمل افضل ہے اور من وجہ دوسرا۔ جیسے کہ حدیث ارحم امتی بامتی ابوبکر واشدھم فی امر اللہ عمر واصدقھم حیاء عثمان واقضاھم علی و اقرءھم ابی بن کعب واعلمھم بالحلال والحرام معاذ بن جبل واصدقھم لھجۃ ابوذر وافرضھم زید بن ثابت وامین ھذہ الامۃ ابو عبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنھم میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت من وجہ (یعنی جزئی فضیلت) کا بیان ہے فضیلتِ کلی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہے وغیرہ۔ (ارشاد القاری)۔

• باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ •

ایمان کی بات یہ ہے کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

۱۲ • حدثنا مسدد قال حدثنا یحیٰی عن شعبۃ عن قتادۃ عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن حسین المعلم قال ثنا قتادۃ عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ •

ترجمہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکیگا جب تک کہ وہ اپنے بھائی (مسلمان) کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ مسلم والترمذی والنسائی وغیرہ۔

مطابقتہ للترجمۃ:۔ مطابقت بالکل واضح ہے کہ ترجمۃ الباب الفاظ حدیث سے ماخوذ ہے۔

ماقبل سے ربط ابھی گذر چکا ہے کہ یہ باب علیٰ وجہ الترقی ہے۔ یعنی اگرچہ اطعام طعام اور افشاءِ سلام اسلام کی بہترین خصلتیں ہیں لیکن اس پر اکتفا نہ کرنا چاہئے بلکہ اس سے ترقی کرنا چاہئے کہ جو چیز اپنے لئے پسند ہو اسی جیسی چیز اپنے بھائی کے لئے پسند کرو۔ یا یہ کہا جائے کہ اطعام طعام اور افشاء سلام بخل اور نفسانیت کی وجہ سے نفس پر شاق ہوتا ہے اس لئے بطور ترغیب و تفہیم یہ باب منعقد کیا کہ جب تمہاری دلی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ تمہیں سلام کریں اور تمہیں کھلاتے پلاتے رہیں تو تمہیں بھی چاہئے کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرو کیونکہ یہ ایمان کی نشانی ہے۔

۲؎ ماقبل کے باب میں اِطعامِ طعام کا بیان تھا اور یہ کام عموماً اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے کسی وجہ سے محبت ہو اور اس باب میں بھی مسلمان بھائی کی محبت کا بیان ہے اسلئے دونوں میں مناسبت ہوگئی۔

اشکال اگر کوئی شخص بادشاہ ہے تو کیا اس پر ضروری ہے کہ وہ ہر کس وناکس کو حکومت میں شریک کرے اور صبیان ومجانین (بچوں اور پاگلوں) کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے، اس سے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائیگا، نیز یہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ دین ودنیا میں سب سے سبقت لیجانا چاہتا ہے؟

جواب: ۱ حدیث پاک کا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگوں کو اپنے اموال اور املاک میں شریک کرلو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر شخص جس طرح اپنے بارے میں یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کا احترام کریں، حسنِ اخلاق سے پیش آئیں، اچھے کاموں پر داد دیں، برائیوں سے درگذر کریں اور پردہ پوشی کریں اسی طرح اسے بھی چاہیئے کہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرے۔

بلاشبہ یہ حدیث رحمتِ عالم کا پیغام ہے جو امنِ عالم کی ضامن ہے، علماء نے اس حدیث کو بھی جوامع الکلم میں سے شمار کیا ہے۔ اگر دنیا صرف اس حدیث پر عمل کرلے تو سارے فسادات اور فتنوں کی جڑ کٹ جائے، چور کسی کے گھر نقب زنی کے وقت، جیب کٹ (پاکٹ مار) کسی کے جیب پر ہاتھ بڑھاتے وقت، کسی کی بیوی، بیٹی پر بدنگاہی کے وقت اگر سوچ لے کہ میں جو معاملہ کرنا چاہتا ہوں اگر یہی معاملہ میرے ساتھ کوئی کرے تو کیا میں اس کو پسند کرلیتا؟ ان شاء اللہ صرف اتنا سوچنے سے چوری، زنا، غیبت، تہمت اور سارا فتنہ وفساد نیست ونابود ہوجائیگا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص دربارِ نبوی میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں اس شرط پر ایمان لاتا ہوں کہ مجھے زنا کی اجازت دیدی جائے، یہ سنکر صحابہؓ زجر وتوبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کرنے لگے مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے آپؐ نے صحابہ کو روکا اور اپنے قریب بلاکر فرمایا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ لوگ تیری ماں یا تیری بیٹی یا تیری بہن کے ساتھ یہ نازیبا حرکت کریں، اس نے کہا ہرگز نہیں میں تو تلوار سے خبر لوں گا، آپؐ نے فرمایا کہ جس سے تو یہ بری حرکت کرنا چاہیگا وہ بھی تو کسی کی ماں، کسی کی بیٹی اور کسی کی بہن ہوگی۔ سبحان اللہ! کتنا پیارا اندازِ تفہیم ونصیحت ہے، آپؐ نے اس پر دستِ مبارک رکھکر دعا فرمائی اللّٰھم اغفر ذنبہ وطہر قلبہ واحصن فرجہ الخ پھر اس شخص نے کسی کی طرف آنکھ اٹھاکر غلط نگاہ سے نہیں دیکھا۔

۲ اس حدیث کو خاص مشورہ سے متعلق قرار دیا جائے یعنی اگر کوئی شخص آپ سے کسی کام میں مشورہ لینے آئے تو آپ ایسا مشورہ دیں جسے اپنے لئے پسند کرتے ہیں یہ سوچ کر مشورہ دو کہ اگر ہم مستشیر کی جگہ ہوتے تو کیا عمل کرتے۔

اختلافِ اسناد یہاں دو سندیں مذکور ہیں اور دونوں متصل ہیں۔ ایک تو یہ ہے: حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن شعبۃ عن قتادۃ عن انسؓ۔

دوسری سند: حدثنا مسدد قال حدثنا یحیی عن حسین المعلم عن قتادۃ عن انسؓ۔

پس بخاری شریف کی سند مذکور میں عن حسین کا عطف عن شعبۃ پر ہے، گویا اصل عبارت یہ ہوگی کہ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں عن شعبۃ وحسین المعلم کلاھما عن قتادۃ۔

اب سوال پیدا ہوگا کہ امام بخاریؒ نے دونوں کو جمع کیوں نہیں کیا ؟
حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ جواب دیتے ہیں کہ بخاری نے اپنے شیخ کی اتباع میں ایسا کیا، ان کے شیخ نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جمع نہیں کیا تو امام بخاریؒ نے بھی جمع نہیں کیا اور اختصار کیلئے عطف سے روایت کیا، پھر دونوں روایتوں میں ایک فرق تھا شعبہ نے کہا عن قتادة اور حسین معلم نے کہا حدثنا قتادة تو اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے بھی جمع کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ البتہ یہاں جو متن مذکور ہے وہ شعبہ ہی کے نقل کردہ الفاظ ہیں۔

• بابٌ حبُّ الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم مِن الایمانِ •

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا ایمان کا ایک جزو ہے۔

الرسول الف لام عہدی ہے اور مراد حضور اقدسؐ ہیں اس لئے کہ روایت میں اکون متکلم کا صیغہ ہے اور اس سے حضورؐ ہی مراد ہیں اگرچہ فی حدّ ذاتہٖ انبیاءؑ کی محبت واجب ہے لیکن احبیت حضور اقدسؐ کے ساتھ خاص ہے لہٰذا ترجمۃ الباب میں الف لام جنس یا استغراق کیلئے لینا درست نہیں۔ (عمدۃ، فتح، قس)

۱۳ • حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیبٌ قال حدثنا ابو الزناد عن الأعرج عن ابی ھریرة انّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فوالذی نفسی بیدہٖ لا یؤمنُ احدُکم حتیٰ اکونَ احبَّ الیہ مِن والدِہٖ وولدِہٖ •

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات (خداوند قدوس) کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اولاد سے زیادہ نہ ہو۔

تعدد الحدیث :- امام بخاریؒ نے اس باب میں دو حدیث ذکر فرمایا ہے اور دونوں حدیث یہی ہیں دوسری روایت اس کے بعد متصلاً آئے گی ان شاء اللہ۔ واخرجہٗ مسلم ایضاً۔

مطابقتہ للترجمۃ :- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ۔

ماقبل سے ربط (۱) دونوں بابوں میں محبت ایمانی کا بیان ہے اس لئے ربط و مناسبت ظاہر ہے۔
(۲) ماقبل کے باب میں محبت عامہ کا بیان تھا اور اس باب میں خصوصی محبت کی تاکید ہے گویا یہ باب تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ تخصیص بعد التعمیم عموماً اہتمام شان کے لئے ہوتی ہے۔ (۳) یا ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ کے قبیل سے ہے، پہلے باب میں محبوب اپنا بھائی تھا اور محبت بھی اپنی جیسی تھی اور اس باب میں افضل الخلائق ہے اور محبت بھی اعلیٰ درجہ کی مطلوب ہے۔

تشریح :- حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان کا جز ہے اگر کسی کو حضور اقدسؐ سے

محبت نہ ہو تو وہ مسلمان ہی نہیں۔

محبت کے معنی اور اس کے اقسام

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: المحبة فی اللغة میل القلب الی الشیٔ لتصور کمال فیه بحیث یرغب فیما یقربه الیه (عمدہ ۱؍ص۱۴۲) یعنی قلب کا کسی چیز کی طرف مائل ہونا اس تصور سے کہ اس میں کوئی کمال ہے علامہ نوویؒ فرماتے ہیں ربالجملة اصل المحبة المیل الی ما یوافق المحب ثم المیل قد یکون لما یستلذہ الانسان ویستحسنه بحواسه کحسن الصورة والصوت والطعام الخ (شرح مسلم ۴۹)

علامہ نوویؒ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ کسی مرغوب و پسندیدہ چیز کی جانب قلب کے میلان و جھکاؤ کو لغت میں محبت کہتے ہیں، پھر میلان و جھکاؤ کبھی ایسی چیز کی طرف ہوتا ہے جس میں انسان اپنے حواس سے لذت محسوس کرتا ہے اور حسین سمجھتا ہے جیسے حسنِ صورت، حسنِ صوت وغیرہ، اور کبھی ایسی چیز کی جانب میلانِ قلب ہوتا ہے جس کی لذت باطنی وجوہ و کمالات کی بنا پر عقل سے معلوم ہوتی ہے جیسے صلحاء، علماء اور فضلاء کی محبتِ مطلقہ یعنی بدون تصورِ جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت، اور کبھی محبت کسی احسان کی وجہ سے ہوتی ہے کہ اس نے کسی سخت تکلیف ومصیبت کے وقت احسان کیا۔

اشکال ان تعریفات سے صاف ظاہر ہے کہ محبت قلب کے میلان اور جھکاؤ کو کہتے ہیں طبعی ہے۔ کچھ اسباب ایسے ہوتے ہیں کہ انسان بے اختیار مائل ہوجاتا ہے انسان کے اختیارات کو دخل نہیں ہوتا جیسے ماں باپ کی محبت، اولاد و اقارب کی محبت اور رہا لوفاتِ طبعیہ کی محبتِ طبعی وغیرہ اختیاری چیز ہے۔ اور کسی انسان کو غیر اختیاری شئی کا مکلف نہیں بنایا جاسکتا ہے، تکلیف ہمیشہ اختیاری امور پر دیجاتی ہے۔

جواب:۔ اس اشکال کا جواب محدثینِ عظام و شراحِ بخاری سے یہ منقول ہے کہ محبت کی تین قسمیں ہیں:۔

۱ محبتِ طبعی یعنی غیر اختیاری۔ ۲ محبتِ عقلی۔ ۳ محبتِ ایمانی، یہ دونوں محبت اختیاری ہے۔ یہاں حدیث شریف میں محبتِ عقلی اور ایمانی مراد ہے۔

اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حبِّ عقلی اور حبِ ایمانی جب تک غالب نہ ہوجائے اس وقت تک کامل مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

حبِ عقلی کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ کوئی چیز طبعی طور پر گراں معلوم ہو لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ تمام چیزوں پر اسی کو ترجیح دی جائے۔ جیسا کہ مریض کو کڑوی دوا سے طبعی طور پر نفرت ہوتی ہے مگر عقلاً چونکہ اس سے تندرستی حاصل ہوتی ہے اس لئے بروئے عقل پیتا ہے۔ یا مثلاً کسی کو ڈاکٹر نے آپریشن کے لئے کہا تو طبعاً کوئی نہیں چاہتا ہے کہ بدن کا کوئی حصہ کاٹا جائے لیکن جب عقل کا حکم ہوتا ہے کہ اگر آپریشن نہ کیا گیا تو دوسرے اعضاء بھی متاثر اور ماؤف ہوجائیں گے۔ تو ڈاکٹر کو بڑی بڑی رقمیں دے کر آپریشن کراتا ہے۔ پس یہ آپریشن کی خواہش محبتِ عقلی ہے۔

تو چونکہ حبِّ عقلی میں نفع و نقصان پر نظر ہوتی ہے اس لئے عقل ما فیہ النفع کو ہمیشہ ترجیح دیگی پس عقل کا تقاضا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی محبت و اطاعت میں دائمی اور ابدی نفع ہے اس لئے دنیا کی تمام چیزوں سے آنحضور ﷺ کی محبت زیادہ ہو، نیز دنیا میں جتنے بھی محبت کے اسباب ہیں وہ سب کے سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، چنانچہ اربابِ عقل کا اس پر اتفاق ہے کہ محبت کے اسباب چار ہیں: جمال، کمال، قرابت، احسان۔
ان میں سے جب کوئی سبب پایا جائیگا تو محبت پائی جائیگی اور یہ واضح رہے کہ طبعی محبت بھی انہی اسباب میں دائر و محصور ہے۔

جمال

محبت کا ایک سبب جمال ہے یعنی ظاہری حسن و خوبصورتی باعثِ محبت ہے جیسا کہ شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے واقعات شاہد ہیں، نیز حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کا واقعہ دلیل ہے کہ حسن و جمال باعثِ محبت ہے۔
حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال کس درجہ کا تھا؟ خالقِ جمال نے جو محبِّ جمال بھی ہے "ان اللہ جمیل یحب الجمال" اپنے محبوب کو کس قدر سنوارہ تھا؟ ؎

منزہ عن شریک فی محاسنہ ؛ فجوہر الحسن فیہ غیر منقسم

دیکھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سنئے:۔
حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میں دیکھ رہا تھا اس وقت حضور ﷺ سرخ جوڑا زیب تن فرمائے ہوئے تھے، میں کبھی چاند کو دیکھتا اور کبھی آپ کو، بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ حضور اقدس ﷺ چاند سے زیادہ منور اور حسین ہیں۔ (شمائل ترمذی)

یا صاحب الجمال و یا سید البشر ؛ من وجھک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ ؛ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ اس قدر صاف شفاف اور حسین و خوبصورت تھے کہ گویا چاندی سے آپ کا بدن ڈھالا گیا ہے الخ۔ (شمائل ترمذی)
ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رات کی ظلمت میں حضور اقدس ﷺ کے چہرۂ انور کی روشنی میں سوئی تلاش کی۔

علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ ہر شخص یہ اعتقاد رکھنے کا مکلف ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک جن اوصافِ جمیلہ کے ساتھ متصف ہے کوئی دوسرا ان اوصاف میں حضور ﷺ جیسا نہیں ہو سکتا اور یہ محض اعتقادی چیز نہیں ہے۔ سیر، احادیث اور تواریخ کی کتابیں اس سے لبریز ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے کمالاتِ باطنیہ کے ساتھ جمالِ ظاہری بھی علی الوجہ الاتم عطا فرمایا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دو شعر منقول ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ زلیخا کی سہیلیاں اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کو دیکھ لیتیں تو ہاتھوں کے بجائے دلوں کو کاٹ دیتیں۔ (خصائل نبوی)

حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں ؎

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ ❊ لآثرن بالتقطیع الصدور علی الید

اشکال حضرت عائشہ رضؓ کے شعر مذکور پر ممکن ہے کسی کو یہ اشکال پیدا ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر قلوب تو درکنار کسی نے ہاتھ بھی نہ کاٹے۔

جواب:۔ یہ اشکال اس شخص کو پیدا ہو سکتا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کے واقعات اور کارناموں سے ناواقف ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جان قربان کرنے والوں کے واقعات اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔

کسی جوان عورت کا کسی خوبصورت جوانمرد پر عاشق ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں یہ تو دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے مافوق العادۃ امر یہ ہے کہ حضور اکرم پر بچوں سے بوڑھوں تک، عورتوں سے لیکر مردوں تک بلکہ ان سے بھی بڑھکر حیوانات نے جانیں قربان کیں، نباتات اور جمادات نے عشق کے مظاہرے کئے، عورتوں اور بچوں کی جاں نثاری کے واقعات کی فہرست بہت طویل ہے۔

حجۃ الوداع میں آپؐ نے سو اونٹوں کی قربانی دی جن میں سے ترسٹھ اپنے ہاتھ مبارک سے قربان کئے اور بقیہ پر حضرت علیؓ کو مامور فرمایا۔ ان اونٹوں کو قربانی کے لئے ایک پاؤں باندھ کر ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کرنے کے لئے ہاتھ میں نیزہ سنبھالا تو یہ اونٹ اس خواہش میں کہ آپؐ کا نیزہ سب سے پہلے اس کے سینہ پر آئے ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ❊ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صدمہ میں آپؐ کے گدھے نے کنویں میں گر کر جان دیدی۔ اور آپؐ کی اونٹنی نے کھانا پینا چھوڑ دیا آخر کار بھوک اور پیاس سے مرگئی۔

اسطوانہ حنانہ کا واقعہ مشہور رہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان پتھروں کو خوب پہچانتا ہوں جو مجھے سلام کیا کرتے تھے اور مجھ سے کلام کیا کرتے تھے الخ (ارشاد القاری)

کمال محبت کا دوسرا سبب کمال ہے، یعنی باطنی حسن وجمال، یہ بھی محبت کا ایک عظیم سبب ہے مشہور مقولہ ہے "کسب کمال کن تا عزیز جہاں شوی"

حضرت بلال حبشی رضؓ سیاہ فام حبشی تھے لیکن کمال ہی کی وجہ سے محبوب خلائق بنے ہوئے تھے حتیٰ کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے "ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا" یعنی بلالؓ۔ (بخاری ج ۱ ص ۵۳۱)

امام اعظم ابوحنیفہؒ پر ہم سب فدا ہیں بلکہ پوری دنیا کے اکثر مسلمان آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپکی تقلید کرتے ہیں اور باعث فخر وسعادت سمجھتے ہیں حالانکہ کوئی قرابت یا رشتہ داری نہیں، ظاہر ہے کہ محبت کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ باکمال تھے، علیٰ ہذا القیاس ائمہ مجتہدین اور اولیاء کاملین سے جو ہمیں محبت ہے اور بلاشبہ

غیر اختیاری محبت ہے اس کا سبب یہی ہے کہ یہ حضرات باکمال تھے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ میں تو تمام انسانی کمالات موجود تھے ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری ٭ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ کے کمالات کون بیان کرسکتا ہے؟ ؎

لایمکن الثناء کما کان حقہٗ ٭ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نیز خود حضور اقدس کا ارشاد ہے: "اوتیت علم الاولین والآخرین" اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑا کمال علم ہے۔ نیز مخلوقات میں جتنے کمالات ہیں سب آپ کی وساطت سے ہیں، لقولہ علیہ السلام: "انما انا قاسم و اللہ یعطی"۔ پس آپ کا اکمل الکملاء ہونا ظاہر ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں ایک بزرگ سے روایت کی ہے کہ حق تعالیٰ نے عقل کے سَو حصے کئے ہیں ننانوے حصے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمائے اور ایک حصہ تمام مخلوقات پر تقسیم فرمایا۔

کتب سیر و تواریخ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کے کمالات کا اعتراف تو ساری قوموں نے کیا ہے، مخالفین اسلام نے کتابیں لکھی ہیں۔

چنانچہ آج سے تقریباً سَو سال پہلے شہر پٹنہ سے مشہور واعظِ اسلام ماسٹر حسن علی صاحب "نورِ اسلام" ایک رسالہ نکالتے تھے اس میں انہوں نے اپنے ایک ہندو تعلیم یافتہ دوست کی رائے لکھی ہے۔ اس نے ایک دن ماسٹر صاحب سے کہا کہ میں آپ کے پیغمبر کو دنیا کا سب سے بڑا کامل انسان تسلیم کرتا ہوں، انہوں نے دریافت کیا تم کیونکر پیغمبر اسلام کو دنیا کا کامل ترین انسان جانتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھ کو ان کی زندگی میں بیک وقت اس قدر متضاد اور متنوع اوصاف نظر آتے ہیں جو کسی ایک انسان میں تاریخ نے کبھی یکجا کر کے نہیں دکھایا۔ وہ بادشاہ ایسا ہو کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو، دولتمند ایسا ہو کہ خزانے کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آرہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر چولہا نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے گذر جاتے ہوں، سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لیکر ہزاروں کی غرق آہن فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو اور صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پرجوش جانثاروں کی ہمرکابی کے صلح نامہ پر دستخط کر دیتا ہو، شجاع اور بہادر ایسا کہ ہزاروں کے مقابلہ میں تنہا کھڑا ہو، اور نرم دل ایسا کہ اس نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو، باتعلق ایسا کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر، بیوی بچوں کی اس کو فکر، غریب و مفلس مسلمانوں کی اس کو فکر، خدا کو بھولی ہوئی دنیا کے سدھار کی اس کو فکر، غرض سارے سنسار کی اس کو فکر۔

اور بے تعلق ایسا کہ خدا کے سوا کسی کی اس کو یاد نہیں اور اس کے سوا ہر چیز اس کو فراموش، اس نے کبھی اپنی ذات کے لئے اپنے بُرا کہنے والوں سے انتقام نہیں لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں ہمیشہ دعاء خیر کی اور ان کا بھلا چاہا

لیکن خدا کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا اور حق کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا رہا اور عذاب الٰہی سے ڈراتا رہا۔ عین اس وقت جب اس پر ایک تیغ زن سپاہی کا دھوکہ ہوتا ہو وہ ایک شب زندہ دار زاہد کی صورت میں جلوہ نما ہو جاتا ہے، عین اس وقت جب اس پر کشور کشا فاتح کا شبہ ہو وہ پیغمبرانہ معصومیت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے، عین اس وقت جب ہم اس کو شاہِ عرب کہکر پکارنا چاہتے ہیں وہ کھجور کا تکیہ لگائے خالی چٹائی پر محوِ خواب نظر آتا ہے، عین اس دن جب عرب کے اطراف سے اس کے صحن مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے اس کے اہل بیت میں فاقہ کی تیاری ہو رہی ہو، عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی اور غلام بنکر بھیجے جا رہے ہوں فاطمہ بنتِ رسول اپنے ہاتھوں کا چھالا اور سینہ کا داغ باپ کو دکھاتی ہیں جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ پر پڑ گیا تھا اور ایک خادمہ کی درخواست کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں فاطمہ: بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے ہیں۔ (خطبات مدراس ص۸)

قرابت

محبت کا تیسرا سبب قرابت ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی سب سے زیادہ محبت کے مستحق ہیں، ارشاد خداوندی ہے: النبی اولٰی بالمؤمنین من انفسہم (پ۲۱ ع ۱۷) نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

مؤمن کا ایمان اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک شعاع ہے اسی نورِ عظیم کی جو آفتابِ نبوت سے پھیلتا ہے۔ آفتابِ نبوت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوئے بنا بریں مؤمن (من حیث ہو مؤمن) اگر اپنی حقیقت سمجھنے کے لئے حرکتِ فکری شروع کرے تو اپنی ایمانی ہستی سے پیشتر اس کو پیغمبر علیہ السلام کی معرفت حاصل کرنی پڑیگی، اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ نبیؐ کا وجود مسعود ہماری ہستی سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے اور اگر اس روحانی تعلق کی بنا پر کہدیا جائے کہ مؤمنین کے حق میں نبی بمنزلہ باپ کے ہیں بلکہ اس سے بھی بمراتب بڑھ کر ہیں تو بالکل بجا ہوگا۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں انما انا لکم بمنزلۃ الوالد الخ اور حضرت اُبی بن کعب وغیرہ کی قرأت میں آیتِ کریمہ النبی اولٰی بالمؤمنین الخ کے ساتھ وھو اب لھم کا جملہ اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

باپ بیٹے کے تعلق میں غور کرو تو اس کا حاصل یہی نکلے گا کہ بیٹے کا جسمانی وجود باپ کے جسم سے نکلا ہے اور باپ کی تربیت و شفقتِ طبعی اوروں سے بڑھ کر ہے لیکن نبی اور امتی کا تعلق اس سے بڑھ کر ہے اور یقیناً امتی کا روحانی اور ایمانی وجود نبی کی روحانیتِ کبریٰ کا ایک پرتو اور ظِل ہوتا ہے اور جو شفقت و تربیت نبی کی طرف سے ظہور پذیر ہوتی ہے ماں باپ تو کیا تمام مخلوق میں اس کا نمونہ نہیں مل سکتا۔ باپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمکو دنیا کی عارضی حیات عطا فرمائی تھی لیکن نبی کے طفیل ابدی اور دائمی حیات ملتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری وہ ہمدردانہ اور خیر خواہانہ شفقت و تربیت فرماتے ہیں جو خود ہمارا نفس بھی اپنی نہیں کر سکتا اس لئے پیغمبر کو ہماری جان و مال میں تصرف کرنے کا وہ حق پہونچتا ہے جو مخلوق میں کسی کو حاصل نہیں حضرت شاہ (عبدالقادر) صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: نبی نائب ہے اللہ تعالیٰ کا اپنی جان و مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا

نبی کا چلتا ہے، اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا جائز نہیں اور اگر نبی حکم دیدے تو جان قربان کرنا فرض اور انتہائی سعادت ہے۔

انہی حقائق پر نظر کرتے ہوئے احادیث میں فرمایا کہ تم میں کوئی شخص مومن (کامل) نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک باپ بیٹے اور سب آدمیوں بلکہ اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (فوائد عثمانی)

احسان

محبت اور تعلق کا چوتھا سبب احسان ہے۔ مشہور مقولہ ہے "الانسان عبد الاحسان": انسان غلام ہے احسان کا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کن کن احسانات کو شمار کیا جائے؟ دنیا سے لیکر آخرت تک حضور اکرمؐ کے احسانات ہم (اہلِ ایمان) پر اور ساری کائنات پر ہیں۔

حضور اکرمؐ کی بعثت کے وقت پوری دنیا بے انتہا ابتذال میں ڈوبی ہوئی تھی، انسانیت سے بالکل دور، قتل و غارت گری، سود خواری و زنا کاری غرض انسانی دنیا میں وحشت و بربریت کے سیلاب اُمڈے ہوئے تھے لیکن رحمتِ عالمؐ نے تمام معاصی و جرائم کی بیخ کنی کی، حیوانوں کو انسان بنایا اور انسانیتِ کبریٰ کا سبق دے کر معلمِ خلائق بنایا یہ کتنا بڑا عظیم الشان احسان ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

(۲) امم سابقہ پر جو سخت احکام تھے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کیلئے منسوخ کر دیئے گئے مثلاً بغیر مسجد کے نماز نہ ہوتی، غنائم کی حرمت، بلا قطع طہارت حاصل نہ ہونا، زکوٰۃ میں مال کا چوتھائی وغیرہ وغیرہ۔

(۳) امم سابقہ پر جو سخت سزائیں تھیں وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے مرتفع کر دی گئیں۔ مثلاً بلا قتل توبہ قبول نہ ہوتی تھی، اگر کوئی رات کو چھپ کر گناہ کرتا تو صبح کو اپنے مکان کے دروازے پر لکھا ہوا پاتا، پوری قوم کا مسخ و خسف وغیرہ۔ قال اللہ تعالیٰ:

ویضع عنهم اِصرَهم والاَغلالَ التی کانت علیهم (پ ۹ ع ۹)۔	(آنحضورؐ) ان پر سے وہ بوجھ اتارتے ہیں اور بندشیں کھولتے ہیں جو اُن پر تھیں۔

اور کائنات عالم کی ساری قوموں کا اتفاق ہے کہ انسان میں جب تک انسانیت اور انسانی شرافت ہے وہ احسان فراموش نہیں ہو سکتا ہے، احسان فراموشی کفار و مشرکین بھی انتہائی مذموم سمجھتے تھے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی نے (جو قریش مکہ میں بڑے معزز اور ذی اثر شخص تھے، اس وقت کافر تھے بعد میں مسلمان ہو گئے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دوران گفتگو میں کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے پاس مختلف قوموں کے لوگ جمع ہو گئے ہیں یہ لوگ معمولی مصیبت دیکھیں گے تو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کو یہ سنکر جلال آگیا اور آپؓ نے غصہ میں عروہ کو گالی دیکر یہ فرمایا کیا ہم لوگ آپؐ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟۔ عروہ نے پوچھا یہ کون شخص ہیں؟ لوگوں نے بتایا یہ ابو بکرؓ ہیں، جواب میں عروہ کہتا ہے کہ ابو بکر! اگر مجھ پر آپ کا احسان نہ ہوتا تو میں جواب دیتا۔ یعنی صرف احسان کی وجہ سے زبان پر روک لی۔

اور صرف انسان ہی پر موقوف نہیں بلکہ بعض حیوانات بھی احسان کی وجہ سے جھکنے لگتے ہیں۔
خلاصہ یہ ہے کہ ان اسباب میں سے ہر ایک سبب موجب محبت ہے تو اگر کسی ایک ذات میں محبت کے یہ سارے اسباب موجود ہوں تو کتنی محبت ہونی چاہئے۔ پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ بتقاضائے عقل سلیم کے علاوہ فطری اور طبعی طور پر بھی سب سے زیادہ محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہونی چاہئے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کی زندگی ناطق و شاہد ہے۔

صحابہ کرام کی محبت کے چند شواہد و نمونے

حضرت خبیبؓ کی گرفتاری اور ان کی شہادت کا واقعہ مشہور ہے۔ (بخاری شریف جلد ثانی ص۵۲۵ میں بھی موجود ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے نصر الباری شرح بخاری کتاب المغازی ص۱۳۳ تا ص۱۳۹) کہ اولاً تو ان کو گرفتار پھر قید کیا گیا، اشہر حرم کے ختم ہونے کے بعد ان کو حرم سے باہر نکالا گیا اور سولی پر لٹکانے کے وقت آخری خواہش کے طور پر پوچھا گیا کہ کوئی تمنا ہو تو بتاؤ۔ ے

کہا مجھ کو کسی شی کی نہ حاجت ہے نہ رغبت ہے ؛؛ فقط حب نبی کا ذوق ہے شوق عبادت ہے

انہوں نے فرمایا کہ مجھے اتنی مہلت دی جائے کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں کہ دنیا سے جانے کا وقت ہے اور اللہ جل شانہٗ کی ملاقات قریب ہے، چنانچہ مہلت دی گئی، انھوں نے دو رکعتیں بہت اطمینان سے پڑھ کر فرمایا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ یہ سمجھوگے کہ موت کے ڈر کی وجہ سے دیر کر رہا ہوں تو دو رکعت اور پڑھتا، اس کے بعد سولی پر لٹکا دیئے گئے، عین سولی کے وقت کسی کافر نے قسم دیکر یہ پوچھا کہ خبیب! تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیں اور تم کو چھوڑ دیں؟ حضرت خبیب رضی نے فرمایا مجھے یہ بھی گوارہ نہیں کہ میری جان کے فدیہ میں ایک کانٹا بھی حضور اقدسؐ کے چبھے۔

(۲) اسی طرح حضرت زید بن دثنہؓ سے شہادت کے وقت ابوسفیان نے پوچھا کہ زید! قسم کھا کر کہو کیا تمہیں اس پسند ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے، حضرت زید نے کہا خدا کی قسم مجھے یہ بھی گوارہ نہیں کہ حضور اقدسؐ جہاں ہیں وہیں ان کے ایک کانٹا بھی چبھے، یہ جواب سنکر قریش حیران رہ گئے، ابوسفیان نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کو جتنی ان سے محبت دیکھی اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی قال ابوسفیان مارأیت من الناس احداً یحب احداً کحب اصحاب محمد محمداً۔

(۳) حضرت علی رضی نے فرمایا کہ حضور انورؐ کی ذات گرامی ہمیں مال، اولاد، والدین اور پیاس میں سرد پانی سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

(۴) ایک انصاری خاتون کے باپ، بھائی اور شوہر غزوۂ احد میں شہید ہو گئے باری باری اس خاتون کو ان حادثوں کی خبر ملتی رہی، ہر بار صرف یہ پوچھتی جاتی ہے کہ وہ سرکار دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس خاتون نے کہا ار دیدہ مجھے چہرۂ انور دکھلا دو، اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک

دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی "کل مصیبۃ بعدک جلل" (آپ کے بعد تمام مصیبتیں حقیر ہیں)۔
علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس واقعہ کو نظم میں بیان کیا ہے کہ جب موقع جنگ پر پہونچیں تو لوگوں نے کہا ؎

تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی — تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیر ستم
سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید — گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہِ الم
اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا — یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم
سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور — گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
کہا چل کر دکھا دو مجھکو صورت کملی والے کی — کہ ان تاریک آنکھوں کو ضرورت ہے اُجالے کی
بڑھ کے اس نے رخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا — آپ سالم ہیں تو ہیچ ہیں سب رنج و الم
میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی اور بھی فدا — اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

(۵) حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ ایک باغ میں تھے کسی نے آکر پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر دی فوراً آنکھیں بند کرلیں اور بارگاہِ رب العالمین میں عرض کیا خدایا جن آنکھوں سے میں نے محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالِ جہاں آرا دیکھا ہے اب ان سے کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا مجھ سے میری بصارت لے لے چنانچہ ان کی بینائی جاتی رہی۔

(۶) حضرت اویس قرنیؓ کے متعلق مشہور ہے کہ جب انہیں یہ اطلاع پہونچی کہ حضور اکرمؐ کا دندان مبارک شہید ہو گیا تو حضرت اویسؓ نے اپنے تمام دانت توڑ لئے کیونکہ معین دندانِ مبارک معلوم نہ ہو سکا تھا۔

ان تمام واقعات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو آنحضرتؐ سے جو محبت عقلی و ایمانی تھی وہ محبت طبعی پر بدرجہا غالب ہو کر محبت عشقی کے درجہ کو پہونچی ہوئی تھی اور عشق کا حال یہ ہے ؎

عشق آں شعلہ ایست کہ چوں بر افروخت
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

۱۴ ● حدثنا یعقوب بن ابراھیم قال ثنا ابن عُلیۃ عن عبد العزیز بن صُھیب عن انسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ح وحدثنا آدمُ بن ابی ایاس قال ثنا شعبۃ عن قتادۃ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤمن احدُکم حتیٰ اکونَ احبَّ الیہ مِن والدہ وولدہ والناس اجمعین ●

ترجمہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومنِ (کامل) نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو میری محبت اپنے باپ، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو جائے۔

مطابقتہ للترجمۃ :- حدیث شریف کی مطابقت ترجمہ سے ظاہر ہے۔

تشریح امام بخاریؒ نے اس باب میں دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس دوسری روایت میں والناس اجمعین کی زیادتی ہے جس میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری ہے حتی کہ انسان کی اپنی ذات بھی شامل ہے۔
اس دوسری روایت میں دو سندیں ہیں درمیان میں حائے تحویل ہے جس کی تفصیل کتاب الوحی میں گذر چکی ہے ملاحظہ فرمائیے حدیث ۵ کی تشریحات۔

فائدہ ابن بطال نے ابوالزناد سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کہ مختصر الفاظ میں محبت کے تمام اقسام کو جامع ہے کیونکہ اقسام محبت تین ہیں۔
۱ محبت اجلال واعظام جیسے والدین کی محبت۔ ۲ رحمت وشفقت کی محبت جیسے ولد کی محبت۔
۳ مشاکلت کی محبت جیسے آپس میں تمام انسانوں کی محبت۔
ظاہر ہے کہ محبت کے سارے انواع واقسام انھیں تینوں میں داخل ہیں محبت کی کوئی نوع اس سے خارج نہیں لہٰذا اس حدیث کا جوامع الکلم میں سے ہونا ظاہر ہے۔
باقی تفصیلات پہلی حدیث میں گذر چکیں۔

یارب صلّ وسلّم دائما ابدا ؛ علی حبیبك خیر الخلق كلهم

• بابُ حلاوةِ الایمانِ •

ایمان کی حلاوت (مزہ) کا بیان

۱۵ • حدّثنا محمّدُ بنُ المُثنّٰی قال ثنا عبدُ الوهابِ الثقفيُّ قال ثنا ایوبُ عن ابی قِلابةَ عن انسٍ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم قال ثلثٌ مَن کنّ فیه وَجَدَ حلاوةَ الایمان اَن یکونَ اللّٰهُ ورسولُهُ اَحبَّ الیه ممّا سواهما واَن یحبَّ المَرْءَ لا یحبُّه الّا للّٰه واَن یّکرهَ اَن یّعودَ فی الکفر کما یَکرهُ اَن یُّقذفَ فی النار •

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص میں تین باتیں ہونگی وہ ایمان کی حلاوت (مزہ) پالیگا ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت سب سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ فقط اللہ کیلئے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ اس کو کافر بننا اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

مطابقة للترجمة: ترجمۃ الباب سے حدیث کی مطابقت ظاہر ہے کہ ترجمۃ الباب حدیث ہی کا ٹکڑا ہے۔

ماقبل سے ربط: باب سابق میں یہ بتایا تھا کہ ایمان میں اسی وقت کمال متحقق ہوگا جبکہ محبوب رب العالمین

کی محبت ساری مخلوق سے زیادہ ہو۔ اس باب میں سابق باب کے ثمرہ کا بیان ہے اس لئے اس باب کے امورِ ثلاثہ میں سے پہلی چیز وہی ہے جو باب سابق میں گذری یعنی اَن یکون اللہ ورسولہ احبّ الیہ ممّا سواھما۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ ھٰذا الباب مشتمل علیٰ ثلاثۃ اشیاء والباب الذی قبلہ جزء من ھٰذہ الثلاثۃ وھٰذا اقویٰ وجوہ المناسبۃ۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ھنا ص۷ ایضاً ص۹ وایضاً ص۸۹۲ وایضاً ص۱۰۲۲ واخرجہ مسلم والترمذی۔

تشریح

ثلاثٌ تنوین بعوض مضاف الیہ ای ثلاث خصال۔ وجد ای اصاب یعنی جس شخص میں تین خصلتیں ہونگی وہ ایمان کا مزہ پالیگا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ھٰذا حدیث عظیم اصل من اصول الاسلام الخ

حدیث شریف میں تین چیزوں کا ذکر ہے، ان تینوں میں اول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت دوسری تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی محبت تو اس لئے کہ وہی منعم حقیقی ہے، نیز محبت کے جتنے وجوہ واسباب ہیں جمال، کمال، احسان اور قرب، سب باری تعالیٰ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور سب سے زیادہ خداوند قدوس میں جمع ہیں۔ جمال، کمال اور احسان کا اعلیٰ اور اکمل ہونا تو ظاہر ہے محتاج بیان نہیں، رہا قرب تو اس کے لئے قرآن کریم کی شہادت کافی ہے:۔

نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ (سورہ قٓ)	ہم اس کے قریب ہیں شہ رگ سے زیادہ۔
وھو معکم اینما کنتم۔ (سورہ حدید)	وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔
ونحن اقرب الیہ منکم ولٰکن لا تبصرون۔ (سورہ واقعہ)	اور ہم اس کے زیادہ قریب ہیں تمہاری بہ نسبت لیکن تم نہیں دیکھتے۔

اللہ کے اقرب ہونے کا مطلب

اللہ تعالیٰ کا قرب ممکنات کے قرب کی طرح نہیں بلکہ ان کی شان کے لائق جو قرب ہے وہ مراد ہے اور یہ ایک مستقل بحث ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اقرب (نزدیک تر) ہونے کا کیا مطلب ہے؟

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے تقریب الی الفہم کے لئے اسے مثال دیکر سمجھایا ہے کہ مثلاً یہ دھوپ ہے جس میں گرمی بھی ہے اور روشنی بھی ہے۔ فرض کرو اگر یہ دھوپ خود اپنی حقیقت کو معلوم کرنا چاہے اور اس سلسلہ میں حرکتِ فکریہ کرنے تو اس حرکت فکریہ میں سب سے پہلے شمس پڑیگا اور اس کو یہ سمجھنا ہوگا کہ میں ایک حصہ اور ٹکڑا ہوں اس نور کا جو قرص شمس میں بھرا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ شمس کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد وہ اپنی حقیقت معلوم کرسکتی ہے اور حرکتِ فکریہ میں شمس پہلے آیا اور اس کو اپنی حقیقت بعد میں آئیگی۔

معلوم ہوا کہ شمس دھوپ سے اس کی اپنی ذات وحقیقت سے بھی زیادہ قریب ہے کیونکہ حرکت میں جو چیز پہلے آئے وہی قریب ہے اور جو بعد میں آئے وہی بعید ہے۔ مثلاً تم ایک جگہ سے حرکت کرکے دور کے

مقام پر جانا چاہتے ہو اس حرکت میں جو مقامات تم کو پیش آئیں گے وہ مقامات تمہارے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت اس مقام کے جہاں تم جانا چاہتے ہو، فرق یہ ہے کہ اس میں حرکت عینی ہے اور اس میں حرکت فکر یہ تھی، کلی طور پر اپنی بات سمجھ لیں کہ معلول اگر اپنی حقیقت کو سمجھنا چاہے اور حرکت فکر یہ کرے تو اس حرکت میں پہلے علت آئیگی بعدہ معلول اپنے نفس اور حقیقت کو سمجھ سکے گا. پس اگر ممکنات مثلاً ہم اپنی حقیقت کو سمجھنا چاہیں گے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو معلوم کرنا پڑیگا کیونکہ ہم معلول ہیں اور وہ علت ہے، ہمارا وجود ایک پرتو اور شعبہ ہے اس کے وجود کا، اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حرکت میں جو پہلے آئے وہ قریب ہے اور جو بعد میں آئے وہ بعید ہے. تو اللہ تعالیٰ ہمارے نفس اور ہماری حقیقت کی بہ نسبت ہم سے زیادہ قریب ہوا

اور اسی طرز و طریق پر النبی اولیٰ (ای اقرب) بالمؤمنین من انفسھم۔ (احزاب) کہا جا سکتا ہے کیونکہ مؤمن من حیث ہو مؤمن، اگر اپنی حقیقت کو سمجھنے کے لئے حرکت فکری کرے تو اپنی ایمانی ہستی سے پیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کرنی پڑیگی ۔ اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ نبیؐ کا وجود خود ہماری ہستی سے بھی زیادہ ہم سے نزدیک ہے۔

مشہور سوال اس حدیث میں ہے: "أن یکون اللّٰہ و رسولہ أحب الیہ مما سواھما" اس مما سواھما کا مرجع اللہ اور رسول ہیں. دونوں کو آپؐ نے ایک ہی ضمیر میں جمع کر دیا ہے حالانکہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کسی خطیب نے اپنے وعظ کے شروع میں کہا و من یعصھما فقد غویٰ " تو آپؐ نے فرمایا " بئس الخطیب انت " (عمدۃ ۱ ص ۱۷۵)۔

اب سوال یہ ہے کہ جس جمع سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس کے برخلاف اس روایت میں کس حکمت کی بنا پر جمع فرمایا، وجہ فرق کیا ؟

جواب:۔ اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں:۔

(۱) بہترین جواب یہ ہے کہ حضور اقدسؐ نے جو اس حدیث میں جمع کیا ہے وہ محبت کا معاملہ ہے اور چونکہ اللہ اور رسول کی محبتیں لازم و ملزوم ہیں، انسان کی فلاح و نجات کیلئے دونوں ضروری ہیں. اللہ کی محبت اسی وقت معتبر و کار آمد ہے جب رسول کی محبت بھی ہو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اسی وقت معتبر اور نافع ہے جب اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہو صرف ایک محبت کافی نہیں۔ اس لئے اس موقع پر ایک ضمیر ہی میں جمع کرنا مناسب تھا تاکہ اشارہ ہو جائے کہ محبتین کا مجموعہ شریعت میں مطلوب ہے۔

اور خطیب والی روایت میں عصیان کا معاملہ ہے اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ ہر ایک کی نافرمانی مستقلاً خطرناک اور باعث ہلاکت ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضمیر میں جمع کرنے سے منع فرمایا. اور تنبیہ کر دیا کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا چاہئے کیونکہ ایک ضمیر میں جمع کرنے سے ایہام ہو سکتا ہے کہ شاید دونوں کی نافرمانی کا مجموعہ مضر ہو تنہا صرف ایک کی نافرمانی موجب ہلاکت نہ ہو اس لئے فرمایا:

قل ومن یعص اللہ ورسولہ الخ (علامہ)

(۲) حضرت شاہ انور کشمیریؒ اور علامہ عثمانیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ "بئس الخطیب انت" قل ومن یعص اللہ ورسولہ فقد غوی، میں نہی تحریم کے لئے نہیں ہے بلکہ ادب فی التکلم کی تعلیم اور تادیب وتہذیب کے لئے ہے۔ کمافی قولہ تعالیٰ: لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا۔ (فیض الباری)

وان یحب المرء لایحبہ الا للہ یہ دوسرا جملہ ہے۔ یعنی جس شخص سے بھی محبت رکھے محض اللہ کیلئے رکھے مطلب یہ ہے کہ نہ تو دنیوی جلب منفعت مقصود ہو اور نہ دفع مضرت مثلاً کوئی شخص اسباب محبت (جمال، کمال، قرب واحسان) میں سے کسی وصف سے بظاہر متصف نہ ہو لیکن متقی اور متبع شریعت ہو اس وجہ سے اس کے ساتھ محبت ہو تو یہ محبت خالصاً لوجہ اللہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جملہ اولیٰ میں محبت مع اللہ اور تعلق مع اللہ کا بیان تھا اور جملہ ثانیہ میں تعلق اور محبت مع الخلق مذکور ہے، گویا یوں فرمایا گیا کہ کامل مؤمن وہ ہے جو ان تمام تعلقات کا حق ادا کرے، حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرے۔ جب انسان میں یہ دونوں وصف کامل ہوجائیں گے تو لامحالہ اسے ہر اس چیز سے نفرت ہوگی جو اللہ اور رسول اور مؤمنین صالحین کے نزدیک مبغوض ہے۔ لہٰذا عود الی الکفر اسے اتنا ناگوار ہونا چاہیئے جتنا آگ میں ڈالے جانے سے بلکہ اس سے زیادہ " لان حب الشئی مستلزم لبغض نقیضہ " اسکو تیسرے جملہ میں بیان کیا گیا ہے۔

وجد حلاوۃ الایمان حلاوتِ ایمان سے کیا مراد ہے؟ حلاوتِ حسّی مراد ہے یا حلاوتِ معنوی؟ عموماً شراح لکھتے ہیں کہ حلاوتِ معنویہ قلبیہ مراد ہے کیونکہ ایمان کوئی حسّی چیز نہیں ہے کہ اس کی حلاوت مراد ہو یعنی طاعت وعبادت میں قلب کو شیرینی جیسی حلاوت محسوس ہو، جیساکہ قطب الاقطاب حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا جو حضرت گنگوہی نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں لکھا تھا کہ بندہ کو بحمد اللہ تین چیزیں حاصل ہیں جو محض اللہ کا فضل وکرم ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اطراف واکناف میں دوسَو سے زائد طالب العلم مجھ سے حدیث شریف پڑھ کر اپنی اپنی جگہ درس دے رہے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ امور شرعیہ امور طبعیہ کی مانند بن گئے ہیں۔ یعنی امور شرعیہ کو چھوڑنے میں ویسی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جیسی کہ بھوک، پیاس اور دھوپ سے طبعاً تکلیف ہوتی ہے اور امور شرعیہ کی طرف ویسی ہی رغبت ہوتی ہے جیسی کہ انسان کو بھوک کے وقت روٹی کی طرف اور پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً میلان ہوتا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ مادح اور ذام (یعنی تعریف اور مذمت کرنے والے) دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں۔

یہ دوسری چیز جو حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے اس مکتوب میں لکھی ہے وہی دراصل استلذاذ بالطاعات ہے جیساکہ امام نووی ودیگر محدثین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حلاوتِ معنویہ مراد ہے یعنی طاعات میں لذت محسوس ہونا اور اللہ تعالیٰ اور سرکار دو عالم ﷺ کی رضامندی کے لئے بڑی سے بڑی تکالیف کو بخوشی برداشت کرنا اور

اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کو تمام دنیا کے مال و متاع پر ترجیح دینا۔ (شرح مسلم ص۴۹)

محدث کبیر عارف باللہ شیخ ابن ابی جمرہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے منتخب بخاری پر جو شرح بہجۃ النفوس کے نام سے لکھی ہے اس میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سادات صوفیہ نے حلاوت حسی مراد لیا ہے اور فرماتے ہیں والصواب معهم فی ذلك واللہ اعلم یعنی سادات صوفیہ کی تحقیق ہی اس مسئلے میں درست ہے کیونکہ صوفیاء نے حدیث کے لفظ کو بغیر تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ هذا الامر لا یدرکه الا من وصل الی ذلك المقام یعنی یہ بات ایسی ہے کہ اس کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جو اس مقام تک پہونچے ہوں، لہٰذا اگر تمہیں محسوس نہیں ہوتی تو جنھیں محسوس ہوتی ہے ان کی بات کو تسلیم کرو اور یہ دعوٰی مناسب نہیں کہ حدیث میں وہ مرتبہ (یعنی حسی حلاوت) مراد نہیں لیکن "ذوقِ این بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی" وللہ درّ الشاعر ؎

اذا لم تر الهلال فسلم ❊ لأناس رأوه بالابصار

جب چاند تمہیں نظر نہ آئے تو جن لوگوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے ان کے کہنے سے مان لو۔

پھر فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت بلالؓ، حضرت عمار، حضرت خبیب رضی اللہ عنہم اور سلف صالحینؒ کے حالات شاہد عدل ہیں کہ وہ حلاوۃ حسی سے محظوظ و مشرف ہوئے۔

• بَابٌ عَلَامَةُ الْاِيمَانِ حُبُّ الْاَنْصَارِ •

انصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

۱۶ • حدثنا ابو الوليد قال ثنا شعبة قال اخبرني عبد الله بن عبد الله بن جبر قال سمعت انس بن مالك عن النبي صلى الله عليه وسلم قال آية الايمان حب الانصار و آية النفاق بغض الانصار •

ترجمہ حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی نشانی انصار سے محبت رکھنا ہے اور انصار سے بغض (دشمنی) نفاق کی علامت ہے۔

مطابقتہ للترجمۃ:- حدیث کی مطابقت ظاہر ہے کہ ترجمۃ الباب حدیث پاک ہی کا ایک جزو ہے۔

ماقبل سے ربط:- اس باب کا ماقبل سے ربط باب اطعام الطعام من الاسلام کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

اشکال حب الانصار کو علامت ایمان اور بغض انصار کو علامت نفاق فرمایا ہے۔ مہاجرین سے محبت یا بغض کو کیوں نہیں ذکر فرمایا؟

جواب:- مہاجرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ میں سے تھے، پھر ترک وطن اور ہجرت کی تکالیف اور فقر و فاقہ کی وجہ سے ان کی فضیلت میں کسی کو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

غرضیکہ ان کی فضیلت چونکہ مسلّم تھی اور یہ حضور اکرمؐ کے اپنے خاندان ہی کے افراد تھے اس لئے ان کی فضیلت بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے برعکس انصار کے لئے چونکہ یہ فضائل حاصل نہ تھے لہذا امکان تھا کہ کسی کو ان کی فضیلت میں کچھ شبہ ہو اور ان کی عظمت و محبت کما حقہ قلب میں پیدا نہ ہو اس لئے خصوصیت کے ساتھ حب انصار کو بیان فرمایا۔

حاصل یہ ہے کہ جب حبّ الانصار اتنی موکّد ہے تو حبّ المہاجرین بطریق اولیٰ ضروری ہوگی۔

اشکال جنگ صفین وغیرہ میں انصار کی اکثریت حضرت علیؓ کے ساتھ تھی تو کیا جو صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے انہیں معاذ اللہ منافق کہا جائیگا؟

جواب:- (۱) بغض و قتال میں فرق ہے۔ قتال کے لئے بغض ہونا لازم نہیں، ان حضرات کا قتال آپس میں بغض و نفرت کی بنا پر نہ تھا بلکہ ہر ایک کا مقصد حفاظتِ دین تھا، مثلاً دو بھائی آپس میں لڑیں تو ان میں بغض نہیں ہوتا بلکہ قتال کے باوجود فطری محبت باقی رہتی ہے اس کا ظہور جب ہوتا ہے کہ کسی غیر سے مقابلہ کی نوبت آئے۔

چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے باہمی اختلاف کے زمانہ میں قیصر روم نے حضرت معاویہؓ کیطرف سے اپنے کو مطمئن سمجھ کر ایران کے کچھ علاقہ پر قبضہ کرنا چاہا جو حضرت علیؓ کی ولایت میں تھا۔

قیصر روم نے حضرت معاویہؓ کے پاس خط لکھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے صاحب یعنی حضرت علیؓ تم پر زیادتی کر رہے ہیں اگر تم کہو تو میں تمہارے پاس امداد کے لئے لشکر بھیجوں۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے جوابی خط میں بہت غصہ سے لکھا کہ "او نصرانی کتے تجھے یہ خیال ہوا کہ موقع پاکر اب مدینہ کیطرف اور مسلمانوں کی طرف حملہ آور ہو اور اسلام کی جڑ کاٹ دے اور مسلمانوں کو نقصان پہونچائے، تو یاد رکھو کہ اگر تم نے مدینہ کیطرف اور مسلمانوں کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو علیؓ کی طرف سے پہلا سپاہی معاویہ ہوگا، خبردار دماغ میں کبھی ایسا خیال نہ لانا"۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات رائے اور اجتہاد کے اختلاف پر مبنی تھے اور دینی اعتبار سے وحید المقصد اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے تھے۔

قرآن و حدیث کو بغور پڑھنے اور سمجھنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ حدیث کا مضمون قرآن حکیم کی کسی آیت سے مستنبط ہوتا ہے یا حدیث قرآن حکیم کی کسی آیت کی تشریح ہوتی۔

مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے اس حدیث الباب کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کا ماخذ سورۂ حشر کی آیت ہے:۔

والذین تبوّؤ الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم۔	اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں اور ایمان میں ان سے پہلے وہ محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے ہیں انکے پاس۔

اس گھر سے مراد مدینہ طیبہ اور یہ لوگ انصار مدینہ ہیں جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے اور ایمان و عرفان کی راہوں پر بہت مضبوطی کے ساتھ مستقیم ہو چکے تھے۔ مدینہ طیبہ کو گھر بنانا تو

ظاہر ہے مگر ایمان کو گھر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس طرح گھر میں محفوظ ہوتا ہے اسی طرح انصار ایمان کے گھیرے اور احاطے میں آچکے تھے ایمان ظرف کے مانند تھا اور وہ مظروف تھے۔ معلوم ہوا کہ مؤمن کا گھر ایمان ہے جس کے حصار میں رہ کر یہ کفر و شرک کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے اور ساتھ ہی اس قلعہ میں رہ کر معاصی اور فسق و فجور کی یلغار سے بھی بچا رہتا ہے۔

(۲) اس حکم میں انصار کی صفت ملحوظ ہے ای آیۃ الایمان حب الانصار من حیث انہم انصار وآیۃ النفاق بغض الانصار من حیث انہم انصار۔ یعنی انصار سے محبت اس لئے ہو کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی نصرت کی، اور علامت نفاق یہ ہے کہ سبب بغض یہ ہو کہ حضور اکرم کے انصار و مددگار ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو شخص اس لئے ان حضرات سے بغض رکھیگا اس کے قلب میں ایمان کا ذرہ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کی نظیر قول فقہاء ہے "سب العلماء کفر" اس میں بھی حیثیت ہی ملحوظ ہے "ای من حیث انہم علماء الدین" ظاہر ہے کہ جو شخص سب العلماء اس لئے کرتا ہے کہ یہ حامل دین ہیں وہ دین کا دشمن ہے جس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

انصار مدینہ کے حالات

انصار مدینہ کا اصل وطن مدینہ نہ تھا بلکہ یہ لوگ ملک یمن کے ایک خوشحال شہر مآرب میں رہتے تھے جہاں قوم سبا آباد تھی، یہ لوگ اوس اور خزرج کہلاتے تھے، جب قوم سبا پر سیلاب کا عذاب آیا تو ایک کاہن نے اطلاع دی کہ یہاں جلد ہی ایک عذاب آنیوالا ہے جو لوگ اس سے بچنا چاہیں وہ یہاں سے نکل جائیں۔ چنانچہ قوم سبا کے لوگ اور بنو قیلہ کے دو قبیلے اوس و خزرج نکل گئے۔ اوس و خزرج مدینہ میں آکر مقیم ہو گئے، اس وقت مدینہ پر یہود کا تسلط تھا جب قبیلہ اوس مدینہ پہونچے تو یہودیوں نے اس شرط پر مدینہ میں اقامت کی اجازت دی کہ جب بھی تمہارے یہاں کسی کی شادی ہوگی تو پہلی رات دلہن کو ہمارے یہاں بھیجنا پڑیگا، ان لوگوں نے مجبوری میں اس شرط کو قبول کر لیا لیکن واقعہ یہ پیش آیا کہ جب شادی ہوئی تو وہ شادی شدہ لڑکی (دلہن) چہرہ کھول کر بالکل بے حجاب مجمع کے سامنے آگئی، مجمع میں اس کے سب رشتہ دار موجود تھے انہوں نے اس کو اس بے حجابی پر عار دلائی، دلہن نے کہا کہ تمہیں ڈوب مرنا چاہئے کہ مجھے غیر شوہر کے پاس بھیجنے پر راضی ہو۔

بات تیر کی طرح لگی اور غیرت و حمیت کو جوش آیا اور ان لوگوں نے تہیہ کر لیا کہ اس ذلت کو ہرگز گوارہ نہیں کرینگے اگر جنگ کی نوبت آئی تو مقابلہ کریں گے، چنانچہ جنگ ہوئی اور خداوند قدوس نے ان کو یہودیوں پر غالب کر دیا۔ اس کے بعد یہود مدینہ اوس و خزرج سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں نبی آخر الزماں کا انتظار ہے ان کے ظہور کے بعد تمہاری ان حرکات کا جواب دیں گے، اوس و خزرج بت پرست و مشرک تھے انہیں کچھ علم نہ تھا، یہود کے اس طعنہ سے اوس و خزرج بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے لئے چشم براہ تھے، جب موسم حج کا آیا تو خزرج کے چھ آدمی مکہ آئے اور منی میں ٹھہرے، حضور اکرم ان کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ رات کو تشریف لائیں جب تک ہم آپس میں کچھ مشورہ کرلیں۔ مشورہ میں طے پایا کہ وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کا تذکرہ یہود کیا کرتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہود اس سعادت و فضیلت میں ہم سے سبقت کر جائیں۔

پھر جب حضور اکرم ﷺ رات میں تشریف لے گئے تو وہ سب کے سب اسلام لے آئے۔ اس کے بعد جب دوسرا سال آیا جو نبوت کا بارہواں سال تھا تو بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے اور اسی گھاٹی میں آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی جو اسلام کی سب سے پہلی بیعت تھی جس کو بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۳ھ نبوی میں بہتر آدمی حاضر خدمت ہوئے اور اسی گھاٹی میں بیعت کی یہ بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔ اس دوسری بیعت عقبہ ثانیہ جو دراصل لیلۃ العقبۃ الثالثہ ہے اسی میں حضرات انصار رضی اللہ عنہم کی درخواست پر مکہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنا طے پایا تھا۔

اختلاف العلماء کی تحقیق

علماء کے اختلاف کا ختم ہو جانا ناممکن ہے اور اس کی تمنا رکھنے والا بہت بڑا احمق ہے اس لئے کہ علماء کا اتفاق اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ قرآن و حدیث میں ہر شخص کے متعلق ہر فعل کی ہر کیفیت کا حکم منصوص ہو اور یہ ناممکن ہے، کیونکہ دنیا میں انسان غیر محصور ہیں اگرچہ غیر متناہی نہیں پھر ہر شخص کے افعال غیر محصور اور ہر فعل کی کیفیات اور احکام غیر محصور پس اگر اتنی مفصل کتب نازل کر دی جاتی جس میں ہر ہر جزئیہ مذکور ہو تو وہ اتنی ضخیم ہوتی کہ نہ تو اس کی حفاظت ممکن ہوتی اور نہ اس کا نقل کرنا انسان کی قدرت میں ہوتا اور نہ ہی اس سے استفادہ کی کوئی صورت ممکن ہوتی، غیر محصور انسانوں میں اپنا نام تلاش کرنا ہی مشکل ہو جاتا پھر اپنے غیر محصور افعال کے غیر محصور احکام میں سے کسی حکم کا تلاش کرنا ناممکن ہوتا، پس ایسی کتاب کا نازل کرنا کہ اس سے انسان استفادہ نہ کر سکے اور اس کی حفاظت سے بھی عاجز ہو یہ ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ میں عیب کا ہونا ناممکن ہے لہذا اختلاف کا مٹنا بھی ناممکن ہے اور ناممکن کی تمنا کرنے والا احمق ہوگا۔

پس ضروری ہوا کہ قرآن و حدیث میں جزئیات کی بجائے کلیات مذکور ہوں جن سے ہر ہر جزئیہ کا حکم مستنبط کیا جائے اور کلیات سے استنباط میں انسان کی عقل و فہم کا دخل ہوتا ہے اور انسان کی عقول مختلف ہیں جس کی وجہ سے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ جزئیہ ایک ہوتا ہے اور کلیات بھی فریقین میں مسلّم ہوتے ہیں مگر اختلاف اس میں ہوتا ہے کہ یہ جزئیہ کس کلیہ کے تحت درج ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جج کے پاس کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعیٰ علیہ کے وکلاء اختلاف کرتے ہیں حالانکہ جزئیہ بھی ایک ہے جس پر دونوں بحث کر رہے ہیں اور جن قوانین سے اپنے نظریہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ قوانین بھی ایک ہی حکومت کے اور فریقین کے ہاں مسلّم ہوتے ہیں اس کے باوجود دونوں وکیلوں میں یوں اختلاف ہوتا ہے کہ مدعی کا وکیل کہتا ہے کہ فلاں قانون کی رُو سے اس جزئیہ میں مدعیٰ علیہ کو سزا ہونی چاہیئے اور مدعیٰ علیہ کا وکیل یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ جزئیہ اس قانون کے تحت نہیں آتا جو مدعی کے وکیل نے بیان کیا ہے بلکہ دوسرے قانون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے لحاظ سے مدعیٰ علیہ بری ہوتا ہے۔

غرضیکہ ان دونوں کی بحث اس میں ہوتی ہے کہ یہ جزئیہ کس کلیہ کا فرد ہے اور کونسا قانون اس پر منطبق ہوتا ہے، ہم شب و روز دیکھتے ہیں کہ وکلاء کی بحثیں اسی طرح جاری رہتی ہیں اور دونوں وکیل حکومت کے مجاز ہوتے ہیں، ان کے اختلاف پر نہ ہی فریقین کو اعتراض ہوتا ہے اور نہ ہی دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔

اور نہ جج ان کے اختلاف پر ناراض ہوتا ہے نہ حکومت انہیں اختلاف سے روکتی ہے بلکہ انہیں خوب بحث کرنیکا اور دلائل بیان کرنیکا موقع دیا جاتا ہے اور جو وکیل زیادہ بحث کرتا ہے اسے داد ملتی ہے اس کے بعد جج دونوں میں سے جس کے دلائل کو راجح پاتا ہے اس کی جانب فیصلہ دے دیتا ہے مگر دوسرے وکیل کی نہ اجازت سلب کی جاتی ہے اور نہ اس کو سزا دیجاتی ہے اور نہ ہی اسے برا سمجھا جاتا ہے بلکہ آئندہ مقدمات میں پھر اسے بدستور بحث کرنے کی اجازت ہوتی ہے، بعینہ یہی مثال علماء کی ہے کہ جزئیہ معینہ پر کونسا کلیہ منطبق ہوتا ہے اس میں ان کا اختلاف ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اختلاف وکلاء کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے اختلافات ہم دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ مثلاً سیاسی اختلاف اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ اسمبلیوں میں بعض دفعہ کرسی بازی تک کی نوبت آجاتی ہے، اسی طرح علم العلاج میں بھی بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی اور آیورویدک وغیرہ کے تو اصول ہی مختلف ہیں چنانچہ ایلوپیتھی میں علاج بالضد ہوتا ہے اور ہومیوپیتھی میں علاج بالمثل۔ پھر ہر طریقۂ علاج میں مرض کی تشخیص، اس کے اسباب اور دوا کی تجویز، متضاد خوراک، خوراکوں کی تعداد، دوا کے طریقۂ استعمال اور غذا و پرہیز کی تجویز میں اختلاف ہوتا ہے۔ خواہ ایک ہی طریقے کے دو ماہرین کو یعنی دو ڈاکٹروں یا دو حکیموں کو دیکھا جائے تو وہ بھی آپس میں مختلف ہوں گے مگر اس کے باوجود اس اختلاف کو کوئی برا نہیں کہتا اور اختلاف کرنے والوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا اور ان کے اختلافات کو دیکھ کر کوئی علاج نہیں چھوڑ دیتا بلکہ جس حکیم یا ڈاکٹر پر اعتماد ہوتا ہے اس سے علاج کروایا جاتا ہے۔

علماء کا اختلاف اس سے بہت کم درجہ رکھتا ہے اس لئے کہ ان کے اصول متحد ہیں۔ مع ہذا اس اختلاف کو برا کہا جاتا ہے اور علماء کو طعن کا ہدف بنایا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس عالم کی بات مانیں، حقیقت میں یہ نتیجہ ہے دین اور علم کی طرف سے بے توجہی اور بے رغبتی کا۔

علاج جسمانی کی اہمیت ہے اس لئے ڈاکٹروں کا اختلاف علاج سے مانع نہیں بنتا، اس کے برعکس باطنی امراض کے علاج کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، قلب میں دین کی اہمیت نہیں اس لئے اختلاف علماء کو ... بنایا جاتا ہے۔

یہاں تک اس کا بیان تھا کہ اختلاف ہونا لازمی امر ہے اور اس کا مٹنا ناممکن ہے۔ آگے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اختلاف کی تین قسمیں ہیں:۔

اولؔ یہ کہ فریقین کے مد نظر رضاء الٰہی ہو، ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ جو وہ کہتا ہے اسی میں دین کا فائدہ ہے اور فریق مخالف کا جو نظریہ ہے اس میں دین کا ضرر ہے۔ اس صورت میں جانبین پر یہ اختلاف فرض ہوتا ہے جس میں جانبین کو ثواب ملتا ہے اگر یہ اختلاف کو چھوڑ دیں گے تو گنہگار ہوں گے۔

دومؔ یہ کہ جانب واحد کا مقصد رضاء الٰہی ہو اور دوسری جانب صرف اتباع ہویٰ کی خاطر اختلاف کر رہی ہو۔ مثلاً ایک شخص دوسرے کو نماز کی تلقین کرتا ہے اور منکرات سے روکتا ہے نہ رکنے کی صورت میں اس سے اختلاف کرتا ہے اور دوسرا شخص صرف اس لئے اس کا مخالف ہے کہ یہ اسے منکرات سے کیوں روکتا ہے؟

تو پہلے شخص پر یہ اختلاف واجب ہے اور دوسرے پر حرام۔
سوئم یہ کہ دونوں خواہشات نفسانیہ کی بناپر اختلاف کر رہے ہوں یہ اختلاف جانبین کے لئے حرام ہے اور اس کا ترک واجب ہے۔
صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف قسم اول کا اختلاف تھا۔

جوازِ اختلاف کی شرائط

(۱) اختلاف کے محمود ہونے کی شرط اول یہ ہے کہ اس کا منشأ رضاءِ الٰہی ہو۔
(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اختلاف کرنے والے کا نظریہ بداہت کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص اونٹ کو بکری کہنے لگے اور یہ کہے کہ میری تحقیق یہی ہے، میں اپنی دیانت واخلاص سے یہی سمجھتا ہوں، اس کے باوجود اس اختلاف کو محمود نہیں کہا جاسکتا بلکہ مذموم ہے۔
ما انا علیہ واصحابی کے خلاف قول کرنا بھی اسی میں داخل ہے اس لئے کہ جس طرح قرآن اپنے مفہوم میں سنت کا محتاج ہے بعینہٖ اسی طرح کتاب وسنت دونوں اپنے مفہوم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے محتاج ہیں یعنی کتاب وسنت کا مفہوم وہی لیا جائیگا جو صحابہ کرامؓ نے سمجھا، صحابہ کرامؓ سے ہٹ کر کتاب وسنت کا مفہوم سمجھنا ضلال ہے اس پر مختصر دلائل یہ ہیں:۔
(۱) اھدنا الصراط المستقیم میں صراط مستقیم کی تفسیر صراط الذین انعمت علیہم سے کی گئی ہے الصراط المستقیم کی تفسیر صراط اللہ یا صراط الرسول یا صراط القرآن سے نہیں کی گئی اس لئے کہ لوگ اس کے مفہوم میں اختلاف کرتے اور ہر شخص اپنے متعین کردہ مفہوم کو صراط قرآن قرار دیتا لہٰذا صراط الذین انعمت علیہم سے وضاحت کردی کہ صراط مستقیم سے مراد منعم علیہم بندوں کا راستہ ہے جو ایک جماعت ہے۔
(۲) وَمَن یشاقق الرسول مِن بعد ما تبیّن لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ما تولّی ونصلہ جھنّم الآیۃ (سورۂ نساء) اس میں بھی سبیل اللہ کے بجائے سبیل المؤمنین فرمایا گیا ہے۔
(۳) قل ھٰذہ سبیلی أدعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ أنا ومَن اتّبعنی (سورۂ یوسف) اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سبیلی کے بعد أنا پر مَن اتبعنی کا عطف فرما کر اس کی وضاحت فرمادی کہ سبیلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہے جس کی طرف آپ کے متبعین یعنی صحابہ کرامؓ دعوت دے رہے ہیں۔
(۴) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین اس میں سنتی کے بعد سنۃ الخلفاء الراشدین کا ذکر کرنا کھلی دلیل ہے کہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہوگی جو خلفاء اختیار کریں گے یعنی یہ عطف تفسیری ہے اور اس کے سوا دوسرے کوئی معنی نہیں ہوسکتے۔
(۵) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ناجی فرقہ وہ ہے جو ما انا علیہ واصحابی کے مطابق ہوگا اگر سنت اپنے مفہوم میں صحابی کی محتاج نہ ہوتی تو صرف ما انا علیہ کہدینا کافی تھا اصحابی کا لفظ بیکار ہوجاتا ہے۔

(۶) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اصحابی کالنجوم بایّهم اقتدیتم اهتدیتم۔
(۷) یہ امر عقلاً بھی ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کا مفہوم وہی متعین ہوگا جو صحابہ کرامؓ نے سمجھا اس لئے کہ متکلم کی مراد سمجھنے میں چند امور کا دخل ہوتا ہے مثلاً اہلِ زبان ہونا، متکلم کی حالت سے باخبر ہونا، متکلم سے ظاہری و باطنی قرب ہونا کلام کے شانِ ورود سے واقف ہونا یعنی یہ کلام کس محل اور کس موقع پر اور کس وقت واقع ہوا؟ اور متکلم کے لہجہ کو سننا، اس کے ہاتھ اور چہرہ کے آثار کو دیکھنا، خصوصاً خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھنے میں تقدس وتقویٰ اور باطن کی طہارت اور نورِ قلب نہایت ضروری ہے۔

یہ سب امور صحابۂ کرامؓ میں بدرجہ اتم موجود تھے اس لئے جب کوئی صحابیؓ آپ کے کسی حکم کی مزید تاکید بیان کرنا چاہتے ہیں تو روایت کرتے وقت یوں فرماتے ہیں "ابصر تُہ عینای وسمعتہ اُذنای ووعاہ قلبی" ان لوگوں کا اہلِ حق سے اصولی اختلاف ہے جو قرآن و حدیث کو صحابہؓ کی تفسیر کا محتاج نہیں سمجھتے جیسا کہ پرویز قرآن کو حدیث کا محتاج نہیں سمجھتا، کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم قافیہ کرنے کے لئے میں اس جماعت صحابہؓ کو رجال اللہ سے تعبیر کرتا ہوں اور یہ لفظ ماخوذ ہے رجال لا تلهیهم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ سے۔

(۳) جوازِ اختلاف کی تیسری شرط یہ ہے کہ اختلاف کرتے وقت الأہم فالأہم کا خیال رکھا جائے کما مرّ من صنیع معاویہؓ، غرضیکہ اہم اختلاف ہوتے ہوئے ادنیٰ اختلافات کو چھوڑ کر متحد ہو جانا ضروری ہے۔

باب — بخاری ص

۱۷ حدثنا ابو الیمان قال حدثنا شعیب عن الزهری قال أنا ابو ادریس عائذ الله بن عبد الله أنّ عبادة بن الصامت وکان شهد بدرًا وهو احد النقباء لیلة العقبة أنّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال وحوله عصابة من اصحابه بایعونی علی أن لا تشرکوا بالله شیئًا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادکم ولا تأتوا ببهتان تفترونه بین ایدیکم وارجلکم ولا تعصوا فی معروف فمن وفی منکم فاجره علی الله ومن اصاب من ذلک شیئًا فعوقب فی الدنیا فهو کفارة له ومن اصاب من ذلک شیئًا ثم ستره الله فهو الی الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه فبایعناه علی ذلک

ترجمہ حضرت عبادہ بن صامتؓ جو بدر کی لڑائی میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ کے نقیبوں میں سے ایک نقیب تھے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جب آپؐ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی یہ فرمایا کہ تم مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ گے اور چوری نہ کرو گے اور زنا نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو نہ مارو گے اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے سامنے

(یعنی خود گڑھ کر) کوئی بہتان نہ باندھو گے، اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے، پھر تم میں سے جو شخص یہ اقرار پورا کردے اس کا ثواب اللہ پر ہے اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے پھر دنیا میں اس کی سزا دیدی جائے (یعنی حد پڑ جائے) تو یہ سزا اس کے لئے کفارہ ہوجائیگی اور جو کوئی ان میں سے (شرک کے علاوہ) ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے پھر اللہ تعالیٰ (دنیا میں) پردہ پوشی فرمائیں تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اگر چاہے (آخرت میں بھی) اس کو معاف کردے اور اگر چاہے سزا دیدے۔ حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں کہ پھر ہم نے ان باتوں پر آپؐ سے بیعت کرلی۔

تعدد الحدیث امام بخاریؒ نے اس حدیث کو دس جگہ ذکر فرمایا ہے ۱ مک ۲ ص۵۵ تا ص۵۵۱ دو روایت ۳ ص۵۷ ۴ ص۲۲۷ ۵ ص۱۰۰۳ ۶ ص۱۰۰۴ ۷ ص۱۰۱۵ ۸ ص۱۰۶۹ ۹ ص۱۰۷۱ ۱۰ ص۱۱۱۲ ۔ واخرجہ مسلم والترمذی ایضاً۔

ربط ما قبل حدیث سابق میں فرمایا گیا تھا "علامۃ الایمان حب الانصار" اب یہ باب بلا ترجمہ دلیل ہے کہ انصار کی محبت ایمان کی علامت اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے انتہائی نازک وقت حضور اقدس اور حضورؐ کی دعوت اسلام پر اپنی جان و مال سے مدد کرنے پر بیعت کی اسی سبب سے ان کو انصار سے ملقب کیا گیا۔

عبادۃ بن صامت رضؓ عبادۃ بضم العین ابن الصامت بن قیس خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ عقبہ اولیٰ عقبہ ثانیہ اور غزوۂ بدر وغیرہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے

وهو اول من ولي القضاء بفلسطين وكان طويلا جسيما جميلا فاضلا توفي سنة اربع وثلاثين

یعنی آپکی وفات ۳۴ھ میں بعمر بہتر ۷۲ سال فلسطین میں ہوئی۔

فائدہ:— عبادۃ نام کے بارہ صحابی ہیں لیکن عبادہ بن صامت صرف یہی ایک صحابی ہیں۔

باب ای هذا باب بالتنوين۔

صحیح بخاری کے اکثر نسخوں بالخصوص ہند و پاک کے نسخوں میں باب تو ہے مگر ترجمۃ الباب یعنی عنوان نہیں ہے۔ بعض نسخوں میں تو باب بھی نہیں ہے، تو اس صورت میں ترجمہ یا عنوان تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ حدیث بھی باب سابق ہی سے متعلق ہوگی۔

البتہ اکثر نسخوں میں چونکہ یہاں باب بلا ترجمہ ہے اور صحیح بخاری میں ایسے اور بھی مواقع آئیں گے جہاں باب بلا ترجمہ ہے البتہ یہ پہلا موقع ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے یہاں ترجمہ کیوں نہیں قائم فرمایا؟ حالانکہ مقصد ترجمہ ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ شراح حضرات سے ترجمۃ الباب حذف کرنے کی متعدد وجوہ منقول ہیں لیکن احقر صرف صحیح اور اہم وجوہ کی نقل پر اکتفا کریگا۔

(۱) کالفصل من الباب السابق۔ جیسا کہ علامہ قسطلانی فرماتے ہیں "وعلی روایۃ اثباتہ (ای الباب) کالفصل عن سابقہ مع تعلقہ بہ۔ (ارشاد الساری)

یعنی باب سابق علامۃ الایمان حب الانصار، کی فصل کے قائم مقام ہے جسے ذیلی باب کہتے ہیں، کہ من وجہ باب سابق سے مناسبت ہوتی ہے اور من وجہ مغایرت، اس لئے دونوں کی رعایت کی گئی، مغایرت کا لحاظ کرتے ہوئے باب رکھا اور مناسبت کے باعث ترجمہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ چنانچہ اس مقام پر باب سابق میں حب الانصار کا ذکر تھا اب اس باب بلا ترجمہ میں انصار کے کچھ حالات مذکور ہیں مگر مکمل مناسبت اس لئے نہیں ہے کہ اس میں حب الانصار کا ذکر نہیں ہے بلکہ انصار کی وجہ تسمیہ اور وجہ فضیلت ظاہر کی گئی ہے۔

چنانچہ حدیث باب میں وھو احد النقباء لیلۃ العقبۃ سے انصار کی وجہ تسمیہ معلوم ہوگئی جس کی تفصیل یوں ہے کہ مکہ مکرمہ سے منیٰ کو جاتے ہوئے راستہ کی بائیں جانب منیٰ سے قریب یہ عقبہ ہے جہاں مدینہ منورہ کے چند لوگوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی اسے بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے جس کی پوری تفصیل بعنوان "تاریخ الانصار" آرہی ہے۔

پھر دوسرے سال یہ حضرات چند اور ساتھیوں کو لیکر اسی مقام پر حاضر ہوئے اور بیعت کی اسے بیعتِ عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے اس مرتبہ تقریباً پچھتر حضرات تھے، ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مدینہ تشریف لائیں ہم آپکی جان و مال سے ہر طرح کی مدد کریں گے، تو چونکہ انصار کے معنی ہیں مددگار اس لئے انکو انصار کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

(۲) حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شارحین کی مذکورہ وجہ صحیح ہے مگر یہ توجیہ یعنی کالفصل من الباب السابق بعض مقامات پر نافذ نہیں ہوتی اس لئے سب سے بہتر اور وجیہ توجیہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے تشحیذ اذہان کی غرض سے ترجمۃ الباب ذکر نہیں فرمایا تشحذ از باب فتح بمعنی تیز کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا مقصد طلبہ کی تمرین و مشاقی ہے کہ اتنے مقامات پر ہم نے باب کے ساتھ ترجمۃ الباب لکھا جس سے تمہیں ہمارا طرز معلوم ہوچکا اب تم ہمارے ذکر کردہ تراجم کی روشنی میں ذہن پر زور ڈال کر حدیث شریف کے پیش نظر کوئی مناسب ترجمۃ الباب تجویز کرلو، اور یہ تشحیذ اذہان والی توجیہ شانِ بخاری کے مناسب بھی ہے کیونکہ آگے کتاب العلم کے پانچویں باب کا ترجمۃ الباب قائم کریں گے "باب طرح الامام المسئلۃ الخ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ مدرس کو وقتاً فوقتاً طلبہ کا امتحان لیتے رہنا چاہئے تاکہ طالب علم غفلت نہ برتے، نیز استاذ کو بھی طلبہ کی استعداد کا پتہ رہے اور پھر استعداد کے مطابق تعلیم دی جاسکے، پس یہاں حدیثِ پاک پر غور کرکے یہ ترجمۃ الباب منعقد کیا جاسکتا ہے باب اجتناب الکبائر من الایمان، یا باب اجتناب المعاصی من الایمان، یا من الایمان ترک البھتان، وغیرہ۔

(۳) کبھی باب بلا ترجمہ بطور دفع دخل مقدر اور استدراک کے ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ امامؒ نے سابقہ ابواب میں بتایا کہ ایمان مرکب ہے، ذو اجزاء ہے، اعمال ایمان میں داخل ہیں اس سے مرجئہ کی تردید تھی مگر اس سے خطرہ پیدا ہوا کہ کوئی شخص مرجئہ کے خلاف خوارج و معتزلہ کی تائید نہ سمجھ لے اس لئے اس باب میں امامؒ نے باب بلا ترجمہ سے دودھاری تلوار استعمال کی ہے جس سے مرجئہ کی تردید بھی ہوتی ہے اور خوارج و معتزلہ کا بھی قلع قمع ہوجاتا

ہے۔ اِن شاء عاقبہ سے مرجئہ کی تردید ہوگئی کہ اگر معصیت مضر نہ ہوتی تو عقاب کے کیا معنیٰ؟ اور اِن شاء عفا عنہ سے معتزلہ خوارج پر تردید ہو رہی ہے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرتکب کبائر کا ایمان باقی ہے لیکن یہ شخص مجرم ہے اللہ تعالیٰ چاہے تو جرم کی سزا دے اور چاہے تو بغیر سزا ہی بخشدے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مجرم کا ایمان تسلیم ہو ورنہ غیر مؤمن کی بخشائش کہاں؟ اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ شَیْئًا وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ۔

نیز فہو کفارۃ لہ، سے بھی خوارج و معتزلہ کی تردید ہو رہی ہے اس لئے کہ ان کے یہاں مرتکب کبیرہ مومن نہیں ہے اور غیر مومن کے لئے کوئی عقوبت کفارۂ سیئات نہیں بن سکتی۔

وکان شہد بدراً شھد از سمع بمعنی حضر ہے، حضرت عبادہؓ غزوۂ بدر میں حاضر و شریک تھے، چونکہ شرکاء بدر کے بڑے فضائل ہیں اس لئے حضرت ابوادریسؒ بطور منقبت ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت عبادہؓ بدری صحابی ہیں۔ غزوۂ بدر کی تفصیل کے لئے دیکھئے " نصر الباری کتاب المغازی "۔

وھو احد النقباء نقباء جمع ہے نقیب کی جس کے معنی ہیں قوم کا سردار، چودھری یا افسر۔ آنحضورؐ نے بارہ نقیب (افسر) مقرر فرمائے تھے اور بارہ کا عدد قرآن حکیم سے ماخوذ ہے وبعثنا علیہم اثنا عشر نقیبا (مائدہ)

عصابۃ علامہ عینی اور علامہ قسطلانیؒ نے لکھا ہے کہ عصابۃ کا لفظ دس سے چالیس تک کے عدد پر بولا جاتا ہے۔ راوی کا مقصد یہ ہے کہ اس مجلسِ بیعت میں دس سے زیادہ اور چالیس سے کم صحابہ تھے۔

اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوئی کہ اس حدیث میں جس بیعت کا ذکر ہے وہ بیعت کوئی چھوٹی سی جماعت تھی حدیبیہ اور فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کا جتنا جم غفیر تھا اس بیعت کے موقع پر ایسا نہ تھا، فاحفظ۔

حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟

اس حدیث میں اختلاف ہے کہ حدود زواجر ہیں یا کفارات؟ بظاہر حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود کفارۂ سیئات ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، امام بخاریؒ کا بھی یہی خیال ہے۔

اور بعض کا خیال ہے کہ حدود کفارہ نہیں محض زواجر ہیں یعنی کسی جرم پر حد لگ جانے سے گناہ معاف نہیں ہوتا بلکہ توبہ ضروری ہے، کذا فی عقیدۃ السفارینی۔

ائمۂ احناف (یعنی امام اعظم اور صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ) سے اس بارے میں کوئی روایت نہیں۔ اور مشائخ احناف کے اقوال مختلف ہیں۔ چنانچہ درمختار میں ہے کہ حدود زواجر ہیں سواتر یعنی کفارہ نہیں۔ اور صاحبِ ملتقط حنفی المذہب ہونے کے باوجود حدود کے کفارہ ہونے کے قائل ہیں۔ اور شیخ نجم الدین نسفی اپنی تفسیر تیسیر میں فمن اعتدیٰ بعد ذٰلک فلہ عذاب الیم کے تحت محرم پر جزاء صید سے متعلق فرماتے ہیں کہ غیر مصر کے لئے کفارہ ہے اور مصر کے لئے کفارہ نہیں۔ صاحبِ تیسیر کا یہ قول احناف کے اقوال مختلفہ میں صورتِ تطبیق بن سکتا ہے۔ کذا فی جنایات الحج من الشامیۃ۔

شوافع کی دلیل:۔ شوافعؒ حدیثِ باب سے استدلال کرتے ہیں۔

احناف کی طرف سے جواب

احناف رحمہم اللہ اس کے معارض حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں جس کی حاکم نے مستدرک میں تخریج کی ہے اور صحیح علیٰ شرط الشیخین ہے۔
لا ادری الحدود کفارات لاھلھا ام لا ؟ اور یہ حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حدیثِ باب سے یقیناً متاخر ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں ایمان لائے ہیں اور حدیث باب میں ہجرت سے قبل لیلۃ العقبہ کا واقعہ ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ حدیث باب میں فعوقب فی الدنیا سے حدود مراد نہیں بلکہ مطلقاً مصائب مراد ہیں۔ اگر حد مراد لی جائے تو اس کے بعد لا ادری الحدود کفارات لاھلھا ام لا ؟ کے کیا معنی ؟
نیز یہ واقعہ ہجرت سے قبل کا ہے اور حدود کی فرضیت مدینہ منورہ میں ہوئی ہے۔
علاوہ ازیں حدیث باب میں جن معاصی کا ذکر ہے ان میں سے سرقہ وزنا کے سوا اور کسی معصیت پر حد نہیں، اس سے بھی ثابت ہوا کہ عوقب فی الدنیا سے حدود مراد نہیں بلکہ تکوینی آفات مراد ہیں۔
حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حدیث باب حدیث ابوہریرہ سے مؤخر ہے۔ فرماتے ہیں کہ حدیث باب میں وھو احد النقباء لیلۃ العقبۃ سے مقصد عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی منقبت بیان کرنا ہے یہ مقصد نہیں کہ اس حدیث کا مضمون لیلۃ العقبہ سے متعلق ہے۔
حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے اس پر چند قرائن پیش فرمائے ہیں کہ حدیثِ باب حدیث مستدرک سے مؤخر ہے۔
(۱) حدیث مستدرک میں عدمِ علم کا ذکر ہے اور حدیث باب میں کفارہ بننے کا ثبوت ہے اور عدمِ علم علم پر مقدم ہوتا ہے۔
(۲) حدیث باب کا مضمون سورہ ممتحنہ کی آیت یا یھا النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک الخ سے ماخوذ ہے جو کہ بالاتفاق صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی ہے پس معلوم ہوا کہ حدیث باب میں لیلۃ العقبہ کی بیعت کا ذکر نہیں ہے۔
(۳) حافظ نے کئی روایات سے ثابت کیا ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بیعت لی تھی لہٰذا حدیثِ باب میں اسی بیعت کا ذکر ہے۔
علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے اس پر زبردست تردید فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ لیلۃ العقبہ ہی کا ہے بلکہ نسائی کی ایک صریح روایت لائے ہیں جس میں اس کی تنصیص ہے کہ یہاں بیعتِ لیلۃ العقبہ کا ذکر ہے۔

اشکال

عوقب کے مقابل دوسرے جملہ میں ثم سترہ اللہ کے الفاظ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ عوقب فی الدنیا سے ایسا عقاب مراد ہے جس میں ستر نہ ہو اور یہ حدود ہی میں ہوتا ہے آفاتِ تکوینیہ میں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس شخص نے کوئی گناہ کیا ہے یہ تو نیک وبد سب پر آتی ہے۔

جواب:۔ بعض مرتبہ آفت تکوینیہ بھی اس طور پر آتی ہے کہ سب لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے پس "عوقب فی الدنیا" سے اس قسم کی مصیبت مراد ہے اور اس قسم کے مقابلہ میں ثم سترہ اللہ سے یہ مراد ہے کہ گناہ کے بعد کوئی تکلیف نہ پہونچی یا کوئی مصیبت تو آئی مگر لوگوں کو یہ علم نہ ہوا کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے۔
یہاں تک امام شافعی رحمہ اللہ کی مستدل حدیث کے جوابات ہوئے آگے دونوں حدیثوں میں وجہ تطبیق بیان کی جاتی ہے۔

وجہ تطبیق

حقیقت یہ ہے کہ حد میں دو حیثیتیں ہیں ایک من حیث انها مصیبة من جملة المصائب اور دوسری حیثیت شرعی سزا ہونے کی ہے، سو پہلی حیثیت سے اس کا کفارۂ ذنوب ہونا ہم بھی تسلیم کرتے ہیں جب کانٹا چبھنے اور چیونٹی کے کاٹنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں تو جلد، قطع ید اور رجم سے کیوں معاف نہ ہوں گے۔

غرضیکہ ہم اس کے قائل ہیں کہ مصیبت ہونے کی حیثیت سے مکفر سیئات ہے مگر اس کی تعیین نہیں کرتے جس گناہ پر حد لگی ہے متعین طور پر وہی معاف ہو، مطلقاً عفو کے قائل ہیں جیسے کہ مصائب تکوینیہ سے بلا تعیین مطلق گناہ معاف ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس شوافع متعین طور پر اس گناہ کے لئے کفارہ قرار دیتے ہیں جس پر یہ حد لگی ہے۔

سنن ترمذی باب لا یزنی الزانی وهو مؤمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: عن النبی صلی الله علیه وسلم قال من اصاب حدا فعجل عقوبته فی الدنیا فالله اعدل من ان یثنی علی عبده العقوبة فی الآخرة، ومن اصاب حدا فستره الله علیه وعفا عنه فالله اکرم من ان یعود فی شیئ قد عفا عنه "اس حدیث سے متعین گناہ کے عفو کی رجاء مفہوم ہوتی ہے عفو موعود نہیں، چنانچہ اس میں وہ گناہ بھی مذکور ہے جس پر حد نہ لگی ہو پس حد کا متعین گناہ کیلئے مکفر ہونا ثابت نہ ہوا۔

حاصل یہ کہ ہم حدود کو زواجر بالذات اور سواتر بالعرض کہتے ہیں اور شوافع اس کے برعکس سواتر بالذات اور زواجر بالعرض ہونے کے قائل ہیں۔

دلائل احناف رح

(۱) والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما جزاء بما کسبا نکالا من الله والله عزیز حکیم، فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله یتوب علیه ان الله غفور رحیم" اس آیت میں "فاقطعوا ایدیهما" پر سرقہ کا حکم ختم ہوگیا، آگے فرمایا جزاء بما کسبا یعنی یہ قطع ید ان کے فعل کی سزا ہے، اس کے بعد نکالا من الله سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حدود کی تشریع کس لئے ہے۔ نکال ایسے عذاب کو کہا جاتا ہے جو مجرم کے علاوہ دوسرے دیکھنے سننے والوں کو بھی جرم سے باز رکھے، اس کے لغوی معنی روکنے کے ہیں اس لئے ہتھکڑی کو بھی نکال کہا جاتا ہے ممکن ہے کہ ہندی لفظ "نکیل" (اونٹ کے ناک کی رسّی) بھی اسی سے ماخوذ ہو۔

غرضیکہ نکالا من الله کا اضافہ فرما کر یہ سمجھا دیا کہ حدود سے زجر مقصود ہے۔

آگے فرماتے ہیں والله عزیز حکیم یعنی ان کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں، دور حاضر کے قانون کی طرح نہیں کہ جو شخص ایک دفعہ جیل سے ہو آتا ہے وہ دوبارہ جیل میں جانے کا متمنی رہتا ہے۔ نئی ظلمت کے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹنا وحشیانہ فعل ہے۔ یہ عقل کے اندھے اس پر غور نہیں کرتے کہ چوری کرنا کونسا شریفانہ کام ہے؟ اگر ایک وحشیانہ فعل کی بدولت لاکھوں وحشیانہ حرکتوں کا انسداد ہو جائے تو یہی حکمت ہے۔ ولکم فی القصاص حیاة یا اولی الالباب میں یہی حکمت بیان فرمائی ہے۔

ملحد شاعر ابوالعلاء المعری نے حکم قطع ید پر اعتراض کیا ہے ؎

؎ یدٌ بخمسِ مئین عَسْجدٍ وُدِیت ÷ ما بالُها قُطِعت فی رُبع دینار
وہ ہاتھ جس کی پانچ سو دینار دیت دی جاتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے کہ ربع دینار کے عوض کاٹ دیا جاتا ہے۔

تحکّمٌ مالنا الا السکوتُ لہ ÷ وأن نعوذ بمولانا من النار
یہ ایک حاکمانہ فیصلہ ہے ہمارے لئے خاموشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، اور ہم آگ سے اپنے آقا کی پناہ چاہتے ہیں۔

جب فقہاء رحمہم اللہ نے اسے طلب کیا تو یہ بھاگ گیا ؎

متعدد حضرات نے اس کا جواب دیا، فقال علم الدین السخاوی رح :-

عِزُّ الامانۃ اغلاھا اَرْخَصَھا ÷ ذُلُّ الخیانۃ فافھم حکمۃ الباری
امانت کی عزت و شرافت نے ہاتھ کی قیمت گراں کردی تھی، اب خیانت کی ذلت نے اس کی قیمت گرادی اللہ کی حکمت سمجھو۔

وقال الشافعی رح ؎

ھناک مظلومۃ غالت بقیمتھا ÷ وھھنا ظلمت ھانت علی الباری
جب یہ مظلوم تھا تو اس کی قیمت خود گراں تھی۔ اور بصورت خیانت اس نے ظلم کیا ہے تو اللہ کے نزدیک ذلیل ہوگیا ہے۔

اور علامہ شمس الدین کردی سے منقول ہے :-

فقیمۃ الید نصف الالف من ذھب ÷ فان تعدت فلا تسوی بدینار
ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار ہے، لیکن جب یہی ہاتھ تعدی کرے تو اس کی قیمت ایک دینار کے برابر بھی نہیں رہتی۔

قال عبد الوھاب المالکی رح :- لما کانت امینۃ کانت ثمینۃ لما خانت ھانت۔
یعنی جب یہ ہاتھ امین تھا تو قیمتی تھا مگر جب اس نے خیانت کی تو ذلیل و خوار ہوگیا۔

آگے ارشاد ہے: "فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ"۔
اگر قطع ید کفارہ ہے تو توبہ کی کیا ضرورت رہی؟

آیت میں مذکور ترتیب کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی منقول ہے، امام طحاویؒ نے ایک روایت کی تخریج کی ہے کہ ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کے بعد حضور اکرمؐ نے فرمایا " تُبْ الی اللہ عز وجل فقال تُبتُ الی اللہ فقال تاب اللہ علیک اس سے ثابت ہوا کہ بلا توبہ صرف حد لگنے سے گناہ معاف نہیں ہوتا۔

(۲) اِنّما جزاءُ الذین یُحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فساداً اَن یُقتّلوا او یُصلّبوا او تقطّع ایدیھم وارجلھم مِن خلاف او ینفوا مِن الارض۔ (مائدہ)

یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو (یعنی بدامنی پھیلانے کو) کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جائیں یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے یعنی

داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں یا دور کر دیئے جائیں اس جگہ سے۔

ابوبکر جصاصؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ قطاع الطریق (یعنی ڈاکوؤں اور رہزنوں) کی سزا ذکر فرمانے کے بعد ذالک لھم خزی فی الدنیا وفی الاٰخرۃ عذاب عظیم میں اس کی تصریح ہے کہ دنیاوی سزا سے آخرت کا گناہ معاف نہیں ہوتا۔

اگرچہ اس آیت کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس میں مرتدین کا حکم ہے مگر صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ رہزنوں اور ڈاکوؤں ہی کی سزا ہے مرتد کی سزا نہیں اس لئے کہ ارتداد کی سزا تو قتل ہے، باقی رہے "یحاربون اللہ و رسولہ" کے الفاظ؟ سو وجہ اس کی یہ ہے کہ روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس کا شان نزول معاملہ عرنیین میں ارتداد ڈکیتی اور قتل سب جمع تھے، اس آیت میں حکم تو قطاع الطریق (ڈاکوؤں) ہی کا بیان کرنا ہے مگر نظم میں ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جو اصل واقعہ کی طرف مشیر ہوں۔

بہرحال آیۂ کریمہ کے الفاظ عام ہیں اگرچہ شانِ نزول خاص ہے والعبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد۔

(۳) جب توبہ سے بالاتفاق حد ساقط نہیں ہوتی حالانکہ گناہ معاف ہو جاتا ہے "التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ" تو حد لگنے سے تو بہ بھی ساقط نہ ہونی چاہیئے۔

پس معلوم ہوا کہ حد کی تشریع عفوسیات کے لئے نہیں ورنہ توبہ کے بعد حد لگانا بے معنی ہوگا۔

• بابٌ[۱۲] مِنَ الدِّینِ الفِرارُ مِنَ الفِتَنِ •

فتنوں سے دور بھاگنا دین میں داخل ہے۔

بابٌ بالتنوین ای ہٰذا بابٌ ولا یجوز فیہ الاضافۃ۔ (عمدہ)

من الدین الفرار من الفتن علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں عبارت مقدر ہے، اصل عبارت یوں ہے الفرار من الفتن شعبۃ من شعب الدین۔

سوال امام بخاریؒ نے یہاں لفظ دین استعمال کیا ہے اور اس سے پہلے نیز ابوابِ آتیہ میں بعض ابواب پر ایمان اور بعض پر اسلام کا لفظ لایا ہے، ابواب سابقہ کی طرح من الایمان الفرار من الفتن کیوں نہیں کہا؟

جواب:- علامہ عینیؒ فرماتے ہیں انما قال ذالک لیطابق الترجمۃ الحدیث الذی یذکرہ فی الباب۔ نیز اس طرف بھی اشارہ مقصود ہے کہ ایمان، اسلام اور دین مصداقاً واحد ہیں۔

۱۸ ● حدثنا عبدُ اللہِ بنُ مسلمۃَ عن مالکٍ عن عبدِالرحمٰن بنِ عبدِاللہِ بنِ عبدِ الرحمٰن بنِ ابی صَعْصَعۃَ عن ابیہِ عن ابنِ سعیدٍ الخُدری انّہ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوشِکُ اَن یکُونَ خیرَ مالِ المسلمِ غنمٌ

يتبعُ بها شعفَ الجبالِ ومواقعَ القَطرِ يفرّ بدينه من الفتن ●

ترجمہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمان کا بہتر مال وہ بکریاں ہونگی جن کے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقاموں میں وہ اپنا دین فتنوں سے بچائے ہوئے بھاگتا پھریگا۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا فی کتاب الایمان صے وفی بدء الخلق ص۴۶۶ وفی کتاب المناقب ص۵۰۸ وفی الرقاق ص۹۶۱ وفی الفتن ص۱۰۵۰۔

مطابقتہ للترجمۃ: مطابقتہ للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ " یفر بدینہ من الفتن "

حل لغات یوشک بضم الیاء وکسر الشین المعجمۃ بمعنی یقرب، افعالِ مقاربہ میں سے ہے، ماضی میں اوشک کہا جاتا ہے، اسی سے ہے اوشک ان یموت۔ بعضوں نے اس کے استعمال ماضی کا انکار کیا ہے لیکن یہ غلط ہے، البتہ مضارع کا استعمال ماضی سے زیادہ ہے۔

ان یکون خیر مال المسلم بنصب خیر۔ غنم بکریاں، بکریوں کا ریوڑ۔ اسم مؤنث ہے جنس کے لئے وضع کیا گیا ہے مذکر ومؤنث دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ تصغیر کے وقت اس کے آخر میں تا کا اضافہ کرکے غنیمۃ کہا جاتا ہے۔ شَعَف بفتحتین جمع ہے شعفۃ بفتح الشین والعین کی، پہاڑ کی چوٹی۔ مواقع بالنصب عطفاً علی شعف جمع موقع بکسر القاف۔ قطر قطرۃ کی جمع ہے بمعنی بارش مواقع القطر بارش اترنے کی جگہ یعنی وادیاں اور جنگلات۔

یفر بدینہ من الفتن میں با سببیت کے لئے ہے اور من الفتن میں مِن ابتدائیہ ہے۔ یعنی فرار کا منشأ اور سبب دین ہی ہو کوئی اور دنیوی غرض نہ ہو بلکہ دین کی حفاظت کے لئے وطن چھوڑ رہا ہے۔

نیز با، مصاحبت ومعیت کے لئے بھی ہوسکتی ہے یعنی اپنے دین کو ساتھ لیکر بھاگ جائے، جیسے حضرت موسٰی علیہ السلام کے واقعہ میں فر بثوبہ کے معنی ہیں، وہ پتھر کپڑے لیکر بھاگ گیا۔

ربط ماقبل ماقبل میں انصار کے مناقب کا بیان تھا کہ انہوں نے کفر وضلال کے فتنوں سے بچنے کے لئے منیٰ کی گھاٹیوں میں حاضر ہوکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور دین کی خاطر سب کچھ قربان کردیا۔ اور اس باب میں بھی ہے کہ جب دین پر خطرہ کا اندیشہ ہو تو گھر بار سب چھوڑ کر سب کو قربان کرکے عزلت وخلوت اختیار کرنی چاہئے۔

۲۔ دین میں دو قسم کی چیزیں ہیں وجودی اور ترکی۔ بعض چیزیں کرنے کی ہیں اور بعض بچنے کی اب تک ان چیزوں کو بیان کیا جو حاصل کرنے کی ہیں، اب یہاں ان چند امور کو بیان کررہے ہیں جو ترکی ہیں اور ان سے بچنا چاہئے، دین کی حفاظت کے لئے وطن چھوڑنا بھی دین ہی ہے۔ اس لئے اب انکو بیان کررہے ہیں۔ (امداد الباری)

تشریح اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشینگوئی فرمائی ہے کہ عنقریب ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ کفر ومعاصی کا اتنا غلبہ ہوجائیگا کہ دینداروں کے لئے شہر وآبادی میں رہنا دشوار

ہو جائیگا مجبور ہو کر اپنے دین کی حفاظت کی خاطر شہر سے بھاگ کر پہاڑ کی چوٹیوں کو اپنا مسکن بنا لیں گے۔

جلوت بہتر ہے یا خلوت؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ خلوت (تنہائی و عزلت نشینی) بہتر ہے کیونکہ جب فتنہ و فساد کا دور شباب ہوگا تو مجمع میں رہ کر بچنا مشکل ہے ایسے وقت میں اپنے آپکو خلوت ہی میں تعلق مع اللہ سے معمور کر سکتا ہے۔

دوسری جماعت کہتی ہے کہ جلوت (اجتماعی زندگی) بہتر ہے کیونکہ خلوت میں بہت سے کام نہیں ہو سکتے جیسے نماز جمعہ، جماعت نماز، شرکت جنازہ اور امر بالمعروف نہی عن المنکر یہ چیزیں اجتماعی زندگی ہی میں ہو سکتی ہیں اور خلوت میں انسان ان سب چیزوں سے محروم ہو جائیگا۔

۳۔ جمہور محققین کی تحقیق یہ ہے کہ کلی طور پر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ حالات و اشخاص کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت ہوگی۔ چنانچہ اس حدیث مذکور سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ اجتماعیت کا تھا، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہی انسانوں کی اصلاح کے لئے ہوئی ہے، پس جن لوگوں سے اہل حقوق کے حقوق وابستہ ہوں یا عوام کی اصلاح ان سے متعلق ہو جیسے علماء اسلام، ان کے لئے خلوت گزینی جائز نہیں، البتہ جب فتنے اتنی کثرت و قوت سے شروع ہو جائیں کہ اپنا ہی دین بچانا مشکل نظر آنے لگے تو علماء اور اہل اصلاح کو بھی خلوت اختیار کرنا جائز ہے۔

اس حدیث کا جو مضمون ہے بعینہ اس کا ماخذ قرآن کریم میں اصحاب کہف کا قصہ ہے جس کو قرآن حکیم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لوگ بھی اپنے دین و ایمان کو لے کر پہاڑ کی طرف بھاگ گئے تھے چنانچہ ان کا قول قرآن نے نقل کیا ہے:۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ۔ الآیۃ (سورۂ کہف)	اور جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے الگ ہو چکے تو اب غار میں چل کر پناہ لو تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دیگا الخ۔

حضرت ابو سعید خدری رضؓ

ابو سعید کنیت ہے اور نام سعد بن مالک ہے، اجداد میں سے ایک صاحب عبید نامی تھے جن کے باپ کا نام اَبْجَر تھا جنھیں خُدرہ بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ غزوہ احد میں صغر سنی کی وجہ سے شریک نہیں کئے گئے مگر اس کے بعد بارہ غزوات میں شریک رہے۔ ان کے والد مالک بن سنان رضؓ غزوہ احد میں شہادت کی سعادت سے مشرف ہوئے۔

حضرت ابو سعید خدری رضؓ صحابہ میں عالم فاضل مشہور تھے ان سے گیارہ سو ستر ۱۱۷۰ احادیث مروی ہیں ۷۴ھ و قیل ۶۳ھ میں مدینہ منورہ میں وصال فرما کر جنت البقیع میں آرام فرما ہیں۔

باب ۱۳ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلمکم باللہ وان المعرفۃ فعل القلب لقول اللہ تعالیٰ ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا بیان کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا جاننے والا ہوں اور یہ کہ معرفت (یقین) دل کا فعل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سورہ بقرہ میں) لیکن ان قسموں پر تم سے مواخذہ کریگا جو تمہارے دلوں نے (جان بوجھ کر) کھائیں۔

۱۹ ● حدثنا محمدُ بن سَلامٍ قال أنا عَبْدَةُ عن هشامٍ عن ابيه عن عائشةَ قالتْ كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم اذا أمَرَهم أمَرَهم مِن الاعمال بما يُطيقون قالوا إنّا لسنا كهيئتك يا رسول الله إنّ الله قد غفرَ لك ما تقدّمَ مِن ذنبك وما تأخّرَ فيغضبُ حتى يُعرفَ الغضبُ في وجهه ثمّ يقول إنّ اتقاكم واعلمَكم بالله أنا ●

ترجمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کو کوئی حکم دیتے تو انہیں کاموں کا حکم دیتے جن کو وہ کر سکتے ہیں، وہ عرض کرتے یا رسول اللہ ہم آپ کی طرح نہیں ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپکی اگلی اور پچھلی تمام لغزشوں کو معاف فرمادیا ہے (یعنی ہمیں تو زیادہ سخت اعمال کا حکم ملنا چاہیئے) یہ سنکر آپ اتنا غصہ ہوتے کہ آپ کے (مبارک) چہرہ پر غصہ کے آثار نمودار ہو جاتے پھر آپ فرماتے (کیا تمکو معلوم نہیں) تم سب میں پرہیزگار اور اللہ کو زیادہ جاننے والا میں ہوں۔

مطابقتہ للترجمۃ :- ترجمۃ الباب سے مطابقت حدیث پاک کے آخری جملہ اعلمکم باللہ انا سے ہے۔

ربط ماقبل ماقبل کے باب میں فرار من الفتن کا بیان تھا اور ظاہر ہے کہ انسان کا دین و ایمان جتنا قوی ہوگا اور جس کی معرفت باللہ قوی ہوگی تقوی و خشیت بھی اس میں زیادہ ہوگی اور وہ فتنہ سے اتنا ہی زیادہ اجتناب کرے گا، ترک وطن اور سامانِ تعیش کو دین کی محبت میں قربان کردینا اس کے لئے آسان ہوگا، اسی لئے امام نے علم و معرفت کو بیان کیا۔

اشکال اس ترجمۃ الباب پر اشکال ہے کہ امام بخاری رح نے یہاں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے انا اعلمکم باللہ جو بظاہر کتاب العلم کے مناسب ہے حالانکہ یہاں کتاب الایمان کی مناسبت سے ابواب سابقہ کی طرح من الایمان یا من الاسلام یا من الدین کا ترجمہ ہونا چاہئے، اس ترجمۃ الباب "انا اعلمکم باللہ" کی کتاب الایمان کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

جواب :- (۱) یہ ہے کہ علم باللہ ایمان باللہ ہے، اور ارشاد نبوی انا اعلمکم باللہ میں اعلم اسم تفضیل ہے جس سے معلوم ہوا کہ علم باللہ کے مختلف درجات ہیں پس ایمان باللہ کے مختلف درجات ہوں گے۔ ایک جگہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادتی علم کی طلب کا حکم ہوتا ہے "قُل رّبِّ زِدنی علما" (سورہ طٰہٰ) اس سے صاف معلوم ہوا کہ علم کے مراتب و درجات مختلف ہیں وفوق کل ذی علم علیم۔

(۲) یہاں اعلمکم باللہ بمعنی اعرفکم باللہ ہے، چنانچہ بعض نسخوں میں یعنی اصیلی کی روایت میں اعلمکم

باللہ کے بجائے اعرفکم باللہ ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں علم بمعنی معرفت ہے اگرچہ مشہور قول یہی ہے کہ علم اور معرفت میں فرق ہے، کلیات کے جاننے کو علم کہا جاتا ہے اور جزئیات کے جاننے کو معرفت، یا مرکبات کے جاننے کو علم کہا جاتا ہے اور بسائط کے جاننے کو معرفت، یا علم متعدی بدو مفعول ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے علمتُ زیداً کریماً اور معرفت ایک ہی مفعول پر بس کرتا ہے جیسے عرفتُ زیداً مطلب یہ ہے کہ علم کا تعلق عین ذات سے نہیں بلکہ صفات سے ہوتا ہے اور معرفت عین ذات سے متعلق ہوتی ہے مثلاً علمتُ زیدا کریما" تو علم کا تعلق کریم کیساتھ ہوا زید پہلے ہی سے معلوم ہے، اور عرفتُ زیداً میں معرفت خود زید سے متعلق ہے، گویا منطقی اصطلاح کے اعتبار سے علم بمنزلہ تصدیق ہے کیونکہ اس کا تعلق ثبوت صفت للذات سے ہوتا ہے جیساکہ مثالِ مذکور میں واضح ہے، اور معرفت بمنزلہ تصور کے ہے کیونکہ اس کا تعلق عین ذات سے ہوتا ہے جو ایک مفرد چیز ہے، مگر دونوں کے متقارب ہونے کی وجہ سے ہر ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتا رہتا ہے، اسی بنا پر اس جگہ نسخوں میں اختلاف ہے۔ بہر حال مطلب ایک ہی ہے خواہ اعلمکم ہو یا اعرفکم ہو۔ جیساکہ حدیث میں فرمایا گیا من مات وھو یعلم ان لا الٰہ الا اللہ الخ تو یہاں یعلم بمعنی یؤمن ہے۔

(۳) امام بخاریؒ کا استدلال بطور الحاق نظیر بالنظیر ہے کہ جس طرح علم میں مراتب ہیں اسی طرح ایمان میں بھی ہیں کیونکہ علم سبب ایمان ہے پس جبکہ سبب میں تشکیک ثابت ہے تو مسبب یعنی ایمان میں بھی ثابت ہوگی۔

دوسرا اشکال

ترجمۃ الباب کے دو جزو ہیں۔ ایک انا اعلمکم باللہ، دوسرا ان المعرفۃ فعل القلب، ان دونوں کی آپس میں کیا مناسبت ہے؟

جواب:۔ اس کا جواب اشکال اول کے جواب ۲ میں گذر چکا ہے کہ یہاں اعلمکم بمعنی اعرفکم ہے۔

ترجمۃ الباب کا مقصد

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں دو جزو ذکر فرمایا ہے۔ ایک انا اعلمکم باللہ۔ دوسرا ان المعرفۃ فعل القلب۔

امام بخاریؒ کا مقصد اس باب سے بھی قائلین بساطت کی تردید ہے جو "الایمان لا یزید ولا ینقص" کے قائل ہیں۔ اس مقصد کے لئے امامؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے انا اعلمکم باللہ جو دراصل حدیثِ پاک کا ٹکڑا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا علم باللہ سب سے زیادہ ہے۔

پھر امام بخاریؒ نے اس کی تشریح کر دی ان المعرفۃ فعل القلب جس سے یہ بتایا کہ یہاں اعلمکم باللہ کے معنی ہیں اعرفکم باللہ، اور معرفت قلب کا فعل ہے، پس معلوم ہوا کہ قلبی اشیاء میں زیادتی کمی ہوتی ہے اور ایمان بھی قلبی چیز ہے لہذا ایمان کے اندر بھی کمی زیادتی ہوگی، لہٰذا اس سے مرجئہ کی تردید ہوگئی۔

اب یہ کہ معرفت فعل قلب ہے، اس کی دلیل ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم ہے (لیکن اللہ تعالیٰ تم سے مؤاخذہ کریگا اس پر جس کو تمہارے دلوں نے کمایا ہے) اس آیت میں بصراحت قلب کی طرف کسب کی نسبت کی گئی ہے جو فعل وعمل کے معنی میں ہے پس معرفت کا فعلِ قلب ہونا ثابت ہوگیا۔

اور یہاں علم و معرفت سے وہ معرفتِ غیر اختیاری مراد نہیں جو ایمان کے لئے موقوف علیہ ہے بلکہ اس سے معرفتِ صوفیا مراد ہے جو ایمان کے بعد ریاضت سے حاصل ہوتی ہے اور اختیاری ہے۔ نیز ترجمۃ الباب کے جز ثانی ان المعرفۃ فعل القلب سے کرامیہ کی تردید ہوگئی جو صرف اقرار باللسان کو ایمان قرار دیتے ہیں، تردید اس طرح ہوئی کہ ایمان باللہ علم باللہ ہے اور علم بمعنی معرفت ہے اور معرفت فعل قلب ہے پس ثابت ہوا کہ ایمان فعل قلب ہے لہٰذا بدون تصدیق قلب کے صرف اقرار باللسان کافی نہیں۔

تشریح حدیث

یہاں روایت مختصر ہے لیکن بخاری کتاب النکاح میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ تین صحابہ (حضرت علیؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ) ازواج مطہرات کے پاس آئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھا، جب ان کو بتلایا گیا تو صحابہ نے ان عبادات کو کم سمجھا اور کہنے لگے کہاں ہم کہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی ہم کو آپؐ سے کیا نسبت؟) آپؐ کے تو اگلے پچھلے سب قصور معاف ہیں (یعنی اگر حضورؐ عبادت کم بھی کریں گے تب بھی کوئی حرج نہیں آپ معصوم و مغفور ہیں لیکن ہم تو گنہ گار ہیں اس لئے ہمیں تو زیادہ عبادت کرنی چاہئے) چنانچہ ایک صحابی نے کہا میں تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہونگا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ دار رہونگا کبھی دن کو افطار نہیں کرونگا، تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہونگا کبھی نکاح نہ کرونگا۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپؐ نے فرمایا کیا تم لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ سنو! خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خشیتِ خداوندی رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا (اور افطار بھی کرتا ہوں) نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (تم نے جو یہ باتیں کیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے ان عبادات کو قلیل سمجھا اور تم مجھ سے بھی بڑھنا چاہتے ہو) بس لو جو بھی میرے طریقہ سے اعراض کریگا وہ میرا نہیں ہے۔ (بخاری ثانی ص ۷۵۷)

قولہ قد غفر لك ما تقدم من ذنبك الخ یہ اشارہ ہے آیت کریمہ لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر۔ (سورۃ فتح)

ذنب سے مراد خطاء اجتہادی ہے یا الفاظ کے ظاہر پر مواخذہ مراد ہے حسنات الابرار سیئات المقربین (فرمانبرداروں کی نیکیاں مقربین کے درجہ میں پہونچ کر برائیاں بنجاتی ہیں) جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انا اعلم فرمانے پر عتاب ہوا حالانکہ بات صحیح تھی، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو انی لیحزننی ان تذھبوا به واخاف ان یاکله الذئب کہنے سے بظاہر خلاف توکل ہے کئی برس تک فراق برداشت کرنا پڑا۔

یونس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا وذاالنون اذ ذھب مغاضبا فظن ان لن نقدر علیه، حالانکہ حقیقتاً ان کا یہ ظن نہ تھا بظاہر آپ کا فعل اس کا مقتضی تھا۔

اور واقعہ ابن ام مکتوم میں فرماتے ہیں عبس وتولی ان جاءہ الاعمیٰ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ

وسلم کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ تو گھر کے آدمی ہیں جب چاہیں پوچھ سکتے ہیں ان رؤساء کفار کو تبلیغ کا موقع شاید پھر نہ ملے۔

حتی یعرف الغضب فی وجہہ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ساری مخلوق میں سب سے زیادہ حسین و جمیل تھے اس لئے غصہ اور خوشی دونوں حالتوں کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتا تھا۔

وجہ غضب ۱۔ ان صحابہ کا عبادت میں حد سے تجاوز کرنا۔
۲۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو کم سمجھنا حالانکہ عبادتِ نبی وغیر نبی کی روح میں ایسا فرق ہے جیسا پارے اور روئی کی ثقل میں۔
۳۔ غفران ذنب کو تقلیل عبادت کا سبب سمجھنا حالانکہ یہ تکثیر عبادت کو مقتضی ہے۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم افلا اکون عبداً شکوراً۔

باب[۱۴] مَنْ كَرِهَ اَنْ يَّعُوْدَ فِى الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ مِنَ الْاِيْمَانِ ● ص۸

جو شخص پھر کافر ہو جانے کو اتنا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو تو یہ بھی ایمان کی علامت ہے۔

۲۰ ● حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَّكْرَهُ اَنْ يَّعُوْدَ فِى الْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ ●

ترجمہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہونگی وہ ایمان کی حلاوت (مزہ) پائیگا، ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کائنات عالم سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے کسی بندے سے خالص اللہ کے لئے دوستی رکھے، تیسرے پھر کفر میں جانا جب اللہ نے اس کو کفر سے چھڑا دیا اتنا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

مطابقتہ للترجمہ:۔ حدیث کی مطابقت واضح ہے یعنی ومن یکرہ ان یعود فی الکفر الخ سے۔

ربط ما قبل علامہ عینیؒ اور علامہ قسطلانیؒ نے یہ ربط بیان کیا ہے کہ ما قبل کی روایت میں یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عبادۃ میں زیادتی کا ارادہ کیا تھا بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت بھی چاہی تھی اور اس کثرت و زیادتی کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ انہیں ایمان کی حلاوت حاصل ہو چکی تھی، اور اس باب کی حدیث میں بھی حلاوت اور اسباب حلاوت کا بیان ہے لھذا مناسبت بھی ظاہر ہے۔

تعدد الحدیث:۔ مر الحدیث ص۷ وھنا ص۸ وسیاتی ص۸۹۲ وص۱۰۲۶ واخرجہ مسلم ص۴۹ ایضا ترمذی م

تشریح حدیث اس کی تشریح کے لئے حدیث ۱۵ ملاحظہ فرمائیے۔
اس حدیث میں کفر کی طرف لوٹنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے مراد نیا اسلام قبول کرنے والا شخص ہی ہو بلکہ وہ بھی مراد ہے جو پہلے ہی سے مسلمان تھا، اس میں دونوں صورتیں داخل ہیں کیونکہ جب نو مسلم کفر کی طرف لوٹنے سے اس قدر متنفر ہوگا تو ایسا شخص جو اَباً عن جدٍّ مسلمان ہے اس کو تو شرک و کفر سے اور بھی زیادہ متنفر و بیزار ہونا چاہئے اور اس کو ایمان کی حلاوت بھی زیادہ ہونی چاہئے۔

• بابٌ تفاضلِ اهلِ الایمان فی الاعمال •

ایمان داروں کا اعمال کی رُو سے ایک دوسرے پر افضل ہونا۔

ای هذا باب تفاضل اهل الایمان والاصل هذا باب فی بیان تفاضل الایمان فی اعمالهم۔ وتفاضل مجرورٌ باضافة الباب الیه ویجوز ان یکون مرفوعًا بالابتداء وقوله "فی الاعمال" خبره الخ۔ (عمدة)

ترجمة الباب فی الاعمال ہے، علامہ عینیؒ، علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ لفظ فی سببیّة کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اعمال کی وجہ سے اہلِ ایمان میں تفاوت ہوتا ہے۔

۲۱ • حدّثنا اسمٰعیلُ قال حدّثنی مالكٌ عن عمرِو بنِ یحیی المازنیِّ عن ابیه عن اَبی سعیدنِ الخُدریِّ عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم قال یَدخلُ اهلُ الجنّةِ الجنّةَ واهلُ النّارِ النارَ ثمّ یقولُ اللّٰهُ اَخرِجوا مَن کان فی قلبه مثقالُ حبّةٍ مِّن خردلٍ مِّن الایمانِ فیُخرَجون منها قد اسوَدّوا فیُلقَون فی نهرِ الحیاءِ اوالحیاةِ .شكَّ مالكٌ فینبُتون کما تَنبُتُ الحِبّةُ فی جانبِ السّیلِ اَلَم تَرَ انّها تَخرُجُ صفراءَ مُلتویةً قال وهیبٌ حدّثنا عمروٌ الحیاةِ وقال خردلٍ مِّن خیرٍ •

ترجمہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (حساب کتاب کے بعد) اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر (بھی) ایمان ہو اس کو (دوزخ سے) نکال لو، چنانچہ (ایسے لوگ) دوزخ سے نکال لئے جائیں گے وہ (جل کر) سیاہ ہو گئے ہوں گے، پھر وہ بارش کی یا زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے، (امام مالکؒ کو شک ہو گیا ہے کہ اوپر کے راوی نے کونسا لفظ استعمال کیا ہے) وہ اس طرح (نئے سرے سے) اُگ آئیں گے جیسے دانہ ندی کے کنارے اُگ آتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ دانہ (اوّل اوّل) زرد لپٹا ہوا نکلتا ہے۔ وہیب نے کہا ہم سے عمرو بن یحییٰ نے (بجائے حیا کے)

حیاۃ اور (بجائے خردل من ایمان) خردل من خیر کا لفظ بیان کیا۔

ربط علامہ عینیؒ اور علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ ماقبل کی حدیث میں ایمان کی تین خصلتوں کا ذکر تھا، اور ظاہر ہے کہ لوگ اس میں متفاوت ہوتے ہیں جس میں مکمل طور پر یہ تینوں پائی جائیں گی وہ افضل ہوگا اور جس کے اندر ان خصائل ثلاثہ میں یا کسی ایک میں نقص ہوگا وہ مفضول ہوگا تو گویا ماقبل میں تفاضل بین المؤمنین کا بیان ضمناً تھا اب امام بخاریؒ اسی چیز کو صراحۃً بیان فرمارہے ہیں۔

ع۲ ماقبل میں حلاوت و محبت اور کراہت کا بیان تھا و الناس فیہا متفاضلون لہٰذا باب تفاضل کا باب منعقد کیا۔

مطابقۃ للترجمۃ:- مطابقتہ للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ "اخرجوا من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان" یعنی ایمان کا قلیل سے قلیل حصہ بھی ہوگا تو جہنم سے نکال لیا جائے گا پس معلوم ہوا کہ اہل ایمان میں تفاوت و تفاضل ہے۔ (عمدہ)

اشکال ترجمۃ الباب میں تفاضل فی الاعمال کا ذکر ہے اور الفاظ حدیث اخرجوا من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان سے تفاضل فی الایمان ثابت ہوتا ہے، اس لئے حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت نہ ہوئی۔

جواب:- صحیح بخاری میں (یہاں) روایت مختصر ہے، ابو سعید خدری کی یہی روایت صحیح مسلم میں باب اثبات رؤیۃ المؤمنین فی الآخرۃ ربہم سبحانہ وتعالیٰ کے تحت تفصیل سے لائے ہیں جس سے تفاضل فی الاعمال ثابت ہوتا ہے چنانچہ ص۱۰۳ پر یہ الفاظ ہیں یقولون ربنا کانوا یصومون معنا و یصلون ویحجون (الیٰ قولہ) قد اخذت النار الیٰ نصف ساقیہ والیٰ رکبتیہ۔ اس میں ان لوگوں کے اعمال کا بیان ہے، اور ان اعمال میں تفاضل کا ثبوت بھی ہے بایں طور کہ نارِ جہنم بعض کے نصف ساقین تک ہے اور بعض کے رکبتین تک۔ یہ تفاوت فی العذاب تفاضل فی الاعمال کی وجہ سے ہے۔

آگے فرماتے ہیں: ثم یقولون ربنا مابقی فیہا احد ممن امرتنا بہ فیقول ارجعوا فمن وجدتم فی قلبہ مثقال دینار من خیر فاخرجوہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے پاس اعمال بدنیہ (اعمالِ جوارح) میں سے کوئی عمل نہ ہوگا البتہ اعمالِ قلب ہوں گے مثلاً خشیت الٰہی، اخلاص، نیت وغیرہ یعنی ذکر قلبی اور تغییر منکر کا پختہ ارادہ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔ (مسلم ج۱ ص۵۱)

(تم میں جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے ختم کردے اور اگر اس کی طاقت واستطاعت نہ ہو تو زبان ہی سے منع کردے اور اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو دل میں پختہ ارادہ رکھے کہ جب بھی موقع ہوگا اس کا استیصال کردوں گا اور یہ ایمان کا آخری اور کمزور درجہ ہے)۔

اس حدیث سے اعمال قلب کا وجود ثابت ہوا کیونکہ تغییر بالقلب کے معنی یہ ہیں کہ بدلنے کا عزم ہو، کما قال الملا علی القاری۔
صحیح مسلم شریف کے اسی باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مامن نبی بعثہ اللہ تعالیٰ فی امۃ قبلی الا کان لہ من امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ ثم انہا تخلف من بعدھم خلوف یقولون مالا یفعلون، ویفعلون مالا یؤمرون فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل۔ (مسلم ج ۱ ص ۵۱)
اس حدیث میں جہاد بالقلب تغییر بالقلب کے معنی کی تائید کر رہا ہے، پس معلوم ہوا کہ یہاں خیر سے مراد عمل ہے
آگے فرماتے ہیں فیخرج منہا قوما لم یعملوا خیراً قط (مسلم ص ۱۰۳) اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسری مرتبہ میں جن لوگوں کو نکالا گیا ہے ان میں تفاضل فی الخیر تفاضل فی اعمال القلب مراد ہے، اور آخر میں یعنی آٹھویں سطر میں فرماتے ہیں: ادخلھم اللہ الجنۃ بغیر عمل عملوہ ولا خیر قدموہ اس سے بھی ثابت ہوا کہ اور یہ خیر سے عمل قلب مراد ہے ایمان مراد نہیں، کیونکہ بغیر ایمان کے دخول جنت نہیں ہو سکتا۔
غرضیکہ امام بخاریؒ باب تفاضل اھل الایمان فی الاعمال کے تحت جو مختصر حدیث لائے ہیں اس سے استدلال کرتے وقت امامؒ کی نظر اس کے دوسرے طریق پر تھی جس کی تفصیل صحیح مسلم میں ہے، اس مفصل حدیث سے تفاضل فی الاعمال ثابت ہو رہا ہے۔ امام بخاریؒ نے حدیث باب کے آخر میں بصورت تعلیق من خیر کا لفظ لاکر اس کی طرف اشارہ بھی فرما دیا کہ یہ روایت تفاضل فی الاعمال کی مثبت ہے کیونکہ عرفاً خیر کا اطلاق عمل پر ہوتا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: یوم یاتی بعض آیات ربک لا ینفع نفسا ایمانہا لم تکن آمنت من قبل او کسبت فی ایمانہا خیرا۔

تعدد الحدیث:- اخرجہ البخاری ھنا ص ۸ وفی الرقاق ص ۹۷۰ ایضا ص ۱۱۰۷ وایضا بمعناہ حدیث ابی ھریرۃ ص ۱۱۱۱۔

تشریح الفاظ

اخرجوا بفتح الہمزۃ امر کا صیغہ ہے اخراج مصدر سے۔
اس بارے میں اختلاف ہے کہ خطاب کس کو ہے؟ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وھو خطاب للملائکۃ (ص ۱۶۱) یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے اخرجوا الخ۔ مثقال ثقل مادہ سے اسم آلہ ہے، مثقال ایک باٹ (وزن) ہے جو ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے لیکن یہاں مطلق وزن اور مقدار مراد ہے جیسے قرآن کریم میں مثقال ذرۃ (ذرہ برابر) مقدار ہی مراد ہے۔ حبۃ بفتح الحاء عام ہے ہر قسم کے دانے کو کہا جاتا ہے جیسے گیہوں وغیرہ اس کی جمع حبوب ہے اور حِبّۃ بکسر الحاء وتشدید الباء الموحدۃ صحرائی تخم، جنگلی بیج۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح جنگلی بیج پانی کی رو میں بہہ کر ہر جگہ جلدی جم جاتی ہے

اسی طرح یہ لوگ نہرالحیاۃ میں پڑکر فوراً ہی ایک نئی سرسبز و شاداب زندگی سے بہرہ مند ہوجائیں گے۔
فی نہر الحیا او الحیاۃ حیا بالقصر بارش، چونکہ بارش کے ذریعہ دانے اُگتے ہیں اور انہیں زندگی ملتی ہے اس لئے وہ سبب حیات ہے، یہاں نہر کا نام ہے۔ قال وھیب وُہیب بن خالد نے بھی عمرو بن یحییٰ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے امام مالکؒ کی طرح، لیکن امام مالکؒ کو شک ہوا کہ استاذ عمرو بن یحییٰ نے حیا کہا تھا یا حیاۃ؟ لیکن وہیب کی روایت بلا شک ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ دہیب کی روایت میں خردل من ایمان کے بجائے خردل من خیر ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ ایمان سے مراد اعمال ہیں۔

تشریح حدیث امام بخاریؒ یہاں دو حدیثیں لائے ہیں مقصد مرجئہ وخوارج کی تردید ہے۔ گویا امام بخاریؒ نے یہاں دو دھاری تلوار چلائی ہے کہ اس حدیث سے دونوں پر رد ہے کیونکہ مرجئہ کا عقیدہ ہے کہ اعمال کو تکمیل ایمان میں بھی دخل نہیں ہے ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت مضر نہیں ہے لہذا مرجئہ پر رد اس طرح ہوگا کہ اگر معاصی مضر نہیں ہیں تو گنہگار مؤمن جہنم میں کیسے گئے؟
خوارج پر اس طرح رد ہوگا کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مرتکب کبائر کافر ہے اور ہمیشہ جہنم میں رہیگا تو اس حدیث میں ان کی کھلی تردید ہے کہ جہنم سے کیوں نکالے گئے؟۔

فائدہ اس باب سے صاف معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ وہی فرماتے ہیں جو حنفیہ اور جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ ایمان بسیط ہے صرف تصدیق قلبی کا نام ہے نفس ایمان ذو اجزاء یعنی مرکب نہیں ہے ہاں اعمال کے اعتبار سے کمی زیادتی ہوتی ہے البتہ امام بخاریؒ اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان میں کیفیت کے اعتبار سے کمی زیادتی ہوتی ہے جیساکہ ان المعرفۃ فعل القلب اور اعلمکم سے ظاہر ہے اور ہم بھی اسی کے قائل ہیں لہذا جو لوگ کہتے ہیں کہ امام بخاری حنفیہ پر رد فرماتے ہیں یہ غلط ہے، بے شک امام بخاری ایمان کامل میں اجزاء کے اعتبار سے کمی زیادتی کے قائل ہیں اور ہم بھی اسی کے قائل ہیں، صحیح یہ ہے کہ امام بخاریؒ زیادہ تر مرجئہ کی تردید کرتے ہیں اور کبھی کبھی خوارج و معتزلہ کی بھی جیسے اوپر مذکور ہوا۔

۲۲ ● حدثنا محمدُ بنُ عُبَيدِ اللهِ قال حدثنا ابراهيمُ بنُ سعدٍ عن صالحٍ عن ابنِ شهابٍ عن ابی امامة بنِ سهلِ بنِ حُنيفٍ انه سمع اباسعيدِ الخدريَّ يقول قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم بينا انا نائمٌ رأيتُ الناسَ يُعرَضون علَيَّ وعليهم قُمُصٌ منها ما يبلغ الثُّدِيَّ ومنها ما دون ذٰلك وعُرِضَ علَيَّ عمرُ بنُ الخطاب وعليه قميصٌ يَجُرُّه قالوا فما اوّلتَ ذٰلك يا رسولَ اللهِ قال الدِّين ●

ترجمہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں سو رہا تھا میں نے (خواب میں) لوگوں کو دیکھا وہ میرے سامنے پیش کئے جارہے

ہیں اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں، بعضوں کے کرتے چھاتیوں تک ہیں اور بعضوں کے اس سے بھی کم، اور حضرت عمر بن خطاب رضؓ میرے سامنے لائے گئے وہ ایسا (لمبا) کرتا پہنے ہوئے تھے جس کو گھسیٹ رہے ہیں (زمین تک نیچا ہے) صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی؟ ارشاد فرمایا "دین" یعنی قمیص کی تعبیر میں نے دین سے کی، جس کا حاصل یہ ہے کہ مجھے لوگوں کی دینی کیفیت دکھلائی گئی میرے سامنے پیش کردہ اشخاص میں عمرؓ کی قمیص سب سے بڑی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ان کا دین ان سب (پیش شدہ حضرات) کے دین سے بڑھ کر و اکمل ہے۔

قمیص کو دین کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ جیسے لباس پہننے سے تین اغراض ہوتی ہیں۔ ستر عورت، گرمی و سردی سے حفاظت اور زینت اسی طرح دین بھی عیوب کے لئے ساتر اور اخروی مصائب سے محافظ اور سبب زینت ہے

یہ معلوم ہو چکا کہ دین کا اطلاق ایمان و اسلام کے مجموعہ پر آتا ہے اس لئے نفس ایمان میں کمی و زیادتی اس سے ثابت نہیں اور اعمال کی وجہ سے تفاوت و تفاضل کا اہل حق میں سے کسی کو انکار نہیں۔

تعدد الحدیث:- اخرجہ البخاری ہنا ص ۸ وفی فضل عمر ص ۵۲۱ وفی التعبیر ص ۱۰۳۷ ایضا ص ۱۰۳۸۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاهرۃ من جہۃ تاویل القمیص بالدین و ذکر فیہ انہم متفاضلون فی لبسہا فدل علی انہم متفاضلون فی الایمان ای فی الاعمال۔

اشکال اسبال ازار ناجائز ہے تو کیا حضور اکرم صلی اللہ نے خواب میں حضرت عمر فاروق رضؓ کو بظاہر معصیت میں مبتلا دیکھا؟

جواب:- یہ دوسرے عالم کا واقعہ ہے جسے اس عالم پر قیاس نہیں کر سکتے۔

(۲) یہاں قمیص سے حقیقی قمیص مراد نہیں بلکہ یہ دین سے تعبیر ہے کما عبرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: وهو یوافق قولہ تعالیٰ "ولباس التقویٰ ذٰلک خیر"

اشکال:- اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی افضل ہیں؟

جواب:- ۱۔ حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو جو لوگ دکھلائے گئے تھے ان میں حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے ممکن ہے کہ صدیق اکبر رضؓ اس جماعت میں نہ ہوں۔

(۲) یہاں حقیقت فضل مراد نہیں بلکہ آثار دین دکھلائے گئے ہیں، پس اصل دین کے لحاظ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں مگر آثار کا ترتب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر زیادہ ہوا بایں طور کہ آپ کے دور خلافت میں فتوحات بہت کثرت سے ہوئیں۔ حضرت ابوبکر رضؓ کی اولاً تو مدت خلافت ہی بہت مختصر ہے پھر اس میں مرتدین کو کچلنے کی طرف توجہ رہی گویا کہ فتوحات کی راہ تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ہموار کر دی تھی جس پر حضرت عمر رضؓ گامزن ہوئے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا درجہ معلوم کرنے کا خیال ہوا تو عالم مثال میں دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ میں کھڑے ہیں اور آپ کے نیچے آپ کے جوتوں کے متصل حضرت ابو بکرؓ کا سر ہے اور حضرت ابو بکرؓ کے جوتوں سے کچھ فاصلہ پر نیچے حضرت عمرؓ کا سر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت صدیقؓ کی نہایت نبی کی بدایت ہے اور حضرت فاروقؓ کی نہایت سے کافی اوپر حضرت صدیق کی بدایت ہے۔ اس حدیث سے تفاضل فی الدین ثابت ہوا والدین والایمان متحدان۔ (ارشاد القاری)

• باب۱۶ الحیاء من الایمان • بخاری صٓ

حیا (شرم) ایمان کا ایک جزو ہے۔

۲۳ • حدثنا عبدُ اللهِ بنُ یوسفَ قال اخبرنا مالکُ بنُ انسٍ عن ابنِ شہابٍ عن سالمِ بن عبدِ اللہ عن ابیہ اَنّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَرّ علیٰ رجلٍ مّن الانصارِ وھو یَعِظُ اخاہ فی الحَیاءِ فقال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دَعْہُ فاِنّ الحیاءَ مِنَ الایمانِ •

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کے پاس سے گذرے اور وہ شخص اپنے بھائی کو حیاء کے بارے میں سمجھا رہے تھے (یعنی تنبیہ کر رہے تھے کہ اتنی شرم کیوں کرتا ہے؟) اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو کیوں کہ حیا ایمان کا ایک حصہ ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ:۔ مطابقتہ للترجمۃ ظاہرۃ لانہ اخذ جزء من الحدیث فبوّب علیہ کما ھو عادتہ۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ ھنا صٓ ایضاً فی کتاب الادب ص۹۰۳۔

ربط سابق باب میں تفاضل اہل الایمان فی الاعمال کا بیان تھا اور اس باب میں حیا کا بیان ہے، حیا کے مراتب متفاوت ہیں اور اس میں باہمی تفاضل ظاہر ہے۔

تشریح حدیث یہاں یہ روایت مختصر ہے اسی بخاری کے کتاب الادب ص۹۰۳ میں کسی قدر تفصیل ہے جس سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

مرّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ رجلٍ وھو یعاتب فی الحیاء یقول انک لتستحیی حتی کانہ یقول قد اضرّ بک، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعہ فان الحیاء من الایمان۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گذرے جو اپنے بھائی کو حیاء کے بارے میں عتاب کر رہا تھا (یعنی ناراض ہو رہا تھا) کہہ رہا تھا کہ تم بہت شرماتے ہو، یہاں تک کہ وہ کہنے لگا کہ شرم نے تجھ کو نقصان پہونچایا ہے (تباہ کر دیا ہے) آنحضورؐ نے فرمایا اسے رہنے دو کیوں کہ حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے۔

امام بخاریؒ کا مقصد مرجیہ کی تردید ہے۔ امامؒ بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان کے لئے اعمال کی ضرورت ہے خواہ قلب کا عمل ہو یا جوارح کا، عمل کے بغیر ایمان ناقص رہے گا کیونکہ عمل مکملاتِ ایمان میں سے ہے، اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ حیاء ایمان کامل کا ایک شعبہ اور جزو ہے۔

حیاء کے متعلق کچھ تفصیل حدیث ۸ میں گذر چکی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

حیاء کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے هو انقباض النفس خشیة ارتكاب ما يكره اعم من أن يكون شرعيا او عقليا او عرفيا مکروہ کے ارتکاب کے خوف سے نفس کا رک جانا چاہے وہ شرعی ہو یا عقلی ہو یا عرفی ؟ اب اگر مکروہ شرعی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ فاسق کہلائیگا اور اگر مکروہ عقلی میں پڑتا ہے تو مجنوں و پاگل کہلائیگا اور اگر عرفی مکروہ میں پڑیگا تو وہ ابلہ اور بے وقوف کہلائیگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حیا ہر حال میں بہتر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے الحياء خيرٌ كلّهٗ۔

● باب فان تابوا واقاموا الصلوٰة وآتوا الزكوٰة فخلّوا سبيلهم ● ص۸

اس آیت کی تفسیر میں کہ "پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو"۔ لفظ باب کو اضافت اور تنوین دونوں صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ بصورتِ اضافت عبارت ہوگی باب تفسیر قوله تعالى الخ اور بصورتِ تنوین عبارت ہوگی هذا باب في تفسير قوله تعالى فان تابوا الخ (فتح)

۲۴ ● حدثنا عبدُ اللهِ بنُ محمدٍ المُسنَدِيُّ قال حدثنا ابو رَوحٍ نِ الحَرَمِيُّ بنُ عُمارَةَ قال حدثنا شعبةُ عن واقدِ بنِ محمدٍ قال سمعتُ أبي يحدِّثُ عن ابن عمرَ أنّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قال أُمِرتُ أنْ أُقاتِلَ الناسَ حتى يشهدوا أن لا اله الا الله وأنّ محمداً رسولُ الله ويقيموا الصلوٰةَ و يؤتوا الزكوٰةَ فاذا فعلوا ذلك عصَموا مِنّي دِماءَهم واموالَهم الا بحقِّ الاسلامِ وحِسابُهم على الله ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے (خدا کا) حکم ہوا ہے کہ لوگوں (کافروں) سے جنگ کروں اس وقت تک کہ وہ اس بات کا اقرار کرلیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دیں، جب وہ یہ کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے بچا لیا مگر اسلام کے حق سے اور ان (کے دلوں کی باتوں) کا حساب اللہ پر رہے گا۔

مطابقته للترجمة:۔ معنى الحديث مطابق لمعنى الآية یعنی آیت میں توبہ (یعنی رجوع عن الشرک الی التوحید) نماز اور زکوٰۃ مذکور ہیں اسی طرح حدیث میں بھی ان ہی تین چیزوں کا ذکر ہے پھر آیت میں جس طرح کہا گیا

ہے کہ جو لوگ ان تین اشیاء کو بجالائیں وہ مامون کردیئے جائیں گے اسی طرح حدیث میں ہے جو لوگ ان تینوں کو بجالائیں ان کے جان ومال محفوظ کردیئے جائیں گے۔ آیت کریمہ میں تخلیہ اور حدیث میں عصمت دونوں کے یہاں ایک ہی معنیٰ ہیں۔

تعدد الحدیث:- اخرجه البخاری ههنا فقط واخرجه مسلم ص۳۷۔

تشریح امام بخاریؒ کا مقصد مرجئہ وکرامیہ کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ ایمان کے لئے اعمال کی ضرورت نہیں، آیت قرآنی وحدیث نبوی دونوں سے پوری پوری تردید ہوگئی کہ اگر اعمال کی ضرورت نہیں تو ادائے شہادت کے ساتھ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ پر تخلیہ سبیل کو کیوں موقوف بنایا گیا پس معلوم ہوا کہ کمال ایمان ان سب چیزوں سے مرکب ہے۔

اشکال آیت وحدیث دونوں میں ارکان اسلام میں سے صرف اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ مذکور ہیں بقیہ ارکان اسلام (روزہ، حج) کا کوئی ذکر نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- بعضوں نے یہ کہا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم صوم وحج کی فرضیت سے قبل کا ہو لیکن یہ جواب حدیث میں تو ممکن ہے مگر آیت میں اس لئے گنجائش نہیں ہے کہ یہ آیت سورۂ برائت کی ہے جو ۹ھ میں نازل ہوئی اور صوم (روزہ) کی فرضیت بلاشبہ اس سے پہلے ہوچکی ہے، اصل جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ سے عبادت بدنیہ کی جانب اشارہ ہے اور زکوٰۃ سے عبادات مالیہ کی جانب۔ صلوٰۃ کو عماد الدین اور زکوٰۃ کو قنطرۃ الاسلام فرمایا گیا ہے۔ بس ان دونوں کی اہمیت کی وجہ سے ان دونوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ورنہ مراد تمام احکامات شرعیہ علی حسب المراتب ہیں، اس صورت میں تمام عبادات بدنیہ اور مالیہ اور مرکب من البدنی والمالی سب اس میں شامل ہوجائیں گی۔

اشکال اس آیت سے ثابت ہوا کہ عصمت دم وتخلیہ سبیل کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ ایمان لائیں اور صلوٰۃ وزکوٰۃ ادا کریں، حالانکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: قاتلوا الذین لا یؤمنون بالله ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم الله ورسوله ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیة عن ید وهم صاغرون۔ (سورۂ توبہ)

جس سے معلوم ہوا کہ قبول جزیہ سے بھی قتل کا حکم ختم ہوجاتا ہے۔

جواب:- فتح الباری میں اس کے چند جواب دیئے گئے ہیں جو زیادہ معتبر ہیں، ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) بعض نے کہا شاید اس وقت تک جزیہ کا حکم نازل نہ ہوا ہو مگر یہ محض احتمال ہے۔

(۲) سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ جہاد سے اعدام کفر مقصود نہیں بلکہ کفر کی شان وشوکت کا توڑنا اور مغلوب کرنا مقصود ہے، کما قال الله تعالیٰ: لیظهره علی الدین کله۔ وقال: لتکون کلمة الله هی العلیا، یعنی اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کا سب ادیان پر غلبہ مقصود ہے۔

غرضیکہ دوسرے ادیان کو مغلوب کرنا مقصود ہے نہ کہ معدوم کرنا۔ لهٰذا اگر کوئی جماعت ایمان قبول نہیں کرتی مگر جزیہ قبول کرکے مسلمانوں کے تابع ہوجاتی ہے اور حکماً ملحق بزمرۃ المؤمنین ہوجاتی ہے تو جہاد کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

حکم تارک صلوۃ

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ تارک الصلوۃ کے قتل کے قائل ہیں،
آگے ان میں اختلافِ انظار ہے۔

امام احمدؒ قتل ردۃً کے قائل ہیں۔ یعنی ان کے یہاں تارک الصلوۃ مرتد ہے لہٰذا اس پر مرتد کے سب احکام جاری کرتے ہیں۔
امام شافعیؒ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ مرتد نہیں قرار دیتے بلکہ حداً قتل کا حکم دیتے ہیں جیسے کہ قصاص یا زانی محصن کو حداً رجم ہوتا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سب سے نرم ہیں یعنی فوراً قتل کرنے کا حکم نہیں فرماتے بلکہ فرماتے ہیں کہ اسے قید میں رکھا جائے اور اتنا مارا جائے کہ خون بہنے لگے حتی یتوب او یموت۔ معلوم ہوا کہ نتیجۃً امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی حکم قتل ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ سوچنے کی مہلت اور توبہ کی فرصت مل جاتی ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کی دلیل ۱۔ حدیث باب۔
امام نوویؒ نے بھی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

جواب ۱۔ خود انہی میں سے منصفین حضرات نے اس حدیث سے استدلال کو غلط قرار دیا ہے، چنانچہ تقی الدین ابن دقیق العید جو پہلے مالکی تھے پھر شافعی ہو گئے، بہت منصف مزاج ہیں، اپنی کتاب "فوائد الاحکام" میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے قتل تارک صلوۃ پر استدلال صحیح نہیں اس لئے کہ حدیث میں مقاتلہ کا حکم ہے اور مقاتلہ و قتل میں فرق ہے۔ مقاتلہ کے معنی ہیں لڑنا جھگڑنا۔ پھر اگر لڑائی میں کوئی شخص قتل ہو جائے تو وہ اور بات ہے، مقاتلہ قتل کو مستلزم نہیں۔ بعض شعائر دین مثلاً اذان یا ختنہ کے ترک پر حاکم مسلم کو قتال کا حکم ہے مگر ایسے لوگوں کا قتل جائز نہیں۔

اسی طرح مار بین یدی المصلی کے بارے میں فرمایا فان ابی فلیقاتلہ حالانکہ اسے قتل کرنا جائز نہیں۔
ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا اقتالا یا سعد، یعنی تم اپنی بات پر اتنے مصر ہو کہ گویا مجھ سے لڑ کر کام کروانا چاہتے ہو۔ دیکھئے یہاں قتل کے کچھ معنی نہیں بنتے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما یہاں اگر قتال سے قتل مراد لیا جائے تو جانبین کے قتل ہو جانے کے بعد صلح کن لوگوں میں کروائی جائے گی ؟

خود امام شافعیؒ سے بیہقی نے نقل کیا ہے لیس القتال من القتل بسبیل قد یحل قتال الرجل ولا یحل قتلہ لہٰذا حدیث باب سے تارک صلوۃ کے ساتھ قتال ثابت ہوتا ہے جوازِ قتل ثابت نہیں ہوتا۔

(۲) ابن قیمؒ نے احکام صلوۃ پر ایک مستقل رسالہ بنام "کتاب الصلوۃ واحکام تارکہا" لکھا ہے جس میں حدیث سے استدلال نہیں کیا بلکہ ترجمۃ الباب میں مذکورہ آیت کریمہ اقتلوا المشرکین (الیٰ قولہ تعالیٰ) فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلهم کو دلیل میں پیش کیا ہے، فرماتے ہیں کہ حدیث میں اگرچہ

قتال کا حکم ہے مگر قرآن میں حکم قتل مذکور ہے۔

ابن قیمؒ کے اس استدلال کے کئی جواب دئے جاسکتے ہیں :-

(۱) قرآن مجید میں قتل مذکور ہے اور حدیث میں قتال۔ لہٰذا رفع تعارض کے لئے ایک کو دوسرے پر محمول کرنا ضروری ہوگا، یعنی یا تو قتل سے قتال مراد لیا جائے اور یا اس کے برعکس قتال سے قتل مراد ہو۔

چونکہ حدیث قرآن مجید کی شرح ہے اس لئے قرآن میں مذکور لفظ قتل سے قتال مراد لیا جائے جو کہ حدیث میں مذکور ہے، امام بخاریؒ نے بھی ترجمۃ الباب میں یہ آیت مذکورہ اور اس کے تحت یہ حدیث لاکر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس آیت کی شرح ہے۔

(۲) قرآن مجید میں صرف قتل کا حکم نہیں بلکہ اس کے ساتھ چند اور احکام بھی مذکور ہیں۔ فرماتے ہیں اقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم۔ اس سے معلوم ہوا کہ تخلیۂ سبیل سب احکام مذکورہ یعنی قتل، اخذ، محاصرہ وغیرہ کو شامل ہے۔ احناف رحؒ بھی تارک صلوٰۃ کا تخلیۂ سبیل نہیں کرتے جبکہ قید وضرب کا حکم دیتے ہیں حتی یتوب او یموت صرف توبہ کی مہلت دیتے ہیں۔

(۳) ابن قیمؒ کی مستدل آیۃ کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تارک زکوٰۃ کو بھی قتل کیا جائے حالانکہ ائمہؒ اربعہ میں سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں صرف امام محمدؒ سے ایک مرجوح روایت ہے۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

(۴) امام نوویؒ نے حدیث باب سے استدلال کیا ہے مگر اُمرتُ اَن اُقاتل الناس سے نہیں بلکہ فاذا فعلوا ذالك فقد عصموا منی دماءھم واموالھم سے استدلال کرتے ہیں بایں طور کہ "ذالك" کا مشار الیہ تین چیزیں ہیں۔ توبہ، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ۔ اور عصمت بھی تین قسم کی ہے عصمۃ الدم، عصمۃ المال، عصمۃ الدم والمال کلیہما۔ پس اگر شرط میں مذکور امور ثلاثہ سب پائے گئے تو عصمتِ مال ودم پائی جائیگی اور زکوٰۃ نہ دی تو عصمتِ مال مرتفع ہوجائے گی اور ترک صلوٰۃ سے عصمت دم جاتی رہے گی۔

جواب ۱۔ ہمارے یہاں بھی تارک صلوٰۃ کا دم معصوم نہیں حتی یتوب او یموت کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ مجد الدین شیرازی صاحب قاموس نے "المرقات الارفعیہ فی طبقات الشافعیہ" میں امام شافعی وامام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا مناظرہ نقل کیا ہے:۔

امام شافعیؒ نے دریافت فرمایا کہ اگر تارک صلوٰۃ کافر ہے تو اسے دوبارہ مسلمان کیسے کریں گے؟

امام احمدؒ نے جواب دیا کہ اسے کلمۂ اسلام پڑھائیں گے، امام شافعیؒ نے فرمایا کلمہ تو وہ پہلے سے پڑھتا ہے۔

امام احمدؒ نے کہا کہ اسے نماز پڑھنے کا حکم دیں گے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مرتد کی نماز کیسے قبول ہوگی؟ امام احمدؒ ساکت ہوگئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب ۱۸ مَن قال اِنَّ الایمانَ ھو العملُ لِقولِ اللّٰہ تعالیٰ وَتِلْكَ

الجنۃ التی اورثتموھا بما کنتم تعملون وقال عدۃ من اھل العلم فی قولہ تعالیٰ فوربک لنسئلنھم اجمعین عما کانوا یعملون عن قول لا الٰہ الا اللہ وقال لمثل ھٰذا فلیعمل العاملون ●

اس شخص کی دلیل جو کہتا ہے کہ ایمان ایک عمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورۂ زخرف میں) فرمایا ہے: یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو وہ تمہارے عمل کا بدلہ ہے: اور متعدد علماء نے (سورۂ حجر کی آیت) فوربک الآیۃ کی تفسیر لا الٰہ الا اللہ کہنے سے کی ہے (یعنی قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان سب سے (اہل کفر سے) ضرور پوچھیں گے "لا الٰہ الا اللہ" کے بارے میں) اور (سورۂ والصّٰفّٰت میں) فرمایا: ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔

۲۵ حدثنا احمد بن یونس وموسیٰ بن اسمٰعیل قالا حدثنا ابراھیم بن سعد قال حدثنا ابن شھاب عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل ای العمل افضل فقال ایمان باللہ ورسولہ قیل ثم ماذا قال الجھاد فی سبیل اللہ قیل ثم ماذا قال حج مبرور

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا پھر کونسا عمل؟ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ عرض کیا گیا پھر کونسا عمل؟ فرمایا حجِ مقبول۔

باب لفظ باب اپنے مابعد کی طرف مضاف ہے عبارت ہوگی ھٰذا باب من قال الخ (عمدۃ)

ربط و مقصد ماقبل کے باب میں تو بہ، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا بیان تھا اور یہ سب اعمال ہیں، توبۂ قلب کا عمل ہے اور اقامتِ صلوٰۃ وایتاءِ زکوٰۃ اعمالِ جوارح۔ اور اس باب میں عمل ہی کا بیان ہے کہ ایمان تو خود ہی عمل ہے۔ امام بخاریؒ کا مقصد ان تمام قائلینِ بساطت کی تردید ہے جو لوگ اعمال کو ایمان سے بے تعلق قرار دیتے ہیں، امامؒ نے اس باب میں سب کا رد کیا ہے فرقہ کرامیہ صرف قول کو ایمان کہتے ہیں، جھمیہ صرف معرفت کو اور مرجیہ فقط تصدیق کو۔ امام بخاریؒ نے بتایا کہ صرف قول ایمان نہیں جب تک قلب کا فعل یعنی تصدیق نہ ہو علیٰ ہٰذا صرف معرفت و تصدیق اگر غیر اختیاری ہے تو ہرگز ایمان نہیں ہاں اختیاری تصدیق جو قلب کا فعل ہے وہ ایمان ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان عمل ہی ہے بلکہ اشرف الاعضاء یعنی قلب کا فعل و عمل ہے۔

ایمان کے عمل ہونے پر پہلی دلیل سورہ زخرف کی آیت لائے ہیں تلک الجنۃ التی الخ اور ظاہر ہے کہ دخولِ جنت ایمان کی وجہ سے ہوگا لا محالہ آیت میں کنتم تعملون بمعنی کنتم تؤمنون ہے۔

دو اشکال مع جوابات پہلا اشکال یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دخول جنت عمل کے سبب سے ہوگا حالانکہ بخاری ہی کی روایت میں ارشاد نبوی ہے:

لن یدخل احدکم عملہ الجنۃ (تم میں سے کوئی شخص صرف اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہو سکیگا بلکہ اللہ کے فضل سے جنت میں جائیگا۔
پس آیت و حدیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب ۱:۔ آیت کریمہ کے اندر بما کنتم میں باء سببیت کے لئے نہیں ہے بلکہ ملابست کے لئے ہے۔ آیت و حدیث میں تعارض اس صورت میں ہوگا جبکہ بار کو سببیت کے لئے لیاجائے کیونکہ سبب پر مسبب کا ترتب بطور دلیل کے ہوتا ہے اور ملابست کی صورت میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ ملابست کی صورت میں بما کنتم تعملون کا مفہوم ہوگا۔ ان اعمال کے ثواب و ثمرات کے ساتھ تمہیں جنت کا مالک بنادیا گیا، اسی طرح بار کو عوض و مقابلہ کے لئے لیا جائے تب بھی کوئی تعارض نہ ہوگا کیونکہ مفہوم یہ ہوگا کہ جنت تمہیں عمل کے عوض اور مقابلہ دی گئی ہے۔

سبب اور مقابلہ میں فرق ہے کہ جس طرح سبب پر مسبب موقوف ہوتا ہے مقابلہ میں ایسا نہیں۔ سبب کی صورت تو یہ ہے کہ دخول جنت عمل پر موقوف ہے عمل نہ پایا گیا تو دخول جنت نہ ہوگا۔ اور مقابلہ کی صورت یہ ہے کہ جنت عمل کے مقابل تو ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے عمل پر موقوف نہیں رکھا انعام کے طور پر دی ہے۔

۲ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اعمال کی دو قسم ہے۔ بعض اعمال مقبول ہوتے ہیں اور بعض غیر مقبول۔ اور ظاہر ہے کہ ہم ناقص اور ہمارا عمل ناقص لہٰذا ہمارا کوئی عمل فضل خداوندی کے بغیر مقبول نہیں ہو سکتا اور جنت بدون عمل مقبول کے حاصل نہیں ہو سکتی پس جنت موقوف ہے عمل مقبول پر اور عمل کی قبولیت موقوف ہے فضل الٰہی پر لہٰذا دخول جنت موقوف ہے فضل الٰہی پر۔ پس دونوں باتیں صحیح ہیں عمل بھی، فضل بھی، ایک کو آیت میں بیان کیا ہے دوسرے کو حدیث میں۔ (املاد بحوالہ فتح الباری ۱۰ ص۳)

دوسرا اشکال

دوسرا اشکال یہ ہے کہ آیت کریمہ میں اورثتموھا فرمایا گیا ہے جبکہ وراثت کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو انتقال کے بعد ورثہ کے لئے چھوڑی جاتی ہے، جنت کسی شخص کی ملکیت نہیں کہ اس کے انتقال کے بعد ورثار کو دیجائے، جنت تو اللہ تعالیٰ کی ملک ہے۔

جواب ۱:۔ یہاں بطور تشبیہ وراثت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس طرح وراثت قطعی چیز ہے کسی سے واپس نہیں لی جاسکتی ہے اور حصول وراثت کے بعد تصرف میں مکمل طور پر مختار ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کو دائمی طور پر بالکل آزادی کے ساتھ تصرف کا اختیار دیدیا گیا ہے اب ان پر کوئی پابندی نہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔

ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون۔ (پ۲۴ رکوع ۱۸)	اور تمہارے لئے اس (جنت) میں جس چیز کو تمہارا جی چاہیگا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اسمیں جو مانگوگے موجود ہے۔

یعنی جس چیز کی خواہش و رغبت ہوگی یا جو طلب کروگے سب ملیگا گویا یہ تشبیہ صرف بقا میں ہے۔ (عمدۃ)

جواب ۲:۔ یہاں کا فر کو مورث قرار دیا جائے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے ایک مکان جنت

میں ہے اور ایک مکان دوزخ میں۔ مؤمن جب جنت میں جائیگا تو اپنی جگہ پر تو قبضہ کریگا ہی کافروں کی جگہ پر قابض ہو جائیگا کیونکہ کافر کفر کی وجہ سے جنت سے محروم رہا اور مسلمان اس کا وارث بنا۔ بس اسی صورت کو ایراث سے تعبیر فرمایا گیا۔ اسی طرح بعد والی آیات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ قال تعالیٰ: فو ربك لنسئلنهم اجمعین عما کانوا یعملون، ای عن قول لا الٰہ الا اللہ یہاں قول سے مراد عام ہے قول قلبی یعنی تصدیق و اعتقاد اور قول لسانی یعنی اقرار، مقصود صاف ہے کہ مراد ایمان ہے۔

تیسرا استدلال سورہ صافات کی آیت سے ہے لمثل ھذا فلیعمل العاملون، ای فلیؤمن المؤمنون، اس سے ایمان کا عمل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

نیز حدیث باب سے بھی یہی ثابت کرنا ہے بایں طور کہ سوال ہے ای العمل افضل؟ اس کے جواب میں حضور اکرم کا ارشاد ہے ایمان باللہ و رسولہ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ایمان عمل ہے۔

مطابقتہ للترجمۃ: مطابقۃ ھذا الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ وھی اطلاق العمل علی الایمان۔

تعدد الحدیث: اخرجہ البخاری ھنا فی کتاب الایمان صـ و ایضا فی کتاب المناسك صـ۲۰۶ و اخرجہ مسلم فی الایمان صـ۶۲ وغیرہ۔

تشریح

حدیث شریف میں ہے ای العمل افضل کون سا عمل افضل ہے؟ والسائل ھو ابوذرؓ۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ایمان باللہ یعنی تمام اعمال میں ایمان باللہ و برسولہ افضل ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ کو عمل قرار دیا ہے۔ نیز ایمان و عمل میں تلازم ثابت ہو گیا کہ کسی جگہ پر عمل کا اطلاق اور کسی جگہ عمل پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے۔

ایک اشکال و جواب

اشکال یہ ہے کہ اتحادِ سوال کے باوجود جواب میں اختلاف کیوں ہے؟

جواب ۱ یہ ہے کہ اختلاف سائلین یا اختلافِ حالات یا اختلافِ زمان و مکان کے اعتبار سے جواب میں اختلاف ہے۔

۲ یا ہر جگہ لفظ مِن محذوف مانا جائے یعنی یہ بھی افضل اعمال میں سے ہے اور یہ بھی الخ

• باب اذا لم یکن الاسلام على الحقيقة وكان على الاستسلام او الخوف من القتل لقوله تعالىٰ: قالت الأعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا أسلمنا فاذا كان على الحقيقة فهو على قوله جل ذكره إن الدين عند الله الاسلام الآية •

قولہ باب بالتنوین خبر ہے مبتدأ محذوف کی ای ھذا باب۔ اگر اسلام اپنی حقیقت پر (یعنی شرعی معنیٰ پر) نہ ہو محض ظاہری تابعداری (یعنی لغوی معنیٰ) پر ہو یا قتل سے ڈر کر ہو (تو معتبر و نافع نہیں ہوگا ای فی الآخرۃ) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سورہ حجرات میں) دیہاتی لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے، اے پیغمبر آپ

کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں (یوں) کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ لیکن اسلام جب اپنے حقیقی معنی (شرعی معنی) میں ہوگا تو وہ اسلام ہوگا جو (سورۂ آل عمران کی) اس آیت میں مراد ہے کہ اللہ کے نزدیک (اصل) دین اسلام ہی ہے آخر تک۔

ربط:۔ پہلے باب میں ایمان باللہ کا بیان تھا اب اس باب میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ایمان معتبر کیا ہے؟۔

۲۶ ● حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی عامر بن سعد بن ابی وقاص عن سعد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اعطی رهطا وسعد جالس فترك رسول الله صلی الله علیه وسلم رجلا هو اعجبهم الی فقلت یا رسول الله مالك عن فلان فوالله انی لاراه مؤمنا فقال او مسلما فسکت قلیلا ثم غلبنی ما اعلم منه فعدت لمقالتی فقلت مالك عن فلان فوالله انی لاراه مؤمنا فقال او مسلما فسکت قلیلا ثم غلبنی ما اعلم منه فعدت لمقالتی وعاد رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم قال یا سعد انی لاعطی الرجل وغیره احب الی منه خشیة ان یکبه الله فی النار رواه یونس وصالح ومعمر وابن اخی الزهری عن الزهری ●

ترجمہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا اور سعدؓ بیٹھے ہوئے تھے آپؐ نے ایک شخص (جعیل بن سراقہ) کو چھوڑ دیا (نہ دیا) وہ ان سب میں مجھے زیادہ پسند تھا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے فلاں شخص کو چھوڑ دیا قسم خدا کی میں تو اس کو مؤمن سمجھتا ہوں آپؐ نے فرمایا "یا مسلم؟ پھر تھوڑی دیر میں خاموش رہا پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا میں نے دوبارہ عرض کیا آپ نے فلاں شخص کو کیوں چھوڑ دیا قسم خدا کی میں اس کو مؤمن جانتا ہوں آپؐ نے فرمایا "یا مسلم؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا، میں نے تیسری بار وہی عرض کیا اور آنحضرتؐ نے وہی فرمایا، اس کے بعد یہ فرمایا "اے سعد! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں باوجودیکہ دوسرا شخص کو اس سے اچھا سمجھتا ہوں مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں (وہ گمراہ ہو جائے اور) اللہ اس کو اوندھا دوزخ میں نہ ڈھکیل دے۔ اس حدیث کو یونس اور صالح اور معمر اور زہری کے بھتیجے نے بھی (شعیب کی طرح) زہری سے روایت کیا ہے۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجه البخاری هنا ص۸ وایضاً فی الزکوٰة ص۲۰۰ واخرجه مسلم فی الایمان ص۸۴ والزکوٰة وایضاً ابو داؤد۔

مطابقته للترجمة:۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "مطابقة الحدیث للترجمة ظاهرة وهی ان الاسلام ان لم یکن علی الحقیقة لا یقبل فلذالك قال علیه السلام او مسلما لان فیه النهی عن القطع بالایمان لانه باطن لا یعلمه الا الله والاسلام معلوم بالظاهر"۔

یعنی لأراہ مؤمنا فقال اومسلما سے ترجمۃ الباب سے مناسبت ظاہر ہے کیونکہ حضرت سعدؓ نے قسم کھا کر مؤمن کہا تھا اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ ایمان تصدیق قلبی وانقیاد باطنی کو کہتے ہیں جس کا علم صرف حق تعالیٰ کو ہے کہ یہ انقیاد واسلام حقیقی ہے یا صرف ظاہری؟ ہاں تم ظاہری انقیاد واستسلام سے مسلم کہہ سکتے ہو اور ترجمۃ الباب کا حاصل بھی یہی ہے کہ اسلام کے دو معنی ہیں ایک حقیقی واقعی اور دوسرا استسلام یعنی ظاہری اور صوری، پس مطابقت ظاہر ہے۔

۲ ترجمۃ الباب یہ تھا کہ جب اسلام حقیقت ونفس الامر کے لحاظ سے صحیح نہ ہو تو وہ معتبر فی الآخرۃ یعنی نجات دلانے والا نہیں، تو حدیث سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ ایسا اسلام ایمان سے مغایر ہوگا۔

تشریح اس ترجمۃ الباب سے ایمان واسلام کے درمیان نسبت بیان کرنا اور ایک اعتراض کا جواب دینا مقصود ہے۔

اعتراض اعتراض یہ ہوتا ہے کہ آیت کریمہ قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما لم یدخل الایمان فی قلوبکم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان واسلام میں مغایرت ہے۔

اور دوسری آیت انّ الدین عند اللہ الاسلام سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں متحد ہیں۔

جواب:۔ اسلام کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے، پس اسلام کی صورتِ محضہ ایمان سے مغایر ہے اور روحِ اسلام عین ایمان ہے۔ پس قالت الاعراب الخ میں صورتِ ایمان مراد ہے۔ یعنی جب قلب میں تصدیق نہ ہو بلکہ خوفِ قتل یا کسی طمع کی وجہ سے اظہار انقیاد ہو تو یہ آخرت میں نافع نہیں۔

اور ان الدین عند اللہ الاسلام سے حقیقتِ اسلام مراد ہے یعنی جبکہ قلب میں بھی تصدیق موجود ہو۔

قالت الاعراب کا مصداق اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ منافق تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مؤمن تھے مگر تا حال ایمان ان کے قلوب میں راسخ نہ ہوا تھا۔

حدیث باب میں قول سعدؓ فواللہ انی لأراہ مؤمنا کے جواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد او مسلماً بھی ایمان واسلام میں فرق کا مثبت ہے پس یہاں بھی صورتِ اسلام مراد ہے ورنہ حقیقتِ اسلام ایمان سے مغایر نہیں۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم طریق ادب تعلیم فرما رہے ہیں کہ مغیبات کے متعلق خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قطعی حکم لگانا خلافِ ادب ہے۔ جیسے حضرت عائشہؓ نے ایک بچے کی وفات پر کہا عصفور من عصافیر الجنۃ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تنبیہ فرمائی حالانکہ نفس الامر میں بات صحیح ہے مگر مغیبات میں یوں قطعی حکم لگانا خلافِ ادب ہے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ومن تکلم فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطأ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد او مسلماً سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ اس شخص کے ایمان میں کچھ شبہ

تھا۔ ان کا نام جعیل بن سراقہ الضمری ہے جو جلیل القدر مہاجر صحابی تھے۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقع پر ان کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ چنانچہ حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
و روینا فی مسند محمد بن ھارون الرویانی وغیرہ باسناد صحیح الی ابی سالم الجیشانی عن ابی ذر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ کیف تری جعیلا قال قلت کشکلہ من الناس یعنی من المھاجرین قال کیف تری فلانا قال قلت سید من سادات الناس قال فجعیل خیر من ملأ الارض من فلان۔ (ارشاد القاری)

ایک اشکال اور اس کا جواب

اشکال یہ ہے کہ جب تعیین اور جزم کے ساتھ حکم لگانے پر اول ہی دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا اور اس عنوان کو بدلنے کی تلقین فرمائی تو دوسری اور تیسری مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس پر جرات کیوں کی؟
جواب یہ ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس شخص کے بارے میں اس کی ظاہری حالت شریعت کے مطابق ہونے کی وجہ سے حسن ظن تھا یا اس کی بھلائی اور نیکی کی طرف دل اتنا مشغول تھا جس کی وجہ سے نبی اکرم علیہ السلام کے ارشاد کی طرف پوری توجہ نہ کر سکے۔
گویا حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے اس خیال کے استیلاء کی وجہ سے ایک طرح معذور تھے، ارشادِ نبوی کی طرف پوری توجہ نہ کر سکے مگر یہ الحاح اور صورت منازعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اقتالاً یا سعد؟ سعد اسفارش کرتے ہو یا لڑتے ہو۔

● بابٌ افشاءُ السلامِ

مِنَ الاسلامِ وقال عمّارٌ ثلٰثٌ مَن جَمَعَھُنَّ فقد جمعَ الایمانَ الانصافُ من نفسِک وَبَذلُ السَّلامِ لِلعالَمِ وَالاِنفاقُ مِنَ الاِقتارِ ●

۲۷ ● حدّثنا قتیبۃُ قال حدثنا اللیثُ عن یزیدَ بنِ ابی حبیبٍ عن ابی الخیرِ عن عبدِ اللہِ بنِ عمرٍو انّ رجلا سأل رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایّ الاسلامِ خیرٌ قال تُطعِمُ الطعامَ و تقرءُ السّلامَ علی مَن عرفتَ ومَن لم تعرف ●

بابٌ بالتنوین ای ھذا بابٌ۔ سلام کی اشاعت (سلام کا رواج) اسلام کا ایک شعبہ ہے۔ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین باتیں جس نے جمع کر لیں اس نے ایمان کو مکمل کر لیا۔ اپنے نفس سے انصاف کرنا، سلام کو عالم میں پھیلانا، تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔
ربط: علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں یہ بتایا تھا کہ ان الدین ھو الاسلام اور اسلام کی تکمیل کے لئے کچھ خصائل و اعمال ضروری ہیں، اب اس باب میں ان خصائل کو بیان کیا جا رہا ہے۔
وقال عمار الخ: امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت موقوفاً نقل کی ہے مگر چونکہ غیر مدرک بالقیاس ہے

اس لئے حکماً مرفوع ہی ہے، نیز اس کے شواہد بھی ہیں۔

حضرت عمارؓ فرماتے ہیں کہ تین باتیں (خصلتیں) جس نے جمع کرلیں اس نے ایمان کو مکمل کرلیا۔ الاول الانصاف من نفسک، من ابتدائیہ ہے۔ یعنی اپنے نفس سے انصاف کرنا۔ اپنے دل سے اعمال کا جائزہ لینا خواہ حقوق اللہ سے متعلق ہو یا حقوق العباد سے۔ حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں "اذا انصف العبد بالانصاف لم یترك لمولاه حقا واجبا علیه الا اداه ولم یترك شیئا مما نهاه عنه الا اجتنبه وهذا یجمع ارکان الایمان (فتح)

مطلب یہ ہے کہ تمام مامورات کو ادا کرتا ہو اور تمام منہیات سے بچتا ہو۔ اس صورت میں نفس فاعل ہوگا معنی انصاف کا ای الانصاف الناشی من نفسک۔ مطلب یہ ہے کہ انصاف اس کا طبعی جوہر اور ملکہ بن جائے کسی خوف و طمع، محبت وتعلق اور نام ونمود کے لئے نہ ہو۔

لفظ من بمعنی فی اور بمعنی مع بھی ہو سکتا ہے یعنی اپنے نفس کے معاملے میں انصاف کرنا، یعنی جیسے لوگوں کے معاملے میں انصاف کرتا ہے اسی طرح اگر اپنے نفس کا معاملہ ہو تو اس میں بھی انصاف کرے اگر کسی پر ظلم کیا ہے یا کسی کو تکلیف پہونچائی ہے تو اپنے آپ کو پیش کرے کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو۔

والثانی بذل السلام للعالم یعنی ہر ایک مسلمان کو سلام کرنا اپنا ہو یا بیگانہ۔ جان پہچان ہو یا نہ ہو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے سلام کرے۔ اور مسلمان کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تبدؤا الیهود ولا النصارىٰ بالسلام۔ (ھدایہ)

سلام کے متعلق کچھ مسائل

سلام اس طرح کیا جائے کہ سننے والا اچھی طرح سن لے، مسنون طریقہ یہ ہے کہ بغیر ہاتھ کے اشارہ کے السلام علیکم کہا جائے، اگر اس کے ساتھ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ زیادہ کیا جائے تو دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔

خطوط میں السلام علیکم کی جگہ سلام مسنون لکھنے سے پوری سنت پر عمل نہ ہوگا۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے علیك السلام یا رسول اللہ کہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یہ مردوں کا سلام وتحیہ ہے تم آپس میں السلام علیکم کہا کرو"۔

شارحین نے لکھا ہے کہ اس سے آپ ﷺ نے بہتر اور اکمل طریقہ کی تعلیم دی ہے آپ ﷺ کا یہ مقصد نہیں کہ یہ سلام نہیں ہوگا۔

وعلیکم السلام کہتے وقت ہاتھ کا اشارہ بھی کرسکتے ہیں مگر صرف اشارہ سلام نہیں بن سکتا۔ السلام علیکم کا جواب اسی وقت دیا جائے۔ اگر دیر کے بعد جواب دیا تو ترک جواب کا گنہگار سمجھا جائیگا۔

اگر ملاقات پر السلام علیکم اور وعلیکم السلام ہوگیا اور تھوڑی دیر کے لئے جدا ہوگئے اور پھر مل گئے تو دوبارہ سلام کہنا سنت ہے اور جواب سلام واجب ہے۔ (فضل الباری)

والثالث الانفاق من الاقتار من بمعنی مع یا بمعنی عند یا بمعنی فی ہو تینوں احتمال ہے اِقتار

کے معنی افتقار و احتیاج کے ہیں۔ تنگدستی کے باوجود، یا تنگدستی کی حالت میں یا تنگدستی اور قحط کے زمانہ میں خرچ کرنا کمال ایمان کی دلیل ہے، قال اللہ تعالیٰ: ویؤثرون علیٰ انفسہم ولوکان بہم خصاصۃ۔ ومن یوق شح نفسہ فاولئک ہم المفلحون۔ وقال تعالیٰ: ومن قدر علیہ رزقہ فلینفق مما آتاہ اللہ (سورۂ طلاق) اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے)

حضرت عمارؓ نام عمار بتشدید المیم ہے، کنیت ابو الیقظان (بالظاء المعجمۃ) والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیّہ (بضم السین) ہے۔ حضرت عمارؓ مع اپنے والدین رضی اللہ عنہم قدیم الاسلام ہیں، حضرت عمارؓ اور حضرت صہیب دونوں ایک ہی ساتھ دارِ ارقم میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ (طبقات ابن سعد جلد ثالث)

حضرت عمار بن یاسرؓ کی والدہ محترمہ حضرت سمیہؓ کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں ابوجہل ملعون نے ایسا برچھا مارا کہ وہ شہید ہو گئیں مگر اسلام سے نہ ہٹیں یہ اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ ہیں، حضرت عمار اور ان کے والد کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں، سخت گرم پتھریلی زمین میں لٹائے جاتے، تکلیف کی شدت سے حواس مختل ہو جاتے، ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا، تو آپ نے فرمایا: صبراً آل یاسر فان موعدکم الجنۃ (مجمع)

ایک مرتبہ ظالموں نے آگ میں ڈال دیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی" یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ عمار کما کنتِ علیٰ ابراہیم تقتلک الفئۃ الباغیۃ" (اے آگ عمار پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامت ہو جا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی، اے عمار تم کو باغی گروہ قتل کریگا۔)

وفات:- جنگ صفین میں آپؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اسی صفین میں ۳۷ھ میں شہید ہو گئے اس وقت آپ کی عمر چورانوے برس کی تھی اور وہیں دفن ہوئے۔ حضرت علیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ان سے کل باسٹھ روایتیں مروی ہیں، دو پر شیخین متفق ہیں اور بخاری تین روایت میں منفرد ہیں اور مسلم ایک حدیث میں۔ (عمدہ)

ترجمہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم کھانا کھلاؤ اور متعارف وغیر متعارف ہر ایک کو سلام کرو۔

تعدد الحدیث:- مرّ الحدیث مع مبناہ ورواہ فی الاستیذان ص۹۲۱۔

باقی تشریح کے لئے حدیث ۱۱ ملاحظہ فرمائیے۔

باب ۲۱ کفران العشیر وکفر دون کفر فیہ عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ای ہذا باب فی بیان کفران العشیر الخ یعنی لفظ باب مضاف ہے اپنے مابعد کی طرف الخ

خاوند کی ناشکری کا بیان اور ایک کفر کا مراتب میں ایک دوسرے کفر سے کم ہونے کا بیان، اور اس باب میں

حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔
(و یاتی حدیث ابی سعید موصولا فی کتاب الحیض ص۴۴)

۲۸ ● حدثنا عبد اللہ بن مسلمۃ عن مالک عن زید بن أسلم عن عطاء بن یسار عن ابن عباس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم أُریتُ النار فاذا اکثر اھلھا النساء یکفرن قیل ایکفرن باللہ قال یکفرن العشیر ویکفرن الاحسان لو أحسنت الی إحداھن الدھر ثم رأت منک شیئا قالت ما رأیت منک خیرا قط ●

ترجمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جہنم دکھلائی گئی دیکھا کہ وہاں عورتیں زیادہ ہیں وہ کفر کرتی ہیں. آپؐ سے پوچھا گیا "کیا اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟" آپؐ نے فرمایا (نہیں) شوہر کا کفر کرتی ہیں اور احسان نہیں مانتیں، اگر تو ایک عورت سے ساری عمر احسان کرے پھر وہ ایک ذرا سی کوئی بات تجھ سے دیکھے (جس کو پسند نہ کرتی ہو) تو کہنے لگتی ہے "میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پائی"

ربط ابواب سابقہ میں ایمان کے مختلف درجات کا بیان تھا اب اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان کی ضد اور مقابل کفر کے بھی مختلف درجات ہیں ع

وبضدھا تتبین الاشیاءُ ہر چیز اپنے ضد اور مقابل سے پہچانی جاتی ہے۔

ع۲۔ ربط کی تقریر اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ امام بخاریؒ نے جس طرح ما قبل کے باب میں یہ بتایا تھا کہ اسلام کا لفظ کبھی اسلام حقیقی واقعی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے یعنی اسلام کے شرعی معنی میں۔
اور کبھی صرف استسلام اور ظاہری اطاعت کے معنی میں، لیکن نجات کا دار و مدار اسلام شرعی پر ہے، صرف ظاہری اطاعت اور استسلام پر نہیں ہے۔ اسی طرح اس باب میں بتانا چاہتے ہیں کہ کفر کا اطلاق بھی دو معنوں پر ہوتا ہے کبھی کفر حقیقی شرعی پر اور کبھی کفرانِ نعمت پر لیکن ابد الآباد کیلئے جہنم میں لے جانے والا کفر حقیقی شرعی ہے کفرانِ نعمت نہیں ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ:- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی قولہ "یکفرن العشیر"

تعدد الحدیث:- اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۹ و یاتی فی الصلوۃ ص۱۴۳ ایضا ص۱۰۳ مطولا وایضا فی النکاح ص۷۸۲ تا ص۷۸۳ مطولا۔

تشریح الفاظ کفران العشیر کفران اور کفر دونوں مصدر ہیں از باب نصر جس کے معنی لغت میں کسی چیز کے چھپانے کے آتے ہیں، کافر کو کافر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے اور احسانات کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ رات کو اسی لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ اپنی ظلمت میں چیزوں کو چھپا لیتی ہے، نیز کاشتکار کو بھی باعتبار لغت کافر کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپاتا

ہے۔ اسی کو کسی نے کہا ہے "رأیتُ الکافر یکفر فی کافر" یعنی میں نے ایک کاشتکار کو دیکھا جو رات کو کھیت لوٹتا تھا یعنی زمین میں بیج چھپاتا تھا۔ اسی اعتبار سے کفر نعمت اور کفران نعمت کے معنیٰ شکر ادا نہ کرکے نعمت کو چھپا دینے کے آتے ہیں لیکن کفران کا استعمال اکثر و بیشتر کفران نعمت اور ناشکری کے لئے ہوتا ہے اور کفر کا استعمال کفر حقیقی اور کفران نعمت دونو کے لئے برابر ہوتا ہے۔

عشیر بمعنی معاشر یعنی زندگی کا ساتھی، جس کے ساتھ زندگی بسر کی جائے یہاں مراد زوج ہے۔

کفر دون کفر اس کا عطف ہے کفران پر اسی لئے کفر اول مجرور ہے دون کفر کلام اضافی ہے اور دون منصوب ہے ظرفیت کی بنا پر۔

بعض حضرات نے کفرٌ دون کفر میں کفر اول کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں اعراب حکائی ہوگا اس لئے کہ یہ حضرت عطاء بن ابی رباح کا قول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفر کا لفظ کفر حقیقی کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور کفرانِ نعمت و ناشکری کے معنی میں بھی، یعنی ایک ہے کفر الملۃ اور ایک ہے کفر النعمۃ۔

کفر حقیقی کی وجہ سے انسان خارج عن الایمان والملۃ ہوجاتا ہے اور کفرانِ نعمت سے خارج عن الایمان نہیں ہوتا اسی وجہ سے کفران عشیر کو امام بخاریؒ نے کفر دون کفر سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ کفر باللہ یعنی کفر حقیقی کی چار قسمیں ہیں: کفر انکار، کفر جحود، کفر عناد، کفر نفاق۔ یہ چاروں کفر کفر حقیقی ہیں، کفر الملۃ میں ان کے مرتکب کی مغفرت ہو ہی نہیں سکتی اگر اسی پر خاتمہ ہو۔

۱۔ **کفر انکار**:۔ کہ نہ تو تصدیق قلبی حاصل ہے نہ زبانی، ہر طرح سے خدا کا منکر ہو کما قال تعالیٰ ان الذین کفروا سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لا یؤمنون۔

۲۔ **کفر جحود**:۔ یہ ہے کہ دل میں تو یقین ہے مگر زبان سے اقرار نہ کرے جیسے ابلیس وغیرہ کا کفر۔

۳۔ **کفر عناد**:۔ یہ ہے کہ دل کی معرفت اور زبان سے اقرار دونوں ہوں مگر قبول ایمان بالتوحید نہ کرے چاہے حب جاہ و مال کی بنا پر جیسے ہرقل یا تقلید آباء کی وجہ سے جیسے ابو طالب کا کفر۔

۴۔ **کفر نفاق**:۔ یہ ہے کہ زبان سے اقرار کرے مگر دل سے انکار ہو جیسے منافقین کا کفر۔

دون کے معنیٰ:۔ لفظ دون دو معنی کیلئے آتا ہے کبھی بمعنی غیر اور سویٰ کے اور کبھی بمعنی ادون و اقل۔ لغت میں یہ دوسرا معنی اصل معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ دون کے معنی القاصر من الشیٔ یعنی کم درجہ کی چیز۔ گھٹیا درجہ و کمتر مرتبہ اور یہی راجح ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ: ان اللہ لا یغفر أن یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء بس کفر دون کفر کے معنی یہ ہوئے کہ بڑے کفر سے کم درجہ کا کفر۔ اس سے کفر کے درجات کا تفاوت ثابت ہوا۔

واما الکفر الذی ھو دون ما ذکرنا فالرجل یقر بالوحدانیۃ والنبوۃ بلسانہ ویعتقد

ذٰلك بقلبه لكنه يرتكب الكبائر الخ (عمدۃ) یعنی وہ کفر جو کفر کے مذکورہ اقسام سے کمتر درجہ کا ہے کہ دل میں تصدیق وایمان بھی ہے اور زبان سے اقرار بھی ہے لیکن کبائر معاصی کا مرتکب بھی ہے مثلاً قتل کفران العشیر وغیرہ۔ جیسے حدیث مذکورہ فی الباب اور ترجمۃ الباب میں ہے۔

فیه عن ابی سعید الخ امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اس باب کے ذیل میں وہ روایت بھی ہے جو کتاب الحیض میں آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا "یامعشر النساء تصدقن فانی اریتکن اکثر اهل النار الخ" (دیکھئے بخاری صہ ۴۴)

قیل ایکفرن باللہ الخ اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کفر کا وہ درجہ مراد نہیں جو مخرج عن الاسلام ومانع عن النجاۃ ہے بلکہ اس سے کم درجہ کا کفر ہے جو ایمان کے منافی نہیں۔

اشکال

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے جہنم دکھلائی گئی جس میں اکثریت عورتوں کی تھی اور دوسری حدیث میں ہے کہ جنت میں ہر جنتی کو دو دو عورتیں ملیں گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں زیادہ عورتیں ہونگی۔ حافظ ابن حجرؒ اس کا جواب نہ دے سکے، حضرت شاہ انور کشمیریؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ دو بیویاں حورانِ جنت ہونگی جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: لکل امرئ زوجتان من الحور العین۔

۲۔ ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ ابتداءً جہنم میں عورتیں زیادہ ہوں گی کفرانِ عشیر وغیرہ کی وجہ سے، مگر چونکہ مؤمنہ ہونگی اس لئے سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخل ہوجائیں گی تو پھر جنت میں زیادہ ہونگی۔

۳۔ اگر غور کیا جائے تو بشرائط چار عورتوں سے نکاح کی اجازت میں ایک لطیف اشارہ ہے لڑکیوں کی پیدائش وتعداد زیادہ ہوگی، واللہ اعلم۔ (امداد الباری)

بدون تکرار روایات بخاری کی تعداد

علامہ عینیؒ نے اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے یہاں حدیث ابن عباسؓ کا ایک ٹکڑا بیان کیا ہے، اور دوسری جگہ اسی اسناد سے پوری حدیث نقل کیا ہے، اس تقطیع سے امام بخاریؒ کا مقصد مختلف قسم کے تراجم وعنوانات قائم کرکے فوائد کثیرہ کا استنباط کرنا چاہتے ہیں اور ان کا اس طرح کرنا اس لئے قابلِ اعتراض نہیں کہ وہ اس طرح حدیث میں اختصار کرتے ہیں کہ جس سے معنی میں کوئی خرابی وفساد نہ آئے۔ پھر لکھا کہ اس طرح ٹکڑوں کی وجہ سے بعض شمار کرنے والوں نے کل احادیث صحیح بخاری کی تعداد بدون تکرار کے کم وبیش چار ہزار لکھا ہے ابن صلاح اور امام نووی رحمہما اللہ اور بعد کے لوگوں نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے، حالانکہ پوری تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ بدون تکرار کل احادیث دو ہزار پانچ سو تیرہ ۲۵۱۳ ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۱ صہ ۲۰۱)

۲۲ باب المعاصی من امر الجاهلیة

ولا یکفر صاحبها بارتکابها الا بالشرك لقول النبی صلی

اللہ علیہ وسلم اِنّک امرءٌ فیک جاھلیۃٌ وقولِ اللہ تعالیٰ اِنّ اللہ لایغفر اَن یشرک بہ ویغفر مادون ذٰلک لمن یشاءُ وانْ طائفتٰن من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فسمّاھم المؤمنین●

قولہ باب یجوز فی (لفظ) باب التنوین والاضافۃ الی الجملۃ التی بعدہ لان قولہ المعاصی مبتدأ وقولہ من امر الجاھلیۃ خبرہ. وعلی کل تقدیر تقدیرہ "ھٰذا باب فی بیان ان المعاصی من امور الجاھلیۃ۔ (عمدہ)

یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ تمام معاصی دورِ جاہلیت کی یادگار ہیں تاہم ان کے ارتکاب کرنے والے (گناہ کرنے والے) کو بجز شرک کے کافر نہیں کہا جائیگا اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابوذر رضی اللہ عنہ سے) فرمایا کہ ابھی تمہارے اندر جاہلیت کی خصلت ہے اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ نساء میں) فرمایا کہ اللہ شرک کی مغفرت نہ فرمائیں گے اس کے سوا جس کے گناہوں کو چاہیں گے بخشدیں گے (نیز ارشادِ الٰہی ہے) اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں باہم صلح کرادو۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں (باہم قتال کرنے والوں) کو مسلمان فرمایا۔

ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "وجہ المناسبۃ بین البابین ظاھر الخ" اس لئے کہ باب سابق میں کفرانِ عشیر کا بیان تھا اور کفرانِ عشیر بھی من جملہ معاصی میں سے ہے۔

مقصد ترجمہ اس باب میں دو ترجمے مذکور ہیں مگر مقصود اصلی اول ترجمہ ہے جس سے مرجئہ کی تردید ہو رہی ہے اور یہی مقصود اصلی ہے دوسرے ترجمہ کو دفع دخل مقدر سمجھئے۔

یعنی ترجمۃ الباب کے دو جزء ہیں، پہلا جزء المعاصی من امر الجاھلیۃ یعنی معاصی زمانہ جاہلیت اور دورِ کفر کی چیزیں ہیں، ہر معصیت میں کسی نہ کسی درجہ میں کفر کا زنگ جھلکتا ہے، اشارہ ہے کفر دون کفر کی طرف۔ لہٰذا ان کا مضر ایمان ہونا یقینی اور واضح بات ہے۔

زمانۂ جاہلیت سے مراد زمانہ فترت ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک۔

مطلب یہ ہے کہ ترجمہ میں امرِ جاہلیت سے مراد امورِ کفر ہیں کیونکہ اس زمانے میں کفر ہی کفر تھا، اب اندیشہ تھا کہ اس ترجمہ سے خوارج و معتزلہ طمع خام پکانے کو تیار نہ ہو جائیں اس لئے امامؒ نے اس کے بعد لا یکفر صاحبھا بارتکابھا الا بالشرک فرما کر اس طمع کو رد کر دیا کہ معاصی کفر ہی کا شعبہ ہیں، مگر کفر دون کفر کی وجہ سے سوائے کفر و شرک کے کسی معصیت کی بنا پر کسی کی تکفیر نہیں کیجا سکتی۔

لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ جزءِ اول سے متعلق ہے، اور قول اللہ تعالیٰ ان اللہ لایغفر اَن یشرک بہ الخ جزءِ ثانی کی دلیل ہے۔

قولہ لا یکفر صاحبھا بارتکابھا الا بالشرک اس سے خوارج و معتزلہ کی تردید مقصود ہے کیونکہ وہ

مرتکب کبیرہ کو کافر و مخلد فی النار کہتے ہیں۔

اشکال جملہ معاصی اجزاء کفر ہیں تو ان کے مرتکب کو کافر ہونا چاہئے، جب مبدأ اشتقاق پایا جاتا ہے تو مشتق کا اطلاق ضروری ہے۔

جواب:- علامہ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ "کتاب الصلوٰۃ و احکام تارکہا" میں فرماتے ہیں کہ مبدأ اشتقاق کی موجودگی میں صدق مشتق عرفاً ضروری نہیں، عرف میں حمل مشتق تب ہوتا ہے جبکہ مبدأ اشتقاق کا معتدبہ درجہ پایا جائے اگر مبدأ اشتقاق نہایت ضعیف ہے تو وہاں مشتق کا اطلاق نہ ہوگا. مثلاً علم بمعنی دانستن ہے پس اگر کوئی ایک آدھ بات کا علم رکھتا ہو تو اگرچہ لغۃً وہ بھی عالم ہے مگر عرف میں اسے عالم کہنا صحیح نہیں، اسی طرح دو چار مسائل کو معلوم کرلینے سے فقیہ اور دو چار نسخے حاصل کرلینے سے طبیب نہیں کہلا سکتا۔

اسی طرح اگرچہ ہر معصیت کفر کا جزء ہے مگر جب تک کفر کا معتدبہ درجہ ضروریاتِ دین میں سے کسی امر کا انکار یا علاماتِ مختصہ بالکفر کا ارتکاب) نہ پایا جائے گا اس وقت تک کافر ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے، اس لئے امام بخاریؒ نے لا یکفر صاحبہا الخ فرمایا۔

سوال لیکن اشکال اب بھی باقی ہے کہ قرآن عزیز میں ہے: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون آیت میں تو ایک خاص معصیت پر اطلاق کفر ہے۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس آیت کی تفسیر ہی میں اختلاف ہے، کسی نے کہا کہ یہ آیت اس صورت میں ہے کہ جب کوئی ما انزل اللہ کا انکار کرے، یہود آیتِ رجم کا انکار کرتے تھے اس لئے ان کے متعلق فرمایا گیا ھم الکافرون، جس طرح شیطان صرف ترکِ سجدہ سے کافر نہیں بلکہ اباء و استکبار کی وجہ سے ابیٰ و استکبر وکان من الکافرین۔

کسی نے کہا کہ وہ لوگ ما انزل اللہ کو حلال سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ رجم قاضی کی مصلحت پر موقوف ہے یعنی ما انزل اللہ کے خلاف کو حلال سمجھتے تھے۔

کسی نے کہا یہ آیت یہود کے حق میں ہے مسلمانوں کے حق میں نہیں۔

لیکن اس کا جواب یہ بھی ہے کہ ایک حکم ہے شخصِ معین پر اور ایک حکم ہے وصفِ عنوانی پر، دونوں میں فرق ہے لعنۃ اللہ علی الکافرین کہنا تو درست ہے لیکن کسی خاص پر معین کرکے لعنت بھیجنا درست نہیں جب تک کہ اس کے خاتمہ علی الکفر کا یقین نہ ہو، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہمیں کسی خاص شخص پر لعنت کا حق نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ توبہ کرچکا ہو یا آئندہ توبہ کرلے۔ اور جھوٹوں پر لعنت کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں جو علمِ الٰہی میں جھوٹا ہوگا کہ اس کی موت جھوٹ پر ہوگی اس پر لعنت ہوگی مگر زید پر لعنت ہے اس لئے کہ وہ جھوٹا ہے یہ درست نہیں ہوسکتا ہے وہ توبہ کرچکا ہو یا کرلے، پس ہمیں رحمتِ خداوندی سے بعید ہونے کی بددعاء درست نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے شخص واحد کے متعلق فرمایا لا یکفر صاحبہا الخ اور آیت میں کسی شخص واحد پر

کفر کا حکم نہیں بلکہ ایک خاص وصف کے مرتکبین پر حکم ہے وشتان بینہما۔ (امداد الباری)

۲۹ ● حدثنا عبدُ الرحمٰنِ بنُ المبارَكِ قال حدثنا حمّادُ بنُ زيدٍ قال ثنا ايوبُ ويونسُ عن الحسنِ عن الأحنفِ بن قيسٍ قال ذهبتُ لِانصُرَ هٰذا الرَّجلَ فلقِيَنِي ابوبكرةَ فقال اَينَ تُرِيدُ! قلتُ انصُرُ هٰذا الرَّجلَ قال ارْجِعْ فانّي سمعتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقولُ إذا التقَى المسلمانِ بِسَيْفَيْهِما فالقاتلُ والمقتولُ فى النارِ قلتُ يارسولَ اللّٰه هٰذا القاتلُ فما بالُ المقتولِ قال إنّه كان حريصًا على قتلِ صاحبِهٖ ●

ترجمہ احنف بن قیس سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں (جنگ جمل کے دوران) اس شخص (حضرت علیؓ) کی مدد کے لئے چلا تو (راستے میں) مجھ کو ابو بکرہؓ ملے اور پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا اس شخص (یعنی حضرت علیؓ) کی مدد کرونگا، ابوبکرہؓ نے کہا واپس جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواریں لیکر (آپسیں) بھڑ جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو قاتل ہے (یعنی اس کا دوزخی ہونا ظاہر ہے) مگر مقتول کا کیا قصور ہے؟ (یعنی مقتول کیوں دوزخی ہوگا؟) آپ نے فرمایا وہ بھی اپنے ساتھی (مسلمان بھائی) کے قتل کا خواہشمند تھا۔

مطابقة للترجمة حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے اس طرح ہے کہ ترجمۃ الباب میں تھا مرتکب معصیت کو کافر نہیں کہا جائیگا اور حدیث میں باہم قتال کرنے والوں کو مسلمان کہا گیا حالانکہ گناہ کبیرہ ہے۔ اس سے معتزلہ کا واضح طور پر رد ہو گیا۔

۲۱ بعض نسخوں میں یہ حدیث مؤخر ہے اور اس حدیث پر مستقل علیحدہ ترجمۃ الباب ہے یہاں حضرت معرور والی یعنی حدیث ۳۰ ہے۔ ملاحظہ ہو عمدة، فتح، قسطلانی)

تعدد الحديث:۔ اخرجه البخارى ههنا فى الايمان ص۹ وايضا فى الديات ص۱۰۱۵ وفى الفتن ص۱۰۴۸ تا ص۱۰۴۹۔

تشریح اس حدیث کا تعلق جنگ جمل سے ہے۔ حضرت احنف بن قیسؒ کہتے ہیں کہ جنگ جمل کے موقع پر میں حضرت علیؓ کی اعانت کے ارادہ سے نکلا لیکن حضرت ابوبکرہؓ نے منع کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی اذا التقى المسلمان الخ تو میں رک گیا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ احنف بن قیس کا یہ واقعہ جنگ صفین کے متعلق ہے قطعاً صحیح نہیں ہے، علامہ قسطلانی نے تصریح کی ہے وکان ذلك يوم الجمل۔ (ارشاد الساری ج۱ ص۱۹۹)

حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں وكان الاحنف اراد أن يخرج بقومه الى على بن ابى طالب رضی اللہ عنہ ليقاتل معه يوم الجمل فنهاه ابوبكرة فرجع (فتح ج۱ ص۷۱)

یعنی احنف نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی قوم کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یوم الجمل میں ان کے ساتھ (یعنی حضرت علی رضؓ کی طرف سے) قتال کریں حضرت ابوبکرہؓ نے منع کیا تو احنف واپس ہو گئے۔

حضرت ابوبکرہؓ نے اس وجہ سے منع کیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ ظاہر نہ ہو سکا تھا کہ حق پر کون ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرہ وغیرہ بالکل کنارہ کش اور الگ رہے۔

اور احنف بن قیس بھی حضرت ابوبکرہؓ کے منع کرنے پر جنگ جمل میں شریک نہیں ہوئے لیکن بعد میں جب احنف پر حق واضح ہو گیا اور شرح صدر ہو گیا کہ حضرت علی رضؓ حق پر ہیں تو احنف بن قیس جنگ صفین میں حضرت علی رضؓ کے ساتھ رہے اور حضرت علی رضؓ کی جانب سے لڑے۔

جنگ صفین کا واقعہ احقر نے نصر الباری کتاب المغازی میں بیان کر دیا ہے، دیکھئے نصر الباری کتاب المغازی ص۱۶۵ تا ص۱۶۸ تک۔

احنف بن قیس ان کا نام ضحاک ہے اور کنیت ابوبحر بن قیس ہے۔ وقیل اسمہ صخر۔ اور احنف لقب کے ساتھ مشہور ہیں اور تابعی ہیں، علامہ عینیؒ لکھتے ہیں ادرک زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واسلم فی عہدہ ولم یرہ۔ (عمدہ) یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشرف باسلام ہوئے لیکن ایمان لانے کے بعد زیارت سے محروم رہے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے عہد خلافت میں ۶۷ھ میں کوفہ میں وصال ہوا۔

حضرت ابوبکرہؓ حالات کے لئے دیکھئے نصر الباری کتاب المغازی ص۳۹۵ البتہ سن وفات میں کتابت کی غلطی ہو گئی ہے صحیح یہ ہے کہ ۵۲ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

۳۰ ● حَدَّثَنَا سليمانُ بنُ حَرْبٍ قال حدثنا شعبةُ عن واصِلٍ الأحْدَبِ عن المعرورِ قال لقيتُ اباذرٍّ بالرَّبَذَةِ وعليه حُلَّةٌ وعلى غلامه حُلّة فسألتُه عن ذٰلك فقال إنى سَابَبْتُ رجلاً فعيّرتُه بامّه فقال لى النبىُّ صلى الله عليه وسلم يا أبا ذرٍّ أعَيَّرْتَه بامّه إنّك إمرؤٌ فيك جاهليّةٌ إخوانكم خَوَلُكم جعلهم الله تحتَ أيديكم فمَن كان اخوه تحتَ يدِه فليُطعِمْهُ ممّا يأكل ولْيُلبِسْهُ ممّا يلبسُ ولا تكلّفوهم ما يَغلِبُهم فإن كلّفتموهم فأعينوهم ●

ترجمہ حضرت معرورؒ سے منقول ہے کہ میں نے مقام ربذہ میں حضرت ابوذرؓ سے ملاقات کی وہ ایک جوڑا پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی (ویسا ہی) ایک جوڑا پہنے ہوئے تھا میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا میں نے ایک شخص (یعنی غلام) کو برا بھلا کہا پھر میں نے اسے اس کی ماں کی غیرت دلائی اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ ابوذر! تونے اسے ماں کی عار دلائی ہے بیشک تو وہ آدمی ہے جس میں جاہلیت کی خصلت ہے، تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جنھیں اللہ نے تمہارا ماتحت بنایا ہے پس جس کا بھائی

اس کا ماتحت ہو تو اس کو وہی کھلائے جو آپ کھائے اور وہی پہنائے جو آپ پہنے اور ان سے وہ کام نہ لو جو اُن سے نہ ہو سکے اگر ایسا کام لینا چاہو تو ان کی مدد کرو۔

مطابقۃ للترجمۃ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے " انک امرأ فیک جاھلیۃ الخ " یعنی ترجمۃ الباب حدیث ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔

مقصد بھی واضح ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ کو تنبیہ تو فرمائی لیکن ایمان سے خارج نہیں بتلایا پس مدعا ثابت ہو گیا کہ کسی معصیت پر کافر کہنے کی اجازت نہیں۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۹ ایضا فی العتق ص۳۴۶ و فی کتاب الادب ص۸۹۳ تا ص۸۹۴۔

حضرت ابوذرؓ:۔ مختصر حال گذر چکا ہے دیکھئے نصر الباری کتاب التفسیر ص۵۳۵۔

تشریح ربذۃ (بفتح الراء) ذات عرق کے قریب ایک گاؤں ہے جو مدینہ منورہ سے تین مراحل کے فاصلہ پر ہے اس جگہ فوج رہتی تھی یعنی یہ جگہ فوجی چھاؤنی تھی جہاں ہزاروں گھوڑے رہتے تھے۔

علیہ حلۃ حلۃ ایک ہی نوع کے دو کپڑوں کو کہتے ہیں، ایک تہبند کی جگہ اور دوسرا جسم کے بالائی حصہ پر آج کل کے عرف میں اسے سوٹ کہتے ہیں۔

وعلی غلامہ حلۃ اور ان کا غلام بھی ایک حلّہ (سوٹ) پہنے ہوئے تھا۔

اب احتمال ہے کہ دونوں حلّے ایک قسم کے ایک ہی قیمت کے تھے اس صورت میں حضرت معرور اس مساوات کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور سوال کیا مگر اکثر روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حلہ ایک ہی تھا مگر اس حلہ میں سے ایک کپڑا حضرت ابوذر کے جسم پر تھا اور ایک غلام کے بدن پر اور ایک ایک کپڑا دوسرا کم قیمت کا دونوں کے بدن پر تھا (دامن) بے جوڑ سوٹ پر حضرت معرور کو تعجب ہوا اور دریافت کیا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ اگر آپ غلام کو اپنا ایک کپڑا دیکر دوسرا قیمتی لے لیتے تو آپکا پورا سوٹ یکساں ہو جاتا، جواب دیا کہ پہلے قصہ سن لو!۔ میں نے ایک شخص کو (یعنی حضرت بلالؓ کو) گالی دی تھی اور یوں کہا تھا " یا ابن السوداء " اے کالی عورت کا لڑکا کہدیا تھا تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کردی اس پر حضورؐ نے فرمایا انک امرأ فیک جاھلیۃ (تمہارے اندر جاہلیت کی خصلت موجود ہے۔)

امرأ اس لفظ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا عین کلمہ لام کلمہ کے تابع ہوتا ہے یعنی ہمزہ پر جو حرکت ہو گی وہی راء یعنی عین کلمہ پر بھی ہو گی۔

اخوانکم خولکم بظاہر خولکم اخوانکم ہونا چاہئے تھا مگر اس تقدیم و تاخیر میں اشارہ ہے کہ اخوۃ اصل ہے باعتبار اولاد آدم ہونے کی وجہ سے، اور خادم و تابع، نوکر وغیرہ ہونا امر عارضی ہے لہذا غلاموں (اسی طرح نوکروں اور مزدوروں) کے ساتھ معاملات میں اخوۃ اصلیہ کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

فلیطعمه مما یاکل اس سے کامل مساوات مراد نہیں ورنہ دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائیگا در حقیقت مساوات مقصود ہے چنانچہ مما میں من تبعیضیہ اس پر دال ہے، نیز دوسری حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب تمہارا خادم کھانا پکا کر لائے تو اسے بھی اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھالو اور اگر کسی وجہ سے ساتھ نہ کھلا سکو تو اس کو ایک دو لقمے ہی دیدو او کما قال۔

حضرت ابوذر رضؓ نے اس حدیث سے مساوات کا امر سمجھا، یا مطلب تو صحیح سمجھا کہ مقصود مواساۃ ہے مساوات ضروری نہیں مگر مع ہذا اعلیٰ درجہ پر عمل کرنے کیلئے مساوات برتتے تھے جیسے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غلام کے ساتھ بیت المقدس کے سفر میں اونٹ پر سوار ہونے میں مساوات فرمائی جو ضروری نہ تھی ایک منزل خود سوار ہوتے تھے اور ایک منزل غلام سوار ہوتا جب بیت المقدس کے قریب پہونچے تو غلام کے سوار ہونے کی باری تھی اس نے عرض کیا کہ آپ سوار ہوں مگر آپؓ نے قبول نہ کیا چنانچہ جب بیت المقدس پہونچے تو غلام اونٹ پر سوار تھا، تمام عیسائی علماء غلام پر کتب سابقہ کا نقشہ منطبق کر کے کہنے لگے کہ یہ وہ خلیفہ نہیں جس کا ذکر کتب سابقہ میں ہے، حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے فرمایا امیر المؤمنین اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے ہیں عیسائی کانپ اٹھے کہ جس شخص کے ہاتھ سے روم و فارس فتح ہوا اسکا یہ حال ہے۔

کھاوے کی رگڑ سے آپؓ کی قمیص پھٹ گئی تھی ایک یہودی کو رفو کرنے کے لئے دی اس نے درست کر کے اس کے ساتھ ایک نئی قمیص بھی دیدی، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضؓ نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین یہاں کے لوگ متمول ہیں اس لئے آپ یہ نئی قمیص پہن لیں، آپؓ نے فرمایا "کفیٰ بالایمان زینۃ" لہذا پرانی قمیص ہی لاؤ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔

عیسائیوں نے امتحان کی غرض سے پورا بازار سجا کر عورتوں کو دکانوں پر بٹھادیا اور کہا کہ مسلمان فوج کے سپاہی جو کچھ مانگیں دینے میں چون و چرا نہ کرنا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فوج میں صرف یہ آیت پڑھ دی قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلك ازکیٰ لھم چنانچہ کسی سپاہی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا نصاریٰ نے اقرار کیا کہ ان کا مقابلہ دنیا نہیں کرسکتی۔ (ارشاد القاری)

باب[۲۳] ظلمٌ دون ظلمٍ ص۹

اس بات کا بیان کہ ظلم بعض ظلم سے ادنی ہے۔

اس باب میں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ظلم کے مختلف درجات ہیں، بڑا درجہ کفر و شرک ہے، کما قال تعالیٰ:

والکافرون ھم الظالمون - انّ الشرك لظلم عظیم۔

اور درمیانہ درجہ معاصی کا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: (بعد ذکر احکام النکاح والطلاق والرجعۃ والخلع) ومَن یتعدّ حدود اللہ فقد ظلم نفسہ۔

اور ادنی درجہ خلافِ اولیٰ ہے کما قال تعالیٰ: ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ وقالا

آدم علیہ السلام " ربنا ظلمنا انفسنا " وقال موسیٰ علیہ السلام " رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی "
وقال یونس علیہ السلام " سبحانک انی کنت من الظالمین "

۳۱ ● حدثنا ابو الولید قال حدثنا شعبۃ ح قال وحدثنی بشر قال حدثنا محمد عن شعبۃ عن سلیمان عن ابراھیم عن علقمۃ عن عبد اللہ قال لما نزلت " الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم " قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَیّنا لم یظلم فانزل اللہ اِنَّ الشرک لظلم عظیم ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب آیۂ کریمہ:
الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون۔ (انعام) (پ ۷ رکوع ۱۵)
جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا ان کیلئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔
نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا ہم میں سے کون شخص ہے جس نے کوئی ظلم نہ کیا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے (سورۂ لقمان کی) یہ آیت نازل فرمائی " بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے "

مطابقتہ للترجمہ ترجمۃ الباب ہے " بعض ظلم بعض ظلم سے ادنیٰ و گھٹیا ہے " اور حدیث الباب سے بھی معلوم ہوا کہ ظلم کے مراتب و انواع ہیں، ظلم کا بعض نوع کفر ہے اور بعض کفر سے کمتر و گھٹیا ہے، نیز آیت میں شرک و کفر کو ظلم کا ایک فرد بتایا گیا ہے پس مطابقت ظاہر ہے۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۱۰ وفی کتاب الانبیاء ص۴۷۳ و ص۴۸۵ وفی التفسیر ص۶۶۲ ایضا ص۷۰۳ وفی کتاب استتابۃ المعاندین ص۱۰۲۲ ایضا ص۱۰۲۵ ایضا مسلم ج۱ ص۷۷۔

تشریح لم یلبسوا لبس بفتح اللام از باب ضرب خلط ملط کرنا کہ امتیاز نہ رہے۔ بظلم ظلم کے معنی ہیں وضع الشیٔ فی غیر محلہ۔ یعنی کسی چیز کو بے محل رکھنا۔ پس اس لغوی معنی کے لحاظ سے ہر جرم و گناہ ظلم ہے خواہ بڑا گناہ ہو یا چھوٹا۔

جب سورۂ انعام کی آیت کریمہ " الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون " نازل ہوئی تو چونکہ آیت کریمہ میں بظلم کا لفظ نکرہ ہے اور نفی کے تحت میں ہے اور قاعدہ ہے کہ جب نکرہ تحت النفی واقع ہو تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اس وجہ سے صحابہؓ پر شاق گذرا اور خوفزدہ ہو گئے کہ دنیا میں کوئی شخص بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی بشر معصوم نہیں اور لھم الامن میں لھم کی تقدیم مفید حصر ہے تو آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ امن اور ہدایت صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے اپنے ایمان کو کسی ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا خواہ وہ ظلم بڑا ہو یا چھوٹا یعنی کوئی گناہ نہ کیا ہو، اسی بناء پر صحابہ نے عرض کیا اینا لم یظلم ہم میں سے کون ہے جس سے کوئی گناہ نہ ہوتا ہو؟ تو کیا ہمیں جہنم سے امن نہ ہوگا؟

اس کے جواب میں معلّم الکتاب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الشرک لظلم عظیم یعنی ولم یلبسوا ایمانھم بظلم میں ظلم پر تنوین تعظیم کے لئے ہے لہذا اس سے ظلم کا سب سے بڑا درجہ، اعلیٰ فرد یعنی شرک مراد ہے۔

اب یہ بحث رہ جاتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بظلم کی تنوین کو تعظیم کے لئے قرار دیکر ظلم عظیم سے تفسیر فرمائی ہے اس پر کوئی قرینہ ہے یا نہیں؟ حضرت نانوتوی رحؒ سے منقول ہے کہ خود آیت کریمہ میں قرینہ موجود ہے اور وہ لم یلبسوا ہے جس کے معنی ہیں لم یخلطوا اور یہ معلوم ہے کہ اختلاط وہیں ممکن ہے جہاں دونوں چیزوں کا ظرف ایک ہی ہو، ظاہر ہے کہ چوری، زنا، شراب نوشی اور سینما بینی یہ سارے معاصی اعمال جوارح ہیں اور ایمان کا محل وظرف قلب ہے تو لبس اور اختلاط اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دونوں کا ظرف ومحل ایک ہو جیسے شربت اسی وقت بن سکتا ہے جب پانی میں شکر ملادی جائے اس کے بعد امتیاز باقی نہیں رہتا، تو یہاں اگر جوارح کے اعمال مراد لے جائیں تو اتحاد نہ ہوگا اتحاد تو جب ہوگا کہ ظلم کے وہ معنی ہوں جو ایمان کے محل اور ظرف کا ظلم ہو اور یہ شرک وکفر ہے۔ تو حضور اقدسؐ نے آیت کریمہ کی مراد ظاہر فرمادی یہ مصداق ہے یعلمھم الکتاب کا۔

حضرت شاہ انور کشمیریؒ نے یہ بھی فرمایا کہ بعینہ یہی توجیہ حضرت نانوتویؒ والی علامہ تاج الدین سبکیؒ نے بھی عروس الافراح میں اپنے والد ماجد سے نقل کی ہے۔

زمخشری کا استدلال

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ایمان وشرک آپس میں ضدین ہیں جن کا ایک محل میں اجتماع ناممکن ہے لہذا ظلم سے شرک نہیں مراد لیا جا سکتا ہے بلکہ کبائر مراد ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان کی حالت میں ارتکاب کبائر سے امن من النار نہ ہوگا۔

جواب ۱:- جب معلّم الکتاب صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کی تفسیر شرک سے کردی ہے تو ہمیں کسی قسم کی لب کشائی کی اجازت نہیں۔

۲- اگر ہم زمخشری کی تفسیر قبول کرلیں تو بھی اس پر وہ اعتراض لازم آئیگا جو اس نے ہم پر وارد کیا ہے بایں طور کہ معتزلہ کے یہاں ارتکاب کبیرہ سے ایمان باقی نہیں رہتا لہذا ظلم بمعنی گناہ کبیرہ، اور ایمان آپس میں ضدین ہوئے تو اجتماع ضدین فی محل واحد لازم آئیگا فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

نیز ہم پوچھتے ہیں کہ وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون میں اجتماع ضدین کیسے ہوا؟ زمخشری نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں ایمان سے ایمان شرعی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں، پس ہم بھی ولم یلبسوا ایمانھم بظلم میں یہی کہتے ہیں کہ یہاں ایمان لغوی مراد ہے۔

۳- ہم پوچھتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ کے لئے دخول نار سے امن نہیں یا خلود سے نہیں؟
اگر دخول نار سے امن نہیں تو اسے ہم بھی تسلیم کرتے ہیں اور اگر خلود سے امن نہیں تو یہ غلط ہے کیونکہ آیت کریمہ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء اسے رد کرتی ہے

قولہ فانزل اللہ عزوجل :۔

اشکال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی حالانکہ دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت پہلے نازل ہو چکی تھی ، یہاں صحابہ کرام رضی کے سوال کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی ۔

جواب :۔ کسی موقع کے مطابق کسی آیت کی تلاوت کو انزال سے تعبیر کردیا جاتا ہے اگرچہ اس کا نزول بہت پہلے ہو چکا ہو چنانچہ اگر آج کوئی چوری کرے تو اسے کہا جاتا ہے کہ السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما الخ تمہارے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔

یہ اصول قابل یاد داشت ہے اس سے بہت سے مشکل مقامات حل ہو جاتے ہیں ۔ (ارشاد القاری)

• بابُ علاماتِ المنافق • ۲۴

منافق کی علامتوں کا بیان ۔

۳۲ • حدثنا سلیمانُ ابو الربیعِ قال حدثنا اسماعیلُ بنُ جعفرٍ قال حدثنا نافعُ بنُ مالکِ بنِ ابی عامرٍ ابو سہیلٍ عن ابیہ عن ابی ھریرۃَ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال آیۃُ المنافقِ ثلٰثٌ اِذا حدّث کذَب و اِذا وَعَدَ اَخلفَ و اِذا اؤتُمِنَ خانَ •

۳۳ • حدثنا قبیصۃُ بنُ عُقبۃَ قال حدثنا سفیانُ عن الاعمشِ عن عبدِ اللہِ بنِ مُرّۃَ عن مسروقٍ عن عبدِ اللہِ بن عمروٍ أنّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قال اربعٌ مَن کُنّ فیہ کان منافقًا خالصًا ومَن کانت فیہ خصلۃٌ منھُنّ کانت فیہ خصلۃٌ مِن النفاقِ حتی یَدَعَھا اِذا اؤتُمِنَ خانَ و اِذا حدّثَ کذَبَ و اِذا عاھَدَ غدَرَ و اِذا خاصَمَ فجَرَ تابعہ شعبۃُ عن الاعمشِ •

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے ۔

دوسری حدیث کا ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص میں چار باتیں ہونگی وہ پکا منافق ہوگا اور جس میں ان چار باتوں میں ایک ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ وہ اس سے باز آجائے جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو خلاف

عہد کرے اور جب کسی سے جھگڑے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔ سفیان کی متابعت شعبہ نے اعمش سے روایت کرتے ہیں۔

مطابقتہما للترجمۃ:۔ ہر دو حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے بالکل واضح ہے۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ھنا ص۱۰ وایضا ص۳۶۸ تا ص۳۶۹ ایضا ص۴۸۴ ایضا ص۹۰۰ ومسلم شریف کتاب الایمان ص۵۶۔

ربط ماقبل:۔ ماقبل کے باب میں ظلم کا تذکرہ تھا اور اس باب میں نفاق کا تذکرہ ہے جو مستقل ظلم ہے۔

ع۲ ماقبل کے باب میں یہ بتایا گیا تھا کہ ظلم کے مختلف مراتب ہیں بعض ایسے ہیں جو ملت سے خارج کر دیتے ہیں اور بعض نہیں، اسی طرح اس باب سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ نفاق کے بھی مختلف مراتب ہیں۔

مقصد ترجمہ اس باب سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جیسے ایمان و کفر اور ظلم کے مراتب ہیں اسی طرح کفر کی ایک نوع نفاق کے بھی مختلف مراتب و درجات ہیں، چنانچہ اس کی علامات بتاتے ہیں کہ جسمیں زیادہ علامات ہیں وہ پکا منافق ہے اور جسمیں کم ہیں وہ ناقص، پس معلوم ہوا کہ نفاق کے بھی درجات ہیں۔

اشکال باب کی پہلی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی ہے جس میں منافق کی تین علامتیں بیان کی گئیں۔ اور دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق کی چار علامتیں ہیں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب:۔ عدد اقل اکثر کی نفی نہیں کرتا۔

ع۲:۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تین علامتوں کی اطلاع دی گئی ہو پھر بعد میں چوتھی علامت کی اطلاع دی گئی ہو۔

ع۳:۔ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت نقل کی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علامات المنافق ثلاث الخ (مسلم اول ص۵۶)

اس میں من تبعیضیہ کے لفظ سے مطلب صاف ہو گیا کہ تین میں حصر مقصود نہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دونوں روایتوں کی علامتوں کو جمع کیا جائے تو پانچ علامتیں ہو جاتی ہیں: کذب ۱، خیانت ۲، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فجور۔ ان پانچوں کو تین ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، چنانچہ فجور کذب کے تحت آ سکتا ہے۔ جھگڑے میں آپے سے باہر ہو کر گالی گلوچ پر اتر آنے کو فجور کہتے ہیں۔ نیز وعدہ خلافی اور عہد شکنی میں مصداق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، ایسی صورت میں تین ہی خصلتیں رہ جاتی ہیں اور دونوں روایتوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔

منافق کی تعریف منافق مشتق ہے نفاق سے، دل میں جو کچھ ہو اس کے خلاف ظاہر کرنے کو لغت میں نفاق کہتے ہیں۔ اور شریعت میں ابطان الکفر و اظہار الایمان یعنی دل میں تو کفر ہو لیکن کسی غرض کی وجہ سے اپنی زبان سے اسلام کو ظاہر کرنا۔ یعنی منافق وہ ہے جس کا باطن کافر ہو

اور ظاہر میں مسلمان ہوا ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔
(۱) قول و عمل صحیح ہو یعنی ظاہر میں مسلمان ہو مگر اعتقاد خراب ہو، قرآن و حدیث میں منافق سے یہی قسم مراد ہوتی ہے یعنی منافق اعتقادی یہ منافق کافر بلکہ کافر سے بدتر ہے، کما فی التنزیل العظیم اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔
(۲) اعتقاد صحیح ہو دل سے مسلمان ہو مگر عمل خراب ہو یہ قسم منافق عملی ہے جو ایمان سے خارج نہیں۔
علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: زعم ابن سیدہ انہ الدخول فی الاسلام من وجہ والخروج عنہ من اٰخر مشتق من نافقاء الیربوع۔ (عمدہ ج ۱ ص ۲۱۷) یعنی ابن سیدہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں ایک طرف سے داخل ہونا اور دوسری طرف سے نکل جانا نفاق ہے اور منافق مشتق ہے نافقاء سے۔
نافقاء گوہ کا بل، گوہ جنگلی چوہے کے مانند ایک جانور ہے جس کو عربی میں یربوع اور ضب کہتے ہیں۔ اس گوہ کی عادت ہے کہ وہ اپنے رہنے کی جگہ دو راستہ بناتا ہے ایک راستہ تو کھلا ہوا اور ظاہر ہوتا ہے اس کو قاصعاء کہا جاتا ہے اور دوسرا راستہ جو اس کے مقابلہ میں ہوتا ہے وہ کھلا ہوا اور ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس جگہ کو صرف اندر سے کھود کر کے اتنا نرم کر دیتا ہے کہ ضرورت کے وقت اگر اپنی ایک ٹھوکر مارے تو اس راستے سے آسانی کے ساتھ نکل بھاگے اسی کو نافقاء کہا جاتا ہے۔ جب کوئی شکاری اس کو شکار کرنے آتا ہے تو یہ یربوع قاصعاء سے اندر داخل ہو جاتا ہے اور شکاری یہ سمجھتا ہے کہ یہیں کہیں اندر چھپا بیٹھا ہے وہ اس قاصعاء کا انتظار کرتا ہے پھر کھودتا ہے حالانکہ یہ نافقاء سے بھاگ جاتا ہے۔
منافق کا بھی حال ہے کہ ایک راستہ سے اسلام میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے راستہ سے نکل جاتا ہے، کما فی القرآن الحکیم وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ۔
یا اس وجہ سے کہ جس طرح یربوع (گوہ) ایک راستہ کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے کو چھپاتا ہے اسی طرح منافق اسلام کو تو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے۔
یا اس وجہ سے کہ جس طرح گوہ شکاری کو دھوکہ دیتا ہے اسی طرح منافق مسلمانوں کو دھوکہ دیتا ہے۔

تشریح پہلی حدیث میں منافق کی تین علامتیں بتائی گئی ہیں ۱؎ اذا حدث کذب جب کوئی بات کہے تو جھوٹ یعنی واقعہ کے خلاف کہے۔ مطلب یہ ہے کہ جان بوجھ کر جھوٹ بولے اس لئے کہ سزا اور وعید کے لئے عمد کی قید ہوگی لہذا اگر کوئی شخص اپنی دانست میں صحیح سمجھ کر کہتا ہے اور وہ واقعہ کے خلاف ہے تو اس میں داخل نہیں، نیز جھوٹ کی عادت ہو۔
۲؎ اذا وعد اخلف، جب کوئی وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، مطلب یہ ہے کہ وعدہ کرتے وقت ہی ایفاء وعدہ کا ارادہ نہ ہو لیکن اگر وعدہ کرتے وقت ایفاء وعدہ کا پختہ ارادہ ہو پھر کسی مجبوری یا معذوری کی بنا پر پورا نہ کر سکے تو اس میں داخل نہیں۔

ع۳ اذا اؤتمن خان جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے خواہ مال ومتاع کی امانت ہو یا کسی نے رازکی بات کہی اس کو دوسروں پر ظاہر کر دیا دونوں صورتوں میں خیانت کے اندر داخل ہے جو نفاق کی علامت ہے۔

اشکال اشکال یہ ہے کہ یہ علامتیں بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں تو کیا انہیں بھی منافق قرار دیا جائیگا؟ حالانکہ جمہور علماء اسلام کا فیصلہ ہے کہ ایسا شخص مومن مسلمان ہے پھر حدیث شریف کا مطلب کیا ہوگا؟ اس اشکال کے پیش نظر علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت نے اس حدیث کو مشکل الآثار میں شمار کیا ہے اور اس کے حل وجواب میں متعدد اقوال نکل گئے ہیں۔

ع۱:۔ قرآن حکیم میں منافق کی جو سزا اور وعید ذکر کی گئی ہے وہ عقیدۂ منافق کے متعلق ہے یعنی دل تو کفر سے بھرا ہوا ہے اور صرف ظاہر میں مسلمان بنا ہوا ہے، اور حدیث میں عمل کا نفاق مراد ہے جیسا کہ جھوٹ بولنا وغیرہ۔

ع۲:۔ آیۃ المنافق میں الف لام عہدی ہے جس سے مراد خاص جماعت ہے جو حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں تھے یعنی عبداللہ بن اُبی اور اس کے متبعین۔

ع۳:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد زجر وتوبیخ کے لیے ہے تاکہ مسلمان ان بری خصلتوں سے حتی الامکان پرہیز کریں اور اجتناب کو ضروری سمجھیں۔

ع۴:۔ یہ باب تشبیہ سے ہے یعنی ایسی خصلتوں والا انسان منافق کے مشابہ ہے جیسا کہ تارک صلوٰۃ۔

حسن بصریؒ کا رجوع حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ: مَن کان فیہ ثلاث خصال لم اتحرج أن اقول إنّہ منافق: اذا حدّث کذب الخ یعنی جس میں تین خصلتیں ہوں میں اسے منافق کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، وہ وعدہ کرے تو خلاف کرے، جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

ایک شخص نے حضرت عطاء کے سامنے حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا تو حضرت عطاء نے فرمایا کہ ان سے کہنا کہ عطاء نے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے واقعہ کو یاد کیجئے اور یہ بھی کہ نفاق کا لفظ اسی پر صادق آسکتا ہے جس کے دل میں ایمان نہ رہا ہو کیونکہ خداوند قدوس نے منافقین کے متعلق فرمایا ہے ذٰلک بانّھم آمنوا ثمّ کفروا، پس جس کے دل میں کفر نہ ہو اس کو منافق کیسے کہا جائیگا؟ اس شخص نے حضرت حسنؒ کو حضرت عطاءؒ کا پیغام پہونچایا تو حضرت حسنؒ نے کہا جزاك اللّٰہ خیرا اور اپنی رائے سے رجوع کرلیا پھر حضرت حسن نے اپنے تلامذہ سے کہا اسی طرح اگر کوئی عالم میری بات کو ناصواب قرار دے تو تم مجھے مطلع کر دیا کرو۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ فرمان نبوی جوامع الکلم میں سے ہے کیونکہ انسان میں تین چیزیں ہیں قول، فعل، نیت۔ یہ تینوں درست ہو جائیں تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے؟

اسی طرح عمل کے تین درجے ہیں ایک دل کا فعل، دوسرا زبان کا، تیسرا جوارح کا۔ کذب قول کے فساد پر دال ہے

خیانت فعل کے فساد پر مبنی ہے اور وعدہ خلافی میں نیت کا فساد ہے۔

باب[۲۵] قِیَامُ لَیْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْاِیْمَانِ

شب قدر میں عبادت کرنا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

۳۴ حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب قال حدثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یقم لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص شب قدر میں عبادت کریگا ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

مطابقۃ للترجمۃ:۔ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ " من یقم لیلۃ القدر "

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری صفحہ ۱۰ ایضاً فی الصوم ص۲۵۵ و ایضا ص ۲۷۰۔

ربط ما قبل امام بخاریؒ کا اصل مقصد تو امور ایمانیہ کو بیان کرکے فرق باطلہ مرجئہ، کرامیہ، جہمیہ اور معتزلہ و خوارج کی تردید ہے۔ درمیان میں استطرادی اور ضمنی طور پر چار ابواب کو بیان کیا تھا " لان الاشیاء تعرف باضدادہا "

اب ضمنی ابواب سے فارغ ہو کر اصل مقصد ایمان کے اجزاء اور متعلقات کی طرف رجوع فرماتے ہیں گذشتہ ابواب میں ایمانیات سے متعلق آخری باب " افشاء السلام من الاسلام " تھا جس میں سلام کا تذکرہ تھا اور اس باب میں شب قدر کا تذکرہ ہے جس میں فرشتے سلام کی اشاعت کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ شب قدر میں حضرت جبریل علیہ السلام فرشتوں کے ایک گروہ میں آتے ہیں اور جس شخص کو نماز، تلاوت قرآن اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں اسے سلام کہتے ہیں؛ یعنی ان عابدین و ذاکرین کے حق میں رحمت اور سلامتی کی دعا کرتے ہیں) اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا ہے، کما فی القرآن الکریم:

تنزل الملٰئکۃ والروح فیہا باذن ربہم من کل امر سلام ھی حتی مطلع الفجر۔ (سورۃ القدر)

اس رات میں فرشتے اور روح القدس (جبریلؑ) اپنے پروردگار کے حکم سے امر خیر کو لیکر اترتے ہیں وہ شب قدر طلوع فجر تک رہتی ہے۔

سوال:۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باب افشاء السلام اور قیام لیلۃ القدر میں چار بابوں کا فاصلہ کیوں ہے؟

جواب:۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا نور اللہ مرقدہ سے جواب منقول ہے، امام بخاریؒ نے یہ طریقہ اختیار کرکے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر کی وہ فضیلت جو احادیث میں وارد ہوئی ہے

وہ شب قدر کی کسی خاص آن کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ آئی اور ختم ہوگئی بلکہ وہ پوری شب میں ممتد ہے ۔
دوسرا ربط:۔ گذشتہ باب میں علاماتِ نفاق کا ذکر تھا اور اس باب میں علاماتِ ایمان کا ذکر ہے ۔
قولہ ایمانا و احتسابا ہر عمل وعبادت کے لئے سب سے پہلی شرط ایمان ہے ۔ ایمان کے بغیر کوئی عمل کارآمد نہیں سب بیکار ہوگا، یہی وجہ ہے کہ کفار کے اعمال بیکار ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے :

مثل الذین کفروا بربھم اعمالھم کرماد ن اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لایقدرون مما کسبوا علیٰ شئی ذالک ھو الضلال البعید ۔ (سورۃ ابراھیم)

جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے جیسے کچھ راکھ ہو جس کو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لے جائے اور ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی نفع) ان کو حاصل نہ ہوگا یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے ۔

اس آیت نے یہ امر واضح کردیا کہ کفار کے اعمال چاہے وہ کتنے ہی بھلے معلوم ہوتے ہوں اور مخلوق ان سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ اٹھا چکی ہو مگر یہ راکھ کے ڈھیر کی طرح قیامت میں اڑجائیں گے اور وہ حسرت کرتے رہ جائیں گے ۔ معلوم ہوا کہ بغیر ایمان کے اعمال کا کچھ اعتبار نہیں ۔

دوسری جگہ (سورۂ نور میں) فرمایا :۔

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتیٰ اذا جاءہ لم یجدہ شیئا ووجد اللہ عندہ فوفّٰہ حسابہ واللہ سریع الحساب ۔ (سورۃ نور)

اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا اس کو (دور سے) پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس کو کچھ نہ پایا اور قضاء الٰہی یعنی موت کو پایا سو اللہ تعالیٰ نے اس کا حساب اس کو برابر سرابر چکا دیا اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب ۔

جن کافروں نے سمجھا تھا کہ ہم بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ہزاروں مخلوق کے کام آتے ہیں یہ سب رائیگاں جائیگا؟ انہیں جواب دیا کہ اللہ پر ایمان کے بغیر کوئی عمل قیمتی نہیں، دنیا میں دیکھو باغی کے کسی اچھے عمل کی کوئی قیمت حکومت کی نگاہ میں نہیں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے باغی کا کوئی عمدہ عمل بھی بے وزن ہے ۔

احتساب یہ دوسری قید ہے یعنی قیام کا منشاء ایمان باللہ اور طلب ثواب ہو ۔
عمل صالح اگرچہ ویسے بھی موجب ثواب ہے مگر اس میں ثواب کی نیت کرلینا بھی ایک مستقل عمل ہے جس پر مزید ثواب ملتا ہے ۔ اسی طرح جن اعمال کے کچھ خواص منقول ہیں ان کے ادا کرتے وقت ان کی خاصیت کا تصور اور اس کی تحصیل کی نیت سے ثمرہ جلدی مرتب ہوتا ہے ۔
حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے انفاس العارفین میں ایک قصہ تحریر فرمایا ہے: کہ ایک بزرگ نے طویل مدت تک مجاہدہ کیا، آواز آئی کہ عبادت کس لئے کر رہا ہے ؟ اور کیا چاہتا ہے ؟ ہم دیتے ہیں ۔

جواب دیا کہ میں کچھ نہیں چاہتا، فرمایا تو عبادت کیوں کرتے ہو؟ جواب دیا کہ میرا کام ہی یہی ہے کیوں کہ میں اسی لئے پیدا ہوا ہوں، جیسے گائے کا کام دودھ دینا ہے کہ اس سے کوئی چارہ ہی نہیں۔ جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ جو تو چاہتا ہے وہ بھی دیتے ہیں اور جو نہیں چاہتا وہ بھی دیتے ہیں۔

اگرچہ غلاموں کا تو یہی وظیفہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو وعدہ فرمایا ہے اس کی تحصیل کی نیت بھی قبیح نہیں بلکہ یہ بھی ایک مستقل ثواب ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ایماناً واحتساباً عبادت کرنے والے کو دُو اجر ملتے ہیں۔

قولہٗ غفرلہٗ ماتقدم من ذنبہ اس سے صغائر مراد ہیں اور عفو کبائر مفوض الی اللہ ہے یعنی بدون توبہ بھی معاف ہو سکتے ہیں مگر ضابطہ اور وعدہ نہیں۔

اشکال حدیث باب میں یہ فرمایا کہ لیلۃ القدر کے قیام سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور آگے چل کر باب تطوع قیام رمضان من الایمان کے تحت حدیث ہے من قام رمضان (الحدیث) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا رمضان قیام کرے تب گناہ معاف ہوں گے۔

وجہ تطبیق درحقیقت مقصود تو قیام لیلۃ القدر ہی ہے اور مغفرتِ ذنوب کا وعدہ اسی پر ہے مگر چونکہ لیلۃ القدر متعین نہیں سارے رمضان میں دائر ہے لہذا قیام لیلۃ القدر کا یقینی طور پر حاصل ہونا پورے رمضان کے قیام پر موقوف ہے اس لئے لیلۃ القدر کے ساتھ مَن یَقُم بصیغۂ مضارع فرمایا اور رمضان کے ساتھ مَن قام بصیغۂ ماضی لائے کیونکہ رمضان میں قیام لیلۃ القدر کا حصول متیقن ہے پس دلالت علی التیقن والتحقق کے لئے صیغۂ ماضی لائے بخلاف اس کے کہ صرف لیلۃ القدر میں قیام کرنا چاہے تو چونکہ اس کا یقینی طور پر علم نہیں ہو سکتا اس لئے صیغۂ مضارع سے بیان فرمایا جو دال علی التردد ہے۔

لیلۃ القدر لیلۃ القدر (شب قدر) سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق تقریباً پچاس اقوال ہیں جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئیگی ان شاء اللہ۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر (شب قدر) رمضان شریف میں ہے شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔

حدیث صحیح نے بتایا کہ رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں بالخصوص عشرہ کی طاق راتوں (۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ کی راتوں میں) اس کو تلاش کرنا چاہئے پھر طاق راتوں میں بھی ستائیسویں شب پر گمان غالب ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

لیلۃ القدر کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ ہوگا "قدر کی رات" لفظ قدر متعدد معنی میں مستعمل ہوتا ہے:

(۱) بمعنی تقدیر، اس لحاظ سے اس رات کو لیلۃ القدر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس رات میں منتظمین فرشتوں کو سال بھر کے سارے معاملات کی اطلاع دی جاتی ہے اور ان کے امور مفوضہ کو ان کے حوالہ کیا جاتا ہے کسی کی موت، کسی کی زندگی کسی کا عروج کسی کا زوال اسی طرح رزق کی کمی و زیادتی وغیرہ۔

(۲) عزت وعظمت کے معنی میں، یعنی عزت کی رات، عظمت والی رات۔ لیلۃ القدر خیر من الف شہر ای

رات میں قرآن مجید نازل ہوا انا انزلناہ فی لیلۃ القدر وغیرہ۔ نیز یہ عزت وعظمت عابدین کے بھی متعلق ہو سکتی ہے کہ اس رات میں عبادت کرنے والوں کی عند اللہ بڑی قدر ومنزلت ہے۔

(۳) وہ عبادت جو اس رات میں کی گئی دوسری راتوں کی عبادت کے مقابلہ میں ان کی قدر ومنزلت اور عزت زائد ہے وغیرہ وغیرہ۔

• بَابٌ اَلْجِهَادُ مِنَ الْاِيمَانِ • منا

جہاد ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

۲۵ • حدثنا حَرَمِيُّ بنُ حَفصٍ قال حدثنا عبدُ الواحدِ قال حدثنا عُمارةُ قال حدثنا ابو زُرعةَ بنُ عمرِو بنِ جَرِيرٍ قال سمعتُ اباهريرةؓ عن النبيّ صلى الله عليه وسلم قال اِنتَدَبَ الله عزوجل لِمَن خَرَجَ فی سبیله لایُخرِجُه الاّ اِیمانٌ بی وَتصدیقٌ بِرُسُلی اَنْ اَرجِعَهُ بِما نالَ مِن اَجرٍ اَوْ غَنیمةٍ اَو اُدخِلَه الجنّةَ ولولا اَن اَشُقَّ علی اُمّتی ماقعدتُ خلفَ سَرِیّةٍ وَلَوَدِدتُّ اَنّی اُقتَلُ فی سبیلِ اللهِ ثمّ اُحیی ثمّ اُقتَلُ ثمّ اُحیی ثمّ اُقتَلُ •

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی ذمہ داری لے لی ہے جو اس کے راستہ میں جہاد کے لئے نکلے اور اس کا نکلنا محض اللہ پر ایمان اور اس کے رسول کی تصدیق کی بنا پر ہو کہ میں اس کو اجر وغنیمت دے کر واپس لوٹاؤنگا یا اس کو جنت میں داخل کردونگا (حضور اقدس ؐ نے فرمایا) اور اگر مجھے اپنی امّت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں کسی سریّہ (معرکۂ جہاد) میں جانے سے نہ رُکتا اور میری دلی تمنا ہے کہ اللہ کے راستے شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں۔

ربط ماقبل اس سے پہلے باب میں لیلۃ القدر کا بیان تھا اور ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر کی تلاش میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے مشقت اٹھانی پڑتی ہے نیز اہل وعیال سے علیحدگی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے جہاد میں بھی زندگی کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے اور اہل وعیال سے دور رہنا پڑتا ہے۔ نیز شب قدر کی تلاش میں محنت ومشقت اٹھا کر مجاہدہ کرکے شب قدر کی جستجو کرتے ہیں پھر وہ کبھی میسر آتی ہے کبھی نہیں۔ اسی طرح مجاہد فی سبیل اللہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد ومجاہدہ کرکے شہادت کا طالب ومتمنی ہوتا ہے، پھر کبھی شہادت کا شرف حاصل ہوتا ہے کبھی نہیں، پس دونوں بابوں میں قوی مناسبت ہوگئی۔ الغرض دونوں میں جد وجہد ہے اور دونوں من الایمان ہیں۔

مطابقۃ للترجمۃ: ترجمۃ الباب سے حدیث کی مطابقت من خرج فی سبیلہ الخ۔

تعدد الحدیث: اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۱۰ وایضا فی الجہاد ص۳۹۱ وایضا ص۳۹۲ ایضا ص۴۱۷ ایضا ص۴۲

ایضاً ص۱۰۷۳ ایضاً ص۱۱۱۱ و ص۱۱۱۳ مسلم ثانی ص۱۳۳ ۔

اشکال جہاد کی دو قسمیں ہیں۔ جہاد مع النفس اور جہاد مع الکفار۔ اور ظاہر ہے کہ جہاد مع الکفار میں مشقت زیادہ ہے، زندگی کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے اس لحاظ سے جہاد کو لیلۃ القدر پر مقدم کرنا چاہئے۔

جواب:۔ جہاد مع النفس کا درجہ بلند ہے اس سے انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا تابع بناتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے المجاھد مَن جاھد نفسہٗ یعنی کامل مجاہد وہ شخص ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے کیونکہ انسان کے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے۔ لہٰذا نفس سے جہاد اعلیٰ ہوگا۔ نیز جہاد مع الکفار کا موقع تو کبھی کبھی میسر ہوتا ہے بخلاف نفس کے کہ اس سے ہر وقت جہاد کرنا پڑتا ہے، پھر دشمن سے جہاد وقتال کرتے میں کبھی کبھی انسان کو مزہ بھی آتا ہے اور اپنے نفس سے مجاہدہ میں کوئی لذت نہیں حاصل ہوتی اس لئے جہاد مع النفس اہم ہے جہاد مع الکفار سے، بلکہ جہاد مع النفس موقوف علیہ ہے جہاد مع الکفار کے لئے کیونکہ جب تک اپنے نفس سے جہاد کرکے اپنے نفس کو مرتاض نہ بنالیگا اور اس پر قابو یافتہ نہ ہوگا جہاد کیلئے کمربستہ ہونا ہی دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ اس صورت میں سیکڑوں وساوس وخطرات ذہن میں آویں گے کہ اگر میں شہید ہوگیا تو میرے اہل وعیال، بال بچوں کا کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے جہاد مع النفس کو پہلے بیان کیا تاکہ اس کی وجہ سے تمام وساوس ختم ہوجائیں۔

۲۔ اگر جہاد مع النفس کے بغیر جہاد مع الکفار کریگا تو یا تو مالِ غنیمت کی حرص وطمع میں کریگا یا کسی انتقامی جذبہ کے ماتحت اپنے نفس کا غصہ اتارنے کیلئے یا لونڈی کی لالچ میں یا کسی اور غرضِ فاسد سے جہاد کریگا جو درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ نہ ہوگا اس لئے جہاد مع النفس کو مقدم کیا۔

حل لغات انتدب بکسر الہمزہ وسکون النون وفتح التاء المثناۃ من فوق والدال المہلۃ وفی آخرہ باء۔ یہاں معنی تکفل ہے، جیساکہ کتاب الجہاد ص۴۴۲ میں ہے تکفل اللہ مَن جاھد فی سبیلہ الخ یعنی اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری لے لی ہے، اللہ تعالیٰ اس کا کفیل وضامن ہوجاتا ہے۔

لایخرجہ الا ایمان مرفوع لانہ فاعل یخرجہ۔ وتصدیق برسلی مشہور واکثر نسخہ میں یہاں واو ہی ہے، جیساکہ شروح بخاری عمدۃ القاری، ارشاد الساری وغیرہ میں واو ہی ہے، نیز ہمارے ہندوستانی نسخہ کے حاشیہ پر بھی یہ نسخہ موجود ہے اور واو کی صورت میں کوئی اشکال بھی نہیں کیونکہ ایمان باللہ بھی ضروری ہے اور تصدیق رسول بھی۔ لیکن ہمارے ہندوستانی نسخہ کے متن میں ہے او تصدیق اس صورت میں اشکال وارد ہوگا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کافی ہے حالانکہ اگر کسی شخص کا ایمان صرف اللہ پر ہو اور اس کے رسول پر نہ ہو یا صرف رسول پر ایمان ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ ہو تو اجماعاً اسے نجات نہیں مل سکتی۔

جواب یہ ہے کہ اگر لفظ او کو تخییر یا تسویہ بین الامرین کے لئے لیاجائے تو بے شک اعتراض وارد ہوگا، اور اگر او کو واؤ کے معنی میں لیاجائے تو دوسرے نسخہ کے قرینہ سے کوئی اشکال نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر لفظ او کو شک راوی کے لئے لیاجائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک ہی فرمایا تھا راوی کو صحیح الفاظ یاد نہیں تھے تو روایت بالمعنی

کے طور پر کہا او تصدیق برسلی. اس صورت میں بھی کوئی اشکال نہ ہوگا، کیونکہ ایمان باللہ مستلزم ہے تصدیق بالرسل کو اور تصدیق بالرسل مستلزم ہے ایمان باللہ کو۔

ان ارجعہ بفتح الھمزہ ازضرب رجع یرجع رجعًا لوٹانا. یعنی واپس لوٹاؤنگا۔ اور یہ رجع یرجع رجوعًا لازم بھی مستعمل ہے بمعنی لوٹنا مگر یہاں اول معنی متعدی ہی ہے بعض نسخوں میں بضم الھمزہ بھی آیا ہے۔

من اجر او غنیمۃ یہاں او مانعۃ الخلو کے لئے ہے مانعۃ الجمع مراد نہیں یعنی کم ازکم ایک، یعنی اجر تو ملیگا ہی، ہوسکتا ہے کہ اجر اور غنیمت دونوں ملیں۔

یا او بمعنی واو لیا جائے جیسا کہ مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے من اجر و غنیمۃ الخ.

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اصل عبارت ہے من اجر فقط، او اجر مع غنیمۃ اس میں چونکہ تکرار تھا اس لئے اختصار کے لئے دوسرے اجر کو حذف کردیا گیا۔

او ادخلہ الجنۃ یہاں او انفصال کے لئے ہے کہ یہ دونوں نہ جمع ہوسکتے ہیں اور نہ مرتفع ہوسکتے ہیں، بہرکیف دو باتوں میں سے ایک ضرور ملے گی اگر زندہ واپس لوٹے تو اجر تو ہر حال میں اور اکثر غنیمت بھی، اور اگر شہید ہوگئے تو سیدھے جنت میں بہر حال فائدہ ہی فائدہ ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:۔

قل ھل تربصون بنا الا احدی الحسنیین	تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے ایک کے منتظر رہتے ہو اور
ونحن نتربص بکم ان یصیبکم اللہ بعذاب	ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہاں
من عندہ او بایدینا فتربصوا انا معکم	سے تم پر عذاب نازل کرے یا ہمارے ہاتھوں سے ہم بھی انتظار
متربصون۔ (سورہ توبہ)	کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کررہے ہیں۔

ولولا ان اشق علی امتی الخ اور اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سریّہ کے ساتھ تشریف لے جاتے تو امت پر مختلف مشکلات پڑجاتیں مثلاً (۱) ہر آنیوالے خلیفہ وحاکم پر ہر سریّہ کے ساتھ نکلنا واجب ہوجاتا۔

(سریہ اور غزوہ کی تعریف اور فرق کے لئے نصر الباری کتاب المغازی دیکھئے)

(۲) اگر آپ مدینہ منورہ میں رہکر بعض اہم امور کا انتظام نہ فرماتے تو مؤمنین کے لئے باعث مشقت ہوتا۔

(۳) ایسے معذورین جو جہاد میں شریک نہ ہوسکتے تھے ان کی دل شکنی ہوتی لہٰذا ان کی تالیفِ قلب کے لئے بعض مرتبہ آپ بھی ان کے ساتھ مدینہ منورہ میں قیام فرماتے۔

ولوددت انی اقتل الخ یعنی مجھے جہاد فی سبیل اللہ میں ایسی لذت آتی ہے کہ ایک دو بار نہیں بلکہ جی چاہتا ہے کہ بار بار جان دیتا رہوں۔

اشکال شہید کے اوپر صدیق کا درجہ ہے اور اس کے اوپر نبی کا پس نبی شہید سے افضل بمرتبتین ہوا تو آپ نے شہادت کی تمنا کیوں فرمائی؟

جواب:۔ ۱ اس اظہار تمنا سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد امت کو جہاد کی رغبت اور شہادت کا شوق دلانا ہے۔

ؑ بلاشبہ نبوت ورسالت شہادت سے اعلیٰ اور افضل ہے مگر اس افضل کے رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی بعض وجوہات کی بنا پر مفضول کی خواہش ہوتی ہے جیسے کسی کے سامنے پلاؤ، قورمہ سے بھرے ہوئے برتن رکھے ہیں وہ اس میں سے کھا رہا ہے اور بطور تفنن ذائقہ بدلنے کیلئے اس کو چٹنی کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد کو معزول فرمادیا تو حضرت خالدؓ نے ایک مسرت کا اظہار فرمادیا کہ اب تک لشکر کو لڑواتا تھا اب خود لڑونگا۔ ظاہر ہے کہ جرنیل کا درجہ سپاہی سے کہیں زیادہ ہے لیکن سپاہی بن کر کٹنے میں ایک خاص قسم کا لطف ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ اگر جنت مل گئی تو محض ایک مصلیٰ کی جگہ اللہ تعالیٰ سے طلب کروں گا جس میں عبادت ہی کرتا رہونگا۔ دیکھئے جنت دار التکلیف نہیں مگر لذتِ عبادت کی وجہ سے تمنا فرمارہے ہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسی نے کہا کہ آپ کی قبر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی قبر کے پاس ہو تو کیا ہی اچھا ہے؟ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں تو یہ نہیں چاہتا، میری تمنا یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں۔

• بابٌ تطوُّعُ قیامِ رمضانَ منَ الایمانِ • ص۱۰

رمضان (کی راتوں) میں نفل عبادت بھی ایمان کا جزو ہے۔

۳۶• حدثنا اسمٰعیلُ قال حدثنی مالکٌ عن ابنِ شہابٍ عن حُمَیدِ بنِ عبدِالرحمٰنِ عن ابی ھریرۃَ انَّ رسولَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قالَ مَن قامَ رمضانَ ایماناً وَّ احتساباً غُفِرَ لہٗ ماتقدَّمَ من ذنبہٖ •

ترجمہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رمضان میں (راتوں کو) ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے قیام کرتا ہے (یعنی تراویح کے لئے اللہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے) اس کے گذشتہ گناہ بخشدیئے جاتے ہیں۔

مطابقتہ للترجمۃ:۔ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ "مَن قامَ رمضانَ"

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ھٰنا ص۱۰ وایضاً فی الصوم ص۲۶۹۔

تشریح حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ علماء محدثین نے جو اعمال کو ایمان میں داخل رکھا ہے ان میں دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت کا قول ہے کہ فقط فرائض ایمان میں داخل ہیں، دوسری جماعت فرائض ونوافل وجملہ اعمال کو داخل فرماتے ہیں۔ غالباً امام بخاریؒ نے اس ترجمہ میں لفظ تطوّع زائد فرماکر قول ثانی کے رجحان کیطرف اشارہ فرمادیا۔ واللہ اعلم (الابواب والتراجم)۔

تطوّع قیامِ رمضان سے مراد تراویح ہے جو رمضان المبارک کی راتوں کا مخصوص عمل ہے، اس کے علاوہ تہجد، نوافل، تلاوتِ قرآن وغیرہ سب اپنے اپنے درجہ میں قیام میں شامل ہیں۔

البتہ نوافل کی جماعت خواہ تہجد ہو یا غیر تہجد سوائے تراویح، صلوۃ کسوف و استسقاء کے اگر تین سے زائد مقتدی ہوں تو حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے البتہ دو میں کراہت نہیں۔

باب[۲۸] صوم رمضان احتسابا من الایمان ۔ منا

ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھنا ایمان کا شعبہ ہے۔

۳۷ ● حدثنا ابن سلام قال اخبرنا محمد بن فضیل قال حدثنا یحیی بن سعید عن ابی سلمۃ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ ●

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھیگا اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

مطابقتہ للترجمۃ: - مطابقۃ الحدیث ظاھر فی قولہ "من صام رمضان الخ"

تعدد الحدیث: - اخرجہ البخاری ھنا احد طرف الحدیث منا واخرجہ بتمامہ فی الصوم ص۲۵۵ وایضا ص۲۷۰۔

تشریح حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ رمضان میں روزہ رکھنا ان دو شرطوں (ایمان و احتساب) کے ساتھ مغفرت ذنوب کا ذریعہ ہے۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ خیر و برکت کا مہینہ ہے رحمت الٰہی جوش میں ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان کی پہلی رات سے اعلان شروع ہوجاتا ہے:

یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر۔ (مشکوٰۃ) اے خیر کے طلبگار (نیکی اور ثواب کے طالب) آگے بڑھ (اور رحمت سے بھرپور فائدہ حاصل کر) اور بدی کے چاہنے والے رُک جا (یعنی شر و برائی بالکل چھوڑ دے تاکہ خسارہ سے بچ جائے)۔

ایک حدیث میں ہے: رغم انف رجل دخل علیہ رمضان ثم انسلخ قبل ان یغفر لہ" (یعنی خاک آلود ہو اس شخص کی ناک کہ جس پر رمضان آیا پھر وہ ختم ہوگیا اس سے پیشتر کہ اس شخص کی بخشش کی جائے)

اور اس سے سخت وعید اس حدیث میں ہے جو کعب بن عجرہؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ممبر کے قریب ہوجاؤ، ہملوگ قریب ہوگئے تو آپؐ ممبر پر چڑھے، جوں ہی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا فرمایا "آمین" پھر دوسرے زینہ پر قدم رکھا تو فرمایا "آمین" اسی طرح تیسری سیڑھی پر بھی قدم رکھتے ہوئے آپؐ نے فرمایا "آمین"۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ آج یہ نئی بات دیکھی گئی؟ فرمایا ہاں ہوا یہ کہ اس وقت جبریل امین میرے سامنے آئے تھے جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی میں نے کہا آمین، پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو جبریل نے کہا، ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا آمین"

جب میں تیسرے درجہ پر پہونچا تو جبرئیلؑ نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پائے اور وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائے میں نے کہا آمین ۔

اللہ کے محبوب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی راتوں کے قیام اور دن کے روزے کو مغفرت کا ذریعہ قرار دیا اور امام بخاریؒ نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق انہیں ایمان میں داخل بتایا۔

اشکال یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ صوم رمضان فرض ہے اور قیام رمضان یعنی تراویح سنت۔ تو لحاظ ترتیب صوم رمضان کو قیام پر مقدم ہونا چاہئے تھا ترتیب میں تطوع کی تقدیم فرض پر کس وجہ سے ہوئی ہے؟

جواب ۱ :۔ رمضان المبارک کے اعمال میں سب سے پہلا عمل قیام رمضان کا ہے کہ چاند دیکھتے ہی شروع ہوجاتا ہے کیونکہ شریعت میں رات پہلے ہوتی ہے اور دن بعد میں۔ تو چاند دیکھنے کے بعد پہلے رات ہی کو قیام رمضان کا عمل یعنی تراویح پڑھی جاتی ہے اور روزہ دن کو رکھا جائیگا۔

۲ :۔ تطوع قیام رمضان تمہید ہے صیام رمضان کی، اور یہ قاعدہ ہے کہ تمہید کو اصل سے مقدم رکھا جاتا ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنے اس ترتیب سے شاید اشارہ کیا ہے کہ فریضہ میں سنت کے راستہ سے داخل ہونا چاہئے کیونکہ مقبولیت کا راستہ یہی ہے۔

باب ۲۹ الدین یسر ۔ صنا

دین اسلام آسان ہے۔

● قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم احبُّ الدین الی اللّٰہِ الحَنِیفِیَّۃُ السَّمْحَۃُ ●

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب و پسند وہ دین برحق ہے جو سیدھا اور آسان ہے۔

۳۸ ● حدثنا عبدُ السّلامِ بنُ مُطَهَّرٍ قال نا عمرُ بنُ عَلِیٍّ عن معنِ بنِ محمّدٍ الغِفاریِّ عن سعیدِ بنِ ابی سعیدٍ نِ المَقْبُرِیِّ عن ابی ھریرۃؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اِنَّ الدّینَ یُسْرٌ وَلَنْ یُّشَادَّ الدِّینَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَاَبْشِرُوا وَاسْتَعِینُوا بِالْغُدْوَۃِ وَالرَّوْحَۃِ وَشَیْءٍ مِّنَ الدُّلْجَۃِ ●

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ دین اسلام آسان ہے اور دین میں جو بھی تشدد اختیار کریگا دین اس پر غالب آجائیگا اس لئے میانہ روی اختیار کرو اور قریب قریب رہو اور رحمت الٰہی کی امید سے خوش رہو اور صبح و شام اور آخر شب کے اوقات نشاط سے (اپنے اعمال کے لئے) مدد حاصل کرو۔

مطابقۃ للترجمۃ: مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاهرۃ فی قولہ ان الدین یسر ۔

تعدد الحدیث: اخرجہ البخاری ھنا ص۱۰ ایضا اخرجہ مع شئی من النقص والزیادۃ ص۹۵۷ ۔

اشکال: اس باب کا ماقبل اور مابعد کے ساتھ بظاہر کوئی ربط نہیں۔

جواب: باب سابق میں صوم رمضان کا ذکر تھا اور قرآن مجید میں حکم صوم کے بعد ارشاد الٰہی ہے: یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں۔

اسی مناسبت سے مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ بھی باب صوم رمضان کے بعد الدین یسر کا باب لائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ قرآن مجید کے کتنے ماہر حافظ ہیں، جب امام بخاریؒ نے صیام کا باب باندھا تو فوراً قرآن حکیم کیطرف منتقل ہو گئے، ارشاد الٰہی ہے:-

شهر رمضان الذی انزل فیہ القرآن هدی للناس و بینات من الهدیٰ والفرقان فمن شهد منکم الشهر فلیصمہ ومن کان مریضا او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ الآیۃ (سیقول)

الدین یسر الف لام عہد کا ہے، مراد دین اسلام ہے اور یسر کا حمل الدین پر ذو یسر کی تاویل سے ہے یا از قبیل زید عدل ہے یعنی دین غایت یُسر کی وجہ سے خود یسر ہو گیا۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصد خوارج و معتزلہ کی تردید ہے، اس لئے کہ ان لوگوں نے دین کو اتنا سخت بنا دیا کہ اگر ایک وقت کی نماز چھوڑ دیا تو کافر ہو گیا یا ایمان سے خارج ہو گیا، اگر کوئی گناہ کبیرہ ہو گیا تو کافر ہو گیا، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ دین اتنا سخت نہیں جتنا بنا رکھا ہے بلکہ دین آسان ہے۔

ع۲: اس سے قبل مسلسل چار ابواب کے ذکر کردہ اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں بڑی مشقت ہے۔ لیلۃ القدر کا قیام، پھر جہاد مع الکفار، رمضان کا روزہ اور تراویح سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین میں نہایت مجاہدہ و مشقت مطلوب ہے۔ اب امام بخاریؒ بتلانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ مجاہدہ و مشقت مطلوب ہے لیکن اتنا ہی کہ پابندی اور مداومت ہو سکے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ہے احب الدین الی اللّٰہ ما داوم علیہ صاحبہ (بخاری ص۱۱)

خلاصہ یہ کہ بقدر تحمل مقصود ہے اور تمام اعمال میں اعتدال مطلوب ہے۔

الدین یسر دین اسلام آسان ہے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ دین اسلام ادیان سابقہ کے لحاظ سے بہت آسان ہے یعنی امم سابقہ پر جو سخت احکام تھے ان میں سخت مشقتیں تھیں وہ اس امت سے مرتفع ہو گئیں، کما قال اللہ تعالیٰ: ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم (سورۃ اعراف) یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات مذکورہ فی التورات والانجیل میں یہ بھی ہے کہ بنی اسرائیل پر جو بوجھ اور گلے کے پھندے تھے اسے اتار دیں گے یعنی سختیاں اٹھا دیں گے، جیسے کبیرہ گناہ سے توبہ میں اپنے کو قتل کر دینا اور اس امت میں توبہ دل کی شرمندگی کے ساتھ

اس سے احتراز کا عزم و عہد ہے ۔ کپڑے پر اگر نجاست لگ گئی تو اس حصے کو کاٹے یا جلائے بغیر پاک ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔ اور ہمارے یہاں کیسی ہی نجاست ہو تین مرتبہ دھونے سے پاک ہو جائیگا ، اسی طرح زکوٰۃ میں مال کا چوتھائی حصہ نکالنا پڑتا تھا اور ہمارے یہاں چالیسواں حصہ ، اسی طرح امم سابقہ میں اموال غنیمت حلال نہ تھا اس امت کے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا ، اہل کتاب کی نمازیں صرف ان کے معابد میں ہو سکتی تھیں اور ہمارے یہاں وقت ہونے پر جہاں بھی پڑھ لیں ادا ہو جائیگی وغیرہ ۔

۲ اور اگر بحسب نفس الامر دیکھا جائے تو بھی دین اسلام بہت آسان ہے ۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کے جتنے احسانات ہیں غیر متناہی ہیں " اِن تعدّوا نعمۃ اللّٰہ لا تحصوھا " ماں کے پیٹ سے آدمی کے اوپر احسانات و انعامات کی بارش برسنی شروع ہو جاتی ہے لیکن باری تعالیٰ کا فضل و کرم دیکھئے کہ پندرہ برس تک غیر مکلف رکھا جاتا ہے اس کے بعد بھی شب و روز میں فقط پانچ وقت نمازوں کی تکلیف دی جاتی ہے ، پورے سال میں محض ایک مہینے کے روزے فرض کئے جاتے ہیں ، پوری زندگی میں صرف ایک حج فرض قرار دیا جاتا ہے ، غرض احسانات خداوندی پر اگر غور کیا جائے تو :-

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو ؛ عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

احبّ الدین الی اللّٰہ الحنیفیۃ السمحۃ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب دین دین حنیف ہے جو آسان ہے ۔

حنیف کے معنی ہیں ادیان باطلہ کو چھوڑ کر دین حق اختیار کرنے والا ۔ جیسا کہ شیخ فرید الدین عطار نے اپنے رسالہ " منطق الطیر " میں اشارہ کیا ہے ۔

از یکے گو واز ہمہ یک سو باش ؛ یک دل و یک قبلہ و یک روی باش

حنیف اصل میں لقب ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ، یوں تو تمام انبیاء کرام علیہم السلام حنیف ہیں وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین حنفاء ۔ (سورۃ البینۃ)

ان لوگوں کو بھی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں بالکل یکسو ہو کر الملل والنحل کے اندر ہے کہ حنیف کا لفظ صابی کے مقابلہ میں ہے ، حنیف معترف نبوت ہے اور صابی منکر نبوت ہے اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت صابئین کی جانب ہوئی ، ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اعمال کے ذریعہ ستاروں کو مسخر کیا جا سکتا ہے اس لئے اس صفت حنیفیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اصل ہوئے چونکہ یہ لوگ ستاروں کی پرستش کرتے تھے ان کی اصلاح کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے ۔

لن یشادّ الدین احد (بتشدید الدال فعل معروف ہے از باب مفاعلت اصل میں یُشادِدُ تھا قاعدہ کے مطابق ادغام کیا گیا یعنی ایک دوسرے پر غالب آنے کیلئے زور آزمائی کرنا ۔

یعنی دین سے زور آزمائی نہیں کریگا کوئی شخص مگر دین اس پر غالب آجائیگا

مشادۃ فی الدین کا مطلب یہ ہے کہ دین کے اعمال دو قسم کے ہیں۔ ایک عزیمت اور دوسرے رخصت۔ عزیمت وہ عمل ہے جو اصالۃً واجب ہے یعنی شارع کی جانب سے بلا لحاظ اعذار مقرر کیا گیا ہو، اور جس عمل کے اندر اعذار عباد کا لحاظ ہے وہ رخصت ہے۔ یہ دونوں چیزیں دین میں داخل ہیں پس عبدیت کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ موقع ومحل کے لحاظ سے دونوں پر عمل ہو، لیکن اگر کوئی شخص اپنے دل میں ارادہ کرلے کہ ہر حال میں عزیمت ہی پر عمل کرونگا اور رخصت پر کبھی عمل نہ کرونگا تو تجربہ شاہد ہے کہ انسان بہت سے حالات میں اس پر کامیاب نہیں ہوتا، صرف عزیمتوں پر عمل کرنا اور شرعی رخصتوں سے فائدہ نہ اٹھانا بھی شدت ومشادہ ہے، ہم بندے ہیں تو بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ شریعت کی جانب سے جو حکم بھی جس حال میں آئے ہم اس پر عمل کریں، عزیمت کی حالت میں عزیمت پر اور رخصت کے موقع پر رخصت سے فائدہ اٹھائیں۔ صرف عزیمت پر عمل کرنیکا عزم حقیقت میں شان بندگی کے خلاف ہے اور اپنے کو بہت اونچا سمجھنا ہے جو کسی طرح درست نہیں، مثلاً مریض کیلئے اللہ تعالیٰ نے رخصت یعنی اجازت دی ہے کہ نماز میں اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے، عذر کی حالت میں بجائے وضو کے تیمم کرلے، شرعی سفر میں روزہ توڑنے کی رخصت ہے۔ وغیرہ۔

لیکن شیطان کے فریب میں آکر ان رخصتوں پر عمل نہیں کرتا اور بجائے تیمم کے وضو کرکے بیماری بڑھالیتا ہے سفر میں تکلیف شدید کے باوجود روزہ نہیں توڑتا ہے جس سے انتہائی پریشانی اٹھاتا ہے، ارشاد نبوی ہے "لیس من البر الصیام فی السفر"

نیز یہ بھی تجربہ ہے کہ انسان جب عزیمت پر عمل کو لازم کرلیتا ہے تو بسا اوقات اکتا کر اصل چیز کو بھی چھوڑ دیتا ہے بعض لوگ رات بھر شب بیداری کرتے ہیں پھر آخر میں نیند کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ فجر کی جماعت یا نماز ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ صبح کی نماز جماعت سے پڑھنا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ ساری رات عبادت کروں اور صبح کی نماز رہ جائے۔

اسی طرح ہر موقع پر رخصت کے متلاشی بننے سے دین کی عظمت ہی ختم ہوجائیگی، مثلاً اگر کوئی انسان اپنی سہولت کے لئے ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے ہر مسئلہ کی رخصتیں اختیار کرکے اس پر عمل شروع کردے تو وہ دین کیا ہوگا خواہشات نفسانی کا مجموعہ اور بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائیگا۔

فسددوا میانہ روی اختیار کرو، بلند پروازی نہ کرو خیر الامور اوساطہا۔

وقاربوا اگر مکمل طور پر اعتدال ومیانہ روی نہ اختیار کرسکو تو اس کے قریب قریب رہو۔ قاربوا کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے مل کر رہو، باہم اختلاف نہ کرو۔

وابشروا بقطع الهمزة من الابشار ای ابشروا بالثواب علی العمل وان قل (عمدۃ) یعنی اجر وثواب کی بشارت حاصل کرو اگرچہ عمل کم ہو، مداومت وپابندی کے ساتھ تھوڑے عمل میں بھی بشارت ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ایک قطرہ جو مسلسل مدتوں تک پتھر پر گرتا رہیگا تو اس میں سوراخ کر دیگا لیکن اتنا ہی پانی ایکدم گرادیا جائے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا اسی طرح مداومتِ ذکر قلب کو چھید دیتی ہے۔
حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ شریعت نے تقلیل عبادت کا حکم تکثیر کیلئے دیا ہے یعنی جو قلیل کریگا اور پابندی سے کرتا رہیگا تو وہ بہت ہو جائیگا اور جب ایکدم بہت سا کرلیا تو عمر بھر پابندی تو نہ کرسکیگا تھک کر چھوڑ دیگا، جو دکاندار کم نفع لیتا ہے وہ زیادہ بیچ لیتا ہے اس لئے نفع بھی زیادہ کما لیتا ہے اور جو دکاندار زیادہ نفع لیتا ہے وہ قائم نہیں رہتا اس لئے بالآخر نفع میں کمی ہو جاتی ہے بس یہی معاملہ عبادت میں بھی ہے اس کو اتنا پکڑو کہ نباہ سکو۔

واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشئی من الدلجۃ اور صبح وشام اور آخر شب کے اوقات سے (اپنی طاعت وعبادت اور دوسرے کاموں میں) مدد حاصل کرو۔ غدوۃ شروع دن میں چلنے کو اور روحۃ بعد زوال چلنے کو اور دلجۃ رات کے آخری حصہ کے سفر کو کہتے ہیں۔ پھر تینوں الفاظ کنایہ ہیں اوقات نشاط سے۔ ہم سب چونکہ اس دنیا میں مسافر ہیں اور ہمارا آخرت کی جانب سفر چالو ہے ہر منٹ آخرت کے قریب ہوتے جاتے ہیں ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی ✤ گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

یہ جملے اگر انسان مضبوطی سے پکڑلے تو ولی بن سکتا ہے، یہ تین اوقات آدمی کے لئے کافی ہیں جبکہ وہ پابندی سے لگا رہے۔

شئی من الدلجۃ اندھیری رات کا تھوڑا سا حصہ محنت ومشقت برداشت کیجائے، یہ حقیقت ہے کہ علم دین ہو یا علم طریقت بغیر شب بیداری کمال پیدا نہیں ہوگا۔

ع من طلب العلیٰ سہر اللیالی

• بابُ الصَّلٰوۃُ من الایمانِ • ص۱۰

اس بات کا بیان کہ نماز ایمان کامل کا ایک شعبہ ہے۔

• وقول اللہ تعالیٰ "وما کان اللہ لیضیع ایمانکم، یعنی صلوٰتکم عند البیت" •
اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورہ بقرہ میں) اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں جو تمہارا ایمان ضائع کردے۔
یعنی بیت اللہ کے پاس جو تم نے نماز پڑھی بیت المقدس کی طرف منہ کرکے۔

۳۹ • حدثنا عمرو بن خالدٍ قال نا زُهَيْرٌ قال نا ابو اسحٰق عن البراءِ انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اوّلَ ما قدِمَ المدینۃَ نزلِ علیٰ اجدادہ او قال اخوالہ من الانصار وانّہ صلی قِبَلَ بیتِ المقدسِ ستۃَ عشرَ شھراً او سبعۃَ عشرَ شھراً وکان یُعجبُہ ان تکون قبلتُہ قبلَ البیتِ وانّہ صلی اوّلَ صلوٰۃٍ صلّاھا

صلوٰۃ العصر، وصلّی معه قومٌ فخرجَ رجلٌ مِمّن صَلّی معه فمرّ علیٰ اھلِ مسجدٍ وھم راکعون فقال اشھد باللہ لقد صلیتُ مع رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قِبَلَ مکّۃَ فداروا کماھم قِبَلَ البیتِ وکانت الیھودُ قد اعجَبَھم اِذا کان یُصَلّی قِبَلَ بیتِ المقدسِ واھلُ الکتٰبِ فلمّا ولّی وجھَہٗ قِبَلَ البیت انکروا ذٰلک قال زُھیرٌ حدثنا ابواسحٰق عن البراءِ فی حدیثہٖ ھٰذا اَنّہٗ ماتَ علی القبلۃِ قَبْلَ اَن تُحَوَّلَ رجالٌ وقُتِلوا فلم ندرِ ما نقولُ فیھم فانزلَ اللہ تعالیٰ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ●

ترجمہ حضرت براء (ابن عازب) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے انصار میں اپنے ننھیال یا ماموں میں اترے اور آپ سولہ یا سترہ مہینے تک (مدینہ میں) بیت المقدس کی طرف (منہ کرکے) نماز پڑھتے رہے اور آپ طبعاً یہ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ کی طرف ہوجائے اور پہلی نماز جو آپ نے (کعبہ کی طرف) پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور آپ کے ساتھ ایک جماعت نے نماز ادا فرمائی ان میں سے ایک شخص (عباد بن نہیک) جو آپ کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا ایک اور مسجد والوں کی طرف سے گذرا اور وہ لوگ رکوع میں تھے (بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے) اس شخص نے کہا میں اللہ کی قسم کھاکر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے (ابھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھی، یہ سنتے ہی وہ لوگ نماز ہی میں کعبہ کی طرف پھر گئے اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے تو یہودی اور دوسرے اہل کتاب (نصاریٰ) خوش ہوتے تھے، جب آپ نے اپنا منہ کعبہ کی طرف کرلیا تو انہوں نے اس امر کو برا مانا۔ زہیر نے کہا کہ ہم سے ابواسحٰق نے بیان کیا انہوں نے براء سے اسی حدیث میں کہ قبلہ بدل جانے سے پہلے کچھ لوگ وفات پاچکے تھے جو (اگلے) قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھتے تھے اور کچھ شہید ہوگئے تھے، ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے متعلق کیا کہیں تب اللہ تعالے نے یہ آیت اتاری "اللہ ایسا نہیں ہے جو تمہارا ایمان (یعنی تمہاری نماز) اکارت کردے"۔

مطابقۃ للترجمۃ ترجمۃ الباب کے دو جزو ہیں۔ ۱۔ الصلوٰۃ من الایمان۔ ۲۔ وقول اللہ تعالیٰ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم یعنی صلوٰتکم عند البیت۔

حدیث پاک کی مطابقت دوسرے ترجمہ یعنی آیت کریمہ سے تو بالکل واضح ہے کہ آیت کریمہ میں ایمان کا اطلاق صلوٰۃ پر کیا گیا ہے جیسا کہ خود امام بخاریؒ نے ایمانکم کی تفسیر کردی ہے یعنی صلوٰتکم عند البیت سے اور یہ اطلاق یعنی نماز پر ایمان کا اطلاق اطلاق الکل علی الجزء کے قبیل سے ہے۔ (عمدۃ)

اور چونکہ حدیث شریف میں بھی نماز ہی کا ذکر و بیان ہے اس لئے مطابقت ظاہر ہے۔

تعدد الحدیث: ۔ اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۱۱ وفی الصلوٰۃ ص۵۷ وفی کتاب التفسیر ص۶۴۴ وایضا ص۶۴۵ وفی اخبار الآحاد ص۱۰۷۷۔

ربط:- باب سابق میں الدین یسر (دین آسان ہے) فرمایا گیا تھا اب اس باب میں دین کے آسان ہونے کی ایک مثال پیش کی ہے، اگر دین کی آسانی دیکھنا ہو تو دین کے ستون نماز کو دیکھو جس کے متعلق ارشاد نبوی ہے الصلوٰۃ عماد الدین، اور جسے ایمان و کفر کے درمیان حد فاصل قرار دیا گیا ہے، کما فی الحدیث المفرق بین الایمان والکفر ترک الصلوٰۃ او کما قال علیہ السلام۔

اس اہم اور عظیم ترین عبادت کو دیکھو کہ اس میں کتنی آسانی ہے کہ چوبیس گھنٹے میں صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہے جو گھنٹہ سوا گھنٹہ کا عمل ہے۔ پھر اس میں بھی سفر و مرض میں سہولتیں دی گئی ہیں، نیز پانی پر قدرت ہو تو وضو کرو ورنہ تیمم کافی ہے الغرض آسانی ہی آسانی ہے۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصود مرجئہ و جہمیہ وغیرہ کی تردید ہے جو عمل کو تکمیل ایمان میں بھی دخیل نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ایمان بسیط ہے، اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ دیکھو آیت کریمہ ما کان اللہ لیضیع ایمانکم میں صلوٰۃ کو ایمان کہا گیا ہے، یعنی آیت میں ایمان سے مراد نماز ہے اور شان نزول بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ تو نماز پر ایمان کا اطلاق اطلاق الکل علی الجزء ہے لہٰذا جزئیت صلوٰۃ للایمان ثابت ہوگئی۔

قولہ عند البیت البیت جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ مراد ہوتا ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ: وما کان صلوتھم عند البیت الا مکاء وتصدیۃ۔ (الانفال) اور ان کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور تالیاں۔ الآیۃ۔ (پ ۹ ع ۱۸)

اشکال اشکال یہ ہے کہ صحابہ کو جو کچھ تردد تھا وہ بیت المقدس کی طرف پڑھی ہوئی نمازوں میں تھا بیت اللہ کی طرف پڑھی ہوئی نمازوں میں نہیں تھا

اب سوال یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے آیت کریمہ کی تفسیر عند البیت سے کیوں کی؟ اور اگر عند البیت سے بیت المقدس مراد لی جائے تو یہ خلاف متبادر ہے۔

حافظ عسقلانی نے ابوداؤد طیالسی اور نسائی سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں لیضیع ایمانکم کی تفسیر صلوٰتکم الی بیت المقدس کی تصریح ہے اس پر کوئی اشکال نہیں۔

جواب ۱:- بعض لوگوں نے صاف کہدیا کہ اصل میں لغیر البیت تھا کاتب نے عند البیت لکھدیا، اس صورت میں عبارت تو درست ہوگئی مگر مشکل یہ ہے کہ بخاری شریف کے تمام نسخوں میں لفظ عند موجود ہے اگر کسی ایک نسخہ میں بھی لغیر البیت ہوتا تو ہم تسلیم کر لیتے کہ دوسرے نسخہ میں غلطی ہوگئی ہے ورنہ بلا وجہ قیاس آرائی درست نہیں۔

حافظ عسقلانیؒ کا جواب:- البیت سے بیت اللہ یعنی کعبہ ہی مراد ہے اور عند اپنے معنی ظرفیت ہی پر ہے البتہ عبارت میں تھوڑا سا اختصار ہے اصل عبارت یوں ہے: ما کان اللہ لیضیع ایمانکم یعنی صلوٰتکم

التی صلیتموھا عند البیت الی بیت المقدس۔ یعنی بیت اللہ کے پاس رہتے ہوئے مکہ معظمہ میں جو نمازیں تم نے بیت المقدس کی جانب پڑھی ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کریں گے۔ پس جو نمازیں بیت اللہ سے دور رہتے ہوئے یعنی مدینہ منورہ میں بیت المقدس کی جانب تم نے پڑھی ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ ضائع نہ ہونگی۔

اس تقریر سے ایک طرف صحابہ کرام کو تسلی بھی ہو گئی اور اشکال کا جواب بھی ہو گیا اور دوسری طرف فیصلہ بھی ہو گیا کہ ہجرت سے قبل مکہ معظمہ میں بھی بیت المقدس ہی کی جانب چہرہ کر کے نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہوتی ہے جو روایت متعدد کتابوں میں موجود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل بیت المقدس ہی کا استقبال کرتے تھے۔ البتہ آپ اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ کا استدبار نہ ہو۔ قال ابن عباس وغیرہ الی بیت المقدس لکنہ لا یستدبر الکعبۃ بل یجعلھا بینہ وبین بیت المقدس۔ (قسطلانی)۔

جنوب کعبہ ــــ مدینہ ــــ بیت المقدس

یعنی آپ کعبہ کے جنوب (حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان) کھڑے ہوتے تھے تاکہ مواجہۃ بیت اللہ بھی فوت نہ ہو۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ حدیث امامت جبرئیلؑ کے بعض طرق میں عند باب البیت آیا ہے اور باب البیت کے پاس کھڑے ہو کر بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں کا استقبال نہیں ہو سکتا کیونکہ باب البیت جانب مشرق میں ہے اور بیت المقدس جانب شمال میں اس لئے اس صورت میں صرف کعبہ کا استقبال ہوتا ہے بیت المقدس کا نہیں۔

البتہ اس میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ ابتداءً استقبال بیت اللہ مامور بہ تھا یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں مختار تھے اور آپ اپنے اختیار سے بیت اللہ کا استقبال فرماتے تھے، شق ثانی راجح معلوم ہوتی ہے، استقبال بیت اللہ آپ کا فطری رجحان تھا کیونکہ آپ اشبہ بابراہیم علیہ السلام تھے، کما قال اللہ تعالیٰ: ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین آمنوا (آل عمران آیت ۶۸) بلاشبہ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیمؑ سے ان کو تھی جنھوں نے (ان کے وقت میں) انکا اتباع کیا اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو ان پر ایمان لائے)۔

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: رأیت ابراھیم علیہ السلام انا اشبہ ولدہ بہ (مسلم ج ۱ ص ۹۵)

وایضاً قال صلی اللہ علیہ وسلم: واذا ابراھیم علیہ السلام قائم یصلی اشبہ الناس بہ صاحبکم یعنی نفسہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مسلم ج ۱ ص ۹۶)

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ شریعت محمدیہ درحقیقت ملت ابراہیمیہ کی تفصیل وتکمیل ہے، غرضیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلقاً وخلقاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مشابہت رکھتے ہیں۔ نیز کعبہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ یہ سب انبیاء علیہم السلام کا قبلہ نہ تھا مگر حج سوائے کعبہ کے اور کہیں نہ ہوا اس لئے آپ کا رجحان کعبہ کی طرف تھا جس کی بنا پر آپ استقبال کعبہ فرماتے تھے۔

بعدہٗ ہجرت سے تین سال قبل جب استقبال بیت المقدس کا حکم ہوا تو مامور بہ کے ساتھ فطری رجحان پر بھی عمل کرنے کے لئے آپ بیت اللہ کی جانب جنوب میں بین الرکنین الیمانی قیام فرماکر بیت اللہ و بیت المقدس دونوں کا استقبال فرماتے تھے، مدینہ منورہ پہونچکر دونوں کا اجتماع ناممکن ہوگیا تو تحویل القبلہ الی الکعبہ کا شدید تقاضا پیدا ہوا کما قال اللہ تعالیٰ:
قد نریٰ تقلب وجهك فی السماء فلنولینك قبلة ترضاها۔ (سیقول)
اس تقریر پر تکرار نسخ کی قباحت بھی لازم نہیں آتی۔
حدیث امامت جبرئیلؑ سے قائلین تکرار نسخ استدلال کرتے ہیں۔ تقریر مذکور سے اس کا بھی جواب ہوگیا کہ ابتداءً استقبال قبلہ مامور بہ نہ تھا بلکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا فطری رجحان تھا اس لئے حضرت جبرئیلؑ نے بھی آپ کی موافقت فرمائی (ارشاد القاری)

تحقیق وتشریح

کان اول ما قدم بکسر الدال ونصب اول علی الظرفیة یہ جملہ ان کی خبر محل رفع میں ہے ای فی اول قدومه المدینة منذالهجرة۔
نزل علیٰ اجداده او قال اخواله من الانصار الشك من ابی اسحٰق والمراد بالاجداد من جهة الامومة۔
واضح رہے کہ حضرات انصارؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد یا اخوال (نانا، ماموں) نہیں تھے بلکہ آنحضورؐ کے دادا عبد المطلب کے اجداد تھے تو چونکہ حضور اقدسؐ عبد المطلب کے پوتے ہوتے ہیں اس لئے مجازاً آنحضور اقدسؐ کی طرف نسبت کردی گئی، چنانچہ قصہ ہجرت کی روایت میں صاف موجود ہے نزل علی بنی النجار اخوال عبد المطلب، اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبد مناف کے چار بیٹے تھے مطلب، ہاشم ایک ماں سے نوفلؒ اور عبد شمسؒ دوسری ماں سے۔ ہاشم تجارت کے لئے شام آتے جاتے تھے درمیان میں مدینہ طیبہ پڑتا تھا وہ یہاں قیام کرتے تھے، ایک شریف زادی اور شریف عورت جس کا نام سلمٰی بنت عمر تھا جو قبیلہ بنی نجار سے تھیں وہ شریف بھی تھیں اور حسین وجمیل بھی، ہاشم جن کے یہاں مہمان تھے انہیں کی یہ لڑکی بھی تھی، جب ہاشم کی نظر ان پر پڑی تو نکاح کا پیغام دیا، نکاح اس شرط پر ہوا کہ سلمٰی خود مختار ہوں گی یعنی حق علیحدگی میرے اختیار میں ہوگا، ان کے لئے مکہ معظمہ جانا لازم نہیں ہوگا، ہاشم نے یہ شرط منظور کرلی اور نکاح ہوگیا۔
بہرکیف سلمٰی مدینہ منورہ میں تھیں ان سے ایک لڑکا یعنی عبد المطلب پیدا ہوا جس کا نام شیبۃ الحمد تھا، ہاشم کا جب انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنے حقیقی بھائی مطلب سے وصیت کی کہ میرے لڑکے (شیبہ) کا خیال رکھنا، شیبہ جب تک بچے تھے ماں ہی کے پاس رہے پھر مطلب اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق شیبہ کو لینے کیلئے گئے، مطلب نے اپنے بھتیجے شیبہ کو پیچھے اونٹ پر بٹھالیا، لوگوں نے شیبہ کو پیچھے بیٹھا دیکھ کر عبد المطلب کہنا شروع کیا، اسی روز سے شیبہ عبد المطلب کے نام سے مشہور ہوگئے۔
قبل بیت المقدس والمقدس بفتح المیم وسکون القاف وکسر الدال مصدر میمی او اسم مکان من القدس وهو الطهر ای المکان الذی یطهر فیه العابد من الذنوب او تطهر العبادة من الاصنام وجاء فیه (ای المقدس) بضم المیم وفتح القاف والدال المشددة۔
ستة عشر شهرا او سبعة عشر شهرا مدینہ منورہ میں استقبال بیت المقدس کی مدت کیا ہے؟ حافظ

عسقلانیؒ نے اس بارے میں نو روایات ذکر کی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ بہت سی روایتیں ضعیف ہیں ان میں سے تین روایتیں مشہور ہیں:۔

(۱) سولہ یا سترہ مہینے شک کے ساتھ کما فی ھٰذہ الروایۃ وکذا فی صلوٰۃ صحیح البخاری ؂ وعند الترمذی ایضا وکذا ذکرہ السیوطی فی الجلالین بالشک۔

(۲) مسلم شریف، نسائی اور مسند احمد بن حنبل بغیر شک کے ستۃ عشر شہرا ہے۔

(۳) وللبزار والطبرانی سبعۃ عشر یعنی بلا شک سترہ کی روایت ہے۔

بظاہر ان روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے تطبیق اس طرح دی گئی ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ آپؐ ربیع الاول کے مہینہ میں مدینہ منورہ تشریف لائے، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آپؐ بارہ ربیع الاول بروز دوشنبہ مدینہ منورہ پہونچے اور جمہور کا صحیح قول یہ ہے کہ اگلے سال یعنی ؁ ۱۵ رجب کو تحویل قبلہ کا حکم آیا۔ پس بارہ ربیع الاول سے ۱۵ رجب تک سولہ ماہ اور تین دن ہوتے ہیں اور یہی اصح الاقوال و معتمد ہے۔

پس جن حضرات نے ماہِ دخول یعنی ربیع الاول اور ماہ تحویل یعنی رجب دونوں مہینوں کو مستقل شمار کر لیا تو سترہ ذکر کیا اور جن حضرات نے دونوں مہینوں کو ملا کر ایک شمار کیا اور زائد تین دن یعنی کسر کو چھوڑ دیا تو انہوں نے سولہ ذکر کیا اور جن حضرات کو شک و تردد تھا انہوں نے شک کے ساتھ بیان کیا۔ (فتح الباری، عمدۃ القاری وغیرہ)

وکان یعجبہ ان تکون قبلتہ قبل البیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو۔ اس کے متعدد وجوہ منقول ہیں:۔

۱۔ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا قبلہ تھا اور آپؐ کو ملتِ ابراہیمی کی اتباع کا حکم تھا مثلاً ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا وغیرہ۔

۲۔ صاحبِ جلالین نے مختصر جامع جواب دیا لانہ ادعی لاسلام العرب۔

اہل مکہ کا دنیا میں وقار تھا اور ان کا اسلام سارے عرب کے اسلام کا باعث ہو سکتا تھا اہل مکہ کو خانہ کعبہ سے بے انتہا محبت اور عقیدت تھی اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طبعی رجحان تھا کہ خانہ کعبہ کے استقبال کا حکم ہو جائے تاکہ اشاعتِ اسلام میں آسانی ہو۔

۳۔ ظاہری عالم میں خانہ کعبہ کو مرکزیت حاصل ہے کیونکہ زمین کی ناف خانہ کعبہ ہے اور ساری زمین وہیں سے پھیلائی گئی ہے، تو جس طرح خانہ کعبہ کو عالم ظاہری میں مرکزیت حاصل ہے اسی طرح عالم ارواح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکزیت حاصل ہے اور مرکز کو مرکز سے ربط ہونا ہی چاہئے اس لئے آپؐ کو اس قبلہ کی طبعی تمنا تھی۔

۴۔ انسان کی خلقت مٹی سے ہوئی ہے اور ساری زمین اسی جگہ سے پھیلائی گئی ہے جہاں آج خانہ کعبہ ہے گویا انسان کا مرکز خانہ کعبہ ہے اور مرکز کی جانب میلان فطری اور طبعی چیز ہے۔

فخرج رجل ھو عباد بن بشر وقیل عباد بن نھیک بفتح النون وکسر الھاء۔

نزل علی اهل مسجد یہ مسجد بنی حارثہ ہے، اہل قبا کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا، وہ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے جب کسی نے تحویل کی خبر دی تو نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔

اشکال: استقبال بیت المقدس کا حکم قطعی تھا اور خبر واحد ظنی ہے تو اس سے قطعی کا ترک کیسے جائز ہوا؟

جواب: بعض دفعہ خبر واحد محفوف بالقرائن موجب علم یقینی ہوتی ہے یہاں ایسے قرائن قاطعہ موجود تھے مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تحویل کی تمنا کرنا اور اس کا انتظار اور اللہ تعالیٰ کا قد نریٰ تقلب وجھك فی السماء فلنولینك قبلۃ ترضاھا سے آپکو تسلی دینا وغیرہ۔ ان قرائن کی وجہ سے یہ خبر واحد قطعی ہو گئی تھی۔ اور حضرات صحابہؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش معلوم تھی اس لئے ان قرائن کی وجہ سے یہ خبر واحد قطعی ہو گئی تھی مثلاً ایک شخص بیمار ہے اس کی جانکنی کی اطلاع آپکو ہو گئی ہے تھوڑی دیر کے بعد آپ گھر سے نکلے تو اس کے گھر سے رونے کی آواز آرہی ہے اور دروازے پر لوگ کفن سِل رہے ہیں، آپ نے کسی سے دریافت کیا کیا بات ہے؟ اس نے وفات کی خبر دی تو آپ کو یقین ہو جائیگا ذرہ برابر شک نہ ہوگا حالانکہ یہ بھی خبر واحد ہی ہے۔

• باب حُسنِ اسلامِ المرءِ • ص۱۱

ای ھذا باب حسن اسلام المرء۔ والباب ھنا مضاف قطعا (عمدۃ) باضافۃ باب لتالیہ (قس)
یعنی انسان کے اسلام کی خوبی۔

• قال مالكٌ اخبرنی زیدُ بنُ اسلمَ اَنّ عطاءَ بنَ یسارٍ اخبرہ اَنّ اباسعیدِ الخدریَّ اخبرہ اَنّہ سمع رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقولُ اِذا اسلمَ العبدُ فحَسُنَ اسلامُہ یُکفِّرُ اللّٰہُ عنہ کلَّ سیئۃٍ کان زَلَّفھا وکان بعدَ ذٰلك القِصاصُ الحسنۃُ بعشرِ اَمثالِھا الیٰ سبعِ مائۃِ ضعفٍ والسیئۃُ بمثلِھا اِلّا اَن یتجاوزَ اللّٰہُ عنھا •

ترجمہ حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے جب کوئی بندہ مسلمان ہو جائے اور اس کا اسلام اچھا ہو (یعنی اچھی طرح مسلمان ہو) تو اللہ تعالیٰ اس کا ہر ایک گناہ معاف فرمادیں گے جو وہ (اسلام سے پہلے) کرچکا تھا اور اس کے بعد بدلہ کا اصول جاری ہو جاتا ہے (نیا حساب شروع ہوگا) ایک نیکی کا بدلہ ویسی دس نیکیاں سات سو نیکیوں تک (لکھی جائیں گی) اور برائی کے بدلہ میں ویسی ہی ایک برائی لکھی جائیگی مگر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کردے۔

قال مالك امام بخاریؒ کی ملاقات چونکہ امام مالکؒ سے ثابت نہیں ہے اس لئے یہ روایت معلق ہے۔

باب سابق سے ربط سابق باب "الصلوٰۃ من الایمان" میں نماز کا بیان تھا اور اس باب میں حسن اسلام۔ دونوں میں مناسبت ظاہر ہے کہ دین اسلام میں حسن نماز سے پیدا ہوتا ہے بلکہ جن اعمال سے اسلام میں حسن پیدا ہوتا ہے ان میں سب سے اہم نماز ہے۔

مطابقتہ للترجمۃ :- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ "فحسن اسلامہ"۔

مقصد ترجمہ اسلام کے درجات کا تفاوت بیان کرنا مقصود ہے کہ بعض کا اسلام حسن اور بعض کا غیر حسن ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک ایمان و اسلام ہم معنی ہیں۔

۴۲ ● حدثنا اسحٰق بن منصور قال حدثنا عبد الرزاق قال اخبرنا معمر عن همام عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا احسن احدكم اسلامه فكل حسنة يعملها تكتب له بعشر امثالها الى سبع مائة ضعف وكل سيئة يعملها تكتب له بمثلها ●

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اسلام کو اچھا کرے تو اس کے بعد جو نیکی وہ کریگا دس گنی سے لیکر سات سو گنی تک لکھی جائے گی اور جو برائی کریگا وہ ویسی ہی ایک لکھی جائیگی۔

مطابقتہ للترجمۃ :- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ "اذا احسن احدکم اسلامہ" الخ۔

تشریح ارشاد ہے کہ جب کوئی مسلمان ہوجائے اور اسکا اسلام اچھا ہو (یعنی اخلاص کے ساتھ اسلام قبول کرے، دل کی گہرائی سے اسلام قبول کرے، اس کا اسلام صرف نمائش اور نفاق پر مشتمل نہ ہو) یکفر اللہ عنہ الخ تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر ایک گناہ معاف فرما دیں گے زلفہا بتشدید اللام و بتخفیفہا نیز ازلفہا ازباب افعال تینوں طرح روایت ہے بمعنی قدمہا۔ یعنی جس گناہ کو پہلے کرچکا سب معاف ہوجاتے ہیں مگر حقوق العباد معاف نہیں ہوتے البتہ حقوق اللہ خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ بتمامہا معاف ہوجاتے ہیں بشرطیکہ حقیقی اسلام ہو لان الاسلام یہدم ما کان قبلہ۔

● باب ۳۲ احب الدین الی اللہ عز وجل ادومہ ● ص۱۱

اللہ تعالیٰ کو وہ عمل زیادہ محبوب ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔

۴۳ ● حدثنا محمد بن المثنى قال حدثنا يحيى عن هشام قال اخبرني ابي عن عائشة ان النبي صلى الله عليه وسلم دخل عليها وعندها امرأة قال من هذه قالت فلانة تذكر من صلاتها قال مه عليكم بما تطيقون فوالله لا يمل الله حتى تملوا وكان احب الدين اليه ما داوم عليه صاحبه ●

ترجمہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (ایک دن) ان کے پاس تشریف لائے اس وقت ان کے پاس ایک عورت تھی آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کون ہے؟ حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا یہ فلاں عورت ہے اور ان کی کثرتِ نماز کا حال بیان کرنے لگیں آپؐ نے فرمایا "مہ" (بس کرو) "تمہیں وہی

عمل اختیار کرنا چاہئے جو (ہمیشہ) کرسکتے ہو (یعنی نباہ سکو) خدا کی قسم اللہ تعالیٰ (ثواب دینے سے) نہیں تھکے گا مگر تم ہی (عمل کرنے سے) تھک جاؤ گے (یعنی تھک کر چھوڑ دو گے) اور آپ کو سب سے زیادہ وہ عمل پسند تھا جس پر عامل مداومت کرے۔

مطابقة للترجمة:۔ مطابقة الحديث للترجمة ظاهرة وهی قوله "وكان احبّ الدّين اليه ما داوم عليه صاحبه"

ربط ماقبل ماقبل کے باب میں حسنِ اسلام کا بیان تھا اور اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں حُسن مداومت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے (القول الفصیح ص۴۲)۔

حافظ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ ماقبل میں ایک نیکی پر سات سو نیکیوں کی بشارت تھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی جوش میں آکر حد سے زیادہ عمل شروع کردے جس پر مداومت دشوار ہو تو یہ باب جوش میں اعتدال پیدا کرنے کیلئے منعقد کیا ہے۔ (فتح الباری، امداد الباری)

تعدد الحديث:۔ اخرجه البخاری هنا فی الایمان ص۱۱ وایضا فی التهجد ص۱۵۴ مسلم اول ص۲۶۷۔

مقصد ترجمہ حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: مراد المصنف الاستدلال علی ان الایمان يطلق على الاعمال لانّ المراد بالدين هنا العمل۔ (فتح)

یعنی امام بخاریؒ کا مقصد اس بات پر استدلال کرنا ہے کہ ایمان کا اطلاق عمل پر ہوا کیونکہ حدیثِ پاک کے اندر احبّ الدین میں دین سے مراد عمل ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک دین اور ایمان متحد المعنیٰ ہیں پس مرجئہ کی تردید ہو گئی کیونکہ حدیث شریف سے عمل اور ایمان کا گہرا تعلق ثابت ہوا۔

۲ ترجمۃ الباب ہے "احبّ الدین" احبّ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اس سے ثابت ہوا کہ دین کے درجات متفاوت ہیں بعض کا درجہ بعض سے زیادہ محبوب و افضل ہے اور چونکہ دین و ایمان متحد المعنیٰ ہیں اس لئے یہ ثابت ہوا کہ ایمان کے متفاوت درجات ہیں۔

تشریح قالت فلانة مرفوع لانه خبر مبتدأ محذوف ای هی فلانةُ الحولاء (بنت تويت) الاسدية وهی غير منصرف الخ (عمدۃ) یعنی لفظ فلانہ چونکہ کنایہ ہے علم سے اس وجہ سے قائم مقام علم کے ہے لہٰذا تانیث اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ مسلم شریف میں نام مذکور ہے "فقالت هذه الحولاء بنت تويت الخ" مسلم ج۱ ص۲۶۷۔

تذكر بفتح التاء والثناة واحد مؤنث غائب مضارع معروف والفاعل عائشةؓ۔ یعنی حضرت عائشہؓ اس کا نام بتا کر یہ بھی کہنے لگیں کہ یہ نمازیں بہت پڑھتی ہیں، رات بھر نوافل ہی پڑھتی رہتی ہیں۔ اور بعض روایتوں میں یہ لفظ يُذكر بالياء التحتانيه یعنی واحد مذکر غائب مضارع مجہول ہے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے "یہ وہی ہیں جن کی نماز کا بڑا چرچہ ہے"۔

اشکال:۔ منہ پر تعریف کرنا ممنوع ہے پھر ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی نے اسکے سامنے تعریف کیوں کی؟

جواب ۱:۔ اولاً تو حضرت صدیقہ رضی کا مقصد تعریف کرنا دتھا بلکہ تعارف مقصود تھا آنحضور ﷺ کی خدمت میں ان کا حال عرض کرکے ہدایت حاصل کرنی تھی اس لئے ساری بات اور سامنے ہی کہنے کی ضرورت تھی تاکہ کمی بیشی نہ ہو۔

۲:۔ علامہ قسطلانی فرماتے ہیں لعل عائشۃ امنت علیہا الفتنۃ فمدحتہا فی وجہہا (قس) یعنی حضرت عائشہ رضی نے حولاء کے منہ پر تعریف اس اطمینان پر کی کہ ان کے کسی فتنہ (تکبر، غرور وغیرہ) میں پڑنے کا اندیشہ نہ تھا۔

۳:۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی نے حولاء کی تعریف اس وقت کی جب وہ اٹھ کر جا چکی تھیں فی مسند الحسن بن سفیان کانت عندی امرأۃ فلما قامت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ھذہ یا عائشۃ (ارشاد الساری) جب حولاء کے چلے جانے کے بعد تعریف کی گئی فلا اشکال۔

قال مہ بفتح المیم وسکون الہاء اسم للزجر بمعنی اکفف (قس)

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھہرو، بس کرو علیکم بما تطیقون یہاں خطاب مؤنث کو ہے اس لئے بظاہر علیکن ہونا چاہئے، لیکن پوری امت کے لئے تعمیم حکم مقصود ہے جس میں رجال و نساء سب شامل ہیں بقاعدۂ تغلیب الرجال علی النساء مذکر کا صیغہ لایا گیا۔

فواللہ لایمل اللہ حتی تملوا خدا کی قسم اللہ تو ثواب دینے سے تھکے گا نہیں تم ہی (عبادت کرنے سے) تھک جاؤ گے۔

اشکال ملال کے معنی ہیں تنگدل ہونا یعنی ملال اس تکان اور تعب کو کہتے ہیں جو مشقت اٹھانے سے لاحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند و برتر ہے کہ اس کو تعب و مشقت ہو۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ملال کا لفظ بطور صنعت مشاکلۃ استعمال کیا گیا ہے مثلاً جزاء سیئۃ سیئۃ بمثلہا (شوریٰ آیت ۴۰) برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے بدلہ کے طور پر جو برائی کی جائے، وہ حقیقۃً برائی نہیں محض صورۃً برائی ہوتی ہے، سیئۃ کا اطلاق اس پر بطور مشاکلت کیا گیا کیونکہ بدلہ لینا سیئۃ نہیں۔

علامہ عینیؒ نے ایک دوسری مثال پیش کی ہے فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ (البقرہ) جزاء اعتداء کو اعتداء کہا گیا مشاکلۃً حالانکہ یہ بدلہ ہے، عدل ہے۔

علامہ خطابیؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ فکنی عن الترک بالملال الذی ھو سبب الترک یعنی ملال کا نتیجہ ترک ہے یعنی ملال سبب ہے ترک کا لہٰذا یہاں سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا مجازاً مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اجر و ثواب کو منقطع نہیں فرماتے جب تک تم عمل ترک نہیں کرتے، اور ظاہر ہے کہ جب تم طاقت سے زیادہ عمل کروگے تو کسی روز اکتا کر چھوڑ بیٹھوگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب بھی منقطع ہو جائیگا۔ لہٰذا اعتدال کے ساتھ عمل کرو تاکہ اس پر مداومت کی جاسکے، جب تک آپ عمل پر مداومت رکھیں گے ثواب ملتا رہیگا یہ تعلیل للتکثیر ہے۔

تنبیہ:۔ یہ حکم عام امت کے لئے ہے خواص مستثنیٰ ہیں چنانچہ حضرت امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے

چالیس سال تک (وفی قول تیس سال تک) عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔

باب ۳۳ زيادة الايمان ونقصانه

وقول الله تعالیٰ ويزدناهم هدًى ويزداد الذين امنوا ايمانا وقال اليوم اكملت لكم دينكم فاذا ترك شيئا من الكمال فهو ناقص ●

ایمان کی زیادتی اور کمی کا بیان اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ کہف میں) ہم نے ان اصحاب کہف کو مزید ہدایت دی، اور (سورہ مدثر میں) ایمان والوں کا ایمان اور زیادہ ہو، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا (سورۂ مائدہ میں) آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا پس جب کوئی کمال میں سے کچھ چھوڑ دے تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

۴۲ ● حدثنا مسلم بن ابراهيم قال حدثنا هشام قال حدثنا قتادة عن انس عن النبي صلى الله عليه وسلم قال يخرج من النار من قال لا اله الا الله وفي قلبه وزن شعيرة من خير ويخرج من النار من قال لا اله الا الله وفي قلبه وزن برة من خير ويخرج من النار من قال لا اله الا الله وفي قلبه وزن ذرة من خير قال ابو عبد الله قال ابان حدثنا قتادة حدثنا انس عن النبي صلى الله عليه وسلم من ايمان مكان خير ●

ترجمہ حضرت انسؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ دوزخ سے ہر وہ شخص نکلے گا یا نکال لیا جائیگا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو کے برابر بھی خیر ہو، اور دوزخ سے ہر وہ شخص نکلیگا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے قلب میں گیہوں کے برابر خیر ہو، اور دوزخ سے ہر وہ شخص نکلے گا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے قلب میں ذرّہ کے برابر بھی خیر ہو۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابان نے حضرت قتادہ سے اور قتادہ نے حضرت انسؓ سے بطور تحدیث روایت بیان کی کہ حضرت انسؓ نے حضورؐ سے مِن خیر کے بجائے من ایمان کا لفظ نقل فرمایا ہے۔

مطابقة الحديث للترجمة ترجمۃ الباب سے مطابقت مفہوم حدیث سے ہے کہ کلمۂ ایمان کے اقرار کے بعد حدیث میں جَو، گیہوں اور ذرّہ کے ذکر سے تفاوت مراتب ظاہر ہے البتہ یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ حدیث میں ایمان کا لفظ نہیں ہے گرچہ خیر کا باہم تفاوت واضح ہے مگر اس اشکال کا جواب امام بخاریؒ نے متابعت پیش کر کے بتلا دیا کہ اس حدیث میں خَیر سے مراد ایمان ہے۔

ربط ماقبل ما قبل کے باب میں احب الدین کا بیان تھا اور ظاہر ہے کہ جس کا دین اَحب ہوگا اس کے دین میں زیادتی ہوگی اور جس کا دین غیر احب ہوگا اس میں نقص ہوگا پس سابق باب میں جو چیز ضمناً مذکور تھی اب اس کو صراحۃً بیان کرنا چاہتے ہیں۔

تعدد الحديث:۔ اخرجه البخاري هنا في الايمان ص۱۱ واخرجه بتمامه مفصلا في التوحيد ص۱۱۰۳

وایضا مسلم فی کتاب الایمان مفصلا والترمذی ایضا ۔

نوٹ:۔ ایمان کی زیادتی، کمی کا مسئلہ کتاب الایمان کی ابتداء میں بالتفصیل گذرچکا، اس حدیث سے خاصکر خوارج ومعتزلہ کی پوری تردید ہورہی ہے جو کہتے ہیں کہ گنہگار مسلمان مخلد فی النار ہوگا، حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مؤمن گنہگار صرف ایمان کی وجہ سے بالضرور جہنم سے نکالا جائیگا۔

متابعت کے فوائد یہ متابعت بخاری شریف میں تعلیقاً مذکور ہے لیکن حاکم نے کتاب الاربعین میں اسے موصولاً ذکر کیا ہے من طریق ابی سلمۃ موسی بن اسمٰعیل قال حدثنا ابان الخ اس متابعت کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ قتادہ مدلس ہیں اگر سماع کی تصریح نہ ہو تو ان کی معنعن روایت مقبول نہیں ہوتی اور یہ روایت معنعن ہے اس لئے امام نے متابع نقل فرمایا جس میں تحدیث کی تصریح ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ متابع میں خیر کے بجائے ایمان کا لفظ ہے جس میں اشارہ ہوگیا کہ روایت میں خیر سے مراد ایمان ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس متابعت سے ہشام کی روایت کی تائید وتقویت ہوگئی۔

۴۳ ● حدثنا الحسنُ الصّبّاحُ سمعَ جعفرَ بنَ عونٍ حدثنا ابوالعُمَیسِ اخبرنا قیسُ بنُ مسلمٍ عن طارقِ بنِ شہابٍ عن عُمَرَ بنِ الخطابِ انَّ رجلاً مِن الیہودِ قال لہٗ یا امیرَ المؤمنینَ اٰیۃٌ فی کتابکم تقرءُونہا لوعلینا معشرَ الیہودِ نزلتْ لاتخذنا ذٰلکَ الیومَ عیداً قال ایُّ اٰیۃٍ قال الیومَ اکملتُ لکم دینَکم وَ اَتممتُ علیکم نعمتی ورضیتُ لکمُ الاسلامَ دِیناً. قال عمرُ قد عرفنا ذٰلکَ الیومَ والمکانَ الذی نزلتْ فیہ علی النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وھو قائمٌ بعرفۃَ یومَ جمعۃٍ ●

ترجمہ حضرت عمر بن خطاب رضؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے ان سے کہا کہ اے امیرالمؤمنین تمہاری کتاب (قرآن مجید) میں ایک آیت ہے جسے تم پڑھتے ہو اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے جواب دیا الیوم اکملت الخ میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور دین اسلام تمہارے لئے پسند کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم اس دن اور اس مقام کو خوب جانتے ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی ہے، آپؐ عرفات میں جمعہ کے دن کھڑے تھے۔

مطابقۃ الحدیث للترجمۃ:۔ مطابقت ظاہر ہے کیونکہ حدیث پاک میں ترجمۃ الباب کی آیت کریمہ کا سبب نزول مذکور ہے۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان صلا وفی المغازی ص۶۳۲ وفی التفسیر ص۶۶۳ وفی الاعتصام ص۱۰۷۹

ایضا مسلم ثانی ص۴۱۹ تا ص۴۲۰ ایضا ترمذی۔

تشریح اس حدیث کی سند میں سمع جعفر تقدیر عبارت ہے انّہ سمع جعفر الخ محدثین کی عادت ہے کہ اس قسم کے موقع پر کتابت میں انّہ کو حذف کر دیتے ہیں لیکن اس کا پڑھنا ضروری ہے ولکن لا بد من قراءتہ، جس طرح لفظ قال کو اختصاراً حذف کر دیا جاتا ہے کتابت میں لیکن پڑھا جاتا ہے۔ (عمدۃ)

ان رجلا من الیھود بعض روایت میں تصریح ہے کہ یہ کہنے والے کعب احبار تھے جو شام میں یہود کے بہت بڑے عالم تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوئے۔

کتاب المغازی کی روایت میں ہے ان اناسا من الیھود، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کعب احبار کے ساتھ اور بھی کچھ لوگ تھے۔ مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کعب نے کہا اے امیر المؤمنین اگر یہ آیت ہم یہود پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے الخ۔

انصاف کی بات ہے کہ یہودی نے انتخاب خوب کیا پورے قرآن مجید میں سے جاندار انتخاب کیا کیونکہ جس روز باری تعالیٰ نے اپنے تمام انعامات مکمل کرنیکا اعلان فرمایا اس سے زیادہ مسرت کا اور کونسا موقع ہو سکتا ہے حضرت عمرؓ نے جواب بھی خوب دیا کہ اے بے خبر جو ہم جانتے ہیں اگر تو جانتا تو اعتراض کے لئے لب کشائی کی جرأت ہرگز نہ کرتا، یوم عرفہ تمام دنوں کا سید ہے جیسے کہ جمعہ پورے ہفتہ کا سید ہے، حقیقی عید یوم عرفہ ہے اور رسمی عید عاشر ذی الحجہ ہے دراصل یوم عرفہ کی فضیلت پورے عشرہ میں سرایت کی ہوئی ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ عشرۂ ذی الحجہ اشرف ہے یا کہ عشرۂ رمضان ؟

ابن قیم نے زاد المعاد میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایام میں سے عشرۂ ذی الحجہ افضل ہے اور لیالی میں سے عشرۂ رمضان کیونکہ عشرۂ رمضان میں لیلۃ القدر افضل اللیالی اور عشرۂ ذی الحجہ میں یوم عرفہ افضل الایام ہے۔

وفی روایۃ الطبری فی تفسیرہ نزلت یوم جمعۃ یوم عرفۃ کلاھما بحمد اللہ عید۔ یعنی ہمیں عید منانے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں دنوں کو ہمارے لئے عید بنا دیا ہے ہم خود عید بناتے تو یہ بدعت ہوتی

وفی روایۃ الطبرانی وھما لنا عیدان، وعند الترمذی نزلت فی یوم عیدین یوم جمعۃ ویوم عرفۃ یہ دو عید یں زمانی ہیں ایک تیسری عید مکانی بھی ہے جو صرف حجاج کے ساتھ مخصوص ہے یعنی میدان عرفات۔

واشار الیہ بقولہ والمکان الذی نزلت فیہ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو قائم بعرفۃ۔

قال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ واتخذوا یوم عرفۃ عیدا لانہ لیلۃ العید وھکذا کما جاء فی الحدیث الآتی فی الصیام شہرا عید لاینقصان رمضان وذوالحجۃ فسمی رمضان عیدا لانہ یعقبہ العید۔

فان قیل کیف دلت ھذہ القصۃ علی ترجمۃ الباب ؟

اجیب من جھۃ انھا بینت ان نزولھا کان بعرفۃ وکان ذلک فی حجۃ الوداع التی ھی

آخر عهد البعثة حين تمت الشريعة واركانها، والله اعلم۔

وقد جزم السدي بانه لم ينزل بعد هذه الآية شئ من الحلال والحرام (ارشاد الساری)

نوٹ:۔ اس حدیث کی مزید تشریح کے لئے دیکھئے "نصر الباری کتاب المغازی ص۴۸۴ تا ص۴۸۵"۔

باب الزکوٰة من الاسلام

وقوله تعالىٰ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ● ص۱۱

زکوٰة اسلام کا ایک شعبہ اور رکن ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورہ بیّنہ میں) حالانکہ ان لوگوں کو (کتب سابقہ میں) یہی حکم دیا گیا تھا کہ یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰة ادا کریں یہی دین مستقیم ہے۔

۴۴ ● حدثنا اسمٰعيل قال حدثني مالك بن انس عن عمه ابي سهيل بن مالك عن ابيه انه سمع طلحة بن عبيد الله يقول جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم من اهل نجد ثائر الرأس نسمع دوي صوته ولا نفقه ما يقول حتى دنا فاذا هو يسال عن الاسلام فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس صلوات في اليوم والليلة فقال هل علي غيرها قال لا الا ان تطوع قال رسول الله صلى الله عليه وسلم وصيام رمضان قال هل علي غيره قال لا الا ان تطوع قال وذكر له رسول الله صلى الله عليه وسلم الزكوٰة قال هل علي غيرها قال لا الا ان تطوع قال فادبر الرجل وهو يقول والله لا ازيد على هذا ولا انقص قال رسول الله صلى الله عليه وسلم افلح ان صدق ●

ترجمہ حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نجد والوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا پراگندہ سر یعنی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے اور اس کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ وہ نزدیک آگیا، جب معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے بارے میں دریافت کر رہا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں اس نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی نماز مجھ پر (فرض) ہیں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم نفل پڑھو۔ طلحہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور رمضان کے روزے فرض ہیں اس نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر روزہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم نفل روزے رکھو۔ حضرت طلحہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوٰة کو بھی بیان کیا اس نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی صدقہ میرے ذمہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم نفلی صدقہ دینا چاہو۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ پیٹھ پھیر کر یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم نہ اس پر بڑھاؤں گا اور نہ گھٹاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہوگیا۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ لان الترجمۃ الزکوٰۃ من الاسلام و موضع الدلالۃ فی الحدیث ہو قولہ فاذا ہو یسألہ عن الاسلام فذکر الصلوٰۃ والصوم والزکوٰۃ وہذا ظاہر فی کونہا من الاسلام وکذلک مطابقۃ للآیۃ ظاہرۃ من حیث ان المذکور فی کل واحد منہا الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔ (عمدۃ)

ترجمۃ الباب کا جزء ثانی یعنی آیت کریمہ جزء اول یعنی الزکوٰۃ من الاسلام کے لئے دلیل ہے بایں طور کہ آیت کریمہ میں ویؤتوا الزکوٰۃ کے بعد فرمایا وذلک دین القیمۃ۔ ذلک کا اشارہ جملہ امور مذکورہ کی طرف ہے جن میں زکوٰۃ بھی داخل ہے۔

ربط ما قبل اس سے پہلے باب میں ایمان کی زیادتی اور نقصان کا بیان تھا اور جن اعمال سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے وہ دو قسم کے ہیں بدنی اور مالی۔ عبادات بدنیہ کو پہلے بیان کرچکے اب عبادات مالیہ کو بیان کررہے ہیں۔

ایک لطیف ربط یہ بھی ہے کہ پہلے زیادتی اور نقصان کا بیان تھا اور اس باب کی حدیث میں واللہ لا ازید علی ہذا ولا انقص ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں زیادتی اور کمی ہوسکتی ہے ورنہ قسم کھاکر اسکی نفی کی حاجت نہ ہوتی۔ (امداد الباری)

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ہنا فی الایمان ص۱۲ وفی الصوم ص۲۵۴ وفی الشہادات ص۳۶۸ وفی الحیل ص۱۰۳۱ مسلم شریف کتاب الایمان ص۳۰۔

تشریح جاء رجل الخ نجد والوں میں سے ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔

عرب کے بلند حصہ کو نجد (بفتح النون وسکون الجیم) کہتے ہیں اور پست حصہ کو تہامہ اور وسط حصہ کو حجاز کہتے ہیں یہاں نجد سے مراد تہامہ کے مقابلہ حجاز کا بلند حصہ ہے جو عراق تک چلا گیا ہے

ثائر الرأس (بالرفع صفۃ الرجل او بالنصب علی الحال) اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے یہ بُعد سفر کا نتیجہ تھا۔ اس روایت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر طالب علم کو علم حاصل کرنے کیلئے دور دراز کا سفر کرنا پڑے تو اس میں تامل اور توقف نہیں کرنا چاہئے نیز طالب علم کو ضرورت سے زیادہ زیب وزینت، بناؤ سنگھار کے چکر میں نہ پڑنا چاہئے بس ایک ہی دُھن ہو

ع طالب علم ہیں ہمیں دنیا سے کیا مطلب مدرسہ ہے وطن میرا ✻ مریں گے ہم کتابوں پر ورق ہوگا کفن میرا

اس آنے والے اور سوال کرنے والے نجدی کے بارے میں محدثین کرام کے اقوال مختلف ہیں:۔

قاضی عیاضؒ اور ابن بطالؒ کی رائے یہ ہے کہ نجدی شخص ضمام بن ثعلبہ ہیں یہ حضرات اپنے خیال کی تائید میں مختلف قرائن و دلائل بھی پیش کرتے ہیں:۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اس حدیث طلحہؓ کے بعد ضمام بن ثعلبہ کی حدیث بیان فرماکر اشارہ کردیا کہ حدیث طلحہ میں رجل من اہل نجد سے مراد ضمام بن ثعلبہ ہیں کیونکہ امام مسلمؒ کا عام طریقہ یہ ہے کہ احادیث ایسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ پہلی روایت میں اگر کوئی ابہام و احتمال ہو تو دوسری روایت سے اسکی

وضاحت ہو جائے چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ضمام بن ثعلبہ کی روایت کے بہت سے الفاظ اس روایت سے ملتے جلتے ہیں کہ حضرت ضمام بن ثعلبہ کو اعرابی و بدوی سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس نجدی کی حالت بھی ثائر الرأس کے ذریعہ بدویت کا ظہور ہے، حضرت انس بن مالکؓ کی روایت میں رجل من اھل البادیۃ سے یقینی طور پر بالاتفاق حضرت ضمام بن ثعلبہؓ مراد ہیں ۔

تیسری دلیل واپسی کے وقت دونوں نے لا ازید علیٰ ھٰذا ولا انقص منہ کہا ہے ۔ محدثین عظام وائمہ حدیث کی ایک جماعت اس سے متفق نہیں ہے چنانچہ علامہ قرطبیؒ، حافظ عسقلانی، علامہ عینی اور حضرت شاہ انور کشمیری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ رجل مبہم ضمام نہیں دونوں کے سوالات وجوابات میں بہت فرق ہے اگرچہ بعض امور میں مشابہت ہے ۔

نسمع دوی صوتہ ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے دوی بفتح الدال وکسر الواؤ وتشدید الیاء لغوی معنی میں مکھی کی بھنبھناہٹ ۔ یہاں بدوی کے گنگنانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قوم کے نمائندہ تھے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ان سوالات کو حضور اقدسؐ کی خدمت میں پیش کرنا تھا ان کو اپنی زبان پر دُہرا رہے تھے تاکہ گفتگو کرتے وقت کسی لغزش کی نوبت نہ آئے ۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے کے پاس جاتا ہے تو اس پر رعب پڑتا ہے، ہیبت طاری ہو جاتی ہے اس لئے یہ شخص آہستہ آہستہ یاد کرتا جاتا ہے تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے ۔

فاذا ھو یسأل عن الاسلام اذا مفاجاتیہ ہے یعنی اس کی ہیئت رثہ سے یہ توقع نہ تھی کہ اسلام کے بارے میں سوال کریگا ۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں ای عن ارکان الاسلام، یعنی اس نجدی کا سوال اسلام کی حقیقت وماہیت کے متعلق نہ تھا بلکہ اسلام کے ارکان وفرائض کے متعلق سوال تھا، یہی وجہ ہے کہ اس میں شہادتین کا ذکر نہیں ہے، احتمال ہے کہ سوال حقیقت اسلام ہی کے متعلق ہو اور آنحضورؐ نے شہادتین کو بیان بھی فرمایا ہو مگر راوی نے اختصاراً اسکا ذکر نہیں کیا کہ یہ تو سب کو معلوم ہے ۔

خمس صلوات فی الیوم واللیلۃ حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ دن ورات میں پانچ نمازیں (فرض) ہیں ۔

فقال ھل علیّ غیرھا قال لا اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی نماز میرے ذمہ ہے؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "نہیں" اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وتر اور عیدین واجب نہیں ۔

مسئلہ وتر امام شافعیؒ اپنی کتاب الام میں اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں ففرائض الصلوات خمس وما سواھا تطوع یعنی فرض نمازیں پانچ ہیں اور اس کے علاوہ نفل ہے ۔

خود امام شافعیؒ نے اتنا ہی لفظ کہا ہے وتر کے متعلق خصوصیت سے انکار لزوم یا عدم وجوب کچھ نہیں کہا، بعد میں شوافع نے وتر کے عدم وجوب پر اس روایت سے استدلال شروع کر دیا ۔

چنانچہ حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ وتر وغیرہ واجب نہیں ۔ (فتح جلد ۱ صـ۸۸)

جوابات: اگر اس روایت سے آپ عدم وجوب وتر ثابت کرتے ہیں تو آگے چل کر زکوٰۃ سے

سے متعلق بھی بعینہ یہی الفاظ ہیں لا الآ ان تطوع تو اس سے ثابت ہوگا کہ صدقۃ الفطر واجب نہیں حالانکہ حضرات شوافع اور خود امام بخاری کے نزدیک صدقۃ الفطر فرض ہے۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

(۲) یہ حدیث وجوب وتر سے قبل کی ہے کما ورد فی روایۃ ابی داؤد:

ان اللہ تعالیٰ قد امدکم بالصلاۃ ھی خیر لکم من حمر النعم وھی الوتر (ابوداؤد رشیدیہ دہلی ص۲۰۱)	اللہ تعالیٰ نے تمہاری نمازوں میں ایک نماز کا اضافہ فرمایا ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور وہ وتر کی نماز ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پہلے پانچ نمازیں ہی فرض تھیں پھر ایک نماز وتر کا اضافہ ہوا اور چونکہ یہ حدیث خبر واحد ہے اس لئے اس سے وجوب ہی ثابت ہوگا۔

(۳) عن ابن عمرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بادروا الصبح بالوتر (ابوداؤد ص۲۰۳)
ای اسرعوا باداء الوتر قبل الصبح والامر للوجوب۔

(۴) الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا، الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا، الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا۔ (ابوداؤد ص۲۰۱)

(۵) من نسی الوتر او نام عنہا فلیصلہا اذا ذکرھا۔ (مسند احمد)
جو وتر کو بھول جائے یا اس سے سو جائے تو جب یاد آئے اسے پڑھ لے۔
جس طرح فرائض کی قضا کا حکم ہے اسی طرح وتر کی قضا کا بھی حکم ہے یہی دلیل وجوب ہے، اگر وتر کی نماز واجب نہ ہوتی تو قضا کیوں واجب ہوتی۔ قضا کا حکم واجبات میں ہوتا ہے نہ کہ سنن میں۔
چونکہ یہ حدیث خبر واحد ہے اس لئے اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوگی اس کا درجہ فرض سے کم سنت سے اوپر یعنی واجب ہوگا۔

(۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اھل القرآن اوتروا (ابوداؤد ص۲۰۱)
والمراد باھل القرآن المؤمنون فان الاھلیۃ علمۃ شاملۃ لمن آمن بہ سواء قرأ اولم یقرأ
اس میں امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

(۷) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجعلوا اخر صلاتکم اللیل وترا (ابوداؤد ص۲۰۳)
اسی طرح بکثرت احادیث میں وتر کی تاکید ہے جس سے وجوب کا درجہ مفہوم ہوتا ہے یہاں صرف چند دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ انشاء اللہ مدلل تفصیل ابواب الوتر میں معلوم ہوگی۔

الّا ان (بفتح الھمزۃ) تطوع میں استثناء متصل ہے یا منقطع؟

اتمام وقضاء نوافل

اس حدیث کے تحت ایک بحث یہ ہے کہ اگر نفل نماز یا نفل روزہ شروع کردے تو اتمام اور کسی وجہ سے فاسد ہوجائے تو اسکی قضا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

احناف کے ہاں اس کی قضا لازم و واجب ہے۔ عام کتابوں میں مالکیہ کا مذہب یہی منقول ہے۔
بعض کتابوں میں ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک کسی نفل کو شروع کر دینے کے بعد بلا عذر فاسد کرنے پر قضا واجب ہے۔

شوافع کے دلائل

چونکہ استثناء میں اصل اتصال ہے اور حضرات شوافع انقطاع کے قائل ہیں یعنی الا ان تطوع میں شوافع کے نزدیک مستثنیٰ منقطع ہے یعنی مستثنیٰ مستثنیٰ منہ سے خارج ہے۔ مستثنیٰ منہ میں فرائض و واجبات تھے اور مستثنیٰ میں نوافل و مستحبات ہیں۔ اور اگر مستثنیٰ متصل مانا جائے جیسا کہ احناف کہتے ہیں تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے علاوہ اور کچھ فرض نہیں مگر یہ کہ نفل پڑھو تو شروع کرنے پر واجب ہو جائیگا چونکہ مستثنیٰ متصل میں مستثنیٰ کا مستثنیٰ منہ کے جنس سے ہونا ضروری ہے اور یہ مسلم ہے کہ اصل متصل ہی ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی شافعی فرماتے ہیں:

وحرف المسألة دائرة على الاستثناء فمن قال انه متصل تمسك بالاصل ومن قال انه منقطع احتاج الى دليل والدليل عليه ماروى النسائى وغيره۔ (فتح الباری ص۹۹)	اور مسئلہ کا مدار استثناء پر ہے جس نے کہا متصل ہے اس نے اصل کے ساتھ تمسک کیا اور جس نے کہا منقطع ہے وہ دلیل کا محتاج ہے اور اس پر دلیل نسائی کی روایت ہے۔ پھر حافظ نے نسائی شریف کتاب الصوم سے ایک روایت نقل کی ہے:۔

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی نفل روزے کی نیت فرما لیتے پھر افطار کر لیتے تھے اور بخاری شریف کی ایک روایت نقل کی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کو جمعہ کے دن روزہ شروع کرنے کے بعد افطار کا حکم دیا۔ (بخاری ص۲۶۷)
حافظ عسقلانیؒ نے ان دونوں روایتوں کو تو ذکر کیا جو قضاء سے ساکت ہیں اور جن روایتوں میں قضا کا صریحی حکم ہے اس کو دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا یہ خلافِ انصاف ہے۔

احناف کے دلائل

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے اور حفصہؓ نے روزہ رکھا تھا بکری کا گوشت ہدیہ میں آیا ہم دونوں نے کھا لیا پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے (اور حفصہ نے یہ بات بتادی) تو آپؐ نے فرمایا: اقضیا یوماً اٰخر مکانہ (ترمذی ص۹۲، مشکوٰۃ ص۱۸۱ ایضا مسند احمد۔ یعنی اس کے کسی دوسرے دن قضا کر لو۔
(۲) دارقطنی نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت درج کی ہے کہ حضرت ام سلمہؓ ایک دن روزہ رکھا پھر کسی وجہ سے توڑ دیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قضا کا امر فرمایا اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ قضا واجب ہے۔
(۳) ارشادِ الٰہی ہے: لاتبطلوا اعمالکم یعنی اپنے اعمال کو باطل مت کرو۔

نہی کا صیغہ ہے اور اصل نہی میں تحریم ہے، جب عمل کا باطل کرنا حرام ہوا تو اس عمل کا قائم رکھنا ضروری ہوا یعنی شروع کرنے کے بعد پورا کرنا واجب ہے۔
(۴) اجماع سے بھی احناف کا مذہب ثابت ہے اگر کوئی نفل حج شروع کردے تو اس کا پورا کرنا واجب ہے توڑنا جائز نہیں، توڑنے پر اجماعاً قضا واجب ہے لہذا نفل نماز، روزہ کا بھی یہی حکم ہونا چاہئے۔
(۵) عبادت میں احتیاط اولیٰ ہے ظاہر ہے کہ عبادت کرنے اور عبادت چھوڑنے میں عبادت کرلینا احوط بالعمل ہے۔
(۶) سب سے بہتر دلیل وہ ہے جو صاحب بدائع نے جلد اول ص۲۹۰ میں بیان کیا ہے:۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولیوفوا نذورھم اور اپنی نذروں کو پورا کریں۔
اس پر سب کا اتفاق ہے کہ صحیح نذر (منت) کا پورا کرنا واجب ہے اور نذر کی دو قسم ہے:۔
۱ نذر قولی جو متعارف ومشہور ہے۔ ۲ نذر فعلی، نفل شروع کرنا نذر فعلی ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کیلئے کسی چیز کے کرنے کا زبانی عہد کرلیتا ہے تو عہد شکنی سے بچنے کے لئے اس کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے تو جس چیز کو انسان نیت کے ساتھ شروع کرچکا ہے اس کا اتمام تو بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔
واللہ لا ازید علی ھذا ولا انقص

اشکال زیادہ عبادت نہ کرنے پر قسم کیوں کھائی؟

جواب:۔ بعض دفعہ طرفین ذکر کرکے طرف واحد کی تاکید مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ مشتری ثمن میں کمی کا مطالبہ کرے تو بائع جواب میں کہتا ہے کہ اس میں کچھ بھی کمی بیشی نہ ہوگی۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کمی نہ ہوگی مگر تاکیداً بیشی کا لفظ بھی ساتھ ملانے کا عرف ہوچکا ہے۔ پس یہاں بھی صرف لا انقص مقصود ہے۔
(۲) یہ شخص اپنی قوم کی طرف سے نمائندہ بن کر آیا تھا اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات قوم تک پہونچانا ان کے ذمہ واجب تھا پس ان کے اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ارشادات کی تبلیغ میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کروں گا۔
(۳) یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ کیفیت میں کمی بیشی نہ کروں گا۔ یعنی فرض کو غیر فرض اور غیر فرض کو فرض نہ سمجھونگا، نیز فجر کی نماز دو رکعت کے بجائے چار اور ظہر میں چار کے بجائے دو نہ کروں گا۔
(۴) اس قول کو اس کے ظاہر پر رکھنا بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ میں نفل عبادت نہ کروں گا اور اس پر قسم کھانا اعراض و نفرت کی بناء پر نہیں بلکہ عدم الفرصۃ کی وجہ سے ہوگا۔
حضرت عثمانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں صرف بیعت ہونا چاہتا ہوں ذکر و شغل وغیرہ مجھ سے کچھ نہ ہوسکیگا فرمایا کہ کچھ نہ کرنا لیکن کم از کم سیکھ لو شاید کبھی دل چاہنے لگے۔ دوازدہ تسبیح کا طریق تعلیم فرمایا جو صرف

سیکھ لیا خیال تھا کہ ادا کر دوں گا نہیں۔
حاجی صاحب قدس سرہٗ نے یہ تصرف کیا کہ خادم سے فرمایا "ان کا بستر میرے قریب لگا دو" اچانک رات کو آنکھ کھلی حالانکہ جوانی کی عمر تھی رات کو کبھی اٹھنے کا خیال تک بھی نہ کیا تھا آنکھ کھلنے کے بعد پھر سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آرہی، خیال کیا کہ نیند نہیں آتی تو چلو آج حضرت کا بتایا ہوا وظیفہ ہی پڑھ لوں تہجد ادا کی پھر بڑے شوق سے ذکر کیا آخر ذکر کی ایسی چاٹ لگی کہ ساری رات ذکر ہی میں گذر جاتی۔ اسی طرح ممکن ہے کہ اس شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تو لا ازید کہا مگر بعد میں کثرت سے نفل عبادت کرنے لگے ہوں۔

افلح ان صدق اگر یہ شخص اپنے کلام میں سچا رہا تو کامیاب ہے۔
مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے افلح وابیہ ان صدق (مسلم اول ص۳۰) یعنی اس کے باپ کی قسم اگر یہ سچا رہا تو کامیاب ہوگا۔

اشکال اس میں غیر اللہ کی قسم ہے حالانکہ ارشاد نبوی ہے: لا تحلفوا بآبائکم (بخاری ص۹۸۳) جب غیر اللہ کی قسم ممنوع ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی؟

جواب:- علامہ شوکانی غیر مقلد نے نیل الاوطار میں بے سوچے سمجھے یہ جواب دیا ہے کہ ھو من فلتات لسانہ یعنی یہ قسم سبقت لسانی کے طور پر آپ سے صادر ہو گئی (العیاذ باللہ) یہ جواب بلا شبہ غلط ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بیجا جسارت ہے۔

جواب ۱: ممکن ہے کہ حلف بغیر اللہ کی حرمت سے قبل کا واقعہ ہو۔
۲: اس قانون سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ پر تو ظاہر ہے کہ کسی چیز کے حرام یا فرض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مستثنیٰ ہیں کہ وہاں علت حرمت مفقود ہے۔ حرمت بغیر اللہ کی علت یہ ہے کہ کہیں مقسم بہ کی عظمت مفضی الی الشرک نہ بن جائے، رسول میں اس کا کوئی احتمال نہیں۔
جواب ۳: یہاں لفظ رب محذوف ہے اصل ورب ابیہ تھا۔
۴: بعض مشائخ سے منقول ہے کہ یہ لفظ اصل میں تھا افلح واللہ کاتب کی غلطی سے افلح وابیہ ہوگیا۔ واللہ اعلم۔

طلحہ بن عبید اللہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ابو محمد ہے، حضرت طلحہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور ان آٹھ بزرگوں میں سے ہیں جو سابقین اسلام میں سرفہرست ہیں، نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنے کے لئے جن چھ بزرگوں کا انتخاب کیا تھا ان میں یہ بھی تھے۔ ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۳۶ھ کے افسوسناک جنگ جمل میں کسی طرف سے ایک تیر لگا اور شہید ہو گئے، شہادت کے وقت عمر مبارک ۶۴ سال یا ۶۲ سال یا ۵۸ سال تھی

سال کی تھی۔ ان سے کل ۸ ۳۸ حدیثیں مروی ہیں دو حدیثوں پر شیخین متفق ہیں اور دو روایتوں میں امام بخاری اور تین میں مسلم منفرد ہیں یعنی بخاری شریف میں ان کی کل چار حدیثیں اور مسلم میں پانچ۔

بابٌ ۳۵ اِتباعُ الجنائزِ من الایمانِ ص۱۲

جنازہ کے پیچھے چلنا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔

۴۵ ● حدثنا احمدُ بنُ عبدِاللّٰہ بنِ علیّ المَنجوفیُّ قال حدثنا رَوحٌ قال حدثنا عوفٌ عن الحسنِ ومحمدٍ عن ابی ھریرۃ اَنَّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال مَنِ اتبعَ جنازۃَ مسلمٍ اِیمانًا واحتسابا وکان معہ حتی یُصَلیَ علیھا وَ یَفرُغَ مِن دفنِھا فانہ یَرجِعُ مِنَ الاجرِ بقیراطین کُلُّ قیراطٍ مثلُ اُحدٍ و مَن صلی علیھا ثمّ رَجَعَ قبلَ اَن تُدفَنَ فانہ یَرجِعُ مِنَ الاجرِ بقیراطٍ تابعہ عثمانُ المؤذنُ قال حدثنا عوفٌ عن محمدٍ عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نحوَہ ●

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلے اور نماز اور دفن سے فراغت تک اس کے ساتھ رہے تو وہ دو قیراط ثواب کے ساتھ لوٹیگا ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے اور جو شخص صرف جنازے پر نماز پڑھ کر دفن کرنے سے پہلے واپس ہوجائے تو وہ ایک قیراط ثواب لیکر لوٹیگا۔ روح کی متابعت کی عثمان موذن نے انہوں نے کہا ہم سے عوف نے محمد بن سیرین کے واسطہ سے نقل کیا اور وہ ابوہریرہؓ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی روایت کے مطابق ای بمعناہ۔

مطابقتہ للترجمۃ:۔ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ من اتبع جنازۃ مسلم الخ

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری فی الایمان ص۱۲ وفی الجنائز ص۱۷۷

باب سابق سے ربط باب سابق سے ربط یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے اور جنازہ کے ساتھ چلنے میں ایک بات قدر مشترک ہے یعنی حقوقِ مسلم کی ادائیگی، یا اس طرح کہا جائے کہ جس طرح ایک فقیر و مفلس مسلمان کے حوائج و ضروریات دوسرے کے تعاون سے پورے ہوتے ہیں اسی طرح مرنے والا بھی اپنی ضروریات کے لئے تعاون کا محتاج ہے اسی قدر مشترک کی وجہ سے امام نے الزکوٰۃ من الاسلام کے بعد اتباع الجنائز کا باب منعقد کیا ہے۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصد مرجئہ کا رد ہے کہ جنازہ کے ساتھ جانا ایک عمل ہے پھر شرکت کرنے والوں کی شرکت کے فرق سے ثواب میں تفاوت بیان کیا گیا ہے جس سے

اعمال کے تفاوت سے ایمان میں کمی بیشی ثابت ہو گئی۔

تشریح

احناف و شوافع میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ جنازہ کے ساتھ چلنے والے جنازہ کے آگے رہیں یا پیچھے؟ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ جنازہ کے آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر طرف چلنا جائز ہے اختلاف صرف اولویت و افضلیت میں ہے۔ حضرات شوافع کہتے ہیں کہ میت کے ساتھ آگے چلنا چاہئے کیونکہ ساتھ جانے والے گویا سفارشی ہیں۔ اور حضرات احناف کہتے ہیں کہ میت کے ساتھ پیچھے چلنا افضل ہے، اس اختلاف کا تعلق جنازہ اٹھانے والوں سے نہیں بلکہ جنازہ کے ساتھ چلنے والوں سے ہے۔

حضرات شوافع؄ فرماتے ہیں کہ جنازہ کے ساتھ چلنے والے ایک سفارشی کی حیثیت میں ہوتے ہیں اور عام قاعدہ یہی ہے کہ مجرم پیچھے ہوتا ہے اور سفارشی آگے ہوتے ہیں۔

احناف کہتے ہیں کہ میت کو بارگاہ خداوندی میں مجرم کے طور پر پیش کرنے کا نظریہ درست نہیں ایسا ہوتا تو ملزم کو خستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑوں میں لیجاتے۔ مگر شریعت کا حکم یہ ہے کہ میت کو اچھی طرح نہلا دھلا کر صاف ستھرا کر کے اچھے اور نئے کپڑوں میں ملبوس کر کے خوشبو لگا کر تعظیم کے ساتھ لیجایا جائے۔ اور نماز جنازہ کے وقت بھی میت کو آگے ہی رکھتے ہیں۔

بہرحال احناف؄ کے نزدیک ساتھ جانے والوں کو میت کے پیچھے ہی چلنا افضل ہے یہی مفہوم لفظ اتباع سے معلوم ہوتا ہے۔ یہاں امام بخاری؄ نے ترجمہ میں لفظ اتباع رکھا اور حدیث میں بھی لفظ اتبع ہے اور لغت میں لفظ اتباع کے معنی پیچھے چلنے کے ہیں۔

نماز جنازہ کہاں افضل ہے؟

اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے یا نہیں؟

حضرات شوافع کا مسلک یہ ہے کہ نماز جنازہ افضل تو بیرونِ مسجد ہی ہے مگر مسجد کے اندر بھی بلا کراہت جائز ہے۔

حضرات احناف کے یہاں افضل یہ ہے کہ مسجد سے باہر ہو اور مسجد کے اندر مکروہ ہے۔

مزید تفصیل کتاب الجنائز میں آئیگی انشاء اللہ۔

ایمانا و احتسابا ایمان رکھ کر اور ثواب کی نیت سے۔

یعنی یہ دونوں چیزیں کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ چلنے کی باعث و محرک بنیں محض رسم و رواج یا خاندانی تعلق کی بنا پر نہ ہو جیسا کہ آج کل عموماً ہوا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احتساب کا لفظ ارشاد فرما کر نیت ثواب کی طرف متوجہ فرما دیا کہ اگر تم اپنے چھوٹے سے عمل کے ساتھ یہ نیت کر لو تو اجر و ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص میت کے ساتھ رہا اور نماز جنازہ میں شرکت کے بعد دفن تک ساتھ رہا تو وہ دو قیراط ثواب کے ساتھ لوٹتا ہے،

اور اگر کوئی شخص صرف نماز جنازہ میں شرکت کے بعد دفن کرنے سے پہلے واپس آجائے تو اس کو ایک قیراط کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور قیراط بھی دنیا کا نہیں جو دینار کا بارہواں حصہ ہوتا ہے بلکہ آخرت کا قیراط مراد ہے جس کی مقدار جبل اُحد کے برابر ہے اور مقصود اس سے ترغیب ہے اور اس سے تفاضل ایمان کی طرف بھی کچھ اشارہ ہوگیا۔ تابعہ عثمان المؤذن اس حدیث میں رَوح کی متابعت عثمان موذن نے کی ہے۔ یعنی انہوں نے اپنی سند سے یہ حدیث بیان کی، مقصد یہ ہے کہ جو رَوح کے طریق سے ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی گئی ہے اس کی موافقت میں عثمان موذن سے بھی ایک روایت منقول ہے، امام بخاریؒ یہ فرق بتانا چاہتے ہیں کہ میری روایت باللفظ ہے اور عثمان کی روایت بالمعنی ہے اس لئے بجائے مثلہ کے نحوہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

● بابُ خوفِ المؤمنِ مِن اَن یَّحبطَ عملُہٗ وھو لا یشعر۔ وقال ابراھیمُ التیمیُّ ما عرضتُ قولی علی عملی الّا خشیتُ اَن اکونَ مُکذِّباً۔ وقال ابنُ ابی مُلیکۃَ ادرکتُ ثلثین مِن اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کلُّھم یخافُ النفاقَ علیٰ نفسہ ما مِنہم احدٌ یقولُ اِنّہ علیٰ ایمانِ جبریلَ ومیکائیلَ ویُذکر عن الحسنِ ما خافہ الّا مؤمنٌ ولا امنہ الّا منافقٌ وما یحذّرُ مِن الاصرارِ علی التقاتلِ والعصیانِ مِن غیر توبۃٍ لقولِ اللّٰہ تعالیٰ "ولم یُصرّوا علیٰ ما فعلوا وھم یعلمون" ●

ترجمہ مومن کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں اس کا عمل اکارت نہ ہوجائے اور اس کو خبر نہ ہو، اور ابراہیم تیمیؒ نے کہا (جو واعظ تھے) کہ جب بھی میں نے اپنے قول کا عمل سے موازنہ کیا تو یہ خوف ہوا کہ کہیں میں (شریعت کے) جھٹلانے والوں میں سے نہ ہوں، اور ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ سے ملا ان میں سے ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا ڈر لگا ہوا تھا ان میں سے کوئی بھی یہ نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کے ایمان جیسا ہے، اور حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو مومن ہے اور نفاق سے بے فکر نہیں رہتا ہے مگر منافق، اور ان امور کا بیان جن سے ڈرایا جاتا ہے یعنی باہمی جنگ اور گناہوں پر بغیر توبہ کے اصرار کرنا (اڑے رہنا) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سورۂ آل عمران میں) اور وہ لوگ جان بوجھ کر اپنے (برے) کام پر اصرار نہیں کرتے۔

ربط باب سابق میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اتباع جنازہ اور دفن میں شرکت سے ثواب عظیم اس وقت حاصل ہوگا جبکہ ایمان واحتساب کے ساتھ ہو کسی دنیوی غرض سے نہ ہو بلکہ خالصاً لوجہ اللہ ہو۔ اب اس باب میں یہ بیان کرتے ہیں کہ کبھی عمل کے ساتھ یا بعد میں ایسی چیزیں عارض ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے انسان ثواب موعود سے محروم ہوجاتا ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا اس لئے انسان کو عمل کے وقت اور بعد میں ایسے عوارض سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے اجر موعود کے سوخت

ہوجانے کا خطرہ ہو۔

اس باب میں دو ترجمے ہیں، ایک تو خوف المؤمن ان یحبط عملہ وھو لا یشعر ہے یعنی مؤمن کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کسی وقت غفلت و بے شعوری میں اس کا کوئی عمل اکارت نہ ہوجائے۔

دوسرا ترجمہ ہے "ما یحذر من الاصرار علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ"۔ یعنی ان امور کا بیان جن سے مؤمن کو ڈرایا جاتا ہے، مثلاً باہمی جنگ اور گناہوں پر بغیر توبہ کے اصرار کرنا۔

امام بخاریؒ نے پہلے ترجمہ کے اثبات کیلئے ابراہیم تیمیؒ وغیرہ کے اقوال ذکر کئے ہیں، اور دوسرے ترجمہ کے لئے دو حدیثیں ذکر کیں۔ چونکہ احادیث میں اصرار من غیر توبہ کا ذکر نہیں تھا اس لئے ایک آیت ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون ذکر کرکے اس کمی کو پورا کردیا۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا اصل مقصد اس باب سے بھی مرجئہ کی تردید ہے لیکن امام نے اس باب سے دوسرا طرز اختیار کیا ہے۔ اب تک مکملات ایمان کو بیان کیا تھا اور اب اس باب سے مضرات ایمان کو بیان فرما رہے ہیں۔

مرجئہ کہتے ہیں کہ عمل لاشئ محض ہے، عمل نہ تو ایمان کا جزء حقیقی ہے نہ جزء تکمیلی، تو امام بخاریؒ نے اب تک یعنی اتباع الجنائز تک من الایمان، من الاسلام اور من الدین کے ابواب منعقد کرکے یہ بتلادیا کہ یہ سارے اعمال ایمانِ کامل کے اجزاء ہیں، ان سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، رونق بڑھتی ہے۔ اب اس باب میں دوسرے پہلو سے مرجئہ کی تردید کر رہے ہیں، مرجئہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لا تضر مع الایمان معصیۃ۔

امام اس باب سے بتلا رہے ہیں کہ معصیت ایمان کو ضرر پہونچاتی ہے، اگر ایمان کے لئے معصیت مضر نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان تحبط اعمالکم نہ فرماتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان تحبط اعمالکم ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ معصیت کی وجہ سے عمل برباد ہوتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھی جبکہ انسان معصیت پر اصرار کرے اور توبہ نہ کرے تو کفر تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔

خوف المؤمن ان یحبط عملہ وھو لا یشعر مؤمن کو بے شعوری میں حبطِ عمل سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ یہ ترجمۃ الباب ایک آیت سے مقتبس ہے یاایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون (سورۂ حجرات) اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کی تعلیم دی گئی ہے کہ جس طرح سے آپس میں ایک دوسرے سے بلاتکلف ہوکر یا ترُخ کر بات کرتے ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا بے ادبی ہے ممکن ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکدر پیش آئے جس سے اندیشہ ہے کہ کہیں تمہارے سارے اعمال ضائع و اکارت نہ ہوجائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

بعض چیزیں بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ جیسے ڈائنامائٹ، ذرا سا ہوتا ہے مگر پہاڑ کو ٹکڑے ٹکڑے کردیتا ہے۔

اشکال اہل سنت والجماعت کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ کفر کے علاوہ کوئی معصیت محبط اعمال نہیں اور معتزلہ کے نزدیک چونکہ معاصی مخرج عن الایمان ہیں اس لئے معاصی محبط اعمال بنتے ہیں چنانچہ علامہ زمخشری نے اس مسئلہ میں آیت مذکورہ سے استدلال کیا ہے کہ رفع صوت فوق صوت النبی کفر نہیں مع ہذا ان تحبط اعمالکم فرمایا گیا معلوم ہوا کہ کفر کے علاوہ دوسرے معاصی بھی محبط اعمال ہیں۔

جواب:۔ جوابات تو مختلف دیئے گئے ہیں لیکن سب سے بہترین جواب ابن منیر مالکیؒ کا ہے جو حاشیۂ کشاف میں ہے جو دو مقدموں پر موقوف ہے۔

(۱) چھوٹے شخص کا بڑے کے سامنے بآواز بلند کلام کرنا بعض دفعہ موجب ایذاء بن جاتا ہے۔

(۲) ایذاء نبی بالاجماع کفر ہے اللہ تعالیٰ نے ایذاء نبی پر سزائے سخت کا اعلان فرمایا ہے: والذین یؤذون رسول اللہ لھم عذاب الیم (سورہ توبہ)

پس چونکہ رفع صوت فوق صوت النبی کے بعض افراد موجب کفر ہیں اور اس میں امتیاز بھی مشکل ہے کہ کس حد تک رفع صوت موجب کفر ہے اور کس حد تک نہیں لہذا حسماً للمادہ ہر رفع صوت سے منع فرمادیا تاکہ غیر شعوری طور پر بعض افراد کے ارتکاب سے کفر نہ لازم آجائے جس سے تمام اعمال حبط (اکارت) ہوجائیں گے اس کی نظیر یہ ہے یایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم (حجرات) حالانکہ بعض ظن اثم (گناہ) ہے مگر کثیر ظن سے بچنے کا حکم فرمایا کہ امتیاز مشکل ہونے کی وجہ سے مبادا ایسے ظن میں مبتلا ہوجائیں جو کہ اثم (گناہ) ہو۔

قال ابراھیم التیمی امام بخاریؒ نے پہلے ترجمہ کے اثبات کے لئے سب سے پہلے ابراہیم تیمیؒ کا قول پیش کیا ہے ما عرضت قولی علی عملی الا خشیت ان اکون مکذبا میں نے اپنے گفتار و کردار کو جب ملایا تو مجھ کو ڈر ہوا کہ کہیں میں (شریعت کے) جھٹلانے والوں میں سے نہ ہوں۔

مکذبا اسم فاعل (بکسر الذال) بھی ہوسکتا ہے اور اسم مفعول (بفتح الذال) بھی۔

اگر اسم فاعل ہو تو اس میں دو احتمال ہے ۱: مکذبا للدین ۲: مکذبا لنفسی

پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب میں ایمان کے مقتضیٰ پر عمل نہ کروں گا تو گویا اپنے عمل سے دین کو جھٹلانے والا ہوں، کیونکہ اگر ایمانیات اور اعمال ایمانیہ کارآمد و مفید ہوتے تو بھلا میں اس پر عمل کیوں نہ کرتا؟ معلوم ہوا کہ ایمان کا مذہب حق ہونا اور اسلامی امور و احکام کے اچھے ہونے کا دعویٰ زبانی ہے دل سے اسے نہیں مانتے ورنہ اس پر ضرور عمل کرتے۔ اس صورت (یعنی مکذبا للدین کی صورت) میں ایک معنیٰ مشابہا للمکذبین بھی ہوسکتے ہیں یعنی عمل کے اعتبار سے دین کی تکذیب کرنے والوں سے مشابہت کی وجہ سے میرا شمار بھی

دین کے جھٹلانے والوں میں سے نہ ہو جائے کیونکہ منافقین میں طلاقتِ لسانی تو بہت ہوتی ہے لیکن عمل کے میدان میں وہ صفر ہوتے ہیں۔

دوسری صورت مکذ بالنفس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب میں اپنے قول کو اپنے عمل پر پیش کرتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ میں اپنے کو جھوٹا تو نہیں کہہ رہا ہوں کیونکہ میری بات سچی ہوتی تو اس پر عمل ضرور کرتا۔

بہرکیف شراح بخاری کی رائے یہ ہے کہ اسم فاعل ہی کا صیغہ زیادہ راجح ہے لیکن فتحہ کی روایت بھی ثابت ہے اس صورت میں مفعول کا صیغہ ہوگا معنی یہ ہوں گے کہ جب میں اپنے قول وعمل کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جھٹلا دیا جاؤں کہ تیرا قول وعمل یکساں نہیں ہے یعنی ہر دیکھنے والے مجھے جھوٹا کہیں گے۔

حضرت ابراہیم تیمیؒ بڑے عابد زاہد متقی و پرہیزگار تابعی تھے، واعظ تھے اور عامل بھی تھے اس لئے ابراہیم تیمیؒ کا یہ قول تواضع اور غلبۂ خشیت پر مبنی ہے یہ ان واعظین میں سے نہ تھے جن کے متعلق حافظ شیرازی نے کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب ومنبر می کنند ؛ چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگری کنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ؛ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ان کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے " یایها الذین اٰمنوا لمَ تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند الله ان تقولوا مالا تفعلون (پ۲۸ ع۹)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ: ان ابراهيم هو ابن زيد بن شريك الكوفی قتله الحجاج بن يوسف وقيل مات فی سجنه الخ یعنی حجاج بن یوسف مشہور ظالم نے حضرت ابراہیم نخعیؒ کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن سپاہی نے ہمنام ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم تیمیؒ کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا، لوگوں نے کہا کہ آپ کو غلطی سے پکڑا گیا ہے آپ صفائی پیش کریں، فرمایا مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنے کو بچا کر ایک بے گناہ کی سزا کا سبب بنوں چنانچہ اسی جیل میں ۹۲ھ میں وصال فرمایا۔

وقال ابن ابی ملیکة الخ (بضم الیم) عبداللہ بن عبیداللہ القرشی المکی التیمی الخ تابعین کے علماء مشاہیر میں سے ہیں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے قاضی اور موذن تھے ۱۱۷ھ میں وفات ہوئی

امام بخاریؒ پہلے ترجمہ کے اثبات کے سلسلہ میں ابراہیم تیمیؒ کے بعد عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکة کا قول پیش کرتے ہیں:۔

ادرکت ثلاثین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخاف النفاق علی نفسه

ابن ابی ملیکة فرماتے ہیں کہ میں تیس صحابہ سے ملا ان میں سے ہر ایک نفاق سے ڈرتا تھا، یعنی نفاق عملی سے ڈرتا تھا یا یوں کہا جائے کہ یہاں نفاق سے دونوں نفاق مراد ہے۔

اس سے اہلِ بدعت مرجئہ کی تردید ہوگئی جو ایمان کے ساتھ اعمال کی اہمیت نہیں دیتے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل خوف وخشیت الٰہی سے معمور تھے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا سکہ ان کے قلوب پر تھا جس کی وجہ سے ہر وقت ترساں ولرزاں رہتے تھے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے مقدس خلیفہ جو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جنت کی بشارت سن چکے تھے اور آپؐ کے وزیر ومشیر تھے، صاحب ستر رسول حضرت حذیفہ رضؓ سے پوچھا کرتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام منافقین میں تو نہیں لیا؟ یہ سب اسی کا ثمرہ تھا الایمان بین الخوف والرجاء۔

احیاء العلوم میں حضرت عمر فاروق رضؓ کا ایک اثر منقول ہے کہ بالفرض میدان حشر میں اگر اللہ تعالیٰ کیطرف سے یہ اعلان ہو جائے کہ پوری مخلوق میں سے ایک شخص کے علاوہ کوئی دوزخی نہیں ہوگا تو مجھے خوف واندیشہ رہیگا کہ وہ ایک شخص شاید میں ہی ہو جاؤں۔ اور اگر یہ اعلان ہو جائے کہ صرف ایک شخص جنت میں جائیگا تو مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے امید ہوگی کہ شاید وہ شخص میں ہی ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید اور اس کے عذاب سے بے خوف ہونا دونوں کفران وخسران کے آثار ہیں۔

مامنھم احد یقول انہ علی ایمان جبریل ومیکائیل ان صحابہ میں سے کوئی یوں نہیں کہتا تھا کہ میرا ایمان جبریلؑ اور میکائیلؑ کا سا ہے۔

بعض مشائخ درس کا خیال ہے کہ اس جملہ کے نقل سے بظاہر امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ پر تعریض ہے لیکن شراح معروفین نووی، کرمانی، حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ حافظ عینی، قسطلانی اور تیسیر القاری کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اس جملہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تردید مقصود ہے اور اس کے لئے ایک واضح قرینہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے کلام میں ایمانی کا ایمان جبریل ومیکائیل ہے اور امام اعظمؒ سے کسی کتاب میں میکائیل کا لفظ منقول نہیں اس لئے کچھ بعید نہیں کہ امام بخاریؒ کے معاصرین میں سے کسی مرجئہ اہل بدعت کا یہ قول ہو جس کی تردید مقصود ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کی عبادت واستقامت، اخلاص وللہیت، تقویٰ اور خوف وخشیت مشہور خلائق ہے جو تواتر سے ثابت ہے۔ امام بخاریؒ اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے اس لئے اس ترجمۃ الباب اور اس قسم کے اقوال سے ان کی تردید مقصود ہی نہیں ہو سکتی، اس قسم کے تراجم سے اسی کی تردید مقصود ہو سکتی ہے جو معاصی کو مضر نہ سمجھتا ہو، اور جو یہ کہتا ہو کہ انبیاء ورسل وصدیقین اور عام مومنین کا ایمان یکساں ہے ان میں کوئی تفاوت نہیں، پھر اس سلسلے میں امام بخاریؒ جو روایت ذکر کی ہے اس میں صاف مرجئہ کا لفظ ہے۔ اور سباب المسلم فسوق سے اسی کی تردید ہو سکتی ہے جو معصیت کو مضر نہ سمجھتا ہو، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تو مسلک ہی یہ ہے کہ سباب المسلم فسوق، پس اس سے امام اعظمؒ کی تردید کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ غیر مقلدین امام بخاریؒ کو بیوقوف سمجھتے ہیں اس لئے اس قسم کی باتیں ان کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ امام اعظمؒ کی تردید ہے گویا وہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ کی بات

سمجھا ہی نہیں اس لئے کہ امام اعظمؒ کا مقولہ یہ ہے کہ ایمانی کایمان جبریل پس امام اعظمؒ نے ایمانی کایمان جبریل کہہ کر مثل ایمان جبریل کی نفی فرمادی اور اس کی تصریح موجود ہے۔ "از امام ابوحنیفہ مروی است کہ گفت" اقول ایمانی کایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل: چہ مثلیت مقتضی مساوات است در جمیع صفات وتشبیہ کاف آں رانمی خواہد بل مساوات در بعض کافی است ذکرہ ابن الہمام فی المسائرۃ۔ (شیخ الاسلام برحاشیہ تیسیر القاری ج ۱ ص ۱۰۳)

اور قاعدہ ہے کہ کاف سے ذات کے اندر تشبیہ مقصود ہوتی ہے اور مثل سے جمیع صفات میں۔

تو امام صاحبؒ نے ذات ایمان (عین ایمان) میں اپنے ایمان کو ایمان جبرئیلؑ سے تشبیہ دیا اور صفات میں برابری کی نفی فرمادی لہٰذا امام صاحب کا مقصد یہ ہوا کہ جن جن چیزوں پر ان کا ایمان ہے ان ہی پر ہمارا بھی ایمان ہے مومن بہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، البتہ رہے اوصاف ان میں یقیناً جبرئیلؑ کا جیسا ایمان نہیں ہوسکتا علامہ شامیؒ نے رد المحتار میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ خلاصۃ الفتاوٰی میں امام صاحبؒ سے یہ منقول ہے:

"اکرہ ان یقول الرجل ایمانی کایمان جبرئیل ولکن یقول اٰمنت بما اٰمن بہ جبرئیل" اس سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ تعبیری اختلاف کے باوجود مآل ایک ہی بات ہے کہ مومن بہ کا اتحاد ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا اصل مقصد یہ ہے کہ میرا اور حضرت جبرئیل امینؑ کا مومن بہ ایک ہے، جن چیزوں کی تصدیق سے حضرت جبرئیلؑ مومن ہوئے ہیں میں بھی ان ہی کی تصدیق سے مومن ہوں یہ مقصد نہیں کہ کیفیاتِ ایمان وجملہ صفات میں میں جبرئیلؑ کے برابر ہوں اور مومن بہ کے اتحاد پر خود نصِ قرآنی شاہد ہے:

اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ	ایمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو ان کے پاس نازل ہوئی
والمومنون۔ (بقرۃ)	ان کے رب کی طرف سے اور مؤمنین بھی۔

اس آیتِ کریمہ سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ عامۂ مؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کا مومن بہ ایک ہے۔

حسن بصریؒ کا قول

امام بخاریؒ پہلے ترجمہ "خوف المؤمن من أن یحبط عملہ" کے اثبات کے لئے ابن ابی ملیکہ کے بعد حسن بصریؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

ویذکر عن الحسن ماخافہ الا مومن ولا امنہ الا منافق حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو ایماندار ہوتا ہے اور اس سے نڈر وہی ہوتا ہے جو منافق ہے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ اسے خوف بھی رہتا ہے اور طمع بھی، اس لئے کبھی اپنے اعمال پر اطمینان واعتماد نہیں کرتا بلکہ ہر وقت نفاق عملی سے خائف رہتا ہے۔ امام نوویؒ، ابن التین اور متأخرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ ماخافہ اور لا امنہ میں ضمیر منصوب اللہ کی طرف راجع ہے، اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ سے وہی ڈریگا جو مومن ہو اور اس سے بے خوف وہی رہیگا جس کے دل میں نفاق ہو یہ معنیٰ اگرچہ صحیح ہیں

قال اللہ تعالیٰ: ولمن خاف مقام ربه جنتان۔ وقال ایضاً: فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون
بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا خوف محمود و مطلوب ہے مگر یہاں یہ معنی مصنفؒ کی مراد اور خود حسن بصریؒ کے سیاق کلام کے خلاف ہے۔ حافظ عسقلانیؒ نے فتح الباری میں حسن بصریؒ سے روایت نقل کی ہے: واللہ مامضیٰ مؤمن ولابقی الا وھو یخاف النفاق وما امنه الا منافق (فتح الباری ...) اللہ کی قسم کوئی مؤمن نہیں جو نفاق سے ڈرتا نہ ہو اور منافق اس نفاق سے بے فکر رہتا ہے۔ دوسرے طرق سے بھی حسن بصریؒ سے ایسی روایات منقول ہیں جن میں لفظ نفاق کی تصریح موجود ہے۔ علامہ عینیؒ نے بھی متعدد طرق سے نقل کیا ہے سب کا حاصل یہی ہے کہ ماخافه کی ضمیر نفاق کی جانب راجع ہے اور ابن ابی ملیکہؒ کے اثر کے موافق بھی یہی ہے کیونکہ اس میں یہی ہے کلھم یخاف النفاق علیٰ نفسه۔ اب معنی یہ ہوں گے کہ نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو مومن ہے اور اس نفاق سے وہی نڈر ہوتا ہے جو منافق ہے۔

یذکر صیغۂ مجہول ہے، اور صیغہ مجہول سے کسی چیز کا تذکرہ اس بات کی دلیل سمجھا جاتا ہے کہ اس کی سند میں ضعف ہے حالانکہ یہاں حسن بصریؒ کا قول بالکل صحیح ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اپنے شیخ ابو الفضل بن الحسینؒ سے ایک قاعدہ نقل کیا ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک اس قسم کے صیغہ کا استعمال صرف ضعف سند ہی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ متن کا ذکر بالمعنی کریں یا کسی قول کے بیان اختصار کریں تب بھی یہ صیغہ لاتے ہیں، امام بخاریؒ نے اس سے پہلے ابراہیم تیمی اور ابن ابی ملیکہ کے قول کے نقل میں کوئی تغیر یا اختصار نہیں کیا اس لئے ان کا ذکر صیغہ جزم سے فرمایا، اور حسن بصریؒ کے قول کو نقل بالمعنی کے طور پر مختصراً ذکر کیا ہے اس لئے اس کے نقل کیلئے صیغہ تمریض استعمال فرمایا اب اس باب کے دوسرے ترجمہ کی تشریح کی جاتی ہے۔

وما یحذر من الاصرار اس کا عطف خوف المومن پر ہے، ما یحذر میں ما مصدریہ ہے جو فعل کو مصدر کے معنی میں بنا دیتا ہے۔ یہاں جس چیز سے ڈرایا گیا وہ اصرار علی المعاصی ہے۔

من غیر توبة تفسیر ہے اصرار کی، یعنی دوسری وہ چیز جس سے مومن کو ڈرنا چاہئے وہ گناہ پر اصرار ہے جو بہت خطرناک ہے۔

اصرار علی المعصیۃ اس وقت بولا جاتا ہے جب آدمی میں جسارت بیجا ہوجائے، گناہ پر گناہ کرتا رہے اور ذرا بھی ندامت نہ ہو کہ توبہ واستغفار کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اگر توبہ کرلی تو مٹ گیا ورنہ جوں جوں گناہ کرتا جائیگا وہ نقطہ بڑھتا جائیگا، یہاں تک کہ تمام قلب سیاہ ہوجاتا ہے، یہی وہ رین (زنگ) ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون " زنگ پکڑ گیا ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے، یعنی ہماری آیتوں میں شک وشبہ کا کوئی موقعہ ہی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ گناہوں کی پے در پے کثرت سے ان سب کے دلوں پر زنگ چڑھ گئے اس لئے حقائق صحیحہ کا انعکاس ان میں نہیں ہوتا۔

ترجمۃ الباب میں من غیر توبۃ اس لئے فرمایا کہ اگر گناہ کے بعد بندہ نادم ہو جائے، سچے دل سے توبہ کرلے پھر بشریت کی بنا پر گناہ صادر ہو جائے تو اسے اصرار نہیں کہا جاتا، ترمذی شریف میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما اصرّ من استغفر وان عاد فی الیوم سبعین مرّۃ۔

۴۶ ● حدثنا محمدُ بنُ عَرْعَرۃَ قال حدثنا شعبۃُ عن زُبَیْدٍ قال سألتُ ابا وائلٍ عن المُرجِئۃِ فقال حدثنی عبدُ اللّٰہِ اَنَّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال سِبابُ المسلمِ فسوقٌ وَقِتالُہ کفرٌ ●

ترجمہ حضرت زبید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو وائل سے مرجئہ کے (عقائد کے) بارے میں دریافت کیا (وہ لوگ ایمان کے ساتھ معصیت کو مضر نہیں سمجھتے) تو انھوں نے کہا کہ مجھ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور مسلمان سے قتال کرنا کفر ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "حدیث عبد اللہ ھذا للترجمۃ الثانیۃ وھی قولہ ومایحذر من الاصرار الی آخرہ (عدج ص۲۷۷)

یعنی مرجئہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ اور دوسرے معاصی مثلاً مسلمانوں کو گالی دینے والا فاسق نہیں ہے حالانکہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔

(۲) ترجمۃ الباب کے جزء اول خوف المؤمن من ان یحبط عملہ الخ سے بھی حدیث کی مطابقت ہو سکتی ہے کیونکہ اس حدیث میں قتالہ کفر فرمایا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ مومن سے قتال کو جائز و حلال سمجھنا کفر ہے جس سے حبط اعمال کا خطرہ ظاہر ہے۔

تعدد الحدیث: اخرجہ البخاری ھھنا فی الایمان ص۱۲ ایضاً فی الادب ص۸۹۳ وفی الفتن ص۱۰۴۸

تشریح ابو وائل (شقیق بن سلمہ کوفی کبار تابعین میں سے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت عمارؓ وغیرہ سے روایت کی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دس سال کے تھے جس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا مگر چونکہ زیارت نہ کرسکے اس لئے صحابہ میں شمار نہیں ہے ۸۲ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت ابو وائلؓ سے مرجئہ کے عقیدہ سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں حدیث پڑھی:

سباب المسلم فسوق وقتاله کفر یعنی اگر عقیدۂ مرجئہ کے مطابق ایمان میں سیئات مضر نہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سباب مسلم کو فسق اور اس سے قتال کو کفر کیوں قرار دیا ؟

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ معاصی انسان کو فاسق بنا دیتی ہے اور بعض کفر تک پہونچا دیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ کفر و فسق ایمان کے لئے مضر ہیں، کفر تو ایمان کی ضد ہی ہے لیکن فسوق و عصیان بھی کفر ہی کے شعبے ہیں، ارشاد خداوندی ہے: ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینه فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان (سورۂ حجرات) اللہ نے محبوب بنا دیا تمہارے دلوں میں ایمان کو اور آراستہ کرکے تمہارے دلوں میں اس کو رچا دیا اور کفر و فسق اور عصیان کی نفرت ڈال دی۔

آیت کریمہ میں کفر، فسوق و عصیان کو ایمان کے مدمقابل ذکر کیا گیا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ فسوق و عصیان بھی کفر ہی کے شعبے ہیں، پھر ایمان کو محبوب بنا دینے اور کفر و فسوق و عصیان کو ناگوار بنا دینے کا احسان جتایا گیا ہے پس اگر فسوق و عصیان مضر نہ ہوتے تو ان سے نفرت مومن کی شان کیوں بتائی جاتی۔

مرجئہ کی مؤثر تمویہ (۱) جس طرح حالت کفر میں حسنات نافع نہیں اسی طرح حالت ایمان میں سیئات مضر نہیں۔ (۲) جیسے کفر جنت میں نہیں جا سکتا اسی طرح ایمان جہنم میں نہیں جا سکتا۔

جواب :- قرآن و حدیث کے مقابلہ میں تلبیسات ابلیس سے کام نہیں چل سکتا، عصاۃ المؤمنین کا جہنم میں جانا نصوص صریحہ متواترہ سے ثابت ہے لہذا مرجئہ کے تلبیسات کا عقلی جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں مگر مع ہذا تبرعاً جواب دیا جاتا ہے :

تمویہ اول کا جواب :- ایمان و کفر کی مثال حیات و موت جیسی ہے، ایمان حیات القلب ہے اور کفر موت القلب، اور حیات میں سیکڑوں درجات ہیں، ایک ضعیف بچے کی حیات ہے اور ایک پہلوان کی، دونوں کے درمیان حیات کے صدہا درجات ہیں، اور موت کا صرف ایک ہی درجہ ہے یعنی لاشیئ محض، یہاں دوسرا درجہ متصور ہی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کفر سے سب اعمال ہباءً منثورہ ہو جاتے ہیں، اور میت کی طرح لاشیئ ہو جاتے ہیں، بخلاف معصیت کے اگرچہ نقص ایمان کا سبب ہے مگر مزیل ایمان نہیں، جیسے کہ قطع اعضاء عن الجسم اگرچہ مضر ہے مگر مزیل حیات نہیں، اب اگر کوئی یوں کہے کہ جیسے میت کے لئے سلامۃ الاعضاء مفید نہیں اسی طرح زندہ کے لئے قطع اعضاء مضر نہیں تو کیا اس قیاس کو کوئی صحیح العقل قبول کر سکتا ہے ؟

تمویہ ثانی کا جواب :- کفر اس لئے جنت میں نہیں جا سکتا کہ اس کے ساتھ جنت میں لیجانے والی چیز نہیں، بخلاف ایمان العصاۃ کے کہ اس کے ساتھ جہنم میں لیجانے والے اسباب یعنی سیئات موجود نہیں ہیں، عصاۃ المؤمنین کی مثال میلے کپڑے کی طرح ہے جو صفائی کے لئے دھوبی کو دیا جاتا

ہے اور کافر بوسیدہ کپڑے کی طرح ہے جو دھلنے کے قابل ہی نہیں، ہاتھ لگانے سے ہی ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔

توجیہ صوفیا رحمہم اللہ تعالیٰ حضرات صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عصاۃ المؤمنین کو جہنم میں ڈالتے وقت ان کے قلوب سے ایمان کو نکال لیا جائیگا جیسے قیدیوں کا اصلی لباس باہر ہی اتار دیا جاتا ہے اور جیل کا مخصوص لباس پہنا کر اندر داخل کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر دوسری حدیث میں ہے ولا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مؤمن (الحدیث) اس کی تفسیر خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے اذا زنی العبد خرج عنہ الایمان حتی یصیر الیہ کالظلۃ فاذا اقلع رجع الیہ الایمان۔

مگر روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں عصاۃ المؤمنین کے قلب پر ایمان کا اثر معلوم ہوگا ان کے قلوب نار جہنم سے محفوظ رہیں گے، بعض روایات میں مواضع سجود کا محفوظ رہنا بھی مذکور ہے، اور آیۃ کریمہ تطلع علی الأفئدۃ کفار کے بارے میں ہے، اگر بالفرض شمول مؤمنین بھی تسلیم کرلیا جائے تو اطلاع علی الفؤاد اثر علی الفؤاد کو مستلزم نہیں۔

تلبیس خوارج ومعتزلہ خوارج ومعتزلہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ بعث اور حساب وکتاب پر یقین نہیں اس لئے وہ خارج عن الایمان ہے، اگر اسے قیامت پر یقین اور بدعملی کی سزا پر ایمان ہوتا تو ہرگز کبیرہ کا ارتکاب نہ کرتا چنانچہ جو شخص سانپ کے مہلک ہونے کا یقین رکھتا ہو وہ کبھی اس کے بل میں انگلی داخل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا پس ارتکاب کبیرہ عدم یقین کی دلیل ہے۔

جواب: ارتکاب کبیرہ عدم یقین کو مستلزم نہیں، قیامت اور حساب وکتاب، جزا وسزا کا یقین کامل ہوتے ہوئے بھی ارتکاب کبیرہ کی جرأت اس لئے ہوجاتی ہے کہ اس یقین کا استحضار نہیں رہتا، نیز امید عفو جری بنا دیتی ہے اگرچہ اس امید پر گناہوں کا ارتکاب سخت غلطی ہے مگر نصوص قرآنیہ قل یٰعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو الغفور الرحیم۔

ولا تیئسوا من روح اللہ انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء۔ وغیرھا من الآیات والاحادیث۔

اور توفیق توبہ کے پیش نظر انسان حساب وکتاب پر یقین رکھتے ہوئے بھی گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

قولہ سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر" سباب بکسر السین کقتال، اس سے بھی معتزلہ وخوارج استدلال کرتے ہیں بایں طور کہ قتالہ کفر میں حقیقی کفر مراد ہے، کفر دون کفر کی تاویل یہاں نہیں چل سکتی، کیونکہ جملۂ اولیٰ میں فسوق بھی کفر دون کفر ہے تو دونوں میں فرق کیا ہوگا؟ لہٰذا قتال المسلم ایضاً کفر ہوگا جو مخرج عن الایمان ہے۔

الزامی جواب: سباب المسلم بھی کبیرہ ہے لہٰذا اس کا ارتکاب بھی تمہارے یہاں مخرج عن الایمان ہونا چاہئے

تو دونوں جملوں میں کیا فرق رہا ؟ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

تحقیقی جواب: قتالہ کفر میں کفر دون کفر ہی مراد ہے مگر اس کفر کے درجات متفاوت ہیں لہذا جملہ اولیٰ میں فسوق اور ثانیہ میں کفر فرما کر اختلاف درجات کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ (ارشاد)

۴۷ ● حدثنا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ حدثنا اسمٰعيلُ بنُ جَعفرٍ عن حُمَيدٍ عن انسٍ قال اخبرنی عُبادةُ بنُ الصَّامتِ انَّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم خرجَ يُخبِرُ بليلةِ القدرِ فتلاحىٰ رجلانِ مِنَ المسلمينَ فقال اِنی خرجتُ لاُخبِرَكم بليلةِ القدرِ وَاِنَّه تلاحىٰ فلانٌ وفلانٌ فرُفِعَتْ وَعسىٰ اَنْ يَكُونَ خيراً لكم فالتمسوها فی السبعِ والتسعِ والخمسِ ●

ترجمہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے مجھے خبر دی کہ (ایک بار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب قدر کی معین تاریخ بتانے کے لئے باہر تشریف لائے اتنے میں (آپ نے دیکھا کہ) دو مسلمان آپس میں جھگڑ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں تو اس لئے باہر نکلا تھا کہ تمہیں شب قدر بتلاؤں، کہ فلاں فلاں جھگڑنے لگے تو وہ معین تاریخ (میرے دل سے) اٹھالی گئی، اور ہو سکتا ہے کہ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو اب اسے (رمضان کی) سات اور نو اور پانچ میں تلاش کرو۔

مطابقتہ للترجمۃ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: هذا الحديث للترجمة الاولیٰ و وجه تطابقه اياها من حيث ان فيه ذم التلاحی وان صاحبه ناقص لانه يشتغل عن كثير من الخير بسببه سيما اذا كان فی المسجد وعند جهر الصوت بحضرة الرسول صلی اللّٰه علیه وسلم بل ربما ينجر الیٰ بطلان العمل وهو لا يشعر۔ (عمدہ)

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب کے پہلے جزء "خوف المؤمن الخ" سے ہے۔

وجہ مطابقت یہ ہے کہ اس حدیث میں مسلمانوں کے باہمی جھگڑنے کی مذمت ہے اور یہ کہ باہمی جھگڑا بہت سی خیر و بھلائی سے محرومی و نقصان کا باعث ہوتا ہے بالخصوص مسجد میں اور وہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بلند آواز سے تو بسا اوقات حبط اعمال کا خطرہ ہے۔

(۲) وقال فی فیض الباری فی وجه المطابقة ان التنازع صار سببا لرفع علم ليلة القدر فكذا لك المعصية قد تكون سببا للحبط، یعنی جس طرح مسلمانوں کا باہمی نزاع شب قدر کے علم کے رفع کا سبب بن گیا اسی طرح معاصی بھی حبط اعمال کا سبب بن جاتے ہیں۔

تعدد الحدیث اخرجه البخاری ههنا فی الايمان ص ۱۲ وايضاً فی ليلة القدر ص ۲۷۱ وايضاً فی الادب ص ۸۹۳ ايضاً اخرجه النسائی فی الاعتكاف۔

تشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے لیلۃ القدر متعین طور پر بتلادی گئی تھی اور بظاہر اس رمضان میں جو لیلۃ القدر تھی اس کی تعیین بتلائی گئی تھی، صحابہ کو اس کی اطلاع دینے کے لئے آپ باہر تشریف لائے تو مسجد نبوی میں دو آدمی جھگڑا کر رہے تھے ایک کعب بن مالکؓ تھے جو قرض خواہ تھے اور دوسرے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمیؓ تھے جو مقروض تھے، اس قرض کے سلسلے میں دونوں میں کچھ تکرار ہوگئی بعض روایتوں میں ہے ارتفع صوتہما فی المسجد آپ نے قرض خواہ سے فرمایا کہ نصف معاف کردو، انھوں نے معاف کردیا پھر آپ نے قرضدار سے فرمایا کہ بقیہ ادا کردو، جھگڑا تو ختم ہوگیا اس دوران میں آپ کے ذہن مبارک سے وہ بات نکل گئی، آپ نے بطور تنبیہ ارشاد فرمایا " میں تو تمہیں یہ بتلانے گھر سے باہر آیا تھا کہ لیلۃ القدر کس شب میں واقع ہو رہی ہے تاکہ تم بہ آسانی پاسکو لیکن فلاں فلاں شخص کا جھگڑا تمہاری محرومی کا سبب بن گیا، اور اسی جھگڑے کی نحوست کی وجہ سے لیلۃ القدر کی تعیین میرے دل سے اٹھالی گئی، شاید اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو۔

شیعہ یہ کہتے ہیں کہ لیلۃ القدر کا وجود ہی اٹھالیا گیا لیکن یہ بالکل غلط ہے، اگر لیلۃ القدر اٹھالی جاتی اس کی تلاش و جستجو کا حکم کیوں دیا گیا۔ حالانکہ صریح ارشاد ہے التمسوھا فی السبع والتسع والخمس۔

• **بابٌ سُؤالِ جبریلَ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم عنِ الایمانِ والاسلامِ والاحسانِ وعلمِ الساعۃِ وبیانِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم لہ ثم قال جاءَ جبریلُ علیہ السلامُ یُعَلِّمُکم دینَکم فجعلَ ذٰلک کلَّہٗ دیناً وما بیَّنَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم لِوَفدِ عبدِ القیسِ من الایمانِ وقولِہٖ تعالیٰ " وَمَن یَّبْتَغِ غیرَ الاسلامِ دیناً فلَن یُّقبَلَ منہ** • ص۱۲

ترجمہ حضرت جبرئیلؑ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے علم کے بارے میں سوال کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان باتوں کو ان سے بیان کرنا، پھر آپ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ تمہیں تمہارا دین سکھلانے آئے تھے۔ یہاں آپ نے ان تمام باتوں کو دین فرمایا اور (اس باب میں اس کا بھی بیان ہے) جو باتیں ایمان کے بارے میں آپ عبدالقیس کے وفد سے بیان فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ آل عمران میں)، جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائیگا۔

بابٌ مضاف الی السوال، والسوال مضاف الیٰ جبریل من اضافۃ المصدر الیٰ فاعلہ وجبریل لاینصرف للعلمیۃ والعجمۃ۔ قولہ النبیَّ منصوب لانہ مفعول المصدر۔ (عمدہ)

تشریح یہ ترجمۃ الباب ابواب سابقہ کے لئے جامع ہے، ابواب سابقہ میں ایمان، اسلام، اور دین کا اتحاد ثابت کیا گیا ہے، اور اس باب میں بھی اس کا اثبات ہے، بایں طور کہ پہلے حدیث

جبرئیلؑ لائے ہیں جس میں تمام احکام کو دین کہا گیا ہے، پھر وفد عبدالقیس کا قصہ بیان کیا جس میں تمام احکام کو ایمان کہا گیا ہے پس دین و ایمان کا اتحاد ثابت ہوا، پھر آیتِ کریمہ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ سے دین و اسلام کا اتحاد ثابت کیا۔ (ارشاد القاری)

ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "وجہ المناسبۃ بین البابین من حیث ان المذکور فی الباب الاول الخ یعنی اس سے قبل کے باب میں خوف المومن من ان یحبط عملہ الخ کا ذکر تھا اب اس باب میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایمان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ اور شریعت میں مؤمن کون ہے؟ (عمدہ ص۲۸۲)

۴۸ ● حدثنا مُسَدَّدٌ قال حدثنا اسمٰعیلُ بنُ ابراهیمَ اخبرنا ابو حَیّانَ التَّیمیُّ عن ابی زُرعۃ عن ابی ہریرۃ قال کان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم بارزا یوما للناس فاتاہ رجلٌ فقال ما الایمانُ قال الایمانُ اَن تؤمنَ باللہ وملٰئکتہ وبلقائہ و رُسُلہ وتؤمنَ بالبعثِ، قال ما الاسلامُ قال الاسلامُ اَن تعبدَ اللہ ولا تُشرِکَ بہ وتقیمَ الصلوٰۃَ وتؤدّیَ الزکوٰۃَ المفروضۃَ وتصومَ رمضانَ. قال ما الاحسانُ قال اَن تعبُدَ اللہ کانّکَ تراہُ فاِن لم تکن تراہُ فاِنّہ یراکَ قال متی السّاعۃُ قال مَا المسئولُ عنہا باعلَمَ مِنَ السائلِ وسأخبرُکَ عن اَشراطِہا اِذا وَلَدتِ الاَمۃُ ربَّہا واِذا تطاوَلَ رُعاۃُ الابِلِ البُہمِ فی البُنیانِ فی خمسٍ لا یَعلمُہُنَّ اِلّا اللہ ثمّ تلا النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم اِنّ اللہ عندہ علمُ السّاعۃِ الآیۃ ثمّ ادبَرَ فقال رُدّوہُ فلم یَرَوا شیئا فقال ہٰذا جبریلُ جاءَ یُعلّمُ النّاسَ دینَہم قال ابو عبدِ اللہ جَعَلَ ذٰلکَ کُلّہ مِنَ الایمانِ ● ص۱۲

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجمعِ عام میں تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے فرشتوں اور (آخرت میں) اللہ سے ملنے اور اس کے رسولوں اور دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھو اس نے سوال کیا اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ مفروضہ کو ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اس نے سوال کیا احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ تصور نہ ہو سکے کہ اسے دیکھ رہے ہو تو (یہ سمجھو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے" اس نے کہا قیامت کب آئیگی؟ آپؐ نے فرمایا جس سے تم پوچھ رہے ہو وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ البتہ میں تجھ کو اس کی نشانیاں بتائے دیتا ہوں" جب لونڈی اپنے آقا کو جننے لگے اور کالے اونٹوں کے چرواہے لمبی لمبی عمارتوں کے بنانے میں تفاخر

کرنے لگیں (بڑے امیر بن جائیں) قیامت کا وقت معین غیب کی ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آپ نے (سورۂ لقمان کی) آیت تلاوت فرمائی ان اللہ عندہ الخ بے شک اللہ ہی جانتا ہے قیامت کب آئے گی؟ پھر وہ شخص چلا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس کو واپس لاؤ (لوگ گئے) تو وہاں کسی کو نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا" یہ جبریلؑ تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھلانے آئے تھے۔"

ابو عبداللہ بخاری فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کو ایمان کامل کا جزء قرار دیا۔

مطابقۃ للترجمۃ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے بالکل واضح ہے اس لئے کہ ترجمۃ الباب میں جن چیزوں کے متعلق حضرت جبرئیلؑ کا سوال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب مذکور ہے حدیث پاک میں اس کا مفصل بیان ہے۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۱۲ وایضا فی کتاب التفسیر ص۷۰۴ ایضا مسلم والترمذی فی الایمان، وابوداؤد فی کتاب السنۃ ج۲ ص۶۴۵ وابنماجۃ فی الایمان ص۷۔

تشریح یہ حدیث یہاں مختصر ہے مسلم شریف میں مفصل ہے۔ اس حدیث کو عام طور سے حدیث جبریلؑ کہا جاتا ہے، یہ حدیث نہایت عظیم الشان اور جامع ہے، علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں: یصلح ان یقال لہ ام السنۃ، یہ حدیث اس لائق ہے کہ اس کو ام السنۃ کہا جائے، یعنی جس طرح پورے قرآن مجید کا نچوڑ اور خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے اسی لئے سورۂ فاتحہ کا نام ام القرآن رکھا گیا ہے، اسی طرح ذخائر احادیث کے تمام مضامین کا خلاصہ علی الاجمال اس حدیث میں موجود ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ زندگی کے ارشادات و ہدایات کا مغز و عطر ہے اسی لئے امام مسلمؒ نے اپنی کتاب صحیح مسلم شریف کا آغاز اسی حدیث سے کیا اور صاحب مشکوٰۃ نے بھی انھیں کا اتباع کیا، نیز امام بغویؒ نے مصابیح السنۃ اور شرح السنۃ دونوں کتابوں کو اسی حدیث سے شروع فرمایا۔ یہ حدیث حضور اقدسؐ کی آخری عمر مبارک کی ہے۔ تیئیس سال کے عرصہ میں جو احکام آپؐ پر نازل ہوئے اور جو تفاسیر آپؐ نے بیان فرمائیں ان تمام کا خلاصہ آپؐ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے جیسے کہ کوئی واعظ و مقرر دو، تین گھنٹے تقریر کرنے کے بعد آخر میں پوری تقریر کا خلاصہ بیان کر دیتا ہے تاکہ علیٰ وجہ الاجمال ہر ایک کو کچھ نہ کچھ یاد رہے اور عمل میں آسانی ہو۔

دین کے تمام علوم اس حدیث میں آگئے۔ اولاً عقائد یہ ایمان میں آگئے۔ دوم احکام و اعمال اسلام کے تحت آگئے۔ سوم روحانی ترقی یعنی سلوک و تصوف اور تزکیۂ نفس احسان کے ضمن میں آگئی۔

ایمان جڑ ہے اور اسلام اس کی شاخیں ہیں کیونکہ ایمان کی تکمیل و رونق اسلام سے ہوتی ہے اور آخری مرتبہ احسان کا ہے جو بمنزلہ اثمار ہے۔ اور یہ اللہ رب العالمین کا عظیم احسان ہے کہ جبرئیلؑ کے توسط سے تیئیس سال تک دین کو نازل کرتا رہا اخیر میں انہی کے ذریعہ اس دین کا خلاصہ بھی بیان کرا دیا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا" ھذا جبریل جاء یعلم الناس دینہم " اس سے یہی مراد ہے کہ سوال و جواب

سے دین کا خلاصہ معلوم ہو جائے۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بارزاً یوما للناس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے تشریف فرما تھے یعنی ممتاز مقام پر نمایاں ہو کر بیٹھے ہوئے تھے اس کی تفصیل ابو داؤد کی روایت میں ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابتداءً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی امتیاز کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل جل کر بیٹھا کرتے تھے جب باہر سے کوئی مسافر آتا تو ناآشنا ہونے کی وجہ سے دریافت کرنا پڑتا تھا (مثلاً ضمام بن ثعلبہ ہی کی روایت میں ہے کہ ایکم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، بخاری ص۱۵)۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو ہم حضور کے بیٹھنے کیلئے ایک چبوترہ بنادیں اور آپ اس پر تشریف رکھیں تاکہ اجنبیوں کو پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے، آپ نے اجازت مرحمت فرمادی اور ہم نے مٹی کا ایک چبوترہ بنادیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسی چبوترہ پر رونق افروز تھے اور صحابہ ارد گرد بیٹھے تھے، اسی کو اس حدیث میں بارزاً سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مسئلہ مستنبطہ اس واقعہ سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مدرس یا مقرر کے لئے اگر کوئی خاص ممتاز نشست گاہ (یعنی اسٹیج) بنادی جائے یا ممتاز مقام پر بیٹھایا جائے تو جائز ہے مگر زیادہ پُر تکلف نہ بنانا چاہئے، چنانچہ آپ کے اس چبوترے کے بارے میں آتا ہے فبنینا لہ دُکّاناً من طین ہم نے مٹی کا ایک چبوترہ آپ کے لئے بنادیا۔

فاتاہ رجل ای نلک فی صورۃ رجل یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام آدمی کی صورت میں آئے۔ مسلم شریف میں کچھ تفصیل ہے رجل شدید بیاض الثیاب یعنی انتہائی سفید و شفاف کپڑے میں تھے اس سے سفید کپڑے اور نیز نظافت کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

شدید سواد الشعر بال بالکل سیاہ تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے سے قبل جوانی میں علم حاصل کر لینا چاہئے کیونکہ اس وقت بدن میں قوت ہوتی ہے۔ حافظہ قوی ہوتا ہے۔

لایریٰ علیہ اثر السفر اس پر سفر کا کوئی اثر اور علامت نظر نہیں آتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی باہر کا مسافر نہیں ہے ورنہ گرد وغبار ہوتا اور کپڑے اتنے صاف نہ ہوتے، یہ کوئی مقامی باشندہ ہے لیکن ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہ تھا یہ علامت تھی کہ باہر کا کوئی آدمی ہے کیونکہ اگر قریب کا آدمی ہوتا تو کوئی ضرور ان کو پہچان لیتا۔

نسائی شریف میں ابو فروہ کے طریق سے منقول ہے وانہ جبرئیل نزل فی صورۃ دحیۃ الکلبی اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آئے تھے تو انھیں کسی نے کیوں نہیں پہچانا؟ حضرت دحیہ تو معروف و مشہور شخص تھے۔

جواب:- علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نزل فی صورۃ دحیۃ الکلبی وہم راوی ہے محفوظ روایتوں

میں یہ جملہ نہیں ہے (عمدہ ص۲۹۱) اور اگر نسائی کا یہ جملہ وہم نہ مانا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے ہی سے حضرت دحیہ مجلس میں موجود ہوں، اب جبرئیلؑ دحیہ کی شکل میں آئے تو صحابہ کو تو یقین تھا کہ یہ ہمارے دحیہ نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے مجلس میں موجود تھے اس لئے حضرت جبرئیلؑ کو کسی نے نہیں پہچانا ہو۔

دراصل اس مرتبہ حضرت جبرئیلؑ نے تعمیہ (اخفاء حال) کا رویہ اختیار کر رکھا تھا، حدیث میں یہ بھی ہے کہ سوال کیا ما الایمان، جب حضورؐ نے جواب دیا تو کہا صدقت یعنی آپ نے ٹھیک کہا، صحابہ کہتے ہیں فعجبنا له یسالہ ویصدقہ ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتے ہیں جو علامت نہ جاننے کی ہے اور تصدیق بھی کرتے ہیں جو علامت ہے واقفیت کی، یہ بھی تعمیہ ہے، غرض ہر مرحلہ پر کوشش کی گئی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے یہاں تک کہ خود حضور پر نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تئیس سالہ جان پہچان کے باوجود پہچان نہ سکے جب حضرت جبرئیلؑ چلے گئے تب معلوم ہوا کہ جبرئیل تھے جو امت کو دین سکھلانے آئے تھے۔

اخفاء کا اس قدر اہتمام کیا گیا، ممکن ہے کہ اس سے یہ بتانا منظور ہو کہ باوجودیکہ تمام ضروری علوم و معارف آپؐ پر ختم کر دیئے گئے اور آپؐ کو علوم الاولین والآخرین عطا کئے گئے تھے پھر بھی بندہ کا حال یہ ہے کہ اپنی ذات سے کچھ نہیں ہے سب کچھ عطاء خداوندی ہے وہ اگر چاہے تو محسوس و مشاہد کا علم بھی واپس لے لے حقائق و معارف کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولئن شئنا لنذهبن بالذی اوحینا الیك ثم لا تجد لك به علینا وکیلا۔ (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۶)

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر ہم نے وحی بھیجی ہے سب سلب کرلیں پھر اس (وحی) کے واپس لانے کیلئے ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملیگا۔

آگے فرمایا: الا رحمة من ربك ان فضله کان علیك کبیرا (بنی اسرائیل آیت ۸۷)

مگر (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بیشک آپ پر اس کا بڑا فضل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم ایسا کریں گے نہیں مگر کر سکتے ہیں اس کا یہ ایک نمونہ دکھلا دیا کہ تئیس سال کی شناخت و تعارف کے باوجود بھی اس دفعہ جبریلؑ مخفی رہے، آپؐ کو ان کا علم نہ ہوا، جب آپؐ کی یہ حالت ہے تو اوروں کا کیا پوچھنا؟ لہٰذا انسان کو کسی چیز پر ناز و فخر کرنا اور اترانا نہ چاہیئے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے ایک روز ایک فتویٰ پر دستخط کرتے وقت اپنا نام بھول گئے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ خانقاہ سے گھر تشریف لیجا رہے تھے کہ مکان کا راستہ بھول گئے اور کافی دیر تک چکر کاٹتے رہے کہ کدھر جاؤں؟ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس پر مجھے یہ حدیث یاد آگئی۔

چونکہ آپؐ کو علم کامل دیا گیا تھا جیسا کہ ارشاد گرامی ہے علمت علم الاولین والآخرین مجھے اولین و آخرین کا علم دیا گیا ہے، اس لئے ایک نمونہ اس کا بھی دکھلا دیا کہ ہم اس کے واپس لینے پر ہر وقت قادر ہیں

جس کا علم چاہیں ذکر دالپس لے لیں خواہ نبی ہو یا دلی۔
اور یہ تمہید ہے کہ علم الساعۃ آپؐ کو نہیں تھا
قال الایمان ان تومن باللہ الخ ترجمہ گذر چکا ہے۔
ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر یقین رکھا جائے اور یہ تمام صفات کمالیہ کا جامع اور منبع اور تمام نقائص سے منزہ ہے۔

سوال بعض روایات میں ہے جبرئیلؑ نے "یا محمد" (ص) کہہ کر پکارا حالانکہ آپؐ کا نام لیکر پکارنے سے ممانعت تھی، نیز ابتداء میں سلام کیوں نہیں کیا؟

جواب :- قال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ بعد نقلہ الروایات المختلفۃ فی ھذا الباب، فاختلفت الروایات قال لہ یا محمد او یارسول اللہ وھل سلم اولاً فاما السلام فمن ذکرہ مقدم علی من سکت عنہ الخ (فتح ج۱) خلاصہ یہ ہے کہ یہاں روایت میں اختصار ہے بعض روایت میں سلام کی تصریح موجود ہے، علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی قریب قریب یہی فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ بعض روایت میں ہے کہ یارسول اللہ اور بعض میں ہے کہ یا محمد کہا۔
جواب یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے، دوسری صورت کا جواب یہ ہے کہ مبالغۃ فی الاخفاء کے لئے بدویوں کا طریقہ اختیار فرمایا۔
(۲) ممانعت کے مکلف انسان ہیں اور یہ فرشتے تھے۔ (۳) معنی وصفی مراد ہیں معنی علمی مراد نہیں، چونکہ مشرکین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بغض وعداوت میں مذمم کہتے تھے اس لئے حضرت جبرئیلؑ نے ان کی تردید کے لئے معنی وصفی کے لحاظ سے تعریف کے طور پر یا محمد کہا (صلی اللہ علیہ وسلم)

الایمان ان تومن باللہ

سوال یہ تعریف الشئی بنفسہ ہے جو درست نہیں کیونکہ ما الایمان سے ایمان ہی کا سوال ہے اور جواب میں ان تؤمن باللہ یعنی اللہ پر ایمان لاؤ۔

جواب ۱ محدود یعنی الایمان میں ایمان شرعی مراد ہے اور حد یعنی تعریف ان تؤمن سے ایمان لغوی مراد ہے ای ان تصدق فلا اشکال۔
۲ سوال نفس ایمان کا نہ تھا بلکہ متعلقات ایمان کا تھا جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے کہ آپؐ نے جواب میں وہ تمام چیزیں بیان فرمائیں جن سے تصدیق متعلق ہوتی ہے۔
قال ما الاسلام دوسرا سوال اس نے یہ کیا کہ اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ان تعبد اللہ الخ بعض روایت میں ہے ان تشہد ان لا الہ الا اللہ، معلوم ہوا کہ تعبد اللہ سے مراد بھی کلمہ ہی پڑھنا ہے کیونکہ یہ ما الاسلام کا جواب ہے، اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام مثل قالب وبدن کے ہے اور ایمان مثل

قلب ورد ح ہے، اور یہ موقعہ تھا کہ دونوں (یعنی ایمان اور اسلام) کی پوری تعریف وتفریق کردی جائے اس لئے وہ فرق واضح کردیا گیا البتہ مجازاً اور درجہ تکمیل ایک کا دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے، اس کے لئے حافظ ابن رجب حنبلیؒ کا مشہور مقولہ ہے، وہ کہتے ہیں: اذا اجتمعا افترقا واذا افترقا اجتمعا یعنی جب دونوں (ایمان و اسلام) ایک ساتھ جمع ہوں تو الگ الگ اپنے حقیقی معنیٰ رکھتے ہیں۔ اور جب دونوں علیحدہ علیحدہ ہوں (یعنی صرف ایمان ہو یا صرف اسلام ہو) تو ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوگا۔ یعنی دونوں مراد لئے جا سکتے ہیں۔

قال ما الاحسان یہ تیسرا سوال ہے کہ احسان کیا ہے؟ احسان کے معنیٰ ہیں حسین بنانا، اچھا کرنا، نکھارنا، سوال کا منشاء یہ ہوگا کہ ایمان و اسلام کی حقیقت تو معلوم ہوگئی اب اس کو اچھا بنانے ونکھارنے کی صورت بتائیے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ۔ یعنی تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ خدا کو دیکھ رہے ہو۔ اس میں دراصل اخلاص کی تاکید اور پورے طور سے متوجہ ہونے کی ترغیب ہے کہ اس تصور سے اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔

اب شبہ ہو سکتا تھا کہ جب اس دنیا میں خداوندقدوس کی رویت نہیں ہوسکتی تو ایک نہ ہونے والی چیز کا تصور کیسے ہوسکتا ہے، صحیح مسلم شریف میں ہے: واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا یعنی تم اپنے رب کو ہرگز نہ دیکھو گے جب تک تمہیں موت نہ آئے، اور قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال رب ارنی انظر الیک کے جواب میں ارشاد الٰہی ہے لن ترانی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بجسد عنصری رویت باری تعالیٰ ممتنع ہے۔

رہا حضور اقدسؐ کا لیلۃ المعراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا مختلف فیہ ہے بنا بر قول رویت اسے مستثنیٰ کہا جائیگا، یا یہ کہ وہ عالم ملکوت کا واقعہ ہے جو دنیا سے خارج ہے۔

اس شبہ کو فان لم تکن تراہ فانہ یراک سے دفع کیا گیا کہ اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے مگر یہ تو تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھتے ہیں اسی کو دل میں جماؤ اور اس یقین کے راسخ ومستحکم ہوجانے کے بعد دیکھنے ہی جیسی عبادت ہوگی کیونکہ احسانِ عمل کا مدار ان کے دیکھنے پر ہے نہ تمہارے دیکھنے پر، اخلاص کا مدار اس استحضار پر ہے کہ خداوندقدوس میری ہر حرکت وسکون اور قلبی خطرات وارادہ کو دیکھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نابینا بھی اگرچہ نہیں دیکھتا لیکن دربار شاہی میں جب پہونچ جاتا ہے تو تعظیم شاہی میں کسی قسم کی تقصیر نہیں کرتا بلکہ یہ سوچتا ہے کہ میں اگرچہ بادشاہ کو نہیں دیکھتا لیکن وہ تو مجھے دیکھتا ہے کہیں کوئی ایسی حرکت نہ ہوجائے جو خلافِ منشا ہو اور میں دربار سے نکالا جاؤں، اور اگر آقا موجود ہو اور نابینا ہو تو بھی ملازم کما حقہ کام نہیں کرتے اور اگر آقا سامنے نہ ہو اور ملازم کو معلوم ہوجائے کہ میرا آقا دور سے مجھے دیکھ رہا ہے تو خوب تن دہی سے کام کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں جنات مصروف رہے اگر جنات یہ خیال نہ کرتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام زندہ ہیں اور ہمیں دیکھ رہے ہیں تو بھاگ جاتے۔

معلوم ہوا کہ درباری کے دیکھنے کو دخل نہیں بلکہ صاحبِ دربار کو دیکھنے کا دخل ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ عبادت اس طرح کرو کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر بالفرض تم دیکھتے ہوتے تو کیا کرتے جس طرح اس وقت کرتے اسی طرح اب بھی بغیر دیکھے کرو اس لئے اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھتا ہے اور اصلی مدار اس کے دیکھنے پر ہے تمہارے دیکھنے پر نہیں۔

ایمان، اسلام، احسان کی ترتیب

اول درجہ ایمان کا ہے جس پر نجات کا مدار ہے، ایمان کے بعد دوسرا درجہ اسلام کا ہے جس پر کامل نجات موقوف ہے ایمان خلود نار سے بچاتا ہے اور اسلام مطلقاً دخول ہی سے نجات دیتا ہے، تو خلود سے نجات اول درجہ ہے اور دخول سے نجات دوسرا درجہ ہے اس کے بعد رفع درجات کا آخری مرتبہ ہے جو احسان سے حاصل ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایمان و اسلام کے لئے احسان درجۂ تکمیل ہے لہٰذا ایمان و اسلام کے بعد احسان کا ذکر ہے۔

قال متی الساعۃ قیامت کب آئے گی؟
سب سے پہلے ایمان کے متعلق سوال ہے جو اساس الاعمال ہے جس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں، پھر اسلام کے متعلق جو مکمِّل ایمان ہے اور بمنزلہ صحتِ اعضاء ہے، پھر احسان کے متعلق جو بمنزلہ کمال صحت و رفع درجات کا باعث ہے۔ پس ان تینوں کا آپس میں ربط ظاہر ہے مگر اس کے بعد قیامت سے متعلق سوال بظاہر بے ربط معلوم ہوتا ہے۔
حضرت نانوتوی قدس سرہ کی بعض تصانیف سے اس کا ربط مستفاد ہوتا ہے جو دو مقدموں پر مبنی ہے
(۱) جملہ عالم کو انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے کما قال تعالیٰ خلق لکم ما فی الارض جمیعا، وقال: سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔ وغیر ذلک من النصوص۔
(۲) انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کما قال عز وجل: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔
ان دونوں مقدموں کو اس آیت کریمہ میں یکجا فرمادیا ہے، یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون، الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا للہ اندادا وانتم تعلمون۔
ان دونوں مقدموں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ سارے عالم کی پیدائش سے مقصود عبادت ہے کیونکہ پورا عالم انسان کے لئے ہے اور انسان عبادت کے لئے۔ پس تخلیق عالم کی غرض و غایت بالواسطہ یا بلاواسطہ عبادت ہے اور عبادت کا کمال اور درجۂ علیا احسان ہے۔ پس جب عبد کامل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے کہ آپ کے درجات قرب تک کسی کی رسائی ممکن نہیں اور آپ نے احسان عبادت کی تعلیم علماً و عملاً مکمل فرمادی تو مقصود عالم حاصل ہو گیا۔
لہٰذا طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ حصول مقصود کے بعد اس کارخانے کو کب منہدم کیا جائے گا؟

مثلاً جلسہ کے لئے تیاریاں کی جاتی ہیں، اسٹیج، لاؤڈ اسپیکر، بجلی اور قناتوں وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے اور جہاں جلسہ ختم ہوا سب اشیاء کو توڑ پھوڑ کر اپنے مقام میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مقصد تخلیق عالم یعنی عبادت کے درجۂ علیا کی تکمیل کے بعد طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کب ہوگی؟ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بعثت انا والساعة کہاتین گویا کہ آپ کا تشریف لانا قرب قیامت کی خبر دے رہا ہے۔ کما قال تعالیٰ: اقتربت الساعة وانشق القمر یعنی انشقاق القمر معجزہ ہونے کی وجہ سے آپ کی نبوت کی دلیل ہے اور آپ کی نبوت قرب قیامت کی دلیل ہے۔

سوال: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کافی زمانہ گذر جانے پر بھی قیامت نہیں آئی؟

جواب: عالم دنیا کے ہزاروں سال ملأ اعلیٰ کے حساب میں چند ایام شمار ہوتے ہیں۔ کما قال اللہ عزوجل ان یوما عند ربک کألف سنة مما تعدون پس ہمارے حساب میں اگرچہ طویل زمانہ گذر چکا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حساب میں ابھی ڈیڑھ دن بھی نہیں گذرا۔ قال اللہ تعالیٰ: انہم یرونہ بعیداً ونراہ قریباً۔

(۲) تکمیل عبادت دو طرح مقصود ہے، ایک کیفاً دوسرا کماً۔

تکمیل کیفاً تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکی اور تکمیل کماً یعنی اتنے بندگان الٰہی عبادت کریں کہ گھر گھر عبادت کا غلغلہ اور بچے بچے کی زبان پر اس کا چرچا ہو، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کے ذریعہ ہوگی۔ چنانچہ نزول عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد یہ تکمیل ہوگی جس کے متعلق ارشاد ہے لایبقی علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ الاسلام بعز عزیز وذل ذلیل۔

اس وقت عبادت کی ہر طرح تکمیل ہو جائے گی تو یہ کارخانہ منہدم کر دیا جائیگا، اٹھانے میں کچھ سال لگیں گے جیسے بتدریج بنایا گیا ویسے ہی اٹھایا جائیگا، البتہ بالآخر میں کلمح البصر او ھو اقرب قیامت کا وقوع ہوگا۔ پہلے بیت اللہ اور ام القریٰ کو اٹھا جائیگا بعدہ دیگر مقامات کو۔

اگر کوئی آج بیت اللہ کو ہدم کا قصد کرے تو اصحاب فیل کی طرح خود تباہ ہو جائیگا اور جب اللہ تعالیٰ خود اسے اٹھانا چاہیں گے تو ایک حبشی کعبہ کی ایک ایک اینٹ کو علیحدہ علیحدہ کر دیگا کما ورد فی الحدیث (ارشاد القاری)۔

ما المسئول عنہا باعلم من السائل اس جملہ میں مسئول اور سائل کا الف لام عہدی اور استغراقی دونوں درست ہے اگر عہدی ہو تو مراد مسئول خاص آقائے کائنات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور سائل خاص افضل الملائک حضرت جبریل ہیں۔

اور اگر الف لام استغراقی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وقت قیامت کے عدم علم میں ہر مسئول و سائل برابر ہے۔ جیسا کہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہی سوال حضرت جبریلؑ سے کیا تو جبریلؑ نے اپنا پر جھاڑا اور جواب دیا ما المسئول عنہا باعلم من السائل۔

ساحدثک عن اشراطہا میں تجھ کو اس کی علامتیں بتاتا ہوں۔ اشراط شرط بالفتح الراء بمعنی

علامت کی جمع ہے۔ اور شرط بسکون الراء کی جمع شروط و شرائط آتی ہے۔ یہاں اشراط ساعت سے مراد علامات سابقہ قریبہ ہے جیساکہ جواب سے ظاہر ہے یعنی عین وقوع کی علامتیں مراد نہیں ہیں۔

اذا ولدت الامۃ ربہا بعض روایت میں ربتہا اور بعض روایت میں بعلہا ہے ہر سہ الفاظ کا مفہوم اس حدیث میں مالک اور سید ہی ہے۔ اس جملہ کی شرح میں اقوال مختلف ہیں۔ سب سے قوی تر اور راجح قول یہ ہے کہ رب بمعنی مربی ہے، مطلب یہ ہے کہ قرب قیامت میں حالات اس قدر متغیر ہوجائیں گے کہ مربی بصیغہ اسم فاعل مربی بصیغہ اسم مفعول ہوجائیگا، عالی سافل ہوجائیں گے چھوٹے بڑوں کا احترام نہیں کریں گے۔

دوسرا قول یہ ہے عقوق والدین کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں اپنے والدین کے ساتھ ایسا سلوک و برتاؤ کریں گے جیسے مالک نوکر کے ساتھ آقا باندی کے ساتھ۔ یعنی قرب قیامت میں اولاد اپنے ماں باپ کو ڈانٹ ڈپٹ، برا بھلا کہیں گے، والدین پر حکومت کریں گے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قرب قیامت میں حالات اتنے خراب ہوجائیں گے کہ لوگ جائز و ناجائز، حلال و حرام کا خیال نہیں کریں گے اور ام ولد کی بیع کریں گے وہ ام یکے بعد دیگرے مختلف خریداروں کے قبضہ میں جائیگی یہاں تک کہ اس کا لڑکا جو اپنے باپ کی جگہ مالک ہوا ہے وہ اس ام کو خرید لیگا، اس صورت میں تلد الامۃ ربہا بالکل مبنی برحقیقت ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں مگر قول اول و دوم ہی راجح عند الاکثر ہے اس لئے بھی کہ باقی علامتیں بھی اسی پر دال ہیں۔

حفاۃ حافی کی جمع ہے بمعنی ننگا پاؤں عراۃ عاری کی جمع بمعنی ننگا بدن رعاۃ راعی کی جمع بمعنی چرواہا بہم بضم الباء أبہم کی جمع وہی الصغار من اولاد الغنم والضان والمعز جمیعا، نیز گائے کے بچے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اس کا واحد بہمۃ ہے ومنہ البہیمۃ چوپایہ ہر وہ جانور جس میں قوت گویائی نہ ہو جمع بہائم۔

حاصل یہ ہے کہ کم درجہ کے لوگ، اراذل غلبہ و اقتدار حاصل کرلیں گے اور اشراف ذلیل و کمزور ہوجائیں گے ریاست و سیادت غیر مستحقین کو مل جائیگی اہل حق کو نہیں ملیگا۔ بعض روایتوں میں ہے اذا وسد الامر الی غیر اہلہ فانتظر الساعۃ جب معاملات نا اہل لوگوں کے سپرد کردیئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو۔ آج ملک میں، ملک کے ہر شعبہ و محکمہ میں، مدارس اور خانقاہوں میں کیا ہورہا ہے؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

فی خمس لا یعلمہن الا اللہ قیامت (کے وقت معین) کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا پھر آپ نے آیت تلاوت فرمائی ان اللہ عندہ علم الساعۃ۔ الآیۃ (سورۂ لقمان)

یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا (کہ کس سال کس تاریخ میں آئے گی) اور وہی بارش کو اتارتا ہے اور وہی جانتا ہے جو شکم مادر میں ہے (کہ لڑکی ہے یا لڑکا؟ اور کس شکل و صورت کا ہے؟) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کمائے گا (یعنی خیر و شر میں سے کیا حاصل کرے گا) اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مریگا؟

دو سوال: امام رازیؒ نے یہاں دو سوال کئے ہیں۔ اول یہ کہ اس آیت کی رو سے یہ ہونا چاہئے کہ

ان پانچوں میں سے کسی ایک جزئی کا علم بھی غیر اللہ کو نہ ہو حالانکہ ہم سیکڑوں واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں، اولیاء کرام کی کرامات بکثرت منقول ہیں، حضرت صدیق اکبرؓ کو رحم کی حالت معلوم ہوگئی تھی اور آپ نے انتقال سے پہلے اپنی حاملہ بیوی کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کے لڑکی ہوگی اس لئے آپؓ نے وصیت فرمائی کہ اس حمل کو لڑکی مان کر ترکہ تقسیم کیا جائے وغیرہ بہت سے واقعات ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پانچ کی کیا تخصیص ہے اور اس میں انحصار کیوں ہے اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جن کی اوروں کو اطلاع نہیں تو یہ انحصار کہاں صحیح ہوا ؟

جواب :- دوسرے سوال کا آسان جواب علامہ سیوطیؒ نے لباب النقول میں یہ دیا ہے کہ سائل کا سوال انہیں پانچ سے متعلق تھا اور جو عدد کسی سائل کے سوال کی موافقت میں ذکر کیا جاتا ہے وہ باتفاق علماء اصول تحدید کے لئے نہیں ہوا کرتا۔

سوال اول کے جواب سے پہلے یہ ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ علم غیب سے مراد اصول اور کلیات کا علم ہے، فروع اور جزئیات کے علم پر عالم غیب نہیں کہا جائے گا۔ جیسے کوئی شخص سو، دوسو نسخے رٹ لے تو اس کو طبیب نہیں کہا جائیگا۔ اسی طرح اگر کوئی فقہی جزئیات یاد کرلے بلکہ بہشتی زیور پوری کتاب حفظ کرلے تو اسے فقیہ نہیں کہا جائیگا جب تک اصول وکلیات سے واقف نہ ہو، اور اصول وکلیات کا علم بمنزلہ مفتاح اور کنجی ہے۔

تکوینیات کا کلی علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے انہی کلیات کو مفتاح الغیب سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

وعندہ مفاتح الغیب لایعلمہا الا ھو۔ (سورہ انعام)	اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں (چابیاں) ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اور ظاہر ہے کہ خزانہ سے وہی کچھ نکال سکیگا جس کے پاس مفتاح ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کلیات تکوینیہ کا علم اور اسی طرح جملہ فروع کا اس طرح علمی احاطہ کہ کچھ بھی خارج نہ رہے خاصۂ باری تعالیٰ ہے یہ علوم نہ نبی کو حاصل ہیں نہ ولی کو، انہیں جو کچھ حاصل ہے خواہ کتنا ہی کثیر ہو سب جزئیات ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ مغیبات دو قسم کے ہیں۔ تشریعی، تکوینی۔ تشریعی جیسے وحی تمام از قبیلۂ غیب ہے تشریعات کے کلیات بھی بقدر ضرورت تلقین ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہیں وہ کامل ہوتا ہے۔ اور تکوینیات کے اصول وکلیات مختص بالباری ہیں۔ ان تکوینیات میں سے اللہ تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب سمجھتے ہیں عطا فرماتے ہیں مگر یہ سب جزئیات وفروع ہوتے ہیں اس لئے عالم غیب کہنا درست نہیں۔

نوٹ علم غیب پر مفصل ومدلل کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ امداد الباری شرح بخاری جلد رابع میں حضرت مولانا عبد الجبار صاحب اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مفصل بحث کی ہے اور رضاخانی بدعتیوں کے دلائل نقل کرکے آیات قرآنی وروایات نبوی سے کما حقہ رد کیا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

نیز ارشاد القاری میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد دامت برکاتہم نے نہایت مدلل و مفصل طور سے اہلِ بدعت کی کامیاب تردید کی ہے فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

● **باب** ۳۸ ● بالتنوین مع سقوط الترجمۃ صـ ۱۲

۴۹ ● حدثنا ابراهيمُ بنُ حمزةَ قال حدثنا ابراهيمُ بنُ سعدٍ عن صالحٍ عن ابنِ شهابٍ عن عُبيدِ اللهِ بنِ عبدِ اللهِ أنّ عبدَ اللهِ بنَ عباسٍ اخبره قال اخبرني ابو سفيانَ بنُ حربٍ انّ هِرقلَ قال له سألتُك هل يزيدون ام ينقصون فزعمتَ انهم يزيدون وكذلك الايمانُ حتى يتمَّ وسألتُك هل يرتدُّ احدٌ سخطةً لدينه بعدَ أن يدخلَ فيه فزعمتَ أن لا وكذلك الايمانُ حين تخالطُ بشاشتُه القلوبَ لا يسخطه احدٌ ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ مجھ سے ابو سفیان بن حرب نے بیان کیا کہ ہرقل (شاہِ روم) نے ان سے کہا میں نے تم سے پوچھا کہ وہ لوگ (یعنی اس پیغمبر کے تابعدار) بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تو تم نے بتلایا کہ وہ بڑھ رہے ہیں، اور اسی طرح ایمان کا معاملہ ہے یہاں تک کہ وہ پورا ہو (اپنے زور کو پہونچ جائے) اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کوئی اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد اسے برا سمجھ کر پھر بھی جاتا ہے؟ تم نے بتلایا کہ نہیں اور یہی حال ایمان کا ہوتا ہے جب اس کی بشاشت (خوشی) دلوں میں سما جاتی ہے تو کوئی اس سے ناخوش نہیں ہوتا۔

باب بلا ترجمہ یہ باب بلا ترجمہ ہے۔ ترک ترجمہ کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں۔

(۱) یہ باب کالفصل من الباب السابق ہے یعنی باب سابق کے لئے بمنزلہ فصل ہے اور اس کے متعلقات میں سے ہے، باب سابق میں امام بخاریؒ نے فرمایا تھا جعل ذالک کلہ دینا یعنی ایمان، اسلام اور احسان سب کا اتحاد ثابت کیا تھا اس باب سے بھی امام کا مقصد یہی ہے کہ دین و ایمان متحد ہے، دیکھو ہرقل نے سوال کیا تھا هل یرتد احد سخطة لدینه الخ (کیا کوئی اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد پھرتا ہے؟) ابو سفیان کی نفی پر ہرقل نے کہا کذالک الایمان (ایمان کا یہی حال ہے) معلوم ہوا دین و ایمان متحد ہیں۔

(۲) ابواب سابقہ میں زیادۃ الایمان ونقصانہ کا اثبات تھا۔ اسی طرح اس باب میں بھی حین تخالط بشاشته القلوب سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

حدیث کی تشریح امام بخاریؒ نے یہاں حدیث ہرقل کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے۔ ہرقل کی یہ گفتگو کتاب الوحی میں مفصل گذر چکی ہے، امام بخاریؒ اس پوری حدیث کو کتاب الجہاد میں اسی سند سے نقل کریں گے، یہاں مختصر ہے۔

خرم کی تعریف اور اس کے جواز پر اختلاف

حدیث کے کسی ٹکڑے کو الگ کر دیا جائے تو اس اختصار کو محدثین کی اصطلاح میں خرم کہتے ہیں، امام بخاریؒ بکثرت ایسا کرتے ہیں۔ محدثین کرام میں اختلاف ہے کہ احادیث نبوی میں خرم واختصار جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات مطلقاً جائز کہتے ہیں اور بعض نے مطلقاً ناجائز قرار دیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کا وہ مخروم ٹکڑا اگر اظہار معنی کے لئے دوسرے اجزاء حدیث کا محتاج ہے یا ٹکڑے کو الگ کرنے کے بعد اس کے معنی بدل جائیں تو ایسا خرم جائز نہیں اور اگر وہ مخروم (حدیث کا ٹکڑا) اپنے معنی بتانے میں دوسرے اجزاء حدیث کا محتاج نہ ہو تو ایسا خرم واختصار جائز ہے اور یہ ماہر فن کا کام ہے، امام بخاریؒ جہاں بھی حدیث میں اختصار کرتے ہیں وہ حد جواز ہی میں ہوتا ہے۔

اشکال وجواب

یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہرقل تو کافر تھا، امام بخاریؒ نے کافر کے قول سے استدلال کیوں کیا؟

جواب یہ ہے کہ حضرت ابو سفیان رضؓ نے مسلمان ہونے کے بعد بیان کیا اور حضرت ابن عباسؓ روایت کر رہے ہیں لہذا مراسیل صحابہ اور موقوفات صحابہ کے قبیل سے ہوئی اور یہ سب ہمارے نزدیک حجت ہیں۔

بابٌ۳۹ فضلِ مَنِ استبرا لِدِینِہ ص۱۳

اس شخص کی فضیلت کا بیان جو اپنا دین قائم رکھنے کے لئے مشتبہات سے بچے۔

۵۰ ● حدثنا ابو نُعَیمٍ حدثنا زکریا عن عامرٍ قال سمعتُ النعمانَ بنَ بَشیرٍ یقولُ سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقولُ الحلالُ بَیِّنٌ والحرامُ بَیِّنٌ و بینھما مشتبھاتٌ لا یَعلَمُھا کثیرٌ من الناسِ فمَنِ اتقی المشتبھاتِ استبرأ لِدِینِہ و عِرضِہ ومَن وَقَعَ فی الشبھاتِ کراعٍ یَرعیٰ حولَ الحِمیٰ یوشِكُ اَن یُّواقِعَہ اَلا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِكٍ حِمیً اَلا اِنَّ حِمَی اللّٰہِ فی ارضِہ محارِمُہ اَلا وَ اِنَّ فی الجسدِ مُضغۃً اِذا صَلَحَتْ صَلَحَ الجسدُ کُلُّہ وَ اِذا فَسَدَتْ فَسَدَ الجسدُ کُلُّہ اَلا وَھِیَ القلبُ ●

ترجمہ

حضرت نعمان بن بشیر رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان بعض چیزیں شبہ کی ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے (کہ حلال ہیں یا حرام ہیں) تو جو شخص شبہ کی چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو شاہی چراگاہ کے آس پاس اپنے جانوروں کو چراتا ہو قریب ہے کہ وہ جانور چراگاہ کے اندر گھس جائے

سن لو ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے، سن لو اللہ کی زمین (یعنی دنیا) میں اللہ کی چراگاہ اس کے محارم (حرام کردہ چیزوں) ہیں۔ سن لو کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے (یعنی گوشت کا) جب وہ درست ہوجاتا ہے تو سارا جسم درست ہوجاتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو پورا جسم خراب ہوجاتا ہے، سن لو کہ وہ لوتھڑا (آدمی کا) دل ہے۔

ربط اس سے پہلے حدیث جبریلؑ میں احسان کا بیان تھا اس باب سے طریق احسان کی تعلیم مقصود ہے یعنی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ احسان کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ اتباع دین کی نیت سے احوال قلب کی مراعات رکھی جائے اور شبہات سے اجتناب کیا جائے۔

مقصد ترجمہ مرجئہ کہتے ہیں کہ لا تضر مع الایمان معصیۃ تو اس باب سے ان کی تردید کی جارہی ہے کہ تم معصیت کو غیر مضر بتاتے ہو حالانکہ حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ مشتبہات سے نہ بچنا بھی مضر ہے۔ (۲) نیز امام بخاریؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ احتیاط کرنے والوں کو غیر محتاط لوگوں پر فضیلت ہے، نتیجہ ظاہر ہے کہ دین و ایمان کے مراتب ہیں۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ "فمن اتقی المشتبہات استبرأ لدینہ وعرضہ"۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۱۳ وفی کتاب البیوع ص۲۷۵ ایضا مسلم والترمذی والنسائی وابی داؤد کلھم فی البیوع۔

تشریح الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبہات ؛
علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جاء فیہ خمس روایات الخ (عمدۃ ص۲۹۷) یعنی اس میں پانچ روایات ہیں یعنی مختلف نسخے ہیں۔

۱۔ مشتبہات۔ بضم المیم وسکون الشین المعجمۃ وکسر الباء علی وزن مفتعلات وھی روایۃ الاصیلی وکذا فی روایۃ ابن ماجۃ یعنی باب افتعال سے اسم فاعل ہے۔

۲۔ مُتَشَبِّہَات۔ بضم المیم وفتح التاء المثناۃ وفتح الشین وتشدید الباء الموحدۃ المشددۃ یعنی باب تفعل سے اسم فاعل یہ روایت طبری کی ہے۔

۳۔ مشَبَّہَات۔ بضم المیم وفتح الشین وفتح الباء الموحدۃ المشددۃ یعنی باب تفعیل سے اسم مفعول ہے۔ یہ مسلم وغیرہ کی روایت ہے۔

۴۔ مشَبِّہَات۔ یعنی باب تفعیل سے اسم فاعل۔ ۵۔ مُشْبِہَات۔ بضم المیم وسکون الشین وکسر الباء الموحدۃ یعنی باب افعال سے اسم فاعل ہے۔

مذکورہ نسخوں میں سے جو نسخہ بھی لیا جائے مادہ اس کا شبہ ہے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اشیاء تین قسم کی ہیں۔ ایک حلال واضح جس کی حلت صاف واضح ہے جیسے فواکہ اور روٹی کھانا اور جیسے بات کرنا، چلنا وغیرہ۔ ۲ اور بعض چیزیں ایسی حرام ہیں کہ جن کی حرمت بالکل واضح اور ظاہر ہے جیسے خمر (شراب پینا) لحم خنزیر، خون اور جھوٹ و زنا وغیرہ۔

۳ اور بعض چیزیں مشتبہات ہیں ای لیست بواضحۃ الحل والحرمۃ۔

یعنی حلت وحرمت میں شبہ پیدا ہوجائے مثلاً کلب معلّم (تربیت یافتہ شکاری کتا) کے ساتھ کلب غیر معلّم شکار کے پاس پایا جائے تو شبہ پیدا ہوگیا کہ یہ شکار ان دونوں میں سے کس کلب ہے، معلّم کا ہو تو حلال ہے ورنہ حرام۔ تو اس صورت میں استبراء دین کا تقاضا شکار کا ترک واجتناب ہے۔

بہر حال شریعت میں جب اصول شریعت (ادلۂ اربعہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع، قیاس) سے جب کسی چیز کی حلت وحرمت ثابت ومتعین ہوجائے تو وہ بیّن ہے، یعنی اس کا حکم واضح ہے جو حلال ثابت ہوا اس کو کرو اور جو حرام ثابت ہوا اس کو چھوڑ دو، گویا بیّن کے معنی ہوئے بیّن حکمہ، یعنی اس کا حکم واضح ہے۔

اب اشتباہ کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں۔

(۱) ادلہ میں تعارض ہو ایک حدیث سے کوئی چیز حلال اور دوسری حدیث سے وہی چیز حرام معلوم ہوتی ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں ۱ تعارض ادلہ کی وجہ سے کسی مجتہد نے کوئی فیصلہ نہ کیا ہو اور خود ائمہ مجتہدین متردد ہوں تو ایسی صورت میں ترک واجتناب ہی میں دین وآبرو کی حفاظت وسلامتی ہے۔ جیسے مار مشکوک واقع میں یا طاہر ہے یا نجس؟ مگر تعارض ادلہ سے شبہ ہوگیا، اور تمام مجتہدین کو یہ صورت پیش نہیں آتی ہے اس لئے فرمایا: لا یعلمہا کثیر من الناس یعنی جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے یہ نہیں فرمایا کہ کوئی نہیں جانتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بعض مجتہد نے دلائل شرعیہ میں غور وفکر کرکے حلال کہا اور دوسرے نے اسی چیز کو دلائل ہی سے حرام کہا اور ان مجتہدین کو کوئی شبہ بھی نہیں ایسی صورت میں اختلاف ائمہ سے بچتے ہوئے جو جس مجتہد کا مقلد ہے اس کے فیصلے پر عمل کرے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔

(۳) علامہ زین الدین ابن المنیر کے شیوخ طریقت میں سے ایک بزرگ شیخ ابو القاسم قباری ہیں یہ طریقت کے امام اور عارف تھے۔ ابن منیر نے ان کے مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے اس کتاب میں یہ حدیث بھی آگئی ہے تو اس کے متعلق ابن المنیر نے اپنے شیخ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ وما بینہما مشتبہات سے مراد یہاں کراہت ہے کیونکہ وہ ذو الشبہتین ہے گویا پہلے دو معنوں میں صرف دو درجے تھے تیسرا ہمارے دلائل سے اشتباہ پیدا ہوگیا تھا تو اب مشتبہات سے بچنے کا مطلب یہ ہوا کہ جو مکروہ سے بچا تو استبرا لدینہ وعرضہ (اپنے دین اور عرض کے لئے استبراء کیا) اس کی تائید صحیح ابن حبان کی حدیث سے ہوتی ہے جیسے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سند مسلم کی ہے اگرچہ متن مسلم کا نہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں: اجعلوا بینکم وبین الحرام سترۃ من الحلال (ج ص۱۱۸) یعنی ایک ردک حلال کی قائم کرلو، مطلب یہ کہ اگر سارے حلال

کاموں کو کیا کرے تو بیچ میں سترہ نہیں رہتا۔ آگے فرماتے ہیں: من فعل ذالك فقد استبرأ لدينه وعرضه۔
اس سے معلوم ہوا کہ کچھ حلال چیزوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔
قباری فرماتے ہیں کہ بندہ اور حرام کے درمیان مکروہ ایک عقبہ (گھاٹی) ہے جو حلال سے چل کر اس گھاٹی میں آئیگا تو حرام میں جا پڑیگا۔ پھر کہتے ہیں کہ مباح ایک عقبہ ہے بندے اور مکروہ کے درمیان یعنی اگر سارے حلال کو اختیار کرے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں مکروہ کی گھاٹی میں نہ پہونچ جائے، معلوم ہوا کہ حلال کی بھی ایک حد ہے اور مکروہ کی بھی ایک حد ہے، اب ابن حبان کی حدیث "حلال کو سترہ بنالو" کا مطلب واضح ہوگیا۔ (درس بخاری ص۲۹۷)
فمن اتقى المشتبهات استبرأ لدينه وعرضه تو جس نے ان مشتبہ چیزوں سے اجتناب کیا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کی طرف سے صفائی پیش کردی۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتبہات میں پڑنے سے دنیوی نقصان بھی ہے کہ لوگ برا بھلا کہتے ہیں اور طعن و تشنیع کرتے ہیں جس سے آبرو ریزی ہوتی ہے۔ اور دینی مضرت بھی ہے دین بالکل صاف ستھرا اور محفوظ نہیں رہتا اندیشہ ہے کہ آگے چل کر شیطان کے اغواء سے محرمات محضہ میں واقع ہوجائے۔
من وقع في الشبهات الخ اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں پڑگیا اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو سرکاری چراگاہ کے اردگرد چرارہا ہے، ڈر ہے کہ عنقریب وہ جانور چراگاہ میں داخل کردیگا اور مجرم قرار پائیگا۔
اس مثال کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود تو راعی (چرواہا) ہے اور اس کا نفس وہ جانور ہے جسے یہ چراتا ہے، اگر انسان نے اس جانور (نفس) کو حمی اللہ یعنی چراگاہ حق میں جانے سے نہ روکا تو چرنے اور چرانے والا دونوں مجرم ہوں گے چراگاہ حق محرمات (یعنی حرام کی ہوئی چیزیں اور معاصی) ہیں اور اس کا ماحول مشتبہات ہیں، جس نے اپنے نفس کو مشتبہات کے لئے آزاد چھوڑا وہ یقیناً محرمات میں بھی جا سکتا ہے کیونکہ محرمات سرکاری چراگاہ ہیں، شاہی چراگاہ نہایت منظر فریب اور خوشنما ہوتی ہے مگر اس سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔
وجہ مشابہت یہاں فقط اس قدر ہے کہ جس طرح شاہان دنیا ایک حصہ کو اپنے لئے مخصوص کرکے اس کی حرمت سب پر لازم کردیتے ہیں اور باقی حصے مباح رہتے ہیں اسی طرح اللہ جل مجدہٗ کے بھی محرمات کی ایک باؤنڈری بنی ہوئی ہے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہئے۔
تنبیہ اس تشبیہ سے مغالطہ نہ ہونا چاہئے، تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی مختصر یہ ہے کہ بادشاہِ وقت کو خاص اپنی ذات کے لئے حمی کا حق نہیں یہ تو جاہلیت کا دستور تھا البتہ بیت المال اور عمومی ضرورتوں کے لئے یعنی مصالحِ شرعیہ کے لئے حمی کا حق ہے خلفاء راشدین سے ثابت ہے ربذہ میں چھاؤنی تھی اور حمی بنائی گئی تھی جس میں تیئس ہزار گھوڑے رہتے تھے، اب باڑھ بنادیتے ہیں یا تار لگا دیتے ہیں۔
ألا وإن في الجسد مضغة سن لو جسم کے اندر (گوشت کا) ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوگا تو

سارا بدن درست ہوگا اور جہاں وہ بگڑا سارا بدن بگڑ گیا۔

یہ جملہ بظاہر ماقبل سے مرتبط نہیں معلوم ہوتا لیکن درحقیقت یہ جملہ نہایت پُرمغز اور حکیمانہ ہے جس کا ماقبل سے نہایت ہی لطیف ارتباط و تعلق ہے۔

پہلے تو امام بخاریؒ نے مشتبہات سے بچنے کی تاکید فرمائی اب بیان فرماتے ہیں کہ محرمات اور مشتبہات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ قلب درست کرلو کیونکہ وہی تمام کمالات کا منبع اور مخزن ہے یہ مشین درست ہوگئی تو محرمات و مشتبہات سے بچنا بھی آسان ہوگا اور اگر دل ہی کی مشین خراب ہے تو مشتبہات سے احتیاط خواب وخیال ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس جملہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی حقیقت پر مطلع فرمایا کہ جو اس پر عامل ہوا اسے حقیقتِ تقویٰ حاصل ہو جائیگی، اگر دل خدا کی عظمت و محبت، خوف و خشیت سے معمور ہو، اخلاقِ نبوی سے منور ہو تو مرضیات پر عمل کرنا غیر مرضیات سے محفوظ رہنا سہل و آسان ہو جاتا ہے۔

ألا وهي القلب سن لو وہ گوشت کا لوتھڑا جس کے صلاح و فساد پر سارے جسم کے صلاح و فساد کا مدار ہے وہ قلب ہے۔

اطباء کے نزدیک قلب ایک صنوبری شکل کا مضغۂ متحرکہ ہے جو تمام اشیاء کا منبع ہے، اور شرع میں قلب لطائفِ الٰہیہ میں سے ایک لطیفہ ہے جس کا مرکز قلب مادی ہے پس یہاں مضغہ سے وہ قوت مراد ہے جس کا محل یہ گوشت کا ٹکڑا ہے جو تمام خیر و شر کا منبع ہے اسلئے مومن کو اپنی ساری توجہات کا مرکز اصلاحاتِ قلب کو بنانا چاہئے بقیہ اعضاء خود اس کے تابع ہو جائیں گے، دوسرے عنوان سے یوں سمجھئے کہ ایک ملک ہے جس کے دار السلطنت کے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا ہے لیکن کوئی بادشاہ اتنا مضبوط اور محکم نظام رکھتا ہے کہ اسکا کنٹرول پورے علاقہ پر رہتا ہے، کسی کو بغاوت کی جرأت و ہمت نہیں ہوتی۔ اور کوئی بادشاہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاقہ پر کنٹرول نہیں کرسکتا، اوپر سے حکم آتا ہے لیکن نیچے والے اسے توڑ دیتے ہیں، آج یہ علاقہ بغاوت کرتا ہے تو کل دوسرا علاقہ باغی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بلاتشبیہ انسان کا پورا جسم ایک ملک ہے اور سینہ اس کا دار السلطنت ہے قلب اس کا تخت ہے جس پر ایمان کا بادشاہ بیٹھا ہوا ہے۔ اگر ایمان کا بادشاہ قوی ہوگا تو سارے جوارح کو تابع بنالیگا نہ ہاتھ بغاوت کرسکتا ہے نہ آنکھ، نہ کان بغاوت کرسکتا ہے نہ زبان۔ اور اگر ایمان کا بادشاہ کمزور ہوگا تو ایک ایک عضو باغی ہوسکتا ہے گویا اصل مشین یا انجن قلب ہے اس کو درست کرلو وہ جدھر جائیگا اعضاء کے سب ڈبے اس کے ساتھ ادھر ہی جائیں گے۔

عقل کا محل قلب ہے یا دماغ؟

قال العینیؒ واحتج جماعة بهذا الحديث وبنحو قوله تعالى: "لهم قلوب لا يعقلون بها" على ان العقل في القلب لا في الرأس۔ قلتُ فيه خلاف مشهور، فمذهب الشافعية والمتكلمين انه في القلب ومذهب

ابی حنیفۃؒ انہ فی الدماغ ۔ وحکی الاول عن الفلاسفۃ والثانی عن الاطباء ، واحتج بانہ اذا فسد الدماغ فسد العقل۔

وقال ابن بطال وفی ھذا الحدیث ان العقل انما ھو فی القلب وما فی الرأس منہ فانما ھو عن القلب وقال النووی لیس فیہ دلالۃ علی ان العقل فی القلب۔ (عمدۃ ص۳۰۲)

بظاہر نصوص من کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید (سورۃ ق) افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا (سورۃ محمد) امام شافعیؒ کی تائید کرتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حقیقۃً محل عقل قلب ہے مگر قلب و دماغ میں اس قدر اتصال ہے کہ قلب سے فوراً دماغ میں آثار ظاہر ہو جاتے ہیں اس کی شان بجلی کی بٹن کی سی ہے کہ بٹن دبایا اور روشنی ہوگئی ایسے ہی بٹن تو قلب ہے اور دماغ میں اس کی بتیاں ہیں۔

اس تقریر پر نہ آیات میں اشکال ہوگا اور نہ حکماء کا اختلاف۔ اسی لئے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے دماغ کو محل عقل فرمایا۔

شاہ صاحبؒ کا یہ قول ابن بطال کے قول مذکور کی تشریح ہے۔

حدیث الباب یہ حدیث نہایت ہی عظیم الشان حدیث ہے۔ امام نوویؒ نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ارکانِ اسلام میں سے ایک ہے اور ان احادیث میں سے ہے جن پر اسلام کا مدار ہے، اس کی شرح کے لئے بہت سے دفتر چاہئیں، بہت سے علماء نے اس کو تمام اصول اسلام کا ایک تہائی اور بعض نے چوتھائی حصہ قرار دیا ہے۔

باب اداء الخمس من الایمان ص۱۳

اس بات کا بیان کہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ ادا کرنا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

۵۱ ● حدثنا علیُّ بنُ الجعدِ قال اخبرنا شعبۃُ عن ابی جمرۃ قال کنتُ اقعدُ مع ابنِ عباسٍ فیُجلِسُنی علی سریرِہ فقال اَقِمْ عندی حتی اَجعلَ لک سھمًا من مالی فاقمتُ معہ شھرینِ ثم قال انّ وفدَ عبدِ القیسِ لمّا اَتَوا النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قال مَنِ القومُ او مَنِ الوفدُ قالوا ربیعۃُ قال مرحبا بالقومِ او بالوفدِ غیرَ خزایا ولا ندامی فقالوا یا رسولَ اللہِ انّا لا نستطیعُ اَن ناتیکَ الّا فی الشھرِ الحرامِ بیننا وبینک ھذا الحیُّ مِن کفارِ مُضَر فمُرنا بامرٍ فصلٍ نُخبِرُ بہ مَن وّراءنا وندخلُ بہ الجنۃَ وسالوہ عن الاشربۃ فامرھم باربعٍ ونھاھم عن اربعٍ امرھم بالایمان باللہ وحدہ قال اَتدرون ما الایمانُ باللہ وحدہ قالوا اللہ ورسولہ اعلم، قال شھادۃُ اَن لا الٰہ

اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ محمدًا رسولُ اللّٰہِ وَاِقامُ الصلوٰۃِ وَاِیتاءُ الزکوٰۃِ وصیامُ رمضانَ وَاَنْ تُعطوا مِنَ المغنمِ الخُمُسَ، ونہاھم عن اربعٍ عن الحَنتَمِ والدُّبّاءِ والنقیرِ والمُزَفَّتِ وربَّما قال المُقَیَّرِ وقال احفظوھنّ واخبروا بھنّ مَن وّرائکم ●

ترجمہ ابو جمرہ (نصر بن عمران تابعی) سے مروی ہے کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا کرتا تھا اور وہ مجھکو خاص اپنے تخت پر بیٹھا لیتے تھے (ایک بار) کہنے لگے تو میرے پاس رہ جا میں تمہارے لئے اپنے مال میں سے کچھ حصہ مقرر کردوں گا چنانچہ میں تنے دو مہینے تک ان کے پاس قیام کیا پھر (ایک دن) ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ جب عبدالقیس کا وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور اقدسؐ نے دریافت فرمایا تم کون لوگ ہو؟ یا فرمایا کس جماعت کے ہو؟ (شک الراوی والشاک شعبہ او ابو جمرہ) انہوں نے عرض کیا ہم بنی ربیعہ کے لوگ ہیں آپؐ نے فرمایا مرحبا خوش آمدید وہ وفد جو نہ رسوا ہوئے نہ شرمندہ، پھر وفد نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم شہر حرام کے علاوہ اور کسی مہینے میں آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتے کیونکہ ہمارے اور آپؐ کے درمیان کفار مضر کا قبیلہ ہے اس لئے آپ ہمیں ایک ایسی فیصل بات بتا دیجئے کہ جس کی خبر ہم (اپنے) ان لوگوں کو کر دیں جو ہمارے پیچھے ہیں (یعنی یہاں نہیں آئے) اور اس پر عمل کرکے ہم جنت میں داخل ہوسکیں۔ اور انہوں نے آنحضرتؐ سے ظروف مشروبات کے بارے میں (یعنی باسنوں کے متعلق) بھی دریافت کیا آپؐ نے چار باتوں کا ان کو حکم فرمایا اور چار باتوں سے منع کیا، آپؐ نے انہیں حکم دیا کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ آپؐ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو خدائے واحد پر ایمان کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول خوب واقف ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا۔ اور آپؐ نے ان لوگوں کو چار چیزوں سے منع فرمایا سبز ٹھلیا سے کدو کے تونبے سے اور لکڑی کے کریدے ہوئے برتن سے اور روغنی برتن سے (یعنی ان برتن سے جس پر روغن زفت لگایا گیا ہو) اور کبھی مقیر کہا (یعنی حضرت ابن عباسؓ نے چوتھی چیز کو کبھی مزفت کہا اور کبھی مزفت کے بجائے مقیر فرمایا) (دونوں کے معنی ایک ہیں) اور فرمایا انہیں یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے (اپنے ملک میں) ہیں انہیں بھی بتلا دو۔

مطابقة للترجمة مطابقة الحديث للترجمة ظاهرة لأنه عقد الباب على جزء منه وهو قوله "وأن تعطوا من المغنم الخمس" (عمدہ)

ربط و مقصد اس سے پہلا ترجمہ "من استبرأ لدينه" تھا جس میں اس شخص کی فضیلت و عظمت تھی جو دین میں صفائی رکھے، امام بخاریؒ اب اس باب میں وفد عبدالقیس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکھری ہوئی باتیں معلوم کرنے کا ذکر فرما رہے ہیں، اس طرح کی باتوں کی طلب اسی شخص کے دل میں ہوگی جس کے دل میں دین کی صفائی کا جذبہ ہو، ایسے ہی لوگ اہل علم کی مجالس میں حاضر ہوتے ہیں اور ایسی باتوں کی

جستجو میں لگے رہتے ہیں جو دنیا میں امن و عزت اور آخرت میں حصول جنت کی ضامن ہوں۔ (فضل الباری)

(۲) ماقبل میں حلال بیّن اور حرام بیّن کا ذکر تھا اس باب میں گویا اس کی مثال دی گئی ہے کہ حلال بیّن وہ ہے جس کا بالتصریح آپؐ نے حکم فرمایا ہو اور حرام بیّن وہ ہے جس سے آپؐ نے صراحۃً منع فرمایا ہو۔ (ماخوذ از عمدہ)

(۳) ایک ربط یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ماقبل میں احتیاط فی الدین کا بیان تھا، مشتبہات سے بچنے کی تاکید تھی، اور اس باب کی حدیث میں جو مخصوص برتنوں کی ممانعت ہے وہ احتیاط ہی کی وجہ سے تھی۔ (امداد)

تعدد الحدیث علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اخرجہ البخاری فی عشرۃ مواضع الخ ھنا فی الایمان ص۱۳ وفی کتاب العلم ص۱۹ وفی مواقیت الصلوٰۃ ص۷۵ وفی کتاب الزکوٰۃ ص۱۸۸ وفی کتاب الجهاد ص۴۳۶ تا ص۴۳۷ وفی کتاب المناقب ص۴۹۸ وفی المغازی ص۶۲۶ وص۶۲۷ وفی کتاب الادب ص۹۱۲ وفی اخبار الاحاد ص۱۰۷۱ وفی التوحید ص۱۱۲۸۔

سوال و جواب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سابق میں بہت سے ایسے ابواب گذرے ہیں جن میں امام بخاریؒ نے اجزاء ایمان کا ذکر کیا ہے اور باب اداء الخمس من الایمان کا ان ابواب سے گہرا ربط تھا چاہئے تھا کہ امام بخاریؒ اس باب کو بھی ان ابواب کے ساتھ رکھتے۔

جواب:۔ سابقہ ابواب میں امام بخاریؒ نے جن اجزاء ایمانیہ کا ذکر فرمایا ہے ان کا تعلق ایمان سے ہمیشہ ہمیشہ کا ہے، جیسے نماز، زکوٰۃ اور صوم رمضان وغیرہ۔ اور یہ اداء خمس ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق مستقل نہیں ہے بلکہ گاہے گاہے ہے، اب ترجمہ کے انعقاد سے یہ تنبیہ ہوسکتی ہے کہ جزء ایمان شمار کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ چیزیں مستقل طور پر ایمان سے متعلق ہوں بلکہ وہ چیزیں بھی اجزاء ایمان ہیں جو کبھی کبھی ایمان سے متعلق ہوتی ہیں۔

کنت اقعد مع ابن عباس ابو جمرہ تابعی راوی حدیث حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد اور خاص مصاحبین میں سے تھے یہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: یعنی زمن ولایتہ البصرۃ من قبل علی ابن ابی طالبؓ الخ یعنی قصہ اس وقت کا ہے جب حضرت ابن عباسؓ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بصرہ کے حاکم تھے، ابن عباسؓ ابو جمرہ کا اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ چنانچہ ابو جمرہ کو اپنے بغل میں تخت پر بیٹھاتے تھے، اس اعزاز کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بصرہ فارس کی سرحد پر واقع ہے اس لئے فارسی لوگ بھی حضرت ابن عباسؓ کے پاس مقدمہ لیکر آتے تھے ابو جمرہ فارسی زبان سے واقف تھے اس لئے ابن عباسؓ ترجمان کی حیثیت سے اپنے پاس بیٹھاتے تھے چنانچہ بین السطور میں لکھا بھی ہے: لانہ کان یترجم لابن عباس الفارسیۃ نیز اسی بخاری شریف کتاب العلم ص۱۹ میں ہے عن ابی جمرۃ کنت اترجم بین ابن عباس و بین الناس الخ یعنی ابو جمرہ حضرت ابن عباسؓ اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کی خدمت انجام دیتے تھے چونکہ حضرت ابن عباسؓ کی زبان عربی تھی اور ابو جمرہ بصرہ میں رہنے کی وجہ سے فارسی کے ماہر تھے۔

اقم عندی حتی اجعل لک سہماً الخ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم میرے پاس کچھ روز قیام کرو میں تمہارے لئے اپنے مال میں سے تمہارا حصہ لگادونگا چنانچہ میں ان کے پاس دو ماہ قیام پذیر رہا۔

دوسری وجہ بخاری کتاب الحج صـ۲۲۸ سے معلوم ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما بعض مصلحتوں کی بنیاد پر تمتع سے منع کرتے تھے ان حضرات کا منشا یہ تھا کہ خانہ کعبہ پورے سال آباد رہے قریب کے لوگ حج کے موسم میں حج کیا کریں اور عمرہ کے لئے مستقل سفر کیا کریں۔ جب ابوجمرہ نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر لبیک حجۃ وعمرۃ کہنا شروع کیا تو بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو ابوجمرہ نے ابن عباسؓ سے مسئلہ پوچھا ان کا مسلک خود تمتع کا تھا اس لئے ان کو اجازت دیدی اور ابوجمرہ مطمئن ہوکر تمتع کے احرام سے روانہ ہوگئے اور فارغ ہونے کے بعد ایک روز خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے: "حجٌ مبرورٌ وعمرۃٌ متقبّلۃٌ" یہ حج اور عمرہ مقبول ہے۔

واپس آنے کے بعد ابوجمرہ نے یہ خواب ابن عباسؓ سے بیان کیا ابن عباسؓ کو بہت خوشی ہوئی اور اپنے مسلک کی صحت کا یقین بڑھ گیا۔ فرمایا: سنۃ ابی القاسم صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز اس خواب سے ابوجمرہ کے صلاح و تقویٰ کا حال بھی معلوم ہوگیا اس لئے حضرت ابن عباسؓ ابوجمرہ کا خصوصی خیال رکھتے تھے اور چونکہ ترجمانی بھی کرتے تھے اس لئے اپنے مال میں سے کچھ حصہ دینے کا ارادہ کیا۔ بخاری ج ا صـ۲۱۳ میں یہ واقعہ موجود ہے اس میں اتنی بات زیادہ ہے کہ ابوجمرہ کے شاگرد شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوجمرہ سے پوچھا لِمَ فقال للرویا التی رأیتھا معلوم ہوا کہ اصل سبب اعزاز و اکرام کا وہ خواب تھا ورنہ ترجمانی کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے اتنا احترام و اکرام ہو۔

بہرکیف حضرت ابن عباسؓ کے ارشاد سے ابوجمرہ نے دو مہینہ قیام کیا۔ مسلم شریف میں ہے کہ ایک دن ایک عورت نے نبیذ جرّہ (ظروف نبیذ) کا مسئلہ دریافت کیا ابن عباسؓ نے اس کو منع کیا تو ابوجمرہ کو یہ سوال و جواب سنکر خیال آیا کہ میں بھی جرّہ (ٹھلیا) میں نبیذ بناتا ہوں، ابوجمرہ نے اپنا حال ابن عباسؓ سے بیان کیا اس پر ابن عباسؓ نے یہ حدیث سنائی:۔

ان وفد عبد القیس لما اتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ نیز ابوجمرہ قبیلہ عبد القیس کے تھے اس لئے بھی ان کو یہ حدیث سنائی۔

وفد عبد القیس

قبیلہ عبد القیس بحرین میں رہتا تھا۔ اس قبیلہ کا تاجر منقذ بن حیان مدینہ میں تجارت کا کپڑا لیکر تجارت کرتا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضور اقدسؐ ان سے ملے اور بحرین کے حالات دریافت فرمائے۔ بحرین کے شرفاء اور رؤسا کے حالات نام بنام آپؐ نے دریافت فرمائے بالخصوص اس قبیلہ کے سردار منذر بن عائذ الملقب بہ منذر الاشج کا حال دریافت فرمایا اور یہ منذر منقذ کے خسر تھے اس لئے منقذ بن حیان کو سخت حیرت ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی بحرین تشریف نہیں لے گئے پھر آپؐ کو بحرین کے تفصیلی حالات کیسے معلوم ہوئے؟ نہایت توجہ سے منقذ آپؐ کی

باتیں سنتے رہے اور بہت متأثر ہوئے، آپ نے اسلام کی دعوت دی وہ مسلمان ہوگئے، حضورؐ نے منقذ کو سورۂ فاتحہ اور سورہ علق (یعنی اقرأ باسم ربک) کی تعلیم دی، منقذ جب وطن جانے لگے تو حضور اقدسؐ نے قبیلہ کے سرداروں کے نام خطوط لکھوا کر دیا، منقذ نے اپنے وطن بحرین جاکر اسلام (اپنا) ظاہر نہیں کیا موقع کے منتظر رہے البتہ جب نماز کا وقت آتا تو گھر میں نماز پڑھ لیتے ان کی بیوی منذر الاشج کی بیٹی تھی اس کے دل میں یہ بات کھٹکی، اس نے منقذ کے نئے افعال و اعمال کا تذکرہ اپنے باپ سے کیا کہ اس مرتبہ منقذ جب سے مدینہ سے آئے ہیں رنگ ڈھنگ بدلا ہوا ہے ہاتھ منہ اور پیر دھوتے ہیں پھر قبلہ رو ہوکر کبھی کھڑے ہوتے ہیں، کبھی جھکتے ہیں اور کبھی زمین پر سر رکھدیتے ہیں، منذر نے یہ حال سنکر اپنے داماد منقذ سے پوچھا کہ کیا نئی بات ہے ؟ انہوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ بھی کہدیا کہ حضور اقدسؐ نے آپ کا حال بھی خصوصیت سے دریافت فرمایا، اس پر منذر الاشج مسلمان ہوگئے، پھر حضرت منقذ کی تبلیغ سے ایک جماعت مسلمان ہوگئی اور چالیس آدمی پر مشتمل ایک وفد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ۸ھ فتح مکہ سے کچھ قبل آیا، حضورؐ نے مرحبا بالوفد یعنی خوش آمدید کہا، وفد والوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر ہیں اس لئے ہم لوگ شہر حرام (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب) کے علاوہ حاضر خدمت نہیں ہوسکتے اس لئے آپ ہمیں ایسی قطعی اور واضح بات بتلا دیجئے جس کی ہم اپنے پیچھے رہنے والوں کو خبر کردیں اور اس پر عمل کرکے ہم لوگ جنت میں جاسکیں" اور ان وفد والوں نے مشروبات (ظروف) کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے انہیں چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے منع کیا۔

اشکال و جواب

اشکال یہ ہوتا ہے کہ اجمال میں چار چیزیں مذکور ہیں، تفصیل میں پانچ چیزیں۔ ایمان، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام اور مال غنیمت کا خمس۔ اس لئے اجمال اور تفصیل میں مطابقت نہیں ہوئی۔

جواب:۔ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:۔

(۱) یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کلام کسی خاص مقصد کے لئے بیان کیا جائے اور ضمناً کوئی دوسری چیز آجائے تو اس ضمنی چیز کو شمار نہیں کیا جاتا ہے، صرف اصل مقصد شمار کیا جاتا ہے۔ عبد القیس کا یہ وفد چونکہ مسلمان تھا جیسا کہ اس کے قول اللہ و رسولہٗ اعلم سے صاف ظاہر ہے تو جب وہ مسلمان تھے تو ایمان سے بخوبی واقف تھے اس لئے شہادتین کا ذکر ضمنی ہے اور تبرکاً ہے اس کا شمار مستقل نہیں ہوگا۔

(۲) ان تؤدوا خمساً من المغنم کوئی جداگانہ چیز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ کی تفصیل ہے۔ اب زکوٰۃ وہ ہے جو متعین ہے اور ہمیشہ وصول کی جاتی ہے، اور دوسری کبھی کبھی جب مال غنیمت حاصل ہو۔

(۳) بعض حضرات کہتے ہیں کہ روایت میں چار میں سے صرف ایک ہی کا تذکرہ ہے یعنی ایمان باللہ کا اور بقیہ امور ایمان کی تفسیر ہیں اور باقی تین امور کو راوی نے اختصاراً یا نسیاناً ترک کر دیا۔

(۴) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: امرھم بالایمان باللہ وحدہ وامرھم باربع واقام الصلوٰۃ الخ چنانچہ امام بخاریؒ نے "الادب المفرد" میں جو روایت

نقل کی ہے اس میں اسی طرح ہے پس اجمال وتفصیل میں مطابقت ہو گئی۔

تحقیق الفاظ خزایا جمع ہے خزیان کی بمعنی رسوا جیسے حیران کی جمع حیاری۔ ندامی ندمان بمعنی نادم کی جمع ہے بمعنی شرمندہ، مطلب یہ ہے کہ نہ تم رسوا ہو کر آئے نہ شرمندہ ہو کر۔

رسوائی تو اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ تم لوگ خود بخود آگئے گرفتار اور قیدی ہو کر نہیں آئے، اور ندامت وشرمندگی اس لئے نہیں کہ تم نے ہم سے کبھی مقابلہ نہیں کیا اگر ہماری تمہاری پہلے لڑائی ہوئی ہوتی تو آج ہمارے پاس آنے میں شرمندگی محسوس ہوتی۔

حنتم بفتح الحاء وسکون النون وفتح التاء، مٹکا، مٹلیا، شراب کا مٹکا چونکہ اکثر سبز رنگ کا ہوتا تھا اس لئے اس کا ترجمہ سبز مٹکے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دباء بضم الدال وتشدید الباء مد اور قصر دونوں کے ساتھ منقول ہے کدو کا تونبا، کدو کو اس کے درخت پر ہی خشک کر لیتے ہیں پھر اس کے اندر سے سارے گودے اور بیج نکال کر برتن سا بنا لیتے ہیں

نقیر بفتح النون وکسر القاف یہاں نقیر بمعنی منقور ہے کھجور کی جڑ کھود کر بنایا ہوا برتن۔

مزفت بتشدید الفاء، بعض روایت میں مقیر ہے دونوں کا مفہوم ایک ہے روغن زفت لگایا ہوا برتن مزفت زفت سے ہے اور مقیر قار سے، قار کو قیر بھی کہتے ہیں تار کول جیسا ایک تیل بصرہ سے آتا تھا اور اس کو کشتیوں میں مسامات بند کرنے کے لئے لگاتے تھے۔

مسئلہ حنفیہ شافعیہ کے نزدیک برتنوں کی حرمت منسوخ ہو گئی۔ مالکیہ وحنابلہ کے نزدیک اب بھی ان برتنوں کی ممانعت ہے، ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بصرہ کی گورنری کے زمانہ میں جب ان برتنوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس حدیث کو سنایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔

احناف اور شوافع رحمہم اللہ کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ منسوخ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ان کے نسخ کا علم نہیں تھا اس بناء پر انہوں نے بیان کیا، منسوخ ہونے کی دلیل مسلم شریف کی وہ حدیث ہے جس میں ارشاد ہے کنت نہیتکم عن الانتباذ الا فی الاسقیة فانتبذوا فی کل وعاء ولا تشربوا مسکراً۔

(ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۵۳)

• **باب**[۴۱] ماجاءَ انّ الاعمالَ بالنيّةِ والحِسبةِ ولِكلِّ امرئٍ مّانوٰى فدخلَ فيه الايمانُ والوضوءُ والصلوٰةُ والزكوٰةُ والحجُّ والصومُ والاحكامُ وقال اللهُ تعالىٰ قُلْ كُلٌّ يعملُ على شاكلتِه " على نيتِه نفقةُ الرجلِ على اهلِه يحتسِبُها صدقةٌ وقال النبي صلى الله عليه وسلم ولكن جهادٌ ونيّةٌ •

اس بات کا بیان کہ (شریعت میں) اعمال کا دار ومدار نیت واخلاص پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی

ہے جس کی اس نے نیت کی ہے تو عمل میں ایمان اور وضو، نماز، زکوۃ اور حج اور روزہ اور احکام (شرعیہ) بھی داخل ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سورۂ بنی اسرائیل میں) قل کل یعمل الخ اے نبی آپ کہدیجئے ہر آدمی اپنے طریقے پر یعنی اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ انسان کا اپنے اہل وعیال پر بہ نیت ثواب خرچ کرنا صدقہ ہے۔ اور (جب مکہ فتح ہوگیا تو) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اب مکہ سے ہجرت تو باقی نہیں رہی) لیکن جہاد اور نیت باقی ہے۔

ربط ماقبل کے باب میں یہ ہے کہ وفد عبد القیس نے یہ سوال کیا تھا کہ کوئی ایسی چیز بتلا دیجئے جس کی وجہ سے ہم جنت میں داخل ہوسکیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اعمال کو بتلا دیا۔ اب امام بخاریؒ اس باب سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ اعمال دخول جنت کا سبب اس وقت بنیں گے جب نیت صحیح ہو۔

۲۔ یا یوں کہا جائے کہ ایمان کے شعبوں کو بیان کرنے کے بعد امام بخاریؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ امور ایمان کا شعبہ اس وقت ہوسکتے ہیں جبکہ خالصاً لوجہ اللہ ہوں۔ (امداد الباری)

مقصد ترجمہ اس سے کرامیہ پر رد مقصود ہے جو صرف اقرار باللسان کو ایمان کہتے ہیں، رد کی تقریر یوں ہوگی "الایمان عمل وکل عمل لا بد لہ من النیۃ فالایمان لا بد لہ من النیۃ"۔

علی شاکلتہ علی نیتہ امام بخاریؒ نے شاکلتہ کی تفسیر نیتہ سے کی ہے، لیکن شاکلۃ کے اصل معنی مناسبت طبعیہ کے ہیں کہ ہر انسان اپنے طبعی مناسبت و رجحان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وقال اللیث الشاکلۃ من الامور ما وافق فاعلہ والمعنی ان کل احد یعمل علیٰ طریقتہ التی تشاکل اخلاقہ الخ (عمدۃ ص ۳۱۵) یعنی ہر شخص اپنے اس طریقہ پر عمل پیرا ہوتا ہے جو اس کے اخلاق سے مطابقت کرتا ہے، مثلاً کافر اپنے طریقے سے میل کھانے والے اعمال کرتا ہے، نعمت خداوندی کے اعراض و روگردانی شدت و مصیبت کے وقت یاس و دل شکستگی وغیرہ۔ اور مومن اپنے طریقے اور مذہب کے مطابق اعمال کرتا ہے الاناء یترشح بما فیہ۔

۵۲ ● حدثنا عبدُ اللہِ بنُ مَسلمۃَ قال اخبرنا مالکٌ عن یحیی بنِ سعیدٍ عن محمد بن ابراھیمَ عن عَلقمۃَ بنِ وَقّاصٍ عن عُمرَ اَنّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الاعمالُ بالنیۃِ ولِکُلِّ امرِیٍٔ مَّا نوَیٰ فمن کانت ھِجرتُہ الی اللہِ و رسولِہ فھجرتُہٗ الی اللہِ و رسولِہ ومَن کانت ھجرتہ لِدُنیا یُصیبُھا اَوِ امرَأۃٍ یتزوّجھا فھجرتہٗ اِلیٰ ما ھاجرَ الیہ۔ ●

۵۳ ● حدثنا حجّاجُ بن مِنھالٍ قال حدثنا شعبۃ قال اخبرنی عدیُّ بنُ ثابتٍ قال سمعتُ عبدَ اللہِ بنَ یزیدَ عن ابی مسعودٍ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اِذا اَنفقَ الرجلُ علیٰ اھلہ یحتسبھا فھی لہ صَدقۃٌ ●

۵۴ ● حدثنا الحکمُ بنُ نافعٍ قال اخبرنا شعیبٌ عن الزہریّ قال حدثنی عامرُ بنُ سعدٍ عن سعدِ بنِ ابی وقاصٍ اَنّہ اخبرہ اَنّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اِنّک لَن تُنفِقَ نفقۃً تَبتغی بہا وجہَ اللّٰہِ اِلّا اُجِرتَ علیہا حتیٰ ما تجعلُ فی فم امرأتِک ●

ترجمہ حدیث ۵۲ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہو۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کی تو وہ اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے شمار ہوگی اور جس نے حصول دنیا یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہجرت کی تو وہ اسی مد میں (شمار) ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت اختیار کی۔

مطابقۃ للترجمۃ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں تین امور ذکر کئے ہیں ۱ الاعمال بالنیۃ ۲ الحسبۃ (یعنی استحضار نیت) ۳ لکل امریٔ مانوی۔

ان تینوں کے لئے علی الترتیب تین حدیث لائے ہیں، اس حدیث کی مطابقت اول ترجمہ سے ظاہر ہے۔ ای فی قولہ "الاعمال بالنیۃ"

تعدد الحدیث:۔ اس کے لئے بخاری شریف کی پہلی حدیث یعنی حدیث ۱ ملاحظہ فرمائیے۔

ترجمہ حدیث ۵۳ حضرت ابومسعود بدریؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ جب آدمی اپنے گھروالوں پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو یہ اس کے لئے صدقہ ہے یعنی صدقہ کا ثواب پائیگا۔ نفقۃ الرجل مبتداء ہے اور تحتسبہا حال ہے اور صدقۃ خبر ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ اس حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب کے دوسرے جزء سے ہے ای اذا انفق الرجل علیٰ اہلہ یحتسبہا فہی لہ صدقۃ۔

اہل وعیال کا نفقہ ایک معاشرتی چیز ہے، انسان اہل وعیال پر خرچ فطری اور طبعی تقاضوں کے تحت کرتا ہے اس لئے ہوسکتا تھا کہ اس میں ثواب کا تصور بھی نہ ہوتا اس لئے احتساب کے لفظ سے متنبہ کردیا گیا کہ ان میں بھی اچھی نیت اور حصول ثواب کا استحضار ہو تو انسان ماجور ومستحق ثواب ہوگا۔

تعدد الحدیث :۔ اخرجہ البخاری ہنا فی الایمان ص۱۳ وفی المغازی ص۵۷۰ وفی کتاب النفقات ص۸۰۵۔

ترجمہ حدیث ۵۴ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہیں ہر اس نفقہ وخرچ پر ثواب دیا جائیگا جس سے اللہ کی رضامندی مقصود ہو یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جسے تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھوگے۔

مطابقۃ للترجمۃ اس حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب کے تیسرے جزء سے ہے۔ یعنی لکل امریٔ مانویٰ۔

تعدد الحدیث:۔ اخرجہ البخاری ہنا فی الایمان ص۱۳ وایضا مفصلا فی الجنائز ص۱۷۳

وایضا فی الوصایا ص۳۸۳ وایضاص۱۰۵۶ وص۶۳۲ تاص۶۳۳ وص۸۰۶ وص۸۴۶ وص۹۴۳ وص۹۹۷۔

● **باب**[۴۲] قولِ النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الدِّینُ النَّصِیحَۃُ لِلّٰہِ ولرسولہٖ ولأئمّۃِ المسلمینَ وعامّتِہم وقولہ تعالیٰ " اِذَا نصحوا لِلّٰہِ ورسولِہٖ ●

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور ائمۂ مسلمین اور عام مسلمانوں کے لئے خیر خواہی کرنا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ توبہ میں) کہ جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خلوص رکھیں۔

مقصد ترجمہ اس باب میں امام بخاریؒ نے دو حدیثیں نقل کی ہیں لیکن پہلی روایت النصیحۃ للّٰہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین ہے جو علیٰ شرط البخاری نہیں تھی اس لئے اس کو ترجمہ کا جزء بنادیا اور آیت کریمہ پیش کرکے اس کسر کو پوری کردی۔

الدین النصیحۃ نصیحت کا حمل دین پر کیا گیا ہے اور ابواب سابقہ سے یہ معلوم ہوچکا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک دین و ایمان متحد ہیں لہٰذا الایمان النصیحۃ ہوگیا اور چونکہ نصیحت کے معنی اخلاص کے ہیں اور اخلاص کے درجات مختلف ہیں اس لئے ایمان کے درجات و مراتب بھی مختلف ہوگئے جس سے ایمان کے اندر زیادتی و کمی کا معاملہ بھی صاف ہوگیا اور چونکہ یہ باب کتاب الایمان کا آخری باب ہے اس لئے امام بخاریؒ نے جو کتاب الایمان قائم کیا تھا اس کی ابتداء اور انتہا مرتبط ہوگئی۔

ربط ماقبل ماقبل کے باب میں نیت کی اہمیت کا بیان تھا اب اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں خواہ اللہ سے ہو یا رسول سے یا ائمۃ المسلمین سے یا عام مسلمانوں سے، اخلاص ضروری ہے اس طرح پر کہ کسی معاملہ میں غش اور رکھونٹ کی آمیزش نہ ہو۔

۵۵ ● حدثنا مُسدّدٌ قال حدثنا یحییٰ عن اسمٰعیلَ قال حدثنی قیسُ بنُ اَبی حازمٍ عن جریرِ بنِ عبدِ اللّٰہِ البَجَلیّ قال بایعتُ رسولَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی اقامِ الصّلوٰۃِ وایتاءِ الزکوٰۃِ وَالنُّصحِ لِکُلِّ مُسلمٍ ●

۵۶ ● حدثنا ابو النعمانِ قال حدثنا ابو عوانۃَ عن زیادِ بنِ عِلاقۃَ قال سمعتُ جریرَ بنَ عبدِ اللّٰہِ یومَ ماتَ المغیرۃُ بنُ شعبۃَ قامَ فحمِدَ اللّٰہَ واثنیٰ علیہ و قال علیکم باتّقاءِ اللّٰہِ وحدَہٗ لاشریکَ لہٗ والوقارِ والسّکینۃِ حتّٰی یاتیَکم امیرٌ فانّما یاتیکمُ الاٰنَ ثمّ قال استعفوا لِاَمیرِکم فانّہٗ کان یحبُّ العفوَ ثمّ قال امّا بعدُ فانّی اتیتُ النّبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قلتُ اُبایعُکَ علی الاسلامِ فشرَطَ علیَّ والنُّصحِ لِکُلِّ مسلمٍ فبایعتُہٗ علیٰ ھذا وربِّ ھذا المسجدِ اِنّی لَناصِحٌ لکم ثمّ استغفرَ ونزلَ ●

ترجمہ حدیث ۵۵ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیرخواہی پر بیعت کی

مطابقتہ للترجمۃ :- مطابقتہ ظاہرۃ فی قولہ " والنصح لکل مسلم "

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا فی الایمان ص۱۳ ایضا ص۱۴ ایضا ص۷۵ ایضا ص۱۸۸ ایضا ص۲۸۹ ایضا ص۳۷۵ ایضا ص۱۰۶۹۔

ترجمہ حدیث ۵۶ زیاد بن علاقہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ جس دن مغیرہ بن شعبہؓ کا انتقال ہوا اس روز میں نے جریر بن عبداللہ سے سنا کھڑے ہو کر انہوں نے (اول) اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور (لوگوں سے) کہا تمہیں صرف خدائے وحدہٗ لاشریک سے ڈرنا چاہئے اور وقار اور سکون کے ساتھ رہنا چاہئے یہاں تک کہ کوئی امیر تمہارے پاس آجائے وہ امیر عنقریب ہی تمہارے پاس آنے والے ہیں پھر کہا اپنے (مرحوم) امیر کے لئے دعاء مغفرت کرو کیونکہ وہ بھی معافی کو پسند کرتے تھے پھر کہا اب اسی (حمد وصلوۃ) کے بعد (سن لو کہ) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت اسلام کی غرض سے حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھ سے اسلام پر قائم رہنے کی اور ہر مسلمان کی خیرخواہی کی شرط لی تو میں نے اسی پر آپؐ کی بیعت کی، اور قسم ہے اس مسجد کے رب کی کہ یقیناً میں تمہارے لئے خیرخواہ ہوں پھر انہوں نے استغفار کیا اور منبر سے اتر گئے۔

مطابقتہ للترجمۃ :- مطابقت حدیث ظاہر ہے۔ فی قولہ " والنصح لکل مسلم "

تعدد الحدیث :- والحدیث ھنا ص۱۴ وباقی ص۳۷۵۔

تشریح نصیحۃ: اسم مصدر اس کے اصل معنی ہیں اخلاص، ازباب فتح نصحا ونُصحا مخلص ہونا۔ یہ لفظ دو طرح مستعمل ہے، ایک تو نصح الثوب کپڑا سینا، نصیحت سے بھی منصوح کے برے حال کی اصلاح ہوتی ہے اسی سے توبۂ نصوح ہے یعنی خالص توبہ گویا معاصی لباس دین کو چاک کر دیتے ہیں اور توبہ اسی کو درست کرتی ہے۔ ۲ یا نصح العسل سے ہے جب شہد کو موم وغیرہ سے صاف کر لیتے ہیں تو کہتے ہیں نصحت العسل، نصیحت سے بھی برائی کو دور کیا جاتا ہے۔

علامہ خطابیؒ کہتے ہیں کہ نصیحت ایک جامع کلمہ ہے جس کے معنی ہیں منصوح لہٗ کے پورے حق کو ادا کرنا۔

النصیحۃ للہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ اس کو وحدہٗ لاشریک مانے، تمام صفات کمالیہ کے ساتھ متصف مانے، اور نقائص ورذائل سے اس کو منزہ اور پاک سمجھے اور پوری زندگی عبدیت وغلامی کی بنالے۔

ولرسولہ رسول کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ان پر ایمان لائے، ماجاء بہ الرسول کی تصدیق کرے، اپنی تمام تر خواہشات کو آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کے تابع کر دے، جیساکہ ارشاد نبوی ہے: لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ، آپ کی تعظیم وتکریم میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے، درود کا اہتمام کرے۔

ولائمۃ المسلمین ائمہ دو ہیں۔ ایک ائمہ علم وہدایت اور دوسرے امراء وحکام۔

ائمۂ علم و ہدایت کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ان کے علوم سے استفادہ کرتے رہیں، ان کی عزت و توقیر کریں اگر ان کے مقلد نہ ہوں تو بھی ان کی شان میں بے ادبی نہ کریں ان کی شان میں گستاخی کا انجام خطرناک ہوتا ہے۔
ائمۂ سیاست یعنی امراء و حکام کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ حق پر ان کی اطاعت و اعانت کی جائے اور اگر خلاف شریعت کام کرنے لگیں تو ان کو حسنِ تدبیر اور خوش اسلوبی سے سمجھانے کی کوشش کریں۔
وعامتھم اور عام مسلمانوں کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے جس کی ترغیب لایؤمن احدکم حتی یحب لأخیہ مایحب لنفسہ۔
علامہ عینیؒ الدین النصیحۃ کے متعلق فرماتے ہیں: ھذا حدیث عظیم علیہ مدار الاسلام فیکون ھذا ربع الاسلام، ومنھم من قال یمکن ان یستخرج منہ الدلیل علی جمیع الاحکام۔ (عمدۃ)
یوم مات المغیرۃ الخ کان المغیرۃ والیاً علی الکوفۃ فی خلافۃ معاویۃؓ وکانت وفاتہ سنۃ خمسین من الھجرۃ واستناب عند موتہ ابنہ عروۃ وقیل استناب جریرا المذکور و لھذا خطب الخطبۃ المذکورۃ۔ (فتح الباری)
جب حضرت معاویہؓ کو حضرت مغیرہؓ کے وصال کی خبر ملی تو انہوں نے زیاد کو لکھا جو اس وقت بصرہ میں ان کے نائب تھے کہ تم امیر بن کر کوفہ پہونچ جاؤ۔ (فتح)
ھذا المسجد اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جریرؓ نے مسجد میں خطبہ دیا ہوگا اور وہی مسجد کوفہ مراد ہوگی مگر طبرانی کی روایت میں ورب الکعبۃ کے الفاظ ہیں جس سے ثابت ہوا کہ ہذا المسجد سے مراد مسجد حرام ہے۔ حاضر فی الذہن ہونے کی وجہ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

فائدہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ ہر کتاب کے خاتمہ پر ایسی روایت لاتے ہیں جس سے ختم کتاب کی طرف اشارہ ہو، چنانچہ اس مقام پر بھی استغفر ونزل سے براعۃ اختتام کی جانب اشارہ ہے کہ جب منبر سے اتر آئے تو جو کچھ کہنا ہے وہ ختم ہوا۔
حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ ہر کتاب کے ختم پر انسان کے خاتمہ کی جانب اشارہ فرماتے ہیں کہ جس طرح یہ کتاب ختم ہوگئی دیکھو تیرا بھی خاتمہ ہونے والا ہے کل من علیہا فان۔
دونوں اقوال میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ دونوں امور کی جانب اشارہ ہو۔
الحمد للہ کتاب الایمان ختم ہوئی والحمد للہ اولاً و آخراً۔

کتابُ العِلم [۱۴]

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کی ابتداء باب بدء الوحی سے فرمائی اور اس میں وحی کی عظمت صداقت اور عصمت وحقانیت کو واضح فرمایا، کیونکہ عقائد ہوں یا احکام، عبادات ہوں یا معاملات تمام امور کا منبع و مخزن اور سارے علوم حقہ اور معارف الٰہیہ کا سرچشمہ صرف وحی ہے۔ اس کے بعد کتاب الایمان لائے کیونکہ ایمان کے بغیر کسی چیز کا اعتبار نہیں، بندہ پر خالق ومالک اللہ رب العالمین کے جو حقوق ہیں ان میں سب سے پہلے اور اصل بنیادی چیز ایمان ہے، ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال وعبادات کا کوئی وزن و قدر نہیں لہٰذا تمام اعمال کے لئے اصلی بنیاد و اساس ایمان ہے اس لئے اس کو باقی سب چیزوں سے مقدم رکھا اب جبکہ ایک شخص ایمان لاچکا تو ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اطاعت لازم کرلی اور اطاعت کے معنی ہیں مُطاع یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو کرنا اور غیر مرضیات کو چھوڑنا، اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہی کے ذریعہ حاصل ہوگا لہٰذا کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم لائے اور ایک ایسی آیت بھی یہاں درج کی جس میں ایمان کے بعد علم ہی کا ذکر ہے تو علم سے غرض یہ ہوگی کہ مرضیاتِ الٰہی معلوم ہوں لہٰذا کتاب العلم کے ماتحت اس علم کے فضائل اور اس کے حقوق وآداب اور حاصل کرنے کے طریقے بتلائے، پھر سب سے پہلے فضلِ علم کا باب رکھا تاکہ شوق ورغبت پیدا ہو ؎

علم سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں ٭ جہل سے بدتر کوئی آفت نہیں

اس سے امام بخاریؒ کی حسنِ ترتیب و دقت نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

• بسم اللہ الرحمٰن الرحیم •

• **باب** [۴۳] فضلِ العلمِ وقولِ اللہِ عزّ وجلّ "یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ" وقولہ "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً" •

علم کی فضیلت کا بیان، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ مجادلہ میں) تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم دیا گیا ہے اللہ ان کے درجے بلند کریگا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سورۂ طٰہٰ میں) پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔

تشریح آیت کریمہ سے ایمان اور علم کا ربط بھی معلوم ہوا اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ایمان وعلم کی وجہ سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

آیت مبارکہ میں الذین اٰمنوا منکم پر والذین اُوتوا العلم کا عطف عطف الخاص علی العام ہے

جواہتمام شان کا فائدہ دیتا ہے -- بدون ایمان کے علم غیر نافع ہے، کما فی التنزیل العظیم یتعلمون ما یضرھم ولا ینفعہم (بقرہ)

ایک معمولی ایماندار بے ایمان متبحر عالم سے لاکھوں درجہ افضل ہے۔

باب فضل العلم

امام بخاریؒ اکثر و بیشتر صحیح بخاری شریف کے تراجم میں بطور تبرک و استشہاد قرآن حکیم کے آیات پیش کرتے ہیں، چنانچہ اس باب کے اندر بھی دو آیتیں ذکر کیں جن سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ پہلی آیت سورۂ مجادلہ کی ہے، اس میں پہلے تو آداب مجلس کا بیان ہے: یاایہا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات واللہ بما تعملون خبیر۔ (سورۃ مجادلۃ آیۃ ۱۱)

اس آیت میں دو چیزیں بتلائیں۔ اول یہ کہ کھل کر بیٹھو یعنی جب مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آجائیں تو مسلمان ان کے لئے جگہ دینے کی کوشش کریں ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ تمہارے لئے وسعت پیدا فرمادیں گے۔

اس آیت میں دوسرا حکم آداب مجلس کے متعلق یہ ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کہا جائے کہ مجلس سے اٹھ جاؤ تو اسے اٹھ جانا چاہئے۔ اس آیت میں لفظ قیل مجہول استعمال فرمایا گیا ہے اس کا ذکر نہیں کہ یہ کہنے والا کون ہو، مگر احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنے والے شخص کو اپنے لئے جگہ کرنے کے واسطے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا جائز نہیں۔

صحیحین اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یقیم الرجلُ الرجلَ من مجلسہ فیجلس فیہ ولکن تفسحوا وتوسعوا یعنی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھے بلکہ مجلس میں کشادگی پیدا کرکے آنیوالے کو جگہ دیدیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اس کی جگہ سے اٹھ جانے کے لئے کہنا آنے والے شخص کے لئے تو جائز نہیں البتہ میر مجلس یا مجلس کا انتظام کرنے والا اٹھ جانے کے لئے کہے تو اٹھ جانا چاہئے۔

(معارف القرآن جلد ۸)

اس کی جزا کیا ہے؟ یرفع اللہ الذین اٰمنوا۔ الآیۃ اللہ تم میں سے مؤمنین اور اہل علم کے درجات بلند کریگا۔

تو امام بخاریؒ کا مقصود اثبات فضل علم ثابت ہوگیا نیز اس پر بھی متنبہ کردیا کہ ایمان کے بعد علم کا بیان کیوں لائے؟ اسلئے کہ آیت میں ایمان کے بعد علم کو بیان کیا گیا۔

واللہ بما تعملون خبیر اشارہ مقصود ہے کہ اللہ خبردار ہے کہ کون کس درجہ کا علم رکھتا ہے اور کس مرتبہ کا شخص ہے اس کے اعتبار سے ہم بھی رفع درجات کریں گے۔

قولہ ربِّ زِدنی علما اس سے فضل علم یوں ثابت ہوتا ہے کہ سید الانبیاء علیہم الصلوۃ والسلام

جنھیں علم الاولین والآخرین عطا کیا گیا ہے انہیں بھی مزید علم طلب کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علم کتنی بڑی دولت ہے ؎

بنی آدم از علم یابد کمال ✧ نہ از حشمت وجاہ ومال ومنال۔

؎ رتبہ آدم کو ملا ہے اس علم سے ✧ خاک کی تو خاک بھی عظمت نہیں

اشکال:۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اکمل واتم تھا تو طلب زیادہ کے کیا معنی ؟

جواب:۔ یہاں علم سے معارف الٰہیہ کے وہ درجات مراد ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔

سوال:۔ یہاں امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب تو قائم کیا مگر کوئی حدیث نہیں لائے ؟

جواب ۱:۔ شاید امام بخاریؒ کو اپنی شرط کے مطابق کوئی حدیث نہیں ملی اس لئے آیت کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

۲:۔ امام بخاریؒ کہیں کہیں ترجمہ قائم کرکے روایت نہیں ذکر کرتے ہیں جس سے طلباء حدیث کا امتحان اور تمرین وتشحیذ اذہان مقصود ہے کہ اس کے مناسب کوئی روایت از خود تلاش کرلیں مثلاً: مَن سلك طريقا يلتمس فيه علماً سهل الله له به طريقا إلى الجنة۔ (مسلم ج۲ ص۳۴۵)

باب ۴۴ مَن سُئِلَ عِلماً وهو مُشتَغِلٌ فِي حديثه فاتمّ الحديث ثمّ أجاب السائلَ

۵۵ حدثنا محمدُ بنُ سِنانٍ قال ثنا فُلَيحٌ ح قال وحدثني ابراهيمُ بنُ المُنذِرِ قال ثنا محمدُ بنُ فُلَيحٍ قال ثنا ابي قال حدثني هِلالُ بنُ عليٍّ عن عطاءِ بنِ يسارٍ عن ابي هريرة قال بينما النبيّ صلى الله عليه وسلم في مجلسٍ يُحدِّثُ القومَ جاءه اعرابيٌّ فقال متى الساعةُ فمضىٰ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يُحدِّثُ فقال بعضُ القومِ سمع ما قال فكرِه ماقال، وقال بعضُهم بل لم يسمعْ حتى اذا قضىٰ حديثَه قال أينَ أُراهُ السّائلُ عن الساعة قال ها انا يارسولَ الله! قال فاذا ضُيِّعَتِ الامانة فانتظِرِ السّاعةَ فقال كيف إضاعتها؟ قال إذا وُسِّدَ الامرُ الى غيرِ اهلِه فانتظِرِ السّاعةَ

باب اس شخص کے بیان میں جس سے کوئی علمی سوال کیا گیا جبکہ وہ اپنی گفتگو میں مشغول ہو تو اپنی بات پوری کرکے سائل (پوچھنے والے) کا جواب دے۔

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں لوگوں سے (کچھ) ارشاد فرمارہے تھے کہ ایک اعرابی (دیہاتی) آپؐ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ قیامت کب آئے گی ؟ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بیان جاری رکھا (یعنی سائل کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی) تو بعض لوگ (جو اس مجلس میں حاضر تھے) کہنے لگے کہ آپؐ نے اعرابی کی بات سن لی ہے مگر اس کی بات (درمیان گفتگو میں) ناگوار ہوئی اور بعض حضرات نے کہا "نہیں بلکہ آپؐ نے اس کی بات سنی ہی نہیں" یہاں تک کہ جب آپؐ نے اپنا بیان پورا فرمالیا تو فرمایا کہ قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے ؟ سائل (اعرابی) نے عرض

کیا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ، آپؐ نے فرمایا تو (سن لے) جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، اس نے کہا امانت ضائع کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جب معاملات نا اہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہئے۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ ای فی قولہ "جاءہ اعرابی فقال متی الساعۃ الخ" یعنی اعرابی نے سوال کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

تعدد الحدیث: اخرجہ البخاری ھنا ص۱۴ وایضا فی الرقاق ص۹۶۱۔
علامہ عینیؒ فرماتے ہیں ولم یخرجہ من اصحاب الستۃ غیرہ۔

ربط گذشتہ باب میں فضیلتِ علم اور استزادۂ علم کا ذکر تھا جس کو امام بخاریؒ نے آیات قرآنی کی روشنی میں بیان کیا تھا۔ اب اس باب میں تحصیلِ علم کا طریقہ بتاتے ہیں اور معلّم و متعلم کو آداب اور تعلیم و تعلّم کا سلیقہ سکھا رہے ہیں۔

رواۃ حدیث کا احتیاط قال اراہ ابن السائل، اراہ بضم الھمزۃ معناہ اظن والشک من محمد بن فلیح (عمدہ، فتح، قس) مطلب یہ ہے کہ یہ شک محمد بن فلیح کو ہوا ورنہ فلیح کے دوسرے تلمیذ سے بلا شک مروی ہے ابن السائل
یہ حضرات محدثین رح کی کمال احتیاط ہے کہ اگر استاذ کے الفاظ میں شک ہوگیا تو اس کو شک ہی کے ساتھ ذکر کیا، اسی طرح اگر استاذ نے صرف راوی کا نام لیا اور نسب کا ذکر نہیں کیا تو یہ حضرات یعنی ابن فلاں کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ تلمیذ کی طرف سے تعارف کی غرض سے اضافہ ہے۔
قال فاذا ضیعت الامانۃ الخ سائل کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کیجانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، مطلب یہ ہے کہ لوگ جن کو امانتدار، دیانتدار سمجھیں وہ خائن ثابت ہو تو قیامت کا انتظار کرو، پھر اس نے سوال کیا کہ امانت کی اِضاعت کیسے ہوگی؟ یہ سوال اس دور و ماحول کے مطابق تھا اس لئے کہ اس وقت کسی کو اس کا وہم بھی نہیں گذرتا تھا کہ امانت ضائع کردی جائے گی اور امین خائن بن جائیگا اس لئے اس نے تعجب سے دوبارہ پوچھا۔ قال اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ آپؐ نے فرمایا جب معاملات نا اہل لوگوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو۔ یعنی جو امین نہ ہونگے ان کے ذمہ کام سپرد کئے جائیں گے، نا اہل لوگ عہدہ دار بن جائیں گے۔
حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں "چنانچہ آج کل یہی ہو رہا ہے کہ کوئی اہل کو نہیں دیکھتا بلکہ اغراض و سفارشات پر دار و مدار رہ گیا ہے۔ (درس بخاری ج ۱ ص۳۱۴)۔ اور ظاہر ہے کہ جب مستحق و غیر مستحق، اہل و نا اہل کا امتیاز نہ رہے گا صرف کنبہ پروری مقصود بن جائیگا تو نتیجۃً بدنظمی کا دور دورہ ہوگا اور یہ قیامت کی ایک عظیم علامت ہوگی، سنن ترمذی میں روایت ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کانت امراؤکم

خیارکم واغنیائکم سمحائکم وامورکم شوریٰ بینکم فظهر الارض خیر لکم من بطنها و اذا کانت امرائکم شرارکم واغنیائکم بخلائکم وامورکم الیٰ نسائکم فبطن الارض خیر لکم من ظهرها۔ (ترمذی ج ۲ ص۵۱ ابواب الفتن)

مسائل مستنبطہ

۱: متعلم (سائل) کو چاہئے کہ اگر معلّم (عالم) کسی کے ساتھ گفتگو میں یا مطالعہ میں مشغول ہے تو درمیان میں دخل انداز نہ ہو بلکہ بیٹھ کر انتظار کرے جب عالم فارغ ہوجائے تب سوال کرے۔

۲: ہر سوال کا جواب فوراً دینا ضروری نہیں ہے، اگر معلّم اشتغال کی وجہ سے فوراً جواب نہ دے تو یہ کبر کی علامت نہیں ہے اور نہ کتمانِ علم ہے، ہاں اگر مصلحت فوراً جواب دینے کی مقتضی ہو تو فوراً جواب دینا چاہئے، معلّم موقعہ اور مصلحت کے اعتبار سے جیسا مناسب سمجھے وہ کرے، اگر عالم جانتا ہو کہ سائل میں سمجھنے کی صلاحیت نہیں تو یہ بھی جائز ہے کہ بالکل ہی جواب نہ دے مگر ایسے موقع پر حکمت کے ساتھ عذر کردینا چاہئے تاکہ تکبر پر محمول نہ کرے۔

۳: لیکن اگر متعلم یا سائل بیجا مداخلت کر بیٹھے تو معلم کو چاہئے کہ نرمی کا برتاؤ کرے خواہ مخواہ زجر و توبیخ اور تشدد کا برتاؤ نہ کرے جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو کے دوران بیجا مداخلت پر زجر و توبیخ سے کام نہیں لیا اسی طرح معلم کو بھی چاہئے کہ اس وقت خاموشی اختیار کرے اور بعد میں موقع پانے پر جواب دے۔

چنانچہ حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کے خادم نے ایک دفعہ سوال کیا کہ لوگ بزرگوں کی قبر کے پاس دفن ہونا کیوں پسند کرتے ہیں؟ اس پر مولانا خاموش رہے، ایک روز خادم پنکھا جھل رہا تھا، فرمایا کہ پنکھا کس کے لئے جھل رہے ہو؟ عرض کیا آپ کے لئے، فرمایا کہ اس کی ہوا قریب بیٹھنے والوں کو بھی پہونچتی ہے یا نہیں؟ عرض کیا پہونچتی ہے، فرمایا یہی آپ کے سوال کا جواب ہے کہ رحمت کی ہوائیں جو قبور اولیاء پر چلتی ہیں ان سے آس پاس کے لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔

بابٌ[۴۵] مَن رَفعَ صوتَهٗ بالعِلمِ ص۱۴

اس شخص کا بیان جو علمی باتیں بلند آواز سے بیان کرے۔

۵۸ ● حدثنا ابو النعمانِ قال حدثنا ابو عَوانَةَ عن اَبی بِشرٍ عن یوسُفَ بنِ ماهَكَ عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عمرٍو قال تخلّفَ عنّا النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی سفرةٍ سافرناها فادرَكَنا وقد ارهقَتنا الصلوٰةُ ونحنُ نتوضّأُ فجعلنا نَمسَحُ علی اَرجُلِنا فنادیٰ باعلیٰ صوتهٖ وَیلٌ للاَعقابِ مِنَ النارِ مَرّتینِ او ثلثاً ●

ترجمہ

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے جو ہم نے (مکہ سے مدینہ کی طرف) کیا تھا، پھر آپؐ نے (آگے بڑھ کر) ہم کو پالیا اور اس وقت نمازِ (عصر) کا وقت تنگ ہونے کی وجہ سے (ہم عجلت کے ساتھ) وضو کر رہے تھے تو ہم (جلدی میں خوب

دھونے کے بجائے، ہاتھ سے پانی پاؤں پر پھیرنے لگے، آپؐ نے (یہ حال دیکھ کر) بلند آواز سے فرمایا: ایڑیوں کے لئے دوزخ (کے عذاب) سے خرابی ہے، دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا۔

مطلب یہ ہے کہ نماز کا وقت تنگ ہونے کی وجہ سے عجلت میں صحابہؓ پاؤں کو اچھی طرح سے دھونے کی بجائے ہاتھ میں پانی لے کر پاؤں پر پھیرنے لگے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا فاصلہ پر تھے اس لئے آپؐ نے پکار کر فرمایا: ایڑیاں اگر خشک رہ جائیں گی تو وضو پوری نہ ہوگی جو عذاب کا باعث ہوگا۔

معلوم ہوا کہ نمسح علی ارجلنا میں مسح سے مراد غسل خفیف ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ویل للاعقاب من النار اس پر دلیل ہے کیونکہ اگر مسح سے عرفی مسح مراد لیا جائے تو مسح میں استیعاب کا کوئی بھی قائل نہیں پس اعقاب کے خشک رہنے پر وعید کیوں وارد ہوئی؟

ویل اور ویح دونوں ہم معنی ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اگر مستحق ہلاکت ہے تو لفظ ویل بولتے ہیں جیسے یہاں، اور اگر مستحق ہلاکت نہیں تو ویح کا استعمال ہوتا ہے، جیساکہ وَیحٌ للعمّار تقتله الفئة الباغیة افسوس ہے عمارؓ پر کہ اس کو ایک باغی گروہ قتل کریگا، ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ ویل دوزخ میں ایک وادی ہے۔

● **بابٌ** قولِ المحدِّثِ حدّثنا و اخبرنا وانبانا وقال الحُمیدیُّ کان عندَ ابنِ عُیینةَ حدثنا وَاخبرنا وانبانا وسمعتُ واحداً وقال ابنُ مسعودٍ حدثنا رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وهو الصّادق المَصدوقُ وقال شقیقٌ عن عبدِاللّٰہ سمعتُ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کلمةً کذا وقال حُذیفةُ حدثنا رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم حدیثین وقال ابو العالیةِ عن ابنِ عباسٍ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فیما یَروِی عن ربه وقال انسٌ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یَروِیه عن ربِّه وقال ابو هریرةَ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یَروِیهِ عن ربّکم تبارکَ وتعالیٰ ●

محدّث کے قول حدثنا (ہم سے بیان کیا) یا اخبرنا (ہمیں خبر دی) اور انبأنا (ہم کو بتلایا) کا بیان۔ اور شیخ حُمیدی نے ہم سے بیان کیا کہ ابن عُیینہ (یعنی حمیدی کے شیخ سفیان بن عیینہ) کے نزدیک حدثنا اور اخبرنا اور انبانا اور سمعتُ ایک ہیں (یعنی کوئی فرق نہیں راوی کو اختیار ہے جیسے چاہے روایت کرے) اور حضرت بن مسعودؓ نے کہا حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو الصادق المصدوق (یعنی ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اور آپؐ سچے تھے اور جو آپؐ سے کہا گیا وہ بھی سچ تھا)۔

اور شقیق (یعنی ابو وائل کوفیؒ) نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی۔ اور حضرت حذیفہ رضؓ نے کہا ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

دو حدیثیں بیان کیں۔ اور ابو العالیہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ربہ۔ اور حضرت انسؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی اور آپؐ اپنے پروردگار سے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہا ہوں جو آپؐ نے تمہارے رب عزوجل سے روایت فرمائی ہے۔

ربط گذشتہ باب میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ عالم کو علمی باتیں بلند آواز سے بیان کرنا چاہئے کہ سارے حاضرین سُن سمجھ لیں تاکہ یہ حاضرین پھر دوسروں کو تعلیم دے سکیں۔ اب اس باب سے ان الفاظ کو بتانا چاہتے ہیں جن الفاظ سے یہ حاضرین دوسروں تک پہونچائیں گے۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ اس باب کو منعقد کر کے اشارہ کر رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب کی بنیاد ان مسندات پر رکھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور متنبہ فرما رہے ہیں کہ اس میدان میں ہر شخص کو من مانی بات کہنے کی آزادی نہیں دی جاسکتی، کسی بات کے قابل اعتماد و اعتبار کے لئے اسناد (سلسلۂ سند) ضروری ہے، امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء۔

ع۲: حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ اس باب سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ مذکورہ بالا الفاظ میں کوئی فرق نہیں، متقدمین اور ائمۂ اربعہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کے نزدیک تحدیث، اخبار و انباء کے الفاظ میں راوی کو اختیار ہے جیسے چاہے روایت کرے۔

متأخرین اور امام مسلم رحمہم اللہ کے نزدیک ان میں فرق ہے۔

تحمل حدیث استاذ سے احادیث حاصل کرنے کو اصطلاحاً تحمل کہتے ہیں۔
تحمل حدیث کے مختلف طریقے ہیں:۔

(۱) قرأۃ الشیخ یعنی استاذ خود حدیث پڑھے اور شاگرد سنتے رہیں۔

(۲) قرأۃ علی الشیخ یعنی شاگرد حدیث پڑھے اور استاذ سُنے۔

اب ان دونوں صورتوں میں روایت کرتے وقت کیا کہیں؟ کونسا لفظ اختیار کریں؟

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ ہر دو صورت میں حدثنا، اخبرنا، انبانا سب کہہ سکتے ہیں اس میں کوئی فرق نہیں، یہی قدماء محدثین سے حتی کہ ائمۂ اربعہ سے بھی منقول ہے کہ سب برابر ہیں۔

امام مسلمؒ ان دونوں (حدثنا و اخبرنا) میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلی صورت یعنی شیخ کے پڑھنے پر حدثنا کہیں گے اور دوسری صورت یعنی شاگرد کے قرأت حدیث کی تو اخبرنا کہیں گے۔ پھر اس میں بھی بعض نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر سننے والا شاگرد ایک ہی تھا تو حدثنی بصیغۂ واحد اور اگر متعدد تھے تو حدثنا بصیغۂ جمع کہیگا۔ اور بعض نے اس میں وسعت دی ہے کہ بہر صورت حدثنا

بصیغۂ جمع کہہ سکتا ہے لجوازہ فی کلام العرب اور حدثنی بصیغۂ واحد بھی کہہ سکتا ہے لان المحدث حدثہ وغیرہ۔

وعلیٰ ہٰذا القیاس قرأۃ علی الشیخ کی صورت میں بھی بعضوں نے تفصیل کی ہے کہ جو شاگرد نے خود پڑھا وہ تو اخبرنی بصیغۂ واحد کہیگا اور دوسرے حضرات سامعین اخبرنا بصیغہ جمع کہیں گے۔ اور بعض حضرات نے اس میں بھی وسعت دی ہے کہ ہر شخص اخبرنی اور اخبرنا کہہ سکتا ہے۔

(۳) **الاجازۃ**:۔ تیسری صورت اجازت بالمشافہہ کی ہے اور اس کو انباء کہتے ہیں، یعنی نہ شاگرد پڑھے اور نہ ہی شیخ، کسی نے نہیں پڑھا بلکہ شیخ نے مشافہۃً اجازت دیدی اس صورت میں راوی یعنی جس کو شیخ نے اجازت دی ہے وہ انبأنی یا انبأنا کہیگا۔

(۴) چوتھی صورت مناولہ ہے اس کے لئے مستقل باب آرہا ہے۔ (۵) **مکاتبۃ یا مراسلۃ** ہے اس کا ذکر بھی مناولہ میں آرہا ہے۔ (۶) ایک صورت **وِجادۃ** (بکسر الواو) کی ہے یعنی مذکورہ کوئی صورت بھی متحقق نہیں ہوئی بلکہ کہیں سے کسی محدث کی کتاب ہمارے ہاتھ میں آگئی اب ہم اس کتاب سے حدیث بیان کرتے ہیں اور اس محدث کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر یہ لفظ مولّد ہے لم یسمع من العرب (یعنی عرب سے منقول نہیں) اس صورت میں وجدتُ فی کتاب فلان کہنا چاہئے۔

محدثین کرام کے یہاں نقل روایت کے یہ مختلف طرق ہیں، تحدیث و اخبار کے لئے قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے یومئذٍ تحدث اخبارھا (الزلزال آیت ۴) اور انباء کے لئے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے لا ینبّئك مثل خبیر (فاطر)۔

پھر محدثین کرام میں اختلاف ہے کہ اخبار اور تحدیث میں کون افضل ہے؟ یعنی قرأۃ علی الشیخ افضل ہے یا قرأۃ الشیخ؟ اس کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے دو قول ہیں ایک یہ کہ دونوں متساوی ہیں، دوسرا یہ کہ قرأۃ علی الشیخ یعنی اخبار افضل ہے کیونکہ جب شاگرد خود سنائیگا تو خوب احتیاط کریگا اور اگر شیخ پڑھیگا تو اس قدر اعتناء نہ کریگا۔

بہتر فیصلہ وہ ہے جو حافظ عسقلانیؒ نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ احوال مختلف ہیں، کہیں تحدیث اقویٰ ہوگی کہیں اخبار جہاں پر جو مامون عن الغلط ہو وہاں وہی اقویٰ ہوگا لہٰذا فیصلہ یکطرفہ نہیں ہونا چاہئے، امام بخاریؒ دونوں کو ایک کہتے ہیں۔

۵۹ ● حدثنا قتیبۃُ بنُ سعیدٍ قال حدثنا اسمٰعیلُ بنُ جعفرٍ عن عبدِ اللّٰہ بنِ دینارٍ عن ابنِ عمرَ قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انّ من الشجرِ شجرۃً لا یسقطُ ورقُھا وانّھا مثلُ المسلمِ نحدّثونی ماھیَ فوقعَ الناسُ فی شجرِ البوادی قال عبدُ اللّٰہ ووقعَ فی نفسی انّھا النخلۃُ فاستحییتُ ثمّ قالوا

حَدِّثنا ماھِی یارسولَ اللّٰہ قال ھِیَ النخلۃُ ●

ترجمہ حضرت (عبداللہ) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "درختوں میں سے ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے (خزاں میں بھی) نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی طرح ہے تو مجھے بتلاؤ کہ وہ کونسا درخت ہے؟ یہ سُنکر لوگ جنگلی درختوں (کے دھیان) میں پڑ گئے۔ عبداللہ (ابن عمرؓ) کا بیان ہے کہ میرے جی میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے لیکن مجھے (عرض کرتے ہوئے) شرم آئی (کہ بڑوں کے سامنے لب کشائی کروں) پھر صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ ہی بتلا دیجئے کہ وہ کونسا درخت ہے؟ آپؐ نے فرمایا" وہ کھجور کا درخت ہے"

مطابقۃ للترجمۃ حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فحدثونی ماھی اور آخر میں صحابہ کرامؓ نے عرض کیا حدِّثنا ماھی امام بخاریؒ ان دونوں کے مجموعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ خواہ استاذ پڑھے یا شاگرد دونوں پر تحدیث کا اطلاق ہوتا ہے۔ (عمدہ)

حافظ عسقلانیؒ نے صرف حدثونی ترجمۃ الباب ثابت کیا ہے کہ امام بخاریؒ کی نظر اس حدیث کے مختلف طرق کے سارے الفاظ پر ہیں یہاں حضورؐ کا ارشاد حدثونی ماھی ہے اور کتاب التفسیر ج ۲ ص۶۸۱ اور کتاب الادب ص۹۰۷ میں حضرت نافع کے طریق سے اخبرونی ماھی ہے اور اسماعیلی کے طریق میں انبئونی؛ نیز صحابہ کرامؓ کی طرف سے بھی بعض روایت میں بجائے حدِثنا ماھی کے اخبرنا آیا ہے۔ بخاری اول ص۲۴ پس معلوم ہوا کہ یہ تینوں الفاظ برابر ہیں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوسکتے ہیں۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری فی کتاب العلم فی اربعۃ مواضع ھنا ص۱۴ ویاتی بعدہ ص۱۴ و ص۱۶ و ص۲۴ ایضا فی البیوع ص۲۹۴ وفی التفسیر ص۶۸۱ وفی الاطعمۃ ص۸۱۹ وایضا ص۸۱۸ وفی کتاب الادب ص۹۰۴ ایضا ص۹۰۷ فتلک عشرۃ کاملۃ۔

مومن کی دعا رد نہیں ہوتی لایسقط ورقھا اس میں اشارہ ہے کہ مومن کی دعا رد نہیں ہوتی قبول کے طرق مختلف ہیں کبھی بعینہٖ مطلوب چیز مل جاتی ہے اور اگر وہ علم باری تعالیٰ میں سائل کے لئے مضر ہوتی ہے تو اس کی بجائے کوئی دوسری نافع چیز عطا کی جاتی ہے بالغرض اگر دنیا میں کچھ بھی نہیں ملا تو اجر آخرت تو ضرور ملیگا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اور نخلہ میں وجہ شبہ یہی ہے۔ حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

وجہ الشبہ بین النخلۃ والمسلم من جھۃ عدم سقوط الورق مارواہ الحارث بن اسامۃ فی ھذا الحدیث من وجہ اٰخر عن ابن عمرؓ ولفظہ قال: کنا عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ذات یومٍ فقال اِن مَثل المؤمن کمثل شجرۃ لا تسقط لھا انملۃ اَتدرون ماھِیَ قالوا لا قال ھی النخلۃ لا تسقط لھا انملۃ ولاتسقط لمؤمن دعوۃ (فتح ج۱ ص۱۱۹)

وجہ شبہ بین المسلم والنخلة

وانها مثل المسلم وجہ شبہ میں مختلف اقوال ہیں:۔
(۱) بعض نے کہا کہ جیسے انسان سر کاٹنے سے زندہ نہیں رہتا اسی طرح نخلہ سر کاٹنے سے ختم ہو جاتی ہے۔
(۲) بعض نے کہا کہ نخلہ انسان کی طرح مذکر و مؤنث ہوتی ہے، بدون تلقیح (تابیر) پھل نہیں دیتی۔
(۳) بعض نے کہا نخلہ انسان کی عمة (پھوپھی) ہے کیونکہ بعض روایت میں ہے کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے بچی ہوئی مٹی سے نخلہ پیدا کی گئی۔
مذکورہ بالا وجوہ اس لئے صحیح نہیں کہ پہلی دونوں حیوانات اور تیسری غیر مسلم کو بھی شامل ہے، ان میں مسلم کی کوئی خصوصیت نہیں، وجہ ثالث سب سے زیادہ اوہن (ضعیف) ہے کیونکہ یہ حدیث ثابت نہیں صرف مندرجہ ذیل دو وجہیں صحیح ہیں:۔
(۴) جیسے کھجور کا کوئی جز بیکار نہیں جاتا جڑ، پتے، ٹہنیاں، تنہ، مغز، پھل اور گٹھلی ہر چیز کار آمد و نافع ہے ایسے ہی مسلم کامل کا ہر فعل نافع ہوتا ہے ویدل علیہ ماروا۵ المصنف رحمہ اللہ تعالیٰ فی الاطعمة: عن ابن عمرؓ قال بينا نحن عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ اتی بجمار فقال ان من الشجر لما بركته كبركة المسلم الخ
(۵) ماصر من قوله صلی اللہ علیہ وسلم لا تسقط لها انملة ولا تسقط لمؤمن دعوة (ارشاد الساری)
اشکال:۔ ممکن ہے کہ یہ صفات کسی دوسرے درخت میں بھی پائی جاتی ہوں۔
جواب:۔ اولاً تو کسی دوسرے درخت میں ان سب صفات کا وجود ثابت نہیں، ثانیاً یہ کہ عرب میں ان صفات کا حامل صرف یہی درخت بکثرت ہوتا تھا اس لئے اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔
قال عبد الله فوقع فی نفسی انها النخلة فاستحييت بعض روایات میں ہے کہ میں اصغر القوم تھا اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما جیسے حضرات تشریف فرما تھے اس لئے بتانے سے حیاء مانع ہوئی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم بتا دیتے تو میرے لئے حمر نعم سے بھی بہتر ہوتا، حضرت عمرؓ کے اس قول کی وجہ یہ تھی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مواقع پر ایسے شخص کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ (ارشاد الساری)
حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کے ذہن میں جو نخلہ آیا اس کے لئے قرینہ بھی تھا وہ یہ کہ اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمار تھا جیسا کہ بعض طرق میں آیا ہے اور بعض روایت میں آیا ہے کہ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:

الم تر كيف ضرب الله مثلا كلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء (ابراهيم)	کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں۔

اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ شجرۂ طیبہ سے مراد نخلہ ہے، اس آیت کو تلاوت فرمانے سے یہاں ایک اور وجہ شبہ بھی معلوم ہوئی کہ جس طرح نخلہ کی جڑ تو زمین میں ثابت ہے اور فرع اس کی آسمان کی طرف ہے اسی طرح مؤمن کا ایمان تو اس کے قلب میں مضبوط ہے یعنی تصدیق جو ایمان کی جڑ ہے اور اعمال جو بمنزلۂ شاخ کے ہیں وہ سماءِ قبولیت تک پہونچتے ہیں۔

• بابٌ طَرْحِ الامامِ المسئلةَ علی أصحابہ لیختبر ما عندھم من العلم •

استاذ کا اپنے شاگردوں کے سامنے سوال پیش کرنا تاکہ ان کے علم کا امتحان لے سکے۔

۶۰ • حدثنا خالدُ بنُ مَخلدٍ قال ثنا سلیمانُ بنُ بلالٍ قال ثنا عبدُ اللهِ بنُ دینارٍ عن ابنِ عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال إنّ مِن الشجرِ شجرةً لا یسقطُ ورقُہا وإنہا مَثَلُ المسلمِ حدِّثونی ماھِیَ قال فوقع الناسُ فی شجرِ البوادی قال عبدُ اللهِ فوقع فی نفسی أنہا النخلةُ فاستحییتُ ثمّ قالوا حدِّثنا ماھی یارسولَ اللهِ قال ھی النخلةُ •

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک بار) ارشاد فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ بے شک مسلمان کی طرح ہے مجھے بتلاؤ کہ وہ کونسا درخت ہے۔ عبداللہؓ کہتے ہیں کہ لوگ جنگلی درختوں (کے خیال) میں پڑ گئے اور میرے ذہن میں یہ آیا کہ وہ کھجور (کا درخت) ہے مگر مجھے (عرض کرتے ہوئے) شرم آئی، پھر صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہؐ آپ (ہی) بتلا دیجئے کہ وہ کون سا درخت ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ کھجور ہے۔

ربطِ ماقبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: "والمناسبة بین البابین ظاھرة فان الحدیث فیھما واحد عن صحابی واحد"، مطلب یہ ہے کہ گذشتہ باب جو شجرہ والی حدیث تھی وہی حدیث اس باب میں بھی ہے اور صحابی بھی ایک ہی ہیں۔ ترجمہ مختلف ہونے کی وجہ سے حدیث کا اعادہ فرمایا ہے، نیز مزید ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس سے مشائخ بخاری کے تعدد اور وسعتِ روایت پر تنبیہ ہوگئی، یہاں تک کہ امام بخاریؒ بسا اوقات ایک ہی حدیث کو اپنے بہت سے شیوخ سے نقل کرتے ہیں۔ (عمدة)

مقصدِ ترجمہ اس ترجمہ سے امام بخاریؒ کا مقصد کیا ہے؟ علماء کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) گذشتہ باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ دین کی کوئی بات بیان کرنے میں سند کا لحاظ ضروری ہے، اب اس باب میں یہ بتارہے ہیں کہ جس طرح دین کی باتیں بیان کرنے کے وقت پورے تیقظ و بیداری کو کام میں لانا چاہئے اسی طرح طلبہ کو بھی متیقظ و بیدار رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ طلباء درس کے وقت غفلت سے کام نہ لیں جس کی ایک بہترین صورت یہ ہے کہ طلبہ سے وقتاً فوقتاً سوالات کئے جائیں تاکہ طلبہ ہر وقت بیدار اور متوجہ رہیں۔

(۲) اس طرف بھی اشارہ ممکن ہے کہ طلبہ کا پہلے داخلہ امتحان لیکر علمی معیار جانچ کر داخل کیا جائے جیسا کہ معیاری

مدارس میں اس پر عمل ہے اگرچہ آجکل کچھ کوتاہی شروع ہو گئی ہے بلاشبہ اس سے بچنا ضروری ہے۔

(۳) ابو داؤد شریف میں حضرت معاویہؓ کے طریق سے ایک روایت منقول ہے نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الاغلوطات (ابوداؤد کتاب العلم) جس سے ممانعت امتحان کی طرف وہم جا سکتا ہے۔

امام بخاریؒ نے یہ ترجمہ قائم کر کے اس وہم کو دور کیا اور حدیث لاکر یہ ثابت کر دیا کہ تشحیذ ذہن اور تیقظ کے لئے امتحان جائز ہے اس سے علمی ترقی ہوتی ہے۔

اب رہا حدیث معاویہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر امتحان سے مقصد اپنی تعلّی اور بڑائی کا اظہار ہو اور مسئلہ کو توڑ مروڑ کر اغلوطہ پیش کرے جس سے عالم یا مفتی کی توہین و تذلیل کا قصد ہو بلاشبہ حدیث معاویہ سے ناجائز ہے ورنہ ذکاوتِ علمی کے لئے اغلوطہ یعنی چیستان پوچھنا جائز ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے واضح ہے فی قولہ قال ان من الشجر شجرۃ... الیٰ قولہ... حدثونی ماھی ؟۔

باقی تشریح کے لئے گذشتہ باب کی حدیث دیکھئے۔

● **بابُ** القراءۃِ والعَرضِ علی المُحدّثِ ورأی الحسنُ والثوریُّ ومالکٌ القراءۃَ جائزۃً واحتجّ بعضُہم فی القراءۃِ علی العالِمِ بحدیثِ ضِمامِ بنِ ثعلبۃَ أنّہ قال للنبیِ صلی اللہ علیہ وسلم آللہُ امرکَ أن نصلیَ الصلوٰۃَ قال نعم قال فھٰذہ قراءۃٌ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم أخبرَ ضمامٌ قومَہ بذالک فاجازوہ واحتجّ مالکٌ بالصَّکِّ یُقرَءُ علی القومِ فیقولونَ أشھدَنا فلانٌ ویُقرَءُ علی المُقرِئِ فیقولُ القاریُ أقرأَنی فلانٌ۔

حدثنا محمدُ بنُ سلامٍ قال ثنا محمدُ بنُ الحسنِ الواسِطیُّ عن عوفٍ عن الحَسَنِ قال لا باسَ بالقراءۃِ علی العالِمِ وحدثنا عُبیدُ اللہِ بنُ موسیٰ عن سفیانَ قال اِذا قَرَأَ علی المُحدِّثِ فلا بأسَ أن یقولَ حَدثنی قال وسمعتُ اباعاصِمٍ یقولُ عن مالکٍ وسفیانَ القِراءۃُ علی العالِمِ وقِراءتُہٗ سَواءٌ ●

محدث (استاذ حدیث) کے سامنے حدیث پڑھنے اور محدث کے سامنے پیش کرنے کا بیان۔

حسن بصری، سفیان ثوری اور امام مالک رحمہم اللہ نے قرأت (یعنی قراءۃ التلمیذ علی الشیخ) کو جائز سمجھا ہے اور بعض محدثین نے استاذ کے سامنے قراءت کرنے پر ضمام بن ثعلبہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کیا اللہ تعالیٰ نے آپکو یہ حکم دیا ہے کہ ہم لوگ نماز پڑھا کریں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، تو یہ (گویا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا ہی ہوا، ضمام نے (پھر جاکر) اپنی قوم سے اس کو بیان کیا تو انہوں نے اس کو جائز رکھا، اور امام مالکؒ نے دستاویز (یا قبالہ) سے استدلال کیا جو پڑھکر

لوگوں کو سنائی جاتی ہے، چنانچہ وہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں شخص نے گواہ بنایا اور مُقری کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو قاری کہتا ہے کہ: مجھے فلاں شخص نے پڑھایا۔

فائدہ مُقری بصیغہ اسم فاعل کے معنی استاذ قراءت ہیں اور قاری کے معنی پڑھنے والا یعنی شاگرد، اب مطلب یہ ہوا کہ قاری (پڑھنے والا شاگرد) استاذ کے سامنے پڑھ کر سناتا ہے پھر کہتا ہے کہ مجھ کو فلاں نے پڑھایا ہے۔

محمد بن سلام (بیکندی) نے بیان کیا کہ محمد بن الحسن واسطی نے حضرت امام حسن بصریؒ سے بواسطہ عوف نقل کیا کہ عالم (استاذ) کے سامنے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اور امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے سفیان ثوری سے نقل کیا کہ جب کوئی شخص محدث کے سامنے حدیث پڑھے (یعنی شاگرد حدیث پڑھ کر محدث کو سنائے) تو حدثنی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (امام بخاریؒ کہتے ہیں) اور میں نے ابو عاصم سے سنا وہ امام مالک اور سفیان ثوری سے نقل کرتے تھے کہ عالم کو پڑھ کر سنانا اور عالم کا (خود) پڑھنا (شاگردوں کے سامنے دونوں) برابر ہیں۔

ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ گزشتہ باب میں قراءت شیخ کا بیان تھا، اب اس باب میں قراءت علی الشیخ کا ذکر ہے، اور یہ دونوں طریقے جمہور کے نزدیک معتبر ہیں مناسبت ظاہر ہے۔

۲ باب سابق میں طالب علم کے امتحان واختبار کا ذکر تھا اب اس باب میں طالب علم کی قراءت علی الشیخ کا بیان ہے، گویا امتحان داخلہ کے بعد پڑھنے کی اجازت ہے پس مناسبت ظاہر ہے۔

مقصد ترجمہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: اراد به الرد على طائفة لا يعتدون الا بما يسمع من الفاظ المشائخ الخ (عمدہ ج۲ ص۱۶)

خلاصہ یہ ہے کہ "امام بخاریؒ" کا مقصد اس باب سے ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قراءت علی الشیخ (یعنی شاگرد پڑھے اور استاذ سنے) معتبر نہیں یعنی اگر کسی نے شیخ کے سامنے حدیث کی قراءت کی تو اسے حدثنا یا اخبرنا کہنا جائز نہیں نہ اس کا قول حجت ہو سکتا ہے جب تک کہ شیخ کے الفاظ نہ سنے، مطلب یہ ہے کہ صرف قراءت الشیخ معتبر ہے۔ امام بخاریؒ ان کی تردید میں دلائل پیش کر رہے ہیں۔

باب القراءة والعرض اى هذا باب فى بيان حكم القراءة والعرض على المحدث يتعلق بالقراءة والعرض كليهما فهو من باب تنازع العاملين على معمول واحد۔ (عمدہ ج۲ ص۱۶)

یہاں دو مسئلے ہیں ۱ قراءت علی المحدث، یعنی محدث (استاذ) کے سامنے شاگرد قراءت کرے جیسا کہ آج کل مرکزی مدارس میں یہی طریقہ رائج ہے۔

۲ دوسرا مسئلہ عرض علی المحدث ہے، یعنی استاذ شاگرد کو اپنی کتاب دیدے اور شاگرد نقل کر کے استاذ سے مقابلہ کرے، یا شاگرد کے پاس استاذ کی لکھی ہوئی حدیثوں کا مجموعہ پہلے سے موجود ہو اب شاگرد نقل کر کے استاذ کے سامنے اس مجموعہ کو سنا کر اجازت حاصل کرے یہ عرض علی المحدث ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرأت علی المحدث تو یہی ہے کہ شاگرد پڑھے اور استاذ سنے، لیکن پڑھنے والے کے جو ساتھی ہیں وہ اگرچہ پڑھتے نہیں ہیں مگر سنتے ہیں تو ان ساتھیوں کا یہ فعل عرض علی المحدث ہے۔ واللہ اعلم

واحتج بعضھم بعض سے مراد کون ہیں؟ بین السطور میں لکھا ہے کہ یہ امام بخاری کے شیخ حُمیدی ہیں حافظ نے فتح الباری میں اس مقام پر لکھا ہے کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا تھا کہ حمیدی مراد ہیں مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ ابو سعید حداد مراد ہیں، پھر بیہقی کی کتاب معرفۃ السنن والآثار سے یہ نقل پیش کی کہ خود امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ ابو سعید حداد مراد ہیں۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۲۱)

باقی عبارت ترجمہ سے ظاہر ہے۔ واحتج مالك بالصك صک بفتح الصاد معرب ہے چک کا، آجکل اس کو دستاویز و قبالہ کہتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دَین (قرض) کا معاملہ ہو یا بیع و شراء کا دستاویز لکھنے والا، قبالہ نویس معاملہ کی کتابت کرکے متعاقدین اور گواہوں کی موجودگی میں پڑھ کر سنا دیتا ہے متعاقدین اس کو تسلیم کرتے ہیں، گواہوں کے دستخط ہو جاتے ہیں متعاقدین خود اس کی قرأت نہیں کرتے لیکن بوقت ضرورت قاضی کی عدالت میں گواہی دیتے ہیں اور عدالت ان کی گواہی کو معتبر قرار دیتی ہے اور یہ مسلّم ہے کہ شہادت کا معاملہ بمقابلہ اخبار کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور نقل روایت از قبیلۂ اخبار ہے، پس جبکہ عدالتی فیصلوں میں اس قسم کا اقرار صحیح اور معتبر ہے تو باب روایت میں بدرجۂ اولیٰ معتبر ہونا چاہیے۔

ويقرئ على المقرئ الخ مُقری بضم المیم قرآن پڑھانے والا یعنی استاذ۔

امام مالکؒ کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ قاری یعنی شاگرد مُقری یعنی استاذ کو پڑھ کر سناتا ہے استاذ نہیں پڑھتا صرف سُن کر تصدیق کر دیتا ہے لیکن شاگرد یہ کہتا ہے کہ فلاں نے مجھے قرآن پڑھایا تھا حالانکہ اس نے خود پڑھ کر استاذ کو سنایا تھا بعینہٖ یہی صورت قرأت علی الشیخ فی الحدیث کی ہے، امام مالکؒ سے اگر کوئی کہتا کہ آپ خود حدیث سنائیں تو خفا ہوتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی قرآن پڑھ کر سنائے تو تم تصدیق کرتے ہو تو حدیث میں تصدیق کیوں نہیں کرتے۔ (فتح، عمدہ)

البتہ کبھی کبھی خود بھی سنا دیتے تھے چنانچہ امام محمدؒ کو پانچ سو احادیث سنائیں اور یہ انکی خصوصیات میں سے ہے اور کسی کے لئے امام مالکؒ نے گوارہ نہیں کیا۔ (درس بخاری ص ۳۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے نزدیک قرأت علی الشیخ اور قرأت الشیخ جواز و صحت میں دونوں برابر ہیں ورنہ امام مالکؒ کے یہاں قرأت علی الشیخ افضل ہے یہی مسلک حضرت امام اعظمؒ کا ہے۔

۶۱ ● حدثنا عبدُ الله بنُ يوسفَ قال حدثنا الليثُ عن سعيدٍ هو المَقبُرِيُّ عن شريكِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ ابي نمرٍ انّه سمع انسَ بنَ مالكٍ يقولُ بينما نحن جُلوسٌ مع النبي صلى الله عليه وسلم في المسجدِ دخلَ رجلٌ على جَمَلٍ فاناخهُ في المسجد

ثمّ عقلہ ثمّ قال لهم أیکم محمدٌ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم مُتکیٌٔ بین ظہرانیهم فقلنا هٰذا الرجلُ الابیضُ المُتّکیُٔ فقال لہ الرجلُ یا ابنَ عبدِ المطلب فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد اَجَبْتُکَ فقال الرّجلُ اِنّی سائلُک فمُشدّدٌ علیك فی المسئلۃ فلا تجِدْ علیّ نفسِکَ فقال سَل عمّا بدالك فقال: اَسْئَلُكَ بربِّكَ وربِّ مَن قبلَكَ آللہ اَرسلك اِلی النّاسِ کلِّهم فقال اَللّٰهمّ نعم فقال اَنشدُك باللہ آللہ اَمَرَك اَن تصلّیَ الصّلواتِ الخمسَ فی الیومِ واللیلۃِ قال اَللّٰهمّ نعم قال اَنشدُك باللہ آللہ اَمَرَك اَن تصومَ هٰذا الشهرَ مِن السَّنَۃِ قال اَللّٰهمّ نعم قال اَنشدُك باللہ آللہ اَمَرَك اَن تاخذ هٰذہ الصّدقۃ مِن اَغنیائِنا فَتَقْسِمَها علیٰ فُقرائِنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَللّٰهمّ نعم فقال الرجل آمنتُ بماجئتَ بہ وَاَنا رسولُ مَن وَرائی مِن قومی وَاَنا ضِمامُ بن ثعلبۃَ اخو بنی سعدِ بنِ بکرٍ رواہ موسیٰ وعلیُّ بنُ عبدِ الحمیدِ عن سُلیمانَ عن ثابتٍ عن انسٍ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بهٰذا ● ص۱۵

ترجمہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور اونٹ کو مسجد کے دروازے پر بیٹھا کر باندھ دیا، اس کے بعد (حاضرین سے) پوچھنے لگا تم میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان ٹیک لگائے جلوہ افروز تھے، ہم نے کہا یہ صاحب سفید رنگ کے (یعنی گورے) شخص جو ٹیک لگائے ہوئے ہیں۔ تب وہ آپؐ سے کہنے لگا اے ابن عبد المطلب! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ہاں کہو) میں تیری بات سُن رہا ہوں، اس پر اس نے کہا میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں اور کچھ سختی سے سوال کروں گا تو آپ میرے اوپر ناراض نہ ہوں، آپؐ نے فرمایا جو تیرا جی چاہے پوچھ، تب اس نے کہا میں آپ کو آپ کے پروردگار اور آپ سے پہلے لوگوں کے پروردگار کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں اللہ جانتا ہے (لفظ اللهم جس کے معنی ہیں یا اللہ تبرکاً وتاکیداً فرمایا ہے (تیسیر القاری)۔ تب اس نے کہا میں آپؐ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں " پھر کہنے لگا میں آپ کو قسم دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ سال بھر میں اس مہینہ میں (یعنی رمضان میں) روزے رکھو؟ آپؐ نے فرمایا ہاں،، پھر کہنے لگا میں آپ کو قسم دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم میں جو مالدار لوگ ہیں ان سے زکوٰۃ لیکر ہمارے محتاجوں میں بانٹ دو؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں،، تب اس شخص نے کہا جو احکام اللہ کی طرف سے آپؐ لے کر آئے ہیں میں ان پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کے لوگوں کا جو یہاں نہیں آئے ہیں نمائندہ ہوں اور میں ضمام بن ثعلبہ ہوں بنی سعد بن بکر کے خاندان سے ہوں۔

اس حدیث کو (لیث کی طرح) موسیٰ اور علی بن عبدالحمید نے سلیمان سے روایت کیا انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انسؓ سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

۶۲ ● حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل قال ثنا سلیمان بن المغیرۃ قال ثنا ثابت عن انس قال نُهينا في القرآن ان نسأل النبيّ صلی اللہ علیہ وسلم وکان یعجبنا ان یجیئ الرجل من اهل البادیة العاقل فیسأله ونحن نسمع فجاء رجل من اهل البادیة فقال اتانا رسولك فاخبرنا انك تزعم ان الله عزوجل ارسلك قال صدق فقال فمن خلق السماء قال الله عزوجل قال فمن خلق الارض والجبال قال الله عزوجل قال فمن جعل فیها المنافع قال الله عزوجل قال فبالذی خلق السماء وخلق الارض ونصب الجبال وجعل فیها المنافع آلله ارسلك قال نعم قال زعم رسولك ان علینا خمس صلوات وزکوة فی اموالنا قال صدق قال بالذی ارسلك آلله امرك بهذا قال نعم قال وزعم رسولك ان علینا صوم شهر فی سنتنا قال صدق قال فبالذی ارسلك آلله امرك بهذا قال نعم قال وزعم رسولك ان علینا حج البیت من استطاع الیه سبیلا، قال صدق قال بالذی ارسلك آلله امرك بهذا قال نعم قال فوالذی بعثك بالحق لا ازید علیهن شیئا ولا انقص فقال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ان صدق لیدخلن الجنة ●

ترجمہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو قرآن میں منع کر دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کریں اور ہماری یہ خواہش رہتی تھی کہ کوئی عقلمند شخص دیہات سے آئے (جس کو اس ممانعت کی خبر نہ ہو) وہ آپؐ سے سوالات کرے اور ہم سنیں، آخر دیہات والوں میں سے ایک شخص آیا اور کہنے لگا ہمارے پاس آپؐ کا قاصد پہونچا تھا اس نے یہ بیان کیا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے آپکو رسول بنا کر بھیجا ہے آپؐ نے فرمایا اس نے سچ کہا، پھر کہنے لگا اچھا آسمان کس نے پیدا کیا؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اس نے پوچھا اچھا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اس نے پوچھا اچھا اس میں اتنے منافع کس نے رکھے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، تب اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور پہاڑوں کو قائم کیا اور ان میں نفع کی چیزیں رکھیں کیا اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، تب اس نے کہا آپ کے قاصد نے کہا کہ ہم پر پانچ نمازیں ہیں اور اپنے مالوں میں زکوٰۃ (فرض) ہے آپؐ نے فرمایا اس نے سچ کہا پھر وہ بولا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا

کہ آپ کے قاصد نے کہا ہے کہ ہم پر سال بھر میں ایک مہینے کے روزے ہیں آپؐ نے فرمایا اس نے سچ کہا تب وہ کہنے لگا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں تب وہ کہنے لگا کہ آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ ہم پر بیت اللہ کا حج ہے جسے وہاں تک پہونچنے کی استطاعت ہو آپؐ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ تب وہ کہنے لگا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا میں ان باتوں پر نہ کچھ بڑھاؤں گا اور نہ ان میں کمی کروں گا، یہ سنکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر یہ سچا ہے تو بلا شبہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

ترجمۃ الباب سے مطابقت

حضرت ضمام کی دونوں حدیثوں سے ترجمۃ الباب کی مطابقت ظاہر ہے کہ حضرت ضمام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد سے معلوم کی ہوئی باتوں کو آپؐ کے سامنے پیش کیا اور آپؐ نے تصدیق فرمائی پھر ضمام جب قوم کے پاس واپس گئے تو قوم کے سب لوگ ایمان لے آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قراءت شیخ ہی ضروری نہیں بلکہ یہ بھی معتبر اور درست ہے کہ شاگرد پڑھے اور استاذ سن کر تصدیق کر دے۔ اس سے قراءت علی الشیخ اور عرض کا معتبر ہونا ثابت ہوگیا یہی امام بخاریؒ کا مقصد ہے۔

تشریح حدیث ۶۱

نحن جلوس جالس کی جمع ہے جیسے راکع کی جمع رکوع نحن مبتدا ہے اور جلوس اس کی خبر۔ دخل رجل مراد ضمام بن ثعلبہ ہیں جیسا کہ اسی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ اس رجل نے کہا انا ضمام بن ثعلبة الخ۔

علی جمل فاناخہ فی المسجد اس سے ابن بطال وغیرہ نے ماکول اللحم کے ارواث وابوال (بول و براز) کے پاک ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ اونٹ کا مسجد میں بیٹھانا خطرۂ بول سے خارج نہیں اور اس کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت اس کی دلیل ہے کہ اونٹ کا پیشاب پاک ہے۔

مگر یہ استدلال صحیح نہیں اس لئے کہ اس میں صرف ایک احتمال ہے کہ پیشاب وغیرہ کر دیتا لیکن پیشاب کرنا ثابت نہیں۔ قابل غور یہ ہے کہ وہ ذات اقدس جو مسجد میں تھوک برداشت نہیں کرتی اور غضب سے چہرہ متغیر ہو جاتا اس نے مسجد میں اونٹ کا داخل کرنا اور اس کا بول و براز کیسے برداشت کرلیا؟ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ اونٹ کو مسجد میں بیٹھایا گیا ہوگا، راوی نے قرب مسجد کو مسجد سے تعبیر کر دیا تھا جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے جو مسند احمد میں ہے: فاناخ بعیرہ علی باب المسجد فعقلہ ثم دخل الخ حافظ عسقلانیؒ کہتے ہیں: فعلی ھذا فی روایة انس مجاز الحذف والتقدیر فاناخہ فی ساحة المسجد او نحو ذلک (فتح الباری) اس سے واضح ہوگیا کہ فی المسجد سے مراد علی باب المسجد یا فی ساحة المسجد ہے۔

ثم قال لهم ایکم محمد؟ الخ پھر اس نے حاضرین مجلس سے پوچھا، تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ظهرانيهم بفتح الظاء والنون والمراد هنا المشرب بحمرة (قس) ظہر کا تثنیہ ظہران ہے پھر ظہران کو مفرد کے حکم میں قرار دے کر تثنیہ کی علامت اس کے ساتھ لگادی ظہرانین ہوا اور اضافت الی الضمیر کی وجہ سے تثنیہ کی نون گرادی، یہ لفظ اسی وقت بولتے ہیں جب مجمع کثیر ہو اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ہوں۔

اشکال قرآن مجید میں ہے لا تجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعاء بعضكم بعضا (سورہ نور آیت ۶۳) اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے پکارنا یا مخاطب کرنا ہو تو عام لوگوں کی طرح آپؐ کا نام لے کر یا محمدؐ نہ کہو کہ یہ بے ادبی ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ضمام بن ثعلبہ کا یہ خطاب ادب و تعظیم کے خلاف ہے جو جائز نہیں۔

جواب: بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ ضمام رضؓ نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا پھر تو جواب کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن امام بخاری، قاضی عیاض اور حافظ عسقلانی رحمہم اللہ وغیرہ کا مختار قول یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو کر آئے تھے، چنانچہ امام بخاریؒ نے اسی بنا پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اور ابو سعید حداد اور حمیدی نے اسی بنیاد پر ضمام بن ثعلبہ رضؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کیونکہ کافر کی قرات بالاتفاق معتبر نہیں۔

اور خطاب میں بے ادبی و گستاخانہ طرز کا جواب یہ ہے کہ یہ نو مسلم تھے ابھی اسلامی احکام سے واقف نہ تھے، پھر اعرابی (دیہاتی) تھے، ادب، تہذیب سے ناواقف تھے ان کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا قرینہ ان کے سوالات کی نوعیت ہے کہ انہوں نے توحید کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی آپؐ سے معجزات طلب کئے بلکہ پورے سوالات تعمیم رسالت اور شرائع اسلام سے متعلق ہیں۔

هذا الرجل الابيض مراد خالص بیاض (سفید) نہیں ہے جیسا کہ شمائل ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں لا بالابيض الامهق ولا بالآدم، یعنی آپؐ نہ چونے کی طرح خالص سفید رنگ کے تھے اور نہ گندمی رنگ (یعنی آپؐ سانولے نہ تھے) بلکہ بیاض مشرب بحمرہ مراد ہے۔ لیکن چونکہ سفیدی غالب تھی اسلئے ابیض سے تعبیر کردیا۔

يا ابن عبد المطلب یہ خطاب ادب و احترام کے خلاف نہیں ہے کیونکہ عبد المطلب عرب کے مشہور سردار تھے اور اسی شہرت کی بنا پر غزوۂ حنین میں آپؐ نے خود رجز پڑھا تھا ؎

انا النبی لا کذب ❊ انا ابن عبد المطلب

یعنی میں نبی ہوں اور نبی کبھی جنگ میں پیٹھ نہیں پھیرتا ہے اور دنیوی اعتبار سے بھی میں عرب کے مشہور سردار کا بیٹا ہوں۔

قد اجبتك میں تیرا جواب دے چکا یعنی میں بالکل تیار ہوں گویا جواب دے چکا بلا تکلف پوچھو

۲ اجبت بمعنی سمعت ہے یعنی میں نے تیری بات سن لی ہے۔

آمنت بما جئت بہ ضمام رض کہنے لگے "جو حکم آپ (اللہ تعالیٰ کے پاس سے) لائے ہیں میں ایمان لاچکا، یعنی اخبار ہے ایمان سابق کی یہی امام بخاریؒ، امام اوزاعی اور قاضی عیاضؒ کا مختار قول ہے۔

اور علامہ قرطبی وغیرہ کہتے ہیں کہ آمنت الخ انشاء ایمان ہے، اس صورت میں آمنت الخ کو تجدید ایمان پر محمول کیا جائیگا۔

انا ضمام بن ثعلبۃ ضمام بکسر الضاد المعجمۃ وثعلبہ بالثاء المثلثۃ المفتوحۃ والباء الموحدۃ۔ (عمدہ)

اخو بنی سعد بن بکر بنو سعد کا یہ خاندان قبیلۂ ہوازن کی ایک شاخ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضعہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا اسی قبیلہ سے تھیں، شاید اس تعارف سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت کا اظہار مقصود ہو کہ آپؐ پر ہمارے حقوق ہیں۔

اس میں حج کا ذکر نہیں

بعض حضرات نے لکھا کہ حج اس وقت تک فرض نہیں ہوا تھا اس لئے اس کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے لیکن یہ بات بچند وجوہ درست نہیں:۔

۱ دراصل یہ روایت مختصر ہے، مسلم شریف جلد اول ص۳۱ میں ضمام بن ثعلبہ کی اس روایت میں حج کا ذکر موجود ہے۔

۲ خود بخاری شریف ہی میں متصلاً موسیٰ بن اسماعیل شیخ بخاری کی روایت آرہی ہے جس میں حج کی تصریح موجود ہے اگرچہ موسیٰ بن اسماعیل کی روایت صرف فربری کے نسخے میں ہے دوسرے نسخوں میں یہ روایت نہیں ہے، چنانچہ عمدۃ القاری، فتح الباری، ارشاد الساری کسی میں بھی موسیٰ بن اسماعیل کی روایت نہیں ہے پس عام نسخوں کے لحاظ سے رواہ موسیٰ الخ تعلیقاً لائے ہیں جس سے مقصود استشہاد اور مذکورہ روایت کی تائید و تقویت ہے۔

البتہ ہمارے ہندوستانی نسخہ میں چونکہ موسیٰ بن اسماعیل کی روایت موصولاً موجود ہے اس لئے اس نسخہ میں اس عبارت (رواہ موسیٰ الخ) کا ہونا درست نہیں، کاتب نے دو نسخوں کو ایک میں ملادیا ہے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: رواہ موسیٰ الخ ای روی الحدیث المذکور موسیٰ بن اسماعیل ابوسلمۃ المنقری التبوذکی وھو شیخ البخاری وقد مر ذکرہ (یعنی کتاب الوحی حدیث ۴) وھو یروی ھذا الحدیث عن سلیمان بن المغیرۃ ابی سعید القیسی البصری عن ثابت البنانی عن انس بن مالک رض واخرجہ ابو عوانۃ فی صحیحہ موصولاً بھذا الطریق وکذا ابن مندہ فی الایمان۔

فان قلت لم علقہ البخاری ولم یخرجہ موصولاً؟ قلت قال الکرمانی یحتمل ان یکون البخاری یروی عن شیخہ موسیٰ بالواسطۃ فیکون تعلیقا وفائدۃ ذکرہ الاستشہاد وتقویۃ ما تقدم۔ (عمدہ)

تشریح حدیث ۶۲ اس میں بھی ضمام بن ثعلبہؓ ہی کا واقعہ ہے، یہ روایت (یعنی موسیٰ بن اسماعیل کی) بخاری شریف کے اکثر نسخوں میں نہیں ہے یہ صرف فربری ہی کے نسخہ میں ہے اور یہی نسخہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں رائج ہے۔ چونکہ علامہ فربریؒ امام بخاریؒ کے بلاواسطہ اور خصوصی شاگرد ہیں۔ علامہ فربریؒ نے امام بخاریؒ سے دو مرتبہ یا فی قول تین مرتبہ پڑھی ہے اس لئے یہ نسخہ زیادہ متداول و متعارف ہے۔ (تفصیل کے لئے مقدمہ ملاحظہ فرمائیے)۔

نُهينا في القرآن الآیۃ مطلقاً سوال سے ممانعت نہ تھی بلکہ فضول سوالات سے روکا گیا تھا مگر "مقربان را بیش بود حیرانی"، صحابہ کرام رضؓ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کا غلبہ تھا اس لئے بالکل رُک گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کوئی سوال کریں اور وہ مورد عتاب و عذاب ہو جائیں، لیکن صحابہ کرام رضؓ چاہتے تھے کہ کوئی عقلمند دیہاتی آجائے جو ممانعت سے واقف نہ ہو اور ٹھکانے کا سوال کرے، چنانچہ سیدنا فاروق رضؓ ضمام بن ثعلبہ کی تعریف میں فرماتے ہیں: ما رأيتُ احسن مسئلةً ولا اوجز من ضمام۔ (فتح ج ۱ ص ۱۲۵)

● **باب ۴۹** ما يُذكرُ في المُناولةِ وكتابِ اهلِ العلمِ بالعلمِ الى البُلدانِ وقال انسٌ نسخ عثمانُ المَصاحِفَ فبعث بها الى الآفاقِ ورأى عبدُ اللهِ بنُ عُمَرَ ويحيى بنُ سعيدٍ ومالكٌ ذلك جائزاً واحتجَّ بعضُ اهلِ الحجازِ في المناولةِ بحديثِ النبي صلى الله عليه وسلم حيث كتبَ لِأميرِ السَّرِيَّةِ كتاباً وقال لا تقرأْهُ حتى تبلُغَ مكانَ كذا وكذا فلما بلغَ ذلك المكانَ قرأه على الناس واخبرَهم بامرِ النبي صلى الله عليه وسلم ● ص ۱۵

ترجمہ مناولہ کا بیان اور عالموں کا علمی باتیں لکھ کر دوسرے شہروں کی طرف بھیجنے کا بیان۔

حضرت انس رضؓ نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضؓ نے مصاحف لکھوائے اور انہیں مختلف ملکوں میں بھجوائے، اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضؓ اور یحییٰ بن سعید اور امام مالکؒ نے اس کو (یعنی مناولہ کو) جائز رکھا ہے، اور حجاز کے بعض علماء نے مناولہ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپؐ نے امیر لشکر کو ایک مکتوب دیا اور فرمایا کہ جب تک تم فلاں مقام تک نہ پہونچ جاؤ اس مکتوب کو نہ پڑھنا چنانچہ جب وہ امیر اس مقام پر پہونچ گئے تو اس مکتوب کو پڑھ کر لوگوں کو سنایا اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطلاع دی۔

ربط تحمل حدیث کے مختلف طریقے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک قراءۃ الشیخ علی التلمیذ ہے، دوسرا طریق قراءۃ التلمیذ علی الشیخ ہے۔ باب سابق میں امام بخاری رحؒ نے اسی کو بیان فرمایا تھا، ان دونوں طریقوں (قراءۃ الشیخ اور قراءۃ علی الشیخ) سے فراغت کے بعد اب اس باب میں مزید دو طریقے بیان کر رہے ہیں۔ ۱۔ مناولہ ۲۔ مکاتبہ۔

مناولہ کی صورت یہ ہے کہ شیخ اپنی مکتوبہ احادیث کسی شاگرد کو بالمشافہہ (آمنے سامنے) دیدے، اب اگر اس کو دیگر روایت کی اجازت دیدے (مثلاً یہ کہے کہ میں اجازت دیتا ہوں تم میری سند سے روایت کرو) تو یہ مناولہ مقرونہ بالاجازت ہے اور اگر بالمشافہہ کتاب دیدے مگر اجازتِ روایت کا تذکرہ نہ کرے تو مناولہ مجردہ عن الاجازت ہے اس صورت میں شیخ سے روایت جائز نہ ہوگی البتہ اس طرح روایت کرسکتا ہے ناولنی فلان کتابا فیہ ھذا۔

اس باب میں دوسرا طریقہ مکاتبہ ہے جس کی صورت یہ ہے کہ شیخ اپنی مکتوبہ احادیث غائب کیطرف بھیجکر روایت کی اجازت دیدے۔

مناولہ اور مکاتبہ اگر مقرونہ بالاجازت ہوں توان دونوں کے صحیح اور معتمد ہونے پر امام بخاریؒ مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:۔

پہلی دلیل وقال انسؓ نسخ عثمان المصاحف الخ مصاحف بفتح المیم جمع ہے مصحف کی، مصحف کی میم میں تینوں حرکات جائز ہیں لیکن مشہور بضم المیم ہے بمعنی مجلد کتاب یہاں مراد قرآن مجید ہے۔

اور حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف (قرآن مجید کے متعدد نسخے) لکھوائے اور مختلف علاقوں میں بھجوائے۔

امام بخاریؒ نے اس مقام پر جس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے وہ بخاری شریف جلد ثانی ص۷۴۶ میں پوری سند کے ساتھ مفصل موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیہ اور آذربیجان کی فتح کے لئے جہاد میں گئے تھے تو دیکھا کہ عراق اور شام کے مسلمانوں میں قرآن مجید کی قرات میں اختلاف ہورہا ہے، یعنی جدا جدا طریق سے پڑھ رہے ہیں اور ہر ایک اپنے طریقہ کو صحیح اور دوسروں کی قرأت کو غلط بتارہے ہیں تو حضرت حذیفہؓ اس اختلاف سے گھبرا اٹھے اور حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے کہ اے امیر المؤمنین خدا کے واسطے اس امت کی خبر لیجئے اور قبل اس کے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب الٰہی میں اختلاف کرنے لگیں اس مصیبتِ عظمیٰ سے انہیں بچائیے تو حضرت عثمانؓ نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ اپنا مصحف ہمارے پاس بھیجدیں ہم اس کی نقل کراکے آپ کے پاس واپس کردیں گے، ام المؤمنین حضرت حفصہؓ نے اپنا مصحف بھیجدیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشامؓ کو حکم دیا اور ان سب حضرات نے ان کی نقلیں اتارلیں اور جب یہ حضرات اپنے مصاحف لکھ چکے تو ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس ان کا مصحف واپس کردیا اور حضرت عثمانؓ نے مختلف علاقوں (بصرہ، کوفہ، شام، اور مکہ وغیرہ) میں ایک ایک نسخہ بھیجدیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ۲۵ھ میں امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اہلِ عراق اور اہل شام کے اختلاف فی القرآن سے فتنہ کا خوف ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ صحیفہ کی

نقل کراکر مختلف نسخے تیار کروائے اور یہ نسخے صرف لغت قریش کے مطابق کروایا، چونکہ قرآن مجید کا اصل نزول لغت قریش ہی پر ہوا اور بعد عارض توسعات کو ختم کر کے صورتِ مکتوب بھی متعین فرمادی تاکہ کلی طور پر اختلاف کا سدِّ باب ہوجائے، اور اسی نسخہ کی نقلیں مختلف علاقہ میں ارسال کرائی گئیں۔

معلوم ہوا کہ ارسال کتب (مکاتبۃ) کا طریقہ بھی معتبر ہے اور جب قرآن مجید کے معاملہ میں مکاتبت کا طریقہ مستند اور حجت ہے تو حدیث کے بارے میں تو بدرجہ اولیٰ معتبر ہوگا۔

دوسری دلیل ورأی عبد اللہ بن عمر الخ اور حضرت عبداللہ بن عمر اور یحییٰ بن سعید انصاری اور امام مالک رحمہم اللہ نے اس (مناولہ) کو جائز رکھا ہے۔

یہ ذہن نشین رہے کہ یہ عبداللہ بن عمر بن عاصم بن عمر بن الخطاب ابو عبدالرحمٰن القرشی المدنی ہیں، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے ہیں جو عبداللہ عمری کے ساتھ مشہور ہیں، یہی تحقیق ہے علامہ عینی اور علامہ کرمانی رحمہما اللہ کی اگرچہ احتمال ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ مراد ہوں۔ واللہ اعلم۔

تیسری دلیل واحتج بعض اهل الحجاز الخ بعض اہلِ حجاز سے مراد امام بخاریؒ کے شیخ حمیدی ہیں شیخ حمیدیؒ نے صحتِ مناولہ کے لئے اپنی کتاب نوادر میں اس حدیث سے استدلال کیا ہے، حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جمادی الثانیہ ۲ھ غزوۂ بدر سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ مہاجرین کو حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں روانہ فرمایا اور امیر سریہ عبداللہ بن جحشؓ کو ایک خط دیا اور فرمایا کہ دو دن سفر کرنے کے بعد اس کو کھولنا اور ساتھیوں کو پڑھ کر سنانا اور اسی کے مطابق عمل کرنا۔ اس مقام پر پہونچکر جب خط کھولا گیا تو اس میں یہ ہدایت تھی کہ مکہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ میں پہونچ کر قریش کا حال معلوم کریں اور ہمیں اس کی اطلاع دیں اور ساتھیوں میں سے کسی کو مجبور نہ کرنا جو چاہے جائے اور جو نہ چاہے نہ جائے۔ چنانچہ اس اعلان کے بعد دو آدمی لوٹ آئے اتنے میں قریش کا ایک تجارتی قافلہ سامنے آگیا اور یہ رجب کی پہلی تاریخ تھی لیکن صحابہ کو ۲۹ کے چاند کی خبر نہ تھی، بلکہ رجب کو تیسری جمادی الاخریٰ سمجھ کر ایک شخص عمرو بن الحضرمی کو قتل کردیا اور دو آدمیوں کو قید کرلیا اور کچھ مال غنیمت بھی حاصل کیا فكان اول مقتول من الكفار فى الاسلام وذلك فى اول يوم من رجب وغنموا ما كان معهم فكان اول غنيمة فى الاسلام۔

بہرحال امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مناولہ مقرونہ بالاجازت کا اثبات ہوگیا کیونکہ آپؐ نے ایک مکتوب بالمشافہہ دیا، نہ پڑھ کر سنایا اور نہ سنا صرف مکتوب دیا اور فرمایا کہ دو دن کی مسافت کے بعد کھولنا اور ساتھیوں کو پڑھ کر سنانا، لہٰذا مناولہ مقرونہ بالاجازت کی صورت ہوگئی اور اس میں مکاتبۃ کے معنی بھی موجود ہیں اور اس پر عمل کا حکم فرمایا۔

۶۳ ● حدثنا اسمٰعيل بن عبد الله قال حدثنى ابراهيم بن سعد عن صالح عن ابن شهاب عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود ان عبد الله

بن عباسٍ اخبرہ اَنَّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث بکتابہ رجلاً وامرہٗ اَن یدفعہ الی عظیم البحرین فدفعہ عظیمُ البحرین الی کسریٰ فلما قرأہ مزّقہٗ فحسبتُ اَنَّ ابنَ المسیّبَ قال فدعا علیہم رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَن یُمَزَّقوا کلَّ مُمَزَّقٍ ● ص۱۵

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط لکھ کر ایک شخص (حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ) کو دیا اور ان سے یہ فرمایا کہ وہ اس خط کو بحرین کے حاکم (منذر بن ساوی) کو دیں، بحرین کے حاکم نے وہ خط کسریٰ (خسرو پرویز) کو بھیجدیا، تو جب کسریٰ نے اس مکتوب گرامی کو پڑھا تو اسکو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، راوی ابن شہاب کا بیان ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ ابن مسیب نے یہ بھی کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس واقعہ کو سنکر) حکومت ایران کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی بد دعا فرمائی۔

تعدد الحدیث:- والحدیث ھنا ص۱۵ ویاتی فی الجہاد ص۴۱۱ وفی المغازی ص۶۳۷ و ص۱۰۷۹ ۔

تشریح رجلاً سے مراد حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ ہیں جو قدیم الاسلام مہاجرین اولین میں سے ہیں ان کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی۔

الیٰ عظیم البحرین ھو المنذر بن ساوی بفتح الواوٗ ۔ بادشاہوں کا عام دستور تھا کہ بلا واسطہ خط نہیں لیتے تھے اس لئے بادشاہ فارس کسریٰ کی طرف خط عظیم البحرین کی وساطت سے بھیجا گیا۔

کسریٰ فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا تھا، جس کسریٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو چاک کیا تھا وہ نوشیرواں کا پوتا خسرو پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں تھا۔ فحسبت یہ قول راوی حدیث ابن شہاب کا ہے کلّ ممزّق ایسی تمزیق کہ اس کے آگے تقسیم نہ ہو سکے۔

کسریٰ کی ہلاکت واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کے پاس تبلیغی خطوط ارسال فرمائے تھے۔ ان خطوط میں ایک خط کسریٰ کے پاس لکھا تھا جو حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ کو دیکر ہدایت فرمادی کہ بحرین کے گورنر منذر بن ساوی کو پہنچادیں چنانچہ عظیم بحرین نے وہ خط کسریٰ کو پہونچا دیا۔

دستور کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کے سرنامہ پر اپنا نام پہلے لکھا "من محمد رسول اللہ الی کسریٰ الخ"، خسرو پرویز کو سخت ناگوار ہوا کہ میرا نام پہلے کیوں نہیں لکھا اس نے طیش میں آکر مکتوب مبارک پھاڑ دیا، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مکتوب گرامی کو پھاڑ دینے کی اطلاع پہونچی تو آپؐ نے بد دعا فرمائی کہ جیسے اس نے میرے خط کو پھاڑا ہے خدا کرے کہ اس کی حکومت بھی پارہ پارہ ہو جائے۔ اس بد دعا کا اثر اس کی جان پر بھی ہوا اور حکومت پر بھی۔

ظاہری سبب یہ ہوا کہ خسرو پرویز کا بیٹا شیرویہ اپنی سوتیلی ماں شیریں پر عاشق ہو گیا، باپ کی موجودگی

میں شیریں پر دست درازی دشوار تھی اس لئے اس نے باپ کو قتل کر دینے کا ارادہ کرلیا، ادھر باپ خسرو پرویز کو بیٹے کے خطرناک ارادے کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے اس نے ایک زہر کی شیشی پر مقوی باہ لیبل لگا کر شاہی خزانہ میں رکھدیا تاکہ بیٹا بھی زندہ نہ رہ سکے، چنانچہ بیٹے نے باپ کو قتل کر دیا، شیریں نے یہ واقعہ سنکر خود کشی کرلی، کسریٰ کے قتل کے بعد جب شیرویہ تخت نشیں ہوا اور خزانہ کھولا تو مقوی باہ کا لیبل دیکھ کر بہت خوش ہوا اور استعمال کر کے ہلاک ہوگیا، پھر اس کی بیٹی پوران تخت نشیں ہوئی جو کم عمر تھی، طوائف اللوکی شروع ہوئی بالآخر حضرت عمر فاروق رضؓ کے زمانے میں اس کی سلطنت کا بالکل استیصال ہوگیا اور ایسی دھجیاں بکھریں کہ کہیں نام ونشان نہیں ملتا" اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ "

مطابقۃ للترجمۃ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن حذافہ رضؓ کو مکتوب گرامی بالمشافہہ عنایت فرما کر اجازت دیدی کہ عظیم بحرین سے کہدیں کہ یہ مکتوب گرامی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اسی بالمشافہہ دینے کو مناولہ کہتے ہیں اور کسریٰ کے پاس مکتوب گرامی بھیجا تو اس سے مکاتبت ثابت ہوئی۔

۶۴ ● حدثنا محمدُ بنُ مقاتلٍ ابو الحسنِ قال ثنا عبدُ اللهِ قال اخبرنا شعبةُ عن قتادةَ عن انسِ بنِ مالكٍ قال كتب النبيُّ صلى الله عليه وسلم كتاباً او اَرادَ اَن يَكتُبَ فقيل لهٗ اِنَّهم لا يقرَءُون كتاباً اِلَّا مختوماً فاتَّخذَ خاتماً مِن فِضَّةٍ نقشُهٗ محمدٌ رسولُ اللهِ كأنّي انظرُ الى بياضِهٖ في يَدِهٖ فقلتُ لِقتادةَ مَن قال نقشُهٗ محمدٌ رسولُ اللهِ قال انسٌ ●

ترجمہ حضرت انس بن مالک رضؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (عجم یا روم کے بادشاہ کو) ایک خط لکھا، یا لکھنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے آپؐ سے عرض کیا وہ لوگ (عجم کے یا روم کے) وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہو (یعنی بے مہر خط کو مستند نہیں سمجھتے) تو آپؐ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اس پر محمد رسول اللہ کا نقش تھا (حضرت انس رضؓ نے کہا) گویا میں آج بھی آپؐ کے دست مبارک میں انگوٹھی کی سفیدی دیکھ رہا ہوں، شعبہ نے کہا کہ میں نے قتادہ سے پوچھا "یہ کس نے کہا کہ اس پر محمد رسول اللہ کا نقش تھا انہوں نے جواب دیا" انس رضؓ نے۔

تعدد الحدیث: اخرجہ البخاری ھہنا ص۱۵ وص۱۱۲ وفی اللباس ص۸۷۲ ایضا ص۸۷۳ وفی الاحکام ص۱۰۶۱۔

تشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ سے عرض کیا گیا کہ ان بادشاہوں کے یہاں کوئی تحریر مہر کے بغیر اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ اسے دیکھا بھی جائے اور چونکہ ان خطوط کا تعلق تبلیغ سے ہے اس لئے ضروری ہے کہ مہر بنوائی جائے تاکہ وہ لوگ معتبر اور مؤثر سمجھ کر پڑھیں اور اسلام کی دعوت ان تک پہونچ سکے چنانچہ آپؐ نے اس ضرورت کی بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا اور یہ نقش تین سطر میں تھا

پہلی سطر اللہ دوسری سطر رسول تیسری محمد (م) گویا نیچے سے پڑھا جائیگا محمد رسول اللہ

اتخاذ الخاتم قال فی فیض الباری " علم منہ انہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لم یکن یحب اتخاذ الخاتم ثم اتخذ ھا لاجل الضرورۃ فاحفظہ کالاصل ، فانہ یدل علی انہ قد یترک شیئ مرضی عند الضرورۃ ، وکان نقشہ " محمد رسول اللہ " علی اختلاف فی صورتہ ۔ وکان نقش خاتم عمرؓ " کفیٰ بالموت واعظا " وکان نقش خاتم امامنا " قل الخیر والا فاسکت " وھذا یدل علی انہ لایجب کتابۃ اسم صاحب الخاتم علی الفص وکان الخاتم فی القدیم امارۃ لإختتام الشیئ ویختم الآن للتصدیق ، وقولہ تعالیٰ " خاتم النبیین " علی العرف القدیم فلاحجۃ فیہ للشقی القادیانی ۔

مطابقۃ للترجمۃ حدیث کی مطابقت ترجمہ کے دونوں جزسے ہے ۔ مناولہ سے تو یہ ہے کہ آپؐ نے اپنا مکتوب گرامی اپنے قاصدوں کو دیا ۔ اور مکاتبۃ سے مناسبت تو بالکل ظاہر ہے ۔

ارشاد خداوندی ہے :۔

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ ۔	اے رسول آپ اس چیز کی تبلیغ کریں جو آپ کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنی رسالت کی تبلیغ نہیں کی ۔

اس فرمانِ خداوندی کی تعمیل کے لئے مختلف بادشاہوں کے نام تبلیغی مکاتیب بھیجے ، معلوم ہوا کہ مکاتبۃ کی صورت بھی مستند اور لائق اعتماد و اعتبار ہے ۔

● باب ۵۰ مَن قعدَ حیثُ یَنتھی بہ المَجلسُ وَمَن رأی فُرجَۃً فی الحَلقَۃِ فَجلَسَ فیھا ●

اس شخص کا بیان جو مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا اور اس شخص کا بیان جو درمیان مجلس میں جگہ پاکر بیٹھ گیا ۔

۶۵ ● حدثنا اسمٰعیلُ قال حدثنی مالکٌ عن اسحٰقَ بنِ عبدِ اللہِ بنِ ابی طلحۃَ اَنّ ابامُرّۃَ مولیٰ عقیلِ بنِ ابی طالبٍ اخبرہ عن ابی واقدٍ اللیثیِ اَنّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینما ھو جالسٌ فی المسجد والناسُ معہ اِذ اقبل ثلٰثۃُ نفرٍ فاقبلَ اثنانِ الیٰ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذھبَ واحدٌ قال فوقفا علیٰ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فامّا احدُھما فرأی فُرجَۃً فی الحلقۃِ فجلسَ فیھا وَامّا الاٰخرُ فجلسَ خلفَھم وامّا الثالثُ فادبرَ ذاھبًا فلمّا فرغَ رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا اُخبرُکم عنِ النفرِ الثلٰثۃِ اما احدھم فاوٰی الی اللہ فآواہُ اللہ وامّا الاٰخر فاستحیٰ فاستحی اللہ مِنہُ وامّا الاٰخرُ فاعرَضَ فاعرَضَ اللہُ عنہُ ●

ترجمہ حضرت ابو واقد لیثیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپؐ کے ساتھ (بیٹھے) تھے استنے میں تین آدمی (باہر سے) آئے ان میں سے دو شخص تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئے (آپؐ کا کلام سننے کے لئے) اور ایک چلا گیا، راوی (یعنی ابو واقدؓ) کا بیان ہے کہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر ٹھہرے، پھر ان میں سے ایک نے مجلس میں گنجائش دیکھی تو اس میں بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا پیٹھ پھیرے ہوئے چلا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (وعظ سے) فارغ ہوئے تو فرمایا: "کیا میں تمہیں ان تینوں آدمیوں کا حال نہ بتلا دوں؟ ایک نے تو ان میں سے اللہ کی پناہ لی تو اللہ نے اس کو جگہ دی (یعنی اس نے خیر کی طرف رغبت کی، متوجہ ہوا تو اللہ نے اس کو ثواب عطا فرمایا) اور دوسرے نے (اندر گھسنے میں لوگوں سے) شرم کی تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی، رہا تیسرا اس نے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ، لان الترجمۃ فیمن قعد حیث ینتھی بہ المجلس وفیمن رأی فرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیھا والحدیث مشتمل علی ذکر الحلقۃ والفرجۃ وعلی من جلس ینتھی بہ المجلس۔ (عمدۃ ۲ ص ۳۱ تا ۳۲)

ربط و مقصد کتاب العلم سے اس باب کی مناسبت یہ ہے کہ یہاں حلقہ اور مجلس سے مراد حلقۂ علم اور مجلس علم ہے۔ امام بخاریؒ کا مقصد طالب علم کو کسی علمی مجلس میں شرکت کے آداب کی تعلیم دینا ہے کہ جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جائے کہ اس میں کبر و غرور کا علاج ہے، خواہ مخواہ اہل مجلس کو پریشان کرنے کے لئے تخطی رقاب نہ کرے لیکن اگر کسی علمی حلقہ میں آگے جگہ خالی ہو تو آگے بڑھ کر خالی جگہ کو پُر کر دینا جائز ہے، مقصد یہ ہے کہ کسی علم و ذکر، وعظ و نصیحت کی مجلس میں پہونچ کر پہلے دیکھ لے اگر اندر جگہ ہے تو بڑھ کر بیٹھ سکتا ہے ورنہ جہاں آسانی ہو وہیں بیٹھ جائے یہ درست نہیں کہ اگر جگہ نہیں مل رہی ہے تو وہاں سے منہ موڑ کر چلا جائے اگر علمی مجلس میں بیٹھے گا تو علمی فوائد کے علاوہ اللہ کی رحمت کی آغوش میں آئیگا اگر بے التفاتی سے چلدے تو خود اپنا ہی نقصان کرے گا، علمی مجلس و حلقہ سے اعراض (چلدینا) اگر تکبر کی وجہ سے ہے تو حرام ہے اور اگر لاپرواہی اس کا سبب ہو تو ایک سعادت و مقام استفادہ سے محرومی ضرور ہے۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا ص ۱۵ تا ۱۶ وایضا فی الصلوۃ ص ۶۸ واخرجہ مسلم والترمذی وغیرہ۔

واما الآخر فاستحیی فاستحیی اللہ منہ اور دوسرے نے (اندر گھسنے میں لوگوں سے) شرم کی تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی۔

اس جملہ کے مطلب میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ اول نے آگے مجلس میں جگہ دیکھی اور وہ بڑھکر وہیں بیٹھ گیا مگر اس کے دوسرے ساتھی کو اس کی شرم آئی کہ لوگوں کی گردنیں پھاند کر آگے جائے اس بناء پر

مجلس کے اخیر میں بیٹھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس حیا کا ثواب عطا فرمایا اور مجلس میں بیٹھنے کا ثواب بھی عنایت فرمایا اس صورت میں اس کا مرتبہ اول سے بڑھ جائیگا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کا ارادہ مجلس میں بیٹھنے کا نہ تھا جی چاہ رہا تھا کہ تیسرے کیطرح چلا جائے مگر شرم آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہیں گے؟ صحابہ کیا کہیں گے؟ اس لئے شرما حضوری میں آکر بیٹھ گیا اس صورت میں اس کا درجہ پہلے شخص سے کم ہوگا۔ لیکن تیسرے شخص نے اعراض کیا، بے رخی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اعراض کیا أی سخط علیہ بشرطیکہ بلا عذر ہو۔

صنعتِ مشاکلہ اس حدیث میں ایواء، استحیاء اور اعراض کے الفاظ کا استعمال بطور صنعتِ مشاکلت ہے ایسے اطلاقات کے بارے میں جن کا ظاہری معنی مراد لینا ممکن نہ ہو تو ان کے ثمرات ولوازم مراد لئے جاتے ہیں۔

نصیحت آمیز واقعہ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے فرجۃ جو فاء کے پیش اور زبر دونوں طرح مستعمل ہے۔ فنِ نحو کے ایک مشہور امام ابو العلاء نحوی کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کو اس لفظ میں تردد تھا کہ بفتح الفاء زیادہ فصیح ہے یا بضم الفاء؟ اور یہ حجاج ظالم کے زمانہ میں تھا، حجاج سے کسی بات پر بحث ہوگئی تو حجاج کے خوف سے کسی دیہات میں رہنے لگے۔ ایک روز ایک اعرابی (دیہاتی) حجاج کی وفات پر ایک شعر پڑھتا ہوا جا رہا تھا۔ غالباً اس کا دل بھی ابو العلاء کی طرح زخمی تھا ؎

ربما تکرہ النفوس من الدھر ؛ لہ فرجۃ کحل العقال

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبائع زمانہ کی تلخ آزمائشوں سے تنگ آجاتی ہیں لیکن خلاف توقع دفعۃً ان سے چھٹکارا مل جاتا ہے جیسے اونٹ کی رسی کھل گئی اور وہ آزاد ہوا۔

غرض وہ اعرابی حجاج ظالم کے مرنے کی خوشی میں شعر مذکور پڑھتا جا رہا تھا، ابو العلاء کہتے ہیں کہ مجھے بھی حجاج کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی مگر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے اس کے مرنے کی زیادہ خوشی ہوئی یا اس بات سے کہ فرجۃ زبر کے ساتھ اعرابی نے پڑھا جس سے مجھے یہ تحقیق ملی کہ بنسبت پیش کے وہی زیادہ فصیح ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں علم کی کتنی قدر وقیمت تھی کہ حجاج کی وجہ سے مارا مارا پھرتا تھا کہ کسی طرح جان بچ جائے، کتنی کچھ تکالیف ومصائب برسوں تک برداشت کئے ہوں مگر خود امام لغت ہونے کے باوجود ایک لفظ کی تحقیق پر اتنی بڑی خوشی منا رہے ہیں کہ وہ سارے مصائب کے خاتمہ کی خوشی کے برابر ہوگئی۔ (نفحۃ الیمن)

• باب ۵۱ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ • ص ۱۶

باب:۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس کو میرا کلام پہنچایا جائے وہ اس سے زیادہ فہیم اور یاد رکھنے والا ہوتا ہے جس نے مجھ سے سنا۔

مبلغ بفتح اللام ای رب مبلغ الیہ۔ اوعی یہ حفاظت الفاظ و معنی دونوں کو شامل ہے، چنانچہ امت میں کئی حضرات ایسے گذرے ہیں جو حفظ و تفقہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ تھے مگر یہ جزئی فضیلت ہے، کلی فضیلت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے لئے مخصوص ہے کوئی شخص کسی ادنیٰ صحابی کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔

۶۶ ● حدثنا مُسَدَّدٌ قال حدثنا بِشْرٌ قال حدثنا ابنُ عونٍ عن ابنِ سيرينَ عن عبدِ الرحمٰنِ ابنِ ابی بکرةَ عن ابيه قال ذکر النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قعد علیٰ بعيرهٖ وأَمسَكَ انسانٌ بخِطامهٖ او بزِمامهٖ قال ایُّ یومٍ هٰذا فسکتنا حتیٰ ظننّا انّه سيُسمّيه سوى اسمهٖ قال الیس یومَ النحرِ قلنا بلیٰ قال فایُّ شهرٍ هٰذا فسکتنا حتیٰ ظننّا انّه سيُسمّيه بغيرِ اسمهٖ قال الیس بذی الحِجّةِ قلنا بلیٰ قال فانّ دِماءَکم واموالَکم واعراضَکم بینکم حرامٌ کحرمةِ یومِکم هٰذا فی شهرِکم هٰذا فی بلدِکم هٰذا لِيُبلِّغِ الشّاهِدُ الغائبَ فانّ الشّاهِدَ عسیٰ اَنْ يُبلِّغَ مَن هو اَوعیٰ له منه ●

ترجمہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ نے اپنے باپ سے روایت کی کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کہ آپؐ اپنے اونٹ پر بیٹھے تھے (منیٰ میں دسویں ذی الحجہ کو) ایک آدمی اونٹ کی نکیل (لگام) تھامے ہوئے تھا آپؐ نے (لوگوں سے) فرمایا "یہ کونسا دن ہے؟ ہم لوگ خاموش رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے کہ آپؐ اس دن کا کچھ اور نام رکھیں گے، پھر آپؐ نے فرمایا" کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا بیشک ہے، آپؐ نے پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے کہ آپؐ اس ماہ کا کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے آپؐ نے فرمایا "کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا ہاں ہے آپؐ نے فرمایا بلاشبہ تمہاری جانیں اور تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کے دن کی حرمت تمہارے اس ماہ میں اور اس شہر میں، جو یہاں حاضر ہے اسے چاہئے کہ غائب کو یہ بات پہونچا دے، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ جو یہاں موجود ہے وہ ایسے شخص کو یہ خبر پہونچائے جو اس سے زیادہ (حدیث کا) محفوظ رکھنے والا ہو۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ من حیث المعنی یعنی حدیث کے آخری ٹکڑا لیبلغ الشاھد الغائب فانّ الشاھد عسیٰ اَن یبلغ من ھو اوعیٰ سے ظاہر ہے۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا فی العلم ص ۱۶ ایضا ص ۲۱ وفی المناسک ص ۲۳۴ وفی بدء الخلق ص ۴۵۳ وفی المغازی ص ۶۳۲ وفی التفسیر ص ۶۷۲ وفی الاضاحی ص ۸۳۳ وفی الفتن ص ۱۰۴۸ وفی التوحید ص ۱۱۰۹۔

تشریح اس حدیث میں حجۃ الوداع کا وہ خطبہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں ارشاد فرمایا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہؒ تابعی ہیں اور مشہور صحابی حضرت ابوبکرہؓ کے فرزند ہیں وھو اول مولود ولد فی الاسلام بالبصرۃ سنۃ اربع عشرۃ و توفی سنۃ تسع و تسعین ھ۔

عبدالرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد حضرت ابوبکرہؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کر رہے تھے کہ آنحضورؐ اونٹ پر سوار ہیں اور ابوبکرہؓ نکیل تھامے ہوئے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے دریافت فرمایا یہ کون سا دن ہے؟ فسکتنا یعنی ہم لوگ خاموش رہے۔ لیکن کتاب الحج ص۲۳۴ میں ہے: قلنا اللہ و رسولہ اعلم پھر اسی صفحہ پر حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ ہیں: قالوا یوم حرام "بظاہر تعارض ہے لیکن یہ کوئی تعارض نہیں ہے، چونکہ مجمع کثیر تھا کچھ لوگ تو اللہ و رسولہ اعلم کہہ کر خاموش ہو گئے اور جو لوگ حضرت ابن عباسؓ کے قریب تھے ان لوگوں نے جواب دیا: یوم حرامؐ "

بہرحال خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سوالی نوعیت اختیار فرمائی تاکہ ارشادات عالیہ کی اہمیت واضح ہو جائے اور حاضرین خوب ذہن نشین کر لیں کہ مسلمان کی عزت و حرمت اور اس کے جان و مال کا احترام ہر وقت اور ہر مقام میں ضروری اور فرض ہے بلکہ اشہر حرم کی حرمت سے بڑھ کر ہے، آخر میں فرمایا: " جو لوگ یہاں حاضر ہیں انہیں چاہیئے کہ غائبین تک میرا پیغام پہونچا دیں۔ لیبلغ الشاھد بکسر اللام امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ واجب ہے۔

باقی حجۃ الوداع کی تفصیل کے لئے احقر کی نصر الباری کتاب المغازی ص۴۷۲ ملاحظہ فرمایئے۔

باب ۵۲ العلمُ قبل القولِ والعملِ لقولِ اللّٰہ عزّ وجلّ "فاعلم انّہ لا الٰہ الّا اللّٰہ" فبدأ بالعلمِ وانّ العلماءَ ھم ورثۃ الانبیاءِ ورّثوا العلمَ مَن اخذہ اَخذَ بحظٍّ وافرٍ ومَن سَلکَ طریقاً یطلبُ بہ علماً سھّلَ اللّٰہ لہ طریقاً الی الجنّۃِ، وقال " اِنّما یخشی اللّٰہَ مِن عبادِہِ العلماءُ، وقال وَ ما یعقِلُھا الّا العالمون وقال وقالوا لوکُنّا نسمعُ اونعقِلُ ماکنّا فی اصحٰبِ السّعیرِ وقال ھل یستوِی الذین یعلمونَ والذین لا یعلمونَ وقال النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مَن یُرِدِ اللّٰہ بہٖ خیراً یُفقِّھْہُ فی الدین، وانّما العلم بالتّعلّم وقال ابوذرٍّ لو وضعتُم الصّمصامۃَ علی ھذہٖ واشارالی قفاہُ ثمّ ظننتُ انّی اُنفِذُ کلمۃً سمِعتُھا من النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قبلَ اَن تُجیزوا علیَّ لَانفذتُھا وقولِ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیُبلّغِ الشّاھدُ الغائبَ وقال ابنُ عباسٍ کونوا ربّانیین حکماء فقھاءَ علماءَ ویقال الرّبّانیُّ الذی یُربّی النّاسَ بصِغارِ

العِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ ●

بَابٌ (بالتنوین) علم (عقلاً و شرعاً) مقدم ہے قول اور عمل پر اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سورۂ محمد میں) آپ جان لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے (دیکھئے) اللہ نے علم کو پہلے بیان کیا اور (حدیث میں ہے) علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور پیغمبروں نے علم (ہی) کا ترکہ چھوڑا ہے، پھر جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حصّہ (اس ترکہ کا) لیا اور (حدیث میں ہے) جو شخص کسی راستے پر علم حاصل کرنے کے لئے چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے، اور اللہ نے فرمایا (سورۂ فاطر میں) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہیں، اور فرمایا (سورۂ عنکبوت میں) ان مثالوں کو عالموں کے سوا کوئی نہیں سمجھتا، اور فرمایا (سورۂ ملک میں) وہ دوزخی کہیں گے اگر ہم پیغمبروں کی بات سنتے یا عقل رکھتے ہوتے تو (آج) دوزخیوں میں نہ ہوتے، اور فرمایا (سورہ زمر میں) کیا اہل علم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عنایت فرما دیتا ہے اور علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے۔

اور حضرت ابوذرؓ کا ارشاد ہے "اگر تم اس پر تلوار رکھدو اور اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا اور مجھے امید ہو کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ایک کلمہ سنا ہے گردن کٹنے سے پہلے بیان کر سکوں گا تو یقیناً میں اسے بیان کر دوں گا، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "حاضرین مجلس کو چاہئے کہ وہ (میری بات) غائب کو پہونچا دے، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا آیت کریمہ کونوا ربّانیین کی تفسیر میں حکماء، فقہاء، علماء مراد ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ ربّانی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل سمجھا کر لوگوں کی (علمی) تربیت کرے۔

تشریح امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمۃ الباب سے یہ بتلانا ہے کہ علم بالذات قول وعمل پر مقدم ہے تمام اعمال واقوال علم ہی پر مبنی ہیں کیونکہ قول وعمل کی صحت و درستگی علم پر موقوف ہے " جب جانتا ہی نہیں تو کیسے کوئی بات کہیگا؟ اور کس طرح عمل کریگا، نیز بلحاظ شرف و مرتبہ بھی علم کو فوقیت ہے عمل پر کیونکہ علم قلب کا عمل ہے جو اشرف اعضاء بدن ہے اور عمل و قول کا تعلق جو اعضاء بدن (یعنی ہاتھ، پاؤں اور زبان) سے ہے بہ نسبت قلب کے مفضول ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی مثال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شخص جا رہا ہے اور دوسرے ایک چلنے والے کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ شیر ہے تو ہرگز اس کی طرف قدم نہیں بڑھیگا، بلکہ الٹے پاؤں بھاگے گا اگرچہ وہ حقیقت میں بیل گائے ہی ہو، اور اگر اس نے اس کو بیل سمجھا تو وہ بے خوف چلا جائیگا اگرچہ وہ واقع میں شیر ہی ہو۔ معلوم ہوا کہ عمل کا مدار علم پر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں رکھی ہیں ایک کسی چیز کے جاننے کی دوسری اس بات کے کرنے کی،

پہلے انسان علم حاصل کرتا ہے، پھر رغبت یا احتراز وخوف پیدا ہوتا ہے، پھر رغبت یا نفرت سے ارادہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے بعدہ ارادہ قدرت کو متحرک کرتا ہے بعدہ استعمال قدرت سے عمل وجود میں آتا ہے معلوم ہوا کہ عمل علم پر متفرع ہے۔

اثبات ترجمہ کے لئے امام بخاریؒ نے سب سے پہلے سفیان بن عیینہ کا استدلال نقل کیا کہ ارشاد خداوندی ہے فاعلم انہ لا الہ الا اللہ واستغفر لذنبک الآیۃ اس آیت کریمہ میں علم اور عمل دونوں کا ذکر ہے مگر پہلے علم ہے یعنی فاعلم انہ لا الہ الا اللہ اس کے بعد فرماتے ہیں واستغفر لذنبک یہ عمل ہے کہ استغفار کرو۔

ان العلماء ہم ورثۃ الانبیاء ورّثوا العلم بتشدید الراء المفتوحۃ ای الانبیاء، یعنی نبیوں نے علم ہی کا ترکہ چھوڑا ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھماً ورثوا العلم ۔ الحدیث (ابوداؤد کتاب العلم)

یعنی انبیاء نے دراہم ودنانیر یعنی دنیاوی مال ودولت کا وارث نہیں بنایا ہے بلکہ علم کا وارث بنایا ہے۔

دنیا میں کمال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک علمی، دوسرا عملی۔ نبی میں علمی وعملی دونوں قوتیں اتنی کامل ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا مگر چونکہ نبوت من حیث النبوۃ کمالاتِ علمیہ میں سے ہے کیونکہ نبی کے لغوی معنی ہیں خبر دینے والا، اور اصطلاحًا اخبار الہیہ دینے والے کو نبی کہا جاتا ہے، پس اگر اسے اخبار الہیہ کا علم ہی نہیں تو دوسروں کو کیسے خبر دیگا؟ لہٰذا علم کو خصوصی طور پر وراثتِ انبیاء قرار دیا۔

واضح رہے کہ علماء صرف وہ ہیں جنھیں قرآن وحدیث عالم کہے ورنہ بہت سے لوگ علم ہوتے ہوئے بھی گمراہ ہیں، کما قال اللہ تعالیٰ واضلہ اللہ علی علم (سورہ جاثیہ)

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء یہ کلمہ حصر کا ہے ترجمہ ہوگا اللہ تعالیٰ سے اس کے صرف وہی بندے ڈرتے ہیں جو علماء ہیں، اس کو اس طرح سمجھو کہ ایک بادشاہ سفر کرتے ہوئے کسی گاؤں میں پہونچ گیا تو شاہی رعب وہیبت اس شخص پر مؤثر ہوگی اور وہی شخص بادشاہ کی شایانِ شان تعظیم کے لئے مستعد ہوگا جس کو علم ہوجائے کہ یہ بادشاہ ہے، جس کو یہ علم نہیں وہ تو ایک آدمی سمجھے گا اور کچھ پرواہ نہ کرے گا۔ اسی طرح اللہ کی مرضیات وغیر مرضیات کا علم اگر صحیح ہوگا تو عمل بھی صحیح اور درست ہوگا۔

وما یعقلہا الا العالمون یہاں ضمیر "ھا" راجع ہے امثال کی طرف یعنی قرآن حکیم میں جگہ جگہ مثالیں دی گئی ہیں ان مثالوں کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

قالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر دوزخی کہیں گے ہم اگر پیغمبروں کی بات سنتے یا عقل رکھتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے، انسان کے لئے علم حاصل کرنے کی یہی دو صورتیں ہیں کہ یا تو خود سمجھتا ہو یا پھر دوسرے کی سنے، علم حاصل کرنے کے ان ہی دو طریق کی طرف اشارہ ہے:

ان فی ذٰلک لذکریٰ لمن کان لہ قلب بے شک اس میں اس کے لئے عبرت ہے جس کے پہلو میں

او القی السمع وھو شھید۔ (سورۂ ق) دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر کان لگا دیتا ہو۔

سمع و تعقل سے کام نہ لینے والے خود اعتراف کریں گے کہ دخول نار کا سبب علم نہ ہونا ہے۔

فاعترفوا بذنبھم فسحقا لاصحٰب السعیر۔ (سورۂ ملک) سو قائل ہو گئے اپنے گناہ کے اب تو اہل دوزخ دفع ہوں" یعنی اب جوارِ رحمت میں ان کے لئے کہیں ٹھکانہ نہیں۔

امام بخاریؒ نے اس سے یہ نکالا کہ مدارِ نجات علم ہی پر موقوف ہے۔

وانما العلم بالتعلم علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ یہاں تو تعلّم بفتح العین وتشدید اللام ہے لیکن بعض نسخوں میں بالتعلیم ہے۔ یعنی قابل اعتماد و معتبر علم وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام سے بذریعۂ تعلیم و تعلّم ماخوذ ہو۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کا اطلاق صرف علم شریعت پر ہوگا اس لئے اگر کوئی شخص وصیت کر جائے کہ میرے مال سے علماء کی امداد کی جائے تو اس کا مصرف صرف اصحاب حدیث و تفسیر و فقہ ہوں گے۔ (عمدہ ج ۲ ص ۴۲)

قال ابو ذرؓ اس کا قصہ یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ شام میں رہتے تھے، اس وقت حضرت امیر معاویہؓ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے شام کے والی تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ زاہد تھے اور حضرت معاویہؓ منتظم آیت کریمہ والذین یکنزون الذھب والفضۃ کی تفسیر میں اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابوذرؓ مالداروں سے فرماتے تھے کہ مال و دولت جمع کرنا درست نہیں، حضرت امیر معاویہؓ نے اس اندیشہ سے کہ یہ مسئلہ بڑھ کر عوام میں انتشار کا باعث نہ بن جائے، خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ انہیں شام سے بلا لیجئے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے مدینہ بلا کر خاص اس مسئلہ میں فتویٰ دینے سے منع کر دیا اور بمقتضائے مصالح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذرؓ سے ربذہ میں مقیم ہونے کی خواہش ظاہر کی یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ مدینہ چھوڑ کر ربذہ میں مقیم ہو گئے اور وہیں ان کا وصال ہوا۔

اسی اثناء میں حضرت ابوذرؓ حج کو تشریف لائے تو منیٰ میں لوگ ان سے مسائل دریافت کر رہے تھے اور یہ فتویٰ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے کہا کہ آپ کو تو امیر المومنین نے فتویٰ دینے سے منع کر دیا ہے، اور آپ فتویٰ دے رہے ہیں؟ چونکہ اس کا اعتراض غلط تھا اس لئے حضرت ابوذرؓ نے بگڑ کر جواب دیا کہ "اگر میری گردن پر شمشیر براں بھی رکھدی جائے اور مجھے موقع ملے تو میں حدیث نبی ضرور سنا دوں گا"

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صرف ایک خاص مسئلہ میں جو ان کی اجتہادی رائے تھی انہیں منع کیا گیا تھا اور یہ معاملہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا تھا اس لئے انہیں بتانے کا حق تھا اور کسی کو روکنے کا حق نہیں تھا اس لئے حضرت ابوذرؓ کا جواب بھی تلخ تھا، دشمنانِ عثمانؓ نے اس واقعہ کو بہت اچھالا اور ابوذرؓ کو مقابل کرنا چاہا لیکن وہ بہر حال صحابی تھے اور اطاعتِ امیر کو واجب سمجھتے تھے اس لئے اس خاص مسئلہ میں اطاعتِ امیر کا حق ادا کیا اور حدیث بتانے میں حدیثِ پاک کا حق ادا کیا۔

کونوا ربانیین حکماء فقہاء علماء ربانی اصل میں رب کی طرف منسوب ہے، الف اور نون مزید مبالغہ کے لئے زیادہ کر دیتے ہیں اس لئے ربّانی ہوگیا، اسی کی جمع ربانیین ہے۔ یعنی اللہ والے بن جاؤ۔
ربانی کس کو کہتے ہیں؟ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جس میں تین چیزیں جمع ہوں علم، فقہ، حکمت۔ علم کے معنی تو ظاہر ہیں کسی چیز کو جاننا، اور تفقہ کے معنی ہیں خوب سمجھنا یعنی عمیق علم ہو محض سطحی نہیں۔ اور حکمت کے معنی ہیں وضع الشیئ فی محلہ یعنی ہر چیز کو اس کے موضع اور محل میں رکھنا۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور قوتوں کا صحیح استعمال کرنا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے قوتِ سماع مرحمت فرمائی اسے اگر فلمی گانے سننے میں صرف کرے تو یہ بے موقع صرف کرنا ہوگا، غرض حکمت ایک نور بصیرت ہے جس کے ذریعہ سے ہر چیز کو اپنے موقع پر رکھنے کا شعور حاصل ہوتا ہے اور بے موقع استعمال سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اس معنی میں تمام دانائی کی باتیں شامل ہیں، بعض مفسرین (ابن کثیرؒ وغیرہ) نے حکمت سے سنّت مراد لی ہے وہ بھی درست ہے کیونکہ سنت کا کام ہی ہے ہر چیز کا موقع و محل بتانا، مثلاً جب یہ آیت نازل ہوئی فسبح باسم ربك العظيم تو آپؐ نے فرمایا اجعلوها فی رکوعکم۔ اور جب آیت آئی سبح اسم ربك الاعلى تو آپؐ نے فرمایا اجعلوها فی سجودکم تو ہر آیت کا محل و موقع بتانا سب حکمت ہے۔ حکمت کا مادّہ ح، ک، م ہے لغت میں اس کے معنی اصلاح کی غرض سے روکنے کے ہیں، چنانچہ اہلِ عرب بولتے ہیں حکمتُ الدّابۃَ میں نے جانور کو لگام لگائی، پس حکمت گویا عقل کی لگام ہے، عقل کو قابو میں رکھتی ہے کہ بے قابو ہو کر کام نہ کرے، اللہ تعالیٰ کو حکیم اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی کام بے محل، بے موقع اور خلاف مصلحت ہو ہی نہیں سکتا۔

ویقال الربانی الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ دراصل یہ بھی پہلی تفسیر جو حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی گئی ہے الگ نہیں ہے، ان حضرات نے رب کو بمعنی مربّی (تربیت کرنے والا) لیا ہے اور تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو بتدریج حدِ کمال تک پہونچانا، جیسے بچے کی تربیت اس کے مرتبہ اور عمر کے لحاظ سے۔ اسی طرح عالم ربانی وہ ہے جو لوگوں کی اس طرح تربیت کرے کہ پہلے دین کی چھوٹی چھوٹی باتیں بتائے پھر بڑے علوم۔ اس کا مآل بھی یہی ہے کہ موقع و محل پر رکھے، حکیم یہ دیکھتا ہے کہ کہاں تک اسے فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنے علوم کے اعتبار سے ادق تقریر کرے، تو پہلے عادت ڈالتے ہیں جیسے بچوں کو پہلے قواعد بغدادی پڑھاتے ہیں پھر بتدریج ترقی کراتے ہیں۔
یہ حکمت و دانش کے خلاف ہے کہ ہدایۃ النحو میں شرح جامی کی تقریر کرنے لگیں اور مرقات پڑھانے میں سلّم وملاحسن کی تقریر۔ حکمت و دانائی یہ ہے کہ کلّموا الناس علیٰ قدر عقولہم۔

باب ۵۳ ما كان النبى صلى الله عليه وسلم يتخولهم بالموعظة والعلم كى لا ينفروا

باب:- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وعظ اور تعلیم میں صحابہ کرامؓ (کے اوقات و احوال) کی رعایت فرماتے

سے تاکہ وہ متنفر نہ ہو جائیں۔

ربط ما قبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: وجه المناسبة بين البابين من حيث ان المذكور في الباب الاول هو العلم والمذكور في هذا الباب هو التخول بالعلم۔

۶۷ ● حدثنا محمد بن يوسف قال انا سفيان عن الاعمش عن ابي وائل عن ابن مسعود قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بالموعظة في الايام كراهة السآمة علينا ●

۶۸ ● حدثنا محمد بن بشار قال ثنا يحيى بن سعيد قال ثنا شعبة قال حدثني ابو التياح عن انس عن النبي صلى الله عليه وسلم قال يسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا ●

ترجمہ حدیث ۶۷ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نصیحت فرمانے میں دنوں کا لحاظ فرماتے تھے اس وجہ سے کہ آپ اس کو برا سمجھتے تھے کہ ہم اکتا جائیں۔

تعدد الحدیث:- والحدیث هنا فی العلم ص۱۶ وسیاتی فی باب التصل ص۱۶ وفی الدعوات ص۹۴۹۔

ترجمہ حدیث ۶۸ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (لوگوں پر) آسانی کرو سختی مت کرو، خوشخبری دو، نفرت نہ دلاؤ۔

تعدد الحدیث:- اخرجه البخاریؒ هنا ص۱۶ وایضا فی الادب ص۹۰۴۔

مطابقۃ الحدیث ترجمۃ الباب کے دو جزء ہیں، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں" والباب مترجم بترجمتين احدهما بالموعظة والأخرى كي لاينفروا امام بخاریؒ باب کے تحت دو حدیثیں لائے، پہلی حدیث جزء اول یعنی موعظۃ کے اور دوسری جزء ثانی کے مطابق ہے

تشریح یتخولنا بالموعظۃ تخول کے معنی ہیں نگہبانی کرنا، دیکھ بھال کرنا یعنی تقریر و وعظ بھی اتنا طول و طویل نہ کرنا چاہئے کہ لوگ اکتا جائیں، البتہ یہ اکتانا صرف ان حضرات کا معتبر ہے جو دیندار ہیں دینی ذوق رکھتے ہیں۔

سآمۃ طول ہونا، اکتا جانا، بڑے سے بڑا عالم بھی اگر روزانہ وعظ کہے تو لوگ اکتا کر بددل ہو جائیں گے۔ غرضیکہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ میں خصوصاً نہی عن المنکر میں تشدید نہ ہو بلکہ ملاطفت سے کام لیا جائے۔ فرعون کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیگا اس کے باوجود حضرت موسیٰ و ہارون علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوتا ہے:- فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى (سورۂ طٰہٰ)

بدعات و رسوم کی اصلاح میں بھی حکمت سے کام لینا چاہئے۔ ارشاد ربانی ہے: ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن (سورۂ نحل)

تشدد عموماً مضر پڑتا ہے۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں "میں نے اپنے اکابر سے بارہا سنا غالباً حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ملفوظات میں بھی دیکھا ہے کہ ایک دیہاتی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت ہوا، آپ نے زنا، چوری اور جھوٹ وغیرہ سے توبہ کروائی اس نے کہا یہ کام تو میں پہلے بھی نہ کرتا تھا آپ نے افیون سے تو توبہ کروائی نہیں، فرمایا کتنی کھایا کرتے ہو؟ اس نے کچھ مقدار بتلائی، فرمایا اس سے آدھی کھایا کرو وہ گھر چلا گیا۔ گھر جا کر خیال کیا کہ اگر یہ اچھی چیز ہوتی تو حضرت آدھی کا حکم کیوں دیتے؟ بس جب بُری ہے تو آدھی بھی بُری ہے بالکل چھوڑ دی، اسہال (دست) شروع ہو گئے یہاں تک کہ حیات سے مایوس ہو گیا، اطباء نے افیون کھانے کو کہا لیکن انکار کیا، تندرست ہوا تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے پہچانا نہیں (غالباً حضرت کی بینائی جا چکی تھی یا کمزور ہو گئی تھی) کہنے لگا حضرت نے یہاں نہیں پہچانا تو پلصراط پر کیسے پہچانیں گے، بتلایا کہ میں افیون والا مرید ہوں، اور تمام قصہ سنایا، جاتے وقت دو روپے بطور نذرانہ پیش کئے آپ نے لے لئے کہا کہ آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ روپے کیسے ہیں؟ یہ افیون کے روپے ہیں، میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ نے جو افیون چھڑائی ہے اس پر خرچ ہونے والی رقم آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

تنبیہ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیں کہ ملاطفت کی غرض سے کسی بدعت یا گناہ کے ارتکاب کی گنجائش ہے یا کسی کو کسی گناہ کی اجازت دیجا سکتی ہے، کسی مصلحت کی بنا پر نہ خود کوئی گناہ کرنا جائز ہے اور نہ دوسرے کو اجازت دینے کی گنجائش ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی اجازت تداوی بالمحرم بلکہ اکلِ مضطر کے قبیل سے تھی۔

غرضیکہ ملاطفت کے پیش نظر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اگر موقعہ مناسب نہ ہو تو سکوت اختیار کرے اس کی ہرگز اجازت نہیں کہ خود گناہ یا بدعت میں شریک ہو جائے یا کسی کے سوال پر اسکی اجازت دیدے۔

(ارشاد القاری)

بابٌ [۵۴] مَن جَعَلَ لِأَهلِ العِلمِ أَيَّامًا مَّعلُومَةً ص [۱۶]

اس شخص کے بیان میں جو علم (سیکھنے) والوں کے لئے کچھ دن مقرر کردے۔

ربط گذشتہ باب میں تخول کا ذکر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و موعظۃ میں صحابہ رضی کے اوقات واحوال، نشاط و ملال کا لحاظ فرمایا کرتے تھے۔

یہ باب باب سابق کا تکملہ ہے کیونکہ اس باب کا مقصد بھی یہی ہے کہ ملال نہ پیدا ہو جائے۔

اس باب سے امام بخاریؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تعلیمی انتظام کی غرض سے ایام کی تعیین اور اوقات مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ علم ایک عظیم الشان چیز ہے اس کے لئے اہتمام و انتظام کی ضرورت ہے اس لئے ایام اور اوقات کی تعیین کر دی جائے تاکہ معلم اور متعلم دونوں اضاعتِ وقت

سے بچ سکیں اگر تعیین نہیں کی گئی تو ایسی صورت بھی ہو جائیگی کہ معلّم (استاذ) آگئے اور شاگرد غائب، یا شاگرد موجود اور استاذ غائب، اس لئے ایام و اوقات کی تعیین بدعت نہیں بلکہ انتظامی معاملہ ہے۔

بدعت کی تعریف یہ تعیین یوم بدعت نہیں کیونکہ بدعت کی تعریف ہے غیر دین کو دین میں داخل کرنا۔ کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ہذا مالیس منہ فہو رد۔ پس تعیین وہ منع ہے جسے موجب ثواب یا باعثِ زیادۂ ثواب سمجھا جائے، کما قال صلی اللہ علیہ وسلم لا تختصوا لیلۃ الجمعۃ بقیام من بین اللیالی ولا تخصوا یوم الجمعۃ بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومہ احدکم۔ (مسلم ج ۱ ص ۳۶۱) لہٰذا میلاد مروّج کی قیود سب بدعت ہیں اور جلسے وغیرہ کی تاریخ متعین کرنا بدعت نہیں کیونکہ اس سے مقصد صرف انتظام ہے اس متعین تاریخ میں زیادہ ثواب کا عقیدہ نہیں ہوتا۔ (ارشاد القاری)

۶۹ ● حدثنا عثمانُ بنُ ابی شَیْبَۃَ قال ثنا جریرٌ عن منصورٍ عن ابی وائلٍ قال کان عبدُ اللہ یُذَکِّرُ النّاسَ فی کلِّ خمیسٍ فقال لہ رجلٌ یا ابا عبدِ الرحمٰن لَوَدِدْتُ انّک ذکّرتنا کلَّ یومٍ قال اَمَا انّہ یَمْنَعُنی مِن ذٰلک انّی اَکرہُ اَن اُمِلَّکم وانّی اَتَخَوَّلُکم بالمَوعظۃِ کما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخوّلنا بہا مخافۃَ السّاٰمۃِ علینا ●

ترجمہ ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ سنایا کرتے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا اے ابو عبدالرحمان (کنیت عبداللہ بن مسعودؓ) میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کریں۔ انہوں نے فرمایا، سن لو مجھے اس فعل سے یہ چیز روکتی ہے کہ میں تمہیں تنگ دل اور ملول کرنا پسند نہیں کرتا اور میں وعظ کے لئے تمہاری نگہداشت رکھتا ہوں، جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اندیشہ سے کہ ہم ملول خاطر نہ ہو جائیں ہماری نگہداشت فرمایا کرتے تھے۔

مطابقتہ للترجمۃ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے یذکر الناس فی کل خمیس۔ اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے استدلال کیا ہے اس لئے امام بخاریؒ پر یہ اعتراض بھی وارد نہ ہوگا کہ موقوف حدیث لائے ہیں۔

تعدد الحدیث:- والحدیث ھنا ص ۱۶ و ثانی ص ۹۴۹۔

حدیث کا متن واضح ہے، گذشتہ باب کا مطالعہ فرما لیجئے۔

بابٌ مَن یُرِدِ اللہُ بہٖ خیرًا یُفَقِّھْہُ فِی الدّینِ ص ۱۶

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

ربط وجہ المناسبة بين البابين من حيث ان المذكور فى الباب الاول شان من يذكر الناس فى امور دينهم ببيان ماينفعهم وما يضرهم وليس هذا الا شان الفقيه فى الدين والمذكور فى هذا الباب هو مدح هذا الفقيه وكيف لا يكون ممدوحا وقد اراد الله به خيرا حيث جعله فقيها فى دينه عالما باحكام شرعه ۔ (عمدة القارى ج ۲ ص ۴۸)

۷ ● حدثنا سعيدُ بنُ عُفيرٍ قال ثنا ابنُ وهبٍ عن يونسَ عن ابنِ شهابٍ قال قال حُميدُ بنُ عبدِ الرحمٰنِ سمعتُ معاويةَ خطيباً يقولُ سمعتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يقولُ مَن يُّرِدِ اللهُ بهٖ خيراً يُّفَقِّهْهُ فى الدِّينِ، وَاِنَّمَا انَا قاسمٌ واللهُ يُعطِى، ولن تزالَ هٰذهِ الأُمّةُ قائمةً على أمرِ اللهِ لا يضرُّهم من خالفهم حتّٰى يأتِيَ أمرُ اللهِ ●

ترجمہ حمید بن عبد الرحمٰن کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ خطبہ کے دوران فرمارہے تھے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین کی سمجھ عنایت فرمادیتے ہیں اور میں تو محض تقسیم کرنے والا ہوں دینے والا تو اللہ ہے اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی جو شخص ان کی مخالفت کریگا انہیں نقصان نہیں پہنچا سکیگا یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔

مطابقته للترجمة :۔ حدیث کی مطابقت ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ ترجمۃ الباب حدیث ہی کا ٹکڑا ہے۔

تعدد الحدیث والحديث هنا فى العلم ص ۱۶ ويأتى فى الخمس ص ۴۳۹ وفى كتاب المناقب ص ۵۱۴ الطرف الاخر فقط وفى الاعتصام ص ۱۰۸۷ وفى التوحيد ص ۱۱۱۱ ۔

تشریح اس حدیث سے علم کی فضیلت اور تفقہ فی الدین کی عظمت معلوم ہوتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کو تفقہ فی الدین حاصل ہو جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔

خیراً میں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے خیر عظیم کا فیصلہ فرمادیا، یہ محض عطائے خداوندی ہے جو انتہائی قابل قدر اور لائق شکر ہے۔

اشکال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حقیقۃً نہ قاسم ہیں نہ معطی، اور مجازاً آپ قاسم بھی ہیں اور معطی بھی تو یہ تفریق کیسے صحیح ہوئی۔

جواب :۔ حقیقۃً اگرچہ معطی و قاسم میں کچھ فرق نہیں مگر عرفاً دونوں میں یہ فرق ہے کہ مالک کو معطی اور خازن کو قاسم کہا جاتا ہے جو معطی اور معطی لہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔

اس حدیث کو کتاب العلم میں لانے سے ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف علوم شرعیہ کے قاسم ہیں نہ کہ جملہ اشیاء کے، پس اہل بدعت کا حضور اکرمؐ کو قاسم مطلق کہنا صحیح نہیں۔

لن تزال ھذہ الامۃ قائمۃ علی امر اللہ یہ مطلب نہیں کہ امت میں سے کوئی بھی گمراہ نہ ہوگا۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جیسے امم سابقہ کُل کی کل گمراہ ہوگئیں اس طرح یہ پوری امت گمراہ نہ ہوگی۔

چنانچہ دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین الخ (بخاری ص۱۰۸۱)

ایک روایت میں ہے لایزال امتی قوم ظاھرین علی الناس۔ (بخاری ص۱۱۱۱)

طائفہ علی الحق سے کونسی جماعت مراد ہے

محدثین، فقہاء اور حضرات مجاہدین رحمہم اللہ میں سے ہر طائفہ اپنے کو اس کا مصداق بتاتا ہے۔

امام بخاریؒ کے نزدیک طائفۃ علی الحق سے مراد اہل علم ہیں جیسا کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث پر ترجمۃ الباب میں تصریح کی ہے "ھم اھل العلم" (بخاری ص۱۰۸۸)

مگر ظاہر یہ ہے کہ اس سے مجاہدین کا طائفہ مراد ہے کیونکہ دوسری حدیث میں تصریح ہے یقاتلون علی الحق (حق کی خاطر قتال کرتے رہیں گے)۔

سب سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اسے عام رکھا جائے، ہر وہ طائفہ مراد ہے جس کے عقائد قرآن وحدیث کے مطابق ہوں خواہ محدثین ہوں یا فقہاء ہوں یا صوفیاء؟ اور یقاتلون میں قتال عام ہے خواہ بالسنان ہو یا باللسان؟

لایضرھم من خالفھم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہلِ حق کو کوئی تکلیف نہیں پہونچا سکیگا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کو ان کے دین سے کوئی نہ ہٹا سکے گا اور مجموعی طور پر دلیل کی رو سے ان پر اہلِ باطل کو غلبہ نہ ہوگا۔ (ارشاد القاری)

حتی یاتی امر اللہ بعض روایتوں میں حتی تقوم الساعۃ آیا ہے اس سے مراد قرب قیامت ہے، اس وقت ایک ہوا یمن کی طرف سے چلے گی اور جملہ مؤمنین کی روح قبض کرلے گی پھر اس وقت کوئی مؤمن نہ رہے گا اور اس کے بعد قیامت آجائے گی۔

باب ۵۶ الفھم فی العلم ص۱۶

علمی سمجھ کا بیان۔

ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وجہ المناسبۃ بین البابین من حیث ان الفھم فی العلم داخل فی قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام "من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین"؛ حاصل یہ ہے کہ باب سابق میں تفقہ فی الدین کا ذکر تھا اور تفقہ کے معنی فہم فی العلم کے ہیں گویا یہ ترجمہ شارحہ ہے۔

۷۱ ● حدثنا علی بن عبد اللہ قال ثنا سفیان قال قال لی ابن ابی نجیح عن

مجاهدٍ قال صحبتُ ابنَ عُمرَ الی المدینۃ فلم اَسْمَعْہُ یُحَدِّثُ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِلّا حدیثاً واحداً قال کنّا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاُتِیَ بِجُمَّارٍ فقال اِنَّ مِنَ الشجرِ شجرۃً مَثَلُہا کَمَثَلِ المسلم فاَرَدتُ اَن اقولَ ھِیَ النخلۃُ فاِذا اَنا اَصْغَرُ القومِ فسکتُّ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھِیَ النخلۃُ ●

ترجمہ مجاہدؒ کا بیان ہے کہ میں مدینہ تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ رہا مگر بجز ایک حدیث کے اور کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہوئے نہیں سنا، انہوں نے فرمایا ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (بیٹھے) تھے، اتنے میں آپؐ کے پاس کھجور کا جمّار (کھجور کا گوند) لایا گیا اس پر آپؐ نے فرمایا درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے جس کی مثال مسلمان کی سی ہے (حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ) میرا ارادہ ہوا کہ میں عرض کردوں وہ کھجور کا درخت ہے، پھر میں نے دیکھا تو سب لوگوں میں میں ہی کم سن تھا (بزرگوں کو دیکھ کر شرم سے) میں خاموش رہا آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے واضح ہے کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے حاضرین مجلس کے سامنے ایک سوال رکھا تو حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں "فاردتُ اَن اقول ھی النخلۃ" اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ سمجھ گئے، یہ ابن عمرؓ کا فہم فی العلم ہے اگرچہ اپنی کم سنی دیکھ کر بزرگوں کے ادب و احترام کے باعث خاموش رہے۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری فی کتاب العلم صـ۱۵ ایضاً صـ۱۴ ایضاً صـ۱۶ صـ۲۴ صـ۲۹۴ صـ۶۸۱ صـ۸۱۹ ایضاً صـ۸۱۹ صـ۹۰۴ ایضاً صـ۹۰۷ ملاحظہ ہو حدیث ۵۹۔

جُمّار بضم الجیم وتشدید المیم وہو شحم النخیل (عمدہ، قس) درختِ کھجور کا گوند جو چربی کی طرح سفید ہوتا ہے اس لئے اس گودے کو شحم النخیل کہتے ہیں، یہ شیریں ہوتا ہے نہایت مقوی اور امراض مردانہ میں نافع ہے، مگر یہ جمّار (گودا) نکالنے کے بعد درخت بے کار ہو جاتا ہے۔

باقی تشریح کے لئے ملاحظہ فرمایئے حدیث ۵۹۔

● **باب ۵۷** الاِغتباطِ فی العلمِ والحکمۃِ وقال عمرُ تفقّھوا قبلَ اَن تُسَوَّدوا وقال ابوعبدِاللہِ وبعدَ اَن تُسَوَّدوا وقد تعلّمَ اصحابُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعدَ کِبَرِ سِنِّھِم ● صـ۱۷

باب:۔ علم اور دانائی کی باتوں میں رشک کرنا، اور حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ سردار بننے سے پہلے علم حاصل کرلو، امام بخاریؒ نے فرمایا اور سردار بننے کے بعد بھی (علم حاصل کرو) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے اصحاب نے بڑھاپے میں علم حاصل کیا ہے۔

ربط ما قبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں " وجہ المناسبۃ بین البابین من حیث أن فی الباب الاول الفہم فی العلم وفی ھذا الباب الاغتباط فی العلم الا یخفی گذشتہ باب میں علمی سمجھ کا ذکر تھا جو عظیم نعمت ہے اور اس باب میں علم وحکمت میں غبطہ کا بیان ہے، اگر کسی انسان کے پاس یہ نعمت عظمیٰ ہے تو وہ قابل غبطہ ہے اس کو دیکھ کر ریس کرنی چاہئے اور حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس نعمت عظمیٰ سے مالا مال فرمائے آمین۔

۷۲ ● حدثنا الحمیدیؒ قال حدثنا سفیانؒ قال حدثنا اسمٰعیلؒ بن أبی خالد علی غیر ما حدثناہ الزھریؒ قال سمعت قیس بن أبی حازم قال سمعت عبد اللہ بن مسعودؓ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا حسد الا فی اثنتین رجل أتاہ اللہ مالاً فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق ورجل اٰتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (آدمیوں کی) خصلتوں پر کوئی رشک کرے تو ہو سکتا ہے، ایک تو اس پر جس کو اللہ نے دولت دی وہ اس کو نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے قرآن وحدیث کا علم دیا وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

مطابقتہ للترجمۃ حدیث پاک میں ہے لا حسد الا فی اثنتین الخ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں اغتباط فی العلم قائم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ حدیث باب حسد بمعنی غبطہ ہے۔

تعدد الحدیث والحدیث ھنا فی کتاب العلم صـ۱۷ ویاتی فی الزکوٰۃ طـ۱۸۱ وفی الاحکام صـ۱۰۵۱ وفی الاعتصام صـ۱۰۸۸۔

تشریح لا حسد الا کلمۃ لا لنفی الجنس وحسداً اسمہ مبنی علی الفتح وخبرہ محذوف ای لا حسد جائز او صالح او نحو ذالک۔

رجل یجوز فیہ الاوجہ الثلاثۃ من الاعراب الرفع علی تقدیر احدی الاثنتین خصلۃ رجل فلما حذف المضاف اکتسی المضاف الیہ اعرابہ، والنصب علی اضمار اعنی رجلاً وھی روایۃ ابن ماجۃ، والجر علی انہ بدل من اثنین واما علی روایۃ اثنتین بالتاء فھو بدل ایضا علی تقدیر حذف المضاف ای خصلۃ رجل لأن الاثنتین معناہ خصلتین۔ (عج)

الفرق بین الحسد والغبطۃ :۔ کسی کی علمی صلاحیت یا مال خوشحالی یا اور کوئی نعمت

وعظمت دیکھ کر اپنے لئے تمنا کرنا کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے یہ غبطہ ہے جس کا مفہوم رشک کرنا یا ریس کرنا ہے اس میں دوسرے کے زوال نعمت کی تمنا نہیں ہوتی اس لئے اشیاء محمودہ (مثلاً علمی صلاحیت علمی کمال وغیرہ) میں غبطہ جائز ہے بلکہ محمود اور مطلوب، کما فی التنزیل العظیم وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون (اور رغبت کرنے والوں کو چاہئے کہ ایسی چیز کی خواہش کریں) یہاں تنافس سے غبطہ ہی مراد ہے۔ اور اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت دی ہو اور دوسرا انسان یہ تمنا کرے کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے اور مجھے حاصل ہو جائے تو یہ حسد ہے، یعنی حسد میں زوالِ نعمت کی تمنا ہوتی ہے یہ ناجائز اور حرام ہے۔

وقال عمر تفقهوا قبل أن تسودوا اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ سردار بنائے جانے سے پہلے دین کا علم حاصل کرلو، کیونکہ سیادت کے بعد کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے میں حیا مانع ہوگی اور تحصیل علم سے محروم رہ جاؤگے اور جہالت کی وجہ سے بجائے اصلاح کے سب کو خراب کردوگے اور ضلوا فاضلوا کے مصداق ہوگے۔

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ سیادت یا کبرسنی کے بعد علم حاصل نہ کرنا چاہئے، اس لئے امام بخاریؒ نے بطور دفع دخل مقدر کے فرمایا وبعد أن تسودوا یعنی سردار بنائے جانے کے بعد بھی علم حاصل کرو علم کی پیاس کبھی نہیں بجھنی چاہئے آگے اس کا شاہد بھی پیش کردیا کہ صحابہ کرامؓ نے بڑے ہونے کے بعد علم حاصل کیا تھا۔

مشہور ہے کہ طالب علم مہد سے لحد تک طالب علم ہے، علم کے معاملے میں بڑے چھوٹے کا لحاظ نہ کرنے بلکہ چھوٹے بڑے ہم عمر اور ہمعصر ہر ایک سے فائدہ حاصل کرے۔

مدارس سے رسمی سند حاصل کرلینے سے عالم نہیں بن جاتا البتہ عالم بننے کی استعداد ہو جاتی ہے اس کے بعد جس قدر محنت و مطالعہ بڑھتا ہے اتنا ہی اپنا جہل کھلتا جاتا ہے۔ مثل ہے کہ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گذرے اس وقت تک وہ اپنے سے اونچا کسی کو نہیں سمجھتا۔

رجل آتاه الله مالاً فسلطه على هلكته في الحق ایک آدمی ہے جس کو اللہ نے مال و دولت دی پھر اس کو حق کے معاملے میں خرچ کرنے پر مسلط کردیا یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بے دریغ خرچ کرتا ہے۔

ورجل آتاه الله الحكمة فهو يقضي بها ويعلمها یہاں لفظ حکمت آیا ہے اور ص ۱۱۲۳ کی روایت میں لفظ قرآن آیا ہے، دونوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ فہم قرآن مراد ہے یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا فہم عطا فرمایا ہے اور وہ اپنے معاملہ میں اور دوسرے کے معاملہ میں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ تو تین چیزیں جمع ہوگئیں علم، عمل، اور تعلیم ایسے شخص کو عالم ملکوت میں کبیر کے لفظ سے مشرف کیا جاتا ہے۔ یہی بڑا عالم ہے

قال حدثنا سفيان قال حدثنا اسمٰعيل الخ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ حدیث اسمٰعیل بن ابی خالد نے ہم سے بیان کی مگر زہری کی سند سے یہ روایت نہیں بلکہ دوسری سند سے۔ مطلب یہ ہے کہ امام زہری کی سند سے یہ بھی روایت ہے مگر کچھ فرق ہے زہری تو روایت کرتے ہیں عن سالم عن ابيه عن النبي

صلی اللہ علیہ وسلم جو ص۱۲۳ پر آرہی ہے۔ اور یہ روایت اسماعیل بن ابی خالد کی ہے جو قیس بن ابی حازم عن عبد اللہ بن مسعود ہے۔

مقصد اس سند کے بتلانے سے یہ ہے کہ اسماعیل بن ابی خالد نے ہمیں جس طریقہ سے حدیث سنائی وہ امام زہری کی سند کے علاوہ ہے، اور یہ تنبیہ اس لئے فرمائی تاکہ کوئی مختلف سند دیکھ کر اضطراب کا شبہ نہ کرنے لگے۔

• **باب ۵۵** ماذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر الی الخضر وقولہ تبارک و تعالیٰ " ھل اتبعک علی ان تعلمنی الخ • ص۱۷

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضرؑ کے پاس دریا کے کنارے جانے کا بیان۔ اور اللہ تعالیٰ کا (سورۂ کہف میں) حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل کرنا کہ آپ کے ساتھ چلوں اس شرط پر کہ آپ مجھے تعلیم دیں۔

ربط ماقبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: وجہ المناسبۃ بین البابین ان المذکور فی الباب الاول ھو الاغتباط فی العلم وھذا الباب فی الترغیب فی احتمال المشقۃ فی طلب العلم الخ

خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ باب میں علم و حکمت میں غبطہ کا بیان تھا اور اس باب میں علم کی طلب کے لئے مشقت اٹھانے کی ترغیب ہے کیونکہ جو چیز قابل غبطہ ہوتی ہے اس کی تحصیل میں مشقت اٹھائی جاتی ہے۔

مقصد ترجمہ اس باب سے امام بخاریؒ کا مقصد کیا ہے؟ مختلف اقوال منقول ہیں:۔
حافظ عسقلانیؒ اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے لئے مشقت اٹھانے کی ترغیب ہے۔

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی رائے یہ ہے کہ اس باب سے علم حاصل کرنے کے لئے سفر کی ترغیب مقصود ہے۔ لیکن اشکال یہ ہے کہ صرف دو باب کے بعد طلب علم کے لئے مستقل طور پر ایک باب باب الخروج فی طلب العلم۔ لارہے ہیں اب اگر یہاں بھی سفر ہی کا جواز یا ترغیب مقصود ہو تو بلا وجہ تکرار ہوگا۔

اس اشکال سے بچنے کے لئے بعض مشائخؒ سے منقول ہے کہ یہاں دریائی سفر کا جواز یا ترغیب مقصود ہے اور اس کے بعد آنے والے باب "باب الخروج فی طلب العلم" سے خشکی کے سفر کی ترغیب یا مطلق سفر کی ترغیب مقصود ہے یعنی علم طلب کرنا چاہئے اگرچہ دریا کا سفر بھی کرنا پڑے۔

(۳) حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں قال ابو عبد اللہ الخ سے امام بخاریؒ نے فرمایا تھا کہ سردار ہونے کے بعد بھی علم حاصل کرو یعنی چھوٹی عمر میں اور بڑی عمر میں، سیادت سے قبل اور سیادت کے بعد ہر طرح ضروری ہے، وہاں صحابہ کرامؓ کے تعامل سے استشہاد کیا تھا۔ یہاں ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے سید العالم اور اعلم الناس ہونے کے باوجود طلب علم کے لئے سفر کیا اور

حضرت خضرؑ کے پاس علم کی طلب میں گئے۔

(۴) اس ترجمۃ الباب سے یہ بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ ابو داؤد شریف جلد اول کتاب الجہاد میں ایک روایت ہے لا یرکب البحر الا حاج او معتمر او غاز فی سبیل اللہ (الحدیث) اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں کے علاوہ دریائی سفر جائز نہیں اس لئے امام بخاریؒ نے اس کے عموم کو مقید کرنے یا اس سے مستثنیٰ کرنے یا روایت کے ضعف پر اشارہ کرکے رد کرنے کے لئے منعقد کیا۔

۷۳ ● حدثنا محمدُ بنُ غُرَیرٍ الزہریُّ قال حدثنا یعقوبُ بنُ ابراہیمَ قال ثنا ابی عن صالحٍ یعنی ابنَ کیسانَ عن ابنِ شہابٍ حدثہ اَنَّ عُبَیدَ اللہِ بنَ عبدِ اللہِ اخبرہ عن ابنِ عباسٍ اَنّہ تماریٰ ھو والحُرُّ بنُ قیسِ بنِ حِصنٍ الفَزاریُّ فی صاحبِ موسیٰ قال ابنُ عباسٍ ھو خضرٌ فمرّ بہما اُبَیُّ بنُ کعبٍ فدعاہُ ابنُ عباسٍ قال اِنّی تماریتُ اَنا وصاحبی ھٰذا فی صاحبِ موسیٰ الذی سألَ موسیٰ السبیلَ الیٰ لُقِیِّہٖ ھل سمعتَ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر شانَہ قال نعم سمعتُ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یقولُ بینما موسیٰ فی مَلَاٍ مِّن بنی اسرائیلَ اِذ جاءہ رجلٌ فقال ھل تعلم احداً اَعلمَ منکَ قال موسیٰ لا فاوحی اللہ الیٰ موسیٰ بلیٰ عبدُنا خضرٌ فسأل موسی السبیلَ الیہ فجعل اللہ لہ الحوتَ آیۃً وقیل لہ اِذا فقدتَ الحوتَ فارجِعْ فاِنّکَ ستلقاہُ فکان یتّبِعُ اثرَ الحوتِ فی البحر فقال لموسیٰ فتاہ اَرأیتَ اِذ اوینا اِلَی الصخرۃِ فاِنّی نسیتُ الحوتَ وما انسانیہُ اِلّا الشیطٰنُ اَن اَذکرہ قال ذٰلک ما کنّا نبغِ فارتدّا علیٰ آثارِہما قصصًا فوجدا خضِراً فکان مِن شانِہما ما قصّ اللہ تعالیٰ فی کتابہٖ ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ان سے (یعنی ابن عباسؓ سے) اور حر بن قیس بن حصنؓ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں اختلاف ہوا، ابن عباسؓ نے کہا کہ وہ خضرؑ تھے، اتنے میں ان دونوں کے پاس سے ابی ابن کعبؓ گذرے تو ابن عباسؓ نے ان کو بلایا اور کہا کہ میں اور میرے یہ رفیق حضرت موسیٰؑ کے اس ساتھی کے بارے میں بحث کر رہے ہیں جس سے ملاقات کے لئے حضرت موسیٰؑ نے راستہ طلب کیا تھا کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ذکر کرتے کچھ سنا ہے؟ انہوں نے کہا۔ ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک دن حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے موسیٰؑ سے پوچھا کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو آپ سے بھی زیادہ علم رکھتا ہو؟ موسیٰؑ نے کہا نہیں (یعنی

میں تو نہیں جانتا) تب اللہ نے موسیٰ ؑ کو وحی بھیجی کہ کیوں نہیں، ہمارا ایک بندہ خضر ؑ ہے (جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے) اس پر موسیٰ ؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ حضرؑ سے ملنے کی کیا صورت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی ان کے لئے نشانی مقرر کردی اور ان سے کہدیا گیا کہ جب تم اس مچھلی کو گم کردو تو واپس لوٹ جانا، یقین رکھو کہ قریب ہی تمہاری ان سے ملاقات ہوجائے گی پس موسیٰ ؑ (چلے اور) دریا میں مچھلی کی نشانی تلاش کرتے رہے، ان کے خادم (یوشع) نے ان سے کہا جب ہم صخرہ کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کا قصہ بیان کرنا بھول گیا تھا اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرتا، حضرت موسیٰ ؑ نے کہا ہم تو اسی جگہ کی تلاش میں تھے پھر دونوں اپنے پیروں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹے وہاں انہوں نے خضر ؑ کو پایا پھر ان کا وہی قصہ گذرا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاهرۃ لانها فی ذهاب موسیٰ علیہ السلام الی الخضر و رکوبہ البحر وسوالہ منہ الاتباع لاجل التعلیم والحدیث یبین ذٰلک کلہ۔ (عمدۃ)

تعدد الحدیث والحدیث هنا فی العلم ص۱۷ ایضا یاتی ص۱۷ وایضا ص۲۳ وفی الاجارات مختصراً ص۳۰۲ وفی الشروط ص۳۷۷ وفی بدء الخلق ص۴۶۳ وفی کتاب الانبیاء ص۴۸۱ ایضا ص۴۸۲ تا ص۴۸۳ وفی التفسیر ص۶۸۷ ایضا ص۶۸۸ وایضا ص۶۹۰ وفی کتاب الایمان والنذور ص۹۸۷ وفی التوحید ص۱۱۱۴۔

تشریح تمارٰی ای تجادل وتنازع۔ الحُر بن قیس الخ بضم الحاء المهملة وتشدید الراء وهو صحابیؓ۔ حضرت ابن عباسؓ اور حُر بن قیس رضی اللہ عنہما دونوں صحابی میں اس بات پر جھگڑا ہوا کہ فوجدا عبداً من عبادنا (سورۂ کہف) میں جس بندہ کا ذکر ہے وہ بندہ کون ہے؟ جس سے ملاقات کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے سفر کیا تھا؟ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خضر ؑ ہیں اور حُر بن قیسؓ کیا کہتے تھے اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا، لیکن اس اختلاف سے اتنی بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ حضرت خضر ؑ کے علاوہ اور کسی کے بارے میں کہتے ہوں گے۔ اس کا فیصلہ حضرت اُبی ابن کعبؓ نے کیا۔ یہی واقعہ اس حدیث میں مذکور ہے۔

امام بخاریؒ آگے ایک اور باب (باب ما یستحب للعالم اذا سئل الخ) کے تحت ص۲۳ میں یہی حدیث لائیں گے۔ جس میں سعید بن جبیر اور نوف بکالی دو تابعی کا اختلاف مذکور ہے، ان کا اختلاف اس بات میں تھا کہ حضرت خضر ؑ کے پاس جو موسیٰ گئے تھے وہ موسیٰ کون تھے؟ آیا موسیٰ بن عمران تھے جو بنی اسرائیل کے مشہور نبی ہیں جن پر تورات نازل ہوئی تھی؟ یا کوئی اور موسیٰ تھے؟ سعید بن جبیر کہتے تھے کہ یہ وہی موسیٰ کلیم اللہ صاحب تورات ہیں، نوف بکالی کہتے تھے کہ نہیں یہ موسیٰ بن میشا بن یوسف بن یعقوب علیہ السلام تھے، یہ دونوں واقعے صحیح ہیں کوئی تعارض نہیں۔

اس دوسرے جھگڑے کا فیصلہ حضرت ابن عباسؓ نے کیا تھا جیسا کہ آرہا ہے۔

یہ حدیث مختصر ہے، مفصل حدیث ص۲۳ میں آرہی ہے۔ خلاصہ اس حدیث کا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اور حضرت حر بن قیس رضی میں اختلاف چل رہا تھا کہ ابی ابن کعب ان کے پاس سے گذر رہے تھے کہ ابن عباس رضی نے انہیں بلایا اور کہا کہ ہمارا فیصلہ کر دیجئے ممکن ہے آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہو، ابی ابن کعب رضی نے بیان کیا کہ میں نے حضور ص کا یہ ارشاد سنا کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے اور عجیب عجیب علوم و مضامین بیان فرمائے، ان مضامین کو سنکر ایک شخص سوال کر بیٹھا کہ دنیا میں کوئی آپ سے زیادہ علم رکھنے والا ہے؟ موسیٰ ع نے فرمایا کہ میں کسی کو نہیں پاتا، اور یہ درست بھی تھا کہ اس وقت یقیناً وہ سب سے بڑھ کر اسرار شریعت اور احکام کے عالم تھے اور ان سے زیادہ حقائق و معارف الٰہیہ کا جاننے والا کوئی نہ تھا مگر موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اس لفظ کا نکلنا بارگاہ خداوندی میں پسند نہ آیا اسی پر گرفت ہوگئی، خدا کی مرضی یہ تھی کہ جواب کو حق تعالیٰ کے علم محیط پر محول کرتے مثلاً یہ کہدیتے کہ اللہ کے مقرب و مقبول بندے بہت سے ہیں سب کی خبر اسی کو ہے۔

چنانچہ حضرت جبرئیل ع وحی لیکر آگئے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ تمہیں کیا خبر کہ میرا علم کہاں کہاں تقسیم ہوا ہے، دیکھو میرا ایک بندہ خضر ع ہے جس کا علم تم سے زیادہ ہے حضرت موسیٰ ع نے درخواست کی کہ مجھے اس کا پورا نشان و پتہ بتا دیا جائے تاکہ میں جاکر علمی استفادہ کرسکوں، حکم ہوا کہ اس کی تلاش میں نکلو تو مچھلی بھون کر زنبیل میں رکھ لو جہاں یہ مچھلی گم ہوجائے بس وہیں وہ بندہ ملے گا۔

حضرت موسیٰ ع نے اسی ہدایت کے موافق اپنے خادم خاص یوشع بن نون علیہ السلام کو ہمراہ لیکر سفر شروع کردیا اور ان سے کہدیا کہ مچھلی کا خیال رکھنا میں برابر سفر کرتا رہوں گا تاآنکہ منزل مقصود (دو دریاؤں کے سنگم) پر پہونچ جاؤں خواہ اس میں کتنی ہی مدت لگ جائے۔

حضرت یوشع بن نون ع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم خاص تھے پھر ان کے رو برو پیغمبر اور ان کے بعد خلیفہ ہوئے۔ چنانچہ مجمع البحرین پر پہونچ کر ایک بڑے پتھر پر جس کے نیچے آب حیات کا چشمہ تھا حضرت موسیٰ ع سر رکھ کر سوگئے، حضرت یوشع بن نون بیٹھے ہوئے تھے کہ چشمہ کا کچھ پانی وضو کرتے وقت یا اور کسی طرح سے زنبیل میں پہونچ گیا، یوشع ع نے دیکھا کہ بھنی ہوئی مچھلی باذن اللہ زندہ ہوکر زنبیل سے نکل پڑی اور عجیب طریقہ سے دریا میں سرنگ سی بناتی چلی گئی وہاں پانی میں خدا کی قدرت سے ایک طاق سا کھلا رہ گیا، حضرت یوشع کو یہ ماجرا دیکھ کر تعجب ہوا ارادہ کیا کہ حضرت موسیٰ ع بیدار ہوں تو ان سے کہوں، حضرت موسیٰ ع جب بیدار ہوئے تو دونوں آگے چل پڑے اور یوشع ع حضرت موسیٰ ع سے مچھلی کے زندہ ہوکر دریا میں چلے جانے کا حال بتانا بھول گئے۔

روایات میں ہے کہ موسیٰ ع نے جب ان کو مچھلی کی خبر گیری کے لئے کہا تھا تو ان کی زبان سے نکل گیا تھا کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں، اسی لئے متنبہ کیا گیا کہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کو محض اپنے نفس پر

بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔

بہر حال دونوں بزرگ بقیہ دن اور پوری رات چلتے رہے، موسیٰؑ کو اب تک بھوک نہ لگی تھی اب صبح کے وقت بھوک کا احساس ہوا اور تھکن محسوس ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کو انہیں لوٹانا مقصود تھا، موسیٰؑ نے ناشتہ طلب کیا اس پر یوشعؑ کو خیال آیا اور فرمایا فانی نسیت الحوت وما انسانیہ الا الشیطان أن اذکرہ (کہف) ارے میں تو مچھلی کا قصہ آپ سے بتانا بھول ہی گیا اور شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے ذکر کرتا۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لوٹ چلو وہیں مقصود ہے چنانچہ الٹے پیروں واپس لوٹے اور جب اس مقام پر پہونچے تو دیکھا کہ مردِ خدا لیٹا ہوا ہے، موسیٰؑ نے سلام کیا انہوں نے جواب سلام کے بعد کہا کون؟ فرمایا موسیٰ ابن عمران، پھر جو واقعہ گذرا وہ مفصل آئیگا۔

تنبیہ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کہ نبی تھے یا رسول؟ ولی تھے یا فرشتہ؟ زندہ ہیں یا نہیں؟ پوری تفصیل احقر نے نصر الباری کتاب التفسیر میں ذکر کردی ہے۔ ملاحظہ ہو نصر الباری کتاب التفسیر سورۂ کہف ص ۳۹۰ تا ص ۳۹۳۔

باب ۵۰ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھم علمہ الکتاب ● ص ۱۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا (ابن عباسؓ کیلئے) یہ دعا کرنا "یا اللہ اس کو قرآن کا علم دے دے"

۷۴ ● حدثنا ابو معمر قال حدثنا عبد الوارث قال ثنا خالد عن عکرمۃ عن ابن عباس قال ضمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال اللّٰھم علمہ الکتاب ●

ترجمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو (اپنے سینے سے) چمٹایا اور دعا فرمائی یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرما۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا ص ۱۷ وفی کتاب الوضوء ص ۲۶ وفی مناقب ابن عباسؓ ص ۵۳۱ وفی الاعتصام ص ۱۰۸۰

ربط ماقبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "المناسبۃ بین البابین من حیث ان من جملۃ المذکور فی الباب الاول غلبۃ ابن عباسؓ علی حر بن قیس فی تماریہما الخ۔ (عینی ج ۲ ص ۶۵)

خلاصہ یہ ہے کہ باب سابق میں جو حدیث ہے اس میں یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰؑ کے متعلق ابن عباسؓ اور حر بن قیس رضی اللہ عنہما کے مباحثہ میں ابن عباسؓ کا غالب آنا ان کے علم وفضل کی کثرت کی وجہ سے تھا۔

اور اس باب میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ابن عباسؓ کے علم کی کثرت وفضیلت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی برکت سے تھی لہٰذا مناسبت واضح ہو گئی۔

مقصد ترجمہ: امام بخاریؒ کا مقصد علم اور حضرت ابن عباسؓ کی عظمت وفضیلت کے ساتھ یہ بتانا

ہے کہ علم چونکہ حق تعالیٰ کا خاص انعام اور خصوصی فضل ہے جیسا کہ "باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین" سے معلوم ہو چکا ہے۔ تو انسان کیسا ہی ذہین و فطین ہو اپنی ذکاوت اور جد و جہد کو کافی نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا رہے۔

۲:- شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے یہ باب باندھ کر اشارہ فرمادیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا ابن عباس رضؓ کے لئے کیوں کی؟ اس کی علت اور سبب کی طرف اشارہ فرمایا اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضور اکرمؐ قضاءِ حاجت کے لئے تشریف لے گئے حضرت ابن عباس رضؓ نے وضو کے لئے پانی رکھدیا حضور اقدسؐ واپس تشریف لائے تو بہت خوش ہوئے اور دریافت فرمایا یہ کس نے رکھا ہے؟ بتلایا گیا کہ ابن عباسؓ نے رکھا ہے آپؐ نے خوش ہو کر دعا دی یہ حدیث ص۲۶ پر یعنی نصر الباری جلد ثانی میں آئیگی انشاء اللہ الرحمان۔

تو امام بخاریؒ نے بتلایا کہ یہ دعا خدمت کی وجہ سے تھی، لہٰذا اساتذہ اور مشائخ کی خدمت کرنی چاہیئے۔

مطابقۃ الحدیث:- ترجمۃ الباب سے حدیث کی مطابقت بالکل واضح ہے کہ ترجمہ حدیث ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔

تشریح حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر دعا فرمائی "اے اللہ اس کو کتاب یعنی قرآن کا علم عطا فرما" اور بخاری ص۲۶ میں ہے اللھم فقھہ فی الدین بعض روایت میں علمہ الحکمۃ آیا ہے، بعض میں ہے اللھم علمہ الحکمۃ و تاویل الکتاب، اس صورت میں حکمت سے مراد سنت اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے، اب ترجمہ ہوگا اے اللہ اسے دین کی سمجھ اور علم تفسیر عطا فرما۔

چنانچہ آج جس قدر تفسیریں ہیں وہ اس کی (یعنی تفسیر ابن عباسؓ کی) محتاج ہیں اور سب سے بڑھ کر انہیں کی تفسیر ہے اور یہی سبب ہے کہ ابن عباسؓ حبر الامۃ راس المفسرین کے ساتھ ملقب ہیں اور تفقہ کا حال یہ ہے کہ فقہ شافعی کا تمام تر مدار ان ہی پر ہے۔

باب متیٰ یصح سماع الصغیر ص۱۷

بچے کا حدیث سننا کس عمر میں درست (معتبر) ہے۔

۷۵ ● حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابن شہاب عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ عن عبد اللہ بن عباس قال اقبلت راکبا علی حمار اتان وانا یومئذ قد ناھزت الاحتلام ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بمنیٰ الیٰ غیر جدار فمررت بین یدی بعض الصف وارسلت الاتان ترتع ودخلت فی الصف فلم ینکر ذٰلک علیّ ●

۷۶ ● حدثنا محمد بن یوسف قال حدثنا ابو مسہر قال حدثنی محمد بن حرب

قال حدثنی الزُّبَیْدِیُّ عن الزهریِّ عن محمودِ بنِ الرَّبیعِ قال عقلتُ مِن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مَجَّةً مَجَّهَا فی وجھی وَاَنَا ابنُ خمسِ سِنِینَ مِن دَلْوٍ

ترجمہ ۷۵ حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا اور ان دنوں میں جوانی کے قریب تھا (لیکن جوان نہیں ہوا تھا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں نماز پڑھ رہے تھے آپ کے سامنے دیوار کی آڑ نہ تھی میں کچھ صف کے آگے سے گذر گیا اور گدھی کو چھوڑ دیا وہ چرنے لگی اور میں صف میں شریک ہو گیا، مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا (یعنی نہ حضور اقدس ؐ نے اور نہ ہی کسی صحابی نے ٹوکا)۔

تعدد الحدیث اخرجہ البخاری ھنا فی العلم ص۱۷ وفی الصلوٰۃ ص۷۱ وفی الاذان ص۱۱۹ وفی الحج ص۲۵۰ وفی المغازی ص۶۳۳

ربط ماقبل گذشتہ باب میں اس بات کا بیان تھا کہ حضرت ابن عباسؓ نے بچپن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں حاصل کی تھیں اور بلوغ کے بعد ان دعاؤں کو نقل فرمایا اور ابن عباس رضؓ کی اس نقل پر اعتماد کیا گیا۔

اب اس باب میں امام بخاریؒ نے بلوغ سے قبل کی ایک روایت بیان کی جس کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ میں اس زمانے میں قریب البلوغ تھا (یعنی بالغ نہیں ہوا تھا) معلوم ہوا کہ نابالغ کا تحملِ حدیث صحیح اور معتبر ہے۔

مقصد ترجمہ پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ایک ہے تحملِ حدیث، اور ایک ہے اداءِ حدیث۔ تحمل کے معنیٰ ہیں اٹھانا اور اداء کے معنیٰ ہیں دوسروں تک پہونچانا، دوسرے کو سنانا

اس ترجمۃ الباب سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اداءِ حدیث کے وقت راوی کا بالغ ہونا شرط ہے لیکن تحملِ حدیث کے لئے بالغ ہونا شرط نہیں اُرید بالسماع مطلق التحمّل ویؤخذ من مجموع حدیثی الباب ان سن صحۃ السماع والتحمل مطلق سن التعقل (حاشیہ سندی بخاری ص۲۰)۔

خلاصہ یہ ہے کہ باب کی دونوں حدیثیں (حدیث ۷۵ و ۷۶) بتاتی ہیں کہ تحمل حدیث (سماع حدیث) کے لئے کسی خاص عمر کی قید یا بلوغ شرط نہیں بلکہ سنِ تحمل وسماع سنِ تعقل ہے، یعنی بچہ جب سمجھ دار ہو جائے تو وہ حاملِ حدیث ہو سکتا ہے۔

ترجمہ ۷۶ حضرت محمود بن ربیع نے فرمایا کہ مجھ کو (اب تک) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کلی یاد ہے جو آپؐ نے ایک ڈول سے پانی لیکر میرے چہرہ پر کلی ماری اور اس وقت میں پانچ برس کا تھا۔

مطابقتہ للترجمۃ :- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ واضحۃ فی " وَاَنَا ابن خمس سنین من دلو "

تعدد الحدیث:۔ والحدیث ھنا فی العلم ص۱ و فی ص۱۳ و ص۱۵۱ و ص۹۴ و ص۹۵۔

تشریح مذکورہ دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ تحمل حدیث کے لئے بالغ ہونا شرط نہیں ہے، اگر بچپن میں کوئی حدیث سنی اور وہ یاد ہے اور بلوغ کے بعد بیان کر رہا ہے تو وہ قبول کی جائے گی کیونکہ ابن عباسؓ، نعمان بن بشیرؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ بہت سے کم عمر صحابی ایسے ہیں جو حضور اقدس ﷺ کی عین حیات میں نابالغ مگر ان کی احادیث کو عمر کے متعلق استفسار کے بغیر تمام امت نے قبول کیا خصوصاً عبد اللہ بن زبیرؓ اور نعمان ابن بشیرؓ کہ ان کی عمر وفاتِ نبوی کے وقت تقریباً دس سال یا اس سے بھی کچھ کم تھی۔ معلوم ہوا کہ عمر کے بارے میں کوئی تحدید نہیں اصل اعتبار عقل و شعور اور تمیز کا ہے۔

علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں بہترین بات وہ ہے جو ابن ہمام نے تحریر الاصول میں لکھی ہے اور جس کو حافظ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ سال کی کوئی تعیین و تحدید نہیں بلکہ بچوں کے قوی و احوال کے اختلاف اور واقعات کی نوعیت کے تفاوت پر اس کا مدار ہے، نہ ہر بچہ کی ہر بات مردود ہے اور نہ ہر بچے کی ہر بات مقبول۔ بعض صغیر بچے ذہین ہوتے ہیں اور بعض چھ، سات سال گزرنے پر بھی ناسمجھ رہتے ہیں، مثلاً ایک بچہ کہتا ہے کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچ سال کا تھا اس وقت یہ مکان بنا تھا تو اسے قبول کر لینے میں کچھ حرج نہیں، لیکن اگر یہ کہے کہ میں پانچ برس کا تھا اس وقت میں نے فلاں عالم کی تقریر سنی تھی جو مجھے بالکل محفوظ ہے تو بے شک اس کے قبول کرنے میں تردد ہوگا۔ معلوم ہوا کہ واقعات کی نوعیت سے بھی قبول اور عدمِ قبول میں فرق ہوتا ہے۔ (درس بخاری)

امام بخاریؒ نے بھی کوئی معین حد ذکر نہیں کی، دو جزئی واقعات ذکر کر دیئے جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ کوئی خاص تحدید اس بارے میں بطور ضابطہ و کلیہ کے نہیں۔

الی غیر جدار اس بارے میں اختلاف ہے کہ سترہ تھا یا نہیں؟ اس کی تفصیل تو کتاب السترۃ میں آئے گی انشاء اللہ۔ یہاں بس اتنا ذکر کر دینا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس روایت کو سترۃ الامام سترۃ من خلفہ کے باب میں ذکر کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ سترہ تھا لیکن جدار (دیوار) کا سترہ نہ تھا بلکہ عنزہ وغیرہ کا تھا۔

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں ما اختارہ البخاری اولیٰ وعلیہ تظہر فائدۃ التعرض الی نفی الجدار خاصۃ لانہ اذا لم یکن ھناک جدار ولا غیرہ فالتعرض الی نفیہ خاصۃ لغو (فیض الباری ۱ ص۱۷۵)

یعنی اگر بالکل سترہ نہ ہوتا تو الی غیر جدار کا لفظ لغو تھا الی غیر سترۃ کہنا کافی ہوتا اس لئے راجح یہی ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہے: الی سترۃ غیر جدار۔

فلم ینکر ذلک علیّ یعنی کسی نے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے ابن عباسؓ کا مقصد ان لوگوں

کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ کلب (کتا) حمار (گدھا) اور مرأت (عورت) اگر سامنے سے گذر جائے تو نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

ابن اثیر رہ فرماتے ہیں کہ حمار کے بعد اتان لانے میں اشارہ ہے کہ حمار مؤنث (گدھا کی میم صاحبہ) کے گذرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی تو انسان مؤنث کے گذرنے سے تو بدرجۂ اولیٰ نماز فاسد نہیں ہوگی کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے نصر الباری کتاب المغازی ص۴۸۸۔

وانا ابن خمس سنین یہ محمود بن ربیع رض صغار صحابہ میں ہیں خود کہتے ہیں کہ مجھے اب تک وہ واقعہ یاد ہے جب حضور ص نے مجھ پر کلی کی تھی اس وقت میری عمر پانچ سال کی تھی۔

حضور ص نے یہ عمل (کلی کرنا) مانوس کرنے کے لئے کیا اس کو ملاعبت کہتے ہیں اس سے والدین بھی خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو بھی انس ہوتا ہے۔

● **باب** ۱۶ الخروج فی طلب العلم ورحل جابر بن عبد اللّٰہ مسیرۃ شہر الی عبد اللّٰہ بن انیس فی حدیث واحد ● ص۱۷

باب :- حصولِ علم کے لئے سفر کرنا، اور حضرت جابر بن عبد اللہ رض نے ایک حدیث کے سلسلے عبد اللہ بن انیس کی طرف ایک مہینے کی مسافت کا سفر کیا۔

۷۷ ● حدثنا ابو القاسم خالد بن خلی قاضی حمص قال ثنا محمد بن حرب قال الاوزاعی اخبرنا الزہری عن عبید اللّٰہ بن عبد اللّٰہ بن عتبۃ بن مسعود عن ابن عباس انہ تماری ہو والحر بن قیس بن حصن الفزاری فی صاحب موسیٰ فمر بہما ابی بن کعب فدعاہ ابن عباس فقال انی تماریت انا وصاحبی ہذا فی صاحب موسیٰ الذی سأل السبیل الی لقیہ ہل سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یذکر شانہ یقول بینما موسیٰ فی ملإ من بنی اسرائیل اذ جاءہ رجل فقال ہل تعلم احدا اعلم منک قال موسیٰ لا فاوحی اللّٰہ الی موسیٰ بلیٰ عبدنا خضر فسأل السبیل الی لقیہ فجعل اللّٰہ لہ الحوت آیۃ وقیل لہ اذا فقدت الحوت فارجع فانک ستلقاہ فکان موسیٰ یتبع اثر الحوت فی البحر فقال فتیٰ موسیٰ لموسیٰ ارأیت اذ اوینا الی الصخرۃ فانی نسیت الحوت وما انسانیہ الا الشیطان ان اذکرہ قال موسیٰ ذلک ما کنا نبغ فارتدا علیٰ اٰثارہما قصصا فوجدا خضرا فکان من شانہما ما قص اللّٰہ فی کتابہ ●

ترجمہ :- حضرت ابن عباس رض سے روایت ہے کہ وہ اور حر بن قیس بن حصن فزاری حضرت

موسیٰؑ کے ساتھی کے بارے میں جھگڑے (اسی دوران میں) ان دونوں کے پاس سے ابی بن کعبؓ گذرے تو ابن عباسؓ نے ان کو بلایا اور کہا کہ مجھ میں اور میرے اس دوست میں موسیٰؑ کے اس ساتھی کے بارے میں جھگڑا (اختلاف) ہوا جن سے ملاقات کے لئے موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے سبیل چاہی تھی، کیا آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کا حال بیان کرتے ہوئے کچھ سنا ہے؟ حضرت اُبیؓ نے فرمایا ہاں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا حال بیان کرتے ہوئے سنا ہے، آپؐ فرما رہے تھے کہ ایک بار حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں (تشریف فرما) تھے اتنے میں ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو آپ سے زیادہ علم رکھتا ہو؟ موسیٰؑ نے کہا "نہیں" تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل کی کہ ہاں ہمارا بندہ خضرؑ (علم میں تم سے بڑھ کر) ہے تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے ملنے کی سبیل دریافت کی، پس اللہ تعالیٰ نے ان سے ملاقات کے لئے مچھلی کو علامت قرار دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جب تم مچھلی کو گم پاؤ تو لوٹ جاؤ، اور یقین رکھو کہ قریب ہی ان سے ملاقات کرلوگے حضرت موسیٰؑ اسی مچھلی کے نشان پر سمندر کے کنارے کنارے جارہے تھے، پھر موسیٰؑ کے خادم یوشع نے ان سے کہا: کیا آپ نے دیکھا جب ہم صخرہ (پتھر) کے پاس ٹھہرے تو مچھلی کا قصہ کہنا میں بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلادیا، میں آپ سے اس کا ذکر نہ کرسکا، موسیٰؑ نے کہا ہم اسی مقام کی تلاش میں تھے، چنانچہ دونوں اپنے نقشہائے قدم پر تلاش کرتے ہوئے لوٹے پھر دونوں نے خضرؑ کو پالیا اور وہی حال ہوا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا۔

تعدد الحدیث — والحدیث ههنا ص۱۷ ومضی ایضا ص۱۷ ویاتی ص۲۳ وص۳۰۲ وص۳۷۷ وص۴۶۳ وص۴۸۱ وص۴۸۲ تا ص۴۸۳ وص۶۸۷ ایضا ص۶۸۸ وص۶۹۰ وص۹۸۶ وص۱۱۱۴۔

ربط — گذشتہ باب میں حضرت ابن عباسؓ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا ذکر تھا اور حاضری دراصل طلب علم ہی کے لئے تھی۔ اور اس باب میں بھی طلب علم کے لئے سفر کا ذکر ہے علامہ عینیؒ نے مذکورہ مناسبت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس مناسبت کے باوجود بہتر اور انسب یہ تھا کہ امام بخاریؒ اس باب کو باب ماذکر فی ذھاب موسیٰ الی الخضر، کے بعد ہی ذکر کرتے۔

پہلے باب سے بحری سفر کا اثبات اور دوسرے میں بری سفر کا مطلق سفر کی ترغیب ہوتی۔

مقصد ترجمہ — امام بخاریؒ نے پچھلے ابواب میں علم کی فضیلت اور ضرورت و اہمیت کو پوری وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے، اب یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ علم نہایت ضروری چیز ہے اگر کسی کو مقامی طور پر یہ ضرورت پوری نہ ہوسکے تو گھر چھوڑ کر باہر سفر کرنا چاہئے خواہ دریائی سفر ہو یا خشکی کا، کیونکہ دنیا کا کوئی کام علم کے بغیر ممکن نہیں۔

البتہ بعض روایات سے سفر کی کچھ ممانعت معلوم ہوتی ہے، مثلاً ایک روایت میں ہے السفر قطعة من العذاب یمنع احدکم طعامه وشرابه ونومه فاذا قضی احدکم نهمته فلیتعجل الی

اصلہ :- یعنی سفر ایک قسم کا عذاب ہے جو تمہارے خورد ونوش اور نیند سب میں رخنہ انداز ہوتا ہے اس لئے جب بھی ضرورت پوری کرلے تو جلد اپنے گھر واپس آجائے۔

اس روایت سے سفر کی ممانعت کا شبہ ہو سکتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس میں سفر کی اجازت ہے البتہ مقصد حاصل ہونے کے بعد اپنے اہل وعیال میں واپسی کی ہدایت ہے۔

۲:- ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے لا یرکب البحر الا حاج او معتمر او غاز فی سبیل اللہ یعنی حاجی، معتمر اور غازی فی سبیل اللہ کے علاوہ کوئی شخص سمندر کا سفر نہ کرے۔

اس حدیث میں سفر بلا ضرورت کی ممانعت ہے۔

بہر حال امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ علم نہایت ضروری چیز ہے اس کے لئے سفر جائز ہے اگر کسی روایت سے ممانعت معلوم ہو تو بلا ضرورت سفر پر محمول ہوگا۔

امام بخاریؒ نے الخروج فی طلب العلم کا ترجمہ قائم کرکے بتلا دیا کہ علم حاصل کرنے کے لئے علی الاطلاق سفر جائز ہے سفر قریب کا ہو یا بعید کا، خشکی کا ہو یا سمندر کا۔

تشریح ترجمۃ الباب میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ کے سفر کا بیان ہے۔ امام بخاریؒ نے "الادب المفرد" اور امام احمد اور ابو یعلی نے اپنی مسند میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ ایک صحابی کے پاس ایسی حدیث ہے جسے انہوں نے براہ راست حضور اقدس ﷺ سے سنا ہے تو میں نے اونٹ خریدا اور کجاوا کسا اور ایک ماہ کی مسافت طے کرکے شام پہنچا، حضرت عبد اللہ بن انیسؓ کے گھر آکر دربان سے اطلاع کرائی کہ جابر دروازہ پر ہے، دربان نے واپس آکر دریافت کیا کہ کیا آپ جابر بن عبد اللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں، حضرت عبد اللہ بن انیسؓ آئے اور معانقہ کیا پس میں نے کہا۔

حدیث بلغنی عنک انک سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخشیت أن اموت قبل أن اسمعہ۔

مجھے آپ سے ایک حدیث پہونچی ہے جو آپ نے خود آنحضرتؐ سے سنی ہے مجھے خوف ہوا کہ اس حدیث کے سننے سے پہلے میں مر نہ جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے وہ حدیث سنائی۔

امام بخاریؒ نے کتاب التوحید کے باب قول اللہ عزوجل ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الا لمن اذن لہ" میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ ویذکر عن جابر عن عبد اللہ بن انیس قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یحشر اللہ العباد فیناديهم بصوت یسمعہ من بعد کما یسمعہ من قرب انا الملک انا الدیان۔ (بخاری ص ۱۱۱۴)

اس کے علاوہ علامہ عینی اور حافظ عسقلانی نے ایک ایک حدیث کے لئے سفر کرنے کے متعدد واقعات ذکر کئے ہیں، من شاء فلیطالع۔

علوِ سند کیلئے میر سید شریف کا سفر

متقدمین نے کس قدر محنتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں اور یہ تو حدیث نبوی ہے، معلوم ہوا کہ اسے جس قدر بھی محنت اور کوشش سے حاصل کیا جائے بہتر ہے، ورنہ لوگوں نے تو اور فنوں کے حصول میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں۔

میر سید شریف جرجانیؒ نے شرح مطالع پڑھی تو شوق ہوا کہ اسے اس کے مصنف سے پڑھنا چاہئے بس چل دیئے اور اس کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اس وقت اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ بھوں کو اٹھا کر دیکھا اور پوچھا، تم کون ہو؟ انہوں نے عرض کیا میں سید شریف جرجانی ہوں، میں شرح مطالع اگرچہ پڑھ چکا ہوں مگر صرف اس تمنا میں کہ آپ سے اس کو پڑھوں آیا ہوں۔ جواب دیا کہ میں بالکل ضعیف ہو چکا ہوں تم جوان ہو مجھ سے تمہاری تسکین نہ ہو سکے گی ہاں میرا ایک شاگرد روم میں ہے اس کا نام مبارک شاہ ہے تم اس کے پاس چلے جاؤ اس کا پڑھانا گویا میرا ہی پڑھانا ہے، یہ وہاں پہونچے اور سارا قصہ بیان کیا، مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے علامہ نے ان کی عمدہ پرورش کی تھی اور اچھی طرح پڑھایا تھا حتی کہ وہ ہر فن میں فاضل و ماہر ہو گئے تھے اور خوب درس دیتے تھے، لوگ اکثر انہیں مبارک شاہ منطقی کے نام سے پکارتے تھے، جب میر سید شریف سے پوری بات سن لی تو فرمایا کہ ہمارے یہاں داخلہ کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ میں ایک اشرفی یومیہ ایک سبق کے لئے لیتا ہوں، میر صاحب روزانہ ایک اشرفی کہاں سے لاتے؟ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سوچنے کے بعد ان سے عرض کیا کہ روزانہ کی شرط تو نہیں جب میرے پاس ایک اشرفی ہو جایا کریگی ایک سبق پڑھ لیا کروں گا، فرمایا منظور ہے۔

میر صاحب میں سچی طلب تھی فیصلہ کیا کہ جھولی ڈال کر بھیک مانگونگا جب ایک اشرفی ہو جایا کریگی ایک سبق پڑھ لیا کرونگا، میر صاحب نے تو یہ فیصلہ کیا مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا اس لئے ابھی میر صاحب کو بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک رئیس کو اس کا علم ہو گیا کہ ایک سید ہے اور وہ اس طرح پڑھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے انہیں بلایا اور کہا کہ میں تم کو ایک اشرفی یومیہ دیا کرونگا تم سبق پڑھنا شروع کر دو، میر صاحب کی مانگی مراد پوری ہوئی اور پڑھنا شروع کر دیا، ایک ہفتہ گذرا تھا کہ استاذ نے بلا کر کہا میاں ہمیں اشرفی کی کچھ پرواہ نہیں ہمارا مدعا تو تمہیں جانچنا اور تمہاری طلب کا امتحان لینا تھا وہ ہو چکا اب تم پڑھو اور اپنی اشرفیاں اپنے پاس رکھو مگر اگلی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہیں نہ بولنے کی بس سماعت کرو، یہ اس پر بھی راضی ہو گئے اور سماعت کرنے لگے اور پیچھے ہی بیٹھتے تھے لیکن آخر سید شریف تھے، تفتازانی کو شکست دی تھی درمیانِ درس میں جوش اٹھتا تھا، شکوک و شبہات لگتے تھے مگر بولنے کی اجازت نہ تھی اس لئے خاموش رہنا پڑتا تھا البتہ جب اپنے حجرہ میں جاتے تو دیوار کو مخاطب کرتے اور کہتے صاحبِ کتاب نے یوں کہا اور استاذ نے یوں کہا اور میں یوں کہتا ہوں۔

ایک مرتبہ استاذ طلبہ کا حال معلوم کرنے لگے گشت میں نکلے جب ان کے حجرے کے پاس پہونچے تو یہ تقریر کر رہے تھے استاذ آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور جب انھوں نے کہا و اقول کذا تو پوری توجہ اور غور سے سنا بات بہت عمدہ تھی، پسند آئی اور بہت خوش ہوئے، صبح کو دریافت کیا کہ فلاں حجرہ میں کون رہتا ہے؟ بتلایا گیا کہ سید شریف رہتے ہیں اور فرمایا تم اگلی صف میں بیٹھا کرو اور خوب جی کھول کر پوچھو۔ پھر ان کا جو مرتبہ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک معمولی سی کتاب شرح مطالع کیلئے اتنی مشقتیں برداشت کیں پھر اگر حدیث نبوی کے لئے اس سے بہت زیادہ مشقت برداشت کی جائے تو کیا بعید ہے (درس بخاری ص۳۵۸)

مطابقۃ الحدیث: مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ " فکان موسیٰ یتبع اثر الحوت "

• باب ۶۲ فضلِ مَن عَلِمَ و عَلَّمَ • ص۱۸

اس شخص کی فضیلت کا بیان جس نے علم سیکھا اور سکھایا۔

ربط علامہ عینی رح فرماتے ہیں کہ سابق باب میں عالم اور معلم کا حال بیان کیا گیا تھا اب اس باب میں ان دونوں کی فضیلت بیان کرنی مقصود ہے۔

حضرت شیخ الہند رح فرماتے ہیں کہ مصنف رح نے ماقبل کے ابواب میں تعلّم (علم سیکھنے) کی ضرورت و اہمیت بیان کی ہے اور اب اس باب میں تعلیم (علم سکھانے و پھیلانے) کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۷۸ • حدثنا محمدُ بنُ العلاء قال حدثنا حمادُ بنُ اُسامۃَ عن بُرَیدِ بنِ عبدِ اللّٰہِ عن ابی بُردۃَ عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال مَثَلُ ما بعثنی اللّٰہ بہ مِنَ الھُدیٰ والعِلمِ کمَثَلِ الغیثِ الکثیرِ اَصابَ ارضًا فکان منھا نقیّۃٌ قبِلَتِ الماءَ فانبتتِ الکلأَ والعُشبَ الکثیرَ وکانت منھا اجادبُ اَمسکتِ الماءَ فنفع اللّٰہ بھا الناسَ فشربوا وسقوا وزرعوا و اصاب منھا طائفۃً اُخریٰ اِنّما ھِیَ قِیعانٌ لا تُمسِکُ ماءً ولا تُنبِتُ کلأً فذٰلک مَثَلُ مَن فَقُہَ فی دینِ اللّٰہ ونفعہ بما بعثنی اللّٰہ بہ فعَلِمَ وعَلَّمَ ومَثَلُ مَن لم یرفع بذٰلک رأسًا ولم یقبلْ ھُدی اللّٰہِ الذی اُرسِلتُ بہ قال ابو عبدِ اللّٰہِ قال اسحٰقُ عن ابی اُسامۃَ وکان منھا طائفۃٌ قیّلتِ الماءَ قاعٌ یعلوہُ الماءُ والصّفصفُ المستوی مِنَ الارضِ •

ترجمہ حضرت ابو موسیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ نے مجھے جس علم و ہدایت کے ساتھ بھیجا ہے اس کی مثال بروقت زوردار بارش کی سی ہے

جو زمین پر برسی تو بعض زمین عمدہ تھی جس نے پانی چوس لیا اور اس نے سبزی اور گھاس خوب اگائی اور بعض زمین سخت تھی (یعنی پتھریلی) اس نے پانی روک لیا (یعنی جمع کر لیا) اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ دیا پیا اور (جانوروں کو) پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا۔ اور بعض ایسی زمین پر یہ مینھ برسا جو برابر اور چٹیل تھی تو نہ پانی کو اس نے جمع کیا اور نہ اس نے گھاس اگائی (اور اس پر سے بہہ کر نکل گیا) یہی اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ پیدا کی اور اللہ نے جو مجھے دیکر بھیجا ہے اس سے اس کو فائدہ پہنچا اس نے خود علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی جانب سر ہی نہیں اٹھایا اور اللہ کی اس ہدایت کو جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اسے قبول نہیں کیا۔

ابو عبداللہ (یعنی خود امام بخاریؒ) نے کہا اسحاق نے ابواسامہ سے اس حدیث کو روایت کیا اس میں قبلت الماء کی جگہ قیلت الماء ہے یعنی بعض زمین نے خوب پانی پیا (اس حدیث میں قیعان جمع ہے قاع کی قاع وہ زمین جس پر پانی چڑھ جائے (ٹھہرے نہیں) اور (قرآن حکیم میں جو قاعاً صفصفا ہے تو) صفصف کہتے ہیں ہموار زمین کو۔

مطابقته للترجمة:- مطابقة الحديث للترجمة ظاهرة في قوله "فعلم وعلّم"

شرح الفاظ

الغیث ضرورت کے وقت کی بارش نقیۃ صاف ستھری بفتح النون وکسر القاف وتشدید الیاء وبالرفع اسم کان منہا مقدماً خبرہ قبلت الماء بفتح القاف وکسر الباء الموحدہ از سمع قبول مصدر سے بمعنی پانی قبول کر لیا چوس لیا۔ الکلأ بفتح الکاف واللام وفی آخرہ ہمزہ یعنی الف پر ہمزہ ہے بعض کتابوں میں الف کے بعد ہمزہ ہے جو غلط ہے۔ کلأ گھاس خشک ہو یا ہری عشب تر گھاس، سبز گھاس پس یہاں تخصیص بعد التعمیم ہے اجادب بالجیم والدال المہملۃ جمع جدب علیٰ غیر قیاس وہ زمینیں جن میں پیداوار نہ ہو یعنی نہ پانی کو چوسے نہ گھاس اگائے۔ قیعان بکسر القاف جمع القاع چٹیل میدان۔

تشریح

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی ربانی کو مثال دیکر سمجھایا ہے کہ جو ہدایت اور علم میں لیکر آیا ہوں اس کی مثال اس بر وقت اور زوردار بارش کی سی ہے جو زمین کے مختلف حصوں پر برسی اب زمین کا بعض حصہ وہ ہے جو ستھرا اور پاکیزہ ہے (یعنی نرم جوتی ہوئی زمین قابل کاشت ہے) یہ حصہ پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے سبزہ لہلہا دیتا ہے اگاتا ہے اور پھل پھول کھلاتا ہے جس سے عوام وخواص اور جانور سب مستفید و متمتع ہوتے ہیں یہ مجتہدین کرام کی مثال ہے جنھوں نے وحی الٰہی (خواہ متلو ہو یا غیر متلو) کو پی لیا پھر اصول و فروع کے پھل پھول اگائے اور مسائل کے بیل بوٹے لگائے الخ کو زمین نمبر ایک کے ساتھ مشابہت ہے یہ حضرات خود بھی نفع اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی نفع پہونچاتے ہیں۔

اور زمین کا دوسرا حصہ وہ ہے جو سخت ہے (یعنی نرم قابل کاشت نہیں ہے) بارش کا پانی جذب

کرنے کی صلاحیت نہیں لیکن نشیب ہے جیسے حوض تالاب یہ پانی کو خود جذب نہیں کرتا لیکن پانی کو جمع کر لیتا ہے جس سے انسانوں اور جانوروں کو نفع پہنچتا ہے یہ مثال ہے اس کی جس نے علم حاصل کر کے خود تو عمل نہ کیا لیکن دوسروں کو سکھایا، نفع پہونچایا۔

زمین کی تیسری قسم وہ ہے جو چٹیل میدان ہے نہ پانی رکتا ہے نہ پیداوار ہوتی ہے یہ مثال ہے اس کی جس میں ہدایت وعلم ٹھہرا ہی نہیں، ایک کان سے سنا دوسرے سے نکال دیا یعنی اس نے علم وہدایت کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی۔

اشکال یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ مثال اور ممثل لہٗ میں مطابقت نہیں ہے، مثال (یعنی مشبہ بہ) میں تین قسم کی زمینوں کا ذکر ہے اور ممثل لہٗ (یعنی مشبہ) میں صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔

جواب: یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے پیش نظر افادہ واستفادہ تھا اس لئے پہلی دونوں قسموں کو یعنی جس نے پانی کو پی لیا اور جس نے روک کر جمع کیا دونوں کو ایک شمار کر لیا کیونکہ یہ دونوں قسمیں نافع ہیں تو اس لحاظ سے کہ ان دونوں سے نفع حاصل کیا جاتا ہے یہ ایک قسم ہے۔

اور دوسری قسم یعنی تیسری زمین بالکل ناقابلِ نفع اور بنجر ہے اور یہ لوگ کافر وجاہل ہیں کہ نہ خود علم وہدایت سے نفع اٹھایا نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

قال ابو عبد اللّٰہ الخ یعنی امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اسحاق (یعنی ابن راہویہ) کی روایت میں قبلت الماء کی جگہ قیلت (بتشدید الیاء التحتانیۃ) آیا ہے۔ بعض حضرات نے اس کو درست قرار دیا ہے کہ اس کے معنی بھی پانی روکنے کے آتے ہیں، لیکن حافظ نے کہا ہے کہ یہ تصحیفِ راوی ہے۔

امام بخاریؒ کی عادت علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ مشکل الفاظ کی تفسیر کر دیتے ہیں اور اگر قرآن حکیم میں اس کے مناسب لفظ ملتا ہے تو اس کی بھی تفسیر کر دیتے ہیں، چنانچہ اسی حدیث میں لفظ قیعان آیا تو اس کی تفسیر کر دی کہ یہ قاع کی جمع ہے تو اس کے ساتھ صفصف کی تفسیر بھی کر دی حالانکہ یہ لفظ یہاں نہ تھا لیکن قرآن حکیم میں فیذرہا قاعاً صفصفا ہے اس لئے امام نے پہلے قاع کی تفسیر کی پھر اس کے ساتھ صفصف کی تفسیر بھی کر دی۔

باب ۹۳ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُوْرِ الْجَهْلِ وَقَالَ رَبِيْعَةُ لَا يَنْبَغِىْ لِأَحَدٍ عِنْدَهٗ شَيْئٌ مِّنَ الْعِلْمِ اَنْ يُّضَيِّعَ نَفْسَهٗ ● ص۱۸

(دنیا سے) علم اٹھ جانے اور جہالت پھیلنے کا بیان۔ اور ربیعہؓ نے کہا کہ جس کو (دین کا) تھوڑا سا بھی علم ہو اس کے لئے مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ضائع کر دے۔

ربط گذشتہ باب میں عالم اور متعلم (تعلیم اور تعلّم) کی فضیلت بیان کی گئی تھی اور تحصیلِ علم کی ترغیب تھی اب یہ باب اسی سابق باب کا تکملہ ہے کہ تعلیم نہایت ضروری ہے اگر یہ سلسلہ بند

ہوگیا تو علم اٹھ جائے گا اور جہالت کا غلبہ ہوگا پھر کوئی کام قاعدہ کے مطابق نہ ہوگا اور نظامِ عالم درہم برہم ہوجائیگا جب علم نہ رہے گا تو عالم کو ختم کردیا جائیگا، معلوم ہوا علم بقائے عالم کا سبب ہے۔

اس سے ترجمۃ الباب کا مقصد بھی واضح ہوگیا کہ تحصیل علم پر ترغیب ہے جیساکہ حدیث الباب سے معلوم ہوگا کہ رفع علم علاماتِ قیامت میں سے ہے اس لئے تعلیم وتعلّم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔

۷۹ ● حدثنا عمرانُ بنُ مَیْسرۃَ قال حدثنا عبدُ الوارثِ عن ابی التَّیّاح عن انس قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِن مِن اشراطِ السّاعۃِ اَن یُرفَعَ العلمُ وَ یَثبُتَ الجھلُ وتُشرَبُ الخمرُ وَیَظھرَ الزنا ●

۸۰ ● حدثنا مُسدَّدٌ قال ثنا یحییٰ بنُ سعیدٍ عن شعبۃَ عن قتادۃَ عن انس قال لَاُحَدِّثَنَّکم حدیثاً لا یُحَدِّثُکم احدٌ بعدی سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اِنَّ مِن اشراطِ السّاعۃِ اَن یَقِلَّ العلم وَیَظھرَ الجھلُ ویَظھرَ الزنا وَتکثُرَ النّساءُ وَیقِلَّ الرِّجالُ حتی یکونَ لِخمسینَ امرأۃً القیّمُ الواحدُ ●

ترجمہ ۷۹ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ (دین کا) علم اٹھ جائے گا اور جہالت جم جائے گی اور شراب (کثرت سے) پی جائے گی اور زنا اعلانیہ ہوگا۔

ترجمہ ۸۰ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جو میرے بعد تم سے کوئی نہیں بیان کریگا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ دین کا علم گھٹ جائیگا اور جہالت پھیل جائے گی اور زنا بکثرت ہوگا، عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور مرد کم ہوجائیں گے یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا نگراں (کام چلانے والا) ایک مرد ہوگا۔

مطابقتہ للترجمۃ:- ترجمۃ الباب سے دونوں حدیثوں کی مطابقت واضح ہے۔

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا ص۱۸ ویاتی فی النکاح ص۷۸۷ وفی اوائل الاشربۃ ص۸۳۶ وفی المحاربین ص۱۰۰۵ تا ص۱۰۰۶۔

قال ربیعۃ ترجمہ گذرچکا۔

حضرت ربیعہؒ کا مختصر حال علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: ربیعۃ ھو المشھور بربیعۃ الرائی الخ یعنی وہی مشہور امام ربیعۃ الرائی ہیں ان کا پورا نام ابوعثمان ربیعۃ بن ابی عبدالرحمان فروخ ہے، یہ فقیہ اہلِ مدینہ ہیں ان کو بعض صحابہ اور کبار تابعین سے ملاقات کا شرف حاصل ہے، بڑے مجتہدین میں ان کا شمار ہوتا ہے، امام مالکؒ کے شیخ اور تابعی ہیں، ربیعہؒ کے والد

فروخ فوج میں خراسان بنی امیہ کے دور میں گئے، ربیعہ اس وقت ماں کے پیٹ میں تھے، ربیعہ کے والد فروخ جاتے وقت اپنی بیوی کے پاس تیس ہزار دینار چھوڑ گئے تھے اور ستائیس سال کے بعد مدینہ میں آئے، گھوڑے پر سوار تھے اور ہاتھ میں نیزہ تھا اپنے گھر پر پہونچے تو گھوڑے سے اتر کر دروازہ کو پاؤں سے ڈھکیلا، ربیعہ نکلے اور کہنے لگے "یا عدو اللہ انت دخلت علی حرمی" اللہ کے دشمن تو میرے حرم میں کیوں داخل ہوا؟ فروخ نے جواباً کہا کہ اللہ کا دشمن تو ہے جو میرے حرم میں داخل ہوا۔ دونوں آپس میں الجھ گئے۔ امام مالکؒ کے پاس اس کی اطلاع پہونچی ادھر ہمسائے ربیعہ کی مدد کو پہونچ گئے، دونوں ایک دوسرے سے کہتے لا فارقتک میں تجھے نہیں چھوڑونگا، جب امام مالکؒ کو دیکھا تو خاموش ہو گئے امام مالک نے کہا۔ بزرگ محترم آپ کے لئے کسی اور مکان میں وسعت ہو سکتی ہے۔ بڑے میاں نے جواب دیا کہ یہ میرا مکان ہے میں فروخ ہوں۔ بیوی نے ان کی بات سنی تو نکل آئیں اور کہنے لگیں کہ یہ میرے خاوند ہیں اور یہ میرے بڑے بیٹے ہیں جنھیں یہ حمل کی حالت میں چھوڑ گئے تھے، باپ بیٹا گلے ملے اور بہت روئے فروخ جب گھر کے اندر داخل ہوئے تو بیوی سے پوچھا اھذا ابنی؟ فقالت نعم اس کے بعد فروخ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تمہارے پاس جو مال چھوڑ گیا تھا وہ کہاں ہے؟ پھر صبح کو ربیعہ مسجد نبوی میں اپنے حلقے میں جا بیٹھے اور ان کے پاس امام مالک اور دوسرے شرفاء مدینہ آئے اور ربیعہ کے گرد حلقہ لگ گیا۔

ربیعہ کی والدہ نے فروخ سے کہا: جایئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز پڑھئے مسجد میں آئے تو ایک بڑا حلقہ دیکھا کھڑے ہو گئے۔ ربیعہ نے اس انداز میں سر جھکائے رکھا کہ وہ گمان کریں کہ ان کو دیکھ نہیں رہے ہیں، فروخ کو بیٹے کا شک ہوا تو دریافت کیا کہ یہ آدمی کون ہے؟ جواب ملا کہ یہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمان ہیں، کہنے لگے اللہ نے میرے بیٹے کو بلند مرتبہ دیا ہے۔ گھر آکر بیوی سے کہا میں نے تمہارے بیٹے کو ایسی شان میں دیکھا ہے جو اہل علم اور فقہاء میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

ربیعہ کی ماں نے کہا آپ کو تیس ہزار دینار زیادہ پسند ہیں یا اپنے بیٹے کی یہ شان؟

کہنے لگے:

لا واللہ بل ھذا فقالت انفقت المال کلہ علیہ قال فواللہ ماضیعتہ۔ (فضل الباری ثلث)	اللہ کی قسم مجھے بیٹے کی شان پسند آئی کہنے لگیں۔ واللہ میں نے وہ تمام مال اس پر خرچ کیا، کہنے لگے واللہ تم نے یہ مال ضائع نہیں کیا۔

امام ربیعہ کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی۔

اصحاب الرائے

ربیعۃ الرائی پر یہ لفظ ہجو استعمال نہ ہوتا تھا۔ متقدمین میں جن لوگوں پر استنباط و اجتہاد کا غلبہ ہوتا تھا انہیں اصحاب الرائی کہا جاتا تھا اور سلف میں یہ لفظ محمود تھا

ہمیشہ دو جماعتیں چلی آئی ہیں، ایک پر روایت غالب تھی جو محدثین کہلاتے تھے اور دوسری جماعت پر درایت واجتہاد غالب تھا جو فقہاء کے لفظ سے مشہور ہوئے۔

ایسی جماعتیں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھیں، ایک جماعت کا عمل جذبۂ اتباع سنت کی وجہ سے صرف الفاظِ حدیث پر تھا اور دوسری جماعت حدیث کا منشأ وغرض تلاش کرتی تھی۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب سے واپسی پر فرمایا: لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة صحابہ کرامؓ باوجود سعی بلیغ کے عصر تک بنی قریظہ میں نہ پہونچ سکے، راستہ میں عصر کا وقت آگیا اب اختلاف ہوا، ایک جماعت نے راستہ میں نماز پڑھ لی اور کہا کہ حضور اکرمؐ کا مقصد یہ تھا کہ جلدی پہونچو۔

دوسری جماعت نے راستہ میں نماز نہیں پڑھی بعد میں قضا پڑھی، حضور اکرمؐ کو اطلاع ہوئی تو دونوں جماعتوں میں سے کسی پر سختی نہیں فرمائی کیونکہ دونوں کی غرض ومنشا اتباعِ سنت تھا لہذا دونوں میں سے کسی کی تغلیط نہیں کیجا سکتی، ہاں اہلِ اجتہاد کا درجہ اہلِ ظواہر سے بلند ہے کیونکہ وہ حاملِ معنی ہیں اور یہ حاملِ الفاظ ہیں۔

تفصیل کے لئے دیکھئے نصر الباری کتاب المغازی ص ۱۷۱ تا ص ۱۷۲۔

واضح رہے کہ نصوص مجملہ کی تشریح مذموم نہیں کیونکہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ البتہ نص کے مقابلہ میں قیاس کرنا مذموم ہے، سفہائے زمانہ نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فقہاء رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں اور اہل حدیث حدیث کو رائے پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ صریح جہالت وحماقت ہے۔

قال ربیعة لا ینبغی لاحد عنده الخ ترجمہ گذر چکا ہے۔

حضرت ربیعہؒ فرماتے ہیں کہ جس کے پاس علم کا کچھ بھی حصہ ہے وہ اپنے آپکو ضائع اور بیکار نہ کرے کیونکہ برسہا برس کی محنت اور جد وجہد سے حاصل کئے ہوئے علم کو ضائع کرنا اپنے آپ کو ضائع کرنا ہے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ تعلیم وتدریس اور تقریر وتبلیغ چھوڑ کر زراعت وتجارت میں مشغول ہوجائے جس سے اشاعتِ علم کے بجائے اضاعتِ علم ہوجائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ علم کی عظمت وتوقیر کا خیال نہ رکھائے اور علم کو حصول دنیا کا ذریعہ بنا لیا جائے، جو عالم اپنے علم کو اہلِ ثروت، امراء کے تقرب کا ذریعہ بناتا ہے تو وہ یقیناً علم اور اپنے آپ کو ذلیل اور ضائع کرتا ہے، عالم کو چاہئے کہ اس عظیم الشان نعمت کی قدر کرے، اس کے وقار کو محفوظ رکھے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ نااہلوں کو پڑھانا، نااہلوں کے ساتھ مشتغل رہنا بھی اپنے آپکو ضائع کرنا ہے کما فی الحدیث واضع العلم عند غیر اهله کمقلد الخنازیر الجوهر واللؤلؤ والذهب. رواه ابن ماجة (مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۴)

کیونکہ اضاعتِ نفس کا ایک مطلب ترکِ عمل ہے کیونکہ علم پر عمل نہ کرنا بھی اضاعتِ نفس واضاعتِ علم ہے۔

لا احدثکم حدیثا لا یحدثکم احد بعدی یہ جملہ متعدد مقامات پر آیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حدیث صرف مجھ ہی کو معلوم ہے کسی اور کو معلوم نہیں کہ وہ بیان کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد بصرہ میں تم سے کوئی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر حدیث بیان نہیں کریگا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت صرف چند صحابہ ادھر ادھر رہ گئے تھے اور بصرہ میں ان کے علاوہ کوئی صحابی نہ تھا کیونکہ حضرت انس رض آخرھم موتا بالبصرہ ہیں۔

اشراط الساعۃ الخ اشراط بفتح الھمزہ جمع ہے شرط بفتح الشین والراء کی ان یرفع العلم قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ دین کا علم اٹھ جائیگا، اور اس کے بعد والی روایت میں ان یقل العلم آرہا ہے دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابتداءً کم ہوتا جائیگا پھر رفتہ رفتہ بالکل اٹھالیا جائیگا۔ یا قلت سے عدم مراد لیا جائے کیونکہ محاورہ میں قلت کا لفظ کبھی عدم کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

تکثر النساء الخ عورتیں زیادہ ہونگی الخ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخر زمانہ میں جنگ و فساد، قتل و قتال کی کثرت ہوگی، رجال مارے جائیں گے کیونکہ لڑائیوں میں اکثر مرد ہی جاتے ہیں اور مارے جاتے ہیں اور عورتیں رہ جائیں گی جس کا آج کل بخوبی مشاہدہ ہو رہا ہے۔

۲ عورتیں بکثرت پیدا ہونگی چنانچہ آج کل اس کا تجربہ ہے۔

لخمسین امراۃ الخ یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا نگراں (خبرگیری اور انتظام کرنے والا) ایک مرد ہوگا، نکاح مراد نہیں۔ ۲ یا پچاس کی حقیقی تحدید مقصود نہ ہو بلکہ پچاس سے مجازاً صرف کثرت مراد ہو ہر دو احتمال منقول ہے۔

حکمۃ تعدد الازواج والحصر فی الاربع

عقلاً ونقلاً وتجربۃً وقیاساً ہر لحاظ سے یہ امر مسلّم ہے کہ مرد میں عورت کی بہ نسبت شہوت کئی گنا زیادہ ہے شرعاً اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کو چار بیویوں کا اختیار دیا، اگر عورت میں شہوت زیادہ ہوتی تو اس کا برعکس ہونا چاہئے تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لئے بہت سی وعیدیں بیان فرمائی ہیں جبکہ وہ مرد کے بلانے پر ہمبستری کے لئے راضی نہ ہوں، اگر عورت میں شہوت زیادہ ہوتی تو مردوں کے لئے ایسی وعیدیں آنی چاہئے تھیں۔

عقلاً اس لئے کہ مرد کا مزاج گرم ہے جو سبب شہوت ہے اور عورت کا مزاج سرد ہے۔

تجربۃً اس لئے کہ کوئی شخص اس کا قائل نہیں اور اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا کہ عورت ہمبستری کی دعوت دے اور مرد انکار کرے اس کے برعکس اس کی مثالیں روزانہ پیش آتی رہتی ہیں کہ مرد بلاتا ہے عورت راضی نہیں ہوتی۔

قیاساً اس طریقہ سے کہ دوسرے حیوانات میں یہ امر مشاہد ہے کہ ایک مذکر سیکڑوں مؤنث کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔

اگر عورت میں شہوت زیادہ ہوتی یا برابر ہوتی تو شہر کا ہر گلی کوچہ شب وروز زناکاری کا بازار ہوتا۔ بازار میں ہر مرد کا عورتوں کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے الاّ المتقین۔

اگر عورت کی جانب سے بھی ایسا ہی میلان پایا ئے تو بدفعلی سے مانع کیا چیز ہوگی؟ خصوصاً جس حکومت میں بدفعلی جرم نہ ہو اور لڑکیوں کے والدین اور اقربین اسے نفرت کی نگاہوں سے نہ دیکھتے ہوں۔

قرآن کریم میں الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مأۃ جلدۃ، پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ زانیہ کی تقدیم اس کی دلیل ہے کہ اس میں شہوت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر مفسرین کا یہ خیال صحیح نہیں اس لئے کہ یہ خیال عقل ونقل اور تجربہ وقیاس سب کے خلاف ہے۔

مزید براں مرد میں کثرتِ احتلام اور عورتوں میں اس کا وجود کالعدم ہونا بھی بیّن دلیل ہے کہ عورت میں شہوت کالعدم ہے۔ ان امور سے ثابت ہوا کہ مرد میں شہوت زیادہ ہے۔

بعض علماء کو ایک مسئلہ فقہیہ سے بھی مغالطہ ہوا ہے وہ یہ کہ نظر الرجل الی المرأۃ کی بنسبت نظر المرأۃ الی الرجل اخف ہے جس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عورت میں شہوت زیادہ ہے لہٰذا مرد کے دیکھنے سے اگر مرد میں بھی شہوت پیدا ہوگئی تو فتنہ زیادہ ہے، اس کے برعکس اگر عورت نے دیکھا تو چونکہ مرد میں شہوت کم ہے لہٰذا فتنہ کا کوئی احتمال نہیں۔

اس مسئلہ کی یہ توجیہ بھی سراسر غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ مرد کے مفتون ہونے کی صورت میں چونکہ اس کی کامیابی سہل ہے اس لئے کہ مرد کے پاس تحصیلِ مقصد کے ذرائع موجود ہوتے ہیں۔ قلتِ حیاء، کثرتِ شہوت، قوتِ قلب اور مال وزر، قوتِ جسم اور آزادی سے آنا جانا یہ امور اس کے مقصد کی تکمیل میں معاون ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس عورت کی نظر مرد کی طرف اس قدر خطرناک نہیں اس لئے کہ اولاً تو ان میں قلتِ شہوت کی بنا پر فتنہ کا احتمال نہیں اور ثانیاً شاذ ونادر یہ نظر موجبِ شہوت ہو بھی جائے تو کثرتِ حیاء، قلب وجسم کا ضعف اور قلتِ مال، آمد ورفت کا تعسر، یہ ایسے امور ہیں کہ ان کی بناء پر عورت اپنی بری خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی۔

آیتِ کریمہ میں زانیہ کی تقدیم کی وجہ بھی یہی ہے کہ قلتِ شہوت، کثرتِ حیاء، کثرتِ موانع اور قلتِ ذرائع کے ہوتے ہوئے عورت کا زنا میں مبتلا ہونا نہایت ہی قبیح ہے لہٰذا اس کی تقبیح اور تشنیع شان کی غرض سے اسے مقدم ذکر کیا۔

پس ثابت ہوا کہ مرد کی کثرتِ خواہش کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے متعدد بیویاں ہوں۔

نیز کثرتِ نساء وقلتِ رجال مذکور ہونے کے ساتھ مشاہد بھی ہے اولاً تو عورت کی پیدائش زیادہ ہے اور مردوں کی کم، ثانیاً عالمگیر جنگوں میں مرد ہی تباہ وبرباد ہوتے رہتے ہیں۔ پس اگر تعدد ازدواج کا مسئلہ

تسلیم نہ کیا جائے تو عورت کی مکافات کے لئے اتنے مرد کہاں سے آئیں گے ؟

اب رہا حصر فی الاربع کا مسئلہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عورت چار مہینے تک نفسانی خواہش کو ضبط کر سکتی ہے چنانچہ قرآن میں مسئلہ ایلاء اور عدتِ متوفیٰ عنہا زوجہا اس پر بیّن دلیل ہے۔

ایلاء میں چار ماہ سے زیادہ مدت تک مرد کا بیوی کے پاس نہ جانا چونکہ ظلم تھا اس لئے شریعت نے چار ماہ کے بعد عورت کو خیار دیدیا، اسی طرح جاہلیت میں عدتِ وفات ایک سال تھی شریعت نے اسے ظلم قرار دیتے ہوئے چار مہینے دس دن سے زائد مدت کو ساقط کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کے وقت کسی گلی میں سے گذر رہے تھے کان میں کسی عورت کی آواز پڑی جو یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

فو اللہ لولا اللہ تخشی عواقبہ ⁂ لزحزح من ھذا السریر جوانبہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر مدتِ طویلہ سے جہاد میں گیا ہوا ہے حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا کہ سمجھدار عورتوں کی شوریٰ بلا کر یہ طے کرو کہ عورت کتنی مدت تک ضبط کر سکتی ہے چنانچہ متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ چار ماہ کی مدت تک عورت صبر کر سکتی ہے۔

بناءً علیہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قانون بنا دیا کہ اس مدت سے زیادہ کوئی شادی شدہ سپاہی جہاد میں نہ رہے۔

اسی کے پیش نظر فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ چار مہینے میں ایک دفعہ ہمبستری کرنا دیانۃً فرض ہے۔

اور مرد کے لئے مدتِ ضبط شرعاً منقول نہیں مگر کئی ایک معاملات میں مدتِ شہر کو کثیر شمار کیا جاتا ہے جیسے کہ بیع سلم اور عند البعض اختلاف مطالع میں مدتِ شہر کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ نیز ایک ماہ میں قمر اپنا دور کامل کر لیتا ہے جس کا انسانی خون پر اثر پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کی قوتِ برداشت کی انتہا ایک مہینہ ہے اور عورت کی چار ماہ، دونوں کے تناسب سے معلوم ہوا کہ ایک مرد کے لئے چار بیویاں کافی ہو سکتی ہیں۔

نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وطی سے مقصد توالد ہے اور موجب توالد وہ وطی ہوتی ہے جو حیض کے بعد ہو اور انقطاعِ حیض کے بعد مرد کے لئے شہوت صادق بھی ہوتی ہے، حیض عام طور پر تندرست عورت کو مہینے میں ایک دفعہ آتا ہے اس بناء پر مرد ہر مہینے میں ایک وطی کا محتاج ہے اور عورت چار مہینے میں۔ تو ثابت ہوا کہ ایک زوج کے لئے چار بیویوں کی ضرورت ہے۔ (ارشاد القاری)

باب ۶۴ فضلِ العلم • ص ۱۸

علم کی فضیلت کا یا زائد علم کا بیان۔

۸۱ ● حدثنا سعيدُ بنُ عُفيرٍ قال حدثني الليثُ قال حدثني عُقيلٌ عن ابنِ شهابٍ عن حمزةَ بنِ عبدِ الله بنِ عُمرَ أنّ ابنَ عُمرَ قال سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقول بينما أنا نائمٌ أُتيتُ بِقدحِ لبنٍ فشربتُ حتى أنّي لأرى الرِيَّ يخرجُ في اظفاري ثمّ اعطيتُ فضلي عمر بنَ الخطابِ قالوا فما اوّلتَه يارسول الله قال العلم ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے کہ ایک بار میں سو رہا تھا میرے سامنے دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے پی لیا (خوب اچھی طرح پی لیا) حتی کہ میں نے دیکھا کہ اس کی تازگی میرے ناخنوں میں جھلک رہی ہے پھر میں نے اپنا بچا ہوا (جو تھا دودھ) عمر بن الخطاب کو دیدیا صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ نے اس کی کیا تعبیر لی؟ فرمایا "علم"۔

ربط گذشتہ باب میں علم کا ذکر تھا اور اس باب میں بھی علم ہی کا بیان ہے، فرق صرف ایک وصف میں ہے کہ گذشتہ باب میں رفعِ علم کا ذکر تھا اور اس میں فضلِ علم کا ذکر ہے فالمناسبة بين البابين ظاهر۔

تعدد الحديث: - والحديث هنا ص۱۸ ویاتی ص۵۲۰ وص۱۰۳۷ ایضا ص۱۰۳۷ وص۱۰۴۰ وص۱۰۴۱۔

مقصد ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمۃ الباب سے یہ بتانا ہے کہ جو علم اپنی ذات سے متعلق نہ ہو بلکہ حاجت اور ضرورت سے زائد اور فاضل ہو تو کیا ضرورت سے زائد علم کے حصول سے ان فضائل کا تعلق ہو گا جو فضیلتیں علم کے متعلق وارد ہوئی ہیں یا مالا یعنیہ میں شمار ہو گا؟

ایک روایت میں ہے من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ، یعنی لایعنی چیزوں سے احتراز انسان کے اسلام کی خوبی ہے۔

امام بخاریؒ نے یہ باب منعقد کر کے بتلا دیا کہ اس میں بھی ثواب ہو گا، علم مطلقاً مفید اور مطلوب ہے مثلاً ایک مفلس نادار مزدور ہے تو زکوٰۃ و حج کے مسائل سیکھنا باعثِ ثواب ہو گا یا نہیں؟ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ثواب ہو گا کیونکہ خود اگرچہ نفع حاصل نہیں کر سکتا مگر دوسروں کو تو تعلیم دے سکتا ہے کیونکہ تعلم علم سے فقط عمل ہی مقصود نہیں تبلیغ و تعلیم بھی ایک اہم مقصود ہے۔ غرض اس باب سے بھی تبلیغ و تعلیم کی اہمیت و فضیلت مقصود ہے۔

اشکال یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ کتاب العلم کی ابتداء میں بعینہ یہ ترجمہ "باب فضل العلم" آچکا ہے اور پھر یہاں دوبارہ ذکر کیا جا رہا ہے جس سے ترجمۃ الباب کا تکرار لازم آرہا ہے۔

جواب: - اس کے متعدد جوابات منقول ہیں ۱ ابتداء میں فضیلتِ علماء کو بیان کرنا مقصود تھا اور اس باب میں علم کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔

ع۲ ماقبل میں فضل بمعنی فضیلت ہے اور یہاں فضل بمعنی فضلہ یعنی زائد کے معنیٰ میں ہے۔
ع۳ ماقبل میں علم کی فضیلتِ کلی بیان کی گئی تھی اور یہاں جزئی فضیلت بیان کی جارہی ہے وغیرہ۔

علم اور دودھ میں مناسبت

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں دونوں کثیر النفع اور مفید ہونے میں مشترک ہیں، دودھ انسان کی فطری غذا اور مقوی بدن ہے اور علم روح کی فطری غذا ہے اس پر دین و دنیا دونوں کی صلاح و فلاح موقوف ہے، اور دودھ سے جسم میں تازگی آتی ہے تو علم پر قلوب کی حیات کا مدار ہے وغیرہ وغیرہ (امداد الباری ۶ ج ۲)

وتفسیر اللبن بالعلم لاشتراکهما فی کثرة النفع بهما (فتح)

انی لاری الری (بکسر الراء و تشدید الیاء) از باب سمع۔ مصدر الری ریاً اور بمعنی ریّاً آتا ہے بمعنی سیراب ہونا۔

فی اظفاری علامہ عینیؒ فرماتے ہیں یہاں فی بمعنی علیٰ ہے جیسے قرآن حکیم میں ہے:
ولاصلبنکم فی جذوع النخل (سورۂ طٰہٰ) اور سولی دونگا تم کو کھجور کے تنہ پر۔

اور بعض روایت میں ہے من اظفاری۔ (فتح)۔

تنبیہ

اس روایت سے سیدنا ابوبکر صدیقؓ پر حضرت عمر فاروقؓ کی فضیلت کا شبہ درست نہیں کیونکہ یہ ایک جزئی فضیلت ہے جو کلی فضیلت کو مستلزم نہیں۔ اس لئے صدیق اکبرؓ کی شان میں ارشاد نبوی ہے: ماصبّ الله فی صدری صببتہ فی صدر ابی بکر۔
ع۲ اس روایت میں صدیق اکبرؓ کا تذکرہ ہی نہیں اور ظاہر ہے کہ عدم ذکر عدمِ شئی پر دال نہیں ہو سکتا ہے کہ حاضرین میں صدیق اکبرؓ موجود ہی نہ ہوں۔
بہر حال صدیق اکبرؓ اکبر ہیں افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق پر اہلِ سنت کا اجماع ہے۔

باب الفتیا وھو واقف علی ظھر الدابۃ او غیرھا۔ ص۱۸

جانور وغیرہ پر سوار ہو کر دین کا مسئلہ بتانا۔

الفتیا بضم الفاء اسم وکذا الفتویٰ وھو الجواب فی الحادثة (عینی)

۸۲ حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابن شهاب عن عیسیٰ بن طلحة بن عبید الله عن عبد الله بن عمرو بن العاص ان رسول الله صلی الله علیه وسلم وقف فی حجة الوداع بمنیٰ للناس یسألونه فجاء رجل فقال لم اشعر فحلقت قبل ان اذبح قال اذبح ولا حرج فجاء آخر فقال لم اشعر فنحرت قبل ان ارمی قال ارم ولا حرج فما سئل النبی صلی الله علیه وسلم عن شیٔ قدم ولا اخر الا قال افعل ولا حرج ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں ٹھہرے اس لئے کہ لوگ آپ سے (دین کے مسئلے) پوچھیں گے چنانچہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا، آپ نے فرمایا اب قربانی کرلے کوئی مضائقہ نہیں، پھر دوسرا آدمی آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کرلی، آپ نے فرمایا اب کنکریاں مارلے کچھ مضائقہ نہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ (اس دن) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو پوچھا گیا کوئی بات کسی نے آگے کرلی یا پیچھے کردی تو آپ نے یہی فرمایا جو ہوگیا ہونے دے کوئی مضائقہ نہیں جو باقی ہے اسے اب کرلے۔

مطابقۃ الحدیث للترجمۃ: من حیث أن المذکور فی الحدیث هو الاستفتاء والإفتاء والترجمۃ هی الفتیا۔

ربط ما قبل علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گذشتہ باب میں علم کی فضیلت کا بیان تھا اور اس باب میں فتویٰ کا بیان ہے یہ بھی علم ہی ہے۔

تعداد الحدیث: والحدیث ههنا ۱۸ ویاتی ص۲۳ تا ص۲۴ و ص۲۳۴ و ص۹۸۶۔

مقصد ترجمہ اس باب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد کیا ہے؟ حافظ عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عالم کسی سواری پر سوار ہو اور اسی حالت میں کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو عالم کے لئے سوار رہ کر جواب دینا جائز ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عالم سے ہر حالت میں سوال کرنا جائز ہے خواہ عالم پیدل چل رہا ہو یا سوار ہو کر، کھڑا ہو یا بیٹھا؟ ہر حال میں مسئلہ بتانا جائز ہے۔

۳ ایک روایت میں ہے لا تتخذوا ظهور دوابکم منابر (رواہ ابوداؤد ص۳۴۲، مشکوۃ ص۳۴۰) یعنی جانوروں کی پشت کو منبر نہ بناؤ، منبر کا کام مت لو۔ اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ جانور پر سواری کی حالت میں فتویٰ دینا، مسئلہ بتانا ممنوع ہو، امام بخاری رحمہ اللہ نے جواز ثابت کرنے کے لئے یہ باب منعقد فرمایا کہ صرف مسئلہ بتادینا ممنوع نہیں ہے البتہ دیر تک بیٹھ کر گفتگو کرنا یا باضابطہ مقدمات کا فیصلہ کرنا، لمبی تقریر کرنا منبر بنانا ہے اور ممنوع ہے۔

تشریح حدیث میں ہے وقف فی حجۃ الوداع اور ترجمۃ الباب میں ہے واقف علی ظهر الدابۃ بظاہر مطابقت معلوم نہیں ہوتی؟ اس کی دو توجیہ ہے:

۱۔ حدیث میں وقوف کا لفظ عام ہے اور ہر عام کے تحت خاص داخل ہوتا ہے اس لئے مطابقت ہوگئی۔

۲۔ یہ روایت یہاں مختصر ہے، کتاب الحج ص۲۳۴ پر یہی حدیث آرہی ہے جس میں پورا جملہ موجود ہے وقف علی ناقتہ الخ امام بخاری رحمہ اللہ کا اشارہ مفصل روایت کی طرف ہے۔

اذبح ولا حرج یعنی اب ذبح کرلو اس میں کوئی گناہ نہیں، دوسرے سے فرمایا ارم ولا حرج

یعنی اب کنکریاں مارلو کوئی حرج نہیں الخ یہ مسئلہ کتاب الحج کا ہے تفصیلی بحث اپنی جگہ پر آئیگی انشاء اللہ الرحمن۔

مختصر یہ ہے کہ یوم النحر سے متعلق چار چیزیں ہیں رمی، ذبح، حلق یا قصر، طواف۔
طواف میں کوئی ترتیب نہیں مقدم بھی کرسکتے ہیں اور مؤخر بھی باقی تینوں میں احناف کے نزدیک ترتیب واجب ہے، خلافِ ترتیب عمل کی صورت میں کفارہ یعنی دَم واجب ہوگا، یہی مالکیہ کا مذہب ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک ترتیب واجب نہیں بلکہ سنت ہے، چنانچہ یہ لوگ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ارشاد نبوی ہے "ولاحرج"
حنفیہ ومالکیہ کی جانب سے یہ جوابات دیئے جاتے ہیں:۔
۱ یہ حدیث آپ کے بھی خلاف ہے کیونکہ ترکِ سنت میں بلا شبہ حرج ہے۔
۲ لاحرج میں صرف اخروی گناہ کی نفی ہے کیونکہ ان لوگوں نے لاعلمی کی وجہ سے غلطی کی جیساکہ لم اشعر کے لفظ سے ظاہر ہے، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معذور سمجھ کر سائل کی پریشانی کو دفع فرمایا تھا سائل نے لزوم گناہ سمجھ کر اظہار پریشانی کیا تھا، رہا معاملہ دم کے وجوب کا؟ اس سے یہاں کوئی تعلق نہیں۔
۳ لاحرج سے مراد گناہ اور دَم دونوں کی نفی مراد لی جائے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے ہی مخصوص تھا کیونکہ لاعلمی عذر تھی۔
پھر اگر حاجی مفرد ہے تو اس پر تو قربانی واجب ہی نہیں قربانی تو صرف قارن اور متمتع پر واجب ہے پس مفرد کے ذمہ صرف دو چیز رمی اور حلق میں ترتیب ہے کہ رمی کی تقدیم حلق پر ضروری ہے۔

• باب ۶۷ مَن اَجابَ الفُتیا باشارةِ الیدِ والرّاسِ • ص ۱۸

باب جس نے فتویٰ کا جواب ہاتھ یا سر کے اشارے سے دیا۔

ربط باب سابق میں بھی فتویٰ کا بیان تھا اور اس باب میں بھی فتویٰ ہی کا ذکر ہے اس لئے دونوں باب کے درمیان مناسبت ظاہر ہے۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصد اس باب سے یہ ہے کہ کسی مسئلہ کا جواب سر یا ہاتھ کے اشارے سے بھی دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ اشارہ اپنے مقام ومحل کے لحاظ سے مفہم ہو، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جواب بالاشارہ ثابت ہے جیساکہ اس باب کی پہلی دو حدیثوں (حدیث ۸۳ و ۸۴) سے واضح ہے۔
۲ دوسری غرض یہ ہو سکتی ہے کہ امام بخاریؒ فتویٰ اور قضا میں فرق بیان کرنا چاہتے ہیں یعنی ہاتھ یا سر کے اشارے سے نفیاً یا اثباتاً فتویٰ دینا تو جائز ہے مگر قضا میں جائز نہیں۔

۸۳ • حدثنا موسیٰ بنُ اسمٰعیلَ قال حدثنا وُهَیبٌ قال ثنا ایوبُ عن عِکرِمةَ عن ابنِ عباسٍ انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سُئِلَ فی حَجّتہٖ فقال ذبحتُ قبل ان اَرمِیَ قال فَاَوْمَأَ بیَدِہٖ قال ولاحرجَ وقال حلقتُ قبلَ اَن اَذبحَ فاَومأ بیدہٖ ولاحرجَ •

ترجمہ:۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے (آخری) حج میں پوچھا گیا، ایک شخص نے کہا میں نے رمی کرنے (کنکریاں مارنے) سے پہلے ذبح کرلیا، آپؐ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا کچھ حرج نہیں اور ایک شخص نے کہا میں نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا آپؐ نے ہاتھ سے اشارہ فرمادیا کہ کچھ حرج نہیں۔

تعدد الحدیث:۔ والحدیث ھٰھنا ۱۸ ویاتی فی المناسک ۲۳۲ و ۲۳۳ وفی النذور ۹۸۶

فاوما بیدہ قال ولا حرج آپؐ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ کچھ حرج نہیں۔

امام بخاریؒ نے اَوْمَا کے لفظ سے استدلال کیا ہے، مگر بظاہر یہاں معلوم ہوتا ہے کہ نطق اور اشارہ دونوں جمع فرمائے ہیں گو احتمال یہ بھی ہے کہ قال لا حرج یہ بیان ہو اس اشارہ کا اور ترجمہ کے ساتھ یہی انسب و الیق ہے۔

۸۴ ● حدثنا المکیُّ بنُ ابراھیمَ قال اَنا حنظلۃُ عن سالمٍ قال سمعتُ اباھریرۃَ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یُقبَضُ العِلمُ وَیَظھرُ الجَھلُ وَالفِتَنُ وَیکثُرُ الھَرَجُ قیل یا رسولَ اللہ وما الھَرَجُ فقال ھٰکذا بیدہٖ فحرّفھا کانّہ یُرِیدُ القتلَ ●

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا (دین کا علم) اٹھا لیا جائے گا اور جہالت اور فتنے پھیل جائیں گے اور ہرج بڑھ جائیگا، آپؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ہرج کیا ہے؟ آپؐ نے اپنے ہاتھ کو ترچھا کر کے فرمایا گویا آپؐ نے قتل مراد لیا۔

مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ترجمۃ الباب میں اشارہ بالید والراس ہے مذکورہ دونوں روایتوں میں اشارہ بالید ظاہر ہے، اشارہ بالراس کے لئے امام بخاریؒ نے اس کے بعد والی حدیث (یعنی اس باب کی تیسری حدیث) کو ذکر کیا ہے۔

تعدد الحدیث:۔ والحدیث ھٰھنا ۱۸ ویاتی ۱۴۱ و ۸۹۲ و ۱۰۴۶ و ۱۰۵۴۔

اس حدیث کے الفاظ کی شرح باب رفع العلم میں گذر چکی ہے یہاں تو امام بخاریؒ کا استدلال اس بات سے ہے کہ جب صحابہ کرامؓ ہرج کے معنی نہ سمجھ سکے تو آپؐ سے سوال کیا تو آپؐ نے ہاتھ کے اشارہ سے جواب دیا اور ہاتھ کو ترچھا کر کے بتلایا جیسے کسی کی گردن اڑائی جاتی ہے۔

۸۵ ● حدثنا موسی بنُ اسمٰعیلَ قال ثنا وُھیبٌ قال ثنا ھشامٌ عن فاطمۃَ عن اسماءَ قالتْ اتیتُ عائشۃَ وھیَ تُصلِّی فقلتُ ما شانُ الناسِ فاشارتْ الی السّماءِ فاذا الناسُ قیامٌ فقالتْ سبحانَ اللہ قلتُ اٰیۃٌ فاشارتْ براسِھا ای نعمْ فقمتُ حتی تجلانی الغَشْیُ فجعلتُ اَصُبُّ علی راسی الماءَ

فَحَمِدَ اللّٰهَ النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وَاثنیٰ علیہ ثمّ قال ما مِنْ شئیٍ لَمْ اَکُنْ اُرِیتُہٗ اِلّا رأیتُہٗ فی مَقامی ھٰذا حتی الجنّۃَ والنّارَ فاُوحِیَ اِلَیَّ اَنّکم تُفتَنُونَ فی قبورِکم مثلَ اوقریبَ لا ادری ایَّ ذٰلک قالت اسماءُ مِن فِتنۃِ المسیحِ الدّجّالِ یُقال ما عِلمُک بہٰذا الرجلِ فامّا المؤمِنُ اَوِ الموقِنُ لا ادری ایّہما قالت اسماءُ فیقولُ ھو محمّدٌ ھو رسولُ اللّٰہ جاءَنا بِالبیّنٰتِ والھدیٰ فاجبناہُ وَاتّبعناہُ ھو محمّدٌ ثلٰثاً فیُقال نَم صالحاً قد عَلِمْنا اِنْ کنتَ لَمُوقِنًا بہ واَمّا المُنافِقُ اَوِ المُرتابُ لا ادری ایَّ ذٰلک قالت اسماءُ فیقولُ لا ادری سمعتُ الناسَ یقولونَ شیئاً فقلتُہٗ ●

ترجمہ حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس آئی وہ نماز پڑھ رہی تھیں میں نے کہا لوگوں کا کیا حال ہے؟ (یعنی لوگ پریشان کیوں ہیں؟) تو انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا (یعنی سورج کو گہن لگا ہے) دیکھا کہ لوگ کھڑے ہیں حضرت عائشہؓ نے کہا "سبحان اللہ" میں نے کہا کیا کوئی (عذاب یا قیامت کی) نشانی ہے؟ انہوں نے سر ہلا کر کہا ہاں، تب میں بھی (نماز میں) کھڑی ہوگئی یہاں تک کہ مجھ کو غش آنے لگا میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تعریف اور خوبی بیان کی پھر فرمایا۔ جو چیزیں ایسی تھیں کہ (یہاں رہ کر) مجھے دکھلائی نہیں جاسکتی تھیں ان سب کو میں نے (آج) اس جگہ سے دیکھ لی یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ بھی دیکھ لیا، اور مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے کہ تم لوگ اپنی قبروں میں اس طرح یا اس کے قریب آزمائے جاؤ گے۔ (فاطمہ کو یاد نہیں کہ اسماء نے کونسا کلمہ کہا) جیسے مسیح دجال سے آزمائے جاؤ گے (تم سے) کہا جائیگا اس شخص کے بارے میں (یعنی حضور اقدس کے بارے میں) کیا اعتقاد رکھتے تھے، ایماندار یا یقین رکھنے والا (معلوم نہیں اسماء نے کونسا لفظ کہا) کہیگا وہ محمد ہیں۔ اللہ کے رسول ہیں، ہمارے پاس اللہ کی ہدایت اور دلیلیں لیکر آئے تو ہم نے ان کا کہنا مان لیا اور ان کی پیروی کی وہ محمدؐ ہیں تین بار (ایسے ہی کہیگا) پھر اس سے کہا جائیگا کہ تو مزے سے سوجا ہم تو (پہلے ہی) جان چکے تھے کہ ان پر یقین رکھتا ہے۔ اور منافق یا شک کرنیوالا (نہیں معلوم کہ اسماءؓ نے کونسا لفظ کہا ان دونوں میں سے) یوں کہیگا میں کچھ نہیں جانتا (میں نے تو دنیا میں کچھ غور ہی نہیں کیا) لوگوں کو جو کہتے سنا وہی میں بھی کہنے لگا۔

مطابقتہ للترجمۃ: مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی "فاشارت براسہا ای نعم"۔

تعدد الحدیث: والحدیث ھٰھنا ص۱۸ ویاتی فی الطھارۃ ص۳۰ تا ص۳۱ وص۱۲۶ وص۱۴۲ ایضاً ص۱۴۳ وص۱۶۵ وص۳۴۳ وفی الاعتصام ص۱۰۸۲۔

حضرت اسماءؓ کا مختصر حال

ھی بنت ابی بکر الصدیق زوجۃ الزبیر رضی اللّٰہ عنہم اجمعین

حضرت اسماءؓ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن تھیں، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ماجدہ ہیں، ہجرت سے ستائیس ۲۷ سال پہلے پیدا ہوئیں اور سو ۱۰۰ برس کی عمر پاکر جمادی الاولیٰ ۷۳ھ میں انکا انتقال ہوا مگر نہ کوئی دانت گرا اور نہ عقل و ہوش میں کوئی فرق آیا۔

سفرِ ہجرت میں توشہ دان باندھنے کو جب کچھ نہ ملا تو اپنی کمر کا پٹکا پھاڑ کر ایک ٹکڑا سے توشہ دان باندھ دیا اس پر حضور اکرمؐ نے ذات النطاقین کے شرف سے نوازا اور ارشاد فرمایا کہ خداوند قدوس اس کے عوض جنت میں دو نطاق عطا فرمائیں گے۔

بڑی شجاع، صبر و استقلال کی پہاڑ تھیں، جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہو گئے اور حجاج بن یوسف نے ان کی نعش مبارک کو سولی پر چڑھایا تو اپنے نورِ نظر لختِ جگر کے نعش پر تشریف لائیں اور فرمایا کہ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ یہ شہ سوار سواری سے اترے؟ حجاج نے ان کو بلوایا، انکار کر دیا، دھمکی دی لیکن کوئی پروا نہ کی، حجاج خود آیا تو نہایت دلیری سے کہنے لگیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ثقیف میں ایک کذاب ہو گا اور ایک سفاک، کذاب تو ہم نے دیکھا اور سفاک تیرے سوا کوئی نہیں۔

قالت اتیت عائشۃؓ وھی تصلی الخ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس آئی وہ نماز پڑھ رہی تھیں الخ۔

اس میں نماز کسوف کا ذکر ہے جس کی پوری تفصیل تو ابواب کسوف میں آئے گی انشاء اللہ الرحمٰن۔

مختصر یہ کہ ۱۰ھ ربیع الاول میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی اتفاق سے اس روز سورج میں گہن لگا، حضور اقدسؐ نے الصلوٰۃ جامعۃ کے ذریعہ نمازِ کسوف کی منادی کرائی صحابہ کرامؓ نماز کے لئے جمع ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف باجماعت پڑھائی نماز ہو رہی تھی کہ حضرت اسماءؓ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں داخل ہوئیں، دیکھا کہ حضرت عائشہؓ نماز میں ہیں، حضرت اسماء مسجد میں اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر گھبرا گئیں ازواج مطہرات حجروں میں سے حضور اقدسؐ کی اقتداء کر رہی تھیں اور حضورؐ مع الجماعت مسجد میں تھے، حضرت اسماءؓ نے حضرت عائشہؓ سے اس ہجوم کا سبب پوچھا حضرت عائشہؓ نے اسماء کے جواب میں آسمان کی جانب اشارہ کیا اور سبحان اللہ کہا کہ یہ ہجوم اور پریشانی سورج گہن کی وجہ سے ہے۔

فاذا الناس قیام یہاں روایت میں تقدیم و تاخیر ہے کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ حضرت اسماءؓ نے سوال سے پہلے لوگوں کے ہجوم کو دیکھا پھر سوال کیا فقالت سبحان اللہ حضرت عائشہؓ نے حضرت اسماء کے سوال کا جواب آسمان کی جانب اشارہ سے دیا جو مفسد صلوٰۃ نہیں۔

اور سبحان اللہ ان کے سوال کے جواب میں نہیں بلکہ عائشہ نے تنبیہ فرمائی کہ میں نماز میں ہوں اور تم سوال کر رہی ہو۔ اور تنبیہ کے طور پر سبحان اللہ یا الحمد للہ یا اللہ اکبر کہنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

قلت آیۃ اسماء کہتی ہیں کہ میں نے کہا کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے ؟ یعنی ہمزہ استفہام محذوف ہے سورج گہن اور چاند گہن کو حضور اقدس نے بھی آیتان فرمایا ہے اور بعض روایتوں میں یخوف اللہ عبادہ بھی ہے تاکہ چاند سورج کے پرستش کرنے والے اور غافل وبدکار اللہ تعالیٰ کے غضب وعتاب سے ڈریں۔

فاشارت براسھا ای نعم اس روایت میں فاشارت دوجگہ ہے مگر پہلی جگہ صرف فاشارت ہے اور دوسری جگہ فاشارت براسھا ہے اگر دونوں جگہ اشارہ بالراس ہی مراد ہو تو ترجمۃ الباب کا ایک جزء اشارہ بالراس ثابت ہوگا اور پہلا جزو اشارہ بالید سابق روایت سے ثابت ہوگا، لیکن موطا میں پہلی جگہ فاشارت بید ھا ہے اس صورت میں پورا ترجمۃ الباب اشارہ بالید والراس اس روایت سے ہی ثابت ہوجا ئیگا۔

مگر یہ حضرت عائشہ رضہ کا فعل ہے جو بظاہر مرفوع نہیں اس لئے امام بخاریؒ کا استدلال درست نہیں لیکن حافظ فرماتے ہیں کہ یہ نماز کا واقعہ ہے اور نمازیوں کا حال آپؐ پر منکشف ہوجاتا تھا اور آپؐ نے نماز کے بعد منع نہیں فرمایا اس لحاظ سے حکماً یہ مرفوع ہے کہ آپؐ کی تقریر ثابت ہوگئی۔ (امداد الباری جلد خامس)

فقمت حتی علانی الغشی حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں بھی نماز کے لئے کھڑی ہوگئی، حضور اکرمؐ نے اس نماز میں قیام بہت زیادہ طویل کیا تھا اس طولِ قیام وغیرہ اور گرمی کی شدت کی وجہ سے مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ غشی کے قریب کیفیت ہونے لگی یعنی سر چکرانے لگا معلوم ہوا کہ غشی سے مراد غشی مثقل یعنی بے ہوشی نہیں ہے کیونکہ بیہوشی ناقضِ وضو ہے اور اس پر واضح قرینہ خود روایت میں موجود ہے۔

فجعلت اصب علی رأسی الماء اگر حقیقۃً غشی (بے ہوشی) ہوتی تو سر پر پانی ڈالنے کا ہوش ہی کیسا رہتا فحمد اللہ الخ یعنی نماز کے بعد آپؐ نے خطبہ پڑھا اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور فرمایا:۔

ما من شیئ لم اکن اریتہ الا رایتہ مطلب یہ ہے کہ وہ سارے فتنے یا ثواب وعقاب جو دنیا یا آخرت میں پیش آنے والے تھے وہ سب دکھا دیئے گئے حتی الجنۃ والنار یہاں تک کہ بہشت ودوزخ بھی، الجنۃ والنار میں تینوں اعراب جائز ہے۔ رفع اگر حتی ابتدائیہ ہو، اور اگر حتی عاطفہ ہو تو نصب اور اگر حتی جارہ ہو تو جر۔

بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے پردے ہٹا دیئے گئے تھے اور آپؐ نے اپنی چشم مبارک سے جنت وجہنم کو دیکھا جیساکہ واقعۂ معراج میں کفار ومشرکین جب مسجد اقصیٰ کے بارے میں سوالات کئے تو آپؐ نے مسجد اقصیٰ کا پورا نقشہ پیش کر دیا۔

بعض روایت میں ہے کہ جنت ودوزخ کی صورتیں قبلہ کی دیوار میں متمثل کر دیئے گئے جس طرح آئینہ کے اندر چیزوں کی صورتیں متمثل ہوا کرتی ہیں یا عالم مثال کو سامنے کر دیا گیا۔

اشکال:۔ اشکال یہ ہے کہ جنت ودوزخ کو تو آپؐ نے شب معراج میں دیکھا تھا ؟

جواب :۔ اس روایت میں مقامی ھذا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سرزمین پر رہتے ہوئے میں نے جنت وجہنم کو بھی دیکھ لیا اور شب معراج کا واقعہ عالم بالا کا ہے فلا اشکال۔

جنت و دوزخ موجود ہے

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جنت و دوزخ اس وقت بھی موجود ہے، نیز قرآنی آیات سے ثابت ہے۔ لیکن یہ سوال کرنا کہ جنت و دوزخ اگر موجود ہے تو کہاں ہے اور کس طرف ہے؟ اس زمانہ میں تو ساری کائنات کا جغرافیہ معلوم کر لیا گیا ہے مگر کہیں جنت وجہنم کا پتہ نہیں؟

اولاً تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ساری کائنات کا جغرافیہ معلوم کر لیا گیا کیونکہ دنیا کی عظیم دریافت نے بھی اس دعویٰ کی تکذیب کر دی ہے۔

ثانیاً اگر بالفرض تم نے معلوم کر بھی لیا تو صرف اس عالم کا جغرافیہ معلوم کیا جنت وجہنم کا وجود دوسرے عالم میں ہے، جنت وجہنم کے وجود کی دوسری نوع ہے ایک عالم کے اعتبار سے این و متی کا سوال ہو سکتا ہے مثلاً کوئی پوچھے کہ فلاں شہر کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ تو کہا جا سکتا ہے کہ پورب ہے یا پچھم ہے، شمال میں ہے یا جنوب میں، کیونکہ اس کا تعلق ہمارے عالم سے ہے مگر جنت وجہنم کا تو عالم ہی اور ہے۔

عالم تین ہیں

علامہ ابن قیم رحؒ نے لکھا ہے کہ دار یعنی عالم تین ہیں۔ دنیا، برزخ، آخرت۔ ہر ایک کے قوانین و حالات جدا ہیں ایک عالم میں دوسرے عالم کا سوال ہی بے جا ہے، جو قانون وہاں ہے وہ یہاں نہیں، مثلاً عالم حیوانات ہے کوئی شخص گدھے سے کہے کہ انسان کا عالم ایسا ہے، اس کے ایسے کھانے ہیں، ایسے آرام ملتا ہے تو وہ کیا سمجھے گا؟ درحقیقت یہ تمام عالم موجود ہیں مگر ہماری نظریں انہیں نہیں دیکھ سکتیں جب حجاب اٹھ جائیگا سب منکشف ہو جائیگا، یہی وجہ ہے کہ جب حجاب اٹھ گئے تو حضور اقدس ﷺ نے دیکھ لیا۔

مثل او قریب لا ادری الخ حضرت اسمار کی شاگرد فاطمہ کہتی ہیں کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ حضرت اسماءؓ نے مثل فتنۃ المسیح الدجال کہا تھا یا قریب فتنۃ المسیح الدجال کہا۔ اسی طرح مومن کہا یا موقن کہا منافق کہا یا مرتاب کہا، یہ کمال احتیاط ہے کہ جس لفظ میں شبہ تھا اس کو ظاہر کر دیا۔

مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے وحی کے ذریعہ بتایا گیا کہ قبر میں تمہارا امتحان ہوگا جو دجال کے فتنہ ہی جیسا ہولناک اور شدید ہوگا یا اس کے قریب قریب۔

فتنۂ دجال سے اس لئے تشبیہ دی کہ یہ فتنہ مشہور ہے، حضرت نوحؑ ہی کے زمانہ سے انبیاء علیہم السلام اس فتنہ سے ڈراتے رہے ہیں مگر دونوں فتنوں میں بہت فرق ہے اس لئے کہ دجال کا فتنہ اس دنیا میں ہوگا جو دار التکلیف والعمل ہے، اس پر احکام کا مدار ہے۔ اور قبر کا امتحان تکلیف و عمل کے طور پر نہ ہوگا بلکہ اظہار عمل اور انجام پر مطلع کرنے کے لئے ہوگا۔

يقال ما علمك بهذا الرجل اى يقال للمفتون. ماعلمك مبتدأ وخبره بهذا الرجل (قس) والجملة وقعت مقول المقول یعنی تم سے کہا جائیگا کہ اس شخص (ذات اقدس) کے باب میں کیا عقیدہ رکھتے تھے، اس مسئلہ کی تفصیل تو انشاء اللہ کتاب الجنائز میں آئے گی۔

مختصراً یہ ہے کہ یہ بتایا گیا ہے کہ قبروں میں تم آزمائے جاؤ گے اور یہ آزمائش دجال کے زمانہ کی آزمائش کیطرح ہوگی یا اس کے قریب ہوگی۔ دجال کی آزمائش کی صورت یہ ہوگی کہ جب وہ قبروں پر قوموا کہے گا تو شیاطین قبروں سے برآمد ہوں گے جن کی صورت مردے کی ہوگی لوگ اس سے اپنے رشتہ داروں کے متعلق سوال کریں گے تو وہ انہیں زندہ کرکے دکھلائیگا، الوہیت کا دعویٰ کریگا، قوموا باذنی کے الفاظ اہل قبور سے کہیگا اور مردے اٹھتے دکھائی دیں گے، یہ وقت انتہائی آزمائش کا وقت ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس ابتلائے عظیم کی طرح ایک ابتلاء تمہیں اپنی قبروں میں پیش آنے والا ہے اور وہ یہ کہ منکر نکیر آئیں گے خوفناک صورت، سخت مزاج پھر تنہائی، سوال کریں گے مَن ربّك، ما دِينك، مَن هٰذا الرجل؟ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ یہ کون ہیں؟

ھٰذا کا مشارٌ الیہ کیا ہے؟

قبر میں منکر نکیر کے تیسرے سوال میں ھٰذا کا مشارٌ الیہ کیا ہے اس میں مختلف اقوال ہیں:۔

عا بعض کی رائے یہ ہے کہ ھٰذا الرجل سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ فرشتہ ماعلمک بمحمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہیگا اس صورت میں ہٰذا الرجل راوی کی اپنی تعبیر ہوگی۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں الأظهر انه سمّى له یعنی زیادہ ظاہر یہ ہے کہ فرشتہ آپؐ کا اسم مبارک (محمدؐ) ذکر کرکے سوال کریگا جیسا کہ بعض روایات میں لفظ محمدؐ کی تصریح ہے۔

عا۲ بعض کی رائے ہے کہ آپؐ تو اپنی جگہ تشریف فرما ہوں گے میت اور آپؐ کے درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائیگا، جیسے معراج کے واقعہ میں فجلى الله لى بيت المقدس آیا ہے۔

عا۳ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صفات بیان کئے جائیں گے کہ ایسے ایسے شخص جو تمہارے پاس ایسی ایسی چیزیں لائے تھے ان کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ کیا قول ہے؟ (درس بخاری ص۳۲۷)

نم صالحًا اچھی طرح آرام کر۔ ہم نے نم کا ترجمہ "سوجا" نہیں کیا اس وجہ سے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردوں کو بھی کسی نہ کسی کام میں لگا دیتے ہیں، بعض تلاوت کرتے ہیں، بعض نمازیں پڑھتے ہیں۔ مکلف نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اب ان پر ضروری نہیں رہا مگر وہ یہ از خود بطور التذاذ کرتے ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ اللہ ایک بار جنت میں پہونچا دے تو ہم کہیں گے کہ ہمیں اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں بس ایک مصلی بھر جگہ دیدی جائے کہ ہمیشہ نماز پڑھتے رہیں تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ

مکلف ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں لذت اسی میں ملتی ہے "جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ"
یہاں کافر مجاہر کا ذکر نہیں ہے مگر بعض روایات میں تصریح ہے اس لئے تحقیق یہ ہے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا۔ واللہ اعلم۔

باب ۶۷ تَحرِيضِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وَفدَ عبدِ القَيسِ علیٰ اَن يَّحفَظُوا الايمانَ والعِلمَ ويُخبِروا مَن وَّرائَهم وقال مالِكُ بنُ الحُوَيرِثِ قال لنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم اِرجِعوا اِلیٰ اهليكم فعَلِّمُوهم۔ ص ۱۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلۂ عبدالقیس کے وفد کو اس بات کی ترغیب دینا کہ ایمان اور عمل کی باتیں یاد کرلیں اور جو لوگ ان کے پیچھے (اپنے ملک میں) ہیں ان کو خبر کردیں۔ اور مالک بن حویرث نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جاؤ اور انہیں (دین کا) علم سکھاؤ۔

ربط گذشتہ باب میں استفتاء اور فتوی یعنی سوال وجواب کا ذکر تھا جس کا حاصل یہی ہے کہ علمی باتوں کو سمجھو اور دوسروں کو بتاؤ اب اس باب میں اسی چیز کو بالتصریح بیان فرمارہے ہیں۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمہ سے اس بات کی تاکید ہے کہ علم حاصل کرنے کے بعد تعلیم وتبلیغ سے غافل نہ ہوں نیز معلم کے لئے ضروری ہے کہ شاگردوں کو دو باتوں کی ہدایت وتلقین کرے ؁۱ جو کچھ پڑھا اور سیکھا ہے اس کو پورے طور پر یاد کریں۔
؁۲ اور اسے اپنی ذات تک محدود نہ رکھیں بلکہ دوسروں تک پہونچانا بھی اپنے ذمہ سمجھیں۔

۸۶ • حدثنا محمدُ بنُ بشّارٍ قال حدثنا غُندَرٌ قال حدثنا شعبةُ عن اَبی جَمرَةَ قال كنتُ اُترجِمُ بين ابنِ عبّاسٍ وبينَ النّاسِ فقال اِنّ وفدَ عبدِ القيسِ اَتَوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال مَنِ الوَفدُ اَو مَنِ القومُ قالوا رَبِيعةُ قال مرحبا بالقومِ او بالوفدِ غيرَ خزايا ولا نَدامىٰ قالوا اِنّا نَاتيكَ مِن شُقّةٍ بَعيدةٍ وبيننا وبينك هذا الحيُّ مِن كفارِ مُضَرَ ولا نستطيع ان ناتيكَ اِلّا فی شهرٍ حرامٍ فمُرنا بامرٍ نُخبِرُ به مَن وَّرائَنا نَدخُل به الجنةَ فاَمَرَهُم باربعٍ ونهاهم عن اربعٍ، اَمَرَهم بالايمانِ باللہ وحدَه قال هل تدرونَ ما الايمانُ باللہ وحدَه قالوا اللہ ورسوله اَعلمُ قال شهادةُ اَن لا اله الّا اللہ واَنّ محمدًا رّسولُ اللہ واِقامُ الصلوٰةِ واِيتاءُ الزكوٰةِ وصومُ رمضانَ وتُعطُوا الخُمُسَ مِنَ المغنمِ، ونهاهم عن الدُّبّاءِ والحنتمِ والمُزَفّتِ قال شعبةُ وربّما قال

المنقیر وربما قال المقیّر قال احفظوہ واخبروہ من وراءکم ●

ترجمہ ابوجمرہ کا بیان ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور (بصرہ کے) لوگوں کے درمیان مترجم تھا ایک دن عبداللہ بن عباسؓ نے کہا قبیلہ عبدالقیس کا وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کون قاصد ہے یا (یہ پوچھا کہ) کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا ہم ربیعہ کے لوگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا مبارک ہو قوم کو آنا یا مبارک ہو اس وفد کو جو کبھی نہ رسوا ہوا نہ شرمندہ ہوا اور کہنے لگے ہم آپؐ کے پاس دور کا سفر کرکے آئے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا یہ قبیلہ (پڑتا) ہے (اس کے خوف کی وجہ سے) ہم شہر حرام کے علاوہ اور ایام میں حاضر نہیں ہوسکتے اس لئے ہمیں کوئی ایسی قطعی بات بتلا دیجئے جس کی خبر ہم اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو کردیں اور اس کی وجہ سے ہم جنت میں داخل ہوسکیں تو آپؐ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع فرمایا۔

ان کو حکم دیا خدائے واحد پر ایمان لانے کا، فرمایا تم جانتے ہو خدائے واحد پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، آپؐ نے فرمایا۔ یوں گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں ہے اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور غنیمت کے مال سے پانچواں حصہ ادا کرنا۔

اور ان کو منع کیا کدو کے تونبے اور سبز لاکھی برتن سے اور روغنی برتن سے۔ شعبہ نے کہا کہ ابوجمرہ نے کبھی تو کہا اور کریدے ہوئے لکڑی کے برتن سے اور کبھی کہا مزفت کے بدلے مقیر، آپ نے فرمایا اس کو یاد کرلو اور اپنے پیچھے والوں کو اس کی خبر کردو۔

مطابقته للترجمة:۔ مطابقة الحدیث للترجمة ظاهرة فی قوله "احفظوه واخبروه من ورائکم"

پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے نصر الباری کتاب المغازی ص۴۴۲ کا "باب وفد عبدالقیس" نیز اس پہلی جلد میں کتاب الایمان کا باب ۴۰ حدیث ۵۱ دیکھئے۔

● بابُ الرحلةِ فی المسئلةِ النّازلةِ ● ص۱۹

باب ۶۸

کوئی مسئلہ جو پیش آیا ہو اس کے لئے سفر کرنا (کیسا ہے؟)

ربط ومقصد گذشتہ باب میں علی الاطلاق تعلیم وتبلیغ کی ترغیب وتاکید تھی اور کلی علم کا ذکر تھا اب اس باب میں ایک جزئی مسئلہ کے لئے سفر کا اثبات فرمارہے ہیں کہ اگر ہنگامی طور پر کوئی خاص جزئی مسئلہ درپیش ہو اور حکم معلوم نہ ہو اور نہ ہی مقامی طور پر کوئی مفتی موجود ہو تو ایسی صورت میں قیاس آرائی درست نہیں بلکہ سفر کرکے کسی عالم سے معلوم کرے۔

۸۷ ● حدثنا محمدُ بنُ مقاتلٍ ابوالحسنِ قال انا عبدُ اللّٰه قال انا عمرُ بنُ

سعیدِ بنِ ابی حُسینٍ قال حدثنی عبدُ اللہِ بنُ ابی مُلیکۃَ عن عُقبۃَ بنِ الحارثِ اَنّہ تزوّجَ ابنۃً لِاَبی اھابِ بنِ عزیزٍ فاتتہُ امراۃٌ فقالتْ اِنی قد ارضعتُ عُقبۃَ والتی تزوّج بہا قال لہا عقبۃُ ما اَعْلَمُ اَنّکِ اَرضَعْتِنِی وَلا اَخبَرْتِنِی فرَکِبَ الیٰ رسولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ فسألہٗ فقال رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کیفَ وَقد قِیلَ ففارقَہا عُقبۃُ و نَکحتْ زوجاً غیرَہٗ ●

ترجمہ عبداللہ بن ابی ملیکہ نے بیان کیا انہوں نے عقبہ بن حارث سے سنا کہ انہوں نے (یعنی عقبہ نے) ابواہاب بن عزیز کی بیٹی (غنیہ) سے نکاح کیا پھر ایک عورت آئی (اس کا نام نہیں معلوم) کہنے لگی میں نے تو عقبہ اور اس کی دلہن (غنیہ) کو دودھ پلایا ہے۔ عقبہ نے اس سے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تو نے مجھ کو دودھ پلایا ہے نہ تو نے مجھ سے پہلے کبھی یہ بیان کیا، پھر عقبہ سوار ہو کر (اپنے ملک مکہ سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ کو چلے اور آپؐ سے پوچھا آپ نے فرمایا (تو اس عورت سے) کیونکر (صحبت) کریگا جب ایسی بات کہی گئی (کہ وہ تیری بہن ہے) آخر عقبہ نے اس کو چھوڑ دیا، اور اس نے دوسرے سے نکاح کر لیا۔

مطابقۃ للترجمۃ :- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی قولہٖ "فرکب الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

تعدد الحدیث :- والحدیث ھھنا ص۱۹ ویاتی فی البیوع ص۲۷۶ وفی الشہادات ص۳۶۰ ایضاً ص۳۶۳ وفی النکاح ص۷۶۴ تا ص۷۶۵۔

اشکال اشکال یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے ابواب سابقہ میں طلب علم کے لئے سفر "باب الخروج فی طلب العلم" میں بیان کر چکے ہیں اس لئے اب یہ باب الرحلۃ سے بظاہر تکرار معلوم ہو رہا ہے۔

جواب :- اس اشکال کا جواب ربط کے عنوان میں دیا جا چکا ہے قال الحافظؒ والفرق بین ھٰذہ الترجمۃ وترجمۃ باب الخروج فی طلب العلم ان ھٰذا اخص وذالک اعم۔

تشریح امام بخاریؒ نے حضرت عقبہ بن حارثؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عقبہؓ نے صرف ایک مسئلہ کے لئے مکہ سے مدینہ کا سفر کیا، امام بخاریؒ کا مقصد ثابت ہو گیا۔

حضرت عقبہؓ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو اہاب بن عزیز کی لڑکی غنیہ سے نکاح کیا جس کی کنیت ام یحییٰ تھی جب شادی ہو گئی تو ایک عورت نے کہا کہ میں نے عقبہ اور غنیہ دونوں کو دودھ پلایا ہے یعنی یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں ان کا باہمی نکاح کیسے درست ہوگا؟ عقبہ نے کہا مجھے کوئی علم نہیں کہ تم نے مجھ کو دودھ پلایا ہے اور نہ تم نے نکاح سے پہلے اس کی اطلاع دی، عقبہؓ کا مقصد یہ تھا کہ نکاح کا معاملہ چھپ چھپا کر نہیں ہوتا اگر یہ حقیقت ہے تو تم نے اس کی اطلاع پہلے کیوں نہ دی؟

حضرت عقبہؓ نے اس عورت کو تو یہ جواب دے دیا مگر اپنے اطمینان کی غرض سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ مسئلہ دریافت کیا کہ اس حالت میں ایک عورت کا قول معتبر ہو سکتا ہے یا نہیں ؟۔

تنہا مرضعہ کی شہادت ثبوت رضاعت کیلئے کافی ہے یا نہیں ؟

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ تنہا دودھ پلانے والی کی شہادت کافی ہے مزید شہادت کی حاجت نہیں۔

امام احمدؒ کا استدلال اسی روایت سے ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے تنہا مرضعہ کی شہادت کا اعتبار فرمایا۔
جمہور ائمہ کے نزدیک ثبوت رضاعت کے لئے بھی نصاب شہادت ضروری ہے اور یہ نصاب شہادت عام ضابطۂ شہادت کے مطابق ہوگا جو دعاوی میں معتبر مانا جاتا ہے۔

واستشھدوا شھیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان الخ (البقرہ) اپنے مردوں میں سے دو شخصوں کو گواہ بنالیا کرو پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے اور یہ حدیث بظاہر امام احمدؒ کے موافق ہے۔

جمہور ائمہ کی طرف سے حنابلہ کے جوابات:۔

۱۔ اس روایت سے حنابلہ کا استدلال درست نہیں کیونکہ حنابلہ کے نزدیک مرضعہ کی شہادت مع الیمین ضروری ہے اور یہاں شہادت ہی ثابت نہیں کیونکہ شہادت عدالت میں ہوتی ہے اور اس حدیث سے تو ظاہر ہے کہ مرضعہ دربار نبوی میں حاضر ہی نہیں ہوئی ہے چہ جائیکہ شہادت مع الیمین ہو۔

۲۔ امام بخاریؒ نے کتاب البیوع میں اشارہ کیا ہے کہ تنہا مرضعہ کی شہادت سے تفریق کرانا عام قانون نہیں اور نہ شریعت حرمت کو ثابت کرتی ہے ہاں اس سے ایک قسم کا شک و شبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اسی لئے دع ما یریبک الی ما لا یریبک کا لحاظ کر کے شبہ سے اجتناب کے لئے تورعاً فرمایا کیف وقد قیل، یہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ حرمت کا قطعی حکم نہیں اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک بھی تنہا مرضعہ کی شہادت موجب حرمت نہیں بلکہ صرف مورث شبہ ہونے کی وجہ سے احتراز کرنا چاہئے۔ نیز شبہ پیدا ہونے کے بعد اس بیوی کے ساتھ مخالطت میں انبساط نہ ہوگا، عمر بھر کا معاملہ ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موجب انقباض رہے گا جس کا امور معاشرت و تربیت اولاد پر برا اثر پڑیگا۔

یہ مسئلہ کتاب الرضاع اور کتاب الشہادت کا ہے، مفصل بحث اپنی جگہ پر آئیگی انشاء اللہ تعالیٰ۔

• باب ۶۹ التناوب فی العلم • ص ۱۹

باب: علم حاصل کرنے کے لئے باری مقرر کرنا۔

مطلب یہ ہے کہ عدیم الفرصت (کثیر المشاغل) کے لئے تحصیلِ علم کا طریقہ۔

ربط ابواب سابقہ سے امام بخاریؒ نے یہ بتایا تھا کہ تحصیل علم کے لئے اگر سفر کی ضرورت پیش آئے تو بھی تامل نہ کرنا چاہئے اگرچہ صرف ایک مسئلہ ہی کی خاطر سفر کرنا پڑے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو تحصیلِ علم کا جذبہ اور شوق ہے مگر کثرتِ مشاغل کی وجہ سے مہلت نہیں پاتا تو ایسے حضرات کے لئے امام بخاریؒ باری کا طریقہ بیان کرتے ہیں۔

مقصد عدیم الفرصت لوگوں کو تحصیلِ علم کا ایک طریق بتلانا مقصود ہے کہ گھر کے افراد طلب علم کے لئے باری مقرر کرلیں، ایک روز ایک شخص طلب علم کے لئے جائے اور دوسرے افراد اپنے ضروری کاموں میں مشغول رہیں یہ شخص جو کچھ سیکھ کر آئے شام میں گھر آکر اپنے ساتھیوں کو سکھا دے، دوسرے روز دوسرا شخص طلبِ علم کے لئے چلا جائے اور رات میں آکر دوسروں کو سکھا دے۔

۸۸ ● حدثنا ابوالیمانِ قال انا شعیبٌ عن الزهریِّ ح قال ابو عبد الله وقال ابنُ وهبٍ أنا یونسُ عن ابنِ شہابٍ عن عُبَیدِ اللهِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ ابی ثورٍ عن عبدِ اللهِ بنِ عباسٍ عن عُمَرَ رضی الله عنه قال کنتُ أنا وجارٌ لی من الانصارِ فی بنی اُمیّةَ بنِ زیدٍ وھی مِن عوالی المدینةِ وکنّا نتناوبُ النزولَ علی رسولِ الله صلی الله علیه وسلم یَنزلُ یوماً وأنزلُ یوماً فاذا نزلتُ جئتُه بخبرِ ذٰلك الیومِ من الوحیِ وغیرِہ واِذا نزلَ فعلَ مثلَ ذٰلك فنزلَ صاحبی الانصاریُّ یومَ نوبته فضربَ بابی ضرباً شدیداً فقال أثَمَّ ھو ففزعتُ فخرجتُ الیه فقال حدثَ امرٌ عظیمٌ فدخلتُ علی حفصةَ فاذا ھی تبکی فقلتُ اَطلّقکنّ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم قالت لاادری ثمّ دخلتُ علی النبی صلی الله علیه وسلم فقلتُ وَاَنا قائمٌ اَطلّقتَ نساءَك قال لا فقلتُ الله اکبر ●●

ترجمہ حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی عوالی مدینہ کے ایک گاؤں بنی امیہ بن زید میں رہتے تھے اور ہم دونوں باری باری رسول الله صلی الله علیہ وسلم کی خدمت میں (مدینہ طیبہ) حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک روز وہ حاضر ہوتا اور ایک روز میں، جس دن میں حاضر ہوتا تو اس دن کی ساری خبریں وحی وغیرہ جو آپؐ پر نازل ہوتی اس کو بتلا دیتا، اور جس روز وہ آپؐ کی خدمت میں جاتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا، ایک دن ایسا ہوا کہ میرا ساتھی انصاری اپنی باری کے دن آپؐ کی خدمت میں گیا اس نے وہاں سے آکر میرا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا، کہنے لگا عمر ہیں؟ میں گھبرا کر باہر نکل آیا وہ کہنے لگا آج تو بڑا سخت

ہوا؟ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی، یہ سنکر میں (اپنی بیٹی) حفصہ کے پاس پہونچا تو وہ رورہی تھیں، میں نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو طلاق دیدی؟ اس نے کہا میں نہیں جانتی؟ پھر میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے کھڑے ہی کھڑے آپ ﷺ سے دریافت کیا کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں میں نے کہا اللہ اکبر۔

مطابقۃ للترجمۃ :۔ مطابقة الحديث للترجمة ظاهرة فی قوله "كنا نتناوب النزول"

تعدد الحدیث :۔ والحديث ههنا صـ۱۹ ويأتی فی ابواب المظالم صـ۳۳۴ وفی التفسير صـ۴۲۹ تا صـ۴۳۰ وفی النكاح صـ۷۸۰ وايضا صـ۱۰۷۷ وصـ۱۰۷۸

تشریح حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے ایک پڑوسی انصاری بنی امیہ بن زید کے قبیلے میں رہتے تھے، اس انصاری کا نام عتبان بن مالک تھا، مدینہ منورہ کی شرقی جانب کو عوالی نیز مدینہ کے قریب بلندی پر جو گاؤں تھے ان سبکو عوالی کہا جاتا تھا اور جو علاقے مدینہ طیبہ سے مغرب جانب نشیب میں تھے ان کو سوافل کہا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ بنی امیہ بن زید عوالی مدینہ کا ایک گاؤں تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری جایا کریں گے کیونکہ روزانہ گاؤں سے آنے جانے میں کسب معاش اور دیگر ضروریات میں حرج ہوتا تھا۔

ایک دن یہ میرا پڑوسی (عتبان بن مالکؓ) آیا اور میرا دروازہ بہت زور سے کھٹکھٹایا اور دریافت کیا اَثَمَّ هو کیا وہ یہاں ہیں؟ میں تو گھبرا کر باہر نکل آیا فقال حدث امر عظیم انصاری پڑوسی نے کہا آج تو ایک بڑا حادثہ پیش آگیا، یہاں روایت میں اختصار ہوگیا مفصل روایت صـ۷۸۰ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے پوچھا اجاء غسانی، چونکہ اس وقت یہ خبریں سنی جاتی تھیں کہ مدینہ طیبہ پر غسانی چڑھائی کرنیوالے ہیں اسلئے حضرت عمرؓ کے دل میں فوراً اس طرف خیال گذرا، عتبان بن مالکؓ نے کہا کہ نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حادثہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ازواج مطہرات کو طلاق دیدی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضور اقدس ﷺ نے ایلاء لغوی کیا تھا اور جاہلیت میں ایلاء کو طلاق سمجھتے تھے اس لئے طلاق کی خبر مشہور ہوگئی اور اسی کو حضرت عتبان نے نقل کردی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو پریشان کرنے کیلئے منافقین نے مشہور کردیا جس کو سنکر حضرت عتبان نے نقل کردی۔ بہرحال حضرت عمرؓ بمشکل رات گذار کر پہلے اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس پہونچے دیکھا تو وہ رو رہی ہیں، پوچھا کیا حضور ﷺ نے طلاق دیدی ہے؟ کہنے لگیں لا ادری، اس سے حضرت عمرؓ کی پریشانی میں کچھ کمی ہوئی، حضرت حفصہؓ مزاج کی کچھ تیز تھیں حضرت عمرؓ نے بیٹی سے کہا کہ تمہیں دھوکہ نہ ہو کہ حضور ﷺ جس طرح عائشہ کو محبوب رکھتے ہیں مجھے بھی رکھیں، خبردار جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا حضور ﷺ سے کبھی نہ کہنا پھر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہونچے اور حاضری کی اجازت چاہی تین مرتبہ اجازت چاہنے کے بعد اجازت ملی تو حاضر خدمت ہو کر سب سے پہلے یہ سوال کیا: کیا ازواج مطہرات کو طلاق دیدی؟ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں، حضرت عمرؓ نے فرح و سرور یا حیرت و تعجب کیساتھ اللہ اکبر کہا۔ بہرحال امام بخاریؒ نے یہ ثابت کردیا کہ ضروریات کی وجہ سے تحصیل علم کیلئے باری مقرر کرنا درست ہے اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ بہرحال علم سے لاپرواہی درست نہیں۔ نیز حضرت عمرؓ کے اس تناوب فی العلم سے ثابت ہوا کہ خبر واحد حجت ہے، اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو ایک دوسرے کی خبر قبول نہ کرتے۔

بَابُ الْغَضَبِ فِی الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِیْمِ اِذَا رَاٰی مَا یَکْرَهُ ص۱۹

وعظ کہنے یا پڑھانے میں ناپسندیدہ امر دیکھے تو غصّہ کرنا۔

ربطِ ماقبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں تنادب فی العلم کا بیان تھا جو منجملہ متعلمین (یعنی طلبہ) کی صفات میں سے ہے اب اس باب میں بھی منجملہ طلبہ کے صفات کا ذکر ہے کہ معلم (استاد) اگر طلبہ کی کوئی نا شائستہ حرکت دیکھے، بے ضابطگی اور بدعنوانی پائے تو اظہارِ غصہ کر سکتا ہے اور بطورِ تنبیہ اظہارِ غصہ عین شفقت ہے لأن الرهبوت خیر من الرحموت۔

مقصد مقصد یہ ہے کہ ہر جگہ غضب و غصہ قبیح نہیں ہے بلکہ بعض مواقع پر غضب ضروری ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو جگہ پر غضب آتا تھا۔ ایک جبکہ محارم توڑے جائیں۔ ۲ دوسرے لایعنی فضول سوالات پر۔

۸۹ ● حدثنا محمدُ بنُ کثیرٍ قال اخبرنی سفیانُ عن ابنِ ابی خالدٍ عن قیسِ بنِ ابی حازمٍ عن ابی مسعودٍ الانصاریِّ قال قال رجلٌ یا رسولَ اللّٰہ لا اکادُ اُدرِکُ الصلوٰةَ مما یُطَوِّلُ بنا فلانٌ فما رایتُ النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی موعظةٍ اشدَّ غضباً من یومئذٍ فقال اَیُّہا الناسُ اِنکم منفِّرونَ فمَن صلّی بالناسِ فلیُخَفِّفْ فاِنَّ فیہم المریضَ والضعیفَ وَذَا الحاجةِ ●

ترجمہ حضرت ابومسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ فلاں شخص لمبی نماز پڑھاتا ہے اس لئے میں (جماعت کی) نماز میں شریک نہیں ہو سکتا (ابومسعودؓ کہتے ہیں کہ) میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی وعظ میں اس دن سے زیادہ غصہ میں نہیں دیکھا، آپؐ نے فرمایا "اے لوگو تم لوگوں کو (جماعت سے) متنفر کرنے والے ہو، پس جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی نماز پڑھے (یعنی مختصر پڑھے) کیونکہ ان میں بیمار، کمزور اور ضرورتمند (سب ہی قسم کے لوگ) ہوتے ہیں"

مطابقته للترجمة مطابقة الحدیث للترجمة فی قوله "فی موعظة اشد غضبا من یومئذ"

تعدد الحدیث والحدیث ههنا ص۱۹ ویاتی ص۹۷ وص۹۸ وفی الادب ص۹۰۳ وفی الاحکام ص۱۰۶۰

۹۰ ● حدثنا عبدُ اللّٰہِ بنُ محمدٍ قال حدثنا ابو عامرٍ العَقَدِیُّ قال ثنا سلیمان بن بلالٍ المدینیُّ عن ربیعةَ بنِ ابی عبد الرحمن عن یزیدَ مولی المُنْبَعِثِ عن زیدِ بنِ خالدٍ الجُهَنِیِّ اَنَّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سالہ رجلٌ عن اللُّقَطَةِ فقال اِعرِفْ وِکاءَها او قال وِعاءَها وعِفاصَها ثم عَرِّفْها سنةً ثم استَمتِعْ بها فاِنْ جاءَ رَبُّها فاَدِّها الیہ قال فضالةُ الابلِ فغضِبَ حتی احمَرَّتْ وَجنتاہُ او قال احمرَّ وجهُهُ فقال مالكَ ولها معها سِقاؤُها وحِذاؤُها تَرِدُ الماءَ وترعَی الشجرَ فذَرْها حتی یلقاها رَبُّها قال فضالةُ الغنمِ قال لك

او لأخيك او لِلذِّئبِ ●

ترجمہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ (گری پڑی ہوئی چیز) کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "اس کا بندھن پہچان لو یا آپؐ نے فرمایا کہ اس کا برتن اور اس کی تھیلی (پہچان لو) پھر ایک سال تک اس کی شناخت (کا اعلان) کراؤ پھر (اس کا مالک نہ ملے تو) اس سے فائدہ حاصل کرو (یعنی اپنے کام میں لاؤ) پھر اگر (ایک سال کے بعد بھی) اس کا مالک آجائے تو اس کو ادا کردو، اس نے پوچھا کہ گم شدہ اونٹ؟ (یعنی گم شدہ اونٹ اگر ملے تو کیا حکم ہے؟) یہ سن کر آپؐ اتنا غصہ ہوئے کہ آپؐ کے دونوں رخسارے سرخ ہو گئے یا (راوی نے یہ کہا) کہ آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا، آپؐ نے فرمایا تجھے اونٹ سے کیا واسطہ؟ اس کے ساتھ اس کی مشک اور اس کا جوتا ہے وہ خود پانی پر پہونچتا ہے اور درخت سے چرلیتا ہے لہٰذا اسے چھوڑ دو یہاں تک کہ اس کا مالک مل جائے۔ اس نے کہا کہ گم شدہ بکری؟ آپؐ نے فرمایا وہ تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی (اس کے مالک) کے لئے یا بھیڑئے کے لئے (غذا) ہے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "فغضب حتی احمرت وجنتاہ"

تعدد الحدیث والحدیث ھھنا ص ۱۹ و یاتی فی المساقات ص ۳۱۹ و فی اللقطۃ ص ۳۲۷ ایضا ص ۳۲۷ تا ص ۳۲۸ و ایضا ص ۳۲۸ تا ص ۳۲۹ ایضا ص ۳۲۹ و فی الطلاق ص ۷۹۷ و فی الادب ص ۹۰۲

تشریح لقطۃ (بضم اللام و فتح القاف) الشیئ الملقوط، عمدۃ یعنی گری پڑی ہوئی چیز جس کا مالک موجود نہ ہو اٹھالی جائے۔ بعض اہل لغت نے بسکون القاف بھی صحیح کہا ہے۔ اعرف صیغہ امر از باب ضرب۔ وکاء بکسر الواؤ بندھن، وہ رسّی جس سے مشک وغیرہ باندھی جائے، نیز تھیلی، ڈاٹ۔ وعاء بکسر الواؤ ظرف، برتن۔ سنۃ منصوب بنزع الخافض ای مدۃ سنۃ۔ عرفھا سنۃ یہ مسئلہ تو دراصل کتاب اللقطہ کا ہے مختصر یہ ہے کہ ایک سال تک تعریف ضروری نہیں بلکہ لقطہ کی مالیت پیش نظر رکھتے ہوئے جب ظن غالب ہو جائے کہ مالک مایوس ہو گیا ہوگا تو یہ حکم ہے کہ واجد (پانے والا) اگر خود مسکین ہے تو خود صرف کر سکتا ہے اور اگر غنی ہے تو تصدق علی الفقیر لازم ہے، اگر اس کے بعد مالک کا علم ہو گیا تو دونوں صورتوں میں ضمان لازم ہوگا الا ان یرضی المالک۔

فغضب غضب اس لئے تھا کہ اس زمانہ میں خیر غالب تھا اس لئے اونٹ کے ضائع ہونے کا کوئی احتمال ہی نہ تھا لہٰذا ضالۃ الابل کے بارے میں سوال کرنا فضول تھا، لیکن آج کل شر کی وجہ سے یہ حکم نہیں لہذا ضالۃ الابل کی حفاظت کے لئے اسے پکڑ کر تعریف کرنا اور مالک پر رد کرنا ضروری ہے۔ غرضیکہ اس زمانہ میں ضالۃ الابل اور ضالۃ الغنم کا ایک ہی حکم ہے۔

پوری تفصیل اس مسئلہ کی کتاب اللقطہ میں آئیگی انشاء اللہ الرحمان۔

۹۱ ● حدثنا محمد بن العلاء قال حدثنا ابو اسامۃ عن برید عن ابی بردۃ عن ابی موسیٰ

قال سُئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن اشیاءَ کرِھَہا فلمّا اُکثِرَ علیہ غضِبَ ثم قال للناس سلونی عمّا شئتم فقال رجلٌ مَن اَبی قال ابوکَ حذافۃُ فقامَ آخرُ فقال مَن اَبی یا رسول اللہ قال ابوکَ سالمٌ مولیٰ شیبۃ فلمارأی عُمرُ مافی وَجھِہٖ قال یارسول اللہ انا نتوبُ الی اللہ عزّ وجلّ ● ص۱۹ تا ص۲۰

ترجمہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں دریافت کی گئیں جو آپؐ کو ناگوار ہوئیں چنانچہ جب اس طرح کے سوالات کی بہتات ہوئی تو آپؐ کو غصہ آگیا اور پھر آپؐ نے لوگوں سے فرمایا (اچھا یونہی سہی) اب جوچاہو پوچھتے جاؤ، ایک شخص (حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ) نے پوچھا میرا باپ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے، پھر دوسرا کھڑا ہو (سعید بن سالم) کہنے لگا یا رسول اللہؐ میرا باپ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیرا باپ سالم ہے شیبہ کا آزاد کردہ۔ جب حضرت عمرؓ نے آپؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا تو کہنے لگے یارسول اللہ ہم اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں۔

مطابقتہ للترجمہ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "فلمّا اکثر علیہ غضب

تعدد الحدیث والحدیث ھھنا ص۱۹ تا ص۲۰ و یاتی فی الاعتصام ص۱۰۸۳

سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن اشیاء اشیاء غیر منصرف ہے
ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات کئے گئے جو ناپسندیدہ تھے۔
دراصل یہ نامعقول اور غیر ضروری سوالات منافقین نے آپؐ کو لاجواب اور پریشان کرنے کیلئے کئے تھے اور بعض بھولے بھالے مخلص مسلمان بھی نافہمی سے اس میں مبتلا ہو گئے جیساکہ عبداللہ بن حذافہ رضؓ اور سعید بن سالم جنھوں نے اپنے اپنے باپ کے متعلق سوال کیا۔
حضرت عبداللہ بن حذافہ کو لوگ نسب کے بارے میں مطعون کرتے تھے کہ تم اپنے باپ حذافہ کے نطفہ سے نہیں ہو اس بنا پر حضرت عبداللہ رضؓ حضور اقدسؐ سے پوچھ بیٹھے یارسول اللہ! میرے باپ کون ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا تمہارے باپ حذافہ ہیں، حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ بہت خوش ہوئے کہ آج معاملہ صاف ہوگیا، لوگوں کے شکوک وشبہات ختم ہو گئے اب کوئی میرے نسب پر طعن نہیں کریگا خوشی خوشی گھر گئے اور ماں کو مژدہ سنایا تو ماں نے ملامت کی اور کہا تو مجھے رسوا کرنے کے لئے گیا تھا، جاہلیت کے دور میں فجور کی کثرت تھی خدانخواستہ اگر تیری ماں سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوتیں تو وہ آج کیسی رسوا ہوتی؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر حضورؐ کسی اور کو تبلاتے تو میں اسی کو باپ کہتا خواہ کچھ ہوتا۔
سبحان اللہ یہ تھا صحابہ کرام کا ایمان ویقین کی پختگی کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا تھا مگر ان کو جو یقین پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر تھا وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتا تھا۔
سلونی عمّا شئتم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کی وجہ سے فرمایا تھا بعض نے حقیقت پر

محمول کرکے سوالات شروع کردیئے مگر حضرت عمر فاروق رضؓ سمجھ گئے کہ آپؐ حالتِ غضب میں فرما رہے ہیں تو عرض کیا یارسول اللہ إنا نتوب الی اللہ عزوجل صحیح بخاری ص۱۰۸۳ پر اسی حدیث میں یہ الفاظ ہیں من احب ان یسئل عن شیئ فلیسئل عنہ فواللہ لا تسئلونی عن شیئ الا اخبرتکم بہ مادمت فی مقامی ھذا " اس سے ثابت ہوا کہ حضور اقدسؐ کا معجزہ تھا جو اسی مقام کے ساتھ مخصوص تھا اس کا دوام و استمرار ثابت نہیں بلکہ نصوص اس کی نفی کرتی ہے۔

بابُ مَن بَرَكَ علی رُكبَتَيهِ عِندَ الامامِ اَوِ المُحَدِّثِ ص۲۰

امام یا محدث کے سامنے دوزانو (ادب سے) بیٹھنا۔

ربط و مقصد گذشتہ باب میں عالم اور استاد کے اس غضب کا ذکر تھا جو متعلم کی بے ادبی اور بدعنوانی کی وجہ سے ہوتا ہے اب اس باب میں اس ادب و احترام کو بتایا جا رہا ہے جو متعلم کو استاد کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔

امام بخاریؒ کا مقصد واضح ہے کہ متعلم کو اپنے استاد و شیخ کے سامنے ادب سے بیٹھنا چاہئے۔

۹۲ ● حدثنا ابو الیمانِ قال انا شعیبٌ عن الزهریِّ قال اخبرنی انسُ بنُ مالكٍ اَنَّ رسولَ اللهِ صلی اللهُ علیه وسلم خرجَ فقامَ عبدُ اللهِ بنُ حُذافةَ فقال من اَبی قال ابوكَ حُذافةُ ثمَّ اَكثرَ اَن یَّقولَ سَلونی فبرَكَ عُمرُ علی رُكبتیهِ فقال رَضینا باللهِ ربًّا و بالاسلامِ دینًا و بمحمدٍ صلی اللهُ علیه وسلم نبیًّا ثلثًا فسكتَ ●

ترجمہ حضرت انس بن مالکؓ نے بیان کیا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو عبداللہ بن حذافہؓ کھڑے ہوئے اور پوچھنے لگے میرا باپ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے، پھر بار بار فرمانے لگے کہ مجھ سے پوچھو آخر حضرت عمرؓ (یہ حال دیکھ کر) دو زانو بیٹھ گئے اور کہنے لگے ہم اللہ کے رب ہونے سے اور اسلام کے دین ہونے سے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے سے خوش ہیں تین بار یہ کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

مطابقتہ للترجمہ مطابقة الحديث للترجمة ظاهرة فی قوله "فبرك عمر علی ركبتيه".

تعدد الحدیث والحديث هٰهنا ص۲۰ ویاتی ص۷۷ وفی التفسیر ص۶۶۵ وفی الدعوات ص۹۴۱ و ص۱۰۵۰ وفی الاعتصام ص۱۰۸۳

تشریح حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو عبداللہ بن حذافہؓ نے کھڑے ہو کر آپؐ سے پوچھا کہ میرے والد کون ہیں؟

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں حذف ہے جو دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ والتقدیر

خرج فسئل فاکثروا علیه فغضب فقال سلونی فقام عبد اللہ بن حذافة الخ آپؐ باہر تشریف لائے جب آپؐ سے سوالات کی بہتات ہوئی تو آپؐ غصہ ہو گئے اور فرمایا جو چاہو پوچھو۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے دو چیزیں اختیار فرمائیں ایک تو آپؐ کے سامنے دو زانو ہو کر ادب سے بیٹھ گئے۔

دوسری یہ کہ زبان سے یہ کلمات دہرانے شروع کر دیئے "ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہیں، بعض روایتوں میں" وبالقرآن اماماً "اور قرآن کے امام ہونے پر راضی ہیں۔

یعنی اب ہمیں کسی سوال کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا فہم ابن بطالؒ کہتے ہیں کہ ان کلمات سے حضرت عمرؓ کے فہم و بصیرت اور علم و فضل کا پتہ چلتا ہے، حضرت عمرؓ جب سمجھ گئے کہ سوالات تعنت اور تشک کے طور پر ہیں تو ڈرنے لگے کہ شاید اس وجہ سے نزول عذاب ہو جائے چنانچہ حضرت عمرؓ کے ان کلمات سے آپؐ راضی ہو گئے اور آپؐ کا غصہ فرو ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کے ان کلمات میں جہاں حضور اقدسؐ کے لئے تادب و احترام تھا وہاں مسلمانوں کے لئے جذبۂ شفقت بھی تھا کہ آپؐ کو اذیت پہونچا کر اس آیت کے مصداق نہ بنیں:

ان الذین یؤذون اللہ ورسوله لعنهم اللہ فی الدنیا والآخرة واعدّ لهم عذابا مهینا۔ (احزاب)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں یقیناً اللہ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس سے ہر متعلم کو سبق ملتا ہے کہ استاذ سے فیما یحتاج الیه کے سوا سوالات نہ کئے جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ ایسے سوالات جن سے اپنی قابلیت و بڑائی کا اظہار مقصود ہو یا دوسروں کی توہین و تذلیل ہو ممنوع ہیں ورنہ مسلم مسئلہ ہے فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون اگر علم نہ ہو تو فرائض کا پوچھنا فرض، واجبات کا پوچھنا واجب اور مستحبات کا پوچھنا مستحب ہے۔

بَابُ مَنْ اَعَادَ الْحَدِيْثَ ثَلٰثًا لِيُفْهَمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا ●

ربط گذشتہ باب میں متعلم کے ادب و احترام کو بیان کیا گیا تھا اب اس باب میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب متعلم اتنا مؤدب و وفادار ہے تو معلم کو بھی چاہیئے کہ تعلیم و تفہیم میں اس کی رعایت کریں۔

اگر مسئلہ اہم ہے یا مشکل ہے تو افہام کے لئے مکرر سہ کرر بیان کریں۔

مقصد امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ معلم کو چاہئے کہ تعلیم میں متعلمین و مخاطبین کا خیال رکھے، مثلاً مضمون مشکل ہے یا متعلم ذہین نہیں ہے تو مضمون کو مکرر سہ کرر بیان کر دے جیسا کہ لِيُفْهَم سے واضح ہو رہا ہے یہ مطلب نہیں کہ ہر ہر بات کو دہرایا جائے بلکہ جن مواقع میں تکرار کی ضرورت ہو وہاں مکرر بیان کرے۔

ع۲ امام بخاریؒ کا مقصد ان لوگوں کا رد ہے جو حدیث کے دہرانے کو یا متعلم کی جانب سے دہرائے جانے کی طلب کو درست نہیں سمجھتے۔

ع۳ بعض نے بیان کیا کہ امام بخاریؒ اس ترجمہ سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بلید (غبی) کے لئے زیادہ سے زیادہ تین بار دہرایا جا سکتا ہے۔ (فتح)

الا وقول الزور، ہو طرف من حدیث ابی بکرۃ سیاتی موصولاً فی الشہادات ص۳۶۲

۹۳ ● حدثنا عَبْدَةُ قال ثنا عبدُ الصمدِ قال ثنا عبدُ اللهِ بنُ المُثنّٰی قال ثنا ثُمامةُ بنُ عبدِ اللهِ بنِ انسٍ عن انسٍ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انّہ کان اذا تکلّم بکلمۃٍ اَعادَھا ثلثاً حتی تُفْھَمَ عنہ واِذا اتیٰ علیٰ قومٍ فسلّمَ علیہم سلّم علیہم ثلثاً ●

ترجمہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات فرماتے تو تین بار فرماتے تاکہ لوگ اس کو (خوب) سمجھ لیں اور جب کسی قوم کے پاس تشریف لاتے تو ان کو سلام کرتے تو تین بار سلام کرتے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ فی قولہ "اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلثاً"

تعدد الحدیث والحدیث ھٰہنا ۲ ویاتی فی کتاب الاستیذان ص۹۲۳

اعادۂ حدیث مختلف اغراض سے ہوا کرتا ہے:

(۱) دور بیٹھے ہوئے لوگوں کو آواز پہونچانا مقصود ہو۔ (۲) اعادہ بغرض تفہیم۔ (۳) اہتمام کے لئے۔

اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثاً ہر کلمہ سے یہ معاملہ نہ ہوتا تھا بلکہ جس کا اہتمام مقصود ہوتا یا جس کے سمجھنے میں کچھ دقت ہوتی اس کا اعادہ فرماتے تھے چنانچہ حدیث کے الفاظ حتی تفہم عنہ اس پر دلیل ہیں۔

سلم علیہم ثلاثاً بعض نے کہا ہے کہ ایک سلام استیذان، دوسرا سلام تحیہ تیسرا سلام وداع ہوتا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مجلس عظیم سے متعلق ہے کہ ایک سلام اس کی ابتدا میں، ایک وسط میں اور ایک انتہا پر کہتے تھے۔ بہتر توجیہ یہ ہے کہ یہ تینوں سلام استیذان کے لئے ہوتے تھے اس پر دلیل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تین مرتبہ سلام استیذان پر جواب نہ ملا تو واپس چلے گئے حضرت عمرؓ نے بلا کر واپسی کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یونہی ہے، حضرت عمرؓ نے مزید تاکید کے لئے اس پر شہادت طلب فرمائی تو اصغر القوم

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت دی۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شہادت طلب فرمانا سیاسۃً تھا تاکہ ابتداء ہی سے روایت حدیث کی بنیاد مضبوط ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مدینہ کے بچے بھی عمر سے اعلم ہیں درحقیقت حوصلہ بڑھانے کے لئے یوں فرمایا۔

۹۴ ● حدثنا مُسَدَّدٌ قال ثنا ابو عوانۃَ عن ابی بِشرٍ عن یوسفَ بنِ ماھَكَ عن عبدِ اللّٰہِ بنِ عمرٍو قال تخلّفَ رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فی سَفرٍ سافرناہُ فادرَکنا وقد ارھقَنا الصّلوٰۃَ صلوٰۃَ العصرِ ونحن نتوضّأ فجعلنا نمسَحُ علی ارجُلِنا فنادٰی باعلٰی صوتِہٖ ویلٌ لِلاعقابِ مِنَ النارِ مرّتینِ او ثلٰثًا ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے تھے پھر آپؐ ہم سے اس وقت ملے جب عصر کی نماز کا وقت تنگ ہوگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے پس اپنے پیروں کو (معمولی سا دھو رہے تھے گویا) مسح کر رہے تھے آپؐ نے بلند آواز سے پکارا دوزخ سے ایڑیوں کی خرابی ہونے والی ہے دوبار یا تین بار یونہی فرمایا۔

مطابقتہ للترجمہ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "مرّتین او ثلٰثًا"

تعدد الحدیث والحدیث قد مضٰی ص۱۴ وھٰھنا ص۲۰ ویاتی ص۲۸

تشریح کے لئے ملاحظہ فرمائیے باب ۴۵ حدیث ۵۸

بابٌ۳۷ تعلیمِ الرّجلِ اَمَتَہٗ وَاَھلَہٗ ص۲۰

مرد کا اپنی باندی اور گھروالوں کو (دین کا علم) سکھانا۔

ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ گذشتہ باب میں تعلیم عام کا ذکر تھا اب اس باب میں تعلیم خاص کا بیان ہے فتناسبا من ھذہ الجھۃ (عمدہ)

مقصد مقصد یہ ہے کہ تعلیم ضروری ہے اور ہر شخص کو علم حاصل کرنا چاہئے ہندو مذہب کی طرح نہیں کہ صرف برہمن ہی فضیلت علم حاصل کرسکتا ہے۔

اور تعمیم تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم صرف مردوں کے ساتھ خاص نہ رہے بلکہ عورتوں کو بھی اس کا ضروری حصہ ملنا چاہیئے بلکہ عورتوں کی تعلیم اس لئے بھی اہم ہے کہ ماں کی آغوش شفقت بچوں کا پہلا مدرسہ ہے، پھر عورتوں میں بھی حرائر ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ باندیوں کو بھی دینی تعلیم دینی چاہیئے اور مردوں کے فرائض منصبی میں یہ داخل ہے۔ مگر یہاں دینی تعلیم و تربیت مراد ہے نہ وہ تعلیم و تہذیب جس سے آدمی بے حیا اور شیطان بن جائے وللہ در القائل ؎

ہم ایسے ہر سبق کو قابل ضبطی سمجھتے ہیں ÷ کہ جس کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

امام بخاریؒ نے ترجمہ میں امۃ اور اھل کا ذکر فرمایا ہے یعنی اپنی لونڈی اور گھر والوں کو علم دین سکھانا مگر جو حدیث لائے ہیں اس میں امۃ کا ذکر ہے اھل کا ذکر نہیں ہے مگر باندی پر قیاس کر کے اھل کی تعلیم کا مسئلہ اس طرح ثابت ہوگا کہ جب باندی کی تعلیم ضروری ہوئی تو حرّہ بیویوں اور گھر والوں کی تعلیم بطریق اولیٰ ثابت ہوگی۔

۲ حضرت شیخ الحدیثؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاری وجہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی لونڈی اور بیوی کی تعلیم پر مامور ہے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کلکم راع وکلکم مسؤل عن رعیتہ، الامام راع ومسؤل عن رعیتہ والرجل راع فی اھلہ وھو مسؤل عن رعیتہ۔ الحدیث بخاری ص ۱۲۲

۹۵ ● حدثنا محمدٌ ھو ابنُ سلام قال أنا المحاربیُّ نا صالحُ بنِ حیّانَ قال قال عامرٌ الشعبیُّ حدثنی ابو بُردۃَ عن ابیہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثلٰثۃٌ لہم أجرانِ رجلٌ من اھلِ الکتابِ آمن بنبیّہ وآمن بمحمدٍ والعبدُ المملوکُ اِذا ادّی حقّ اللّٰہ وحقّ موالیہِ ورجلٌ کانت عندہ اَمَۃٌ یطاھا فادّبہا فاحسن تادیبہا وعلّمہا فاحسن تعلیمَہا ثمّ اَعتقہا فتزوّجہا فلہ اجرانِ ثمّ قال عامرٌ اعطیناکہا بغیرِ شیئٍ قد کان یُرکبُ فیما دونہا اِلی المدینۃِ ●

ترجمہ ابو بردہ اپنے والد (ابو موسیٰ اشعریؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین شخص ہیں جن کے لئے دوگنا ثواب ہے۔ ایک شخص اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) میں سے جو اپنے پیغمبر پر ایمان لایا تھا پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، دوسرے وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی، تیسرے وہ شخص جس کے پاس ایک لونڈی ہو وہ اس سے صحبت کرتا ہو پھر اس کو اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرلے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ عامر شعبیؒ نے خراسانی سے کہا ہم نے تم کو یہ حدیث بدون مشقت سنادی ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ اس سے کم حدیث کے لئے مدینہ تک سوار ہو کر جاتے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "وعلمہا فاحسن تعلیمہا"۔

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا ص ۲۰ ویاتی ص ۳۴۶ ایضا ص ۳۴۶ وفی الجھاد ص ۴۲۲ وفی کتاب الانبیاء ص ۴۹۰ وفی النکاح ص ۷۶۱

تشریح ھو ابن سلام بتخفیف اللام۔ یہ ھو ابن سلام امام بخاریؒ کے تلمیذ فربریؒ کا مقولہ ہے اصل روایت میں نہیں ہے فربری نے تشریح کے لئے اضافہ کیا ہے۔ یہ حضرات محدثینؒ کا احتیاط ہے کہ جب اصل روایت میں کسی لفظ کا اضافہ کرتے ہیں تو یعنی یا وھو کا اضافہ کردیتے ہیں

تاکہ امتیاز ہو جائے۔

ثلاثة لہم اجران تین آدمیوں کو دوہرا اجر ملیگا۔ ایک تو اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا، قرآن حکیم میں اس کا ذکر موجود ہے:

الذین اٰتینٰہم الکتاب من قبلہ ھم بہ یؤمنون واذا یتلیٰ علیہم قالوا آمنا بہ انہ الحق من ربنا انا کنا من قبلہ مسلمین اولئك یؤتون اجرھم مرتین بما صبروا۔ پارہ ۲۰، رکوع ۹، (سورۂ قصص)

جن لوگوں کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی ہے وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے کہ بیشک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم تو پہلے ہی سے مانتے تھے۔

حافظؒ نے اور بھی بہت سے لوگ ایسے ذکر فرمائے ہیں جن کے لئے تضعیف اجر کا وعدہ ہے، چونکہ عدد اقل اکثر کی نفی نہیں کرتا لہذا کوئی تعارض نہیں پس یہاں تین کا عدد تحدید کے لئے نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ ان تین کے ذکر کا کوئی داعیہ ہوگا۔

اور یہ تو رات دن کا مشاہدہ ہے کہ مقررین و واعظین جس وقت اور جس مقام پر جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہیں کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ صرف یہی چیزیں اہم ہیں جس کو اس وقت بیان کیا گیا بلکہ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ حاضرین کی مصالح کی بناء پر ان کو خصوصیت سے بیان کیا گیا۔

البحث فی تحقیق سبب الاجرین

یہاں بحث ہے کہ دو اجر دو عملوں پر ملتے ہیں بایں طور کہ ہر ایک عمل پر ایک اجر یا کہ ہر ایک عمل پر دو دو اجر ملتے ہیں؟

علماء دونوں جانب گئے ہیں مگر صورتِ اولیٰ پر دو اشکال لازم آتے ہیں:۔

اشکال اوّل

پہلے دو شخصوں نے دو دو کام کئے ہیں لہذا ان کے لئے اجرین کا ہونا صحیح ہے مگر تیسرے شخص نے کئی کام کئے ہیں۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اعتاق کا ما قبل تعلیم وتادیب وغیرہ اعتاق میں داخل ہے یعنی ایک عمل اعتاق (آزاد کرنا) اور دوسرا عمل نکاح۔

اشکال دوم

جب عمل دو ہیں تو اجر بھی دو ہی ہوں گے یہ عام قاعدہ ہے کہ جتنے اعمال اتنے ہی اجر تو مذکورہ اشخاص کی وجہ فضیلت کیا ہوئی؟

اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا۔

سب سے الطف توجیہ

نہ دو عمل پر دو اجر کا وعدہ مقصود ہے اور نہ ہر ایک عمل پر دو اجر کا بلکہ اعمال مذکورہ میں سے جو عمل ترتب اجرین کی صلاحیت رکھتا ہے صرف اس پر

دو اجر ملیں گے اس کی تفصیل یہ ہے کہ عمل میں جتنی مشقت زیادہ ہوگی اسی قدر اس پر اجر زیادہ ہوگا۔ مقولہ مشہور ہے: "العطایا علی قدر البلایا"
چنانچہ صحیحین کی حدیث ہے:۔

الماهر بالقرآن مع السفرة الکرام البررة والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران۔ (مسلم اول ص۲۶۹)

قرآن کا مشاق ان بزرگ فرشتوں کے ساتھ ہے جو لوحِ محفوظ کے پاس لکھتے رہتے ہیں اور جو قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے (رک رک کر پڑھتا ہے) اور اس کو محنت ہوتی ہے اس کے لئے دو اجر ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو قرآن کو اٹک اٹک کر یا تتلا کر پڑھتا ہے اسے بہت مشقت ہوتی ہے زبان پر الفاظ بہت مشکل سے آتے ہیں مگر وہ ہمت نہیں ہارتا، کلام الٰہی کے پیش نظر بڑی محنت سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لئے ایک اجر قرأت کا اور ایک محنت کا۔

ارشاد الٰہی "اولٰئك یؤتون اجرهم مرتین بما صبروا" میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ تضعیفِ اجر مکارہ نفس پر صبر اور مشقت کی وجہ سے ہے، پس اعمال مذکورہ فی الحدیث میں جس عمل میں مشقت زیادہ ہوگی اسی پر ترتب اجرین ہوگا۔

پھر مذکورہ تینوں ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر وہ عمل (مامور بہ) جو مزاحمت کے ساتھ کیا جائے جس میں مشقت وصعوبت زیادہ ہو اور وہ منشاء شریعت کے مطابق ہو اس پر یہ دو اجر ہوگا۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے تیس۳۰ سے زیادہ اعمال کو بیان کیا ہے جس میں احادیث کے اندر دو اجر کی بشارت موجود ہے۔

اب حدیث کو ملاحظہ فرمایئے:۔

اس میں پہلے شخص کو ایمان بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے دو اجر ملیں گے اس لئے کہ ایک دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا بہت مشکل امر ہے خصوصاً جبکہ پہلا دین بھی سماوی ہو اور بعد میں آنیوالا نبی اس کی تصدیق بھی کرتا ہو۔

اسی طرح جو شخص حق موالی کے ساتھ حقوق اللہ بھی ادا کرتا ہو اجرین کا اس لئے مستحق ہے کہ اس میں بڑی مشقت ہے کہ شب و روز مولیٰ کی خدمت میں مشغول رہنے کے باوجود حقوق اللہ سے غافل نہ رہے۔

یہی حال تیسرے شخص کا ہے کہ اولاً جاریہ کو تعلیم دینا اور ادب سکھانا بھی باعث مشقت ہے پھر اس سے نکاح کرنا تو بڑا مجاہدہ ہے کیونکہ اسے بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ غرضیکہ لوگوں کے طعن وتشنیع کی پرواہ نہ کرنا اور جاریہ کو مساویانہ حقوق دیدینا بہت بڑا مجاہدہ ہے اس لئے اس پر اجرین کا وعدہ ہے۔

اہم تنبیہ:۔

اشکال یہ یہود کو بھی شامل ہے حالانکہ یہود کا ایمان بموسیٰ علیہ السلام اس لائق نہیں کہ اس پر اجر ملے کیونکہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور بزعم خود آپ کو سولی پر چڑھایا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ ایک نبی کی تکذیب سے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر بھی ایمان نہیں رہتا لہٰذا تکذیب عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ایمان بموسیٰ علیہ السلام بھی ساقط ہو گیا تو اس پر اجر کیسا ؟

جواب:۔ بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ نبی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اہلِ کتاب سے نصاریٰ مراد ہیں۔

مگر حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے عموم کو ترجیح دی ہے۔ نیز حدیث کا خصوص تسلیم بھی کر لیا جائے تو آیاتِ قرآنیہ "یؤتکم کفلین من رحمتہ" اور "اولئك یؤتون اجرهم مرتین" سب اہلِ کتاب کو شامل ہیں، اور حضرت عبداللہ بن سلام وامثالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو یہود میں سے تھے۔

(۲) **صحیح جواب** دو مقدموں پر موقوف ہے:۔

مقدمۂ اولیٰ:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیام قیامت تک کافۃ للناس اور عام ہے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوت کسی خاص قبیلہ یا خاص علاقہ کی طرف ہوا کرتی تھی جیساکہ ارشاد نبوی ہے کان النبی یبعث الی قومه خاصة وبعثت الی الناس کافة.
(بخاری اول صـ۶۲)

مقدمۂ ثانیہ:۔ ایک علاقہ یا ایک قوم کی طرف مبعوث نبی کی دعوت اگر دوسری قوم یا دوسرے علاقہ تک پہونچے تو ان پر اقرار توحید اور اس نبی کی تصدیق لازم ہے مگر التزام طاعت ضروری نہیں جبکہ وہ کسی دوسرے دینِ سماوی پر عامل ہوں۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ کے آباء واجداد اصل میں شام کے باشندے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

بخت نصر نے جب شام پر حملہ کیا تو یہ حجاز کی طرف آگئے اور بنی اسرائیل سے ان کے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث تھے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواری تبلیغ کرتے ہوئے روم، ترک اور انطاکیہ تک پہونچے ہیں، مدینہ منورہ کے گرد ونواح میں پہونچنا بھی ثابت ہوتا ہے مگر ان کی دعوت کا مدینہ میں پہونچنا ثابت نہیں، اور اگر مدینہ میں پہونچنا تسلیم بھی کر لیا جائے تو عبداللہ بن سلامؓ کی تکذیب ثابت نہیں، ممکن ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی ہو مگر التزام طاعت نہ لیا ہو جو ان کے ذمہ ضروری نہ تھا۔

(۳) قال الطیبی رحمه الله یحتمل اجراء الحدیث علیٰ عمومه اذ لایبعد أن

یکون نظرا ان الایمان بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم سببا لقبول تلک الادیان وان کانت منسوخۃ۔
مطلب یہ ہے کہ حدیث مذکور میں اہل کتاب سے عام مراد لیا جائے اور یہود و نصاری دونوں کو شامل رکھا جائے کہ یہود و نصاری میں سے کسی کا ایمان فی حد ذاتہ معتبر و نافع نہیں تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ منسوخ شدہ دین پر بھی اجر دیدیں، جیسا کہ کتاب الایمان میں ایک مسئلہ گذر چکا ہے کہ کافر نے حالت کفر میں کوئی نیک کام کیا تو قواعد کے اعتبار سے وہ نیکی بالکل بیکار اور کالعدم ہے مگر مسلمان ہوجانے سے اگر ایمان و اسلام کی برکت سے حالت کفر کی نیکی پر اجر و ثواب مرتب ہو جائے تو یہ قواعد کے خلاف نہیں۔

اسی طرح یہود و نصاری کا ایمان اگرچہ معتبر و نافع نہ تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی برکت سے وہ بھی معتبر ہو گیا، اس کا راز یہ ہے کہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے وہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر بھی صحیح ایمان لاتا ہے اس لئے اس کے ایمان سابق کی بھی عزت افزائی اور تصحیح ہو گئی۔

اشکال اہل کتاب نے دین میں تحریف کر ڈالی تھی، تعدد الٰہ کے قائل تھے اور کئی من گھڑت عقائد بنا رکھے تھے پس ان کا ایمان بنیہم مستحق اجر کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ علامہ طیبیؒ کے قول مذکور سے اس کا جواب ہو گیا کہ ان کا اپنے نبی پر ایمان اگرچہ فی نفسہٖ غیر معتبر تھا مگر ایمان بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے وہ بھی معتبر ہو گیا، جیسے حالت کفر کے حسنات غیر معتبر ہیں مگر اسلام لانے پر اسلام کی برکت سے حالت کفر کی حسنات پر بھی ثواب ملے گا۔

نکتہ از محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے وہ ہر وقت دو ایمان کو جامع ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اہل کتاب کا ایمان اپنے نبی سابق پر بالاستقلال اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ضمناً تھا کیونکہ انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی ہے اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تو آپؐ پر ایمان بالاستقلال اور نبی سابق پر ضمناً ہو گیا۔ پس چونکہ اس کا ایمان ہر وقت دو ایمانوں کو شامل ہے اس لئے اسے دو اجر ملتے ہیں (ارشاد القاری)

ثم قال عامر اعطینا کہا الخ عامر شعبیؒ تابعی ہیں، شعبی نے اعطینا کہا میں کس کو خطاب کیا ہے؟ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ عامر شعبی اپنے شاگرد صالح سے کہا مگر یہ درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ خطاب ایک خراسانی شخص کو ہے جس نے شعبیؒ سے کہا کہ ہمارے علاقہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی باندی کو آزاد کر کے نکاح کرنے والا گویا اپنی بدنہ ہے، یعنی جس طرح قربانی کے اونٹ (ہدی) پر سواری بلا عذر برا ہے اسی طرح یہ نکاح برا ہے۔

حضرت شعبیؒ نے جواب دیا کہ وہ لوگ غلط کہتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ ایسے شخص کو دُو اجر ملے گا۔ ملاحظہ ہو بخاری اول صفحہ ۴۹ نیز مسلم کتاب الایمان۔

بغیر شئی یعنی مفت میں گھر بیٹھے یہ حدیث تجھ کو سنادی الخ۔

بَابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَاءَ وَتَعْلِيمِهِنَّ ص۲۰

امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا اور ان کو دین کی باتیں سکھانا۔

ربط و مقصد علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں تعلیم خاص کا ذکر تھا کہ ہر شخص اپنے گھر والوں کو تعلیم دے خواہ آزاد ہوں جیسے بیوی اور اولاد، یا باندی ولونڈی ہو تعمیم تعلیم کا تقاضا یہی ہے اب اس باب میں تعلیم عام کا ذکر ہے کہ امام المسلمین اور حاکم بھی عورتوں کی تعلیم کا نظم کرے کیونکہ ہر شوہر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا اس لئے امام وحاکم کی ذمہ داری ہے کہ تعلیم نسواں کا انتظام کرے۔

(۲) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں اس کا بیان تھا کہ شوہر کو بیوی اور آقا کو اپنی باندی کی تعلیم کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

اب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صرف شوہر وآقا ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ وقت کے حاکم وامام یا اس کے نائب کو بھی اس کا انتظام واہتمام کرنا چاہیئے۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ امام عورتوں کے مجمع کو وعظ سنائے، ضروریات دین سکھائے۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ البتہ عورتوں کی تعلیم مردوں سے الگ ہونا چاہیئے۔ مخلوط تعلیم نقصان وفتنہ سے خالی نہیں۔

۹۶ ● حدثنا سليمانُ بنُ حَرْبٍ قال ثنا شعبةُ عن ايوبَ قال سمعتُ عطاءَ بنَ أبي رَباحٍ قال سمعتُ ابنَ عباسٍ قال اشهدُ على النبي صلى الله عليه وسلم أو قال عطاءٌ اشهدُ على ابن عباس أنّ النبي صلى الله عليه وسلم خرجَ ومعه بلالٌ فظنَّ أنّه لم يُسمِعِ النساءَ فوعظهنّ وأمرهُنّ بالصدقة فجعلتِ المرأةُ تُلقِي القُرطَ والخاتمَ وبلالٌ يأخذُ في طرفِ ثوبه وقال اسمٰعيلُ عن ايوبَ عن عطاءٍ قال ابنُ عباسٍ اشهدُ على النبي صلى الله عليه وسلم ●

ترجمہ عطاء ابن ابی رباح نے کہا میں نے ابن عباسؓ سے سنا انھوں نے کہا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی دیتا ہوں، یا عطاء نے کہا میں ابن عباسؓ پر گواہی دیتا ہوں (راوی کو شک ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (مردوں کی صف سے) نکلے اور آپؐ کے ساتھ بلال تھے آپؐ کا خیال ہوا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں پہونچی، پھر آپؐ نے عورتوں کو نصیحت کی اور ان کو صدقہ کرنے

کا حکم دیا تو کوئی عورت اپنی بالی پھینکنے لگی، کوئی انگوٹھی اور بلال رضؓ نے اپنے کپڑے کے کونے میں (یہ خیرات) لینا شروع کی۔ اس حدیث کو اسمٰعیل بن علیہؒ نے ایوب سے روایت کیا ہے انھوں نے عطاء سے کہ ابن عباس رضؓ نے یوں کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی دیتا ہوں (اس میں شک نہیں ہے)۔

مطابقتہ للترجمہ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "فوعظہن وامرھن بالصدقۃ"

تعدد الحدیث والحدیث ھھنا ص ۲۰ ویاتی ص ۱۱۹ وص ۱۳۱ وفی خروج الصبیان ص ۱۲۳ وفی باب العلم بالمصلی ص ۱۳۳ وفی باب موعظۃ الامام النساء ص ۱۳۳ وفی باب الصلوٰۃ قبل العید ص ۱۳۵ وفی الزکوٰۃ ص ۱۹۲ وص ۱۹۵ وفی التفسیر ص ۷۲۷ وفی النکاح ص ۷۸۹ وفی اللباس ص ۸۷۳ وفی باب القلائد والسخاب ص ۸۷۳ وفی باب القرط للنساء ص ۸۷۴ وفی الاعتصام ص ۱۰۸۹

تشریح **خرج ومعہ بلال** حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عید کے موقعہ پر جب نماز اور خطبہ سے فارغ ہوئے تو یہ خیال ہوا کہ عورتیں پیچھے بیٹھی ہیں شاید ان تک میری آواز نہ پہونچی ہو تو آپؐ نے بلال کو ساتھ لیکر مردوں کے صف سے نکلے اور عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "ای خرج من بین صفوف الرجال الی صف النساء"، (عمدہ ص ۱۲۳ ج ۲) آپؐ نے انھیں وعظ فرمایا اور انھیں تعلیم دی، وعظ کے الفاظ دوسری روایات میں موجود ہیں "کہ میں نے تمہیں باہمی لعن وطعن اور شوہر کی نافرمانی کی وجہ سے جہنم میں زیادہ دیکھا ہے"۔ وعظ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آخرت کا دھیان غالب ہو جائے، وعظ سے مراد نصیحت ہے اور امر سے مراد تعلیم احکام ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پہلا ارشاد وعظ ہے اور دوسرا ارشاد تعلیم ہے جس میں آپؐ نے صدقات وخیرات کا حکم فرمایا اور اس پر عورتوں نے اپنے کانوں کی بالیاں (یا ایرنگ) اور ہاتھوں کے زیورات اتار کر دینے لگیں اور حضرت بلال رضؓ کپڑے میں جمع کرنے لگے۔

قرط ہر وہ چیز جو کان میں پہنا جائے جیسے ایرنگ، بالی، بندکی۔

چونکہ عورتیں کفرانِ عشیر بہت کرتی ہیں تو عذاب سے بچانے کے لئے آپؐ نے صدقات وخیرات کا حکم دیا کیونکہ الصدقۃ تطفیٔ غضب الربّ وان الصدقۃ تمحوا کثیرا من الذنوب التی تدخل النار۔

قال اسماعیل الخ یہاں سے امام بخاریؒ تعلیقاً نقل کرتے ہیں کہ اس حدیث کو اسماعیل بن علیہ نے ایوب سختیانی سے روایت کیا ہے اور ایوب نے عطاء بن ابی رباح سے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے یوں کہا اشھد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس میں بلا شک مروی ہے۔ چونکہ پہلی روایت میں شک تھا کہ لفظ اشھد عطاء کا ہے یا ابن عباس رضؓ کا؟ اس تعلیق سے وضاحت ہو گئی کہ ابن عباس رضؓ نے اشھد کہا ہے یعنی عطاء کا لفظ نہیں ہے۔ البتہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاء اور ابن عباس

دونوں نے لفظ اشہد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

بَابُ الحِرصِ علی الحَدیثِ صنہ۲

حدیث نبوی معلوم کرنے کے لئے حرص کرنا۔

ربط و مقصد ایک ہے طلب اور ایک ہے حرص جو طلب سے خاص ہے، حرص میں کبھی قناعت نہیں ہوتی اس لئے امام بخاریؒ نے ترجمہ میں حرص کا لفظ رکھ کر اشارہ کردیا کہ علم حدیث کی طلب میں ایسے "حریص بنجاؤ" کہ ہر دم ہل من مزید کا نعرہ لگاتے رہو کہ دریائے ناپید اکنار ہے۔

باب سابق میں خطاب خاص کا ذکر تھا جو عورتوں کے لئے تھا اب اس باب میں بھی خطاب خاص کا ذکر ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہؓ کے سوال پر صرف انھیں کو مخاطب فرمایا۔

نیز گذشتہ باب میں عمومی تعلیم کی اہمیت بیان ہوئی اور اب اس باب میں خاص علم حدیث کی طرف ترغیب دی جارہی ہے گویا یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔

۹۷ ● حدثنا عبدُ العزیزِ بنُ عبدِ اللہ قال حدثنی سلیمانُ عن عمرِو بنِ ابی عمرٍو عن سعید بنِ ابی سعیدنِ المقبُری عن ابی ھریرۃ انہ قال قیل یارسولَ اللہ مَن اَسعدُ الناسِ بِشفاعتِکَ یومَ القیٰمۃِ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد ظننتُ یا اباھریرۃ أن لایسألنی عن ھذا الحدیث احدٌ اوّلُ منکَ لِمارایتُ مِن حرصِکَ علی الحدیث اَسعد الناسِ بِشفاعتی یومَ القیامۃِ مَن قال لاالٰہ الاّ اللہ خالصاً من قلبہٖ اَو نفسِہٖ ●

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کے دن آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ حصہ پانے والا کون ہوگا (کس کی قسمت میں یہ نعمت ہوگی؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابو ہریرہ! میں جانتا تھا کہ تم سے پہلے کوئی مجھ سے یہ بات نہیں پوچھے گا کیونکہ میں نے حدیث کے متعلق تمہاری حرص دیکھ لی تھی (اب سن لے) قیامت کے دن سب سے زیادہ فیضیاب میری شفاعت سے وہ شخص ہوگا جس نے اپنے دل سے (یا اپنے جی سے) اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ (محمد رسول اللہ) کہا ہو۔

مطابقتہ للترجمہ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "لِمارایت من حرصکَ علی الحدیث"۔

تعدد الحدیث الحدیث ھٰہنا صنہ۲ و یاتی فی الرقاق ص۹۷۲

تشریح قیل یارسول اللہ الخ یہاں قیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والے حضرت ابو ہریرہؓ کے علاوہ کوئی اور صحابی ہیں لیکن بعض نسخوں میں قیل نہیں ہے حافظ عسقلانی

فرماتے ہیں وھوالصواب (فتح)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں قال القاضی عیاضؒ قولہ قیل وھوالصواب سقوط قیل لماجاء عند الاصیلی والقابسی لأن السائل ھو ابو ھریرۃ نفسہ (عمدۃ)

خلاصہ یہ ہے کہ سائل خود ابو ہریرہؓ ہی ہیں جیساکہ اس کے بعد کا جملہ ظاہر کر رہا ہے لقد ظننت یا اباھریرۃ الخ نیز یہی حدیث ص۹۷۲ پر آرہی ہے وہاں بجائے قیل کے قلت ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قیل کسی راوی کا تصرف ہے۔

ان لایسالنی عن ھذا الحدیث یجوز ضم اللام فی یسالنی وفتحہا لان کلمۃ أن اذا وقعت بعد الظن یجوز فی مدخولہا الوجہان، الرفع والنصب۔ احد بالرفع لانہ فاعل یسالنی اول منک یجوز فیہ الرفع والنصب فالرفع علیٰ انہ صفۃ لأحد أو بدل منہ والنصب علی الظرفیۃ (عمدۃ)

اسعد الناس بشفاعتی الخ قیامت کے دن سب سے زیادہ فیضیاب وکامیاب میری شفاعت سے وہ شخص ہوگا جس نے اپنے دل سے یا اپنے جی کے خلوص کے ساتھ "لاالٰہ الااللہ" کہا ہو۔

شفاعت کے اقسام

روز قیامت میں جو واقعات وحالات پیش آنے والے ہیں اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی مختلف قسمیں ہوں گی۔

علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ پانچ قسموں کی شفاعتیں ہوں گی (شرح مسلم ج۱ ص۱۰۳، عمدہ ج۲ ص۱۲۷)

(۱) میدان محشر کی ہولناکی سے نجات، اور یہ شفاعت تمام انسانوں کے لئے ہوگی خواہ مومن ہو یا کافر، مشرک ہو یا منافق سب کے لئے عام ہوگی تاکہ حساب وکتاب جلد کرکے ہولناک تکلیف سے نجات ملے۔

(۲) کچھ لوگوں کو بلا حساب جنت میں داخل کرنے کے لئے سفارش فرمائیں گے۔

(۳) بعض مستحق جہنم لوگوں کے لئے سفارش فرمائیں گے کہ انھیں عذاب سے بچا لیا جائے۔

(۴) بعض کافر (جیسے ابوطالب) کے عذاب میں تخفیف کی سفارش

(۵) بعض مستحق جنت کے لئے ترقیٔ درجات کی سفارش وغیرہ، وغیرہ۔

سوال اس حدیث میں یہ ہے کہ ہر مؤمن مخلص کو میری شفاعت کی سعادت حاصل ہوگی اور دوسری روایت میں ہے شفاعتی لأھل الکبائر من امتی (ترمذی شریف جلد۲ ص۶۶) باب ماجاء فی الشفاعۃ۔

بظاہر ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے کیونکہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کبائر کے لئے میری شفاعت ہوگی۔

جواب:- درحقیقت تعارض نہیں، تعارض اس وقت ہوتا جب ترمذی شریف کی روایت میں کوئی کلمہ حصر کا ہوتا حالانکہ حصر کا کوئی کلمہ نہیں اس لئے یہ کہا جائے گا کہ اس باب کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے

اخلاص کے ساتھ کلمہ پڑھا صرف زبانی اقرار نہیں کیا ان سب کے لئے میری شفاعت ہوگی۔

اور شفاعتی لاھل کبائر من امتی کا مطلب یہ ہے کہ میری شفاعت کا نفع اہلِ کبائر کے حق میں زیادہ ظاہر ہوگا کہ وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم میں تڑپ رہے ہوں گے اور ان کے بدن سیاہ کوئلہ جیسے ہو چکے ہوں گے بجز موضع سجود کے۔ پھر میری شفاعت کے بعد جہنم سے نکال کر پہلے نہر الحیاۃ میں داخل کر کے انھیں صاف وشفاف نازک اندام بنا کر جنت میں داخل کیا جائیگا، تو شفاعت کا اثر ان کے حق میں زیادہ ظاہر ہوگا۔

اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی شریف کی روایت کا مطلب یہ ہے کہ میری شفاعت اہلِ کبائر کیلئے بھی ہوگی (الکوکب الدری ج ۲ ص ۲۸۲) یعنی یہ مطلب نہیں کہ اہلِ کبائر ہی کے لئے ہوگی، جب یہ مطلب نہیں تو تعارض بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جب آپؐ نے یہ فرمایا کہ میری شفاعت ہر مومن مخلص کے لئے ہوگی تو کسی کو وہم ہوگیا کہ جو مومن مخلص ہوگا وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا اس لئے آپؐ نے فرمادیا ہو کہ میری شفاعت مرتکب کبیرہ کے لئے بھی ہوگی۔ واللہ اعلم

فائدہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین اور اہل سنت کا اجماع ہے کہ مذنبین اور مرتکب کبیرہ کیلئے شفاعت ہوگی جہنم سے نکالنے کے لئے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ المعنی سے بھی ثابت ہے خوارج اور بعض معتزلہ نے ترقی درجات کے لئے شفاعت کو تسلیم کیا ہے لیکن اخراج من النار کی شفاعت کو تسلیم نہیں کرتے اور فما تنفعہم شفاعۃ الشافعین اور ما للظٰلمین من حمیم ولا شفیع یطاع وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کی آیتیں کفار کے بارے میں ہیں اور احادیث میں تصریح ہے کہ بہت سے مذنبین جہنم میں جائیں گے اور شفاعت کی وجہ سے انھیں جہنم سے خلاصی ہوگی۔ (امداد الباری)

بَابُ ۷۶ كَيفَ يُقْبَضُ العِلمُ وَكتبَ عُمَرُ بنُ عبدِ العزيزِ الىٰ أبي بكرِ بنِ حزمٍ

اُنظر ما كان مِن حديث رسولِ الله صلى الله عليه وسلم فاكتُبْهُ فاِنّي خِفتُ دُرُوسَ العِلمِ وذَهابَ العلماءِ ولا يُقبل الّا حديثُ النبي صلى الله عليه وسلم وَلْيُفشوا العلم ولْيَجْلِسوا حتىٰ يُعَلَّم مَن لا يَعْلَمُ فاِنّ العِلمَ لا يَهْلِكُ حتى يكونَ سِرًّا ص ۲۰

یہ باب اس بات کے بیان میں ہے کہ علم کس طرح اٹھا لیا جائے گا اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ (خلیفہ) نے (مدینہ منورہ کے قاضی) ابو بکر بن حزم کو لکھا دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی حدیثیں بھی ہوں انھیں لکھ لو اس لئے کہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوا (کسی اور کا قول وفعل) نہ قبول کی جائے، اور لوگوں کو چاہیئے کہ علم پھیلائیں، علمی مجلس قائم کریں تاکہ جس کو علم نہیں وہ علم حاصل کرلے کیونکہ علم چھپانے ہی سے ضائع ہوتا ہے۔

ربط ومقصد باب سابق میں حرص علی الحدیث کی ترغیب تھی جو انواع علم میں اشرف ہے اب اس باب میں ارتفاعِ علم کا بیان ہے دونوں میں تقابل ہے اور دونوں اس جہت سے متناسق ہیں (عمدہ)

(۲) یا یہ کہا جائے کہ باب سابق میں تحصیل حدیث میں حریص بن جانے کی ترغیب تھی جس کا منشا یہی تھا کہ اس صورت میں علم باقی رہ سکتا ہے۔ اب اس باب میں بقاء علم کی مزید صورتوں کا بیان ہے کہ تعلیم کا سلسلہ قائم و جاری رکھا جائے، علمی مجالس اور درسگاہیں قائم کی جائیں، علماء کو اشاعتِ علم کے لئے ہمہ تن مستعد رہنا چاہیئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا حال تفصیل سے مقدمہ میں گذر چکا ہے ملاحظہ فرما لیجئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ چوراسی سال کی عمر میں ۱۰۱ھ میں انتقال ہوا۔

الیٰ ابی بکر بن حزم الخ یہ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم ہیں، ان کا نام ابوبکر اور کنیت ابو محمد ہے اور یہ تابعی ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفۂ وقت کی جانب سے مدینہ طیبہ کے حاکم و قاضی تھے اسی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ انہیں حکم دیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث جمع کریں، ان کا وصال ۱۲۰ھ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ہوا۔

باقی تفصیل کے لئے مقدمہ میں تدوین حدیث کا عنوان دیکھئے۔

۹۸● حدثنا العلاءُ بنُ عبدِ الجبارِ حدثنا عبدُ العزيزِ بنُ مسلمٍ عن عبدِ اللهِ بنِ دينارٍ بذلك يعني حديثَ عمرَ بنِ عبدِ العزيزِ الى قوله ذَهابُ العلماءِ ●

پہلے تو امام بخاریؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ارشاد کو تعلیقاً نقل کیا ہے، اب اس کی سند بیان کر رہے ہیں، مگر علاء بن عبدالجبار کی سند سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا کلام صرف ذهاب العلماء تک ہے۔

مگر احتمال ہے کہ بعد کا جملہ لا يقبل الا حديث النبي صلى الله عليه وسلم عمر بن عبدالعزیزؒ ہی کا کلام ہو اور علاء کی روایت میں نہ ہو امام بخاریؒ کو کسی دوسری سند سے معلوم ہوا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہو کہ سرے سے یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا کلام ہی نہ ہو اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ تدوین حدیث کے اندر مقدمہ میں تفصیل گذر چکی ہے۔

۹۹● حدثنا اسمعيلُ بنُ ابي أُوَيسٍ قال حدثني مالكٌ عن هشامِ بنِ عروةَ عن ابيه عن عبدِ اللهِ بنِ عمرِو بنِ العاصِ قال سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقولُ اِنّ اللهَ لا يَقبِضُ العلمَ انتزاعًا ينتزعه من العبادِ ولكن يَقبِضُ العلمَ بقبضِ العلماءِ حتى اذا لم يُبقِ عالمًا اتخذ الناسُ رؤسًا جُهّالًا فسُئِلوا

فافتوا بغیر علمٍ فضلّوا واَضلّوا قال الفِربریّ نا عباسٌ قال ثنا قتیبة قال حدثنا جریرٌ عن ہشامٍ نحوَہ ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ (دین کا علم بندوں سے چھین کر نہیں اٹھائیں گے بلکہ عالموں کو اٹھا کر (یعنی موت دیکر) علم کو اٹھالے گا حتی کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار (پیشوا) بنالینگے ان سے مسئلہ پوچھیں گے وہ بے علم فتویٰ دیں گے تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ فربری (راوی بخاری) نے کہا ہم سے عباس نے بیان کیا کہا ہم سے قتیبہ نے کہا کہا ہم سے جریر نے عن ہشام اسی طرح بیان کیا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقة الحدیث للترجمة فی قولہ "ولکن یقبض العلم بقبض العلماء"

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا ص۲۰ ویاتی فی الاعتصام ص۱۰۸۶ واخرجہ مسلم ایضاً

علماء کے جانشین جہلاء ہوں تو یہ رفعِ علم کی علامت ہے

امام بخاریؒ نے قبض علم پر دوسرا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت سے کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ علماء کے سینوں سے علم کو نکال لیں بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ علماء ختم ہوجائیں گے اور ان کی جگہ پُر کرنے کے لئے علماء پیدا نہ ہوں گے اور جہلاء علماء کی جگہ بیٹھیں گے اور گمراہی پھیلائیں گے۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ قلوب میں حاصل شدہ علم کو سلب نہیں کریں گے بلکہ صورت یہ ہوگی کہ علماء مرتے جائیں گے اور ان کے ساتھ ان کا علم بھی ختم ہوتا جائیگا۔

یہ افسوسناک عظیم حادثہ آج کل دیکھا جارہا ہے اچھے اچھے علماء اپنی اولاد کو بی اے اور ایم اے کرارہے ہیں، بیٹا میٹرک پاس کرکے ڈاڑھی منڈاتا ہے اور ساتھ رہتا ہے، ساتھ ہی کھاتا پیتا ہے اور عالم صاحب اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جبکہ ڈاڑھی ایک مشت واجب ہے منڈانے والا (ڈاڑھی خور) اور کٹانے والا (ڈاڑھی چور) فاسق معلن ہے، لیکن اونچی پوزیشن کے عالم کہلاتے ہیں، لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں مگر اولاد کو علم دین سے محروم رکھ کر بے عمل و بدعمل دیکھ کر نکیر و تنبیہ تک نہیں کرتے، حد یہ ہے کہ اپنی صاحبزادیوں کو بھی بی اے اور ایم اے کرانے لگے اور ان کے رشتوں کے لئے ایسے ہی فاسقوں کی تلاش ہوتی ہے فیا للعجب۔

مسند احمد اور طبرانی میں حضرت ابوامامہؓ کے طریق سے ایک روایت ہے کہ حجۃ الوداع میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خذوا العلم قبل اَن یقبض "یعنی علم حاصل کرو قبل اس کے کہ

اٹھالیا جائے۔ اس پر ایک اعرابی نے عرض کیا حضور! علم کیسے اٹھایا جائے گا؟ ارشاد فرمایا: الا ان ذهاب العلم ذهاب حملته سن لو علم کا اٹھنا حاملین علم کی وفات ہے، تین مرتبہ فرمایا۔

ابن المنیرؒ فرماتے ہیں محو العلم من الصدور جائز فی القدرة الا ان هذا الحديث دل علی عدم وقوعه (عمدہ) اللہ تعالیٰ علوم کو سینوں سے نکالنے پر قادر ہیں لیکن اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت کے باوجود ایسا نہ کریں گے۔

اشکال روایت مذکورہ فی الباب سے تو یہی ظاہر ہے کہ علم سینوں سے نہ نکالا جائیگا لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز سینوں سے نکال لیا جائے گا پس تعارض ہوگیا۔

جواب: محققین کی رائے یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ابتداءً قبض علم کی صورت یہ ہوگی کہ علماء رخصت ہوتے جائیں کے اور ان کے ساتھ علم بھی ختم ہوتا جائیگا۔ اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت سے جو معلوم ہوتا ہے کہ علم سینوں سے محو کر دیا جائے گا وہ اچانک قیامت کے قریب ہوگا کیونکہ قیامت اس وقت تک قائم ہی نہیں ہوگی جب تک کوئی مومن باقی رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے دونوں صورتیں دو وقت میں ہوں گی فلا تعارض۔

شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کے اصول میں سے ہے کہ جو روایت ان کے نزدیک صحیح نہیں ہوتی ہے اس کی تردید کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں۔ چونکہ محو من القلوب والی روایت امام بخاریؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہے اس لئے ترجمۃ الباب، کیف یقبض العلم کا منعقد کر کے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت لاکر اشارہ کر دیا کہ قبض علم کی کیفیت یہ ہوگی۔ دوسری روایت قابل اعتماد نہیں واللہ اعلم۔

قال الفربری وهو ابو عبد الله محمد بن يوسف بن مطر بن صالح بن بشر (عمدة)

یہ محمد بن یوسف فربری امام بخاریؒ کے تلمیذ ہیں اور صحیح بخاری کے راوی ہیں اور چونکہ انھوں نے امام بخاریؒ سے دو مرتبہ یا تین مرتبہ پڑھا اور امام بخاریؒ کے انتقال کے بعد چونسٹھ (۶۴) سال بعد تک زندہ رہے اور بخاری شریف کا درس دیتے رہے اس لئے ان کا نسخہ سب سے زیادہ متداول و متعارف رہا۔

ان کی (یعنی علامہ فربری کی) عادت ہے کہ جب کوئی حدیث باب کے مناسب امام بخاریؒ کے علاوہ کسی دوسرے سے ملتی ہے تو اسے بھی نقل کر دیتے ہیں، یہ روایت بھی انھیں روایات میں سے ہے جو فربری کو امام بخاریؒ سے بھی ملی ہے اور دوسرے شیخ سے بھی، اس لئے اسے بھی نقل کر دیا۔

بَابٌ هَل يُجعَلُ لِلنِّسَاءِ يَومٌ عَلىٰ حِدَةٍ فِى العِلمِ ص۲۰

کیا عورتوں کی تعلیم کے لئے کوئی خاص دن مقرر کیا جائے؟

یعنی امام کے لئے مناسب ہے یا نہیں کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے کوئی خاص دن مقرر کر دے؟

ربط و مقصد باب سابق میں قبض علم کی کیفیت کو بیان کیا گیا جس کے فوائد میں اشاعتِ علم کی ترغیب اور علمی مجلس منعقد کرنے کی تاکید ہے۔

اب امام بخاریؒ اس باب میں ایسی حدیث نقل کر رہے ہیں جس میں علم کی حفاظت و اشاعت کی ترغیب موجود ہے، ظاہر ہے کہ تعلیم میں تعمیم مقصود ہے بالخصوص ماں کی آغوش شفقت بچوں کا پہلا مدرسہ ہے اس لئے عورتوں کی تعلیم بہت اہم ہے۔ چنانچہ عورتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان کی تعلیم کیلئے علیحدہ دن مقرر کیا جائے اس لئے کہ عورتیں اپنے مخصوص مسائل کی دریافت میں حیا محسوس کریں گی آپ نے ان کی درخواست پر متعین دن میں تشریف لانے کا وعدہ فرمایا اور ان کے لئے مستقل وقت مقرر فرما دیا۔

۱۰۰● حدثنا آدمُ قال حدثنا شعبةُ قال حدثنی ابنُ الاَصْبَهانی قال سمعتُ ابا صالحٍ ذکوانَ یحدِّثُ عن ابی سعیدٍ الخدریؓ قال قال النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم غلَبَنا علیك الرجالُ فاجعَلْ لنا یوماً من نفسك فوَعَدَهنّ یوماً لَقِیَهنّ فیه فوعظهُنّ و امرهنّ فکان فیما قال لهنّ ما منکنّ امرأةٌ تُقدِّمُ ثلثةً من وَّلدِها اِلّا کان لها حجاباً من النار فقالت امرأةٌ و اثنین فقال و اثنین ●

۱۰۱● حدثنی محمدُ بن بَشّارٍ قال ثنا غُندَرٌ قال ثنا شعبةُ عن عبدِالرحمٰنِ بنِ الاَصْبهانی قال عن ذکوانَ عن ابی سعیدٍ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بهٰذا وعن عبدِالرحمٰن بن الاصبهانی قال سمعتُ اباحازمٍ عن ابی هریرةَ قال ثلثةً لم یبلغوا الحِنثَ ●

ترجمہ حدیث ۱۰۰ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عورتوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مرد آپ کے پاس آنے میں (یعنی آپ سے مستفید ہونے میں) ہم پر غالب ہو گئے اس لئے آپ اپنی طرف سے (خاص) ہمارے لئے ایک دن مقرر کر دیجئے تو آپؐ نے ان سے ایک دن کا وعدہ کر لیا جس میں آپؐ نے ان سے ملاقات کی پھر آپؐ نے انھیں نصیحت کی اور انھیں شرعی احکام بتلائے، ان باتوں میں سے جو آپؐ نے فرمائیں یہ بھی تھی کہ جو عورت اپنے تین بچے آگے بھیجے تو وہ (آخرت میں) اس کے لئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گے، اس پر ایک عورت نے کہا اگر دو بھیجے؟ تو آپؐ نے فرمایا اور دو بھی۔

ترجمہ حدیث ۱۰۱ حضرت ابو سعید خدریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی حدیث نقل فرمائی، اور (دوسری سند میں) عبد الرحمٰن بن الاصبہانی سے روایت ہے کہ میں نے ابو حازم سے سنا وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ایسے تین لڑکے جو ابھی بلوغ کو نہ پہونچے ہوں۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "فوعدھن یوما لقیھن فیہ"

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا ص۲۰ ویاتی ص۲۱ وفی کتاب الجنائز ص۱۶۷ وفی الاعتصام ص۱۰۸۷

فائدہ امام بخاری "صحیح بخاری میں علی العموم (یعنی اکثر) ہر باب میں ایک روایت لاتے ہیں لیکن کبھی کسی خاص مصلحت سے ایک سے زیادہ روایتیں بھی ذکر کردیتے ہیں، اس باب میں بھی پہلی روایت کے بعد دوسری روایت لائے دوٌ وجہ سے :۔

اول تو یہ کہ پہلی روایت میں ابن الاصبہانی مبہم تھا۔

دوسری روایت میں اس ابہام کو ختم کردیا کہ ابن الاصبہانی سے مراد عبد الرحمٰن بن الاصبہانی ہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ پہلی روایت میں تین بچوں کا ذکر ہے لیکن نا بالغ ہونے کی قید کا ذکر نہیں ہے، دوسری روایت میں جو ابو ہریرہؓ کے طریق سے لائے ہیں اس میں یہ قید ہے کہ حدّ بلوغ کو نہ پہونچے ہوں۔ جس سے وضاحت ہوگئی کہ بشارت مذکورہ فی الحدیث اس کے لئے ہے جس کے نابالغ بچوں کا انتقال ہوا ہو اور اس نے صبر کیا ہو۔

اشکال لم یبلغوا الحنث کی قید سے اشکال ہوتا ہے کہ بالغ وجوان کے مرنے سے یہ اجر نہیں ملے گا حالانکہ بالغ کام کے لائق ہوکر مرجائے صدمہ زیادہ ہوتا ہے۔

جواب ۱: نابالغ سے عقوق متصور نہیں ہوتا اس لئے اس کی موت کا زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔

جواب ۲: صحیح تر جواب یہ ہے کہ یہاں دو جداگانہ مسئلے ہیں۔ ایک مصیبت کے کفارہ بننے کا اور دوسرا شفاعت کا۔

بلاشبہ جوان کے صدمہ سے گناہ ضرور معاف ہوگا مگر یہ من باب کفارات ہے کہ مومن کو اگر کوئی صدمہ یا مصیبت پہونچے تو وہ مکفر ہوتا ہے سیئات کے لئے۔

بہر حال کفارہ کا حکم یہی ہے کہ جتنا زیادہ صدمہ ہوگا اسی قدر مکفر سیئات ہوگا اور یہ وعدۂ مغفرت ماں باپ دونوں کے لئے ہے صرف والدہ کے ساتھ نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الجنائز میں یہ الفاظ موجود ہیں: ما من الناس من مسلم ان احادیث میں شفاعت کا بیان ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ بچہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مچل جائے گا اور ضد کرنا شروع کریگا کہ میں اکیلا جنت میں نہیں جاؤں گا میرے ماں باپ کو میرے ساتھ بھیجو، یہ چیز بڑوں سے نہیں ہوسکتی اس کے لئے بچہ ہونا شرط ہے۔ چنانچہ دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ ماں باپ بچہ کی ضد ایک دفعہ نہیں دوٌ دفعہ نہیں سو دفعہ پوری کرتے ہیں اور بچوں کی ضد بُری معلوم نہیں ہوتی بخلاف کسی بڑے جوان آدمی کے کہ اگر بچوں کی سی ضد کرنے لگے تو کون پرواہ کریگا بلکہ سب اس کی اس ناشائستہ حرکت پر ہنسیں گے۔

نیز جوان بالغ تو اپنے حساب وکتاب کے غم میں ہوں گے نفسی نفسی کے عالم میں ہوں گے وہ کیا شفاعت کریں گے۔

تشریح وعن عبد الرحمٰن بن الاصبہانی یہ تعلیق نہیں ہے بلکہ روایت متصل ہے اور اس کا عطف پہلے عبد الرحمٰن پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعبہ اس روایت کو عبد الرحمٰن اصبہانی سے دو طرح نقل کرتے ہیں:۔

پہلی سند تو یوں ہے عن عبد الرحمٰن بن الاصبہانی عن ذکوان عن ابی سعید الخ

دوسری سند یہ ہے شعبۃ عن عبد الرحمٰن بن الاصبہانی قال سمعت اباحازم عن ابی ھریرۃ پس ابو ہریرہ رضؓ کی روایت متصل ہے تعلیق نہیں (امداد الباری)۔

بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ [۲۱]

کوئی شخص کوئی بات سنے اور نہ سمجھے تو سمجھنے کے لئے دوبارہ پوچھنے کا بیان۔

ربط باب سابق میں عورتوں کی تعلیم اور وعظ کا ذکر تھا اور عورتیں عموماً ناقصات العقل ہوتی ہیں تو قصور فہم کی وجہ سے دوبارہ پوچھنے کی محتاج ہوتی ہیں۔

وہٰذا الباب ایضاً فی مراجعۃ العالم لعدم الفہم، یعنی سمجھنے کی غرض سے اپنے استاذ و شیخ سے دوبارہ پوچھا جا سکتا ہے۔

مقصد امام بخاریؒ کا مقصد ظاہر ہے کہ اگر تلمیذ نے استاذ کی بات اچھی طرح نہیں سمجھا تو بے سمجھے مجلس سے نہ جائے بلکہ دوبارہ استفسار کرکے اپنا اطمینان کرلے۔

ع۲ یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ مراجعت میں عالم کی سوءِ ادبی اور متعلم کی تحقیر نہیں اس لئے نہ عالم کو ناگوار ہونا چاہئے نہ متعلم کو حیا کرنا مناسب ہے، واللہ اعلم (امداد)

۱۰۲ ● حدثنا سعیدُ بنُ اَبی مریمَ قال اَنا نافعُ بنُ عُمَرَ قال حدثنی ابنُ ابی مُلیکۃَ اَنَّ عائشۃَ زوجَ النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کانت لا تَسْمَعُ شیئًا لا تعرِفُہ اِلّا راجعت فیہ حتی تعرِفَہ واَنَّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال مَن حوسِبَ عُذِّبَ قالت عائشۃ فقلتُ اَوَلیس یقولُ اللّٰہُ عز وجل "فسوفَ یُحاسَبُ حِسابًا یَسیرا" قالت اِنّما ذلك العرضُ ولکن من نوقشَ الحِساب یَہْلِكُ ●

ترجمہ ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ کی عادت تھی کہ جب کوئی ایسی بات سنتیں جس کو سمجھ نہ پاتیں تو دوبارہ اس کو دریافت کرتیں تاکہ سمجھ لیں، چنانچہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (قیامت کے دن) جس سے حساب لیا جائیگا وہ عذاب میں مبتلا ہو جائے گا تو حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ یہ سنکر میں نے عرض کیا "کیا اللہ تعالیٰ نے (سورۃ انشقاق میں) نہیں فرمایا کہ عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا، تو آپؐ نے فرمایا کہ (یہ حساب نہیں ہے) اس سے

مراد تو اعمال کا بتلا دینا ہے لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا وہ تباہ ہو جائے گا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "کانت لا تسمع شیئا لا تعرفہ الا راجعت فیہ حتی تعرفہ"

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا ص۲۱ ویاتی فی التفسیر ص۷۳۶ وفی الرقاق ص۹۶۷ ایضا ص۹۶۸

تشریح ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی عادت تھی کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد سمجھ میں نہ آتا تو اسے مکرر پوچھ لیا کرتی تھیں جب تک وہ بات پورے طور سے سمجھ میں نہ آجائے برابر پوچھتی رہتیں، چنانچہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "من حوسب عذب" قیامت کے دن جس سے حساب لیا جائیگا وہ عذاب میں مبتلا ہوگا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کیا اللہ تعالیٰ نے فسوف یحاسب حسابا یسیرا نہیں فرمایا؟ انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور قرآن حکیم کی نص صریح میں تعارض معلوم ہوا، سورۂ انشقاق میں ارشاد ربانی ہے:

فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا وینقلب الی اھلہ مسرورا۔ (پارۂ عم)

تو جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملیگا اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے متعلقین کے پاس خوش وخرم واپس ہوگا۔

حساب یسیر، آسان حساب یہ ہے کہ بات بات پر گرفت نہ ہوگی محض کاغذات (نامۂ اعمال) پیش ہو جائینگے اور بدون بحث ومناقشہ کے سستے چھوڑ دیئے جائیں گے نہ سزا کا خوف رہے گا نہ غصہ کا ڈر، نہایت امن واطمینان سے اپنے احباب واقارب اور مسلمان بھائیوں کے پاس خوشیاں مناتا ہوا آئیگا۔

وجہ تعارض یہ تھی کہ حضورؐ تو علی العموم من حوسب عذب فرما رہے ہیں اور قرآن حکیم سے معلوم ہو رہا ہے کہ بعض ایسے بھی ہوں گے یعنی اصحاب یمین جن سے آسان حساب لیا جائیگا چنانچہ آپؐ کے ارشاد کا عموم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے سوال کا باعث ہوا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ روایات میں ہے کہ جب آیت:

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون۔ (سورۂ انعام آیت ۸۲)

جو لوگ ایمان لے آئے اور اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا انھیں کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

نازل ہوئی تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بہت ہی شاق گذرا، اور اشکال پیش آیا۔ چنانچہ آپؐ کی خدمت میں عرض کیا اینا لم یظلم، ہم میں سے کون ہے جس نے کوئی ظلم نہ کیا ہو، پھر تو ہم سب عذاب الٰہی سے غیر مامون اور ہدایت سے محروم ہوگئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے مطلق

گناہ نہیں (بخاری اول صنا)

بہرحال حضرت عائشہؓ کو من حوسب عذب پر اشکال پیش آیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا: انما ذلک العرض یہ تو نامۂ اعمال کی پیشی ہے ای عرض افعال العبد علیہ مع التبشیر بالغفران مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز حساب کی مختلف قسمیں ہوں گی، ایک حساب تو یہ ہے کہ اعمال نامہ سامنے کر دیا گیا اور کسی طرح کی گرفت و باز پرس نہیں ہوئی کہ سینمہ کیوں دیکھا؟ غیبت کیوں کی؟ بالکل بلا مناقشہ مغفرت کی بشارت کے ساتھ بندے کے سامنے اس کی خطائیں پیش کی جائیں تو یہ حساب یسیر یعنی عرض ہے۔ اور ایک وہ حساب ہے جس سے مناقشہ کیا جائے تو چھٹکارا مشکل ہے یہ باز پرس ہی ایک عذاب ہے جس سے انسان خواس باختہ ہو جائے گا۔

بَابٌ لِيُبَلِّغِ العِلْمَ الشَّاهِدُ الغَائِبَ

قال لهُ ابنُ عباسٍ عن النبي صلى الله عليه وسلم

حاضرین کو غیر حاضروں تک علمی بات پہونچا دینی چاہئے اس کو ابن عباسؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

ربط ومقصد علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں استاد سے سنی ہوئی بات کو سمجھنے اور ضبط کے لئے متعلم یا سامع کی مراجعت کا ذکر تھا فکانّ المراجع کان کالغائب عند سماعہ یعنی مراجع الیہ (استاد و شیخ) کی طرف سے مراجع (متعلم و سامع) کو تبلیغ کی جارہی ہے اور اس کی حیثیت بھی غائب ہی جیسی تھی کہ مجلس میں بظاہر تو موجود ہے مگر سن کر سمجھ نہ سکا اس لئے مکرر پوچھنے کی نوبت آئی تو موجود ہونے کے باوجود گویا مجلس سے غائب ہے۔

امام بخاریؒ اب اس باب میں بھی یہ بیان کر رہے ہیں کہ حاضر کو غائب تک دین کی بات پہنچانی چاہئے، امام بخاریؒ کا مقصد اس باب سے ایک عظیم شبہ کا ازالہ ہے:۔

شبہ یہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے "بلّغوا عنی ولو آیۃ" اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ صرف آیاتِ قرآنی کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام بخاریؒ نے لیبلّغ العلم کا ترجمہ منعقد کر کے اشارہ فرما دیا کہ مقصود تبلیغ علم ہے خواہ آیاتِ قرآنی ہوں یا حدیث پاک ہو قال لہ ابن عباس الخ ھو طرف من حدیث وصلہ فی الحج فی باب الخطبۃ ایام منی ص۲۳۴۔

۱۰۳ ● حدثنا عبدُ اللهِ بنُ يوسفَ قال حدثنا الليثُ قال حدثني سعيدٌ هو ابنُ ابي سعيدٍ عن ابي شريحٍ انّه قال لِعَمْرِو بنِ سعيدٍ وهو يَبعثُ البعوثَ الى مكةَ ائذن لي ايها الاميرُ اُحدّثك قولاً قام به رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم الغدَ من يومِ الفتحِ سمعتْهُ اُذناي ووَعاه قلبي وابصرَتْه عيناي حين تكلّم به

حَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مَکَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ یُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا یَحِلُّ لِامْرِءٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَّلَا یَعْضِدَ بِهَا شَجَرَةً فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِیْهَا فَقُوْلُوْا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِهٖ وَلَمْ یَاْذَنْ لَکُمْ وَاِنَّمَا اَذِنَ لِیْ فِیْهَا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْیَوْمَ کَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِیْلَ لِاَبِیْ شُرَیْحٍ مَا قَالَ عَمْرٌو قَالَ اَنَا اَعْلَمُ مِنْكَ یَا اَبَا شُرَیْحٍ لَا یُعِیْذُ عَاصِیًا وَّلَا فَارًّا بِدَمٍ وَّلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ ●

ترجمہ ابوشریح صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انھوں نے عمرو بن سعید سے کہا (جو یزید کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا) جبکہ وہ مکہ کی طرف فوجیں روانہ کر رہا تھا، اے امیر مجھے اجازت دے دے میں تجھ کو ایک حدیث سناؤں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن ارشاد فرمائی، میرے دونوں کانوں نے اس کو سنا اور میرے دل نے اس کو محفوظ رکھا اور میری دونوں آنکھوں نے حدیث سناتے ہوئے آپ کو دیکھا، آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرام کیا ہے لوگوں نے اس کو حرام نہیں کیا (یعنی اس کا یہ ادب واحترام بحکم الٰہی ہے) اس لئے کسی ایسے شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو یہ جائز نہیں کہ مکہ میں خوں ریزی کرے یا وہاں کا کوئی درخت کاٹے بس (میرے بعد) اگر کوئی ایسا کرنا چاہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتال سے استدلال کرے تو اس سے یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ نے تو خاص فتح مکہ کے دن اپنے رسول کو اجازت دی تھی تم کو اجازت نہیں دی، (آپ فرماتے ہیں کہ) اور میرے لئے بھی صرف دن کے ایک حصہ میں اجازت دی تھی پھر اس کی حرمت آج ویسی ہی ہو گئی جیسی کل (یعنی یوم الفتح سے پہلے) تھی۔ جو یہاں موجود ہو وہ غائبین کو خبر کر دے۔

لوگوں نے ابوشریح سے پوچھا کہ عمرو نے آپ کی بات کا کیا جواب دیا؟ حضرت ابوشریح نے کہا عمرو نے یہ جواب دیا کہ میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں، مکہ گنہگار کو پناہ نہیں دیتا اور نہ اس کو جو خون یا چوری کر کے بھاگے۔

مطابقته للترجمة مطابقة الحدیث للترجمة فی قوله "ولیبلغ الشاهد الغائب"

تعدد الحدیث والحدیث هٰهنا ۲۱ ویاتی فی المغازی ص ۶۱۳ وفی الرقاق ص ۹۶۷ ایضاً ص ۹۶۸

تشریح عن ابی شریح بضم المعجمة وفتح الراء آخره حاء مهملة خویلد بن عمرو بن صخر الخزاعی الکعبی الصحابی المتوفی سنة ثمانون وستین (۶۸) رضی اللہ عنه وله فی البخاری ثلاثة احادیث (قس)

حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں فتح مکہ سے قبل مسلمان ہوئے۔ واقدی کہتے ہیں کہ ابوشریح عقلائے مدینہ میں سے تھے۔ (عمدۃ)

انه قال لعمرو بن سعید عمرو بن سعید بفتح العین، علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔ وهو عمرو بن

سعید بن العاص بن امیۃ القرشی الاموی یعرف بالاشدق لیست لہ صحبۃ ولا کان من التابعین باحسان، یعنی صحابی تو قطعی نہیں ہے البتہ تابعی ہے مگر اچھا نیک تابعی نہیں ہے، بعض اکابر نے اس کو شیطان فاسق بھی لکھا ہے۔

بہر حال یہاں صحیح بخاری میں اس کا ذکر ضمناً آگیا ہے بطور راوی حدیث نہیں ہے کہ کوئی غلطی سے اس فاسق کو رواۃ بخاری میں سے سمجھ لے۔

امام بخاریؒ تبلیغ علم کے لئے ایک اہم اور مشہور واقعہ سے استدلال کرتے ہیں، واقعہ کا تعلق اور جوڑ جنگ صفین سے ہے جسے احقر نے بھی بقدر ضرورت نصر الباری کتاب المغازی میں بیان کر دیا ہے، ملاحظہ ہو نصر الباری کتاب المغازی ص۱۶۵ ۔

واقعہ یہ تھا کہ جب نواسۂ رسول سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہؓ سے مصالحت کر لی اور خلافت انھیں سپرد کر دیا تو پھر مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع ہو گیا، فتوحات اسلامیہ کا سلسلہ جو تقریباً منقطع ہو چکا تھا پھر شروع ہو گیا، حضرت معاویہؓ کو مشیروں نے سمجھایا کہ اس وقت آپ بالاتفاق خلیفۃ المسلمین ہیں اگر آپ نے اپنی زندگی میں کسی کو ولی عہد نہیں بنایا تو آپ کے بعد پھر مسلمانوں میں اختلاف ہوگا اور قتل و قتال کی نوبت آسکتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ آپ اپنی زندگی میں یزید کو اپنا ولی عہد بنادیں، اگرچہ ولی عہدی کا یہ طریقہ اسلامی طریقہ نہیں، اور یزید کے اندرونی حال کا علم حضرت معاویہؓ کو نہ تھا اس لئے قتل و قتال اور اختلاف و شقاق سے اجتناب کے لئے حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولی عہد بنا دیا گویا یہاں سے ولی عہد بنانے کی رسم پڑ گئی چنانچہ بہت سے لوگوں نے جن میں بلاد اسلامیہ کے گورنران بھی تھے یزید کی ولی عہدی کو منظور کر لیا مگر سیدنا الامام حسینؓ اور محمد بن ابی بکرؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے ولی عہدی کی بیعت نہ کی (البدایۃ والنہایہ ج۸ ص۷۹)۔

حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد جب یزید تخت نشین ہوا تو اہل مدینہ سے بیعت لینا چاہی خصوصاً ان حضرات سے حضرت محمد بن ابی بکر تو پہلے ہی امیر معاویہؓ کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ امیر معاویہؓ کے بعد بیعت ہو گئے، حضرت حسینؓ اہل کوفہ کی دعوت پر کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے پھر ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ مشہور ہے اگرچہ اس میں مبالغہ آمیزی بھی ہے، اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مدینہ طیبہ چھوڑ کر مکہ معظمہ (حرم) میں پناہ لی اس لئے ان کو عائذ البیت کہا جاتا ہے۔ انہوں نے مکہ معظمہ پہونچکر معاملات سنبھال لئے، یزید کو غصہ آیا اور اس نے مکہ کے والی یحییٰ بن حکیم کو لکھا کہ عبداللہ بن زبیرؓ سے میرے لئے بیعت لے لو، مکہ معظمہ کے حاکم نے عبداللہ بن زبیرؓ سے بیعت لیکر یزید کو مطلع کر دیا تو یزید نے کہا کہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت قبول نہ کروں گا جب تک وہ میرے پاس قید ہو کر نہ آئیں گے، جب حاکم مکہ نے عبداللہ بن زبیرؓ کو یزید کا حکم نامہ سنایا تو عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا کہ میں نے تو حرم میں پناہ لی

ہے میری گرفتاری کیسی ؟ (عمدہ)

عمدۃ القاری کی مذکورہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ مکرمہ پہونچنے کے بعد انکار نہیں کیا مگر اس متکبر یزید کو ضد تھی کہ میرے پاس ہتھکڑی اور بیڑی میں آئیں، اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو خطرہ تھا اس لئے انھوں نے کہا کہ میں نے تو حرم میں پناہ لی ہے میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔

پھر یزید نے مدینہ کے حاکم عمرو بن سعید کو لکھا کہ عبداللہ زبیرؓ سے قتال کے لئے مکہ میں فوج بھیجو۔

وھو یبعث البعوث۔ بعوث (بضم الباء) بعث کی جمع ہے ای یرسل الجیوش۔ یعنی عمرو بن سعید حرم مکہ پر فوجیں بھیج رہا تھا اس وقت حضرت ابو شریح صحابیؓ نے کہا ایہا الامیر اے امیر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو ایک حدیث سنادوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن ارشاد فرمائی تھی، یہ نہایت ادب و تہذیب کا خطاب تھا اور یہ اصولِ دعوت و تبلیغ میں سے ہے کہ امراء و سلاطین کے تبلیغ میں ایسا عنوان اختیار کیا جائے جس میں نرمی و جاذبیت ہو بالخصوص ان کاموں میں جن کو وہ اپنے حقوق میں مداخلت شمار کرتے ہیں، نیز اس طرح بات کہنے میں قبولیت کی زیادہ توقع ہوتی ہے۔

الغد من یوم الفتح ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ مکہ فتح ہوا اور فتح مکہ کے دوسرے دن آپؐ نے خطبہ دیا جس میں مندرجہ ذیل باتیں فرمائیں:

سمعتہ اذنای الخ میرے کانوں نے خود سنا الخ مقصد یہ ہے کہ جس وقت آپؐ ارشاد فرما رہے تھے میں ہمہ تن گوش تھا اور قلب نے محفوظ کرلیا، مطلب یہ ہے کہ پورا پورا محفوظ ہے۔

ان مکۃ حرمہا اللہ الخ یعنی مکہ معظمہ کو اللہ نے حرم بنایا ہے، یہ کسی انسان کا بنایا ہوا حرم نہیں اس لئے کسی انسان کے لئے اس کی حرمت کا ختم کرنا جائز نہیں۔

اشکال ایک روایت میں ہے "ان ابراھیم حرم مکۃ وانا احرم ما بین لابتی المدینۃ" اور اس روایت میں ہے لم یحرمہا الناس بظاہر تعارض ہے۔

جواب:۔ حضرت ابراہیمؑ کی جانب تحریم کی نسبت مجازی ہے بلکہ مکہ معظمہ کی حرمت خداوند قدوس کی طرف سے ہے اور ہمیشہ سے ہے، طوفان نوحؑ سے اس کے آثار و نشانات مٹ گئے تھے اور حدود حرم مخفی تھیں حضرت ابراہیمؑ نے بحکم الٰہی اس کی تحدید فرمائی کہ یہ حصہ حرم ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے اس کے حرم ہونے کا اعلان کیا ہے ورنہ در اصل مکہ معظمہ کو اللہ تعالیٰ نے حرم بنایا ہے اس لئے کسی انسان کے لئے اس کی حرمت کا ختم کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کسی صاحب ایمان کے لئے قطعاً جائز نہیں کہ وہاں خون ریزی کرے خون ریزی تو بہت بڑی بات ہے وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مخصوص وقت (طلوع شمس سے لیکر عصر تک) کے لئے اجازت دی تھی۔

حرم کے مسائل اور ائمہ کرام کے اقوال

یہاں چند مسائل ہیں:۔

۱؎ اگر کوئی شخص حرمِ مکہ ہی کے اندر کسی کو قتل کر دے یا زخمی کر دے تو بالاتفاق اس کا قصاص حرم میں لیا جاسکتا ہے۔

۲؎ اگر کسی نے حرم سے باہر کسی کو زخمی کر دیا مثلاً: ہاتھ کاٹ دیا، ناک کاٹ دی تو اس صورت میں بھی سب ائمہ کا اتفاق ہے کہ اس کا قصاص حرم میں لیا جاسکتا ہے۔

۳؎ اگر کسی نے حرم سے باہر کسی کو قتل کر دیا اور پھر حرم میں داخل ہو کر پناہ لے لیا اس صورت میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک اس سے حرم کے اندر قصاص لیا جاسکتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس سے حرم میں قصاص نہیں لیا جاسکتا ہے بلکہ قاتل کو اس طرح تنگ کیا جائیگا، اس کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائیگا، کھانا پینا، لین دین سارے تعلقات کو منقطع کر دیا جائے گا کہ وہ مجبور ہو کر باہر نکل آئے پھر اس سے قصاص لیا جائے گا۔

حدیثِ باب مسلک احناف کی تائید کرتی ہے جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس جملہ سے استدلال کرتے ہیں ان الحرم لاتعیذ عاصیا ولا فاراً بدم الخ۔

حضرات احنافؒ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی حدیث نہیں بلکہ عمرو بن سعید کا قول ہے جو صحابی نہیں بلکہ یزید کا گورنر تھا اور اچھا تابعی بھی نہیں تھا چنانچہ اس کو لطیم الشیطان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ابن حزمؒ کہتے ہیں ولا کرامۃ للطیم الشیطان ان یکون اعلم من صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ولا یعضد بہا شجرۃ حرم مکہ کی نباتات تین قسم کی ہیں۔ ایک۱؎ وہ جو کسی شخص نے اپنی محنت سے اگائی ہو ان کو کاٹنا بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری۲؎ وہ کہ ان کو کسی نے اگایا تو نہ ہو لیکن وہ انھیں نباتات کی جنس سے ہوں جنھیں لوگ عام طور سے اگاتے ہیں، اس دوسری قسم کی نباتات کو بھی کاٹنا اور اکھیڑنا جائز ہے۔

تیسری۳؎ خودرو گھاس وغیرہ، اس میں صرف اذخر (ایک قسم کی خوشبودار گھاس) کو کاٹنا اور اکھیڑنا جائز ہے، نیز خودرو پودوں میں سے کوئی پودا بالکل سوکھ گیا ہو یا جل گیا ہو یا ٹوٹ گیا ہو تو اس کو کاٹنا بھی جائز ہے۔

خلاصہ یہ کہ لا یعضد بہا شجرۃ میں شجرہ سے مراد وہ گھاس اور پودے ہیں جو خود اُگے ہوں مما انبتہ الناس کی جنس میں سے بھی نہ ہوں ٹوٹے ہوئے، جلے ہوئے اور سوکھے ہوئے بھی نہ ہوں، نیز اذخر بھی نہ ہوں، ایسے پودوں اور گھاس وغیرہ کا کاٹنا جائز نہیں اور کاٹنے کی صورت میں جزا واجب ہے۔

۱۰۴ حدثنا عبد اللہ بن عبد الوھاب قال ثنا حماد عن ایوب عن محمد عن ابن ابی بکرۃ عن ابی بکرۃ ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فان دمائکم واموالکم قال محمد واحسبہ قال واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شہرکم

هٰذا الا لیبلغ الشاھدُ منکم الغائبَ وکان محمدٌ یقول صدق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان ذٰلک الا ھل بلغتُ مرّتین ●

ترجمہ حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا آپؐ نے فرمایا بلاشبہ تمہاری جانیں اور تمہارے اموال، محمد بن سیرینؒ کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ آپؐ نے واعراضکم کا لفظ بھی فرمایا، یعنی اور تمہاری آبروئیں تم پر (یعنی ایک دوسرے پر) حرام ہیں جس طرح اس دن (یوم نحر) کی حرمت ہے اس مہینہ میں، سن لو جو یہاں موجود ہیں غائبین تک میری اس بات کو پہونچا دیں۔ اور محمد بن سیرینؒ کہتے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ایسا ہی ہوا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں فرمایا" اور یاد رکھو میں نے یہ حکم تم کو پہونچا دیا آپؐ نے یہ دو بار فرمایا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ" الا لیبلغ الشاھد منکم الغائب"

تعدد الحدیث والحدیث ص۱۶ وھٰھنا ص۲۱ وباقی ص۲۳۴ وص۲۳۵ وص۶۳۲ وص۶۷۲ وص۸۳۳ وص۱۰۴۸ وص۱۱۰۹.

فائدہ ہمارے ہندی نسخوں کی سند میں ہے عن محمد عن ابی بکرۃ الخ

محمد سے مراد محمد بن سیرینؒ تابعی ہیں ان کا سماع حضرت ابو بکرہؓ سے ثابت نہیں۔

حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں فصار منقطعا لأن محمدا لم یسمع عن ابی بکرۃ (فتح الباری مطبوعہ بیروت ج ۱ ص۱۶۱)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ بعض نسخوں میں عن محمد عن ابی بکرۃ ہے اور بعض میں عن کو ابن سے بدل کر عن محمد بن ابی بکرۃ ہے وکلاھما وھم فاحش (عمدہ ص۱۴۵)

خلاصہ یہ کہ اکثر نسخوں میں یہ ہے عن محمد عن ابن ابی بکرۃ عن ابی بکرۃ الخ اور یہی صحیح ہے چنانچہ اسی بخاری کتاب العلم ص۱۶ میں ہے عن عبد الرحمٰن بن ابی بکرۃ عن ابیہ الخ، نیز عمدۃ القاری، فتح الباری اور ارشاد الساری تمام شروح معتبرہ ومستندہ میں اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

تشریح ھل بلغت ترجمہ میں ھل بمعنی قد لے کر ترجمہ کیا گیا ہے اور اگر ھل کو استفہام کے لئے مانا جائے تو اس صورت میں ترجمہ ہوگا، الا حرف تنبیہ ہے یعنی خوب غور سے سن لو اور جواب دو کیا میں نے فریضۂ تبلیغ ادا کر دیا؟ کیا میں نے یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک کی تعمیل کر دی؟ باقی تشریح کے لئے حدیث ص۶۶ ملاحظہ فرمایئے۔

بابُ اثمِ مَن کذبَ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص۲۱

اس شخص کے گناہ کا بیان جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔

ربط و مقصد باب سابق میں تبلیغ علم کا ذکر تھا کہ علم اپنی ذات تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ جو کچھ دین کا علم حاصل کیا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کی پوری کوشش کرے۔

امام بخاریؒ کا مقصد اس باب سے یہ ہے کہ یہ بالکل درست ہے کہ تبلیغ و تعلیم علماء کا مستقل فریضہ ہے اس لئے تبلیغ کا اہتمام کرنا چاہئے مگر اس اہتمام کے ساتھ ساتھ احتیاط بھی لازم ہے کہ کہیں شوق تبلیغ میں کوئی غلط بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نہ ہو جائے۔

۱۰۵ ● حدثنا عليُّ بنُ الجَعْدِ قال أنا شعبةُ قال أخبرني منصورٌ قال سمعتُ رِبْعِيَّ بنَ حِرَاشٍ يقول سمعتُ عليًّا يقول قال النبي صلى الله عليه وسلم لا تكذِبوا عليَّ فانه مَن كذَبَ عليَّ فليَلِجِ النارَ ●

ترجمہ ربعی بن حراش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (دیکھو) مجھ پر جھوٹ نہ باندھو کیونکہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ دوزخ میں جائیگا۔

مطابقته للترجمة مطابقة الحديث للترجمة في قوله "لا تكذبوا عليّ فانه من كذب عليّ فليلج النار"

یعنی حدیث پاک میں کذب علی النبیؐ سے ممانعت ہے جو مستلزم ہے گناہ کو اور گناہ مستلزم ہے دخول جہنم کو اور ترجمۃ الباب ہے کذب علی النبیؐ کے گناہ کا بیان (عمدہ)

ربعی بن حراش ربعی بکسر الراء وسکون الباء الموحدہ وکسر العین المہملۃ وتشدید الیاء ابن حراش بکسر الحاء المہملۃ وتخفیف الراء (عمدۃ)

تابعي ثقة لم يكذب كذبة قط (تہذیب التہذیب جلد ثالث (۳))

زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولے، ان کے دو بیٹے حجاج ظالم کے باغی و مخالف تھے اور روپوش تھے حجاج سے لوگوں نے کہا ان کے باپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے ان کے پاس آدمی بھیجکر معلوم کرلو، حجاج نے حضرت ربعی کے پاس آدمی بھیجا، حجاج کے فرستادے نے پوچھا کہ تمہارے دونوں بیٹے کہاں ہیں؟ ربعی نے کہا "هما في البيت" وہ دونوں گھر میں ہیں۔ حجاج نے جب سنا تو بہت متأثر ہوا اور کہا قد عفونا عنهما لصدقك تمہاری صدق بیانی کی وجہ سے ان دونوں کو معاف کر دیا۔

قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک نہ ہنسوں گا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میرا ٹھکانہ جنت میں ہے یا جہنم میں؟ عمر بھر کبھی نہ ہنسے موت کے بعد مسکرا رہے تھے توفي في خلافة عمر بن عبد العزيز سنة ۱۰۱ھ وقيل توفي في سنة اربع ومائة ۱۰۴۔

حضرت علی رضؓ نام ہے علی اور کنیت ابو الحسن و ابو تراب ہے، حیدر، اسد اللہ خطابات ہیں۔

ابوطالب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں ابوطالب کا مشہور نام عبد مناف تھا۔ حضرت علی رضؓ کی کنیت ابوالحسن ہے لیکن انہیں اپنی کنیت ابوتراب بہت پسند تھی اس لئے کہ یہ کنیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ کسی وجہ سے ان میں اور حضرت سیدہؓ میں کچھ شکر رنجی ہو گئی یہ مسجد میں جاکر سو گئے اتفاقاً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے حضرت علی رضؓ کو نہ پایا تلاش کروانے پر معلوم ہوا کہ مسجد میں سو رہے ہیں آپؐ تشریف لائے دیکھا کہ پیٹھ پر گرد لگی ہوئی ہے تو فرمایا قم یا ابا تراب اے ابوتراب اٹھو اور آپؐ گرد جھاڑنے لگے، اعلانِ نبوت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے، بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے ان کی تربیت آغوشِ نبوت میں ہوئی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضؓ سے ان کی شادی فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اے فاطمہ میں نے اپنے خاندان کے بہترین شخص سے تمہارا نکاح کردیا۔ (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۲۴)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں اول خليفة من بنی هاشم واحد العشرة المبشرة بالجنة و احد الستة اصحاب الشورىٰ الذين توفي رسول الله عليه الصلوة والسلام وهو عنهم راض واحد الخلفاء الراشدين واحد العلماء الربانيين واحد الشجعان المشهورين۔ (عمدة ج ۲ ص ۱۴۷)

حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد تیسرے دن باتفاق اہلِ حل وعقد ۳۵ھ بماہ ذی الحجہ خلیفہ منتخب ہوئے تین ماہ کچھ دن کم پانچ سال تک مسند آرائے خلافت رہے۔

۱۸ رمضان ۴۰ھ میں نماز فجر کے لئے جاتے ہوئے مسجد کوفہ میں عبد الرحمٰن بن ملجم نے زہر آلود تلوار ماری اور تیسرے دن یکشنبہ کی رات شہید ہو گئے۔ امام حسین رضؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور کوفہ کے ایک قبرستان میں دفن کردیا اس وقت آپؐ کی عمر مبارک تریسٹھ ۶۳ برس تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا اشد کبائر میں سے ہے

بلا شبہ کذب (جھوٹ) مطلقاً ناجائز اور گناہ کبیرہ ہے خواہ دین کے معاملہ میں ہو یا دنیا کے معاملہ میں، عبادات سے متعلق ہو یا معاملات سے علی الاطلاق جھوٹ ناجائز و حرام ہے، اور کذب علی الرسول اشد کبائر میں ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

ان كذبا عليّ ليس ككذب على الناس۔ میرے اوپر جھوٹ بولنا لوگوں پر جھوٹ بولنے جیسا نہیں ہے۔

جمہور علماء اسلام کے نزدیک کذب علی النبی متعمدا علی الاطلاق اشد کبائر ہے، حرام ہے مگر بجز استحلال کافر نہیں ہوگا۔

صرف امام الحرمین ابو المعالی شافعیؒ کے والد ابو محمد جوینی اور ابن المنیرؒ نے جھوٹی حدیث بیان کرنیوالے کی تکفیر کی ہے لیکن امام الحرمینؒ نے اس کی تردید کردی ہے کہ کافر نہیں ہوگا بلکہ فاسق ہوگا۔

بہرحال جمہور علماء اسلام کا یہی فتویٰ اور فیصلہ ہے کہ تکفیر اصول اسلام کے خلاف ہے ہاں گناہ کبیرہ بلکہ اکبر کبائر کا مرتکب کہتے ہیں۔

امام بخاریؒ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی چیز کے انتساب میں پوری احتیاط کے لئے پانچ روایات پیش کی ہیں جو پانچ صحابہ سے مروی ہیں، ان روایات کو بہترین انداز سے مرتب لایا ہے۔

پہلی روایت حضرت علی رضؓ کی ہے جس میں کذب سے صراحتاً منع فرمایا گیا ہے اور جھوٹی حدیث بیان کرنے والے کے لئے دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔

دوسری روایت حضرت زبیر بن عوام رضؓ کی ہے:۔

۱۰۶ ● حدثنا ابو الولید قال ثنا شعبة عن جامع بن شداد عن عامر بن عبد الله بن الزبیر عن ابیه قال قلت للزبیر انی لا اسمعك تحدث عن رسول الله صلی الله علیه وسلم کما یحدث فلان وفلان قال اما انی لم افارقه ولکن سمعته یقول من کذب علیّ فلیتبوأ مقعده من النار ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ سے مروی ہے کہ میں نے (اپنے باپ) حضرت زبیر رضؓ سے کہا میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں فلاں فلاں کی طرح بیان کرتے نہیں سنتا، انھوں نے کہا سنو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں رہا کہ آپ کی حدیثیں میں نے نہ سنی ہو لیکن میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو کوئی مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

۱۰۷ ● حدثنا ابو معمر قال ثنا عبد الوارث عن عبد العزیز قال انس انه لیمنعنی ان احدثکم حدیثا کثیرا ان النبی صلی الله علیه وسلم قال من تعمد علیّ کذبا فلیتبوأ مقعده من النار ●

ترجمہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

مطابقته للترجمة مطابقة الحدیث للترجمة ظاهرة۔

۱۰۸ ● حدثنا المکی بن ابراهیم قال حدثنا یزید بن ابی عبید عن سلمة هو ابن الاکوع قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول من یقل علیّ ما لم اقل فلیتبوأ مقعده من النار ●

ترجمہ حضرت سلمہ بن اکوع رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا جس نے میری جانب ایسے قول کی نسبت کی جو میں نے نہیں کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ۔

۱۰۹ ● حدثنا موسیٰ قال ثنا ابو عوانۃ عن ابی حَصینٍ عن ابی صالحٍ عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال تَسَمَّوا باسمی ولا تکتنوا بِکُنْیَتی ومن راٰنی فی المنام فقد راٰنی فاِنَّ الشیطٰنَ لایتمثّل فی صورتی ومَن کذَبَ علیَّ متعمّدًا فلیتبوّأ مقعدہ من النار ●

ترجمہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے نام پر نام رکھو (محمد اور احمد نام رکھو) اور میری کنیت (ابوالقاسم) نہ رکھو اور (ذہن میں رکھو) جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے بلاشبہ مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں اختیار کرسکتا اور جوجان بوجھ کر قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاہرۃ۔

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا ۲۱ وفی المناقب ۵۰۱ وفی الادب ۹۱۴ ایضاً ۹۱۵

"قولہ من راٰنی فی المنام فقد راٰنی فانّ الشیطان لایتمثل فی صورتی"

ھو حدیث آخر جمعھا الراوی بھٰذا الاسناد یاتی فی الادب فی باب مَن سمّی باسماء الانبیاء ص ۹۱۵ مفردًا کذالک ویاتی ہٰذا الحدیث فقط فی التفسیر فی باب من رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام ص ۱۰۳۵

تشریح باب کی دوسری حدیث عبداللہ بن زبیر رضؓ کی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد حضرت زبیر رضؓ سے عرض کیا کہ میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں فلاں اور فلاں کی طرح بیان کرتے ہوئے نہیں سنتا، کما یحدث فلان وفلان. ایک فلاں سے مراد تو ابن ماجہ کی روایت کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ ہیں دوسرے فلاں کا علم نہیں شاید حضرت ابو ہریرہ رضؓ مراد ہوں۔

قال اما انی لم افارقہ الخ: میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں رہا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہے ہوں کیونکہ سفر ہجرت میں حضرت زبیر رضؓ ساتھ نہ تھے، نیز جب حضرت زبیر رضؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ ہی میں تھے اس لئے مقصد صرف کثرت ملازمت اور اغلب احوال میں صحبت و حاضری کو بیان کرنا ہے، بعض روایات میں ہے کہ حضرت زبیر رضؓ نے حضورؐ سے اپنی قرابتوں کو پہلے بیان کیا اور پھر کہا کہ میں صحبت نبوی میں اکثر رہا ہوں اور میرے پاس بھی حدیثیں بکثرت محفوظ ہیں لیکن حضورؐ کا ارشاد سن چکا ہوں کہ جو میرے اوپر جھوٹ بولیگا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے اس لئے احتیاط برتتا ہوں۔

تیسری روایت حضرت انسؓ کی ہے ترجمہ گذر چکا ہے

اشکال حضرت انسؓ مکثرین فی الحدیث میں سے ہیں ان سے دو ہزار، دو سو، چھیاسی حدیثیں مروی ہیں (عمدہ ج ۱ ص ۱۴۰) پھر آپ کا یہ قول کیسے صحیح ہوگا؟

جواب: آپؓ کا مقصد یہ ہے کہ مجھے جتنی حدیثیں یاد ہیں وہ سب بیان نہیں کرتا۔

حضرت انسؓ از خود بہت کم بیان کرتے تھے لیکن چونکہ دس سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور عمر بھی بہت طویل ہوئی صحابہ کے آخر زمانہ تک زندہ رہے، صحابہ تقریباً سب اٹھ چکے تھے صرف دو چار رہ گئے تھے اس لئے لوگوں کا رجوع عام انھیں کی طرف تھا پس آپؓ سے کثرتِ سوالات کی وجہ سے روایات کی کثرت ہوئی چونکہ سوال کے بعد کتمانِ علم پر بھی وعید منقول ہے ارشاد نبوی ہے:۔

من سئل عن علم فكتمه الجم يوم القيامة بلجام من النار — جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اور اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔

(ابن ماجہ ص ۲۳)

حدثنا المكي بن ابراهيم الخ یہ اس باب کی چوتھی حدیث ہے اور صحیح بخاری شریف کے بائیس ۲۲ ثلاثیات میں سے پہلی ثلاثی ہے جس میں امام بخاریؒ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف تین واسطے ہیں، ایک واسطہ مکی ابن ابراہیم ہیں جو امام بخاریؒ کے اکابر شیوخ میں سے ہیں اور امام اعظمؒ کے تلامذۂ حدیث میں سے ہیں جس کی تصریح خود حافظ عسقلانی شافعی نے مکی بن ابراہیم کے حالات میں کی ہے (تہذیب التہذیب ص ۲۹۳ ج ۱۰)

حضرت شیخ الحدیث سہارنپوریؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ کے بائیس ۲۲ ثلاثیات میں سے بیس ۲۰ کے مشائخ حنفی ہیں گویا صحیح بخاری شریف کی سند میں علو امام اعظمؒ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد سے پیدا ہوا۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ جس کو امام بخاری کے استادوں نے امام مانا ہے اس کی امامت کیوں تسلیم نہیں؟

روایت بالمعنیٰ چوتھی حدیث حضرت سلمہ بن اکوعؓ کی ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ "مَن يقل عليّ ما لم اقل" میں قول کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اس وجہ سے بعض حضرات روایت بالمعنیٰ کو ناجائز کہتے ہیں کیونکہ روایت بالمعنیٰ کی صورت میں ارشاد نبوی میں لفظی تغیر واقع ہو جائے گا۔

لیکن جمہور کے نزدیک روایت بالمعنیٰ جائز ہے اس لئے علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:۔

واجيب من جهة المجوزين بان المراد النهي عن الاتيان بلفظ يوجب تغيير الحكم على ان الاتيان باللفظ اولى بلا شك۔ — اور روایت بالمعنیٰ کو جائز قرار دینے والوں کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس سے حضورؐ کے ارشادات میں ایسے الفاظ لانے کی ممانعت مقصود ہے جو حکم کو بدل دیں۔ البتہ روایت بلفظہٖ نقل کرنا بلا اختلاف سب کے نزدیک اولیٰ ہے۔

حضرت سلمہ بن اکوع رضؓ

آپ کی کنیت ابو سلمہ ہے وقیل ابو عامر وقیل ابو ایاس۔ آپ بڑے بہادر اور ماہر تیر انداز صحابی تھے۔ صاحب فضل وکمال اور سخی تھے، پیدل دوڑتے تو سواروں سے آگے ہو جاتے، بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن تین بار بیعت کی ابتداء میں، درمیان میں، پھر اخیر میں۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ علامہ عینی رحؒ وغیرہ نے یوں ذکر کیا ہے کہ ان کا خود بیان ہے کہ میں نے ایک بھیڑیا دیکھا جس نے ہرن کو پکڑ لیا ہے تو میں نے بھیڑیے کا تعاقب کیا اور اس سے ہرن کو چھین لیا تو بھیڑیا کہنے لگا "تمہاری خرابی ہو تمہیں میرے معاملہ سے کیا تعلق؟ مجھے خداوند تعالیٰ نے ایک رزق دیا تھا تم نے اُسے چھین لیا حالانکہ وہ تیرا مال نہیں تھا پھر بھی مجھ سے چھین لیا۔ میں نے سخت حیرت سے کہا لوگو! دیکھو کیسی عجیب بات ہے کہ بھیڑیا کلام کر رہا ہے۔ اس پر بھیڑیے نے کہا اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اللہ کا رسول کھجوروں کے باغوں والے شہر (مدینہ طیبہ) میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں اور تم بتوں کی عبادت پر مصر ہو۔

حضرت سلمہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں یہ سنکر سیدھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گیا۔

اسی طرح بھیڑیے کے کلام کرنے کا ایک واقعہ مشکوٰۃ میں بھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک یہودی چرواہے نے بھیڑیے کی بات سنی اور حضور اقدس صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گیا۔
(مشکوٰۃ ص۵۴۱ باب المعجزات فصل ثانی)

حضرت سلمہ رضؓ ۷۴ھ میں اسی برس کی عمر پاکر مدینہ طیبہ میں وصال فرمایا۔

حدثنا موسی الخ: یہ پانچویں حدیث یعنی اس باب کی آخری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی ہے۔

قال تسموا باسمی: بفتح التاء والسین والمیم المشددۃ امر بصیغۃ الجمع من باب تفعل۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے نام پر نام رکھو لیکن میری کنیت پر کنیت نہ رکھو۔

سببِ ورود

اس حدیث پاک کا شانِ ورود یہ ہے کہ آپؐ ایک مرتبہ بازار تشریف لے جا رہے تھے کسی نے آواز دی "یا ابا القاسم" آپؐ نے سمجھا کہ مجھے پکارا ہے، آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا "یا رسول اللہ میں نے آپ کو نہیں بلکہ فلاں شخص کو پکارا ہے، اس التباس کی وجہ سے آپؐ نے اپنی کنیت سے ممانعت فرمائی اور نام سے چونکہ عموماً نہیں پکارا جاتا تھا اس لئے نام سے منع نہیں فرمایا۔

ایک قول یہ ہے کہ یہود ابو القاسم کنیت رکھتے تھے آپؐ کو ایذا پہونچانے کے لئے چنانچہ جب آپؐ کو دیکھتے تو پکارتے اے ابو القاسم! جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوتے تو کہتے کہ آپ کو نہیں بلایا بلکہ فلاں کو بلایا ہے اس لئے آپؐ نے کنیت ابو القاسم سے منع فرمایا۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ کسی نام سے اگر مدح یا ذم (تعریف یا بُرائی) ظاہر ہو تو اسے لقب کہتے ہیں جیسے حکیم الامت، شیخ الاسلام۔ ورنہ اگر اس کے شروع میں اب یا اُم ہو تو کنیت ہے جیسے ابوبکر، ام الدرداء، ورنہ نام ہے جیسے عمر، عثمان۔

پس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک محمدؐ اور کنیت ابوالقاسم اور لقب رسول اللہ، سید المرسلین خاتم النبیین ہے۔

اسم گرامی اور کنیت کا حکم حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم کنیت رکھنا جائز نہیں لیکن محمد یا احمد نام رکھنا جائز ہے۔

لیکن ابوداؤد میں ایک روایت ہے:

من تسمّی باسمی فلا یکتنی بکنیتی ومن اکتنی بکنیتی فلا یتسمی باسمی۔

جو میرا نام رکھے تو میری کنیت نہ رکھے اور جو شخص میری کنیت رکھے وہ میرا نام نہ رکھے۔

(ابوداؤد ج ۲ ص ۶۷۸ کتاب الادب)

نیز ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ نہی أن یجمع احد بین اسمہ وکنیتہ ویسمی محمدا اباالقاسم۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نام اور کنیت جمع کرنے سے منع فرمایا اور اس سے بھی کہ جس کا نام محمدؐ ہو اس کی کنیت ابوالقاسم رکھی جائے۔

(ترمذی ج ۲ ابواب الادب ص ۱۰۷)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں (نام اور کنیت) جمع کرنا ممنوع ہے صرف محمدؐ نام رکھنا یا صرف ابوالقاسم کنیت رکھنا منع نہیں تھا چنانچہ بعض حضرات اسی کے قائل ہیں، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس قسم کی ممانعت کا جو بھی حکم تھا وہ حیات مبارکہ ہی تک محدود تھا، حضورؐ کے وصال کے بعد منسوخ ہے نام اور کنیت دونوں کو جمع کرنا خود حضور اقدسؐ کی اجازت سے ثابت ہے۔

ابوداؤد شریف میں محمد بن الحنفیہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر آپؐ کے بعد میرے کوئی لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام حضورؐ کے نام پر اور اس کی کنیت حضورؐ کی کنیت پر رکھوں؟ فرمایا ہاں اجازت ہے۔ چنانچہ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے ابن الحنفیہ کا نام محمد رکھا اور کنیت ابوالقاسم رکھی۔

پس معلوم ہوا کہ اب دونوں کو جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں اور نہ کسی ایک میں مضائقہ ہے کیونکہ ممانعت کی علامت مرتفع ہو گئی۔

قولہ "مَن رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطٰن لا یتمثل فی صورتی"

جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا ہے (یعنی کسی دوسری چیز کا وہم نہ کرے) کیونکہ شیطان میری صورت میں متشکل نہیں ہو سکتا ہے (یعنی شیطان کو یہ قدرت نہیں کہ میری صورت اختیار کر سکے)۔

رؤیا یعنی خواب کے اقسام حافظ عسقلانیؒ نے ایک مستقل رسالہ کتاب الرؤیا کے نام سے لکھا ہے، فرماتے ہیں رؤیا کے تین اقسام ہیں۔

(۱) کبھی بعینہ اصل چیز نظر آتی ہے یعنی رؤیا (خواب) کسی صحیح واقعہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔
(۲) کبھی شیطان اصل کی صورت میں متمثل ہو کر نظر آتا ہے۔
(۳) کبھی قوت خیالیہ میں جو اشیاء ہوتی ہیں قوت مصورہ انھیں سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری صورت میں متمثل ہو کر شیطان نہیں آسکتا، شیطان کو یہ قدرت ہی نہیں کہ آکر یہ کہدے کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔

خواب میں حضورؐ کی رویت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت سے متعلق مختلف روایات ہیں۔

(۱) من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطٰن لا یتمثل فی صورتی۔
(۲) من رآنی فی المنام فقد رای الحق۔
(۳) من رآنی فی المنام فسیرانی فی الیقظۃ او لکانما رآنی فی الیقظۃ۔

مسلم نے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے دیکھئے (مسلم ج ۲ ص ۲۴۲)

جاہل متصوفین نے فقد رای الحق کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، یہ صریح الحاد اور بے دینی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے خواب میں مجھے دیکھا وہ کسی وہم میں نہ پڑے اس نے ٹھیک مجھے ہی دیکھا۔

بعض علماء نے فسیرانی کی روایت کو اصل قرار دیکر یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ جس نے خواب میں مجھے دیکھا وہ آخرت میں مجھے دیکھے گا۔

اشکال اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آخرت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار تو ہر مومن کو ہوگا تو اس کی کیا تخصیص؟

جواب:۔ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس شخص کو خاص قسم کی رویت نصیب ہوگی اور اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نظر عنایت ہوگی۔

اور جن روایات میں ماضی کے صیغے ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ تحقق وقوع پر دلالت کے لئے لائے ہیں کما فی قولہ تعالیٰ: وسیق الذین کفروا وامثالہ۔

اور بعض نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ یہ حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے

ساتھ مختص تھا، مطلب یہ ہے کہ میری زندگی میں جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ میرے پاس پہونچکر مجھے دیکھ لے گا۔

اور بعض نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے مابعد پر بھی شامل کہا ہے بایں طور کہ جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اس کو آپؐ کے روضۂ مبارک کی زیارت نصیب ہوگی مگر یہ توجیہات اس لئے صحیح نہیں کہ فان الشیطٰن لا یتمثل فی صورتی کی تعلیل ان کی تردید کرتی ہے۔

لہٰذا اس روایت کا صحیح مطلب وہی ہے جو اس کے ظاہر سے مفہوم ہوتا ہے یعنی جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ یہ وہم نہ کرے کہ شاید شیطان متشکل ہو کر آگیا ہو بلکہ اسے یقین رکھنا چاہئے کہ اس نے مجھے ہی دیکھا ہے۔

هل يلزم ان تكون رويته صلى الله عليه وسلم فى صورته الاصلية ؟

اس میں اختلاف ہے کہ خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی حلیہ اور حقیقی صورت کا دیکھنا ضروری ہے یا نہیں ؟

شاہ رفیع الدین اور سید المعبرین ابن سیرین اور قاضی عیاض رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہ مسلک ہے کہ آپؐ کی اصلی صورت کا دیکھنا ضروری ہے۔

فنِ تعبیر میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد ابن سیرینؒ کے برابر کسی کا درجہ نہیں، آپ کے پاس اگر کوئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کا خواب بیان کرتا تو اس سے حلیہ اور علامات دریافت فرماتے، اگر اس کی بتائی ہوئی علامات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان علامات سے مطابقت کرتیں جو کتب سیرت میں منقول ہیں تو قبول فرماتے ورنہ رد فرمادیتے فان الشیطٰن لا یتمثل فی صورته سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت متعینہ اگر دیکھی ہے تو یقین ہوگا کہ یہ شیطانی تمثل نہیں ہے۔

مگر جمہور علماء اور شاہ عبدالعزیز اور امام غزالی رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی علامات کا دیکھنا ضروری نہیں صرف اتنا کافی ہے کہ رائی بوقت رویت یہ یقین کئے ہوئے ہو کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مختلف صورتوں میں دکھائی دینا کبھی رائی کے قلب کا عکس ہوتا ہے مثلاً اچھی صورت میں دکھائی دینا رائی کے قلب کی صفائی کی دلیل ہے اور کسی ناجائز صورت یا ناجائز لباس میں دکھائی دینا رائی کی سیئات کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور کبھی رائی کی حالت کی طرف اشارہ نہیں ہوتا بلکہ کسی حالت عامہ سے تعبیر ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالعلی صاحب مدرس مدرسہ عبدالرب نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا، آپ نے جواب تحریر فرمایا کہ اس میں آپ کی کسی برائی کی طرف اشارہ نہیں بلکہ دین پر غلبۂ

نصرانیت کی طرف اشارہ ہے۔

خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالاتفاق حجت نہیں اگر خلاف شرع ہوگا تو قبول نہ کیا جائیگا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگرچہ شیطان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے متمثل نہیں ہو سکتا مگر یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں کہ شیطان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجہ سے اپنا لہجہ نہیں ملا سکتا، رائی نے جو کچھ سنا اس میں شیطان کے اختلاط کا احتمال ہے اس لئے حجت نہیں۔

مگر فتح المغیث میں علامہ سخاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حجت نہ ہونے کی مذکورہ بالا وجہ بیان کرنا مناسب نہیں، صحیح وجہ یہ ہے کہ حالتِ نوم حالتِ غفلت ہے اور مغفل کی روایت قبول نہیں، نوم میں غفلت کی وجہ سے الفاظ کے تغیر اور نسیان کا احتمال باقی رہتا ہے۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حکایت از شیخ اجل عبد الوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ شنیدم کہ یکے از فقراء مغرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را بخواب دید کہ اورا بشرب خمر امر فرمایند رفع اشکال را از مشائخ وقت خود استفتاء کرد کہ حقیقت حال چیست؟ ہر کس از مشائخ اُمرا محملے دتاویلے کردند، در مدینہ منورہ مطہرہ عزیزے بود از مشاہیر مشائخ وقت خود کہ ایشاں را شیخ محمد بن عراقی می گفتند در غایت اتباع واستقامت چوں استفتاء در منظر ایشاں درآمد فرمود ایں چنیں نیست، در سامعہ آں شخص خللے بود، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لا تشرب الخمر فرمودہ اند وے لا تشرب را اشرب شنیدہ۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا خیال ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشرب الخمر تہدیداً فرمایا ہوگا۔

رویتہ صلی اللہ علیہ وسلم تکون بالجسد المثالی؟

اس موقع پر ایک اور اختلاف ہے کہ خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت جسم مثالی کے ساتھ ہوتی ہے یا کہ جسد حقیقی کے ساتھ بایں طور کہ آپ کی قبر مبارک اور رائی کے درمیان سے حجاب اٹھادئے جاتے ہیں۔

امام غزالی وسیوطی رحمہما اللہ تعالیٰ رویت بالمثال کے قائل ہیں اور بعض روایت میں فکانما رانی کے الفاظ بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔ بعض اولیاء کو حالتِ بیداری میں بھی بصورت کشف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے اس حالت میں بھی آپ کا قول حجت نہیں۔

لطیفہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف رشد و ہدایت کے مظہر ہیں اور شیطان صرف صفت ضلالت کا مظہر ہے اور اللہ تعالیٰ ہادی بھی ہیں اور مضل بھی اس لئے شیطان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں متمثل نہیں ہو سکتا اگر کسی شخص نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو

ممکن ہے کہ وہ شیطان ہو اور رائی اسے اللہ تعالیٰ سمجھ رہا ہو۔ (ارشاد القاری)

نقل فی الدر المختار عن امامنا الاعظم رحمہ اللہ تعالیٰ انہ رأی ربہ فی المنام مائۃ مرۃ وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ لرؤیتہ تعالیٰ فی المنام قصۃ مشہورۃ ذکرھا الحافظ النجم الغیطی وھی ان الامام رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال رایت رب العزۃ فی المنام تسعا وتسعین مرۃ فقلت فی نفسی ان رایتہ تمام المائۃ لاسئلنہ بم ینجو الخلائق من عذابہ یوم القیامۃ قال فرایتہ سبحانہ وتعالیٰ فقلت یارب عز جارك وجل ثناؤك وتقدست اسماؤك بم ینجو عبادك یوم القیامۃ من عذابك فقال سبحانہ وتعالیٰ من قال بعد الغداۃ والعشی سبحان الابدی الابد سبحان الواحد الاحد سبحان الفرد الصمد سبحان رافع السماء بغیر عمد سبحان من بسط الارض علی ماء جمد سبحان من خلق الخلق فاحصاھم عدد سبحان من قسم الرزق ولم ینس احد سبحان الذی لم یتخذ صاحبۃ ولا ولد سبحان الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد، نجا من عذابی اھ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۵)

ارشاد القاری کا حوالہ ممکن ہے کہ مصری نسخہ کا ہو لیکن شامی مطبوعہ دیوبند دیکھئے (ج ۱ ص ۳۵)

اجزاء حدیث کا باہمی ربط

اس حدیث میں چار چیزیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ (۱) ایک نام پر نام رکھنا۔ (۲) کنیت پر کنیت رکھنا۔ (۳) خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونا۔ (۴) آپؐ پر قصداً جھوٹ بولنا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث ابو ہریرہ رضؓ کے اجزاء میں ربط کیا ہے؟ علامہ بدر الدین عینیؒ فرماتے ہیں دوسرے حکم کو پہلے حکم کے بعد ارشاد فرمانا تو ظاہر ہے کیونکہ نام اور کنیت دونوں ایک ہی وادی کی چیزیں ہیں، اسی طرح حکم رابع کو حکم ثالث کے بعد لانا بھی ظاہر ہے کیونکہ اذا کذب علیہ بانہ راٰہ فی المنام الخ یعنی آپؐ پر جھوٹ بولنا خواہ عالم بیداری میں ہو یا عالم خواب میں دونوں حرام اور وعید مذکور میں داخل ہیں۔

تیسرے حکم کو دوسرے حکم کے بعد لانے میں کیا ربط ہے؟ اس کی وضاحت کو علامہ عینیؒ نے شاید مستقبل کے لئے چھوڑ دیا ہو اور پھر تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔

بعض علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت منامی کو تسمیہ سے تعبیر کیا ہے یعنی میرے نام پر (محمدؐ اور احمدؐ) نام رکھو، میری کنیت ابو القاسم نہ رکھو اور جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا بیشک اس نے مجھ ہی کو دیکھا یعنی خواب میں بھی جس چیز پر میرا تسمیہ آجائے بایں طور کہ دل گواہی دے یا کوئی

بتادے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو سمجھ لو کہ میں ہی ہوں ۔ واللہ اعلم۔

بَابُ[۸۱] کِتَابَةِ العِلْمِ صـ۲۱

علمی باتوں کے لکھنے کا بیان۔

ربطِ ماقبل ماقبل کے باب میں اس کی تعلیم اور تاکید تھی کہ نقل روایت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا گناہ بلکہ اشد کبائر میں سے ہے اس لئے احادیث کے نقل میں احتیاط ضروری ہے۔

اب اس باب میں اس احتیاط کی صورت بیان کی جارہی ہے کہ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو لکھ لیا جائے اس لئے امام بخاری ؒ نے احتیاط فی الحدیث اور توقی عن الکذب کے بعد کتابت حدیث کا باب منعقد کیا ہے۔

مقصد ترجمۃ الباب سے مقصد یہ ہے کہ حدیث اور علم دین کی کتابت بدعت نہیں بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مزید تفصیل کے لئے شروع مقدمہ میں تدوین حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

ع۲ حضرت گنگوہی ؒ فرماتے ہیں" احادیث نہی عن الکتابت سے ممانعت مفہوم ہوسکتی تھی اس لئے امام بخاریؒ نے اس باب کو منعقد کرکے اس شبہ کو دفع کردیا کہ ممانعت ابتداء میں تھی پھر آپ ؐ نے کتابت کی رخصت عنایت فرمادی۔ (امداد الباری بحوالہ لامع)

۱۱۰ ● حدثنا محمدُ بن سلامٍ قال اخبرنی وکیعٌ عن سفیانَ عن مُطرّفٍ عن الشعبیِّ عن ابی جُحَیفۃَ قال قلتُ لعلیٍّ رضی اللہ عنہ ھل عندکم کتابٌ قال لا اِلّا کتابُ اللہ اوفہمٌ اُعطیہ رجلٌ مسلمٌ اوما فی ھذہ الصَّحیفۃِ قال قلتُ ومافی ھذہ الصحیفۃِ قال العقلُ وفکاکُ الاسیرِ ولا یُقتَلُ مسلمٌ بکافرٍ ●

ترجمہ حضرت ابوجحیفہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت علی ؓ سے پوچھا کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں مگر اللہ کی کتاب (قرآن شریف) یا سمجھ جو مسلمان کو دی جاتی ہے یا جو اس صحیفہ میں لکھا ہوا ہے، ابوجحیفہ نے کہا میں نے پوچھا اس صحیفے میں کیا لکھا ہوا ہے؟ حضرت علی ؓ نے فرمایا دیت کے احکام، قیدی کو چھڑانے کا بیان اور یہ حکم کہ مسلمان کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "ومافی ھذہ الصحیفۃ" لان الصحیفۃ ھی الورقۃ المکتوبۃ۔

تعدد الحدیث والحدیث ھٰھنا صـ۲۱ ویاتی فی کتاب الجہاد صـ۴۲۸ وفی الدیات صـ۱۰۲۰ ایضا صـ۱۰۲۱ ۔

تشریح امام بخاری ؒ نے اس باب کے تحت چار احادیث ذکر فرمائے ہیں اور چاروں احادیث

میں علوم نبوت کو ضبط تحریر میں لانے کا ثبوت ہے یہی حدیث ابو جحیفہ کی ہے۔

عن ابی جحیفۃ (بضم الجیم و فتح الحاء) ان کا نام وہب بن عبداللہ سوائی (بضم السین المہملۃ وتخفیف الواو) کوفہ کے باشندہ صغار صحابہ میں سے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بالغ بھی نہیں ہوئے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محبوب اور معتمد تھے حضرت علیؓ نے ان کو کوفہ کے بیت المال کا امین مقرر کیا تھا ۷۴ھ میں وصال فرمایا (عمدہ)

ھل عندکم کتاب قال لا الخ حضرت ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کیا آپ کے پاس کوئی اور کتاب (نوشتہ) ہے یعنی اس قرآن حکیم کے علاوہ جو سارے مسلمانوں کے پاس ہے کیا اس کے علاوہ بھی آپ کے پاس کوئی خصوصی مکتوب (نوشتہ ہے؟ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص آپ کو لکھوایا ہو۔

وجہ سوال حضرت علیؓ ہی کے دور سے رافضی شیعوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت علیؓ کے پاس کوئی خاص نوشتہ مکتوب کی شکل میں ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔

اسی زمانہ میں عبداللہ بن سبا یہودی نے مسلمانوں میں غلط عقائد کی تبلیغ شروع کر رکھی تھی مثلاً یہ کہ اصل قرآن تو حضرت علیؓ کے پاس محفوظ ہے اور اس کے دس پاروں میں مناقب اہل بیت کا ذکر ہے، اور یہ قرآن جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے یہ اصل اور پورا قرآن نہیں ہے یہ بیاض عثمانی ہے، روافض یہ بھی پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو بطور خاص وحی کے کچھ علوم عطا فرمائے ہیں جو سینہ بہ سینہ صرف اہل بیت کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے۔

اس قسم کی باتوں سے متاثر ہو کر حضرت ابو جحیفہؓ اور بروایت نسائی قیس بن عبادہ اور اشتر نخعی اور مختلف لوگوں نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس کوئی خاص احکام والی وحی ہے؟

یہ حدیث جس میں وحی کے متعلق سوال کی تصریح ہے آگے بخاری اول ص ۴۲۸ پر آ ویگی جس کے الفاظ ہیں ھل عندکم شیئ من الوحی الخ۔

بہر حال حضرت علیؓ نے جواب دیا لا۔ الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ رجل مسلم، کوئی نہیں مگر اللہ کی کتاب الخ یعنی ہمارے پاس کوئی خصوصی نوشتہ نہیں الخ۔

گویا حضرت علیؓ نے شیعوں کے اس غلط عقیدے کی تردید کر دی۔

مطلب یہ ہے کہ یہ غلط کہا جاتا ہے کہ میرے پاس کوئی خاص مکتوب ہے، میرے پاس اور تو کچھ نہیں وہی کتاب اللہ ہے جو سب کے پاس ہے اور عقل سلیم جو اللہ تعالیٰ رجل مومن کو دیتا ہے (یعنی وہ بھی کوئی خاص خصوصیت میری نہیں ہے) اور وہ کتاب اللہ میں غور کر کے حقائق و معارف اور بہت سی باتیں معلوم

کرلیتا ہے جن کا ذکر صراحۃً کتاب اللہ میں نہیں۔

اِلا کتاب اللہ او فھم کے استثناء میں اختلاف ہے کہ یہ استثناء متصل ہے یا منقطع؟

علامہ بدرالدین عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں استثناء منقطع ہے، اور محدث ابن منیرؒ اور علامہ ابوالحسن سندھیؒ کے نزدیک استثناء متصل ہے۔

محدث ابن منیرؒ فرماتے ہیں کہ اِلا کتاب اللہ او فھم کو بالرفع ذکر کیا گیا ہے لوکان الاستثناء من غیر الجنس لکان منصوبا (فتح) اگر استثناء غیر جنس سے (یعنی منقطع) ہوتا تو رفع کے بجائے نصب ہوتا۔

اس صورت میں روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے پاس دو چیزیں مکتوب اور لکھی ہوئی ہیں ایک کتاب اللہ اور دوسری اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی فہم سے استنباط کئے ہوئے مسائل، اور ان کے ارشاد او فھم اعطیہ رجل مسلم سے یہی مراد ہے (عمدہ)

علامہ بدرالدین اور حافظ ابن حجر کا ارشاد

علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ کا رجحان یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس اجتہادی مسائل لکھے ہوئے نہ تھے، یعنی استثناء منقطع ثابت کرنے کے لئے دو استدلال پیش کئے ہیں، ایک وہ روایت جو امام بخاریؒ کتاب الدیات میں لائے ہیں ما عندنا اِلا ما فی القرآن الا فھما یعطی رجل فی کتابہ (ص۱۰۲۰)

یہاں پہلا استدلال استثناء مفرغ ہے اور دوسرا منقطع ہے۔ یعنی ہمارے پاس صرف کتاب اللہ مکتوب ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں خصوصی فہم عطا فرمادے تو قرآن حکیم میں جو اشیاء منصوصہ ہیں وہ ان کے علاوہ دوسری چیزوں کے استنباط پر قدرت پالیتا ہے فتحصل عندہ الزیادۃ بذالک الاعتبار (فتح ج ۱ ص۱۶۵)

دوسرا استدلال جو زیادہ واضح ہے جس کو امام احمدؒ نے طارق بن شہاب کے طریق سے بسند حسن نقل کیا ہے۔

شھدت علیا علی المنبر وھو یقول واللہ ما عندنا کتاب نقرؤہ علیکم الا کتاب اللہ وھذہ الصحیفۃ (عمدہ ص۳۶)	میں نے حضرت علیؓ کو منبر پر دیکھا وہ فرمارہے تھے کہ واللہ ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں جسے ہم پڑھ کر تمہیں سنائیں سوائے کتاب اللہ اور اس صحیفہ کے۔ (فتح ص۱۶۵)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کی مراد لفظ فھم سے کوئی مکتوب (لکھی ہوئی چیز) نہیں اگر کچھ اجتہادی مسائل مکتوب ہوتے تو ان کو ضرور ذکر فرماتے۔

صحیفہ میں کیا تھا؟

ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا لکھا ہوا ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا العقل وفکاک الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر۔

یعنی اس صحیفہ میں دیت کے مسائل ہیں اور قیدیوں کو چھڑانے کے بارے میں احکام، اور یہ حکم کہ مسلمان کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔

قولہ العقل ، ای الدیۃ و انما سمیت بہ لانہم کانوا یعطون فیہا الابل ویربطونہا بفناء دار المقتول بالعقال وھو الحبل ووقع فی روایۃ ابن ماجۃ بدل العقل الدیات والمراد احکامہا ومقادیرھا واصنافہا (فتح ص۱۶۵ تا ص۱۶۶)

عقل سے مراد دیت کے احکام ومقادیر واقسام ہیں۔ یعنی دیت کی کتنی قسمیں ہیں اور اس کے وجوب کی کیا صورت ہے؟ اور کس طرح ادا کی جاتی ہے؟

لا یقتل مسلم بکافر یہ معرکۃ الآراء اور اختلافی مسئلہ ہے، اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے تو اس قاتل مسلمان کو مقتول کافر کے عوض میں بطور قصاص قتل کیا جائے گا یا نہیں؟

کافر مقتول کی تین صورتیں ہیں: ۱ حربی ۲ معاہد مستامن ۳ ذمی

حربی کافر میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ سب کے نزدیک مباح الدم ہے اس لئے حربی کافر کے قتل پر بالاتفاق مسلم سے قصاص نہیں لیا جائیگا۔

۲ معاہد مستامن اور ذمی میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ مسلم سے قصاص نہیں لیا جائے گا البتہ ذمی ومستامن میں دیت لازم ہوگی، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ عہد واستیمان کی وجہ سے گو حفاظت لازم ہوگئی مگر جو اصلی علت ہے اباحت دم کی وہ بدستور قائم ہے اس لئے مسلم کی جان اس کے قصاص میں نہیں لی جا سکتی وبہ قال الاوزاعی، واللیث، والثوری، والاسحاق وغیرہم (عمدہ)

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ وغیرہ حدیث باب لا یقتل مسلم بکافر سے استدلال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مسلم بھی نکرہ ہے اور کافر بھی نکرہ، اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے پس حدیث پاک کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا خواہ وہ کافر حربی ہو یا ذمی۔

ائمہ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو اس کافر ذمی کے عوض میں مسلمان سے قصاص لیا جائے گا وھو قول النخعی والشعبی وسعید بن المسیب ومحمد بن ابی لیلیٰ وعثمان البتی وھو روایۃ عن عمر بن الخطاب وعبد اللہ بن مسعود وعمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم، امام مالکؒ اور لیث بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسلم نے دھوکہ سے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو اس مسلم پر قصاص ہوگا اور اگر دوسرے کسی طریقہ سے قتل کیا تو قصاص نہیں (عمدہ)

ائمہ حنفیہ رح کے دلائل (۱) قصاص کی نصوص قرآنیہ مطلق ہیں یا ایہا الذین اٰمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ الحر بالحر الخ (بقرہ آیت)

(۲) کتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس والعین بالعین الخ (مائدہ آیت ۴۵)

ان آیات میں ذمی کا کوئی استثناء نہیں۔

(۳) ولا یقتلون النفس التی حرم الله الا بالحق (سورہ فرقان آیت ۶۹)
اس آیت میں حرمت نفس ذمی کو بھی شامل ہے لہٰذا اس کے قاتل پر قصاص بھی واجب ہونا چاہئے۔

(۴) وقال بعض الحنفیة وقع الاجماع علی ان المسلم تقطع یده اذا سرق من مال الذمی فکذا یقتل اذا قتله الخ (عمدہ) یعنی اگر کوئی ذمی کا مال چرائے تو اس پر بالاتفاق قطع ید کی سزا ہے اس پر قیاس کرنے سے معلوم ہوا کہ ذمی کے قاتل پر قصاص بطریق اولیٰ ہونا چاہئے اس لئے کہ قتل نفس کا معاملہ سرقہ مال سے بہت زیادہ اہم ہے۔

احناف کی طرف سے جواب

(۱) امام طحاوی رح نے یہ جواب دیا ہے کہ لا یقتل مسلم بکافر میں کافر سے مراد حربی کافر ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ بعض روایات میں لا یقتل مسلم بکافر کے بعد ولا ذو عهد فی عهده کے الفاظ بھی ہیں (کما فی ابی داؤد ص ۶۲۳/۲ ایضاً طحاوی ص ۹۳/۲ باب المومن یقتل الکافر متعمداً) اس میں واؤ عاطفہ ہے جس کا عطف مسلم پر ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ کوئی مسلم اور ذو عهد یعنی ذمی کسی کافر کے مقابلہ میں قتل نہ کیا جائے پس ذمی اور کافر کے تقابل سے معلوم ہوا کہ کافر سے مراد حربی ہے۔

(۲) بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ لا یقتل مسلم میں مسلم ومؤمن فی حکمہ مراد ہے یعنی لفظ مسلم حقیقی اور حکمی دونوں کو شامل ہے۔ حکمی مسلم سے مراد ذمی ہے اس لئے کہ انہوں نے حفاظت مال ودم کے لئے جزیہ قبول کیا۔

۱۱۱ ● حدثنا ابو نُعیم الفضلُ بنُ دُکینٍ قال ثنا شیبانُ عن یحییٰ عن ابی سلمة عن ابی هریرة أنّ خُزاعة قتلوا رجلاً من بنی لیثٍ عامَ فتحِ مکة بقتیلٍ منهم قتلوهُ فأُخبِر بذلک النبیُّ صلی الله علیه وسلم فرکِبَ راحلته فخطب فقال إنّ الله حبسَ عن مکة القتلَ او الفیلَ قال محمدٌ واجعلوهُ علی الشکِّ کذا قال ابو نعیمٍ القتلَ او الفیلَ وغیرُهُ یقولُ الفیلَ وسُلِّط علیهم رسولُ الله والمؤمنون الا وإنّها لم تحِلّ لأحدٍ قبلی ولا تحِلّ لاحدٍ بعدی الا و إنّها حلّت لی ساعةً من نهارٍ الا وإنّها ساعتی هذه حرامٌ لا یُختلی شوکُها ولا یُعضدُ شجرُها ولا تُلتقطُ ساقِطتُها الا لمُنشِدٍ فمن قُتِل فهو بخیر النظرینِ إمّا أن یُعقلَ وإمّا أن یُقادَ اهلُ القتیلِ فجاء رجلٌ من اهل الیمن فقال اُکتب لی یا رسولَ الله فقال اکتبوا لابی فلانٍ فقال رجلٌ من قریشٍ الّا الإذخرَ یا رسولَ الله فانّا نجعلهُ فی بیوتِنا وقبورِنا فقال النبی صلی الله

علیہ وسلم اِلّا الاِذخر اِلّا الاِذخر ● بخاری ص۲۱

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ قبیلۂ خزاعہ نے بنولیث کے ایک شخص کو اس سال مار ڈالا جس سال فتح مکہ ہوا اپنے ایک خون کے بدلے جو بنی لیث نے ان کا کیا تھا اس کی خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور خطبہ پڑھا پھر فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مکہ سے قتل کو یا فیل (ہاتھیوں) کو روک دیا، امام بخاری نے کہا اس لفظ کو شک ہی کے ساتھ رکھو ابونعیم نے یوں ہی کہا القتل یا الفیل، اور ابونعیم کے سوا اور لوگ کہتے ہیں الفیل (بلاشک) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اب اللہ کے رسول اور مؤمنین کو اہل مکہ پر غالب کر دیا گیا، اور سُن لو کہ وہ مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہوگا۔
سُن رکھو بیشک میرے لئے بھی دن کی ایک گھڑی (تک) مکہ حلال رہا، سُن رکھو کہ مکہ اس وقت (بھی) حرام ہے نہ وہاں کے کانٹے کاٹے جائیں گے اور نہ اس کے (خودرو) درخت قطع کئے جائیں گے اور وہاں کی پڑی ہوئی چیز نہ اٹھائی جائے مگر جو پہونچوانا چاہے (وہ اٹھا سکتا ہے) پس جو شخص قتل کر دیا جائے تو (ورثاء کو) دو میں سے ایک کا اختیار ہے یا تو دیت لے یا قصاص، اتنے میں یمن والوں میں سے ایک شخص (ابوشاہ) آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے لئے لکھ دیجئے تو آپؐ نے فرمایا ابوفلاں کے لئے لکھ دو۔ پھر قریش کے ایک شخص (حضرت عباسؓ) نے عرض کیا یا رسول اللہ اذخر کو مستثنیٰ کر دیجئے کیونکہ ہم اس کو اپنے گھروں اور قبروں میں لگاتے ہیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اچھا اذخر کو اچھا اذخر کو (کاٹ سکتے ہو)۔

مطابقتہٗ للترجمۃ مطابقتہٗ للترجمۃ فی قولہ "اکتبوا لابی فلان" اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حدیث کی کتابت ہو رہی ہے چونکہ یہ ابوشاہؓ نابینا تھے اس لئے حضور اکرمؐ سے لکھوانے کی درخواست کی۔

تعدد موضعہ والحدیث ھٰہنا فی کتاب العلم ص۲۱ ویاتی فی اللقطۃ عن یحیی بن موسیٰ ص۳۲۸ وفی الدیات ص۱۰۱۶۔

تشریح اس حدیث میں دو قتل کا ذکر ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔
صلح حدیبیہ کے موقع پر بنوخزاعۃ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بن گئے تھے اور بنوبکر یا بنولیث (ھذا علی الشک) قریش کے حلیف بن گئے تھے اور معاہدہ یہ ہوا تھا کہ دس سال تک کوئی کسی پر حملہ نہ کرے، بنولیث نے غدر کیا اور خزاعہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور کفار قریش نے خفیۃً بنولیث کی مدد کی تو بنوخزاعۃ نے اس واقعہ کی اطلاع دینے اور امداد طلب کرنے کی غرض سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد روانہ کیا کیونکہ یہ لوگ آپؐ کے حلیف تھے، آپؐ حضرت میمونہؓ

کے گھر تشریف فرما تھے اور آپؐ عصر کا وضو فرما رہے تھے وہ وفد اب تک نہیں پہنچا تھا حضور اکرمؐ نے
فرمایا: لبیک لبیک، لبیک ، نصرت، نصرت، نصرت. حضرت میمونہؓ نے تعجب سے
دریافت کیا کہ آپ کس کے ساتھ کلام فرما رہے ہیں؟ ارشاد فرمایا بنو خزاعہ کا وفد طلب امداد کے لئے آرہا ہے
بنو لیث نے ان سے بدعہدی کی ہے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ وفد پہونچا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے انھیں تسلی دی اور امداد کا وعدہ فرمایا اور یہی واقعہ صلح حدیبیہ توڑنے کا باعث ہوا۔ (درمیانی تفصیل
کے لئے نصر الباری کتاب المغازی فتح مکہ دیکھئے ص۳۲۳ تا ص۳۳۱)

آپؐ مکہ پر حملہ آور ہوئے اور مکہ فتح ہوگیا اس کے بعد آپؐ نے امن کا اعلان فرمایا چونکہ بنو خزاعہ اپنا آدمی
قتل ہوجانے کی وجہ سے خار کھائے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے جونہی بنو لیث میں سے قاتل کو دیکھا فوراً
اس پر ٹوٹ پڑے اور خراش بن امیہ خزاعی نے قتل کر دیا۔ یہ خراش بن امیہ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوچکے
تھے اور اعلان امن کے بعد انہوں نے قتل کیا تو ثابت ہوگیا کہ ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم صادر فرمایا؟ اس کا جواب اس حدیث میں بالکل صاف
ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی (یعنی قتل المسلم الذمی) کی اطلاع دی گئی تو آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار
ہوئے اور خطبہ دیا اور باتوں کے علاوہ یہ بھی ارشاد فرمایا:

فمن قتل فهو بخير النظرين إما أن يعقل وإما أن يقاد۔ جو شخص قتل کر دیا جائے تو ورثاء کو دو میں سے ایک کا اختیار ہے یا تو دیت لے یا قصاص۔

یہ قانون بیان فرمادیا کہ ذمی کے عوض میں مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

إن الله حبس عن مكة الخ اعلان امن کے بعد خزاعی کے قتل کی خبر پر حضور اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہوکر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مکہ سے قتل یا فیل کو روک دیا"۔ آپ نے
قتل کا لفظ ارشاد فرمایا یا فیل کا؟ امام بخاریؒ کہتے ہیں اسے شک پر ہی رہنے دیا جائے کیونکہ میرے
استاذ ابو نعیم نے مجھ سے یونہی تردد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس روایت کے دوسرے راوی مثلاً
عبید اللہ بن موسیٰ شیبان کے شاگرد وغیرہ متعین طریقے پر الفیل کہتے ہیں، گویا القتل اور الفیل کا
شک صرف ابو نعیم کی طرف سے ہے۔

اگر قتل کا لفظ ہو تو یہ مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں قتل روک دیا، حرام کر دیا۔

اور اگر فیل کا لفظ ہو تو اشارہ ہوگا اس واقعہ کی طرف جس کا ذکر سورۂ فیل میں ہے، یہ واقعہ
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے چند روز پیشتر ہوا تھا، تفصیل کے لئے سورۂ
فیل کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

قوله لا تلتقط ساقطتها الا لمنشد وہاں کی پڑی ہوئی چیز نہ اٹھائی جائے مگر وہ اٹھا سکتا ہے

جو مالک کی تلاش کر کے پہونچوانا چاہے۔ و اصل الانشاد رفع الصوت یعنی مالک تک پہونچانے کے ارادہ سے اعلان کرنا۔

بظاہر تخصیص بے فائدہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام مواضع کا یہی حکم ہے غیر منشد کے لئے کسی جگہ کے لقطہ کو اٹھانا جائز نہیں۔

شوافع رح وجہ تخصیص یہ بیان کرتے ہیں کہ حرم مکہ کے لقطہ کا انشاد علی وجہ التابید مقصود ہے بخلاف دوسری جگہوں کے لقطوں کے کہ ان کے لئے تو ایک معین مدت تک انشاد کرے پھر بعد میں استعمال کر سکتا ہے، مکہ مکرمہ کے لقطہ کو استعمال نہیں کر سکتا ہمیشہ اس کا انشاد کرتا رہے۔

حنفیہ کے نزدیک مکہ معظمہ کے لقطوں کا بھی وہی حکم ہے جو عام لقطوں کا ہے، پھر خصوصیت سے اس کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مالک کا ملنا بہت مشکل ہے کیونکہ موسم حج میں اطراف عالم کے لوگ جمع ہوتے ہیں مزید برآں یہ کہ ان کا ایک جگہ قیام نہیں رہتا۔

اس لئے اس کا مظنہ تھا کہ شاید لاقط انشاد کو فضول سمجھ کر اس میں تساہل کرے کہ لاکھوں کے ہجوم میں مالک کے ملنے کی امید نہیں لاؤ استعمال کرلیں اس لئے تاکید فرمادی کہ مکہ کا لقطہ وہی اٹھائے جو انشاد کرے۔

فمن قتل فھو بخیر النظرین کذا وقع ھنا وفیہ حذف وقع بیانہ فی روایۃ المصنف فی الدیات فمن قتل لہ قتیل (فتح) یعنی جو شخص قتل کر دیا جائے تو (ورثا کو) دو میں سے ایک کا اختیار ہے یا تو دیت لے یا قصاص،، ھو کی ضمیر وارث مقتول، ولی مقتول کی طرف راجع ہے کیونکہ مقتول تو مر چکا اب اس کے مخیر بین النظرین کا کیا سوال ؟

اما ان یعقل واما ان یقاد یہ تفسیر و تفصیل ہے نظرین کی یعنی ورثہ مقتول کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے وہ جو چاہے پسند کرے دیت لے یا قصاص۔

اب اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ حضرات شوافع و حنابلہ رحمہم اللہ کے نزدیک صرف مقتول کے وارث کو اختیار ہے یعنی دیت کے اندر رضائے قاتل شرط نہیں، یہ حضرات حدیث باب سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں رضائے قاتل کا ذکر نہیں ہے۔

حنفیہ و مالکیہ رحمہم اللہ کے نزدیک رضائے قاتل شرط ہے، یہی قول ہے صاحبین، ابراہیم نخعی اور ثوری رحمہم اللہ وغیرہ کا (عمدہ)۔ یعنی ولی مقتول کو قتل کرنے یا معاف کرنے کا حق ہے۔ لیکن دیت کا حق بغیر قاتل کی رضامندی نہیں ہے، قتل عمد کا اصلی موجب قصاص ہے کما فی القرآن الحکیم: کتب علیکم القصاص فی القتلی الخ ایضاً وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس الخ

حدیث الباب حنفیہ کے خلاف نہیں ہے

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حدیث الباب ہمارے خلاف نہیں ہے کیونکہ یہاں حدیث میں ولی مقتول کو اختیار دیا گیا ہے قصاص لے یا دیت اور اس کو ہم بھی مانتے ہیں، آگے یہ کہ یہاں رضائے قاتل کا ذکر نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی جان ایسی قیمتی چیز دینے کی جگہ مال دینے پر اس کی رضامندی ظاہر تھی، جو کچھ دشواری بظاہر ہوتی ہے وہ اولیاء مقتول کی رضامندی میں ہوا کرتی ہے کہ وہ دیت کو جان کے بدلہ میں لیتے ہیں تو گویا کم درجہ کی چیز پر راضی ہوتے ہیں۔

اور حافظ عینیؒ نے بخیر النظرین پر لکھا کہ یہ اولیاء مقتول کے لئے تخییر نہیں ہے بلکہ ان کو بطور ترغیب کہا گیا ہے کہ بہتر و اصلح صورت کو اختیار کریں تو اچھا ہے۔

اس سے یہ سمجھنا کہ ان کو مستقل طور سے اختیار دیدیا گیا ہے یا ان کے لئے رضاء قاتل بھی ضروری نہیں رہی حدیث نبویؐ کا منشاء نہیں ہے۔ (انوار الباری)

اس پر مزید مفصل بحث کتاب الدیات میں آئے گی انشاء اللہ الرحمان۔

۱۱۲ ● حدثنا علی بن عبد اللہ قال ثنا سفیان قال ثنا عمرو قال اخبرنی وھب بن منبہ عن اخیہ قال سمعت ابا ھریرۃ یقول ما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب تابعہ معمر عن ھمام عن ابی ھریرۃ ● بخاری ص۲۲

ترجمہ وہب بن منبہؒ اپنے بھائی (ہمام بن منبہؒ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے ابوہریرہؓ سے سنا آپؓ فرماتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں عبد اللہ بن عمروؓ کے علاوہ مجھ سے زیادہ حدیث بیان کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا، معمر نے وہب بن منبہ کی متابعت کی وہ ہمام سے روایت کرتے ہیں اور وہ (ہمام) حضرت ابوہریرۃؓ سے۔

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی قولہ "فانہ کان یکتب" الخ یعنی حضرت عبد اللہ بن عمروؓ احادیث لکھا کرتے تھے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث مسموعہ لکھ لینے کی اجازت چاہی تھی چنانچہ آپؐ نے مجھے اجازت دے دی پس صحابی کے عمل اور حضور اکرمؐ کی اجازت سے کتابت حدیث کا عمل ثابت ہوا۔

تشریح ما من اصحاب الخ ما مشابہ بلیس کا اسم احدٌ اور اکثرَ حدیثا اس کی خبر اس لئے اکثرَ کو بالنصب پڑھا جائے اور یہی راجح ہے۔ اور اکثرُ کو مرفوع پڑھنا بھی درست ہے اس صورت میں احدٌ کی صفت ہوگی۔ (عمدہ)

فانہ کان یکتب ولا اکتب وہ لکھتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔

یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے خیال اور تخمینہ سے کہی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ امت محمدیہؐ کو ابو ہریرہؓ سے زیادہ حدیثیں ملیں ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذخیرۂ احادیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس زیادہ ہو مگر روایت کی نوبت ان کو کم آئی ہو اور خود زیادہ روایت نہیں کی قلتِ روایت اس کی دلیل نہیں کہ ان کے پاس ذخیرۂ احادیث کم تھا چنانچہ خلفاءِ اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم خصوصاً صدیق اکبرؓ سے احادیث بہت کم مروی ہیں کیا ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ صدیق اکبرؓ جو اول المومنین ہیں اور جلوت و خلوت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح ہمیشہ مصاحب رہے کہ یارِ غار ایک محاورہ ہی بن گیا اور خصوصیات کا تو ذکر ہی کیا۔ المختصر یہ کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر اور مشیر خاص تھے تو ایک منٹ کے لئے بھی تصور نہیں کیا جاسکتا کہ حضور اکرمؐ کے حالات و مقالات ابو ہریرہؓ سے کم پہونچے ہوں گے۔

روایات ابو ہریرہؓ کی کثرت کے اسباب

علامہ عینیؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایات کا ایک سبب محل قیام بھی تھا فتوح امصار کے بعد حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا قیام اکثر طائف اور مصر میں رہا ان مقامات کو علمی اعتبار سے کوئی مرکزیت حاصل نہ تھی بخلاف ابو ہریرہؓ کے کہ ابو ہریرہؓ نے مدینہ منورہ کو اپنا وطن بنالیا تھا اور مدینہ منورہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کی منزلِ مراد تھی۔

مدینہ طیبہ کے مرکز علم ہونے کی وجہ سے واردین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور ابو ہریرہؓ زندگی کے آخری لمحات تک مدینہ منورہ میں فتویٰ و تحدیث میں مصروف رہے۔ اور لوگوں کی کثیر تعداد نے ان سے تحمل روایات۔ کیا جس کی وجہ سے ان کی روایات کی تعداد بہت بڑھ گئی، حضرت ابو ہریرہؓ نے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) حدیثیں روایت کی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایات سات سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ سے آٹھ سو تابعین نے روایت کی ہے۔

دوسرا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء ہے، ایک مرتبہ ابو ہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ نسیان کی وجہ سے بہت زیادہ بھول جاتا ہوں آپؐ نے مخصوص طریقہ اختیار فرماکر ان کے لئے عدمِ نسیان کی دعاء فرمائی یہ آپؐ کی دعا ہی کا فیض تھا کہ امت محمدیہ کو علوم نبوت کا وافر حصہ ابو ہریرہؓ کی ذاتِ گرامی سے ملا۔

ابو ہریرہؓ کے لئے دعا والی روایت آگے "باب حفظ العلم" میں آرہی ہے۔

تیسرا سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شام میں عبداللہ بن عمروؓ کو اہل کتاب کی کتابوں کا ذخیرہ مل گیا تھا یہ انکا مطالعہ کرتے تھے اور ان میں سے بعض روایات بھی بیان کردیتے تھے اس وجہ سے بہت سے تابعین نے ان

سے روایات حاصل کرنے سے پرہیز کیا کہ شاید اسرائیلیات میں سے ہو۔

چوتھا سبب حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ: ان عبد الله کان مشتغلا بالعبادة اکثر من اشتغاله بالتعلیم (فتح) یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ تعلیم و تدریس کی بہ نسبت عبادت میں زیادہ مشغول رہا کرتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں ابوہریرہؓ کا رجحان طبع اشتغال علمی کی طرف زیادہ تھا اس وجہ سے عبداللہ بن عمروؓ کی نسبت روایاتِ ابوہریرہؓ کی تعداد بہت بڑھ گئی۔

۱۱۳ ● حدثنا یحیی بن سلیمان قال حدثنی ابن وهب قال اخبرنی یونس عن ابن شهاب عن عبید الله بن عبد الله عن ابن عباس قال لمّا اشتد بالنبی صلی الله علیه وسلم وجعه قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده قال عمر ان النبی صلی الله علیه وسلم غلبه الوجع وعندنا کتاب الله حسبنا فاختلفوا واکثروا اللغط قال قوموا عنّی ولا ینبغی عندی التنازع فخرج ابن عباس یقول ان الرزیّة کلّ الرزیّة ما حال بین رسول الله صلی الله علیه وسلم وبین کتابه ● ص۲۲

ترجمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں شدت ہوگئی تو آپؐ نے (اسی بیماری کی سختی میں) فرمایا میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ میں تمہارے لئے ایک کتاب لکھوادوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو سکو، اس پر حضرت عمرؓ نے (لوگوں سے) کہا بلاشبہ (اس وقت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض (تکلیف) کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جو ہمیں (ہدایت کے لئے) کافی ہے۔ لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور شور و شغب بڑھ گیا آپؐ نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ میرے پاس جھگڑا نادرست نہیں، ابن عباسؓ (نے جب یہ حدیث بیان کی تو) یوں کہتے ہوئے نکلے بیشک مصیبت بڑی سخت مصیبت وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی کتاب کے درمیان حائل ہوگئی (یعنی کتاب نہ لکھوانے دی)۔

مطابقته للترجمة مطابقة الحدیث للترجمة ظاهرة فی قوله "ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا الخ" یعنی گذشتہ تین روایتوں میں کہیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قصد کتابت کا تذکرہ نہیں ہے اس لئے اب باب کی چوتھی اور آخری روایت لاکر حضور اقدس ؐ کے ارادۂ کتابت کا بھی ثبوت پیش کردیا، اس کو حدیث القرطاس کہا جاتا ہے۔

تعدد موضعه والحدیث ههنا فی کتاب العلم ص۲۲ ویأتی فی الجهاد ص۴۲۹ وایضا فی باب اخراج الیهود ص۴۴۹ وفی المغازی ص۶۳۸ وفی کتاب المرضی ص۸۴۶ وفی الاعتصام ص۱۰۹۵۔

تنبیہ اس حدیث القرطاس کی مختصر تفصیل احقر نے نصر الباری کتاب المغازی میں بیان کردی ہے ملاحظہ ہو نصر الباری کتاب المغازی ص۵۲۲ تا ص۵۲۷۔

اب یہاں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کی تالیف لطیف "ارشاد القاری" سے نقل کردینا کافی سمجھتا ہوں تاکہ طلبا ر اس دور کے محدث کبیر کی تقریر سے بھی مستفید ہوں۔

قصۂ قرطاس

یہ واقعہ قصۂ قرطاس کے نام سے مشہور ہے جس کی تفصیل یہ ہے:۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آخری بیماری میں وفات سے چار روز قبل پنجشنبہ کے دن اپنے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ قرطاس یعنی کاغذ لاؤ میں ایک تحریر لکھدوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بیماری کی تکلیف زیادہ ہے لہٰذا آپ کو زحمت نہ دینی چاہیئے اور ضروری احکام کے لئے کتاب اللہ کافی ہے۔ اور بعض نا معلوم الاسم لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ لکھوا لینا چاہیئے، اس اثناء میں کچھ لوگوں نے جن کا نام کسی روایت میں مذکور نہیں کہا اھجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استفہموہ یعنی کیا آپ کی جدائی کا وقت آگیا؟ آپ سے پوچھو تو سہی، پھر اس وقت نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تحریر کے لکھوانے کا قطعی حکم دیا اور نہ اس کے کسی اور وقت میں اس کے متعلق کچھ فرمایا حالانکہ چار روز تک اس کے بعد دنیا میں تشریف فرما رہے۔

قصہ تو صرف اسی قدر ہے جو اوپر بیان ہوا مگر اہل تشیع نے بڑی بے باکی کے ساتھ اس قصہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تین اعتراض بڑے زور شور سے کئے ہیں:۔

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یہ شخص ہذیان بکتا ہے (نعوذ باللہ منہ ذالک) ھجر کے معنی ہذیان بکنے کے لیتے ہیں اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ قرار دیتے ہیں۔

(۲) ایسی ضروری تحریر جس کے بعد قیامت تک گمراہی کا اندیشہ نہ رہتا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ لکھنے دی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی بھی ہوئی اور تمام مسلمانوں کا نقصان بھی۔

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حسبنا کتاب اللہ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث ضروری نہیں ہے۔

اعتراض اول کا جواب

لفظ ھجر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نہیں ہیں، کتب اہل سنت میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس افتراء کے ثبوت میں نہیں مل سکتی، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ کسی روایت میں یہ نہیں کہ یہ لفظ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تحفۂ اثنا عشریہ میں یہی فرماتے ہیں۔

شیعہ علماء بھی جنھیں تجسس وعیب جوئی کی خاص مشق ہوتی ہے درجنوں کی درجنوں کئی سو برس سے ایسی روایت کی تلاش میں ہیں مگر مطالبات کے باوجود آج تک کوئی روایت نہیں پیش کر سکے لہٰذا اگر کسی عالم

اہلِ حق نے اسے مقولۂ عمرؓ تسلیم کرلیا تو انھیں دھوکہ ہوا ہے کیونکہ شیعوں نے اپنی افتراء پردازیوں کو کچھ اس طرح شہرت دی اور عوام میں اس قدر پھیلایا کہ اس عام شہرت سے بعض خواص بھی دھوکہ کھا گئے جس کی بہت سی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب میں متعہ کا جواز اس قدر مشہور ہوگیا کہ صاحب ہدایہ جیسے محقق دھوکہ کھاگئے کسی بڑے سے بڑے عالم کا دھوکہ میں آجانا کچھ مستبعد نہیں اسی وجہ سے ہم نے مطالبہ کیا ہے کہ کوئی معتبر روایت بسند صحیح پیش کرو، اول ہر شخص کا بلاسند کوئی بات کہدینا روایت معلق نہیں ہوسکتا، معلق اسے کہتے ہیں کہ کوئی محدث روایت کرتے وقت کسی چیز کو بلا ذکر سند کے بیان کرے، پھر ہر روایت معلق کا صحیح ہونا بھی غلط ہے ورنہ پھر سند تو ایک بیکار شئی ہوجاوے گی۔

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ تعالیٰ ظفر الامانی صـ۱۸۹ میں فرماتے ہیں: تلك الاخبار لا یعتبر بها مالم یعلم سندها ومخرجها الی ان قال المرسل انما هو ما ارسله راوی الحدیث وترك الواسطة بینه وبین النبی صلی اللہ علیه وسلم لا مجرد قول کل من قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم والا لزم ان یکون قول العوام والسوقیة قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم كذا مرسلا۔

والوجه فیه ان الارسال والانقطاع ونحو ذالك من صفات الاسناد ویتصف الحدیث به بواسطته فحیث لا اسناد فلا ارسال ولا انقطاع ولا اتصال وانما هو مجرد نقل اعتمادا علی الغیر ومن المعلوم ان صاحب الهدایة وغیره من اکابر الفقهاء ومؤلف احیاء العلوم وغیره من اجلة العرفاء لیسوا من المحدثین ولا من المخرجین وان کانوا فی الفقه والتصوف وغیرهما من الکاملین۔

(۲) هجر کے معنی محض ہذیان کے نہیں بلکہ یہ لفظ جدائی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ واهجرهم هجرا جمیلا یہ معنی علماء لغت وشراح حدیث بھی لکھتے ہیں (فتح الباری ج ۸ صـ۱۰۱) میں ہے: ویحتمل ان یکون قوله اهجر فعلا ماضیا من الهجر بفتح الهاء وسکون الجیم والمفعول محذوف ای الحیاة وذکره بلفظ الماضی مبالغة لما رای من علامات الموت۔

اور علامہ محمد طاہر گجراتی مجمع البحار الانوار (جو خاص حدیث کی لغت ہے) جلد ۲ صـ۴۷۵ میں فرماتے ہیں ویحتمل ان یکون معناه هجرکم رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من الهجر ضد الوصل بلکہ تحقیق یہ ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی جدا ہونے ہی کے ہیں، ہذیان کے معنی میں بھی اسی مناسبت سے آتا ہے اس میں عقل سے جدائی ہوتی ہے اور یہی معنی زیادہ مشہور و متبادر ہیں اردو میں بھی ہجر بمقابلۂ وصل بولا جاتا ہے اور حدیث قرطاس میں بھی یہی معنی چسپاں ہوتے ہیں۔

ہذیان کے معنی وہاں دو وجہ سے نہیں بنتے۔

(۱) ہذیان کا شبہ اس بات پر ہوتا ہے جو خلافِ عقل ہو، ایک پیغمبرؑ اپنے آخری وقت میں فرماتے ہیں کہ کاغذ لاؤ ایک ضروری ہدایت نامہ لکھدوں، اس میں کونسی بات خلافِ عقل ہے؟ جسے ہذیان کہا جاسکے۔

(۲) روایت میں ھجر کے بعد استفہموہ کا لفظ ہے یعنی آپ سے پوچھو، اگر ہجر بمعنی ہذیان لیا جائے تو استفہموہ سے ربط بالکل غلط ہوجاتا ہے کیونکہ جسے ہذیان ہوگیا اب اس سے پوچھنا بالکل خلاف عقل ہے۔

اب دیکھئے جدائی کے معنی کس خوبی سے بنتے ہیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ مرض میں ہدایت نامہ لکھوانے کو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب پر ایک بجلی سی گر گئی کہ شاید وہ قیامت کی گھڑی آگئی ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ٭ روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

کیونکہ ایسی تحریر آخری وقت میں لکھوائی جاتی ہے لہٰذا انھوں نے کہا اھجر استفہموہ یعنی کیا حضرت اب جدا ہو رہے ہیں؟ آپ سے پوچھو تو، یہ لفظ ھجر جس نے بھی کہا کمالِ عشق اور جذب محبت میں کہا مگر جن کے قلوب دردِ محبت سے ناآشنا ہیں وہ اس کی قدر کیا کر سکتے ہیں ؎

چوں دل بمہر نگارے نہ بستۂ اے ماہ ٭ تراز سوز درون نیاز ما چہ خبر؟

(۳) بفرض محال اگر یہ لفظ بمعنی ہذیان ہی ہو تو یہ ہمزۂ استفہام کے ساتھ ہے اور استفہام انکاری ہے ممکن ہے کہ یہ قول اس جماعت کا ہو جو تحریر لکھوانے کی مؤید تھی اس نے اپنی رائے کو تقویت دینے کے لئے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں کیوں توقف کرتے ہو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ہذیان ہوگیا ہے؟ یعنی ہذیان نہیں ہوا ہے یہ مطلب بھی شراحِ حدیث نے بیان کیا ہے۔

صحیح بخاری میں یہ روایت سات جگہ پر ہے۔ کتاب الجہاد کے سوا باقی چھ مواضع میں یہ لفظ ہمزۂ استفہام کے ساتھ ہے اور صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتب میں بھی ہمزہ موجود ہے، پس اگر ایک روایت میں ہمزہ نہ ہو تو حرج نہیں، ایک ہی واقعہ کی متعدد اسانید میں اگر ایک لفظ کسی روایت میں ہو اور کسی میں نہ ہو تو یقیناً یہی سمجھا جائیگا کہ جس میں نہیں ہے اس میں راوی سے چھوٹ ہوگیا ہے، اسی لئے حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۱۰۸ میں فرماتے ہیں الراجح فیہ اثبات الہمزۃ۔ علاوہ ازیں بلا اداۃ استفہام کے بھی استفہام ہوتا ہے۔

ان تینوں جوابوں کا خلاصہ یہ ہوا:

اولاً تو لفظ ھجر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ نہیں۔

ثانیاً بالفرض اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو ھجر بمعنی ہذیان نہیں بلکہ جدائی کے معنی میں ہے جو خاص محبت کا کلمہ ہے نہ کہ گستاخی کا۔

ثالثاً بالفرض ھجر بمعنی ہذیان ہو تو ہمزۂ استفہام کے ساتھ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ اب ارباب عقل غور کریں کہ اس اعتراض میں کیا جان باقی رہ گئی۔ جب تک شیعہ ان تین باتوں کا جواب نہ دیدیں یعنی کسی روایت میں اس کا مقولۂ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہونا دکھائیں پھر یہ ثابت کریں کہ ہجر کے معنی سوائے ہذیان کے اور کچھ نہیں ہیں یا یہاں سوائے ہذیان اور کوئی معنی چسپاں نہیں ہوتے، پھر یہ بھی ثابت کریں کہ یہ لفظ استفہام کے ساتھ نہیں یا یہ استفہام انکاری نہیں ہو سکتا۔ اس وقت تک اس اعتراض کا نام لینا سخت بے غیرتی ہے۔

اعتراض ثانی کا جواب

جواب سے قبل چند امور غور طلب ہیں:

(۱) الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا بالاتفاق اس قصۂ قرطاس سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی پس اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی ضروری تحریر باقی تھی تو دین ہرگز کامل نہیں ہو سکتا اور یہ آیت معاذاللہ غلط ثابت ہوتی ہے۔

(۲) قصۂ قرطاس پنجشنبہ کے روز واقع ہوا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات دوشنبہ کو ہوئی، چار روز تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس قصہ کے بعد اس عالم میں تشریف فرما رہے پس اگر کوئی ایسی ضروری تحریر باقی ہوتی تو آپؐ کو اس کے لکھوانے کا کافی موقعہ ملا اس کے باوجود آپؐ نے نہ لکھوائی یہ ایک بہت بڑا اور سخت الزام حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوگا (نعوذ باللہ من ذالک)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے سے یا ان کے خوف سے نہ لکھوانا کوئی مسلمان باور نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کے خوف سے اگر انبیاء علیہم السلام تبلیغ سے رُک جائیں تو دین سے امان اٹھ جائیگا اور نبوت ایک بازیچۂ اطفال ہو جائے گی۔

خیال کیجئے جب کفار نے آپ سے کہا کہ اگر آپ کو سلطنت کی خواہش یا کسی حسین عورت کی طلب ہے تو آپ کو سلطنت دیدیں اور تمام عرب سے حسین عورت آپ کو لا دیتے ہیں مگر ہمارے معبودوں کو برا مت کہو۔ کفار کے مقاطعہ کے وقت ابو طالب نے آپکو پیغام پہونچایا اور سمجھایا کہ اے بھتیجے تو اس تبلیغ سے باز آجا میں اکیلا سارے عرب کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو آپؐ نے فرمایا اے چچا اگر میرے ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے میں چاند بھی رکھدیا جائے تب بھی اس کلمۂ حق سے ہرگز نہ رُکوں گا۔

غرضیکہ جب آپؐ تمام عرب سے دین کی خاطر برسرپیکار تھے اس وقت تو آپؐ نے ضروریات دین کو نہیں چھوڑا تو اب ایسی اہم چیز کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

پھر ان چار پانچ روز میں دن میں یا رات میں کسی وقت تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ کر گئے ہوں گے اس وقت آپ لکھوا دیتے۔

(۳) اتنی ضروری تحریر سے اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منع کیا تھا تو حضرت علی اور دوسرے صحابہ رضی اللہ

عنہم کا فرض تھا کہ لکھواتے مگر کسی نے بھی اس طرف توجہ نہ کی، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ الزام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ہوگا اس لئے کہ بزعم شیعہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تقرب سب سے زیادہ تھا۔

نیز ایسا حکم عموماً گھر والوں ہی کو ہوتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو یہ حکم دیا گیا ہوگا جس کی انہوں نے تعمیل نہیں کی، مزید برین مسند احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ یہ خطاب حضرت علی رضہ کو تھا۔

(۴) اتنا بڑا واقعہ اور تمام طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی متنفس سوائے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس کی روایت نہیں کرتا، پھر ابن عباس رضہ کے سیکڑوں شاگردوں میں سے صرف ان کے بیٹے عبید اللہ اور سعید بن جبیر اس کے ناقل ہیں۔

(۵) اس قصۂ قرطاس سے بہت پہلے حدیث ثقلین ارشاد ہو چکی تھی اس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں اگر تم ان دونوں سے تمسک کروگے تو ہرگز کبھی گمراہ نہ ہوگے، پس اگر یہ قصۂ قرطاس والی تحریر کوئی ضروری فرض کیجائے تو حدیث ثقلین کی تکذیب لازم آئیگی۔

ان امور پر غور کرنے کے بعد عقل سلیم دو امور میں سے ایک کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(۱) یا تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے۔ دین کامل ہو چکا تھا اور ہرگز کوئی ایسی ضروری تحریر باقی نہ تھی اور ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت قرآنیہ کے خلاف کسی تحریر کے لکھوانے کا ارادہ ظاہر نہیں فرمایا تھا، یہ قصہ محض بے بنیاد اور اعداء دین کا خانہ زاد ہے اور محض اس لئے گھڑا گیا ہے کہ آیت قرآنیہ الیوم اکملت لکم دینکم الخ اور حدیث ثقلین کی بھی تکذیب ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تبلیغ رسالت میں کوتاہی کرنے کا الزام قائم ہو کر سارا دین مشکوک ہو جائے۔

مگر امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے محدثین کی تخریج اس نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

(۲) یا پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا امتحان لینے کے لئے فرمایا تھا کہ قلم دوات اور کاغذ لاؤ تاکہ میں ایک ایسی ضروری تحریر لکھوا دوں کہ اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

درحقیقت نہ کوئی ایسی ضروری تحریر باقی تھی اور نہ واقع میں آپ کا ارادہ تھا محض امتحان مقصود تھا کہ یہ لوگ ایمان میں کہاں تک راسخ القدم ہیں۔

اگر کہیں خدانخواستہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اس تحریر کے لکھوانے پر مستعد ہو جاتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج ہوتا اور فوراً فرماتے الیوم اکملت لکم دینکم الخ کے بعد اب بھی تم کسی تحریر کے منتظر ہو اور دین کو کامل نہیں سمجھتے۔ مگر الحمد للہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس امتحان میں بدرجۂ علیا کامیاب ہوئے اور اور اس کامیابی میں نمایاں حصہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔

چند نامعلوم الاسم لوگوں نے لکھوانے کی تاکید کی، قوی احتمال ہے کہ یہ حضرات جدید الاسلام ہوں گے

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اگر کوئی ممتاز شخصیت یہ قول نقل کرتی تو ان کا نام ضرور کسی روایت میں مذکور ہوتا کما هو ظاهر من داب المحدثین پس ان جدید الاسلام لوگوں کا اختلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ آیا جس کا اظہار قوموا عنی کے الفاظ سے فرمایا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بطریق امتحان تھا اس پر دو زبردست دلیلیں ہیں:۔

(۱) جبکہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم الخ کمال دین اور اتمام نعمت کی خبر دے چکی تھی تو ناممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد کسی تحریر کی حاجت ظاہر فرما کر دین کو ناقص اور نعمت خداوندی کو ناتمام قرار دیتے۔

(۲) آپؐ نے جو صفت قرطاس والی تحریر کی بیان فرمائی ہے اسی صفت کی دو چیزیں جب آپؐ امت کے ہاتھ میں دے چکے تھے (جن کا ذکر حدیث ثقلین میں گذر چکا ہے) تو اب اس تحریر کی کیا حاجت تھی؟ اس کی حاجت تو اس وقت ہو سکتی تھی جب ان دونوں چیزوں میں یہ صفت نہ ہوتی لہذا ناممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حدیث کے خلاف ایسی بات فرمائیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کا یہ خیال ہے کہ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے خلافت نامہ لکھوانا چاہتے تھے اور صحیحین کی اس روایت کو اپنے خیال پر قرینہ بناتے ہیں کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس آخری مرض میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر کے لئے لکھدوں تاکہ لوگ میرے بعد اختلاف نہ کریں، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا اچھا رہنے دو یابی اللہ والمؤمنون الا لأبی بکر اھ

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے مطمئن کر دیا گیا تھا اس لئے اس ارادہ کو ترک فرمادیا۔

اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مطمئن ہو جانے کے بعد بھی آپ خلافت صدیقی رض لکھوانا چاہتے تھے تاکہ لوگ اختلاف نہ کریں۔ تو بعد میں آپؐ کا سکوت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت میں تھا جس میں راز یہ تھا کہ انتخاب خلیفہ کا زریں اصول تفویض الی اہل الحل والعقد قائم کر جائیں اور ولیعہدی کی رسم جاہلیت کا تصور اسلام میں باقی نہ رہے۔

کئی مواقع پر آپؐ نے وحی الٰہی کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت فرمائی اس موقع پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت اور حضرت عمر رض کی موافقت وحی الٰہی سے تھی۔ اسے شیعہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ شیعہ کی نہایت معتبر کتاب فلک النجات صفحہ ۳۲۶ جلد اول میں یہ الفاظ موجود ہیں واما سکوته علیه السلام بعد التنازع فما کان من عنده بل کان بوحی ؂

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی :: تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اختلاف اگر بالہام اللہ تعالیٰ اختلاف منظر تھا کما وقع فی

مواضع شتی تو اس کا مناقب میں شمار ہونا بدیہی ہے اور اگر شدتِ مرض اور آپ کی تکلیف کے مدنظر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اختلاف کیا تو اس کی نوعیت بعینہٖ صلح حدیبیہ کے موقع پر لفظ رسول اللہ مٹانے سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انکار جیسی ہو گی جسے شیعہ مناقب علی رضی اللہ عنہ میں شمار کرتے ہیں۔

اعتراض ثالث کا جواب

یہ تو بعینہٖ وہ قول ہے جس کو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے تین ماہ پیشتر حجۃ الوداع میں لاکھوں کے مجمع میں فرما چکے تھے یعنی لن تضلوا ما تمسکتم بہ۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حسبنا کتاب اللہ کہنے کا اگر یہی مطلب ہے تو قرآنِ کریم میں ہے حسبنا اللہ پس اس کا مطلب بھی یہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہیں رسول اللہ کی ضرورت نہیں فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

سچ یہ ہے کہ یہ زریں مقولہ حسبنا کتاب اللہ ایمان کی جان ہے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ان کمالات کا آئینہ ہے جن کا نمونہ اس آسمان نے بایں ہمہ دور کبھی نہیں دیکھا۔

مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: قال امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اٰتیہ بطبق یکتب فیہ مالا تضل بہ امتہ من بعدہ قال فخشیت ان تفوتنی نفسہ قال قلت انی احفظ واعی قال اوصی بالصلوٰۃ و الزکوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ اس حدیث سے چند امور ثابت ہوئے:۔

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خیال نہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے خلافت کی وصیت تحریر فرمائیں گے اگر آپ کے قلب میں ذرا بھی ایسا خیال ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر فوراً اس کے لکھوانے کی کوشش کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ایسا خیال پیدا کیا گیا تو اس پر بھی آپؓ کو یہ امید نہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مطابق وصیت فرمائیں گے چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اذھب بنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلنسئلہ فیمن ھذا الامر ان کان فینا علمنا ذلک وان کان فی غیرنا علمناہ فاوصی بنا فقال علی انا واللہ لئن سألناھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمنعناھا لا یعطیناھا الناس بعدہ وانی واللہ لا اسئلہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) حدیث مذکور میں صراحت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ و زکوٰۃ و ما ملکت ایمانکم کی وصیت لکھوانا چاہتے تھے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے خلافت بلافصل کی۔

(۳) اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض مصالح کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشاد کے باوجود کتابت کا انتظام نہ کیا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے بچانے کی غرض سے وصیت نہ لکھوائی پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مورد الزام بنانا کیسے جائز ہوگا؟

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔ اٰمین۔

قولہ فخرج ابن عباس الخ حضرت ابن عباس رض (نے جب یہ حدیث بیان کی تو یوں) کہتے ہوئے نکلے ان الرزیۃ کل الرزیۃ الخ یعنی ہائے مصیبت وائے مصیبت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کتاب نہ لکھوانے دی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب واقعہ ہوا تھا اس وقت ابن عباس رض یہ کہتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ سے برآمد ہوئے اس وقت تو ابن عباس بہت کم سن تھے۔ صحیح مطلب اس کا یہ ہے کہ مدتوں بعد ایک دن حضرت ابن عباس رض اس واقعہ کو عبید اللہ تابعی رح سے بیان کر کے حسرت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اپنے مقام سے باہر نکلے۔

بابُ العِلمِ والعِظۃِ باللیلِ ص۲۲

رات کے وقت تعلیم اور وعظ کا بیان۔

ربط ماقبل باب سابق میں علمی باتوں کے لکھنے کا بیان تھا اور کتابتِ علم ضبط و محنت پر دلالت کرتا ہے جس سے علم سفینے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

اب اس باب میں رات کے وقت وعظ و تعلیم کا ذکر ہے، جو محنتِ شدید کی دلیل ہے جس سے علم سینے میں محفوظ ہو جاتا ہے گویا امام بخاری رح سفینہ میں حفاظت کے بعد سینے میں حفاظت کا ذریعہ بتانا چاہتے ہیں، مشہور ہے خواندنِ شب بر دل نقش می شود۔

مقصد ترجمہ امام بخاری رح کا مقصد اس باب سے ایک شبہ کا ازالہ ہے، شبہ یہ ہے کہ ترمذی شریف میں ایک روایت ہے کہ:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکرہ النوم قبل العشاء والحدیث بعدھا	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ و ناپسند سمجھتے تھے

ترمذی جلد اول ص۲۴ ایضاً بخاری اول ص۸۰

اس حدیث سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ تعلیم و تذکیر، وعظ و نصیحت عشاء کے بعد ممنوع ہوں تو امام بخاری رح نے اس باب سے اس شبہ کو زائل کر دیا۔ اور بتا دیا کہ عشاء کے بعد دنیاوی اور بلا ضرورت باتیں کرنا جن کا شمار

خیر اور دین میں نہ ہوتا ہو وہ ممنوع ہیں۔
لیکن تعلیم و تذکیر، وعظ و تقریر جو صحیح دینی غرض سے ہو تو بلاشبہ جائز ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو سونے والوں کو جگایا بھی جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ایقظوا صواحب الحجر یعنی حجرہ والیوں کو بیدار کردو۔
چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں واراد المصنف التنبیہ علی ان النہی عن الحدیث بعد العشاء مخصوص بما لا یکون فی الخیر (فتح ص۱۷۱)

۱۱۴ ● حدثنا صَدَقَةُ قال اخبرنا ابنُ عُیینةَ عن مَعمرٍ عن الزہریِّ عن ھندٍ عن امِّ سَلَمَۃَ ح وعمرٍو ویحیی بنِ سعیدٍ عن الزہریِّ عن ھندٍ عن امِّ سَلَمَۃَ قالت استَیقظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذاتَ لیلۃٍ فقال سبحان اللہ ماذا اُنزِلَ اللیلۃَ من الفِتَنِ وماذا فُتِحَ مِنَ الخزائنِ اَیقِظوا صواحبَ الحُجَرِ فرُبَّ کاسِیَۃٍ فی الدنیا عاریۃٍ فی الاٰخرۃِ

ترجمہ ام المؤمنین ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات بیدار ہوئے تو فرمایا۔ سبحان اللہ آج کی رات کس قدر فتنے نازل کئے گئے اور کتنے خزانے کھولے گئے (اے لوگو!) حجرے والیوں کو (عبادت کیلئے) جگادو کیونکہ بہت سی عورتیں جو دنیا میں (باریک) کپڑا پہننے والی ہیں وہ آخرت میں برہنہ ہوں گی (یعنی ذلیل ہوں گی)۔

مطابقتہ للترجمۃ اس ترجمۃ الباب کے دو جز ہیں (۱) علم (۲) نصیحت۔
انزل اللیلۃ سے پہلا جز ثابت ہوا کہ ان چیزوں کا علم آپ کو عطا کیا گیا، اور ایقظوا صواحب الحجر سے دوسرا جز یعنی وعظ و نصیحت کا ثبوت ہوا، پس باب کے دونوں اجزاء سے حدیث کی مطابقت ہو گئی۔

تعدد موضعہ والحدیث ھٰہنا ص۲۲ ویاتی فی کتاب التہجد ص۱۵۱ تا ص۱۵۲ وفی اللباس ص۸۶۹ وفی الادب ص۹۱۸ وفی الفتن ص۱۰۴۷۔

شرح الفاظ استیقظ بمعنی تیقظ ولیس السین فیہ للطلب کما فی قولہ علیہ السلام اذا استیقظ احدکم من منامہ، ومعناہ انتبہ، یعنی بیدار ہوئے تو فرمایا، سبحان اللہ یہ کلمہ تسبیح و تنزیہ کے لئے ہے، عرب مقام تعجب پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔

کلمہ ماذا کی تحقیق علامہ عینیؒ فرماتے ہیں ماذا فیہ اوجہ۔ الاول ان یکون ما استفہاما وذا اشارۃ نحو ماذا الوقوف۔ الثانی ان تکون ما استفہاما وذا موصولۃ بمعنی الذی۔ الثالث ان تکون ماذا کلمۃ استفہام علی الترکیب کقولک لماذا جئت۔ الرابع ان تکون ما نکرۃ موصوفۃ بمعنی شئ

الخامس ان تکون ما زائدة وذا للاشارة۔ السادس ان تکون ما استفہاما وذا زائدة (عمدة)

تشریح ماذا انزل اللیلة من الفتن کس قدر فتنے آج کی رات نازل کئے گئے؟

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ انزال مجازاً بمعنی اعلام ہے یعنی اعلم اللہ الملائکة بامر المقدر الخ (عمدة) یعنی حق تعالیٰ نے فرشتوں کو آئندہ کے امور مقدرہ کا علم عطا فرمایا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی روز وحی کی گئی جو فتنوں کی شکل میں امت پر بعد میں واقع ہونے والے تھے، علامہ عثمانی رح فرماتے ہیں کہ عالم مثال میں تمام اشیاء کا وجود ہے پس فتن کے مثالی وجود آپؐ پر منکشف کئے گئے۔

بلاشبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل صحیح ثابت ہوا کہ آپؐ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری دور سے بکثرت فتنے رونما ہوئے اور دنیا کے خزائن بھی ہاتھ آئے کہ روم و فارس فتح ہوئے اور یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں کہ جیسی خبر دی ویسی ہی ظاہر ہوئی۔

الخزائن یا خزائن سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت ہو، کقولہ تعالیٰ ام عندھم خزائن رحمة ربک العزیز الوھاب (سورہ ص) قل لو انتم تملکون خزائن رحمة ربی الآیة (سورہ بنی اسرائیل)

ان دونوں یعنی فتوحات و برکات نیز ظہور فتن کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اس لئے آپؐ نے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو جگایا۔

ایقظوا صواحب الحجر حجرے والیوں کو جگا دو (مراد ازواج مطہرات رضہ ہیں چونکہ یہ موجود تھیں) کیونکہ یہ وقت قبولیت دعا کا ہے۔

فرب کاسیة فی الدنیا عاریة فی الآخرة رُبّ حرف جر ہے حسب سیاق کلام تکثیر و تقلیل کا فائدہ دیتا ہے، یہاں تکثیر کے لئے ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے کاسیة اسم فاعل کسا یکسو کسوا کے معنی کپڑا پہنانے کے ہیں، ولکنہ بمعنی مکسوّة کما فی القرآن عیشة الراضیة بمعنی مرضیة ہے۔ حدیث پاک کے اس جملہ "فرب کاسیة" کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں۔

ع۱ اللاتی تلبس رقیق الثیاب الخ یعنی بہت سی عورتیں نہایت باریک کپڑے دنیا میں پہنتی ہیں کہ ساتر بدن نہیں ہے بلکہ اندر سے جسم نظر آتا ہے، ایسی عورتوں کو آخرت میں ننگی ہونے کی سزا ملے گی، نہایت چست لباس کا بھی یہی حکم ہے۔

ع۲ دنیا میں مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے نہایت بیش قیمت نفیس لباس پہنتی تھیں مگر لباس تقویٰ (اعمال آخرت) سے خالی رہیں اس لئے آخرت کے ثواب سے عاری ہوں گی، ان کو چاہئے تھا کہ دنیا میں اسراف و فضول خرچی سے اجتناب کرتے ہوئے کفایت شعاری سے کام لیتیں اور کچھ بچا کر صدقہ کرتیں کہ آخرت میں لباس تقویٰ اعمال صالحہ ہی کام آنے والے ہیں۔

بَابُ السَّمَرِ فِی الْعِلْمِ [۸۳] [۲۲]

رات کو علمی باتیں کرنا، یا رات کے وقت علمی گفتگو۔

السمر بفتح السین المهملة والمیم وقیل الصواب باسکان المیم لانہ اسم الفعل ومعناه الحدیث باللیل قبل النوم ولهٰذا یظهر الفرق بین ہذه الترجمة والتی قبلها (فتح)

یعنی سمر کے معنی رات کو سونے سے قبل گفتگو کرنا۔

ربط ومقصد گذشتہ باب میں یہ بیان تھا کہ سو جانے کے بعد رات کے کسی حصہ میں بیدار ہو کر تعلیم اور علمی گفتگو ثابت ہے۔

اب اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عشاء کے بعد سونے سے پہلے بھی دینی باتیں اور وعظ و نصیحت کر سکتے ہیں۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ فضول قصہ گوئی ممنوع ہے اگر کوئی علمی تذکرہ ہو، قرآن حکیم یا حدیث پاک کا درس ہو وہ قطعاً ممنوع نہیں، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

واما السمر بالخیر فلیس بمنهی بل هو مرغوب (عمدة)

یعنی رات میں خیر کی باتیں ممنوع نہیں بلکہ مرغوب ہیں۔

۱۱۵ ● حدثنا سعید بنُ عُفیرٍ قال حدثنی اللیثُ قال حدثنی عبدُ الرحمٰنُ بنُ خالدِ بنِ مسافرٍ عن ابنِ شہابٍ عن سالمٍ وابی بکرِ بنِ سلیمانَ بنِ ابی حثمةَ اَنّ عبدَ اللهِ بنَ عمرَ قال صلی بنا النبی صلی الله علیه وسلم العشاءَ فی اٰخرِ حیاتِهٖ فلمّا سلّمَ قامَ فقال اَرَاَیتکم لیلتکم فانَّ راسَ مائةِ سنةٍ منها لا یَبقٰی مِمّن هو علی ظهرِ الارضِ اَحَدٌ ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی، جب آپؐ نے سلام پھیرا تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کیا تم نے اپنی اس رات کو دیکھا (یعنی اسے یاد رکھنا) اس صدی کے آخر تک ان لوگوں میں سے جو اس وقت روئے زمین پر ہیں کوئی باقی (زندہ) نہیں رہے گا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقة الحدیث للترجمة ظاهرة وهو ان النبی صلی الله علیه وسلم حدث الصحابة بهذا الحدیث بعد صلوٰة العشاء وهو سمر بالعلم (عمده) مطلب یہ ہے کہ حدیث پاک میں صراحت ہے قام فقال الخ یعنی نماز عشاء کے بعد آپؐ نے صحابہ سے خطاب فرمایا اور حدیث بیان کی اور یہ سمر بالعلم ہے۔

تعدد موضعہ والحدیث ھٰھنا ص۲۲ و یاتی فی مواقیت الصلوٰۃ ص۸۰ ایضا ص۸۴۔

فقال ارایتکم۔ ارأیتکم کا لفظی ترجمہ ترجمہ کے ذیل میں کردیا گیا ہے۔ محاورہ میں اس کا مطلب خیز ترجمہ ہے اخبرونی یعنی تم لوگ مجھ سے بیان کرو، مجھے بتاؤ۔

چونکہ رویت علم کا سبب و ذریعہ ہے اور علم ہی سے خبر دینے کا تعلق ہے۔ تو جب کبھی قابل بیان بات دیکھی جاتی ہے تو اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اس طرح کہا جاتا ہے مقصد یہ ہوتا ہے کہ تم کبھی ایسی بات دیکھتے تو ضرور بیان کرتے

تشریح حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آخر عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھائی جب آپؐ نے سلام پھیر دیا تو کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا ارایتکم لیلتکم الخ اس روایت میں مطلق طور پر آخر عمر کا ذکر ہے، حضرت جابرؓ کی روایت میں صراحت ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کا ہے (مسلم ثانی ص۳۱۰)

مراد یہ ہے کہ اس وقت جتنے لوگ دنیا میں موجود ہیں سو سال کے اندر سب مرجائیں گے

اس حدیث کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی ۱۱ھ کی ہے کیونکہ آپؐ کی وفات ۱۱ھ ماہ ربیع الاول میں ہوئی اس کے ایک سو سال بعد کوئی صحابی باقی نہ۔

حیات خضر کی بحث اس پر تفصیلی بحث کے لئے احقر کی نصر الباری کتاب التفسیر ص۳۹ ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ نووی رحمہ فرماتے ہیں "وقد احتج بھذا الاحادیث من شذ من المحدثین فقال الخضر علیہ السلام میت والجمہور علی حیاتہ کما سبق فی باب فضائلہ (نووی شرح مسلم ص۳۱۰)

امام نووی رحمہ فرماتے ہیں: وقال الشیخ ابوعمرو ابن صلاح ھو رای الخضرؑ حی عند جماھیر العلماء والصالحین والعامۃ معھم فی ذالک قال وانما شذ بانکارہ بعض المحدثین (نووی شرح مسلم جلد ثانی ص۲۶۹)

۱۱۶ ● حدثنا اٰدمُ قال ثنا شعبۃُ قال ثنا الحَکَمُ قال سمعتُ سعیدَ بنَ جُبیرٍ عن ابن عباسٍ قال بِتُّ فی بیت خالتی مَیمونۃَ بنت الحارثِ زوجِ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وکان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عندھا فی لیلتھا فصلّی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم العشاءَ ثمّ جاءَ الیٰ منزلہ فصلّی اربعَ رکعاتٍ ثمّ نام ثمّ قامَ ثمّ قال نامَ الغُلَیِّمُ اَوکلمۃً تُشبِہُھا ثمّ قامَ فقمتُ عن یَسارِہٖ فجعلنی عن یَمینہٖ فصلّی خمسَ رکعاتٍ ثمّ صلّی رکعتین ثمّ نامَ حتی سمعتُ غَطیطَہٗ او خَطیطَہٗ ثم خرج الی الصلوٰۃ ●

ترجمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات اپنی خالہ میمونہ بنت الحارثؓ کے گھر گذاری جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس رات کو ان کی باری میں انہی کے پاس تھے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشار کی نماز (مسجد میں) پڑھی پھر اپنے گھر تشریف لائے اور چار رکعتیں پڑھیں اور سو گئے، پھر اٹھے اور فرمایا "کیا بچوا (بچہ) سو گیا یا اسی جیسا کوئی اور کلمہ ارشاد فرمایا" پھر (نماز کے لئے) کھڑے ہوئے اور میں بھی آپؐ کے بائیں جانب کھڑا ہوا آپؐ نے مجھے دائیں جانب کرلیا اور پانچ رکعتیں پڑھیں پھر آپؐ نے دو رکعتیں (فجر کی سنت) پڑھیں پھر سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپؐ کے خراٹے کی آواز سنی (جس کو غطیط یا خطیط کہتے ہیں) پھر نماز کے لئے برآمد ہوئے۔

مطابقۃ للترجمۃ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ ابن منیر کے نزدیک ارشاد گرامی نام الغلیمّ (چھوکرا سوگیا ؟) موضع ترجمہ ہے۔ کیونکہ آپؐ نے ابن عباس رضؓ کے متعلق حضرت میمونہ رضؓ سے خطاب کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا اور نماز عشار کے بعد فرمایا تھا اس لئے سمر بالعلم ثابت ہوگیا۔ اس کے علاوہ علامہ عینی اور حافظ عسقلانیؒ علامہ کرمانی وغیرہ سے بھی اقوال نقل کئے ہیں، لیکن حافظ عسقلانیؒ کو پسند نہیں، فرماتے ہیں: والاولیٰ من ہذا کلہ ان مناسبۃ الترجمۃ مستفادۃ من لفظ آخر فی ہذا الحدیث بعینہ من طریق اخریٰ الخ (فتح الباری)

حافظ عسقلانیؒ ترجمہ سے مناسبت کے لئے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں کہ سب سے بہتر بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے یہی حدیث کتاب التفسیر ص۶۵۷ اور کتاب التوحید ص۱۱۱۱ میں عن کریب عن ابن عباس لائے ہیں وہاں یہ جملہ موجود ہے فتحدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اہلہ ساعۃ ثم رقد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلیہ محترمہ کے ساتھ کچھ دیر گفتگو فرمائی اس کے بعد سو گئے۔

حافظؒ فرماتے ہیں فصحت الترجمۃ بحمد اللہ تعالیٰ من غیر حاجۃ الیٰ تعسف فلا رجم بالظن (فتح)

اور بلاشبہ امام بخاریؒ کے اصول تراجم کے بالکل مطابق ہے، لان تفسیر الحدیث بالحدیث اولیٰ من الخوض فیہ بالظن۔

تعدد موضعہ والحدیث ہٰہنا فی العلم ص۲۲ ویاتی فی کتاب الوضوء ص۲۵ ایضاً ص۳۰ وفی کتاب الاذان ص۹۷ ایضاً ص۱۰۰ ایضاً ص۱۰۱ ایضاً ص۱۱۸ تا ص۱۱۹ وفی ابواب الوتر ص۱۳۵ وفی کتاب التہجد ص۱۵۹ وفی کتاب التفسیر ص۶۵۷ ایضاً ص۶۵۷ وفی اللباس ص۸۷۷ وفی الادب ص۹۱۸ وفی کتاب الدعوات ص۹۳۴ تا ص۹۳۵ وفی التوحید ص۱۱۱۱۔

بِتُّ کی تحقیق و تعلیل: بکسر الباء الموحدۃ وتشدید التاء المثناۃ صیغہ واحد متکلم از بیتوتۃ۔

اصل میں تھا بَیَتَتَ یاء متحرک ماقبل اس کے فتحہ یاء کو الف سے بدل دیا تو بَاتَ ہوا اجتماع ساکنین کی وجہ سے الف کو ساقط کردیا اور حذف یاء پر دلالت کے لئے باء کے فتحہ کو کسرہ سے بدل دیا بِتُّ ہوگیا۔

خالتی میمونۃ میمونہ عطف بیان ہے خالتی سے۔ غطیطہ او خطیطہ شک راوی ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے غطیطہ کہا یا خطیطہ کہا؟۔

غطیط اور خطیط دونوں کے معنی ایک ہیں، یعنی سونے والے کی سانس کی آواز یعنی خراٹے کی آواز۔

تشریح فصلی اربع رکعات بعض نے کہا ہے کہ یہاں راوی نے اختصار کیا ہے درحقیقت یہ سبھی تہجد کی رکعات ہیں مگر اس روایت کے ظاہر سے متبادر یہ ہے کہ عشاء کے بعد کی چار رکعتیں ہیں دو مؤکدہ اور دو غیر مؤکدہ۔

نام الغلیّم غلام کی تصغیر ہے بمعنی بچوا، یہاں مشہور قول یہی ہے کہ ہمزۂ استفہام محذوف ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضؓ سے پوچھا کیا بچوا سوگیا؟ لیکن اخبار کا بھی احتمال ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت میمونہ رضؓ کو بتایا کہ ابن عباس سوگیا ہے، اور ابن عباس نے سکوت اس لئے فرمایا تاکہ آپؐ بلا تکلف اپنے معمولات ادا فرمائیں۔

فقمت عن یسارہ ابن عباس رضؓ تادباً بائیں جانب کھڑے ہوئے تھے لیکن حضورؐ نے نماز ہی کی حالت میں دائیں طرف گھمالیا۔

قولہ فصلی خمس رکعات ان میں سے دو رکعات نفل اور تین وتر کی ہیں، دونوں کو ملاکر بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ نے اس رات میں صلوٰۃ اللیل کی کل تیرہ۱۳ پڑھی ہیں اس ترتیب سے کہ پہلے عشاء کے بعد کی چار رکعتیں پڑھیں پھر صلوٰۃ اللیل کی آٹھ رکعات پڑھ کر کچھ آرام فرمایا جیساکہ ابوداؤد کی ایک روایت ہے " قام فصلی رکعتین رکعتین حتی صلی ثمانی رکعات ثم اوتر بخمس لم یجلس بینھن " (ابوداؤد باب فی صلوٰۃ اللیل ص۱۹۲ مطبوعہ رشیدیہ دہلی)۔

اور بعض روایات میں ہے کہ آپؐ ہر دو رکعت پر آرام فرماتے تھے بعدہ دو رکعت پڑھ کر متصلاً وتر کی تین رکعات پڑھیں اس کے بعد فجر کی دو رکعت سنت پڑھیں، پس صلوٰۃ اللیل میں سے چونکہ آخری دو رکعتوں کے بعد متصلاً وتر ادا فرمائے اس لئے راوی نے ان دونوں کو ملاکر بیان کردیا۔

قولہ ثم صلی رکعتین اس سے فجر کی دو رکعت سنتیں مراد ہیں۔

بَابُ حِفظِ العِلمِ ص۲۲

باب علم کو یاد رکھنا۔

ربط و مقصد ماقبل کے باب میں سمر بالعلم یعنی رات کے وقت علمی گفتگو، علمی مشغلہ کا بیان تھا

جس کا تعلق علم سیکھنے اور حاصل کرنے سے تھا۔
اب اس باب میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے بعد اس کی حفاظت اور یاد رکھنے کی کوشش بھی ضروری ہے۔

۱۱۷ ● حدثنا عبدُ العزیزِ بنُ عبدِ اللہ قال حدثنی مالکٌ عن ابنِ شہابٍ عن الاعرجِ عن ابی ھریرۃ قال اِنّ الناسَ یقولون اکثرَ ابوھریرۃ ولولا آیتان فی کتابِ اللہ ما حدثتُ حدیثاً ثم یتلو اِنّ الذین یکتمون ما انزلنا من البیّناتِ والھُدیٰ الیٰ قولہ الرّحیم اِنّ اِخواننا مِنَ المہاجرین کان یَشغلُھُمُ الصَّفقُ بالاسواقِ وَ اِنّ اِخواننا مِنَ الانصارِ کان یَشغلُھُمُ العملُ فی اموالِھم و اِنّ ابا ھریرۃ کان یَلزمُ رسولَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم بِشِبَعِ بَطنِہ و یَحضُرُ ما لا یحضرون ویَحفظ ما لا یَحفظون ●

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ کہا لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ نے بہت حدیثیں بیان کیں اور بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا پھر (سورہ بقرہ کی) یہ آیتیں پڑھیں "جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے اتاریں الیٰ قولہ یعنی اَنا التوّابُ الرحیم تک۔ بیشک ہمارے بھائی مہاجرین تو بازاروں میں خرید و فروخت میں پھنسے رہتے تھے اور ہمارے انصاری بھائی کھیتی باڑی کے کام میں لگے رہتے تھے اور ابوہریرہؓ (نہ کوئی پیشہ کرتا تھا نہ سوداگری) وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جما رہتا تھا اور ان مواقع پر حاضر رہتا جہاں وہ حاضر نہ رہتے اور وہ باتیں یاد رکھتا جن کو وہ لوگ یاد نہ رکھتے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "ویحفظ ما لا یحفظون"

تعدد موضعہ والحدیث ھٰھنا فی العلم ص۲۲ ویاتی فی کتاب البیوع ص۲۷۴ وفی ابواب الحرث والمزارعۃ ص۳۱۶ وفی آخر علامات النبوۃ ص۵۱۵ وفی الاعتصام ص۱۰۹۳۔

قولہ اکثر ابوھریرۃ چونکہ ابوہریرہؓ مکثرین حدیث میں سے اول نمبر پر ہیں ان سے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں، اس کثرت پر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ ابوہریرہؓ کو صرف چار سال کے قریب صحبت بابرکت میں رہنا میسر ہوا پھر اتنی زیادہ احادیث کیسے بیان فرماتے ہیں جبکہ بڑے بڑے صحابۂ مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم جو ان سے برسہا برس زیادہ صحبت یافتہ ہیں وہ اتنی احادیث بیان نہیں فرماتے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے یہاں دو وجہ بیان فرمائی ۱ کتمانِ علم پر وعید آئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ الآية (سورہ بقرہ آیت ۱۵۹ و ۱۶۰)

بیشک جو لوگ ان کھلی کھلی باتوں اور ہدایت کو کہ جسے ہم نے نازل کردیا ہے اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان کو لوگوں کے لئے کتاب میں بیان کردیا ہے ایسوں پر خدا اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں، ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کرلیتے اور احکامات کو صاف صاف بیان کردیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کردیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا اور رحم والا ہوں۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر یہ دونوں آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا لیکن چونکہ کتمان حرام ہے لہٰذا احادیث کی تبلیغ و اظہار واجب ہے۔

۲ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے دینی بھائیوں (مہاجرین و انصارؓ) کے مختلف مشاغل تھے، حضرات مہاجرینؓ تجارتی ذمہ داریوں میں مصروف رہتے تھے اور حضرات انصارؓ کھیتی باڑی اور زراعت کے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور میرا حال یہ تھا کہ نہ زراعت تھی اور نہ میں تجارت کرتا تھا کیوں کہ میرے ذمہ کسی کے حقوق نہ تھے اور نہ مال کمانے کی فکر تھی اس لئے صرف شبعِ بطن پر اکتفا کرکے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بمقابلہ ان بھائیوں کے زیادہ رہتا تھا۔

اس لئے میں نے ارشادات نبوی کا وہ ذخیرہ یاد کرلیا جسے یاد کرنے کا انہیں موقع نہ ملتا تھا۔

بشبع بطنه ایک نسخہ لشبع بطنہ ہے اور باء یا لام کلاہما للتعلیل ای لأجل شبع بطنہ وھو بکسر الشین المعجمۃ و فتح الموحدۃ (عمدہ، قس)

اس کے مطلب میں مختلف احتمالات ہیں: ۱ ایک مطلب تو ترجمہ سے ظاہر ہے کہ صرف ایک پیٹ کی روٹی کافی تھی کسی کے حقوق میرے ذمہ نہ تھے اس لئے شبع بطن پر اکتفا کرکے ہمہ وقت حاضرِ خدمت رہتا تھا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو کوئی کام نہ تھا نہ زراعت نہ ہی تجارت اس لئے پیٹ بھر یعنی جی بھر خدمتِ اقدس میں حاضر رہتا تھا جیساکہ محاورہ ہے فلان یحدث شبع بطنه فلاں شخص پیٹ بھر کر یعنی جی بھر کر باتیں کرتا ہے۔ فلان یسافر شبع بطنه فلاں آدمی جی بھر سفر کرتا ہے۔ یہ مطلب سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے لیکن یہ معنی تعلیل کے مناسب نہیں۔

بہرحال حضرت ابوہریرہؓ احادیث نبوی کو یاد کرنے کے لئے دوسری تدبیریں بھی کرتے تھے مثلاً: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کروانا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے نسخۂ کیمیا کو استعمال کرنا۔ چنانچہ اس کے بعد والی روایت آرہی ہے۔

حضرت ابوہریرۃ رضؓ حضرت ابوہریرہ رضؓ کا نام زمانہ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے عبدشمس تھا اور بعد اسلام عبدالرحمان بن صخر ہوا۔

ابوہریرہ کنیت ہے اور آپ کنیت ہی سے مشہور ہیں، اور اس کنیت کے بارے میں خود حضرت ابوہریرہؓ کا اپنا بیان منقول ہے کہ میں اپنے گھر کی بکری چراتا تھا اور میری ایک چھوٹی سی بلی تھی جس کو رات کے وقت میں درخت پر رکھدیا تھا اور جب دن ہوتا تو میں اس کو اپنے ساتھ لیجاتا اور میں اس سے کھیلا کرتا تھا، لوگوں نے میری کنیت ابوہریرہ رکھدی۔ (ترمذی ثانی ابواب المناقب ص۲۲۴)

تمام محدثین ابوہریرۃ غیر منصرف پڑھتے ہیں۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: وهو اول من كنى بهذه الكنية لهرة كان يلعب بها كناه النبى صلى الله عليه وسلم بذالك وقيل والده (عمدہ جلد اول ص۱۲۴ فی باب امور الایمان)

حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کا نام میمونہ تھا عرصہ تک اسلام سے مشرف نہ ہوئیں ابوہریرہؓ کی درخواست پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی اور وہ مسلمان ہوگئیں۔

بہرحال ابوہریرہؓ جلیل القدر صحابی ہیں تمام صحابہ سے زیادہ روایتیں ان سے منقول ہیں مکثر الحدیث احفظ الصحابہ تھے ۷ھ میں مشرف باسلام ہوئے اور اٹھہتر ۷۸ برس کی عمر میں ۵۹ھ میں وفات پائی اور بقیع میں دفن کئے گئے۔

۱۱۸ ● حدثنا ابومُصْعَبٍ احمدُ بنُ اَبى بكرٍ قال ثنا محمدُ بنُ ابراهيمَ بنِ دينارٍ عن ابنِ اَبى ذِئبٍ عن سعيدِ المَقْبُرِىِّ عن ابى هريرة قال قلتُ يارسول الله اِنّى اَسْمعُ منك حديثاً كثيراً اَنْساه قال ابسُطْ رِدَاءَكَ فبسطتُهُ فغرف بيديه ثمّ قال ضُمَّ فضَمَمْتُه فما نسيتُ شيئاً بعدُ ●

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں آپ سے بہت باتیں سنتا ہوں ان کو بھول جاتا ہوں، آپؐ نے فرمایا اپنی چادر بچھاؤ میں نے اپنی چادر بچھادی تو آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک لپ (چلّو) اس میں ڈالدیا پھر فرمایا اس کو لپیٹ لے (یعنی اپنے سینے سے لگالے) میں نے (لپیٹ کر) اپنے سینے سے لگا لیا پھر اس کے بعد کوئی چیز نہیں بھولا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقة الحديث للترجمة بطريق الالتزام (عمدہ) مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نسیان کی شکایت کی ہے اور نسیان حفظ کی ضد ہے اور قاعدہ ہے وبضدها تتبيّن الاشياء (چیزوں کے ضد کا ذکر خود ان کے اظہار کا سبب ہے) پس اس طرح ترجمۃ الباب ثابت ہوگیا۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرتِ روایت اور قوتِ حفظ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت کا نتیجہ ہے۔

تعدد موضعہ والحديث ههنا فى العلم ص۲۲ ويأتى فى البيوع ص۲۷۴ تا ص۲۷۵ وفى

ابواب الحرث والمزارعۃ ص۳۱۶ وفی کتاب المناقب ص۵۱۴ تا ص۵۱۵ ایضاً ص۱۰۹۳۔

اشکال یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ کتاب العلم کی اس روایت میں ہے فما نسیتُ شیئاً بعدہ اور یہی روایت کتاب البیوع ص۲۷۴ تا ص۲۷۵ پر آرہی ہے جس کے الفاظ ہیں فما نسیتُ من مقالۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تلک من شیئ اس کتاب البیوع کی روایت کا مطلب تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے اسی وقت جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں سے کوئی چیز نہ بھولے۔

اور روایت الباب کا ظاہر یہ ہے کہ اس دعا کے بعد حضرت ابو ہریرۃؓ کچھ نہیں بھولے۔ بظاہر دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔

علامہ عینیؒ نیز حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں ویحتمل ان تکون وقعت لہ قضیتان یعنی تعدد واقعہ پر محمول ہے۔

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دونوں کا سیاق ایک ہے جو تو حد واقعہ کو مقتضی ہے۔

۲ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللّٰہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ کتاب البیوع والی روایت میں من مقالۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم میں جو مِن ہے وہ اجلیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی اس دعا کی برکت کے سبب سے پھر میں اس کے بعد کچھ نہیں بھولا۔

(تقریر بخاری ج ۱ ص۱۹۹)

۱۱۹ ● حدثنا ابراهیمُ بن المنذرِ قال حدثنا ابنُ ابی فُدَیکٍ بهذا وقال فغرفَ بیدِهٖ فیه ●

ترجمہ ہم سے ابراہیم بن منذر نے بیان کیا کہا ہم سے ابن ابی فدیک نے (ابن ابی ذئب سے نقل کرکے ان کی سند سے) یہی بیان کیا کہ آپ نے ہاتھ سے چلّو لیکر اس (کپڑے) میں ڈالدیا۔

تشریح حدیث ع۱۱۸ دوسری سند سے ہے البتہ الفاظ متن میں کچھ فرق ہے کہ پہلی سند میں بیدیہ تثنیہ کا لفظ ہے اور فیہ نہیں ہے اور اس دوسری سند (یعنی ع۱۱۹) میں بیدہ واحد ہے اور فیہ کا اضافہ ہے۔

امام بخاریؒ کا مقصد ایک دوسری سند پیش کرنا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرۃؓ نے فرمایا " اس کے علاوہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی ایک دوسری خصوصی عنایت بھی مجھ پر یہ تھی کہ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے میری چادر میں کچھ ڈالدیا تھا، ہاتھ بظاہر خالی تھا مگر اس میں علم کے خزانے تھے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے بعد سے حضورؐ کی کوئی بات بھولتا نہ تھا اس لئے میرے پاس ذخیرۂ حدیث بہت تھا اور چھپانا منع تھا اس لئے میں نے سب ہی کچھ امت کو پہونچادیا۔ (درس بخاری مطبوعہ ڈابھیل گجرات)

۱۲۰ ● حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی اخی عن ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن ابی ھریرۃ قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فاما احدھما فبثثتہ واما الآخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم قال ابو عبد اللہ البلعوم مجری الطعام ●

ترجمہ ہم سے اسمٰعیل بن ابی اویس نے بیان کیا کہا مجھ سے میرے بھائی (عبد الحمید) نے انہوں نے نقل کیا (محمد) ابن ابی ذئب سے انہوں نے سعید مقبری سے انہوں نے ابو ہریرہؓ سے، کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (علم کے) دو تھیلے سیکھے (یعنی دو طرح کے علم حاصل کئے) ایک کو میں نے (لوگوں میں) پھیلا دیا اور دوسرے کو اگر میں پھیلاؤں تو یہ میرا بلعوم کاٹ ڈالا جائے۔ امام بخاریؒ نے کہا بلعوم (نرخرا) وہ ہے جس میں کھانا اترتا ہے۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی قولہ " حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین ،، یعنی حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علم حاصل کئے، جس میں ایک قسم کے علم کو لوگوں میں پھیلا دیا۔ اس میں صاف اشارہ ہے کہ علم کے اسباب حفظ میں سے ایک عظیم سبب علم کی اشاعت ہے کہ اس سے حاصل شدہ علم برقرار و پائدار ہو جاتا ہے۔

تعدد موضعہ: ملاحظہ ہو ص۲۲ ص۲۷۴ ص۳۱۶ و ص۳۱۵ و ص۱۰۹۳۔

وعائین سے کیا مراد ہے؟

وعائین سے علم کے دو نوع مراد ہیں یعنی حضرت ابو ہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علوم حاصل کئے۔ ایک قسم کے علم کو تو میں نے عام کر دیا، پھیلا دیا۔ جن کا تعلق عقائد و احکام اور حلال و حرام سے تھا۔

دوسرے قسم کے علوم کو میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس دوسری قسم کا تعلق احکام شریعت، حلال و حرام سے نہیں تھا ورنہ چھپانا جائز نہ ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دوسری قسم سے کیا مراد ہے؟ کس قسم کے علوم تھے؟ اقوال مختلف ہیں:۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ تصوف کے وہ اسرار و حقائق مراد ہیں جو عقول متوسطہ سے بالاتر ہیں عوام الناس ان اسرار کا تحمل نہیں کر سکتے ان اسرار کو سمجھنے کے لئے درد محبت کی ضرورت ہے کما قال الرومی ؎

در درونِ خود بیفزا درد را ٭ تا ببینی سبز و سرخ و زرد را

دوسرا قول جو اکثر محدثین و محققین کی تحقیق ہے کہ وعاء ثانی سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں فتنوں کے متعلق تفصیلات اور بعض امراء جور (ظالم بادشاہوں کے نام) کی تعیین اور ان کے حالات ہیں۔ چنانچہ

حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے: قال ابو هريرةؓ ان شئت ان اسمّيهم بنی فلان و بنی فلان
(بخاری اول ص۵۰۹)

بعض ظالم امراء کا اشارہ کنایہ سے ذکر بھی فرمایا کرتے تھے مثلاً:
اعوذ بالله من راس الستين وامارة الصبيان، میں ۶۰ھ سے اور بچوں کی حکومت سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

یہ اشارہ تھا خلافت یزید کی طرف کیونکہ یزید اسی سال تخت نشین ہوا ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے ان حوادث اور فتنوں سے بچنے کے لئے دعا بھی کی تھی اللهم اقبضنی الیك قبل الستين خدایا مجھے ۶۰ھ سے پہلے ہی اپنی طرف اٹھالے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور یزید کی حکومت سے ایک سال پہلے ۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

بہرحال ظاہر یہی ہے کہ ظالم بادشاہوں کے نام اور حالات ہی کی جانب اشارہ ہے کہ اگر میں صاف صاف بتادوں تو وہ لوگ مجھ کو قتل کردیں گے۔

باب۸۵ الانصات للعلماء ص۲۳

علماء کی بات سننے کے لئے خاموش رہنا۔

ربط و مقصد گذشتہ باب میں حفظِ علم اور یاد کے اہتمام کا ذکر تھا اب اس باب میں حفظ علم کا ایک بہترین طریقہ بیان کیا جارہا ہے کہ عالم جب کوئی چیز بیان کرے تو ہمہ تن گوش ہو کر پوری توجہ سے سننا چاہئے اگر سنتے وقت توجہ نہ ہو تو یاد اور حفاظت کس چیز کی کریگا۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی عالم کو کوئی اہم بات بیان کرنی ہو تو لوگوں کو خاموش کر کے بھی بیان کرسکتا ہے۔

۱۲۱ ● حدثنا حجّاج قال ثنا شعبة قال اخبرنی علیّ بن مُدرِك عن ابی زُرعة عن جرير ان النبی صلى الله عليه وسلم قال له فی حجة الوداع استنصت الناس فقال لا ترجعوا بعدی كفّارًا يضرب بعضكم رقاب بعض ●

ترجمہ حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ان سے فرمایا لوگوں کو خاموش کرو (جب جریرؓ نے خاموش کردیا) تو فرمایا (لوگو!) میرے بعد پھر کافر مت بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قوله "استنصت الناس"

تعدد مواضعہ والحدیث ھٰھنا ص۲۳ ویاتی فی المغازی ص۶۳۲ وفی الدیات ص۱۰۱۵ وفی الفتن ص۱۰۴۸

اشکال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا:

لا الفینّک تاتی القوم وھم فی حدیثھم فتقطع علیھم حدیثھم۔ میں تمہیں اس طرح نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں اور تم انکی بات کاٹ دو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگ گفتگو میں مشغول ہوں تو قطع کلام کی ممانعت ہے کیونکہ یہ چیز ملال اور رنجش کا باعث بن سکتی ہے اس کے ظاہر اور عموم سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کو خاموش کر کے علم اور دین کی باتوں کی طرف متوجہ کرنا بھی ممنوع ہوگا۔

امام بخاری رحؒ نے یہ باب منعقد کر کے ثابت کر دیا کہ تعلیم و تبلیغ کی ضرورت کے وقت انصات مباح اور مستحسن ہے۔ دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں جبکہ لوگ تلبیہ اور ذکر و تلاوت میں مشغول تھے علمی بات سنانے کے لئے خاموش کرایا۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ انفرادی ذکر و اذکار سے بڑھ کر علماء ربانیین کا وعظ سننا ہے۔ البتہ بلا ضرورت کسی کی گفتگو میں دخل دینا، خلل ڈالنا ممنوع ہوگا۔

قال سفیان الثوری وغیرہ اول العلم الاستماع ثم الحفظ ثم العمل ثم النشر۔

تشریح حدیث پاک میں استنصت الناس کا تعلق اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے لیکن بفحوائے حدیث العلماء ورثۃ الانبیاء علماء ربانیین کے متعلق بھی یہی حکم ہے اسی مقصد کی خاطر امام بخاری رحؒ نے اس حدیث پر انصات العلماء کا ترجمہ قائم کیا ہے۔

لا ترجعوا بعدی کفارا الخ ارشاد فرمایا کہ میرے بعد کافروں کے مثل مت ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ یعنی یہاں کفار کے ساتھ تشبیہ ہے کہ جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اسی طرح تم میرے بعد ایک دوسرے کا قتل مت کرنا ای لا تفعلوا فعل الکفار فتشبھوھم الخ

مطلب صاف ہے کہ اگر تم آپس میں قتل و قتال کرو گے تو فعل کفار کا ارتکاب کرو گے، نیز کفرٌ دون کفرٍ پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ ۳ بعض روایتوں میں بجائے کفاراً کے ضلالاً آیا ہے اس سے مقصد بالکل واضح ہو جاتا ہے اور معلوم ہو گیا کہ صرف قتل سے خارج از اسلام نہیں ہوتا جیسا کہ قتالہ کفر میں تاویل کرتے ہیں، ہاں اگر قتل مومن حلال و جائز سمجھ کر کریگا تو بلا شبہ کافر حقیقی ہو جائے گا۔

بابُ۸۶ ما یُستحبُّ لِلعالِمِ اِذا سُئِلَ ایُّ النّاسِ اَعلَمُ فیکِلُ العِلمَ الی اللہ تعالیٰ

جب عالم سے پوچھا جائے کہ سب سے زیادہ علم والا کون ہے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ علم کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے

ربط علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وجه المناسبة بين البابين من حيث ان المذكور فی الباب الاول لزوم الانصات وكون الامر الى الله تعالىٰ اذا سئل عن الاعلم۔

یعنی باب سابق میں عالم کے لئے انصات کے لزوم کا بیان تھا اور یہ خاموشی درحقیقت اپنے معاملہ کو عالم کے حوالے کردینا ہے۔

اسی طرح اس باب میں ہے کہ جب عالم سے اعلم کے بارے میں پوچھا جائے تو اس پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے۔

مقصد ترجمہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد اس ترجمۃ الباب سے یہ ہے کہ علماء کبار کو تواضع اختیار کرنا چاہیئے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ انسان جب اس درجہ تک مقبول ومشہور ہوجاتا ہے کہ لوگ اس کی باتوں کو سننے کے لئے خاموش ہوجایا کریں اور اس کی بات کو سنانے کے لئے لوگوں کو خاموش اور متوجہ کیا جانے لگے تو ایسی حالت میں عموماً انسان عجب اور بڑائی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب کو منعقد کرکے متنبہ کردیا کہ انسان جب علم کے بلند مقام پر پہونچ جائے تو اس کو تواضع اختیار کرنی چاہیئے جیسا کہ شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ع نہد شاخ پرمیوہ سر برزمین

۱۲۲ ● حدثنا عبدُ اللهِ بنُ محمدٍ المُسْنَدِيُّ قال ثنا سفيانُ قال ثنا عمروٌ قال اخبرني سعيدُ بنُ جُبَيرٍ قال قلتُ لابنِ عباسٍ إنَّ نوفانَ البكاليَّ يزعُمُ انّ موسى ليس موسى بني اسرائيلَ إنما هو موسى آخرُ فقال كذب عدوُّ الله حدثنا أُبَيُّ بنُ كعبٍ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال قامَ موسى النبيُّ خطيباً في بني اسرائيل فسُئِلَ ايُّ الناسِ اَعْلَمُ فقال أنا اعلمُ فعتبَ اللهُ عزوجل عليه اذلم يَرُدَّ العلمَ اليه فاوحى الله اليه اَنَّ عبداً من عبادي بمَجْمَعِ البحرينِ هو اعلمُ منكَ قال يا ربِّ وكيف به فقيل له احمِلْ حوتاً في مِكْتَلٍ فاذا فقدْتَهُ فهو ثَمَّ فانطلق وانطلقَ بفتاهُ يوشعَ بنِ نونٍ وحَمَلا حوتاً في مكتلٍ حتى كانا عند الصَّخْرَةِ وَضعا رؤسَهما فناما فانسَلَّ الحوتُ مِنَ المكتلِ فاتخذَ سبيلَه في البحرِ سَرَباً وكان لموسى وفتاه عَجَباً فانطلقا بقيَّةَ لَيْلَتِهِما ويومِهما فلمّا اصبحَ قال موسى لفتاه آتنا غداءَنا لقد لَقِينا مِن سَفَرِنا هذا نصَباً ولَمْ يَجِدْ موسى مَسّاً مِنَ النَّصَبِ حتي جاوزَ المكانَ الذي أُمِرَ به فقال له فتاه ارايتَ إذ اَوَيْنا الى الصَّخرةِ فاني نَسِيتُ الحوتَ قال موسى ذلك ما كنّا نبغِ فارتدّا على آثارِهما قَصَصاً فلمّا انتهيا الى الصَّخرةِ اذا رجلٌ مُسَجًّى بثوبٍ او قال تسَجّى بثوبه

فسلّم موسیٰ فقال الخضر وانّیٰ بارضك السلام فقال انا موسیٰ فقال موسیٰ بنی اسرائیل قال نعم قال هل اتّبعك علیٰ ان تعلّمنی ممّا علّمت رشدا قال انّك لن تستطیع معی صبرا یا موسیٰ انّی علیٰ علم من علم الله علّمنیه لا تعلمه انت وانت علیٰ علم علّمکه الله لا اعلمه قال ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصی لك امرا فانطلقا یمشیان علیٰ ساحل البحر لیس لهما سفینة فمرّت بهما سفینة فکلّموهم ان یحملوهما فعرف الخضر فحملوهما بغیر نول فجاء عصفور فوقع علیٰ حرف السفینة فنقر نقرة او نقرتین فی البحر فقال الخضر یا موسیٰ ما نقص علمی وعلمك من علم الله تعالیٰ الا کنقرة هذه العصفور فی البحر فعمد الخضر الیٰ لوح من الواح السفینة فنزعه فقال موسیٰ قوم حملونا بغیر نول فعمدت الیٰ سفینتهم فخرقتها لتغرق اهلها قال الم اقل انّك لن تستطیع معی صبرا قال لا تؤاخذنی بما نسیت ولا ترهقنی من امری عسرا قال فکانت الاولیٰ من موسیٰ نسیانا فانطلقا فاذا غلام یلعب مع الغلمان فاخذ الخضر براسه من اعلاه فاقتلع راسه بیده فقال موسیٰ اقتلت نفسا زکیة بغیر نفس قال الم اقل لك انّك لن تستطیع معی صبرا قال ابن عیینة وهٰذا اوکد فانطلقا حتی اذا اتیا اهل قریة استطعما اهلها فابوا ان یضیّفوهما فوجدا فیها جدارا یرید ان ینقضّ قال الخضر بیده فاقامه فقال له موسیٰ لو شئت لاتّخذت علیه اجرا قال هٰذا فراق بینی وبینك قال النبی صلی الله علیه وسلم یرحم الله موسیٰ لوددنا لو صبر حتی یقصّ علینا من امرهما قال محمد بن یوسف ثنا به علی بن خشرم قال ثنا سفیان بن عیینة بطوله

ترجمہ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ نوف بکالی کہتا ہے کہ وہ موسیٰؑ (جو خضرؑ کے پاس گئے تھے) بنی اسرائیل کے موسیٰ نہیں ہیں بلکہ وہ دوسرے موسیٰ تھے (یہ سنکر) ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کے دشمن نے غلط کہا ہم سے ابی بن کعبؓ نے بیان کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرکے (آپؐ نے فرمایا) موسیٰ پیغمبر نے بنی اسرائیل میں کھڑے ہو کر خطبہ دیا (تقریر کی) تو آپ (موسیٰؑ) سے پوچھا گیا کہ سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے؟ موسیٰؑ نے کہا۔ میں بڑا عالم ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا کیونکہ انہوں نے علم کو اللہ کے حوالہ نہیں کیا تب اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ میرا ایک بندہ ہے وہاں جہاں دو دریا (فارس و روم کے سمندر) ملے ہیں وہ تجھ سے زیادہ علم والا ہے، موسیٰؑ نے کہا اے پروردگار میں ان تک کیسے پہونچوں؟ حکم ہوا کہ ایک مچھلی زنبیل (تھیلا) میں رکھ لے پھر جب تم اسے

گم پاؤ تو وہ بندہ وہیں ملیگا، پس حضرت موسیٰؑ روانہ ہوئے اور اپنے ساتھ اپنے جوان (خادم) یوشع بن نون کو لے لیا اور دونوں نے ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی جب دونوں (ایک پتھر) صخرہ کے پاس پہونچے تو دونوں اپنے سر اس پر رکھ کر سو گئے پھر مچھلی زنبیل سے نکل بھاگی اور دریا میں اس نے اپنا راستہ بنا لیا سرنگ بناکر اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم کو تعجب ہوا پھر وہ دونوں ایک رات، دن میں جتنا باقی تھا اس میں چلتے رہے جب صبح ہوئی تو موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا ہمارا ناشتہ لاؤ بالیقین ہم اس سفر سے تھک گئے اور موسیٰؑ کو تھکان نے چھوا بھی نہیں مگر جب اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جہاں تک ان کو جانے کا حکم ملا تھا اس وقت ان کے خادم نے کہا کیا آپ نے نہیں دیکھا جب ہم صخرہ کے پاس ٹھہرے تھے تو (مچھلی نکل بھاگی اور) میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا موسیٰؑ نے کہا یہی وہ جگہ ہے جس کی ہمیں تلاش تھی آخر وہ دونوں کھوج لگاتے ہوئے اپنے پاؤں کے نشان پر لوٹے جب اس صخرہ کے پاس پہونچے دیکھا تو ایک شخص ہے کپڑا لپیٹے ہوئے یا کہا اپنا کپڑا لپیٹے ہیں، موسیٰؑ نے ان کو سلام کیا خضرؑ نے کہا تمہاری سرزمین میں سلام کہاں ؟ پھر موسیٰؑ نے کہا میں موسیٰ ہوں خضر نے کہا بنی اسرائیل کے موسیٰ ؟ انہوں نے جواب دیا ہاں، پھر کہا میں تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط پر کہ آپ کو جو علم کی باتیں سکھائی گئی ہیں وہ مجھ کو سکھلاؤ، حضرت خضرؑ نے کہا تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے، اے موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ نے ایک (قسم کا) علم مجھ کو دیا ہے جسے تم نہیں جانتے اور تم کو ایک (قسم کا) علم دیا ہے اسے میں نہیں جانتا، موسیٰؑ نے کہا اگر خدا چاہے تو تم ضرور مجھ کو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں آپ کے کسی فرمان کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

چنانچہ دونوں سمندر کے کنارے کنارے پیدل چلے ان کے پاس کشتی نہ تھی (کہ سمندر پار کر جائیں) اتنے میں ایک کشتی ان کے پاس سے گذری انہوں نے کشتی والوں سے بات کی کہ انہیں کشتی میں سوار کر لیں، کشتی والوں نے خضرؑ کو پہچان لیا اور انہوں نے دونوں کو بے کرایہ ہی سوار کر لیا اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی پھر سمندر میں اس نے ایک یا دو چونچیں ماریں (اسے دیکھ کر) خضرؑ نے کہا اے موسیٰ میرے اور تمہارے علم (دونوں) نے اللہ کے علم میں سے کچھ کم نہیں کیا مگر جتنا پانی کہ اس چڑیا کی چونچ نے سمندر میں سے۔

پھر حضرت خضرؑ نے کشتی کے تختوں میں ایک تختہ کی طرف قصد فرما کر ایک تختہ نکال دیا، حضرت موسیٰؑ نے کہا ان لوگوں نے تو ہم کو بے کرایہ سوار کیا اور تم نے یہ کام کیا کہ ان کی کشتی میں چھید کر دیا کشتی والوں کو ڈبانا چاہا خضرؑ نے کہا میں نہیں کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، موسیٰؑ نے کہا آپ میری بھول پر مؤاخذہ نہ کیجئے اور میرے کام کو مشکل میں نہ پھنسائیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ پہلا اعتراض تو موسیٰؑ کا بھولے ہی سے تھا۔ پھر دونوں چلے (کشتی سے اتر کر) دیکھا کہ ایک لڑکا چند لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے خضرؑ نے اس کے سر کو اوپر سے پکڑا اور اپنے ہاتھ سے اس کا سر اکھیڑ لیا، موسیٰؑ نے کہا آپ نے ایک معصوم جان کو ناحق قتل کر دیا، خضرؑ نے کہا کیا میں نے آپ ہی سے یہ نہیں کہدیا تھا کہ آپ

میرے ساتھ صبر کی تاب نہ لا سکیں گے۔

ابن عیینہ نے کہا اس کلام میں زیادہ تاکید ہے، پھر دونوں چلے چلتے چلتے ایک گاؤں والوں کے پاس پہونچے ان سے کھانا طلب کیا ان لوگوں نے مہمان داری سے انکار کر دیا پھر ان دونوں نے دیکھا اس گاؤں میں ایک دیوار ہے جو گرا چاہتی ہے حضرت خضرؑ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور دیوار کو سیدھا کر دیا حضرت موسیٰؑ نے خضرؑ سے کہا تم چاہتے تو اس کی مزدوری (گاؤں والوں سے) لے سکتے تھے حضرت خضرؑ نے کہا بس مجھ میں اور تم میں جدائی کی گھڑی آن پہونچی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم کرے۔ ہم تو یہ چاہتے تھے کاش موسیٰ صبر کرتے تو ان کے اور حالات بھی ہم سے بیان کئے جاتے، محمد بن یوسف فربری نے کہا ہم سے یہ حدیث علی بن خشرم نے بیان کی ہے انہوں نے کہا ہم سے سفیان بن عیینہ نے یہی لمبی حدیث بیان کی۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی قولہ "فسئل ای الناس اعلم" الخ

تعدد موضعہ والحدیث ھٰھنا فی العلم صـ۲۳ ومرّ ایضاً صـ۱۷ ویاتی مختصراً صـ۳۰۲ ایضاً صـ۳۷۷ وصـ۴۶۳ وصـ۴۸۱ ومفصلاً صـ۴۸۲ تا صـ۴۸۳ وصـ۶۸۷ تا صـ۶۸۸ وصـ۶۹۰ و صـ۹۸۷ وصـ۱۱۱۴۔

سند عبداللہ بن محمد، یہ جعفی المسندی ہیں، ان کو مسندی کہا جاتا ہے چونکہ یہ اہتمام سے روایات مسند ہی کی تلاش میں رہتے تھے۔

سفیان، یہ ابن عیینہ ہیں نہ کہ ثوری۔ عمرو ھو ابن دینار۔ نوف بکالی، نون بفتح النون وسکون الواؤ وفی آخرہ فاء۔ بکالی بکسر الباء الموحدۃ وتخفیف الکاف۔ نسبۃً الی بنی بکال بطن من حمیر یہ دمشق کے بہت بڑے عالم فاضل تابعی تھے۔ کعب احبار کے ربیب یعنی بیوی کے لڑکے تھے بعض نے کہا ہے کہ کعب احبار کے بھتیجا تھے سعید بن جبیرؒ تابعین کے بڑے عالم اور ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔

اشکال اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف موسیٰ کے بارے میں ہے کہ جو موسیٰؑ حضرت خضرؑ کے پاس گئے تھے وہ موسیٰ کلیم اللہ بنی اسرائیل کے نبی حضرت موسیٰ (ابن عمران) علیہ السلام ہیں یا موسیٰ بن میشا؟

اس کے قبل صـ۱۷ باب ماذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر والی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اختلاف صاحب موسیٰؑ کے بارے میں تھا کہ وہ حضرت خضر ہیں یا کوئی اور ہیں؟ بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب:۔ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ کے متعلق دو باتوں میں اختلاف ہوا، ایک اختلاف جو باب صـ۵۸ باب ماذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر کے تحت کی حدیث

میں ہے وہ اختلاف دو صحابی کے درمیان ہے یعنی حضرت ابن عباس اور حضرت حُر بن قیس رضی اللہ عنہما کے درمیان صاحب موسیٰ کے بارے میں اختلاف ہوا کہ وہ خضر ہیں یا کوئی اور ہیں ؟
دوسرا اختلاف جو یہاں باب ۸۶ کے تحت والی حدیث میں جس اختلاف کا ذکر ہے وہ دو تابعی کے درمیان اختلاف کا ذکر ہے یعنی نوف بکالی اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کے درمیان یہ اختلاف ہوا کہ حضرت خضرؑ کے پاس جانے والے موسیٰ کون ہیں ؟
نوف بکالی کا خیال تھا کہ یہ موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ نہیں ہیں بلکہ موسیٰ بن میشا حضرت یوسفؑ کے پوتے ہیں۔
پس دونوں اختلاف کا موضوع الگ ہے اختلاف کرنے والے الگ ہیں لہذا تعارض نہیں ہے۔

تشریح كذب عدو الله ، نوف بکالی مؤمن تھے عالم فاضل اور اہل دمشق کے امام تھے پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو عدو اللہ فرمایا ؟ یہ فرمانا محض زجراً و توبیخاً ہے حقیقت پر محمول نہیں ہے۔
اس سے تو ایک مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی عالم کسی کی قبیح حرکت دیکھے یا صریح حدیث کے خلاف کسی کا قول سنے تو شدتِ انقباض اور دینی حمیت کی وجہ سے اس طرح کے سخت الفاظ کہدے تو اس کی گنجائش ہے۔
وكان لموسى وفتاه عجبا یعنی یوشع کو اس وقت تعجب ہوا اور حضرت موسیٰؑ کو یوشع سے مچھلی کا واقعہ سننے کے بعد۔ مگر چونکہ وجوہِ تعجب مشترک تھے اس لئے اختصار کے لئے ایک ساتھ ہی دونوں کے تعجب کا ذکر کیا گیا۔
فانطلقا بقية ليلتهما ويومهما ان الفاظ میں قلب ہوگیا ہے یعنی یہاں لیلتہما کو یومہما پر مقدم ذکر کیا گیا ہے، صحیح ترتیب کے ساتھ اسی بخاری شریف کتاب التفسیر میں ہے فانطلقا بقية يومهما وليلتهما مطلب یہ ہے کہ دوپہر کو سونے کے بعد جب بیدار ہوئے تو مچھلی کا قصہ بتانا یوشع بھول گئے اور دونوں بقیہ دن اور اس کے بعد آنے والی رات چلتے رہے فلما اصبح ظاہر ہے کہ رات بھر چلنے کے بعد صبح ہوتی ہے تو اس طرح فلما اصبح کا جملہ مربوط ہوجاتا ہے۔ نیز مسلم شریف جلد ثانی صـ ۲۶۹ میں بھی یوم مقدم اور لیلۃ مؤخر ہے۔
قولہ **حتى اذا اتيا اهل قرية استطعما اهلها** اس میں اشکال یہ ہے کہ اہل دوبارہ کیوں لایا گیا ؟ وضع المظہر موضع المضمر میں کیا حکمت ہے۔
جواب: یہ ہے کہ اس بستی میں دو نبی تشریف لائے اور ان کے مہمان ہوئے پھر کسی اجنبی سے نہیں بلکہ ان بستی والوں ہی سے طعام طلب بھی کیا اور وہ بستی میں مقیم ہونے کی وجہ سے ان کی پوری قدرت بھی رکھتے

تھے اس کے باوجود ان کی مہمانی کی توفیق نہ ہوئی پس ان کی تقبیح کے لئے لفظ اھل مکرر لائے۔

فائدہ باقی تشریح کے لئے اسی پہلی جلد کا باب ۵۸ ملاحظہ فرمایئے، نیز احقر نے نصر الباری کتاب التفسیر میں تفصیل سے بیان کردی ہے ملاحظہ فرمایئے نصر الباری کتاب التفسیر ص۳۹۰ تا ص۳۹۳

مسائل مستنبطہ علامہ عینیؒ نے اس حدیث سے بہت سارے مسائل مستنبط فرمائے ہیں۔
۱ علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا مستحب ہے ۲ سفر کے لئے توشہ (کھانے پینے کا سامان) ساتھ لینا جائز ہے۔
۳ طالب علم کی فضیلت، عالم کے ساتھ ادب کا معاملہ کرنا، مشائخ و بزرگوں کا احترام کرنا ان پر اعتراض سے بچنا، مشائخ کی جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کی تاویل کرنا اور ان کے معاہدے کو پورا کرنا۔ اگر اس میں کوتاہی ہوجائے تو معذرت کرنا۔
۴ ولایت صحیح ہے اور اولیاء کرام کے کرامات حق ہیں ۵ بوقت ضرورت کھانا مانگنا جائز ہے ۶ اجرت پر کوئی چیز دینا جائز ہے ۷ کشتی یا اور کوئی سواری ہو تو بلا اجرت سوار ہونا جائز ہے بشرطیکہ مالک کی رضامندی ہو ۸ کذب خلاف واقعہ خبر دینے کا نام ہے خواہ عمداً ہو یا سہواً خلافاً للمعتزلہ۔
۹ جب دو مفسدے، دو برائیاں متعارض ہوں تو بڑی برائی کو دفع کرنے کے لئے کم درجہ کی برائی کو برداشت کرلینا چاہئے جیسے خرق سفینہ کے ذریعہ غصب سفینہ کی مصیبت دفع کی گئی اذا ابتلیت ببلیتین فاختر اھونہما۔
۱۰ ایک اہم اور اصولی بات یہ معلوم ہوئی کہ شریعت کے تمام احکام کی تسلیم و اطاعت واجب ہے خواہ اس کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے وغیرہ۔

بابٌ مَن سَالَ وهو قائمٌ عالماً جالساً ص۲۳

ایک عالم سے جو بیٹھا ہو کوئی کھڑے کھڑے سوال کرے۔

ربط باب سابق میں بھی عالم سے سوال کا تذکرہ تھا اور اس باب میں بھی عالم ہی سے سوال کرنے کا تذکرہ ہے پس دونوں میں مناسبت ظاہر ہے۔

مقصد ترجمہ ترجمۃ الباب سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی مجلس باقاعدہ تعلیم دین کے لئے نہ ہو مثلاً حالت سفر ہو اور کسی سائل کو دینی مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ عالم کے پاس جاکر کھڑے کھڑے بھی سوال کرسکتا ہے۔ یعنی کھڑے کھڑے سوال کرنا اگرچہ خلاف ادب ہے مگر بضرورت جائز ہے۔
۲ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ پچھلے ابواب میں ایک باب گذرا ہے من برک علی رکبتیہ

عند الامام او المحدث جس سے معلوم ہوا تھا کہ تحصیل علم کے لئے ادب و اطمینان کی نشست اختیار کرنی چاہئے اس سے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ بیٹھنا ہی ضروری ہو۔

امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمہ سے یہ بتانا ہے کہ بیٹھنے کا حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں، ضرورت کے وقت کھڑے کھڑے بھی مسئلہ دریافت کر سکتا ہے۔

۱۲۳ ● حدثنا عثمانُ قال ثنا جريرٌ عن منصورٍ عن ابی وائلٍ عن ابی موسیٰ قال جاء رجلٌ الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللّٰہ ما القتال فی سبیل اللّٰہ فان احدنا یقاتل غضبا و یقاتل حمیة فرفع الیہ راسہ وما رفع الیہ راسہ الا انہ کان قائما فقال من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ھی العُلیا فھو فی سَبیلِ اللّٰہ ●

ترجمہ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللّٰہ! اللّٰہ کی راہ میں لڑنا کون سا لڑنا ہے؟ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصے کی وجہ سے لڑتا ہے اور کوئی (شخصی یا قومی یا ملکی) حمیت (غیرت) کی وجہ سے لڑتا ہے تو آپؐ نے اس کی طرف سر اٹھایا اس لئے کہ (آپؐ بیٹھے تھے اور) وہ کھڑا تھا، پھر آپؐ نے فرمایا جو کوئی اس لئے لڑے کہ اللّٰہ کا بول بالا ہو تو وہ لڑنا اللّٰہ کی راہ میں ہے۔

مطابقتہ للترجمة مطابقة الحديث للترجمة فی قوله "وما رفع الیہ راسہ الا انہ کان قائما"

تعدد موضعہ والحدیث ھٰھنا فی العلم صـ۲۳ ویاتی فی الجہاد صـ۳۹۴ والخمس صـ۴۴۰ وفی التوحید صـ۱۱۱۱۔

تشریح یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اگر آپؐ ہر ہر جزئی کی تفصیل فرماتے تو بات بہت طویل ہو جاتی کیونکہ غصہ اگر دین کے لئے ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللّٰہ کہلائیگا، اسی طرح حمیت یعنی غیرت اگر دین کے لئے ہے تو بلاشبہ جہاد فی سبیل اللّٰہ ہوگا لیکن اگر غضب وغیرت کسی فاسد غرض کے لئے ہو تو بلاشبہ فی سبیل اللّٰہ جہاد نہیں ہے۔

نیز بعض روایتوں میں سائل کے سوال میں دوسرے اسباب قتال ہیں مثلاً کتاب الجہاد کے الفاظ ہیں الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیریٰ مکانہ فمن فی سبیل اللّٰہ۔ (بخاری اول صـ۳۹۴)

ان سب امور کے جواب میں حضور اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے نہایت مختصر مگر جامع جواب دیا کہ تمام سوالات کا جواب بھی ہو گیا اور اصل مقصد بھی واضح ہو گیا کہ جس لڑائی سے یہ مقصد ہو کہ اللّٰہ تعالیٰ کا دین

بلند ہو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہوگا اور جس لڑائی سے صرف مال و دولت کمانا یا اپنی شہرت و ناموری مقصود اصلی ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہو سکتا۔

باب السؤال والفتیا عند رمی الجمار[۲۳]

کنکریاں مارتے وقت مسئلہ پوچھنے اور جواب دینے کا بیان۔

ربط باب سابق سے ربط و مناسبت واضح ہے کیونکہ ما قبل کے باب میں سوال و جواب کا تذکرہ ہے، اور اس باب میں بھی سوال و جواب کا تذکرہ ہے۔

مقصد ترجمہ اس ترجمۃ الباب کے منعقد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی عالم ایسی عبادت میں مشغول ہو جس میں دوسری طرف توجہ کرنے اور بات چیت کرنے کی اجازت ہے اس صورت میں اس عالم سے علمی بات دریافت کر سکتے ہیں اور عالم بھی جواب دے سکتا ہے خصوصاً جبکہ مسئلہ کا موقع نکل جانے کے خوف سے فوراً سوال کی ضرورت ہو تو اسی وقت سوال کرنا جائز ہے کیونکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے رمی جمار کے وقت مسئلہ بتایا ہے۔ البتہ اگر عالم ایسی عبادت میں مشغول ہے جس میں بات چیت جائز نہیں جیسے نماز کہ اس میں کلام ممنوع اور مفسد صلوٰۃ ہے ایسی صورت میں علمی اور دینی مسئلہ بھی بتانا جائز نہ ہوگا۔

۱۲۴● حدثنا ابونُعیمٍ قال ثنا عبدُ العزیز بنُ ابی سَلَمَۃ عن الزھریِّ عن عیسی بنِ طلحۃ عن عبدِ اللہ بن عمروٍ قال رایتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عند الجمرۃ ویُسئالُ فقال رجلٌ یارسولَ اللہ نحرتُ قبلَ ان اَرمِیَ فقال اِرمِ ولا حرجَ قال اٰخرُ یارسولَ اللہِ حلقتُ قبلَ انْ اَنحَرَ قال اِنحَرْ ولا حرجَ فماسُئِل عن شیئٍ قُدِّمَ ولا اُخِّرَ الّا قال اِفعلْ ولا حرجَ ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرہ (عقبہ) کے پاس دیکھا کہ لوگ آپ سے مسئلے پوچھ رہے تھے چنانچہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے (بھول سے) قربانی کر دی، آپ نے فرمایا اب کنکریاں مار لو کوئی حرج نہیں، دوسرے نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے قربانی کرنے سے پہلے (بھول سے) سر منڈا لیا آپ نے فرمایا اب قربانی کر لو کچھ حرج نہیں، سو آپ سے جو چیز پوچھی گئی کہ آگے کر لی گئی یا پیچھے آپ نے یہی فرمایا اب کر لو کچھ حرج نہیں۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ "عند الجمرۃ وھو یُسأل" وھذا من جانب المستفتی وقولہ ارم ولا حرج وافعل ولا حرج من جھۃ

المفتی فطابق الترجمۃ بجزئیھا (عمدہ)

تعدد موضعہ:- والحدیث ھٰہنا ص۲۳ تا ص۲۴ ویاتی ص۲۳۴ وص۹۸۶

تشریح عند الجمرۃ اللام اما للجنس فیشمل کل جمرۃ کانت من الجمرات الثلاث او للعہد فالمراد جمرۃ العقبۃ لانہا اذا اطلقت کانت ہی المرادۃ (عمدہ ج۲ ص۱۹۸)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرۂ عقبہ کے پاس دیکھا کہ آپ سے مسائل دریافت کئے جارہے ہیں، یہ حدیث اس سے پہلے باب الفتیا وھو واقف علی ظہر الدابۃ او غیرھا کے تحت گذر چکی ہے۔ حدیث ۸۲ کی تشریح ملاحظہ فرمائیے۔

باب ۸۹ قولِ اللہِ تعالیٰ وما اُوتیتم من العلمِ اِلّا قلیلا ص۲۴

باب اللہ تعالیٰ کا (سورۂ بنی اسرائیل میں) فرمانا " اور تم کو تھوڑا ہی سا علم دیا گیا "

ربط وجہ المناسبۃ بین البابین من حیث ان کلا منہما مشتمل علی سوال عن عالم غیر ان المسؤل قد بیّن فی الاول لکونہ مما یحتاج الی علمہ السائل ولم یبین فی ہذا لعدم الحاجۃ الی بیانہ لکونہ مما اختص اللہ سبحانہ فیہ (عمدہ)

یعنی ماقبل کے باب میں بھی عالم سے سوال کا تذکرہ تھا اور اس باب میں بھی۔ اس حیثیت سے دونوں بابوں میں مناسبت ظاہر ہے لیکن دونوں ترجمۃ الباب میں تھوڑا سا فرق ہے وہ یہ کہ ماقبل کے باب میں سائل کے سوال کا جواب دیا گیا اور اس باب میں سوال کا جواب نہیں دیا گیا کیونکہ پہلا ضرورت کا سوال تھا اس لئے وہ بتا دیا گیا اور اس باب میں روح کے بارے میں سوال ہے اور روح کی حقیقت معلوم کرنا ضروری نہیں پھر روح کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں اس لئے اس کا جواب نہیں دیا گیا یعنی روح کی حقیقت نہیں بتائی گئی پس معلوم ہوا کہ ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں۔

مقصد ترجمہ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ما اوتیتم من العلم الا قلیلا تو کسی کو اپنے علم پر مغرور نہیں ہونا چاہئے خواہ وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم کہلانے لگے اس لئے کہ بموجب ارشادِ ربانی ساری مخلوق کا علم قلیل ہے تو ان میں سے ایک شخص کا علم اقل قلیل ہوگا۔

کسی بڑھیا نے ایک عالم سے مسئلہ دریافت کیا انہوں نے جواب میں لا اَدری فرمایا، بڑھیا نے ناراض ہوکر کہا کہ تنخواہ کس چیز کی لیتے ہو؟ اس عالم نے جواب میں فرمایا کہ میں اپنی معلومات کی تنخواہ لیتا ہوں، اگر مجہولات کی بھی لینے لگوں تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہوگا۔

۲ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس باب کی غرض ایک دیوبندی

مسئلہ کو ثابت کرنا ہے وہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے کیونکہ ما اوتیتم کے خطاب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں، یہاں نہیں فرمایا قل ما اوتیتم کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بہرحال اللہ کے بعد ہے لہذا عالم الغیب تو صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور باقی جتنے لوگ ہیں خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء ہوں کسی کو بھی علم غیب نہیں ہے (تقریر بخاری ج اول ص۲۰۲)

۱۲۵● حدثنا قیسُ بنُ حَفصٍ قال ثنا عبدُ الواحِدِ قال ثنا الاعمشُ سلیمانُ بنُ مِہرانَ عن ابراھیمَ عن علقمةَ عن عبدِ اللہ قال بینا انا امشی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خَرِبِ المدینةِ وھو یتوکّأ علیٰ عسیبٍ معه فمرّ بنفرٍ مّن الیھودِ فقال بعضُھُم لبعضٍ سَلُوهُ عن الروح فقال بعضُھم لا تسئلوہ لایجیئ فیه بشیئٍ تکرھونہٗ فقال بعضھم لنسألنّه فقامَ رجلٌ منھم فقال یا ابا القاسم ما الرّوحُ فسکتَ فقلتُ انّه یوحیٰ الیه فقمتُ فلمّا انجلیٰ عنه فقال "ویسئلونك عن الرّوح قلِ الرّوحُ مِن امرِ ربّی وَمَا اُوتوا مِنَ العِلمِ اِلّا قلیلا" قال الاعمشُ ھی کذا فی قرائتنا وَمَا اوتوا ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ رض (بن مسعود) کہتے ہیں کہ ایک بار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ کے کھنڈروں میں (یا کھیتوں میں) چل رہا تھا آپ کھجور کی چھڑی پر جو آپ کے پاس تھی سہارا دیکر چل رہے تھے راہ میں چند یہودیوں پر سے آپ گذرے ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان سے روح کے بارے میں سوال کرو اور ان میں سے بعض نے کہا مت پوچھو ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی بات کہدیں جو تمہیں ناپسند ہو پھر ان میں سے بعض نے کہا ہم تو ان سے ضرور پوچھیں گے آخر ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے ابوالقاسم! روح کیا چیز ہے؟ (یہ سنکر) آپ خاموش رہے میں نے دل میں کہا کہ آپ پر وحی آرہی ہے اور میں کھڑا ہو گیا پھر جب آپ سے وہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے (سورہ بنی اسرائیل کی) یہ آیت پڑھی یسئلونك عن الروح الآیة. اے نبی آپ سے یہ لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہدیجئے روح میرے مالک کا حکم ہے اور ان لوگوں کو تھوڑا ہی علم ملا ہے، اعمش نے (جن کا نام سلیمان بن مہران ہے) کہا ہماری قرأت میں اسی طرح ہے وما اوتوا (یعنی بصیغۂ غائب اور وما اوتیتم نہیں)۔

مطابقته للترجمة مطابقة الحدیث للترجمة ظاھرة اس لئے کہ ترجمۃ الباب میں آیت کریمہ کا ٹکڑا ہے اور حدیث پاک میں شان نزول کے ساتھ ساتھ پوری آیت موجود ہے۔

تعدد موضعه والحدیث ھٰھنا فی العلم ص۲۴ ویاتی فی التفسیر ص۶۸۶ وفی الاعتصام ص۱۰۸۴ وفی التوحید ص۱۱۱۱ وص۱۱۱۳۔

الفاظ حدیث کی شرح

خروب بفتح الخاء المعجمۃ وکسر الراء، ویقال بالعکس ای بکسر الخاء وفتح الراء جمع خربۃ بمعنی کھنڈر، ویرانہ۔ کتاب التفسیر میں فی حرث المدینۃ ہے اس لئے قوسین میں اس کا ترجمہ لکھدیا گیا ہے۔

عسیب بفتح العین وکسر السین المہملتین۔ جرید النخل، کھجور کی ٹہنی جس کے پتے دور کر دیئے گئے ہوں یعنی کھجور کی چھڑی۔

حدیث کی تشریح

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ مدینہ کے کھیتوں میں چل رہا تھا اور آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کو آپؐ ٹیکتے چل رہے تھے اچانک یہود مدینہ کے کچھ لوگوں کے سامنے سے آپؐ کا گذر ہوا، ان یہودیوں میں سے بعض نے کہا ان سے روح کے بارے میں سوال کیا جائے اور بعض نے کہا مت پوچھو کیونکہ ایسا نہ ہو کہ آپؐ ایسی بات کہیں جو تمہیں ناپسند ہو۔

یہود کو معلوم تھا کہ حکماء وفلاسفہ تو اٹکل پچو روح کی حقیقت بیان کرنے لگ جاتے ہیں مگر انبیاءؑ سے جب کبھی اس کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو وہ خود نہیں کہتے بلکہ علم الٰہی کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اب اگر حضورؐ نے بھی علم الٰہی کے حوالہ کیا تو لوگوں پر نبوت کی ایک اور حجت قائم ہوجائے گی جس کو وہ پسند نہیں کرتے انہیں معلوم تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہی جواب دیں گے جو توراۃ میں موجود ہے۔

یہود نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے کوئی بات ہاتھ آجائے، اب اگر روح کے متعلق سوال کا جواب بھی وہی ملتا ہے جو موسیٰؑ بیان کر چکے ہیں تو یہ جواب دلیل نبوت بنتا ہے۔

اس کے بعد یہودیوں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے ابوالقاسم! روح کیا چیز ہے؟ یعنی وہ روح جو مدبر بدن ہے جس کی وجہ سے تمام انسانی اعضاء اپنی اپنی جگہ حرکت کرتے ہیں یہ سنکر آپؐ چپ ہو رہے، میں سمجھ گیا کہ آپؐ پر وحی آرہی ہے میں الگ کھڑا ہو گیا جب وہ حالت وکیفیت جو نزول وحی کے وقت آپؐ کو پیش آیا کرتی تھی جاتی رہی تو آپؐ نے سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔	لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

روح کے متعلق یہی جواب توراۃ میں بھی تھا اب کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی خاموش ہونا پڑا۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے آزمانے کو یہود نے پوچھا سو اللہ نے (کھولکر) نہ بتایا کیونکہ ان کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا آگے پیغمبروں نے کبھی مخلوق سے ایسی باریک باتیں نہیں کیں اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی وہ جی اٹھا جب نکل

گئی مرگیا۔
اس کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے، نصر الباری کتاب التفسیر ص۳۶ تا ص۳۷۔

بابُ۹۰ مَن ترکَ بعضَ الاختیارِ مخافۃَ اَن یَّقصُرَ فھمُ بعضِ الناسِ فیقعوا فی اَشدَّ مِنہ ص۲۴

اس شخص کا بیان جس نے بعض اچھی چیز کو اس خوف سے چھوڑ دیا کہ بعض لوگوں کی سمجھ اس سے قاصر رہے اور وہ اس سے زیادہ سخت بات (بڑی غلطی) میں مبتلا ہو جائیں گے۔
مطلب یہ ہے کہ مباحات و جائز امور میں سے راجح کا علم ہوتے ہوئے کسی مصلحت کے پیش نظر مرجوح پر عمل جائز ہے جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے بناء بیت کو بناء ابراہیمی پر لوٹا دینے کے جائز و اختیاری امر کو مصلحتاً ترک فرمادیا۔

ماقبل سے ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں اقتضائے حکمت کی وجہ سے سائل کے سوال کا جواب نہ دینے کا ذکر تھا۔
اس باب میں حکمت و مصلحت کے پیش نظر بعض مختار و پسندیدہ کو ترک کرنے کا ذکر کیا جارہا ہے۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصد مذکورہ بالا ربط ہی سے ظاہر ہے کہ کوئی کام مختار و پسندیدہ ہو لیکن اس پر عمل کرنے سے خطرہ ہو کہ لوگ بڑے فتنے و گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے تو اس مختار و راجح کو چھوڑ دینا چاہیئے۔
علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس ترجمۃ الباب سے امام بخاریؒ تنبیہ کر رہے ہیں کہ عالم کو حکیم بھی ہونا چاہیئے اور اصلاح کے وقت لوگوں کے حالات پر نظر رکھنا چاہیئے کہ کہیں چھوٹی بات کی اصلاح سے کسی بڑی برائی میں نہ پڑ جائیں۔ (درس بخاری)

۱۲۶● حدثنا عُبَیدُ اللّٰہ بنُ موسیٰ عن اسرائیلَ عن ابی اسحٰق عن الاسودِ قال قال لی ابنُ الزبیر کانت عائشۃ تُسِرّ الیک کثیراً فما حدَّثتک فی الکعبۃِ قلتُ قالتْ لی قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یا عائشۃُ لولا اَنّ قومَکِ حدیثٌ عھدُ ھم قال ابنُ الزبیر بکفرٍ لنقضتُ الکعبۃ فجعلتُ لھا بابین باباً یَدْخلُ الناسُ وباباً یخرجون منہ ففعلہ ابنُ الزبیرِ ●

ترجمہ اسودؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مجھ سے کہا ام المومنین حضرت عائشہؓ تم سے بہت باتیں چھپا کر کہتی تھیں تو کیا تم سے کعبہ کے بارے میں بھی کچھ بیان کیا؟ میں نے کہا (ہاں) مجھ سے

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ اگر تیری قوم (دورِ جاہلیت کے ساتھ) قریب العہد نہ ہوتی (بلکہ پرانی ہو گئی ہوتی) ابن زبیر نے کہا یعنی کفر کے زمانہ سے (قریب نہ ہوتی) تو میں کعبہ کو توڑ کر دو دروازے بناتا ایک دروازہ سے لوگ اندر جاتے اور ایک دروازہ سے باہر نکلتے پھر ابن زبیرؓ نے (اپنی حکومت کے زمانہ میں) ایسا ہی کیا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ من جہۃ المعنی، یعنی ترجمہ سے حدیث کی مطابقت مفہوم حدیث سے بالکل واضح ہے کہ قریش بیت اللہ کا انتہائی احترام کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے اپنے اختیارات سے کام لیا تو قریش نومسلم ہونے کی وجہ سے اس کو تفرد بالفخر اور ناموری پر محمول کر کے ایک بڑے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لئے آپؐ نے امر مختار کا ترک فرمایا۔

تعدد موضعہ والحدیث ھہنا ص۲۴ ویاتی فی الحج ص۲۱۵ ، ، ص۴۷۰ وفی التفسیر ص۶۴۴ ایضاً ص۱۰۷۵ تا ص۱۰۷۶

تشریح **عن الاسود** اسود بن یزید نخعیؒ کبار تابعین میں سے ہیں اور ابراہیم نخعی مشہور محدث وفقیہ کے ماموں ہیں حضرت عائشہؓ کے شاگرد ہیں نیز حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا لیکن زیارت سے مشرف نہ ہو سکے ۷۵ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور اسودؒ دونوں نے یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنی تھی جیسا کہ سعید بن میناء سے روایت ہے سمعت عبد اللہ بن زبیر یقول حدثتنی خالتی یعنی عائشۃ قالت قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا عائشۃ لولا ان قومک حدیثوا عہد بشرک لہدمت الکعبۃ الخ (مسلم شریف ج اول ص۴۳۰)

اور اسود بن یزید کا سننا حدیث الباب سے ظاہر ہے۔
معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھانجے عبد اللہ بن زبیرؓ کو بھی یہ حدیث بتائی تھی اور ان کو یاد بھی تھی لیکن مزید تثبت کے لئے حضرت اسود بن یزیدؒ سے بھی دریافت کر رہے ہیں تا کہ خانہ کعبہ کو از سرِ نو بنانے میں لوگوں کو اعتراض نہ رہ جائے۔

قال ابن الزبیر بکفر، حضرت ابن زبیرؓ نے جب اسودؒ سے پوچھا کہ حضرت عائشہؓ نے کعبہ کے بارے میں تم سے کیا بیان کیا؟ تو اسودؒ نے کہا حدثتنی حدیثا کثیرا نسیت بعضہ وانا اذکرہ بعضہ قال ای ابن الزبیر ما نسیت اذکرتک قلت قالت (فتح ج ۱ ص۱۸۱)
چنانچہ اسود حدیث بیان کرتے ہوئے جب حدیث عہد ھم پر پہونچے تو یا تو بکفر کہنا بھول گئے اور حضرت ابن زبیرؓ نے لقمہ دیا کہ حدیث عہد ھم بکفر کہو۔
یا اسود حدیث عہد ھم تک پہونچکر بکفر سے لیکر اخیر تک بھول گئے اور ابن زبیرؓ نے پوری حدیث

پڑھی ہو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ میں تین تصرف کرنا چاہتے تھے:۔

(۱) حطیم کو بیت اللہ میں داخل کرنا۔

(۲) بیت اللہ کا دروازہ جو ساڑھے چار ذراع زمین سے بلند ہے اسے زمین سے ملانا۔

(۳) دو دروازے بنانا یعنی باب شرقی کے مقابل غربی جانب میں بھی ایک دروازہ ہو تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے خارج ہوں۔

بیت اللہ کی تعمیر قال النوویؒ قال العلماء بنی البیت خمس مرات بنته الملائکة ثم ابراھیم صلی اللہ علیہ وسلم ثم قریش فی الجاھلیة وحضر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھذا البناء وله خمس وثلثون سنة وقیل خمس وعشرون وفیه سقط علی الارض حین وقع ازاره ثم بناه ابن الزبیر رضی اللہ عنھما ثم الحجاج بن یوسف واستمر الی الآن علی بناء الحجاج وقیل بنی مرتین اخریین او ثلاثا وقد اوضحته فی کتاب ایضاح المناسك الکبیر (شرح مسلم جلد اول ص ۴۲۹)

تیسری تعمیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال یا پندرہ سال قبل قریش مکہ نے بیت اللہ کی تعمیر کی جس میں طے پایا کہ خالص حلال مال ہی اس پر صرف کیا جائے، حلال مال جمع کیا گیا تو بیت اللہ کی مکمل تعمیر کے لئے ناکافی تھا اس لئے حطیم کا حصہ چھوڑ دیا اور دروازہ صرف ایک وہ بھی زمین سے بلند اسلئے رکھا کہ دخول بیت پر مکمل ضابطہ رکھ سکیں جسے چاہیں داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں روک دیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی سہولت کے لئے مذکورہ تین تصرفات فرمانا چاہتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ فعل کوئی واجب نہ تھا صرف مستحسن تھا مگر اس جدید تعمیر میں یہ خطرہ تھا کہ قریش جدید الاسلام ہیں اور ان کو اپنی آبائی تعمیر کے ساتھ محبت ہے لہٰذا اسے بدلنا ان لوگوں کے لئے باعث فتنہ نہ ہو۔

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق بیت اللہ کی تعمیر کی مگر ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج نے عبد الملک ابن مروان کے حکم سے پھر حسب سابق تعمیر کردی، بعد میں ہارون رشیدؒ نے امام مالکؒ سے مشورہ لیا کہ مناسب ہو تو میں پھر بیت اللہ کی تعمیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق کروں، امام مالکؒ نے فرمایا کہ بیت اللہ کو بار بار گرانا اور بنانا مناسب نہیں اس سے بیت اللہ کی وقعت جاتی رہے گی اور "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کے مطابق ملعبۂ سلاطین بن جائیگا (یعنی بادشاہوں کا تختۂ مشق بن جائیگا اور ہر ایک اس میں ترمیم کریگا)

اشکال حطیم بیت اللہ کا جزء ہے مگر مع ہذا فقہاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ صرف حطیم کے استقبال

سے نماز صحیح نہ ہوگی اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب :۔ نماز میں استقبال بیت کا حکم نصِ قرآنی سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی حکم ہے اور حطیم کا جزء البیت ہونا ثابت بخبرِ الواحد ہونے کی وجہ سے ظنی ہے۔

نیز اس میں اختلاف ہے کہ کل حطیم بیت اللہ کا جزء ہے یا کہ اس کا کچھ حصہ ؟ صحیح یہ ہے کہ کچھ حصہ جزء البیت ہے اور باقی حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بکریوں کا خطیرہ تھا۔

پھر اس میں بھی روایات مختلف ہیں کہ حطیم کا کتنا حصہ بیت اللہ کا جزء ہے ؟ چار، پانچ، چھ، ساڑھے چھ اور سات ذراع کی روایات ہیں۔

ان میں تطبیق یوں دی گئی ہے کہ فرجہ کو چھوڑ کر چار اور پانچ ذراع کے درمیان ہے اور فرجہ سمیت ساڑھے چھ ذراع ہے پس کسر کے حذف یا اتمام سے روایات کا تعارض مرتفع ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ استقبالِ حطیم سے استقبال بیت کا وقوع متیقن نہیں اس لئے نماز نہ ہوگی۔

بابٌ مَن خصَّ بالعلمِ قوماً دون قومٍ كراهيةَ أنْ لايفهموا۔ وقال عليٌّ رضي الله عنه حَدِّثوا الناسَ بمايعرِفون أتُحِبُّون أن يُكذَّبَ اللهُ ورسولُهُ ص۲۴

علم کی باتیں کچھ لوگوں کو بتانا اور کچھ لوگوں کو نہ بتانا اس خیال سے کہ ان کی سمجھ میں نہ آئیں گی (یعنی ہر ایک کو اس کی عقل وفہم کے مطابق تعلیم دینا)

حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ لوگوں کے سامنے ایسی باتیں بیان کرو جنھیں وہ سمجھ سکیں کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔

ماقبل سے ربط باب سابق میں کہا گیا تھا کہ عالم کو لوگوں کے قصورِ فہم کے اندیشہ کی وجہ سے اپنے بعض مختارات (پسندیدہ) ترک کر دینی چاہیئے۔

اب اس باب میں یہ بتایا جارہا ہے کہ کچھ علوم وحقائق اہلِ فہم کے لئے خاص کرتے ہوئے قصورِ فہم کے اندیشہ کی وجہ سے بعض لوگوں کو ترک کیا جائے۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں ترجمے متقارب ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ باب سابق میں اس حکمت کا ذکر تھا جو ترک افعال سے متعلق ہے اور یہاں اس حکمت کا ذکر ہے جو ترک اقوال سے وابستہ ہے۔ کعبہ کو منہدم نہ کرنا یہ ترکِ فعل ہے اور خطاب کے وقت ایسی باتیں زبان سے نہ نکالنا جو مخاطب کی سمجھ سے اونچی ہو یہ ترک قول ہے۔

مقصد ترجمہ :۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ ترجمہ کا مقصد ظاہر ہے کہ علماء کو تبلیغ وتعلیم میں

مخاطبین وطلبہ کی حالت کا پورا پورا لحاظ کرنا چاہیئے ہر ایسی بات جو مخاطب کی سمجھ سے اونچی ہو ہرگز نہ کہنی چاہیئے جس درجہ کا مخاطب ہو اسی درجہ کی بات کہنی چاہیئے جیسا کہ حضرت علی رضؓ کا ارشاد ہے: حدثوا الناس بما یعرفون ای کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم

۱۲۷● حدثنا بہ عبیدُ اللّٰہِ بنُ موسیٰ عن معروفٍ عن ابی الطفیل عن علیٍّ رضی اللّٰہ عنہ ●

ترجمہ ہم سے اس قول کو عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انہوں نے معروف سے انہوں نے ابو الطفیل رضؓ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔

امام بخاری رحؒ نے ترجمۃ الباب میں حضرت علی رضؓ کا ارشاد نقل کیا پھر اس کی سند پیش فرمادی یہ ان روایات میں سے ہے جن میں امام بخاری رحؒ کو علوِّ سند حاصل ہے یعنی ثلاثیاتِ بخاری کے ساتھ ملحق ہے۔ (عمدہ)

ثلاثی وہ ہے کہ تیسرا راوی صحابی ہو، اس میں تیسرا راوی حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ صحابی ہیں جو غزوۂ احد کے سال ۳ھ میں پیدا ہوئے اور وفات صحیح قول کی بنا پر ۱۱۰ھ میں ہوئی، صحابہ کرام میں وفات کے لحاظ سے سب سے آخری صحابی ہیں۔

سوال یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام بخاری رحؒ نے حضرت علی رضؓ کے ارشاد کا متن پہلے ذکر کیا ہے اور اس کی سند بعد میں پیش فرمایا اس کی وجہ کیا ہے؟

علامہ عینی رحؒ فرماتے ہیں کہ علامہ کرمانی رحؒ نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں:۔

(۱) اسنادِ حدیث اور اسنادِ اثر میں فرق کرنے کے لئے۔

(۲) مقصود متن اثر کو ترجمۃ الباب کے تحت لینا تھا۔

(۳) اس سند میں ایک راوی معروف بن خرّبوذ ضعیف تھے لہذا سند کو مؤخر کر کے ضعفِ سند کی طرف اشارہ کردیا۔

(۴) امام بخاری رحؒ کا تفنّن ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں چنانچہ بعض نسخوں میں سند متن سے پہلے ذکر کی گئی ہے۔

علامہ عینی رحؒ نے علامہ کرمانی رحؒ کے جوابات نقل کرنے کے بعد ایک جواب اپنی طرف سے لکھا کہ ہوسکتا ہے کہ امام بخاری رحؒ کو اثر مذکور معلقاً ذکر کرنے کے بعد سند ملی ہو۔ (عمدۃ)

۱۲۸● حدثنا اسحٰقُ بنُ ابراھیمَ قال انا معاذُ بنُ ھشامٍ قال حدثنی ابی عن قتادۃَ قال ثنا انسُ بن مالکٍ اَنّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم و معاذٌ ردیفُہ علی الرَّحلِ قال یا معاذُ بنَ جبلٍ قال لبّیک یا رسولَ اللّٰہ و سعدیک قال یا معاذُ قال لبّیک یا رسولَ اللّٰہ وسعدیک قال یا معاذُ قال

لبّیك یا رسولَ اللّٰہ وسعدیك ثلٰثا قال ما مِن اَحَدٍ یشہد اَن لا الٰہ اِلاّ اللّٰہ وأنّ محمدا رسولُ اللّٰہ صِدقاً من قلبہ اِلاّ حرّمہ اللّٰہ علی النّار، قال یا رسولَ اللّٰہ اَفلا اُخبِرُ بہ الناسَ فیستبشِرون قال اِذًا یتّکِلوا وَاَخبَرَبِہا معاذٌ عند موتہ تاثّماً •

ترجمہ قتادہ سے روایت ہے کہ ہم سے حضرت انس بن مالکؓ نے بیان کیا کہ (ایک مرتبہ) حضرت معاذ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھے آپؐ نے فرمایا "اے معاذ بن جبل! انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر" آپؐ نے (دوبارہ) فرمایا اے معاذ! انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ حاضر ہوں حاضر، آپؐ نے (سہ بارہ) فرمایا اے معاذ! انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر تین بار (آپؐ نے معاذ کو پکارا پھر) فرمایا جو شخص سچے دل سے اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ پر حرام کر دیگا۔ معاذ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ کروں؟ کہ وہ خوش ہو جائیں آپؐ نے فرمایا (جب تم یہ خبر سنا دوگے) اس وقت لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل چھوڑ دیں گے) اور معاذ رضؓ نے مرتے وقت گنہگار ہونے کے ڈر سے یہ لوگوں سے بیان کر دیا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ من حیث المعنی وھو انہ علیہ السلام خصّ معاذاً بھذہ البشارۃ العظیمۃ دون قومٍ اٰخرین مخافۃ ان یقصروا فی العمل متکلین علی ھذہ البشارۃ۔ (عمدۃ)

تعدد موضعہ:- والحدیث ھٰھنا فی العلم ص۲۴ وایضا یاتی بعدہ متصلا مختصرا۔

الفاظ حدیث کی شرح

ردیف پیچھے سوار ہونیوالا، از باب نصر، سمع ردفاً پیچھے ہونا امام نوویؒ فرماتے ہیں رِدف بکسر الراء واسکان الدال ھو الراکب خلف الراکب یعنی سوار کے پیچھے سوار ہونے والا۔ (شرح مسلم ج ۱ ص۴۴)

اصل میں رِدف کے معنیٰ سُرین کے ہیں اس لئے پیچھے بیٹھنے والے کو ردیف کہا جاتا ہے۔

لبیك یا رسولَ اللّٰہ وسعدیك علامہ عینیؒ فرماتے ہیں لبیك بفتح اللام تثنیۃ لب معناہ الاجابۃ (عمدہ) یعنی لام کے فتحہ کے ساتھ بمعنی جواب دینے کے ہے، مطلب یہ ہے کہ تیرے بلانے پر حاضر ہوں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔

سعدیك علامہ عینیؒ فرماتے ہیں بفتح السین تثنیۃ سعد والمعنی اسعادا بعد اسعاد ای انا مسعد طاعتك اسعادا بعد اسعاد فثنی للتاکید کما فی لبیك۔ (عمدہ ج ۲ ص۲۰۶)

ان دونوں کو تثنیہ اس لئے لائے کہ تاکید و تکثیر کے معنیٰ حاصل ہو جائیں۔

اب لبیک وسعدیک کے معنیٰ ہوئے آپ کی بارگاہ میں بار بار حاضر ہوں اور حکم بجالانے کیلئے مستعد ہوں۔
آپؐ نے تنبیہ کے لئے اور ہمہ تن گوش ہونے کے لئے تین بار پکارا تاکہ پورے طور سے متوجہ ہوجائیں
جب حضرت معاذ رضؓ پوری طرح متوجہ ہوگئے تو ارشاد فرمایا " مامِن اَحَدٍ یشھد الخ "
جس شخص نے صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ پر حرام کردے گا۔
اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں حضرت ابوہریرہ، حضرت عثمان اور دوسرے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایسی روایتیں آئی ہیں۔

اشکال اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ گو مومن دوزخ میں نہیں جائیگا صرف شہادت کیوجہ سے دوزخ حرام ہوجاتی ہے، حالانکہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ گنہگار مسلمان دوزخ میں جائیں گے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور حق تعالیٰ کی خصوصی رحمت سے دوزخ سے نکل کر جنت میں بھیجے جائیں گے۔
بظاہر ان دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب :- (۱) بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ نزول فرائض واحکامات سے قبل کی حدیث ہے۔
یہ جواب اس لئے صحیح نہیں کہ صحیح مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ اور مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت ابوموسیٰؓ سے بھی اس مضمون کی روایت ہے حالانکہ ان دونوں حضرات کی صحبت اکثر فرائض کے نزول سے متاخر ہے۔
دونوں حضرات ؁ ۷ھ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔
(۲) اس میں حکم اکثری کا بیان ہے کیونکہ غالب یہ ہے کہ کلمہ گو مؤمن نیک عمل کرتا ہے اور معاصی سے اجتناب کرتا ہے۔
(۳) دوزخ کے دو طبقے ہیں ایک تو خاص کفار کے لئے اور ایک عصاۃ المؤمنین کیلئے، یہاں تحریم نار سے دوزخ کا وہ طبقہ مراد ہے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔
(۴) تحریم علی النار سے مراد حرمت کل ہے کیونکہ مسلم کے مواضع سجود اور زبان جو کلمہ توحید کا اقرار کرتی تھی نار دوزخ سے محفوظ رہے گی۔
(۵) دخول نار حرام نہیں بلکہ تحریم خلود مراد ہے یعنی مومن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔
(۶) یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو ایمان لانے کے بعد فوراً وفات پا گیا ہو اسے عمل کا موقع ہی نہیں ملا۔
(۷) حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مفردات کی تاثیر بیان فرماتے ہیں مرکبات کی تاثیر کا ظہور عند المیزان ہوگا۔
پس اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ طیبہ کی تاثیر بحالت انفراد بیان فرمائی ہے

کہ یہ محرم نار ہے اس کے ساتھ معاصی کی ترکیب سے اس کی تاثیر بدل جائے گی۔
حضرت نانوتویؒ آبِ حیات میں فرماتے ہیں کہ ایمان کی طبعی خاصیت نار سے نجات دینا ہے مگر معاصی کی حرارت سے ایمان گرم ہو جاتا ہے تو یوں نہ سمجھو کہ ایمان کی طبعی خاصیت جاتی رہی جیسے کہ پانی کی طبعی خاصیت برودت ہے آگ پر رکھنے سے جب کھولنے لگتا ہے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبعی خاصیت ختم ہوگئی مگر درحقیقت ایسا نہیں چنانچہ یہ حقیقت اس طرح منکشف ہوگی کہ اس کھولتے ہوئے پانی کو دہکتی آگ پر ڈالدیں تو آگ فوراً بجھ جائے گی معلوم ہوا کہ پانی میں حرارت ایک عارضی ہے جس سے اس کی برودت اصلیہ کا کبھی فقدان نہیں ہو سکتا۔ یہی حال ایمان کا ہے کہ اس کی خاصیت مومن کے قلب میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے کہ اس کی تاثیر کا ہرگز انفکاک نہیں ہوتا۔

سونے کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے

سونے کے میلے کچیلے زیورات کو صراف آگ میں ڈالتا ہے مگر مقصد آگ میں ڈالنے سے صرف صاف کرنا ہوتا ہے کہ آگ میں میل کچیل زائل ہو کر خالص سونا چمکنے لگے ٹھیک اسی طرح مومن کو جلانے اور فنا کرنے کیلئے دوزخ میں نہیں ڈالا جائیگا بلکہ صاف و پاک کر کے جنت کے قابل بنانے کیلئے ایسا کیا جائیگا جب صاف ہو جائیگا تو آگ سے نکال لیا جائیگا، یہی وجہ ہے کہ مومن کا دخول فی النار تو ہو سکتا ہے لیکن خلود نہیں ہو سکتا، ایمان کا اثر طبعی بالآخر ظاہر ہو کر اور اس کو جنت میں داخل کر کے رہیگا۔

قولہ یتکلوا (بتشدید المثناۃ المفتوحۃ وکسر الکاف) جزا ہے اور شرط محذوف ہے۔ ای ان اخبرتم یتکلوا یعنی اگر تم لوگوں کو خبر پہونچا دو گے تو کلمۂ ایمانی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔

واخبر معاذ عند موتہ تأثما یعنی کتمانِ علم کے گناہ سے بچنے کے لئے اس حدیث کو بیان فرمایا عند موتہ ای عند موت معاذ یعنی اپنے مرنے کے وقت۔

اشکال

اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اس حدیث کے بیان کرنے سے منع فرما دیا تھا تو حضرت معاذؓ نے کیوں بیان کر دیا؟

جواب:

(۱) نہی تحریم کے لئے نہ تھی بلکہ مصلحت کی بنا پر نہی تنزیہی تھی اگر حضرت معاذؓ نہی کو حرام سمجھتے تو بعد میں بھی قطعاً کسی سے بیان نہ کرتے۔
(۲) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا تعلق صرف عوام الناس سے تھا جن سے اِتکال کا اندیشہ تھا خواص سے نہیں تھا اس لئے آپؐ نے خود بھی صرف حضرت معاذؓ کو خبر دی جو اہلِ معرفت اور خواص میں سے تھے اور ان سے اتکال کا ڈر نہیں تھا، چنانچہ حضرت معاذؓ نے بھی اپنے مرنے کے وقت خواص کو جمع کر کے بیان کر دیا تھا۔
(۳) یہ بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ ابتداءً اس کے بیان کرنے ممانعت تھی پھر جب معاذؓ کو معلوم ہوا کہ

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا تو معاذ رضؓ نے بھی بیان کردیا۔

۱۲۹ ● حدثنا مُسَدَّدٌ قال حدثنا مُعْتَمِرٌ قال سمعتُ أبي قال سمعتُ أنسًا قال ذُكِرَ لي أنّ النبي صلى الله عليه وسلم قال لِمُعاذٍ مَن لَقِيَ اللهَ لا يُشرِكُ به شيئًا دخل الجنّةَ قال ألا أُبَشِّرُ به الناسَ قال لا إنّي أخافُ أن يَتَّكِلوا ●

ترجمہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے اس کیفیت کے ساتھ ملاقات کریگا کہ اس نے اللہ کے ساتھ (دنیا میں) کسی کو بالکل شریک نہ کیا ہو وہ یقینا جنت میں داخل ہوگا۔ معاذ رضؓ نے عرض کیا (یا رسول اللہ!) کیا میں اس بات کی خوشخبری لوگوں کو نہ سنادوں؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں مجھے خوف ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔

مطابقتہ للترجمۃ:- مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاهرۃ مثل مطابقۃ الحدیث السابق۔

معاذ بن جبل رضؓ:- حضرت معاذؓ کا مختصر حال کتاب الایمان کے شروع میں گذر چکا۔

● بابٌ [۹۲] الحياءِ في العِلمِ وقال مجاهدٌ لا يَتعلّمُ العِلمَ مُستحيٍ ولا مُستكبِرٌ وقالت عائشةُ نِعمَ النساءُ نساءُ الانصارِ لم يَمنعْهُنّ الحياءُ أن يَتفقّهْنَ في الدينِ ● ص۲۴

باب:- حصولِ علم میں شرم کرنا۔ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ متکبر اور شرمانے والا آدمی علم حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کا ارشاد ہے کہ انصار کی عورتیں اچھی عورتیں ہیں کہ شرم انہیں دین کی سمجھ حاصل کرنے سے نہیں روکتی۔

ماقبل سے ربط علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ باب سابق میں بعض علمی بات کو ایک جماعت (اہلِ فہم) کے لئے خاص کرنے کا ذکر تھا۔

اب اس باب میں امام بخاریؒ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ علم کو کسی خاص قوم کے لئے مخصوص سمجھ کر سوال سے حیا نہ کیجائے بلکہ جب علمی ضرورت پیش آئے خواہ وہ دینی معاملہ سے متعلق ہو یا دنیوی معاملہ سے اس کے دریافت کرنے میں حیا مانع نہیں ہونی چاہئے۔

مقصدِ ترجمہ حدیث میں آتا ہے کہ الحیاء شعبۃ من الایمان، مسلم کی ایک روایت میں ہے الحیاء کلہ خیر اور ایک روایت میں ہے الحیاء لا یاتی الا بخیر (مسلم اول ص۴۸)۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ حیا بلاشبہ شعبۂ ایمانیہ میں سے ہے اور خیر ہے لیکن اس کا استعمال ایسے مواقع میں نہ کیا جائے کہ خیر سے محرومی کا باعث ہو، امام بخاریؒ متعلمین اور طلبۂ علم کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ علم کی جو بات سمجھ میں نہ آئے، کوئی اشکال پیش آئے تو دوبارہ دریافت کرلو علم میں حیا کو مانع نہ ہونا چاہئے اس لئے

کہ جو حیاء علم سے مانع ہو وہ دراصل حیا نہیں وہ کمزوری اور بزدلی ہے۔
اس مقصد کی تائید کے لئے امام نے ترجمہ کے ذیل میں اثر مجاہدؒ اور اثر عائشہ صدیقہؓ کو پیش کیا ہے، ترجمہ گذر چکا

۱۳۰۔ حدثنا محمدُ بنُ سلامٍ قال أنا ابو معاويةَ قال حدثنا هشامٌ عن ابيه عن زينبَ بنتِ امّ سَلَمَةَ عن امِّ سَلَمَةَ قالتْ جاءتْ امُّ سُلَيمٍ الى رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقالت يارسولَ اللّٰه اِنّ اللّٰه لا يَستحيي مِنَ الحقّ فهل على المرأةِ من غُسلٍ اِذا احتلمتْ فقال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم اِذا رَاَتِ الماءَ فغطّتْ امُّ سلمةَ تعني وجهَها وقالت يارسولَ اللّٰه اَوَ تحتلمُ المرأةُ قال نعم تَرِبَتْ يَمِينُكِ فبِمَ يُشبِهُهَا وَلَدُها ●

ترجمہ حضرت زینب بنت امّ سلمہ حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ امّ سُلیمؓ (والدہ حضرت انسؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے سے نہیں شرماتا (اس لئے میں پوچھتی ہوں کہ) کیا احتلام سے عورت پر بھی غسل ضروری ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ہاں) جب عورت پانی دیکھ لے (یعنی جاگ کر کپڑے پر منی کا اثر دیکھ لے) تو (یہ سنکر) حضرت ام سلمہؓ نے اپنا چہرہ (شرم سے) ڈھانک لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں پھر کیوں اس کا بچہ اس کے مشابہ ہوتا ہے؟

مطابقۃ للترجمۃ مطابقۃ الحديث للترجمۃ ظاهرة فى قول امّ سُليمٍ اِنّ اللّٰه لا يستحيي الخ اس ارشاد سے حضرت امّ سلیمؓ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق بات فرمانے سے نہیں رکتے پس میں بھی علمی سوال سے نہیں رکتی اگرچہ وہ ایسا سوال ہے جس سے عام طور پر عورتیں شرم کرتی ہیں۔

تعدد موضعہ والحديث ههنا فى العلم ص۲۴ ويأتى فى الغسل ص۴۲ وفى كتاب الانبياء ص۴۶۸ وايضا ص۹۰۰ وايضا ص۹۰۴۔

تشریح اس حدیث پاک سے صاف معلوم ہوا کہ جو شخص کسی سے پڑھنے میں اشکال وشبہ کے باوجود پوچھنے میں شرم کریگا وہ علم سے محروم رہیگا۔

حضرت امام اعظمؒ سے کسی نے پوچھا آپ اتنے بڑے زبردست عالم کیسے ہوگئے؟
فرمایا جو مجھے معلوم تھا اس کے بتانے میں بخل نہیں کیا اور جو معلوم نہ تھا اس کے حاصل کرنے میں شرم نہیں کی۔

حضرت زینب بنت ام سلمہؓ حضرت زینب بنت امّ سلمہؓ امّ المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی ہیں یہ اپنے زمانے کی عورتوں میں بہت بڑی

عالمہ فقیہہ تھیں، یہی زینب بنت ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بھی ہیں مگر اثبات شرف کے لئے ماں ام سلمہؓ کی طرف نسبت جوڑی گئی کیونکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت سے مشرف ہوئیں تو صاحبزادی زینب کو لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں پس یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پرورش میں رہیں۔

حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں نسبت الی امّها تشریفا لکونها زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم (فتح) وفات ۷۳ھ میں ہوئی (عمدہ) توفیت قریبا من سنة اربع وثمانین (سیر اعلام النبلاء جلد ثالث)

حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ آپ کا اسم مبارک ہند ہے۔ علامہ شمس الدین ذہبیؒ فرماتے ہیں: و قد وهم من سماها رملة (سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۲۰۲) یعنی جن لوگوں نے حضرت ام سلمہؓ کا نام رملہ کہا ہے وہ غلط ہے باقی حالات کے لئے دیکھئے نصر الباری کتاب التفسیر ص ۶۲۴۔

حضرت ام سلیمؓ ان کے کئی نام ہیں ۱۔ رُمیصاء ۲۔ رُمیثہ (بالراء و بالمثلثہ) ۳۔ غمیصاء، کلها بالتصغیر بنت ملحان (بکسر المیم وسکون اللام) حضرت انس بن مالکؓ کی والدہ اور حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی بیوی ہیں، مشہور صحابیہ ہیں جن سے بخاری و مسلم وغیرہ میں احادیث کی روایت کی گئی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں ان کے شوہر مالک بن النضر تھے جب یہ اسلام لائیں تو ان کو بھی اسلام لانے کے لئے کہا وہ ناراض ہو کر شام چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

اس کے بعد حضرت ام سلیمؓ کو حضرت ابوطلحہؓ نے پیام نکاح دیا چونکہ اس وقت وہ مشرک تھے اسلئے ام سلیمؓ نے انکار کر دیا کہ بغیر اسلام کے نکاح نہیں ہوگا چنانچہ انہوں نے مسلمان ہو کر نکاح کیا۔ حضرت ام سلیمؓ نے بیان کیا کہ میرے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی اچھی دعا کی تھی جس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۷۱)

۱۳۱ ● حدثنا اسمعیلُ قال حدثنی مالکٌ عن عبیدِ اللّٰه بنِ دینارٍ عن عبدِ اللّٰه بنِ عمرَ انَّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال اِنَّ مِنَ الشجرِ شجرةً لا یسقطُ ورَقُها وهی مَثَلُ المسلمِ حدِّثونی ما هی فوقع الناسُ فی شجرِ البادیة ووقعَ فی نفسی اَنّها النخلةُ قال عبدُ اللّٰه فاستحییتُ قالوا یا رسولَ اللّٰه اَخبِرنا بها فقال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم هی النخلة قال عبد اللّٰه فحدثتُ ابی بما وقع فی نفسی فقال لَاَن تکونَ قلتَها احبُّ الیَّ مِن اَن یکونَ لی کذا وکذا ●

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے اور اس کی مثال مسلمان جیسی ہے، مجھے بتلاؤ وہ کون سا درخت ہے؟ تو لوگ جنگلی درختوں (کے خیال) میں پڑ گئے اور میرے جی میں آیا کہ وہ

کھجور کا درخت ہے، عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ پھر مجھے شرم آئی (اور میں کہہ نہ سکا) آخر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہی اس کے بارے میں بتلایئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔
عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (حضرت عمر فاروق رضؓ) سے بیان کیا جو میرے دل میں آیا تھا تو عمر رضؓ نے فرمایا اگر تو (اس وقت) کہہ دیتا تو مجھ کو اتنا مال ملنے سے بھی زیادہ خوشی ہوتی۔

مطابقتہ للترجمۃ: مطابقۃ الحدیث للترجمۃ ظاھرۃ فی قولہ "قال عبد اللہ فاستحییت"۔

تعدد موضعہ والحدیث ھہنا فی العلم ص۲۴ وقد مضی ص۱۴ وص۱۶ تا ص۱۷ ویاتی ص۲۹۴ وص۶۸۱ وص۸۱۹ ص۹۰۴ وص۹۰۷

تشریح جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حیا مانع عن تحصیل الفضیلۃ پر نکیر فرمائی تو حیا مانع عن تحصیل العلم بطریق اولیٰ مذموم اور واجب الترک ہوگی۔
یہ حدیث دو بار گذر چکی حدیث ۵۹ ملاحظہ فرمایئے۔

بابٌ۹۳ مَنِ اسْتَحْیَیٰ فَاَمَرَہٗ بِالسُّؤَالِ ص۲۴

جو شخص (خود عالم سے) علم کی بات پوچھنے میں شرمائے تو کسی دوسرے سے سوال کرنے کے لئے کہے۔

ربط ماقبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وجہ المناسبۃ بین البابین ظاھر لان کلا منھما مشتمل علی الحیاء۔
ع۲ باب سابق سے بظاہر حیاء کا قبح ثابت ہوتا ہے لہذا اس باب میں اس کی تفصیل مقصود ہے کہ اگر حیاء تحصیلِ مقصود سے مانع نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

مقصدِ ترجمہ امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمہ سے یہ ہے کہ جو حیاء علم حاصل کرنے سے مانع ہو وہ حیاء مذموم ہے، اگر کسی وجہ سے خود نہیں پوچھ سکتا ہے اور حیاء کا موقع ہو تو کوئی ایسی صورت اختیار کرے، ایسا ذریعہ تلاش کرے کہ حیاء بھی ملحوظ رہے اور علمی بات سے محرومی بھی نہ ہو جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک خاص وجہ سے شرم محسوس ہوئی تو انہوں نے دوسرے سے دریافت کرنے کو کہا۔

۱۳۲ ● حدثنا مُسَدَّدٌ قال حدثنا عبدُ اللہِ بنُ داؤدَ عن الاَعْمَشِ عن مُنذِرٍ الثوریِّ عن محمدِ بنِ الحَنَفِیَّۃِ عن علیِّ بنِ ابی طالبٍ رضی اللہ عنہ قال کنتُ رجلاً مَذّاءً فامرتُ المقدادَ اَن یّسألَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہُ فقال فیہِ الوُضوءُ ●

ترجمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری مذی بہت نکلا کرتی تھی تو میں نے مقداد سے کہا تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مسئلہ پوچھو انہوں نے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا

اس میں وضوء ہے (یعنی مذی نکلنے سے وضوء فرض ہوتا ہے)۔

مطابقۃ للترجمۃ حدیث شریف کی ترجمۃ الباب سے پوری مطابقت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ترجمۃ الباب میں دو چیزیں مذکور ہیں۔ ۱ استحیاء ۲ دوسرے کو سوال کا حکم دینا۔ لیکن حدیث باب میں صرف ایک چیز یعنی دوسرے سے سوال کرانے کا ذکر ہے استحیاء کا ذکر نہیں، مگر امام بخاری رح کی نظر ذخائر حدیث میں پہونچتی ہے چنانچہ یہی حدیث کتاب الوضوء میں ص۳۰ پر آرہی ہے اس میں ہے قال علیؓ کنتُ رجلا مذاءً فاستحییت ان اسئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فامرت المقداد الخ۔ اس میں استحیاء کی صراحت موجود ہے۔

تعدد موضعہ: ـ والحدیث ھھنا فی کتاب العلم ص۲۴ ویاتی ص۳۰ وص۴۱۔

تشریح اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت مقداد رضؓ سے کہا تھا، بعض روایت میں ہے کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت عمار رضؓ سے فرمایا تھا اور بعض میں ہے کہ حضرت علی رضؓ نے خود سوال کیا تھا، بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے فکیف التطبیق؟

جواب تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابتداءً حیاء کی وجہ سے حضرت علی رضؓ نے حضرت مقداد رضؓ اور حضرت عمار رضؓ دونوں سے فرمایا ہوگا اور جب حضرت مقداد رضؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو حضرت عمار رضؓ بھی مجلس میں پہونچ گئے اور حضرت علی رضؓ کی طرف پوچھنے کی نسبت مجازی ہے چونکہ آمر تھے۔

اس حدیث پر مزید تفصیل کتاب الوضوء میں آئے گی انشاء اللہ الرحمٰن۔ یہاں صرف یہ ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مذی کی وجہ سے غسل واجب نہیں ہوتا اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ مذی ناپاک ہے جس طرح پیشاب کے بعد وضوء ضروری ہے اسی طرح مذی سے بھی صرف وضو ضروری ہے۔

بابٌ[۹۴] ذکرِ العلمِ والفُتیا فی المسجدِ[ص۲۵]

مسجد میں علمی مذاکرہ اور فتویٰ دینا۔

ربط ماقبل علامہ عینی رح فرماتے ہیں وجہ المناسبۃ بین البابین من حیث اشتمال کل منہما علی السؤال اما فی الاول فلأنہ فیہ سؤال مقداد عن حکم المذی وفی ھذا الباب سوال ذالک الرجل فی المسجد عن حکم الاھلال للحج وکل منہما عن امر دینی۔ (عمدۃ القاری)

خلاصہ یہ کہ یہ باب بھی باب سابق کی طرح سوال پر مشتمل ہے فرق صرف اتنا ہے کہ باب سابق میں حکم مذی کے متعلق حضرت مقداد رضؓ کے سوال کا ذکر تھا اور اس باب میں مسجد میں احرام باندھنے کے متعلق سوال کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں دینی معاملہ ہے۔

مقصد ترجمہ چونکہ مساجد میں رفع صوت سے ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ مسجد میں فتویٰ دینا اور علمی مذاکرہ وگفتگو بھی جائز نہ ہو کیونکہ اس میں بھی رفع صوت کی ضرورت پڑ سکتی ہے، اس لئے امام بخاریؒ نے یہ باب منعقد کر کے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ مسجد میں علمی بات کرنا اور فتویٰ دینا جائز ہے جبکہ کسی کی نماز میں خلل نہ ہو۔

۱۳۳ ● حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا اللیث بن سعد قال حدثنا نافع مولیٰ عبد اللہ بن عمر بن الخطاب عن عبد اللہ بن عمر أن رجلا قام فی المسجد فقال یا رسول اللہ من این تامرنا أن نہل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہل اہل المدینة من ذی الحلیفة ویہل اہل الشام من الجحفة ویہل اہل نجد من قرن وقال ابن عمر ویزعمون أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ویہل اہل الیمن من یلملم وکان ابن عمر یقول لم أفقہ ہذہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ●

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) ایک آدمی مسجد (نبوی) میں کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہمیں کس جگہ سے احرام باندھنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، مدینہ والے ذو الحلیفہ سے احرام باندھیں اور شام والے جحفہ سے (احرام باندھیں) اور نجد والے قرن سے" ابن عمر نے فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ یمن والے یلملم سے احرام باندھیں، ابن عمرؓ کہتے تھے کہ میں نے یہ بات (کہ یمن والے یلملم سے احرام باندھیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد نہیں کیا۔

مطابقتہ للترجمۃ مطابقۃ الحدیث للترجمۃ فی قولہ ان رجلا قام فی المسجد فقال یارسول اللہ من این تامرنا أن نہل الخ

یعنی حدیث الباب میں آپؐ سے سوال اور آپؐ کی طرف سے جواب کی صراحت موجود ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ مسجد میں علمی مذاکرہ اور اہل علم سے مسئلہ دریافت کرنا اور اہل علم کا فتویٰ دینا جائز ہے البتہ دنیاوی باتیں ممنوع ہیں۔

تعدد موضعہ والحدیث ھھنا فی کتاب العلم ص۲۵ ویاتی فی المناسك فی باب مواقیت الحج والعمرة ص۲۰۶ ایضا فی باب مہل اہل مکة ص۲۰۶ ایضا فی باب میقات اہل المدینة ص۲۰۶ ایضا فی باب مہل اہل الشام ص۲۰۶ وص۲۰۷ وفی الاعتصام ص۱۰۹۱۔

حضرت ابن عمرؓ کی احتیاط قال ابن عمر ویزعمون الخ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن والوں کے لئے یلملم کو میقات قرار دیا ہے لیکن میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات صاف نہیں سنی، اس سے روایت

کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی احتیاط اور تقویٰ کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ خود سنا اسے تو اعتماد سے بیان کیا اور دوسروں کی بات ان کے حوالہ سے بیان فرمایا۔

باب ۹۵ مَن اَجابَ السَّائِلَ بِاَکثَرَ مِمَّا سَالَہٗ ص۲۵

پوچھنے والے نے جتنا پوچھا اس سے زیادہ جواب دینا۔

ربط ما قبل علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وجه المناسبة بين البابين من حيث اشتمال كل منهما على السوال والجواب وهو ظاهر۔ (عمدہ)

مطلب یہ ہے کہ باب سابق کی طرح یہ باب بھی سوال وجواب پر مشتمل ہے۔

مقصد ترجمہ ایک حدیث ہے من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ ۔ اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ سائل کو صرف سوال کا جواب دینا چاہئے کیونکہ سائل جب اپنے سوال میں مقصد کی تصریح کر رہا ہے تو زیادہ جواب دینا لایعنیہ کے مرادف ہے۔

امام بخاریؒ نے یہ باب منعقد کر کے یہ بتایا کہ اگر زیادتی سائل کے لئے مفید ہو اور ضرورت ہو تو سوال سے زیادہ جواب دینا درست ہے جیسا کہ حدیث الباب سے ثابت ہے اور مالا یعنیہ میں اسی وقت داخل ہو گا جبکہ بلا ضرورت اور غیر مفید زیادتی ہو۔

۱۳۴ ● حدثنا آدمُ قال حدثنا ابنُ اَبی ذئبٍ عن نافعٍ عن ابنِ عُمرَ عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم ح وعنِ الزهریِّ عن سالمٍ عن ابنِ عُمرَ عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم اَنَّ رجلاً سَاَلهٗ مایَلبَسُ المُحرِمُ فقال لایَلبَسُ القمیصَ ولا العِمامةَ ولا السَّراویلَ ولا البُرنسَ ولا ثوباً مَسَّهُ الوَرسُ اَوِ الزَّعفرانُ فاِن لم یَجِدِ النَّعلَینِ فَلیَلبَسِ الخُفَّینِ ولْیَقطَعهُما حتیٰ یکونا تحتَ الکَعبَینِ ●

ترجمہ ہم سے آدم (بن ابی ایاس) نے بیان کیا کہا ہم سے ابن ابی ذئب نے بیان کیا نافع سے نقل کر کے انہوں نے ابن عمرؓ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ح (یعنی دوسری سند) ابن ابی ذئب نے اس کو زہری سے بھی نقل کیا انہوں نے سالم سے انہوں نے ابن عمرؓ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ ایک شخص نے آپؐ سے پوچھا جو شخص احرام باندھے ہو وہ کیا پہنے؟ آپؐ نے فرمایا قمیص نہ پہنے اور نہ عمامہ، پائجامہ، نہ ٹوپی نہ وہ کپڑا جس میں ورس یا زعفران لگی ہو پھر اگر (پہننے کو) جوتیاں نہ ملیں تو موزے کو ٹخنوں سے نیچے تک کاٹ کر پہن لے۔

مطابقته للترجمة مطابقة الحديث للترجمة فی قوله "فان لم يجد النعلين فليلبس الخفين الخ" (عمدة القاری)

حاصل یہ کہ یہ ارشاد مقدار سوال سے زیادہ ہے اور یہی ترجمہ ہے۔

تعدد موضعہ والحدیث ھٰھنا ص۲۵ ویاتی فی الصلوٰۃ ص۵۳ وفی المناسک ص۲۰۸ تا ص۲۰۹ وفی ابواب العمرۃ ص۲۴۸ ایضاً ص۲۴۸ وفی کتاب اللباس ص۸۶۲ ایضاً ص۸۶۳ ایضاً ص۸۶۳ ایضاً ص۸۶۳ تا ص۸۶۴ وص۸۶۹ وص۸۷۰۔

برنس بضم الباء وسکون الراء وضم النون وھو ثوب راسہ ملتزق فیہ (یعنی ہر وہ کپڑا جس میں سر پر اوڑھنے کا حصہ (یعنی ٹوپی) جڑا ہوا ہو) وقیل قلنسوۃ طویلۃ وکان النساک یلبسونھا فی صدر الاسلام (یعنی وہ لمبی ٹوپی جس کو لوگ شروع زمانہ اسلام میں پہنا کرتے تھے۔ (عمدہ)

خلاصہ یہ ہے کہ برنس وہ کپڑا جسمیں ٹوپی لگی جبہ ہو یا قمیص، برساتی کپڑا۔

ورس بفتح الواو وسکون الراء وفی آخرہ سین وھو نبت اصفر یکون بالیمن الخ یعنی ورس پیلے رنگ کی گھاس ہے جو صرف یمن میں ہوتی ہے۔ اگر چہرہ پر جھائیں پڑ جائے تو اس کا لیپ کرنا مفید ہے۔

فلیلبس الخفین ولیقطعھما اگر کسی محرم کے پاس جوتا نہ ہو بلکہ موزہ ہو تو دونوں موزے کو کاٹ دیں۔

الکعبین یہاں وسط قدم کی ہڈی مراد ہے اور وضو میں ٹخنے مراد ہیں بیچ کی ہڈی مراد نہیں۔

الغرض محرم سلا ہوا کپڑا نہ پہنے اور نہ سر اور پاؤں کو چھپائے۔

براعۃ الاختتام امیر المؤمنین فی الحدیث نے کتاب العلم کو آیت ربّ زدنی علماً سے شروع کیا تھا اب اس کا خاتمہ باب من اجاب السائل باکثر مما سالہ پر کیا کہ شروع میں زیادتی علم کی دعا تھی، ختم میں سوال سے زیادہ علم سکھانا ثابت کر دیا۔ (مولانا فخر الدین احمد رحمہ اللہ تعالیٰ)

اس کو علم بلاغت میں العود علی البدء کہہ سکتے ہیں یہ تو ابواب کا براعۃ الاختتام ہوا۔ اور کتاب کا براعۃ الاختتام حافظ ابن حجرؒ کی رائے کے مطابق یوں ہے کہ حدیث کے آخر میں ولیقطعھما حتی یکونا تحت الکعبین موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے۔ اب کتاب العلم قطع یعنی ختم ہو گئی اب دوسری کتاب کے لئے تیار رہو۔

حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق کتاب العلم ختم ہو گئی تو اپنی عمر کے ختم ہونے کو یاد کرو اس کے واسطے احرام کے کپڑوں والی حدیث لائے یہ کپڑے تمہارے کفن کے کپڑوں کے مشابہ ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (امداد الباری)

والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

الحمد للہ نصر الباری شرح بخاری کی جلد اول ۱۷ ربیع الثانی بروز دوشنبہ ۱۴۱۷ھ کو پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کو اصل کی طرح قبول فرمائے آمین ثم آمین۔

ان شاء اللہ جلد ثانی کتاب الوضوء سے شروع ہوگی۔

محمد عثمان غنی البہاری غفرلہ الباری مدرسہ مظاہر علوم وقف سہارنپور۔



فہرست مضامین مقدمہ نصر الباری مع جلد اوّل

نصر الباری جلد اول کے احادیث

(۱) کتاب الوحی ——— ۶

(۲) کتاب الایمان ——— ۵۰

(۳) کتاب العلم ——— ۷۸

۱۳۴

العناقيد الغالية



الأسانيد العالية

جمع فيه المؤلف أسانيد مشائخ ديوبند
إلى الشاه ولى الله الدهلوى ثم منه إلى
أصحاب الكتب الستة وغيرها مع فوائد
ثمينة يحتاج إليها المحدث والطالب .

﴿ تاليف ﴾

المحدث الجليل
مولانا محمد عاشق الهى البرنى المظاهرى
رحمه الله تعالى

الناشر
مكتبة الشيخ
٣/٤٤٥، بهادر آباد، كراچی نمبر ٥۔

مؤلف دامت برکاتہم کی طرف سے تصحیح اغلاط
اور اضافات کے ساتھ پہلی بار

الدُّرُّ المنضُود

علی

سُنَنِ ابی داود

افادات درسیہ مع اضافات ونظر ثانی

مولانا محمد عاقل صاحب صدر المدرسین مظاہر علوم

تلمیذ رشید

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ

ناشر

مکتبۃ الشیخ

۳/۴۴۵-بہادر آباد-کراچی ۵

اہل علم کی طرف

سے

طلبہ کے لیے قیمتی نصائح

تالیف

مولانا محمد روح اللہ نقشبندی غفوری

ناشر

مکتبۃ الشیخ

۳/۴۴۵، بہادر آباد، کراچی نمبر ۵۔